قافلۂ حدیث

محمد اسحاق بھٹی

❀❀❀ توجہ فرمائیں! ❀❀❀

کتاب وسنت ڈاٹ کام پر دستیاب تمام الیکٹرانک کتب............

- عام قاری کے مطالعے کے لیے ہیں۔
- مجلس التحقیق الاسلامی کے علمائے کرام کی باقاعدہ تصدیق واجازت کے بعد اَپ لوڈ (UPLOAD) کی جاتی ہیں۔
- متعلقہ ناشرین کی اجازت کے ساتھ پیش کی گئی ہیں۔
- دعوتی مقاصد کی خاطر ڈاؤن لوڈ، پرنٹ، فوٹو کاپی اور الیکٹرانک ذرائع سے محض مندرجات کی نشرواشاعت کی مکمل اجازت ہے۔

❋❋❋ تنبیہ ❋❋❋

- کسی بھی کتاب کو تجارتی یا مادی نفع کے حصول کی خاطر استعمال کرنے کی ممانعت ہے۔
- ان کتب کو تجارتی یا دیگر مادی مقاصد کے لیے استعمال کرنا اخلاقی، قانونی وشرعی جرم ہے۔

اسلامی تعلیمات پر مشتمل کتب متعلقہ ناشرین سے خرید کر
تبلیغ دین کی کاوشوں میں بھرپور شرکت اختیار کریں

نشرواشاعت، کتب کی خرید وفروخت اور کتب کے استعمال سے متعلقہ کسی بھی قسم کی معلومات کے لیے رابطہ فرمائیں

ٹیم کتاب وسنت ڈاٹ کام

webmaster@kitabosunnat.com

www.KitaboSunnat.com

محمد اسحاق بھٹی

مکتبہ قدوسیہ اردو بازار لاہور

انتساب

میرے مخلص ترین دوست مولانا عبدالخالق قدوسی شہیدؒ مسلک اہل حدیث کے ہمہ وقتی مبلغ اور علمائے اہل حدیث کے بے حد عقیدت مند تھے۔ انھوں نے برصغیر کے علمائے اہل حدیث کے حالات ضبط تحریر میں لانے اور ان کی عملی کاوشوں کو اجاگر کرنے کا ایک منصوبہ بنایا تھا۔ اس موضوع پر انھوں نے اچھا خاصا مواد جمع کر لیا تھا اور اسے ترتیب دینے کی طرح ڈال دی تھی۔ ان کے بعض مضامین ہفت روزہ ''الاعتصام'' میں بھی شائع ہوئے تھے۔

اس خادم کتاب وسنت نے ۲۳ مارچ ۱۹۸۷ء کی شب کو اپنے محلے میں اہل حدیث کا تبلیغی جلسہ منعقد کیا، جس میں ان کے جگری دوست اور قریب ترین ساتھی علامہ احسان الٰہی ظہیر بہ طور مقرر شریک تھے۔ جلسے میں کسی بدبخت نے بم پھینکا اور وہ اپنے دس ساتھیوں سمیت جام شہادت نوش کر گئے۔ اس طرح افسوس ہے ان کا تصنیفی منصوبہ پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکا۔

میں نہیں کہہ سکتا کہ میری یہ ادنیٰ کاوش جو ''قافلہ حدیث'' کے نام سے قارئین کے پیش نگاہ ہے، قدوسی شہید کے قائم کردہ منصوبے اور ذوقِ تحقیق سے ہم آہنگ ہے یا نہیں، تاہم میں اسے ان کے نام منسوب کرتا ہوں اور دعا گو ہوں۔

خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

محمد اسحاق بھٹی

فہرست

مرحومین بہ ترتیب تاریخ وفات

موجودین

بہ ترتیب تاریخ ولادت

حرفِ آغاز

''قافلہ حدیث''۔۔۔۔ان اصحاب علم وقلم کا تذکرہ ہے کہ جن کے شب و روز قال اللہ و قال الرسول کی صدائیں بلند کرتے ہوئے گزرے ہیں۔ان میں سے اکثر لوگ حیات فانی سے حیات جاودانی کا مرحلہ طے کر چکے ہیں۔اہل علم و دانش کے اس گلدستے کو محترم جناب محمد اسحاق بھٹی نے ترتیب دیا ہے۔الحمدللہ اس سے قبل ہم ''نقوش عظمت رفتہ'' اور ''بزم ارجمنداں'' کے نام سے ان کی دو تصنیفات قارئین کے سامنے پیش کر چکے ہیں۔

جناب بھٹی صاحب شخصیت نگاری کے میدان کے پرانے شناور ہیں۔پڑھے لکھے لوگ ان کے کام سے بخوبی آشنا ہیں۔برصغیر پاک و ہند کے علمی حلقوں میں انھیں خاص مقام حاصل ہے۔جہاں بھی اردو زبان بولی اور پڑھی جاتی ہے' بلاشبہ وہاں بھٹی صاحب کے محب ان کی تحریروں کے انتظار میں ہوتے ہیں۔ہمسایہ ملک ہندوستان میں بھی ان کی بعض کتب شائع ہو چکی ہیں۔وہاں بھی بھٹی صاحب سے محبت کرنے والے موجود ہیں۔یہی وجہ ہے کہ ''قافلہ حدیث'' کے لائق تکریم شرکا میں سے چار شخصیات کا تعلق ہندوستان سے ہے۔جن میں مولانا شمس الحق سلفی' جناب عزیر شمس' جناب ڈاکٹر محمد لقمان سلفی اور جناب ڈاکٹر وصی اللہ شامل ہیں۔ان میں جناب عزیر شمس محترم بھٹی صاحب سے پرانے ملنے والے ہیں۔جب کہ ڈاکٹر محمد لقمان سلفی اور ڈاکٹر وصی اللہ کی ملاقات بھٹی صاحب سے سفر حج کے دوران (مارچ ۲۰۰۰ء) ہوئی۔ان محترم شخصیات کی ''قافلہ حدیث'' میں

شمولیت سے اس کتاب میں اہل ہند کی دلچسپی میں یقیناً اضافہ ہوگا۔

امید ہے محترم بھٹی صاحب کی یہ کتاب بھی ان کے سابقہ شخصیاتی مجموعوں کی طرح مقبول عام ہوگی اور ان کے چاہنے والے "ھل من مزید" کے آرزو مند ہوں گے۔ یہاں ایک مرتبہ پھر محترم بھٹی صاحب کی وسیع القلبی اور وسعت ظرفی کا ذکر بے جا نہ ہوگا کہ ان کا آئندہ شائع ہونے والا مجموعہ مختلف مسالک اور مختلف ذہن و فکر کی حامل شخصیات کے تذکرے پر مشتمل ہے اور اس کا نام انھوں نے ''محفل دانش منداں'' تجویز کیا ہے۔ دیکھیے کون کون سی لائق احترام شخصیات کی ''دانش وری'' پر محترم بھٹی صاحب مہر تصدیق ثبت کرتے ہیں۔

اکابر علما اہل حدیث سے محبت ہمیں ورثے میں ملی ہے۔ ہمارے والد محترم جناب مولانا عبدالخالق قدوسی شہیدؒ کا تاریخ اہل حدیث سے خاص تعلق تھا۔ مطالعۂ کتب ان کا اوڑھنا بچھونا تھا۔ اہل حدیث کی چودہ سو سالہ تاریخ پر ان کی گہری نظر تھی۔ بچپن ہی سے علمائے اہل حدیث کے کارہائے نمایاں سے ہمارے کان آشنا ہوگئے تھے۔ والد گرامی ہی کی تربیت کا نتیجہ ہے کہ محترم بھٹی صاحب کی تصنیفات ہم قارئین کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں۔ ان شاء اللہ آئندہ بھی یہ سلسلہ جاری رہے گا اور علما اہل حدیث کا تعارف اور ان کی خدمات کے تذکرے شائع ہوتے رہیں گے۔

ابوبکر قدوسی

۱۷-دسمبر ۲۰۰۲ء

حرفے چند

رجال کے سلسلے میں اس سے قبل خوانندگانِ ذی اکرام نے ''نقوش عظمت رفتہ'' کا مطالعہ کیا' جس میں اہل حدیث، دیو بندی اور بریلوی علما ایک خاص مرتب شکل میں پورے وقار کے ساتھ موجود ہیں۔ مختلف سیاسی جماعتوں کے بعض رہنما اور حلقہ صحافت کے چند ارکان بھی اس میں نمایاں شان سے دکھائی دیتے ہیں۔ ایک سکھ دوست بھی اپنی پوری آن بان کے ساتھ براجمان ہیں۔

اس کے بعد ''بزم ارجمنداں'' آراستہ کی گئی' اس میں بھی اہل حدیث اور دیو بندی و بریلوی حضرات تشریف فرما ہیں۔ ایک شیعہ مجتہد بھی اپنے مروجہ طریقے کے مطابق اس میں مجلس پڑھتے نظر آ رہے ہیں۔ سیاسی قائدین اور صحافی بھی اس میں موجود ہیں۔

پھر ''کاروان سلف'' آیا جو بہ صورت عنوان مستقل حیثیت سے تو صرف اہل حدیث پر مشتمل ہے' لیکن ضمناً اس میں بھی دوسرے بزرگوں کو مختلف مقامات پر مناسب نمائندگی دی گئی ہے۔ اس باب میں بحمد اللہ ہمارا سینہ کھلا اور ظرف وسیع ہے۔ نہ ہم ہٹو بچو کے قائل ہیں' نہ اونچ نیچ کے---! ہمارے پاس کوئی ایسا پیمانہ نہیں' جس سے لوگوں کے اسلام کی پیمائش کریں کہ کس کا اسلام بڑا ہے اور کس کا چھوٹا۔ نہ ہمارے پاس کوئی ایسی ترازو ہے' جس سے کسی شخص کے اسلام کو تولنا شروع کر دیں۔ ہم بے حد گنہگار ہیں اور اللہ تعالیٰ سے مغفرت کے طالب---!

اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے' رجال کے اِن تینوں مجموعوں کو اہل علم نے توقع سے کہیں زیادہ پذیرائی کا مستحق گردانا۔

اب یہ روداد شوق انگیز "قافلہ حدیث" کے نام سے نذرِ قارئین ہے۔ ترتیب عنوانات کی رو سے ظاہری طور پر یہ روداد چھبیس اصحاب فضل کی نشان دہی کرتی ہے' لیکن اس کے باطن میں جھانکنے کی کوشش کریں تو معلوم ہوگا کہ اس میں اہل علم کی ایک دنیا آباد ہے۔ یعنی ان چھبیس کے اسلاف' اساتذہ' تلامذہ' متاثرین' فیض یافتگان' ہم مکتب' ہم جماعت' دوست احباب اور مستفیدین کی متعدد قطاریں ہیں جو تاحد نگاہ دکھائی دیتی ہیں۔ بہ الفاظ دیگر ایک شخص کے حالات میں کئی اشخاص کے حالات کی تہیں کھلتی گئی ہیں اور ایک دوسرے کے ساتھ پیوستہ یہ سلسلہ دور تک چلا گیا ہے۔

یہ کتاب اہل حدیث اصحاب علم کی تگ وتازِ نوع بنوع کو اجاگر کرتی ہے اور بتاتی ہے کہ ان میں سے کس کس بزرگ نے کیا کیا معرکہ آرائیاں کیں اور ان کے فکر وعمل کے حدود نے کس انداز سے کہاں تک وسعت اختیار کی۔ تصنیف وتالیف میں یہ حضرات کہاں تک پہنچے' تحقیق وکاوش کی کن کن وادیوں میں قدم زن ہوئے' درس وتدریس میں کہاں تک رسائی حاصل کی اور وعظ وتبلیغ کے میدانوں میں انہوں نے کیا اثرات چھوڑے۔

یہ "قافلہ حدیث" آپ کی نظروں کے سامنے سے گزر رہا ہے۔ اس قافلے کے معزز ارکان کو آپ دیکھ رہے ہیں کہ ان میں مرحومین بھی شامل ہیں اور موجودین بھی-! پاکستانی بھی ہیں اور ہندوستانی بھی-!! اس فقیر نے اپنے ناتواں قلم اور کم زور الفاظ میں اپنی دانست میں ان سب کے متعلق کامل احترام کے ساتھ گزارشات پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ البتہ ہوا ہے کہ حالات کی دست یابی اور عمل وحرکت کی کمی بیشی کے پیش نظر کسی صاحب کا تذکرہ کچھ زیادہ صفحات لے گیا ہے اور کسی کے واقعات حیات کم جگہ میں سما گئے ہیں۔ ایسا ہونا قدرتی بات ہے اور ہمیشہ سے ہر موضوع میں یہ ہوتا آیا ہے۔

اس کتاب میں چند حضرات وہ ہیں جو باپ بیٹا دونوں شامل ہیں اور وہ حضرات مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ حضرت حافظ عبداللہ بڈھیمالوی اور ان کے فرزند گرامی حافظ محمد شاکر۔

۲۔ مولانا محی الدین لکھوی اور ان کے بیٹے حافظ محمد لکھوی۔

۳۔ مولانا محمد یوسف اور ان کے صاحب زادے مولانا عبداللہ سلیم۔

۴۔ مولانا شمس الحق سلفی اور ان کے لائق فرزند مولانا محمد عزیر شمس۔

کتاب کے مندرجات کی ترتیب یہ ہے کہ مرحومین کا تذکرہ ان کے سنین وفات کی رو سے کیا گیا ہے یعنی جن صاحب کا پہلے انتقال ہوا' ان کا پہلے اور جن کا بعد میں ہوا' ان کا بعد میں۔

موجودین کے تذکرے میں تاریخ ولادت کو پیش نگاہ رکھا گیا ہے یعنی جن کی ولادت پہلے ہوئی' ان کا ذکر پہلے اور جن کی بعد میں ہوئی ان کا بعد میں۔

اس کتاب کے بعد ان شاء اللہ ''محفل دانشمنداں'' سجائی جائے گی۔

یہاں یہ بھی عرض کر دیں کہ اس فقیر نے اپنی معلومات کے مطابق پنجاب کے چار خاندانوں کی تقریباً تمام علمی شخصیتوں کا تذکرہ قلم بند کر دیا ہے اور وہ خاندان مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ غزنوی خاندان کے اولین بزرگ حضرت سید عبداللہ غزنوی کے ان کے صاحب زادوں سمیت فقہائے پاک و ہند کی تیرھویں صدی ہجری کی تیسری جلد میں مفصل حالات بیان کر دیے گئے ہیں۔ ''نقوش عظمت رفتہ'' میں حضرت مولانا سید محمد داؤد غزنوی کے اور زیر مطالعہ کتاب ''قافلہ حدیث'' میں ان کے صاحب زادے سید ابوبکر غزنوی کے واقعات معرض تحریر میں آ گئے ہیں۔ مولانا سید اسماعیل غزنوی اور بعض دیگر بزرگوں کا تذکرہ ان شاء اللہ ''محفل دانشمنداں'' میں آ جائے گا۔

۲۔ لکھوی خاندان کے جد اعلیٰ حضرت حافظ بارک اللہ لکھوی کے حالات فقہائے پاک و ہند کی تیرھویں صدی ہجری کی دوسری جلد میں آ گئے ہیں' ان کے صاحب زادے حضرت حافظ محمد لکھوی کا تذکرہ پنجاب یونیورسٹی کے اردو دائرہ معارف اسلامیہ میں لکھا گیا ہے اور مولانا محمد علی لکھوی اور مولانا معین الدین لکھوی کے حالات ''بزم ارجمنداں''

میں بیان ہو چکے ہیں اور ''قافلہ حدیث'' میں مولانا محی الدین لکھوی اور ان کے صاحب زادے حافظ محمد لکھوی کا تذکرہ آ گیا ہے۔

۳۔ روپڑی خاندان کے بزرگوں میں حضرت حافظ عبداللہ روپڑی کے حالات ''بزم ارجمنداں'' میں اور مولانا حافظ محمد حسین روپڑی' حافظ عبدالرحمٰن روپڑی اور حافظ عبدالقادر روپڑی کے حالات ''قافلہ حدیث'' میں مرقوم ہیں۔

۴۔ قصوری خاندان کے حالات میں مستقل کتاب بنام ''قصوری خاندان'' تصنیف کی جا چکی ہے۔ اس طرح اس فقیر نے پنجاب کے اہل حدیث کے ان چاروں خاندانوں کے اہل علم کے حالات بحمد اللہ رقم کر دیے ہیں۔

''محفل دانشمنداں'' مشترکہ کھاتا ہے۔ اس میں اہل حدیث بھی شامل ہیں اور غیر اہل حدیث بھی۔ اس کا زیادہ تر حصہ لکھ لیا گیا ہے اور کمپوزنگ کے مرحلے سے گزر رہا ہے۔

اس کے علاوہ چند کتابیں اور ہیں' جن میں سے بعض تکمیل کی منزل کو پہنچ گئی ہیں اور بعض پہنچنے والی ہیں۔ اختصار کے ساتھ اس کی تفصیل یہ ہے۔

۱۔ برصغیر میں اہل حدیث: اس کی پہلی جلد کمپوز ہو چکی ہے' اس جلد میں اہل حدیث کی برصغیر میں آمد اور آثار و اثرات کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ بعض ارباب تکریم حضرات فرمایا کرتے ہیں کہ اہل حدیث ایک نیا فرقہ ہے اور برصغیر میں اس کی عمر ڈیڑھ دو سو سال سے زیادہ نہیں' ان کے اس فرمان کا دلائل و حقائق کی رو سے جواب دیا گیا ہے۔

۲۔ اس کی دوسری جلد کا تعلق اہل حدیث کی ان سرگرمیوں سے ہے جو انھوں نے برصغیر میں قرآن مجید کی تفسیر اور ترجمے سے متعلق سرانجام دیں' وہ پورے قرآن کی ہیں یا اس کے چند خاص حصوں کی یا کسی سورت کی۔ عربی میں ہیں' فارسی میں ہیں' اردو میں ہیں' سندھی میں ہیں' پنجابی میں ہیں یا بنگلہ زبان میں۔ نثر میں ہیں یا نظم میں۔ مفسر اور مترجم کے مختصر حالات بھی بیان کیے گئے ہیں اور بطور نمونے کے ان کے تحریر فرمودہ اہم نکات کا تذکرہ بھی کیا گیا ہے۔ میں نے ان تراجم اور تفاسیر کو حاصل کر کے خود دیکھنے اور پڑھنے

کی کوشش کی ہے۔ بحمداللہ اس کتاب کا زیادہ تر حصہ مکمل ہو چکا ہے --- اس سے آگے بہ شرط صحت وزندگی ان شاء اللہ یہ سلسلہ چلے گا اور اہل حدیث حضرات نے جن شعبوں میں تگ وتاز کی ہے' اس کا تذکرہ کیا جائے گا اور ان کے آثار واثرات کی وضاحت کی جائے گی۔

۳۔ صوفی عبداللہ مرحوم ومغفور بانی دار العلوم تعلیم الاسلام اوڈاں والا اور ماموں کانجن کی سوانح بھی اللہ کے فضل سے تقریباً مکمل ہو چکی ہے' صرف ایک باب باقی ہے۔

۴۔ حضرت علامہ قاضی محمد سلیمان سلمان منصور پوری رحمۃ اللہ علیہ کی سیرت بھی تکمیل کے قریب ہے۔

۵۔ میاں عبدالعزیز مالواڈہ بارایٹ لا بہت بڑے قانون دان اور سیاسی رہنما تھے۔ ہندوستان کے تمام سیاسی رہنماؤں سے ان کے تعلقات تھے' ان کے گھر میں تیس بتیس ہزار خطوط ہیں جو مختلف سیاسی اور مذہبی جماعتوں کے اکابر واصاغر نے ان کو بھیجے' جن میں محمد علی جناح' گاندھی' ڈاکٹر مختار احمد انصاری' مولانا ابوالکلام آزاد' حکیم اجمل خاں' لیاقت علی خاں' ظفر علی خاں' مولانا ثناء اللہ امرتسری' محمد علی جوہر اور دوسرے بہت سے رہنما شامل ہیں۔ میاں صاحب مسلکاً اہل حدیث تھے۔ وہ ۱۹۔ اگست ۱۸۷۲ء کو پیدا اور ۲۸ جولائی ۱۹۷۱ کو فوت ہوئے' ان کا جنازہ حضرت مولانا عطاء اللہ حنیف نے پڑھایا تھا۔ انھوں نے ہر اعتبار سے بھرپور زندگی بسر کی اور ۹۹ برس عمر پائی۔ ان کے حالات مختلف دائروں میں پھیلے ہوئے ہیں۔ میں نے کافی عرصہ پیشتر ''برصغیر کی تحریک آزادی کے سو سال'' کے نام سے ان کے حالات لکھے تھے جو ساڑھے پانچ سو صفحات پر مشتمل ہیں۔ کتاب کی کمپوزنگ ہو چکی ہے۔ ان شاء اللہ جلد شائع ہو گی۔

اس طرح بعض اور کتابیں بھی لکھنا چاہتا ہوں۔ اب کچھ مدت سے برصغیر میں جماعت اہل حدیث کی تاریخ اور ان کی خدمات کے مختلف پہلوؤں کو ضبط کتابت میں لانے کی طرف توجہ مبذول ہے۔ جی چاہتا ہے' یہ کام کسی نہ کسی طرح مکمل ہو جائے۔

تنہا کام کرتا ہوں' اس لیے اہم واقعات کے سلسلے میں کتابوں کے حصول' ان کی

ورق گردانی اور حوالوں کی تلاش میں بہت وقت خرچ ہو جاتا ہے۔

اگر اللہ تعالیٰ کی مدد شامل حال رہی، حالات نے رفاقت کی اور قارئین کرام حوصلہ افزائی کرتے رہے تو ان شاء اللہ یہ اہم منصوبہ تکمیل کی منزل کو پہنچ جائے گا۔ وما ذلك على الله بعزيز

بندہ عاجز
محمد اسحاق بھٹی
اسلامیہ کالونی۔ ساندہ، لاہور

۲۸۔ رمضان المبارک ۱۴۲۲ھ
۱۴۔ دسمبر ۲۰۰۱ء
بروز جمعۃ الوداع

❀❀❀

مولانا سید امیر علی ملیح آبادی

(وفات ۱۹۱۹ء)

مولانا سید امیر علی ملیح آبادی متحدہ ہندوستان کے بہت بڑے عالم، بہت بڑے مفسر قرآن، بہت بڑے مدرس، بہت بڑے مصنف اور بہت بڑے مترجم تھے- ۱۲۷۴ھ (۱۸۵۸ء) کو ہندوستان کے صوبہ یوپی کے مشہور قصبے ملیح آباد میں پیدا ہوئے- والد کا نام سید معظم علی تھا- حسنی سادات میں سے تھے- ان کی ایک نہایت عالمانہ تصنیف "تفسیر مواہب الرحمٰن" ہے جو دس ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے- اردو زبان کی تفسیروں میں اسے بڑی اہمیت حاصل ہے- اس کا تذکرہ اس مضمون میں اختصار کے ساتھ کیا گیا ہے- ان کی دوسری بہت بڑی خدمت فتاویٰ عالم گیری کا اردو ترجمہ ہے- اصل فتاویٰ عربی میں ہے اور چھے جلدوں پر محیط ہے، جو ہندوستان کے مغل حکمران اورنگ زیب عالم گیر نے اپنے دور کے بہت سے علمائے کرام سے مرتب کرایا تھا- اس کے ایک حصے کا فارسی ترجمہ اس عہد کے ایک عالم ملا عبداللہ ترکی نے کیا تھا، جس کی ایک قلمی جلد پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں موجود ہے- اس کے اردو مترجم سید امیر علی ملیح آبادی نے اس پر تین سو صفحات کا طویل مقدمہ لکھا ہے، جس سے مترجم کی فضیلت علمی کا پتا چلتا ہے اور یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ ان کی معلومات کا دائرہ کس درجہ وسیع تھا اور مختلف موضوعات کی کتابوں پر ان کی نظر کس قدر گہری تھی- مقدمے میں انھوں نے تفصیل سے لکھا ہے کہ فتاویٰ عالم گیری کے مرتبین نے مختلف مسائل میں فتاویٰ وفقہ کی جن جن کتابوں کے حوالے دیے ہیں، ان کا درجہ کیا ہے اور وہ کس پایہ کی ہیں- ان میں سے کون سی کتابیں پایۂ اعتبار سے ساقط ہیں اور کون سی قابل اعتبار ہیں- یہ تمام قلمی کتابیں ہیں اور مترجم ان پر عمیق نگاہ رکھتے ہیں- یہ ان کے غیر معمولی مطالعہ اور انتہائی وسعت نظر کی دلیل ہے-

یہ ترجمہ ان سے منشی نول کشور نے کرایا تھا اور انہی کے مطبع نول کشور (لکھنؤ) سے پہلی دفعہ شائع ہوا تھا۔ اب ہمارے ہاں فتاویٰ عالم گیری کا اردو ترجمہ ہی متداول ہے' اصلی عربی کتاب کا جو بڑی بڑی چھے جلدوں پر مشتمل ہے' بہت کم لوگوں کو علم ہوگا۔ ترجمہ دس جلدوں کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔

حضرت مولانا سید امیر علی ملیح آبادی نے فقہ حنفی کی مشہور کتاب "ہدایہ" کا اردو ترجمہ عین الہدایہ کے نام سے کیا جو پہلی دفعہ چار جلدوں میں مطبع نول کشور لکھنؤ سے چھپا تھا۔

ان تصنیفات و تراجم کے علاوہ حافظ ابن حجر کی معروف تصنیف تقریب التہذیب پر حواشی لکھے۔ اصول فقہ کی کتاب التوضیح والتلویح کا حاشیہ لکھا۔ صحیح بخاری کا اردو ترجمہ کیا جو بہ صورت مسودہ ان کے گھر میں موجود تھا۔ المستدرک فی الرجال لکھی جس میں سنن اور صحاح کے راوی جمع کیے گئے ہیں اور بتایا گیا ہے کہ کون راوی ثقہ ہے اور کون ضعیف ہے۔ یہ بھی مسودہ تھا جو ان کی وفات کے وقت ان کے گھر میں محفوظ تھا۔

وہ بہت بڑے مدرس تھے۔ ان کی تدریسی سرگرمیاں مدرسہ عالیہ کلکتہ میں بھی جاری رہیں اور دارالعلوم ندوۃ العلما (لکھنؤ) میں بھی۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی کے والد گرامی سید عبدالحی حسنی نے جو اس وقت دارالعلوم کے ناظم تھے' ان سے سند حدیث لی تھی۔ دارالعلوم ندوۃ العلما میں وہ تین سال خدمت تدریس انجام دیتے رہے۔ یہیں ان کی وفات ہوئی۔ ان کے شاگردان گرامی کا حلقہ خاصا وسیع تھا اور جید اہل علم پر مشتمل' جن میں مولانا ابوالکلام آزاد کے رفیق خاص اور بہت سی کتابوں کے مصنف و مترجم مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی خاص طور سے قابل ذکر ہیں جو ان کے ہم وطن بھی تھے۔

۱۹۲۷ء میں "صبح سعادت" کے نام سے ایک سہ ماہی رسالہ الہلال بک ایجنسی فاروق گنج لاہور کے مالک و منتظم مولانا عبدالعزیز آفندی نے جاری کیا تھا۔ وہ مولانا ابوالکلام آزاد سے بہ درجہ غایت عقیدت رکھتے تھے۔ انھوں نے مولانا کی کئی کتابیں شائع کی تھیں۔ مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی سے بھی ان کے مراسم تھے۔ مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی سے انھوں نے امام ابن تیمیہ اور بعض دیگر ائمہ دین کی عربی کتابوں کے ترجمے

کرائے تھے جو الہلال بک ایجنسی کی طرف سے شائع ہوئے تھے۔ ''صبح سعادت'' میں بھی وہ مضامین لکھتے تھے۔ ایک مضمون انھوں نے اپنے استاذ مکرم مولانا سید امیر علی ملیح پر سپرد قلم کیا تھا جو ''صبح سعادت'' کے اپریل ۱۹۲۸ء کے شمارے میں چھپا تھا۔ مضمون نہایت جان دار اور بہت سی معلومات کو اپنے دامن صفحات میں لیے ہوئے ہے۔ فاضل مضمون نگار نے واضح الفاظ میں لکھا ہے کہ مولانا سید امیر علی ملیح آبادی اہل حدیث تھے اور حضرت میاں سید نذیر حسین دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد رشید تھے۔ یہ مضمون نایاب ہے' البتہ اس فقیر کے پاس محفوظ تھا جو اس کتاب میں درج کیا جا رہا ہے۔

مولانا سید امیر علی ملیح آبادی نے ۱۹۱۹ء (۱۳۳۷ھ) کو وفات پائی ---اب مضمون ملاحظہ فرمایے۔

دنیا بار بار انہی اشخاص کا تذکرہ دہراتی رہتی ہے جن کی عظمت کی قائل ہو چکی ہے۔ لیکن ''عظمت'' کیا چیز ہے؟ اس لفظ کا مفہوم کیا ہے؟ آج تک کوئی شخص بھی اس کا اطمینان بخش جواب نہیں دے سکا۔

سکندر' چنگیز' تیمور' نپولین' سقراط' ارسطو' ابن رشدؒ' ابن تیمیہؒ' گلیلو ' نیوٹن' ڈارون' ہومر' امرأ القیس' حافظ' شکسپیئر ' ہوگو وغیرہ وغیرہ تاریخی اشخاص ہیں۔ دنیا ان کی عظمت کے آگے جھکتی ہے' حالانکہ یہ تمام ایک ہی صف کے آدمی نہیں ہیں۔ بعض سفاک بادشاہ ہیں' بعض اہل علم ہیں' بعض شاعر ہیں' تاہم سب ''عظیم'' سمجھے جاتے ہیں۔ ان میں وہ قدر مشترک کیا ہے جسے ''عظمت'' کے لفظ سے تعبیر کیا گیا اور جس کی بنا پر یہ عظیم کہلائے؟

کیا عظمت کے معنی یہ ہیں کہ انسان میں ایسے کام کر دکھانے کی قوت ہو' جو عام لوگ کر نہ سکتے ہوں؟ لیکن تانتیا بھیل اور اس کے سے مشہور چور اور ڈاکو بھی اپنے کاموں سے لوگوں کو حیرت میں ڈال دیا کرتے تھے۔ کیا ان چوروں کی عظمت کا بھی کوئی قائل ہے؟ کیا عظمت' شہرت کا نام ہے؟ چارلی چیپلن دنیا بھر میں مشہور ہے' مگر کتنے آدمی اس کی عظمت کے معترف ہیں؟ علما و فلاسفہ نے عظمت کی تعریف متعین کرنے کی بہت کوشش کی ہے۔ حسن کی طرح عظمت بھی من جملہ ان چند لفظوں کے ایک ہے جن کا مبہم مفہوم' ہر دل میں موجود

ہے' مگر کوئی زبان بھی اسے بیان نہیں کر سکتی۔ جس دن عظمت کا مفہوم زبان یا قلم سے بیان کر دیا جائے گا' اسی دن سے یہ لفظ اپنی طلسمی تاثیر سے محروم ہو جائے گا۔ پھر نہ عظمت باقی رہے گی نہ عظیم باقی رہیں گے۔

یہ تمہید ہم نے بے فائدہ نہیں اٹھائی۔ یہ ان سوالوں کا جواب ہے جو اس مضمون کا عنوان دیکھ کر بعض ذہنوں میں پیدا ہو سکتے ہیں۔

مولانا سید امیر علی مرحوم نہ کسی ملک کے بادشاہ تھے' نہ کسی قلعے کے فاتح تھے' نہ کوئی دولت رکھتے تھے۔ وہ ایک غریب آدمی تھے۔ ایک چھوٹے سے قصبے کے باشندے تھے۔ ایک مطبع میں کم تنخواہ ملازم تھے۔ ایک مدرسے کے معلم تھے۔ اتنے کم مشہور تھے کہ ہندوستان کے بہ مشکل دس مشہور آدمیوں نے ان کا نام سنا ہوگا۔ تاہم وہ عظیم تھے۔ اپنے اندر وہ چیز رکھتے تھے جسے عظمت کے مبہم لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہی عظمت آج ہمیں ان کے تذکرے پر مجبور کر رہی ہے۔ مشاہیر کے تذکرے بار بار ہو چکے اور ہمیشہ ہوتے رہیں گے۔ آج ایک گم نام کا بھی تذکرہ سن لیجیے۔ امید نہیں پھر کبھی کوئی اس کا ذکر کرے۔

ابتدائی حالات:

ضلع لکھنؤ میں قصبہ' ملیح آباد' اپنے باشندوں کی جہالت اور جنگ جوئی کی وجہ سے ہندوستان بھر میں کافی شہرت رکھتا ہے۔ مولانا امیر علی مرحوم اسی قصبے میں پیدا ہوئے اور عمر کے اولین سال وہیں گزارے۔

یہ قوم کے سید تھے۔ ان کا خاندان بہت غریب تھا۔ اس لیے ان کی تعلیم و تربیت کا مناسب انتظام نہ کر سکا۔ ان کے والدین کو کسی بزرگ عبدالرزاق نامی نے ولد صالح کی بشارت دی تھی۔ جب یہ پیدا ہوئے تو اسی بزرگ کے نام پر تبرکاً ان کا نام بھی ''عبدالرزاق'' رکھ دیا گیا۔ مگر چوں کہ خاندان میں اس طرز کا کوئی نام نہ تھا' اس لیے خاندانی ناموں کے وزن پر لوگ انھیں ''امیر علی'' کہنے لگے اور بالآخر یہی نام پڑ گیا۔

پوسٹ ماسٹر:

ملیح آباد کے اردو مدرسے میں انھوں نے تعلیم پائی۔ فارغ ہونے سے پہلے ہی

ملازمت پر مجبور ہوئے اور بہرائچ کے کسی ڈاک خانے کے پوسٹ ماسٹر مقرر ہو گئے۔ مولانا مرحوم نے مجھ سے بیان کیا کہ اس وقت ان کی عمر ۱۸۔۱۹ برس کی تھی۔ انگریزی بالکل نہیں جانتے تھے۔ جب اس ملازمت پر مقرر ہونے لگے تو انگریزی کا سوال پیدا ہوا۔ مگر انھوں نے صرف تین دن کے اندر اتنی انگریزی سیکھ لی کہ بے تکلف خطوط کے پتے پڑھنے اور لکھنے لگے۔ چند روز کام کرنے کے بعد ڈاک خانے کی جملہ خدمتیں بہ خوبی انجام دینے لگے۔ بالا دست اور زیردست' سب ان کے کام سے خوش تھے۔ یہی باعث ہے کہ چند ماہ بعد ان کی تنخواہ میں اضافہ ہو گیا۔

علم دین کی طلب:

اب تک یہ ایک اردو دان منشی تھے۔ علم دین سے بالکل بے بہرہ تھے۔ تاہم صوم وصلوٰۃ کے بہت پابند تھے۔ ایک دن ایسا اتفاق پیش آیا کہ جس وقت یہ نماز پڑھنے مسجد گئے ہوئے تھے' کوئی افسر ڈاک خانہ دیکھنے آ پہنچا۔ پوسٹ ماسٹر کو غیر حاضر پا کر بہت ناخوش ہوا۔ کسی ڈاکیے نے دوڑ کر انھیں مسجد میں خبر دی۔ یہ وضو کر رہے تھے' مگر انھوں نے کوئی پروا نہیں کی۔ اطمینان سے نماز ختم کر کے واپس آئے۔ افسر نے اعتراض کیا' انھوں نے معذرت بھی نہیں کی بلکہ استعفا داخل کر کے ملازمت سے علیحدہ ہو گئے۔

مولانا فرماتے تھے' اس واقعہ کا مجھ پر بڑا اثر پڑا۔ میرا خاندان اگرچہ غربت میں مبتلا تھا' تاہم ملازمت چھوٹنے اور ذریعہ رزق سے محروم ہو جانے پر کوئی افسوس نہیں ہوا۔ البتہ یہ خیال کر کے میری حسرت بے حساب تھی کہ جس دین کی پابندی پر میری نوکری گئی' اس سے بالکل جاہل ہوں۔ ٹکریں لگانا جانتا ہوں' مگر نماز کی حقیقت اور قرآن کے فہم سے بے بہرہ ہوں۔

اس خیال نے انھیں عربی اور دینی علوم کی تحصیل پر آمادہ کیا۔ سب سے پہلے چریاکوٹ (علی گڑھ) میں اس عہد کے مشہور عالم مولانا فاروق مرحوم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ مولانا فاروق' علامہ شبلی نعمانی اور بہت سے دوسرے مشاہیر علما کے استاد تھے۔ مگر یہاں کا ڈھنگ نرالا تھا۔ مولانا ہفتوں درس نہیں دیتے تھے۔ طالب علم بیٹھے پاؤں دابا

کرتے تھے اور مولانا ایک عالم کیف میں پڑے رہتے تھے۔

مولانا فاروق کو پاؤں دبوانے کی بہت عادت تھی اور وہ اپنے کسی شاگرد کو بھی اس خدمت سے معاف نہیں رکھتے تھے۔ خود میں نے ایک مرتبہ علامہ شبلیؒ صاحب مرحوم کو اس شہرت و منزلت کے عالم میں مولانا کے پاؤں داب تے دیکھا

نوجوان امیر علی کو علم کی تشنگی اتنی زیادہ تھی کہ اس لیت و لعل میں پڑے نہیں رہ سکتے تھے۔ فوراً علی گڑھ سے لاہور پہنچے۔ یہاں بھی کوئی صورت پیدا نہ ہوئی۔ آگرہ چلے گئے اور وہاں سے دہلی وارد ہوئے۔ اس وقت دہلی میں مولانا میاں سید نذیر حسین صاحب مرحوم شیخ الحدیث کا چشمۂ فیض جاری تھا۔ سید امیر علی ان کی خدمت میں پہنچے، مگر یہاں یہ مشکل پیش آئی کہ عربی زبان سے یہ بالکل ناواقف تھے، درس حدیث میں بیٹھ نہیں سکتے تھے۔

لیکن اصحاب ہمت کے سامنے کوئی مشکل، مشکل نہیں ہوتی۔ سید امیر علی نے صرف و نحو وغیرہ علوم الٰہیہ کی تحصیل شروع کر دی۔ خود فرماتے تھے صرف نو مہینے میں یہ علوم ختم ہو گئے۔ ان کے درس میں ایک مولانا عبدالحلیم شرر لکھنوی بھی تھے۔

مولانا مرحوم کسی کے حق میں زبان نہیں کھولتے تھے۔ لیکن ایک دن "یحسبون انهم یحسنون صنعا" کی تفسیر میں بے اختیار ان کی زبان سے نکل گیا "بعض لوگوں کی حالت کس درجہ قابل رحم ہے، حدیث کی تکمیل کر کے ناول نگاری میں عمر صرف کر دی اور سمجھتے ہیں کہ بہت اچھا کام کر رہے ہیں!"

یہ کہتے کہتے اچانک چپ ہو گئے۔ شاید یاد آ گیا کہ مذمت و غیبت ہو رہی ہے۔ میں نے بالکل خلاف عادت ان کی زبان سے یہ تصریح سن کر پوچھا: وہ کون لوگ ہیں؟ دیر تک سر جھکائے بیٹھے رہے، مگر طبیعت میں مروت بہت تھی۔ جواب دینا پڑا۔ بہت آہستہ سے کہنے لگے: عبدالحلیم شرر، خدا انھیں معاف کرے! میاں صاحب (یعنی مولانا نذیر حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ) سے انھوں نے میرے ساتھ حدیث سنی۔ اب ناول لکھتے ہیں!"

میں نے عرض کیا "حضرت کے خیال میں ناول نویسی بری بات ہے؟"

فرمانے لگے "شاید نہیں، مگر شغلِ حدیث، اولیٰ و احسن ہے۔"

مطبع نول کشور میں ملازمت:

کل چار سال میں جملہ علوم عربیہ و دینیہ سے فراغت حاصل کر لی۔ نیز علم طب کی بھی تکمیل ہو گئی۔

لکھنؤ واپس آئے تو یہاں منشی نول کشور جیسا مردم شناس موجود تھا۔ منشی صاحب نے مولانا کو دیکھتے ہی درخواست کی کہ ان کے مطبع کی ملازمت قبول کر لیں۔ خود ہی پچاس روپیہ ماہوار تنخواہ مقرر کر دی۔ آپ کام پر جانے لگے۔ مگر منشی صاحب بہت ہوشیار تھے۔ وہ جان گئے تھے یہ جوہر پکھا ور ہی ہے۔ ان سے خواہش کی کہ آپ مطبع میں آنے کی زحمت نہ کریں۔ مکان ہی پر کام کیا کریں۔ اسی قدر نہیں بلکہ روز پینے کو تمبا کو بھی بھیج دیتے تھے' کیونکہ مولانا کو حقے سے بہت رغبت تھی۔

ایک دن میں نے سوال کیا ''آپ کی عمر کیا ہے؟'' یہ وفات سے ایک برس پہلی کی بات ہے۔ بہت نحیف تھے اور بوڑھے معلوم ہوتے تھے۔ فرمانے لگے ''۵۰ یا ۵۱ سال۔ مگر نول کشور نے مجھے بوڑھا کر دیا۔ انھوں نے مجھے گھر میں کام کرنے کو کہا۔ میں اس خیال سے کہ کہیں وہ کام' کم نہ سمجھیں' بہت محنت کیا کرتا تھا' نتیجہ یہ ہوا کہ صحت بگڑ گئی۔ اب جو حال ہے' دیکھ رہے ہو۔

تمبا کو نوشی کی مناسبت سے ایک واقعہ یاد آ گیا۔ مولانا حکیم سید عبدالحی صاحب مرحوم سابق ناظم ندوۃ العلما (لکھنؤ) بیان کرتے تھے کہ میں مولانا امیر علی صاحب سے پڑھنے جایا کرتا تھا۔ چلتے وقت وہ ایک دو پیسے دے دیتے تھے اور میں کوئلے خرید کر اپنے کرتے میں لے جایا کرتا تھا۔ وہ اسے گوارا کر لیا کرتے تھے۔ لیکن ایک دن میں چلم لے کر آگ چڑھانے جانے لگا تو مولانا نے فوراً منع کیا ''تم سید ہو' حقہ نہ بھرو!''

لیکن یہ عجیب بات ہے کہ خود مولانا مرحوم نے کبھی اشارۃً بھی نہیں کہا کہ حکیم صاحب ان کے شاگرد ہیں۔ بلکہ الٹی ان کی تعظیم کرتے ہم نے دیکھا۔ کیونکہ آخر عمر میں مولانا ان کے ماتحت کی حیثیت سے تھے۔

نول کشور کی ملازمت کے زمانے میں مولانا نے بہت سی کتابوں کی تصحیح کی۔ متعدد

کتابیں ترجمہ کیں۔ فیضی کی تفسیر پر مقدمہ لکھا اور خود ایک نہایت ضخیم تفسیر مواہب الرحمٰن کے نام سے تالیف کی۔ یہ تفسیر بعض اعتبارات سے اردو میں بہترین تفسیر کہی جا سکتی ہے۔ نول کشور پریس سے ۳۲ روپیہ قیمت پر فروخت ہوتی ہے۔

ہجرت:

مدت تک کام کرنے کے بعد مولانا نے ملازمت سے استعفا دے دیا اور ہندوستان سے مکہ معظمہ کو ہجرت کرنے لگے۔ اکثر نہایت شکر گزاری کے ساتھ فرمایا کرتے تھے کہ منشی نول کشور نے چلتے وقت دو ہزار یا پانسو (میں بھولتا ہوں) بطور شکرانہ نذر کیے تھے۔ ایک مرتبہ میں نے جھنجلا کر کہا آپ بار بار یہ احسان کیوں یاد کرتے ہیں؟ اس شخص نے تو آپ کی پوری زندگی برباد کر ڈالی۔ ساری عمر آپ کو پچاس روپے دیتا رہا اور آپ کی محنت سے ہزاروں کماتا رہا۔ اس کا یہ احسان' ہرگز احسان نہیں ہے۔

یہ سن کر ان پر ایک عجیب کیفیت طاری ہو گئی' دیر تک سر جھکائے بیٹھے رہے۔ پھر بڑی سنجیدگی سے ایک معصومانہ لہجے میں کہنے لگے۔ ''منشی صاحب ایک شریف اور نیک دل آدمی تھے۔ ان کے احسان مجھ پر بہت ہیں۔ میری قابلیت کی جانچ کیے بغیر انھوں نے مجھے پچاس روپیہ پر نوکر رکھ لیا تھا۔ میں اس وقت تقریباً فاقے کرتا تھا!''

مکہ معظمہ کی آب و ہوا موافق نہ ہوئی۔ کچھ مدت بعد ہی بیمار پڑ گئے اور بڑا لڑکا بھی وہیں فوت ہو گیا۔ طبیبوں نے مشورہ دیا کہ آپ فوراً ہندوستان لوٹ جائیں ورنہ ہلاکت کا احتمال ہے۔ اس واقعہ پر اکثر رنج ظاہر کیا کرتے تھے۔

ایک دن فرمانے لگے ''نصاریٰ کی حکومت سے بے زار ہو کر جوارِ بیت اللہ میں پناہ ڈھونڈی' مگر خدا کی مشیت یہی تھی کہ وہاں رہ نہ سکوں!''

ایک دن اپنے مرحوم لڑکے کا ذکر کرنے لگے ''خدا کی حکمت کون سمجھ سکتا ہے؟ اس لڑکے کی خوب تعلیم و تربیت ہوئی تھی' مگر اٹھا لیا گیا۔ جس نے (یعنی دوسرے لڑکے نے) کچھ پڑھا نہیں وہ زندہ موجود ہے......''

حجاز سے واپس آ کر مطبع نول کشور میں کام کرنے لگے یہاں تک کہ پنشن مل گئی۔

دارالعلوم ندوہ میں:

غالباً ۱۹۱۵ء میں مولانا مرحوم' مدرسہ عالیہ کلکتہ کے صدر مدرس مقرر ہوئے- یہ عمر میں پہلا موقعہ تھا کہ کئی سو ماہوار تنخواہ گھر میں آنے لگی- شاید یہاں ترقی سال میں ۵۰۰ ماہوار تک پہنچ جاتی ہے- ایک کنبے والے غریب آدمی کے لیے بڑھاپے میں یہ رقم' نعمت غیر مترقبہ کہی جا سکتی ہے-

لیکن چند ہی ماہ بعد مولانا حکیم عبدالحی صاحب کا خط پہنچا کہ آپ دارالعلوم میں چلے آیئے اور درس حدیث شروع کر دیجیے- مولانا کا جواب کیا تھا؟ فوراً کمر بستہ ہو گئے- بعض بااثر عزیزوں نے سخت مخالفت کی' مگر انھوں نے ایک نہ سنی- کہنے لگے "زندگی" حدیث کے شوق میں گزری' اب اس کی خدمت کا موقعہ ملا ہے' جانے نہیں دیں گے-

چنانچہ دارالعلوم چلے آئے' حالانکہ یہاں زیادہ سے زیادہ تنخواہ ترقی کے بعد ۱۵۰ تک پہنچتی تھی-

میرا تلمذ:

اوائل ۱۹۱۷ء میں جب میں مصر سے واپس آیا تو تحصیل حدیث کی خواہش ہوئی- لکھنؤ کے مشہور بزرگ مولانا عین القضاۃ صاحب مرحوم نے ایک دن سوال کیا اب کیا ارادہ ہے؟ میں نے حدیث کی طرف رغبت ظاہر کی- ساتھ ہی مشورہ لیا کہ یہ علم مجھے کہاں حاصل کرنا چاہیے؟ ایک عالم صاحب مولانا ممدوح کی خدمت میں موجود تھے- انھوں نے فوراً کہا: "دیو بند میں-" پھر نہایت فصاحت سے بیان کرنے لگے کہ وہاں ایک محدث موجود ہیں- اپنے وقت کے ایک ہی ہیں' جو کہ فقہ حنفی کی حقانیت حدیث سے ثابت کرتے ہیں!

اس تصریح پر میں مسکرائے بغیر نہیں رہ سکتا تھا- بات یہ ہے کہ مصر سے واپس آنے کے بعد ہندوستان کا کوئی مولوی' نظر میں نہیں جچتا تھا- میں تقریباً نا امید تھا کہ کوئی محدث یہاں نہیں ملے گا' تاہم مجھے کسی نہ کسی مدرسے میں داخل ہونا ضرور تھا- کیونکہ وہ زمانہ جنگ کا تھا- حکومت نظر بند کرنے پر تلی ہوئی تھی- صرف اس شرط پر رہائی ملی تھی کہ کسی عربی مدرسے میں داخل ہو جاؤں-

مجبوراً دار العلوم ندوہ کا رخ کیا۔ مولانا امیر علی صاحب مدرسے کے مہتمم تھے۔ داخلے سے پہلے میں ابتدائی گفتگو کے لیے ان کے مکان پر گیا۔ مجھے یقین تھا کسی دقیانوسی مولوی سے ملوں گا، بے تکی گفتگو سنوں گا۔

لیکن مولانا کی صورت دیکھتے ہی میری حیرت کی کوئی حد نہ رہی۔ میں نے ہندوستان اور بلادِ اسلامیہ کے بہت سے اجلہ علما کی زیارت کی ہے۔ بعض مشاہیر کی خدمت میں رہا بھی ہوں، لیکن سچ کہتا ہوں کہ مولانا محمود حسن صاحب مرحوم اور مولانا حافظ عبداللہ صاحب مرحوم غازی پوری کو مستثنیٰ کر دینے کے بعد آج تک کسی شخصیت نے اتنا متاثر نہیں کیا جتنا مولانا امیر علی صاحب کی شخصیت نے کیا تھا۔

حلیہ:

میں نے ایک سن رسیدہ بزرگ اپنے سامنے دیکھا۔ چھریرا بدن، کسی قدر دراز قد، اعضا متناسب، رنگ گندمی، پتلا مگر بھرا ہوا چہرہ، گول داڑھی، نہ بہت چھوٹی، نہ بہت بڑی، نہ بہت گھنی، نہ بہت ہلکی۔ سر پر سنت کے مطابق کان کی لو تک لمبے اور خوب گھنے بال۔ سر اور داڑھی کے بال وسمہ اور مہندی کے مخلوط بھورے خضاب سے رنگے ہوئے۔ نہایت خوب صورت نقرئی فریم کی عینک، آنکھوں پر لگائے ہوئے۔ لباس از حد پاکیزہ، غرارے دار پائجامہ، لمبے دامنوں کی اچکن، سر پر مراد آبادی وضع کی دفتی والی ٹوپی۔ وارنش کیا ہوا خوب صاف پمپ جوتا پہنے ہوئے تھے۔ جوانی میں خوب صورت آدمی ہوں گے، اس بڑھاپے میں بھی کچھ عجب شان تھی۔ مجموعی طور پر ان کی صورت اور ہیئت ویسی تھی، جیسی بعض حدیثوں میں مومنین صادقین کی بتائی گئی ہے کہ انھیں دیکھ کر خدا یاد آ جاتا ہے۔ مولانا امیر علی صاحب کو جب میں نے دیکھا، خدا یاد آ گیا۔ تقویٰ وطہارت چہرے سے ٹپکی پڑتی تھی۔

میں دیکھتے ہی بہت مؤدب ہو گیا۔ مگر ان کا اخلاق بہت وسیع تھا۔ میں نے اپنی اطلاع کے پرزے پر لکھ دیا تھا کہ ایک طالب علم ہوں، دار العلوم میں پڑھنا چاہتا ہوں۔ مگر دار العلوم کا مہتمم ایک طالب علم سے کس طرح ملا؟ اس طرح کہ ایک ہاتھ مصافحہ کے لیے خالی تھا اور دوسرے میں خوشنما تھالی تھی، جس پر پان کی دو گلوریاں، تمباکو اور الائچیاں

رکھی تھیں- طالب علم کی تواضع کے لیے یہ سامان وہ اپنے ساتھ لائے تھے-

میں از حد متاثر ہوا- نہایت سنجیدہ ہو گیا- مگر انھوں نے بڑی خندہ پیشانی سے اس طرح گفتگو شروع کر دی گویا اپنے کسی دوست کو مخاطب کر رہے ہیں- وہ میرے ہم وطن تھے' مگر میں اس واقعہ سے بے خبر تھا- خود انھوں نے میرے خاندان سے اپنے خاندانی تعلقات بیان کیے اور وہ تمام احسان گنا ڈالے جو ان کے خیال میں میرے بزرگوں نے ان کے بزرگوں پر کیے تھے-

پھر علمی گفتگو شروع ہوئی- اب میری حیرت بے حساب تھی- کوئی موضوع نہ تھا' جس میں انھیں تبحر حاصل نہ ہو- حدیث' تفسیر' تاریخ' ادب' معقولات' ریاضی' جغرافیہ' علوم جدیدہ' سب ہی پر کچھ نہ کچھ گفتگو ہوئی- انھوں نے ایک ایک دو دو جملوں میں سب پر اظہار خیال کیا- یہ میرے لیے کافی تھا- میں ان کی علمیت کا قائل ہو گیا-

اخلاق:

انسان کا اخلاق بہ تدریج ہی ظاہر ہوتا ہے- ابتدائی صحبتوں میں ہر شاطر' مخاطب کو مسحور کرنے کی کوشش کرتا ہے' مگر رفاقت کے بعد حقیقت کھل جاتی ہے- ہم نے بہت آدمی دیکھے اور بہتوں کو اچھا سمجھا' مگر تجربے کے بعد بہت ہی کم آدمی اچھے ثابت ہوئے- ایسے تلخ تجربے ہوئے ہیں کہ قریب ہے خود انسانیت پر سے اعتماد اٹھ جائے- مگر مولانا امیر علی صاحب کے اخلاق نے قلب پر ایسا اثر کیا کہ اب تک تازہ ہے' بلکہ ہر نئے تلخ تجربے پر ان کی عظمت کا سکہ زیادہ بیٹھتا جاتا ہے- یہی باعث ہے کہ ہمیشہ انھیں یاد کرتے ہیں اور جب یاد کرتے ہیں' دل بے اختیار ہو جاتا ہے- سخت حسرت ہے کہ دنیا نے انھیں بالکل نہیں جانا ورنہ آج ناظرین یہ مضمون ویسی ہی پر نم آنکھوں سے پڑھتے جیسی پر نم آنکھیں اس وقت راقم حروف کی ہیں-

مسلسل دو سال تک ان کی صحبت میں رہنے کی سعادت نصیب ہوئی- افسوس' موت نے جلدی کی ورنہ یہ سعادت زیادہ طویل ہوتی- اس تمام مدت میں کوئی دن ایسا نہیں گزرا جس نے ان کی کوئی نہ کوئی خوبی ظاہر نہ کی ہو- وہ از حد شریف تھے- شیر خوار بچوں کی طرح

معصوم معلوم ہوتے تھے۔ کبھی کوئی سخت لفظ ان کی زبان سے نہیں سنا۔ وہ مدرسے کے مہتمم تھے۔ لڑکوں کی شرارت معلوم و مشہور ہے' خصوصاً دارالعلوم ندوہ کی حالت اس وقت بہت خراب تھی۔ مسلسل ہڑتالوں اور شورشوں نے طلبا کو بے لگام کر دیا تھا۔ مگر مولانا کے اخلاق نے زیادہ سے زیادہ شریر لڑکوں کو بھی مسخر کر لیا تھا۔ ان کے عہد میں مدرسہ نہایت انتظام اور سکون سے رہا۔

انھوں نے کبھی کسی لڑکے کو سزا نہیں دی۔ کسی کو ڈانٹا تک نہیں۔ اگر کوئی شرارت ہو جاتی تھی تو وہ خطا کار لڑکے کو بلا کر اپنے ساتھ بٹھاتے یا کھڑا کرتے اور پوری شفقت سے نصیحت کرتے تھے۔ یہ نصیحت بڑی سے بڑی سزا سے بھی زیادہ مؤثر ثابت ہوتی تھی۔

بہت سے لڑکے پڑھنے سے جی چراتے تھے۔ ہمیشہ کوئی نہ کوئی بیماری انھیں لگی رہتی تھی۔ جب چھٹی کے لیے ان کی درخواست پیش ہوتی' مولانا انھیں طلب کرتے' نبض دیکھتے' پھر مسکراتے۔ غور سے انھیں دیکھتے اور کہتے "بے شک بیمار ہو' نبض تیز ہے' جاؤ لیٹ رہو۔" بہتوں کی عیادت کو ان کے کمروں میں چلے جاتے۔ وہ بیمار ہوتے تو چار پائی پر نظر آتے۔ مولانا کو دیکھ کر ڈر جاتے تھے۔ مگر مولانا انھیں کچھ نہ کہتے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہتے "چلو پھرو نہیں' بیماری بڑھ جائے گی!"

ایک دن میں نے عرض کیا یہ شریر لڑکے ہیں' روز بہانے کرتے ہیں۔ آپ نبض دیکھ کر ان کی تصدیق کر دیتے ہیں اور وہ اپنے ساتھیوں میں جا کر قہقہے مارتے ہیں۔ اس پر مولانا مسکرانے لگے۔ پھر کہا "میں جانتا ہوں' یہ بچے ہیں۔ کبھی کھیلنا بھی چاہتے ہیں۔۔۔" لیکن ان کے اس برتاؤ نے تھوڑی ہی مدت میں ان سدا بیماروں کو اچھا کر دیا۔

لڑکوں کو قرض لینے کی عادت بہت ہوتی ہے' قرض کا سلسلہ ترقی کر کے خود مولانا تک پہنچ گیا تھا۔ انھیں تنخواہ ملی نہیں کہ لڑکے پہنچ گئے۔ اب کسی کو دو چاہیے' کسی کو چار' کسی کو چھ' مولانا "نہیں" کہہ نہیں سکتے تھے۔ ایک مرتبہ میں نے حساب لگایا تو معلوم ہوا ہر مہینے تقریباً آدھی تنخواہ لڑکے قرض لے جاتے ہیں۔ ادائیگی کا تو وہاں کوئی سوال ہی نہ تھا۔

مولانا کی حالت قابل رحم تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ اپنے عزیزوں سے بہت ڈرتے

ہیں- گھر میں پیسے پیسے کا حساب مانگا جاتا تھا- یہاں لڑکوں کے مطالبے ہوتے تھے- وہ بڑی مشکل میں پھنس جاتے تھے- مگر "قرض" دینے سے کبھی نہیں رکتے تھے- معلوم نہیں آدھی تنخواہ گھر لے جانے اور آدھی مدرسے میں پھینک جانے پر ان کے عزیز ان سے کیا سلوک کرتے ہوں گے- اس سلسلے میں عجیب واقعہ یہ ہے کہ مدرسے بھر میں صرف ایک طالب علم تھا جس سے مولانا کو نہیں معلوم کیوں نفرت تھی- یہ طالب علم میرا ہم درس تھا- مولانا اسے کبھی حدیث کی قرات کرنے نہیں دیتے تھے- کتاب کھلتے ہی ہم باقی دو طالب علموں سے مطالبہ کرتے تھے کہ پڑھو۔ اگر ہم ذرا بھی دیر کرتے تو وہ خود قرأت شروع کر دیتے تھے تاکہ وہ ان کا مبغوض طالب علم پڑھ نہ سکے- کبھی ایسا بھی ہوا کہ ایک طرف سے اس نے قرات شروع کر دی اور دوسری طرف سے خود مولانا نے شروع کر دی- دونوں پڑھتے جاتے تھے- مگر مولانا اپنی مروت کی وجہ سے اسے منع نہیں کر سکتے تھے- دیر تک کش مکش جاری رہتی تھی اور وہ طالب علم بالآخر خاموش ہو جاتا تھا- لیکن قرض لینے والوں میں سب سے بڑا حاتم یہی طالب علم تھا- مولانا بے چون و چرا اس کے مطالبے بھی پورے کر دیا کرتے تھے- بعد میں ہمیں معلوم ہو گیا تھا کہ اس رفیق درس سے مولانا کی نفرت' بے وجہ نہ تھی' یقیناً ان کی پاکیزہ روح اس شخص سے بے زار رہنے میں حق بجانب تھی-

حسن اتفاق سے مولانا کو چپراسی ایسا ملا تھا جو اپنی ظاہری ہیئت اور عمر میں ان سے مشابہت رکھتا تھا- مولانا کا اس سے برتاؤ برادرانہ سا تھا- اسے بہت کچھ دیتے رہتے تھے اور وہ صاف ستھرا رہتا تھا- کئی مرتبہ ایسا ہوا کہ باہر سے کوئی آیا اور مولانا کی بجائے چپراسی کو مہتمم مدرسہ سمجھ کر مصافحہ شروع کر دیا- مولانا ایسے واقعوں پر بہت تبسم کرتے تھے- مگر یہ شخص بہت سست اور احمق تھا- شاذ و نادر ہی ان کے حکموں پر عمل کرتا تھا- لیکن ادھر سے کوئی باز پرس نہیں ہوتی تھی-

ان کی سادگی کا اس ایک واقعہ سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ایک مرتبہ دارالحدیث کے لیے ٹاٹ کا فرش تیار کرانے کی ضرورت پیش آئی- چپراسی ایک کاریگر کو بلا لایا- مولانا ہمیں اس وقت درس دے رہے تھے- کاری گر نے خرچ کا تخمینہ بتایا- مولانا بے چارے کو

مول تول کہاں آتا تھا؟ میری طرف دیکھنے لگے- پھر فوراً اس انداز سے گویا کوئی سن نہیں رہا ہے' کہنے لگے: "معلوم ہوتا ہے کم نہیں کرے گا- اچھا آدمی نظر آتا ہے!" مجھے اس پر بہت غصہ آیا اور میں نے ایک پرزے پر یہ جواب لکھ دیا: "بے شک اب آپ کے فرمانے کے بعد کم نہیں کرے گا" مولانا متحیر سے ہو گئے اور فرمانے لگے "کیا اس نے سن لیا ہے؟" حالانکہ وہ پاس ہی کھڑا سن رہا تھا- پھر اس کے منہ مانگے دام دے کر ٹاٹ بنوالیا-

ایک مرتبہ طبیعت ناساز تھی- میں عیادت کو گیا- آپ چارپائی پر لیٹے تھے- میں سرہانے کی جانب کرسی پر بیٹھ گیا- اس وقت دودھ والے سے مولانا سودا کر رہے تھے- کہتے تھے "بھئی! پہلے تم نے وعدہ کیا تھا کہ ڈھائی آنے پر میں خالص دودھ دوں گا' پھر گھر میں شکایت کی گئی کہ دودھ میں پانی ہوتا ہے- اس پر میں نے بغیر تمھارے مطالبے کے چار آنے سیر کی شرح مقرر کر دی اور تم نے قسم کھائی کہ پانی نہیں ملاؤ گے- مگر گھر میں اب پھر شکایت کی جاتی ہے-"

دودھ والے نے ہاتھ جوڑ کر کہا "حضور! میرے بچے مریں اگر پانی ملاتا ہوں' بی بی صاحب ناحق شک کرتی ہیں!"

مولانا کو یقین آ گیا- مگر ساتھ ہی فرمانے لگے "ہم اور زیادہ دام دے سکتے ہیں مگر دودھ میں پانی نہ ملایا کرو!"

اس پر میں بول اٹھا کہ چار آنے سیر بھی زیادہ شرح ہے- اگر یہ پانی ملائے تو اس سے دودھ لینا موقوف کر دیجیے- میں دوسرے گوالے کو لگا دوں گا- مولانا ایسی سخت گفتگو اپنے دودھ والے کے حق میں بھی پسند نہیں کرتے تھے- مسکرا کر اس کی تعریف کرنے لگے- پھر کہا اچھا بتاؤ کتنا دینا ہے؟ اس نے کہا حساب آپ کے پاس لکھا ہے- مولانا نے ایک کاپی سرہانے سے نکالی اور دیکھنا شروع کی- میری نظر پڑ گئی- کیا دیکھتا ہوں کہ کاپی بالکل سادہ ہے اور مولانا لیٹے مسکرا رہے ہیں- سرے سے حساب لکھا ہی نہیں تھا!

پھر دودھ والے نے جو مانگا دے دیا-

شہر سے مدرسے آنے جانے کے لیے ایک تانگا سولہ روپیہ ماہوار پر نوکر رکھا تھا-

بہ مشکل پندرہ دن وہ حاضر ہوتا تھا- مولانا دوسرے تانگے پر آتے جاتے تھے' مگر اسے تنخواہ ماہ بماہ پوری ملتی رہتی تھی-

ایک دن بزاز خانے سے گاڑی پر گزر رہے تھے' میں ساتھ تھا- ایک بزاز نے گاڑی روک کر زبردستی کپڑے کے کئی تھان سر منڈھ دیے- مولانا انکار نہیں کر سکتے تھے- دام دے کر خاموش کپڑا لیے چلے آئے-

خودداری:

وسعت اخلاق کا یہ عالم تھا کہ عربی مدارس کے سرکاری انسپکٹر کے لیے (جو دارالعلوم کے ایک سابق طالب علم تھے) اپنی کرسی خالی کر دی تھی- وہ مرد خدا ایسی طبیعت رکھتا تھا کہ اس بزرگ کی جگہ پر بے تکلف بیٹھ گیا اور دوسری کرسی آنے تک اسے کھڑا رہنے دیا- مولانا نے یہ برتاؤ گوارا کر لیا' مگر جب اس نادان شخص نے اپنے حقیر عہدے کے گھمنڈ میں اساتذہ کو ''تم'' کے لفظ سے مخاطب کیا تو وہ برداشت نہ کر سکے- لیکن ان کے اخلاق میں ترکی بہ ترکی جواب دینے کی گنجائش نہ تھی- اٹھ کر دارالحدیث میں چلے آئے- اس وقت تنہا میں وہاں موجود تھا- مولانا نہایت افسردہ تھے- میں نے وجہ دریافت کی تو آنکھوں سے آنسو نکل آئے- فرمانے لگے ''اب گوشہ نشینی بہتر ہے- یہ ذلت گوارا نہیں کر سکتا-'' میں نے بہت کچھ تسکین دی اور عرض کیا ''کم سے کم حدیث کا یہ دورہ ختم کر دیجیے' پھر جو جی میں آئے کیجیے گا-'' انھوں نے یہ درخواست منظور کر لی-

قناعت:

قناعت اور توکل علی اللہ' ان کا اصلی وصف تھا- ایک مرتبہ میں نے عرض کیا ''سب لوگ حیدر آباد سے مستفید ہو رہے ہیں' آپ کی ساری عمر تکلیف میں گزری- مناسب ہے کوئی کوشش وہاں جاری کی جائے تاکہ باقی عمر آرام میں گزرے اور علم حدیث پر اردو میں کوئی ایک کتاب تصنیف ہو جائے-''

مولانا نے کوئی جواب نہ دیا- چند دن بعد میں نے پھر زور دے کر یہی کہا- آج بالکل تنہائی تھی- ان کی آنکھیں اشک بار ہو گئیں- دیر تک چپ بیٹھے رہے' پھر بہت ہی دھیمی

آواز میں کہا ''عمر بھر خدا کی چوکھٹ پر پڑے رہے- اب جب کہ وقت اخیر ہے مخلوق کے آگے ہاتھ پھیلائیں؟''

تبحر علمی:

ہندوستان میں علم، خصوصاً علوم دینیہ کی کساد بازاری مشہور و معروف ہے- لیکن مولانا امیر علی مرحوم ایک بالکل مستثنیٰ ہستی تھے- نہایت افسوس کا مقام ہے کہ دنیا ان سے بالکل بے خبر رہی اور مسلمان اس عالم متبحر سے کوئی قابل ذکر فائدہ اٹھا نہ سکے- میں اکثر بلاد اسلامیہ کے مشاہیر علما سے واقف ہوں، مگر میں نے تبحر کسی میں نہیں پایا- علم حدیث اور اس کے تمام متعلقات، مولانا کا اصلی موضوع تھا- وہ حدیث کے حافظ تھے- جو حدیث بھی سامنے آجاتی، اس پر اس شرح وبسط سے گفتگو کرتے کہ حیرت ہو جاتی تھی- متن کو لے کر بیان کرنا شروع کرتے کہ حدیث کن کن طرق سے آئی ہے؟ امہات الکتب میں متن کے اندر کون کون اختلافات موجود ہیں؟ اختلاف کس راوی سے وارد ہے؟ وجوہ اختلاف کیا ہیں؟ اصح الروایات کون ہے؟ پھر معانی پر بحث کرتے- لغوی تشریح اپنی جگہ پر خود ایک ادبی بحث ہوتی تھی- بلغاء کے مقولے، جاہلیت واسلام کے شعرا کے کلام سے استشہاد کرتے تھے- پھر فقہی بحث شروع ہوتی، مذاہب اربعہ انھیں پوری تفصیل سے حفظ تھے- غیر مشہور مذاہب پر بھی نظر تھی- سب دوران بحث میں آجاتے تھے- ہر ایک کے دلائل علیحدہ علیحدہ بیان کر دیتے تھے اور اکثر ترجیح دینے سے اجتناب کرتے تھے-

فقہ حنفی کی بے مائیگی معلوم ہے- درس میں عموماً تین طالب علم شریک ہوتے تھے- ایک بنگال کے اہل حدیث تھے، ایک سیلون کے شافعی المذہب تھے اور ایک خود کاتب حروف تھا- ہم اکثر مولانا کو مجبور کرتے تھے کہ کسی ایک مذہب کو ترجیح دیں- اس پر وہ ایسی مجتہدانہ تقریر کرتے تھے کہ ہم مبہوت ہو کر رہ جاتے تھے- علمائے حنفیہ کے لیے استغفار کرتے جاتے تھے- کہتے تھے ''خدا انھیں معاف کرے، ان سے تسامح ہو گیا ہے-''

مولانا نے کبھی اپنی زبان سے یہ نہیں کہا کہ وہ ''اہل حدیث ہیں'' لیکن وہ حضرت میاں سید نذیر حسین مرحوم کے جلیل القدر شاگرد تھے اور صحیح معنی میں ''اہل حدیث'' تھے-

ایک مرتبہ درس میں بعض اور لوگ بھی شریک تھے۔ انھوں نے مداخلت کی اور فقہ حنفی کی حمایت کرنے لگے۔ مولانا نے ان کے تمام اعتراضوں اور قیل وقال کا صرف یہ جواب دیا۔ ''لیکن حدیث اس کے مخالف ہے۔''

اسماء الرجال کا فن' صدیاں گزریں کہ مر چکا ہے' لیکن مولانا مرحوم اس کے زندہ امام تھے۔ حدیث کا کوئی راوی نہیں جس کے جملہ حالات مع سنین ولادت ووفات انھیں حفظ نہ ہوں۔ محدثین نے اس کی جرح وتعدیل میں کیا کہا ہے؟ کن کن لوگوں سے وہ روایت کرتا ہے؟ کون کون لوگ اس سے روایت کرتے ہیں؟ صحاح کا راوی ہے یا مسانید کا؟ غرضیکہ کوئی بات نہ تھی جو انھیں یاد نہ ہو۔ وہ ہر راوی پر شروع شروع اتنی تفصیل سے گفتگو کرتے تھے کہ ہم طالب علم قطعی یاد نہیں رکھ سکتے تھے۔ آخر ہم نے درخواست کی کہ یہ سلسلہ موقوف کر دیں' کیونکہ ہم اس سے کوئی فائدہ اٹھا نہیں سکتے' مگر وہ کچھ نہ کچھ بیان ضرور کرتے تھے۔ جب ہماری طرف سے انھیں بھی مایوسی ہوگئی تو ان لفظوں پر اکتفا کرنے لگے۔ ''مشہور راوی ہے'' ''بخاری کا راوی ہے'' ''مسلم کا ہے'' ''مجروح ہے'' ''حاکم نے تعدیل کی ہے' مگر حاکم کی تعدیل کا حال معلوم ہے!''

اس فن کا انھیں اس قدر شوق تھا کہ وفات سے تقریباً ایک سال پہلے سمعانی کی کتاب الانساب کی تہذیب وترتیب شروع کر دی تھی۔ صحاح کے راویوں کو یہ کہہ کر چھوڑ دیا تھا کہ ''مشہور ہیں'' باقی راویوں کے حالات جمع کرنا شروع کر دیے تھے۔ کئی سو صفحے لکھ چکے تھے کہ وفات ہوگئی۔ یہ مسودہ ان کے عزیزوں کے پاس محفوظ ہے۔

صرف حدیث ورجال ہی نہیں' ہر اسلامی علم میں انھیں پوری مہارت حاصل تھی۔ فقہ کا ذکر اوپر گزر چکا' تفسیر میں ان کی تصنیف کی جانب بھی اشارہ ہو چکا ہے۔ معقولات' مناظرہ' ادب' تاریخ وغیرہ علوم وفنون میں بھی بے نظیر تھے۔ علم ادب پر ان کی نظر اتنی وسیع تھی کہ مجھے اکثر حیرت ہو جایا کرتی تھی۔ ہزارہا مقولے' ضرب المثلیں' اشعار' زبان پر رہتے تھے۔ پھر ہر شاعر کی تاریخ بھی محفوظ تھی۔ صرف عربی ہی نہیں' فارسی اور اردو کے بھی بے شمار اشعار یاد تھے اور تینوں زبانوں میں بہت اچھا ذوق رکھتے تھے۔ شیخ محمد صاحب عرب بن شیخ محسن

صاحب یمنی" (مشہور محدث) مولانا کے سمدھی تھے- شیخ صاحب' خدا مغفرت کرے بڑے ظریف تھے- نواب صدیق حسن خان مرحوم والی بھوپال کے محل میں پلے تھے- مولانا مرحوم ان سے بہت مذاق کرتے تھے- اردو کے ظریفانہ اشعار ان پر منطبق کیا کرتے تھے- شیخ صاحب یہ اشعار نہیں سمجھتے تھے- مولانا کا وہ بہت ادب کرتے تھے-

ان علوم کے علاوہ ریاضی سے مولانا کو بہت شوق تھا- درس میں یا دفتر میں جب خالی بیٹھتے تو میز پر انگلی سے ریاضی کی شکلیں بناتے رہتے تھے- جغرافیے پر بھی نظر بہت وسیع تھی- ایک مرتبہ اخباروں میں خبر چھپی کہ جرمن حکومت' بحر بالٹک سے بحر اسود تک ایک نہر نکالنا چاہتی ہے- مجھے اس خبر پر بہت تعجب ہوا اور مولانا سے آ کر بیان کیا- مجھے یقین تھا وہ بھی متحیر ہوں گے- مگر انھوں نے بغیر کسی استغراب کے کہا "معقول تجویز ہے' نہر آسانی بنائی جاسکتی ہے-" پھر پوری تفصیل سے بیان کرنا شروع کیا کہ دونوں سمندروں کے مابین کون کون دریا ہیں' کتنا علاقہ پہاڑی ہے' کہاں پر نشیب و فراز ہے- میں نے جا کر نقشہ دیکھا تو ان کا بیان حرف حرف صحیح نکلا-

ایک دن درس میں وہ حدیث آئی' جس کا مفہوم یہ ہے کہ قیامت آنے سے پہلے تمام صحرائے عرب' گلزار بن جائے گا- میں نے تعجب کا اظہار کیا- اس پر مولانا نے نہایت شرح و بسط سے صحرائے عرب کے جغرافیے پر گفتگو شروع کر دی- انھیں معلوم تھا' عرب میں کہاں کہاں بارش زیادہ ہوتی ہے- بارش کا پانی کن کن نالوں سے گزر کر صحرا میں جاتا ہے- کس طرح بند باندھ کر یہ پانی صحرا میں جا بجا روکا جا سکتا ہے- کتنی مدت میں صحرا کی ریگ' کیچڑ بن سکتی ہے- غرضکہ اس طرح بیان کیا کہ پوری تشفی ہو گئی-

جدل و مناظرے سے مولانا کو نفرت تھی- بعض اہل علم کی طرح حجت نہیں کرنے لگتے تھے- اپنی دلیل بیان کر کے خاموش ہو جاتے تھے- ایک مرتبہ مولانا عبداللہ صاحب غازی پوری مرحوم و مغفور سے ایک دقیق مسئلے میں گفتگو ہو پڑی- دونوں متبع سنت اور سنجیدہ تھے- یہ گفتگو بڑی دلچسپ تھی- دونوں نے صرف دو دو مرتبہ تقریر کی اور جب کسی فیصلے پر پہنچ نہ سکے تو اس طرح خاموش ہو گئے گویا کوئی بحث تھی ہی نہیں-

بزرگی:

طویل تجربوں کے بعد اب میں کسی انسان کو بھی بزرگ کہنے سے ڈرتا ہوں- کتنے ہی فرشتہ صورت آدمی دیکھے' حسن ظن کیا' مگر آخر میں نتیجہ خلاف توقع نکلا- لیکن مولانا مرحوم کے تقدس اور بزرگی کا میرے قلب پر بڑا اثر ہے- وہ اپنے آپ کو اس قدر چھپاتے تھے کہ ہرگز کسی غیر معمولی عبادت و ریاضت میں ان کی مشغولیت ظاہر نہ ہوتی تھی' اس بارے میں اس درجہ محتاط تھے کہ کسی کو لمبی چوڑی نصیحتیں بھی نہیں کرتے تھے- نماز سے غافل طالب علموں سے بھی اس سے زیادہ کچھ نہیں کہتے کہ "دیکھو نماز خدا نے فرض کر دی ہے' اسے نہ چھوڑو-"

لیکن اتنا چھپانے پر بھی کھلے جاتے تھے- عموماً ظہر کی نماز مدرسے میں پڑھتے تھے- مگر ان کی نماز' عام نمازوں کی سی نہ ہوتی تھی- ریاکاروں کی طرح آنکھیں بند کر کے اور منہ بنا کر نہیں کھڑے ہوتے تھے' نہ رکوع و سجود بہت دراز کرتے تھے- نہایت سادگی سے ارکان ادا کرتے تھے- مگر نماز میں ان کی حالت دیکھنے کے لائق ہوتی تھی- ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گم ہو کر رہ گئے ہیں- قیام میں کمر کسی قدر خم کر کے آگے کو جھکے دکھائی دیتے تھے- ایک مدہوشی کا سا عالم ہوتا تھا- میں اکثر مسجد میں بیٹھا ان کی نماز دیکھتا رہ جاتا تھا- اٹھنے کا خیال بھی نہ گزرتا تھا-

ملک وملت کی محبت:

مولانا مرحوم میں وطن اور قوم کی محبت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی- بہت کم سخن تھے' مگر اکثر اظہار خیال کرتے رہتے تھے- یہ دیکھ کر تعجب ہوتا تھا کہ سیلف گورنمنٹ یا اندرونی آزادی کے وہ قائل نہ تھے- ایک دن ایک گفتگو کے دوران میں غصے سے کہنے لگے "اندرونی آزادی مانگنے والوں کو شرم نہیں آتی- اگر کامل آزادی نہیں تو پھر آزادی ہی نہیں-"

ایک دن ماڈریٹون کا ذکر نکلا- فرمانے لگے "آزادی کے مطالبے میں اعتدال میری سمجھ میں نہیں آتا" پھر امام غزالیؒ کا یہ قول بیان کیا "پورے پورے یہودی بنو ورنہ تورات سے کھیلنا چھوڑ دو-"

اسلامی ہمدردی اس درجہ تھی کہ میرے خیال میں ان کی جان ہی اسی میں گئی۔

ان کی وفات کا بیان بھی عبرت انگیز ہے۔ ایک دن دفتر میں بیٹھے تھے۔ ابھی تعلیم شروع ہونے میں دیر تھی۔ اسی وقت خبر ملی کہ دمشق پر اتحادی فوجوں نے قبضہ کرلیا۔ میری کم بختی کہ دوڑ کر مولانا کو خبر دی۔ سناٹے میں آ گئے۔ کچھ نہیں بولے۔ نگاہیں نیچی ہو گئیں۔ خود مجھ پر بھی بہت اثر تھا۔ میں بھی افکار میں غرق ہو گیا۔ چند لمحے بعد میز ہلتی محسوس ہوئی۔ نگاہ اٹھی تو کیا دیکھتا ہوں، مولانا تمام جسم سے کانپ رہے ہیں۔ میں نے مزاج پوچھا مگر جواب نہیں دیا۔ میں نے ہاتھ پر ہاتھ رکھا تو بخار محسوس ہوا۔ فوراً سواری منگائی، بمشکل سوار کیا، بلکہ گود میں لے کر بیٹھا۔ وہ اتنی دیر میں اس قدر کمزور ہو گئے تھے کہ بیٹھ بھی نہیں سکتے تھے۔ دور جا کر بہت دھیمی آواز میں فرمانے لگے:

"خاتمہ ہو گیا۔ دمشق، حدیث میں مسلمانوں کا آخری حلقہ بتایا گیا ہے۔ کفار نے اس پر بھی قبضہ کرلیا، اب زندگی کیا رہی۔"

گھر میں چارپائی پر لٹائے گئے اور اس طرح لٹائے گئے کہ پھر نہ اٹھے۔ لاش ہی اٹھائی گئی۔ شاید دس ہی دن کے اندر کام تمام ہو گیا۔

مجھے یقین ہے مولانا کو قرب اجل کا دو مہینے پہلے سے احساس ہو گیا تھا۔ عام عادت تھی کہ مدرسے سے فارغ ہوتے ہی مکان کو لوٹ جاتے تھے۔ مگر ایک دن نہیں گئے۔ بہت دیر وہیں ٹہلتے رہے۔ بار بار میرے کمرے کے سامنے سے گزرتے تھے اور ایسا معلوم ہوتا تھا کوئی بات کہنا چاہتے ہیں۔

آخر میں حاضر ہو گیا، دورانِ میدان میں لے جا کر آہستہ سے فرمانے لگے "وقت قریب ہے، میرے بعد وطن (ملیح آباد) میں کوئی باقی نہیں رہے گا۔ صرف ایک تم سے امید ہے، مگر تم میں ایک کمی باقی رہی جاتی ہے۔ معقولات سے بالکل کورے ہو۔ میں تمھاری رائے سے متفق ہوں کہ یہ فن غیر ضروری بلکہ لغو ہے۔ لیکن مسلمانوں نے اس میں بہت محنت کی ہے۔ بہتر ہے کہ ایک سرسری نظر اس پر بھی ہو جائے۔ مگر محنت کرنا پڑے گی۔ دو ڈھائی مہینے کے اندر ہی فارغ ہو جانا پڑے گا۔ میں باتوں باتوں میں تمام مسائل ذہن

نشین کر دوں گا۔"

پھر امام غزالیؒ کی ایک کتاب کا نام لیا کہ اسے پہلے مطالعہ کر لو' پھر میری تقریریں شروع ہوں گی۔ مگر میرے دماغ کو اس طرف رجحان نہ ہوا اور مولانا کے حکم کی تعمیل نہ ہو سکی۔ یہ واقعہ وفات سے ٹھیک دو مہینے پہلے کا ہے۔

افسوس ناظرین اس شخص سے ذرا بھی واقف نہیں جس کا حال رو رو کر لکھ رہا ہوں۔ جی چاہتا ہے یہ صحبت کبھی ختم نہ ہو' مگر نہ رسالے میں گنجائش ہے نہ سننے والوں میں طول کلام کی برداشت' مجبوراً خاموش ہوتا ہوں۔ آئندہ صحبت میں ان شاء اللہ ایک دوسرے "گم نام عظیم" کا حال سناؤں گا۔

❀❀❀

مولانا محمد سلیمان روڑی والے

(وفات ۲۱ نومبر ۱۹۴۹)

متحدہ پنجاب کے انتیس ضلعوں میں سے ایک ضلع حصار تھا۔ تقسیم ملک کے زمانے میں پنجاب دو حصوں میں بٹا تو اس کے سترہ ضلعے پاکستان کو اور بارہ ہندوستان کو ملے۔ اس وقت پاکستان میں شامل ہونے والے پنجاب کو مغربی پنجاب اور ہندوستان کے حصے میں آنے والے پنجاب کو مشرقی پنجاب کہا جاتا تھا۔ اس سے کچھ عرصہ بعد ہندوستان کی حکومت نے مشرقی پنجاب کو تین حصوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ یعنی اس کے تین صوبے بنا دیے تھے۔ ایک پنجاب، دوسرا ہماچل پردیش اور تیسرا ہریانہ...... ضلع حصار جو متحدہ پنجاب کا بہت بڑا ضلع تھا، صوبہ ہریانہ میں شامل کیا گیا۔ اس کے پھیلاؤ کا یہ عالم تھا کہ اس کے ایک طرف ضلع رہتک، ایک طرف کرنال، ایک طرف فیروز پور، ایک طرف ریاست بیکانیر اور ایک طرف ریاست پٹیالہ کی حدیں ملتی تھیں۔ ریاست پٹیالہ کی سرحد کے قریب اس ضلعے کا ایک قصبہ روڑی تھا، جس کی حیثیت اچھی خاصی منڈی کی تھی اور اردگرد کے دیہات کے لوگ وہاں اپنی ضرورت کی چیزیں خریدنے کے لیے آیا کرتے تھے۔ جس زمانے کی میں بات کر رہا ہوں اس زمانے میں وہاں نہ کوئی سڑک تھی، نہ آمدورفت کی سہولت حاصل تھی، نہ تانگے چلتے تھے، نہ موٹر یا سائیکل کا کوئی تصور تھا۔

یہ قصبہ چاروں طرف ریت کے اونچے اونچے ٹیلوں میں گھرا ہوا تھا۔ ریلوے اسٹیشن جس کا نام ''لکڑ والی'' تھا وہاں سے بارہ کوس دور تھا۔ (اس نواح میں مسافت کی پیمائش کے لیے کوس کا لفظ بولا جاتا تھا، میل کو بہت کم لوگ جانتے ہوں گے) اس قصبے میں محمد سلیمان نام کے ایک بزرگ رہتے تھے، جن کی بزرگی اور نیکی کی بہت سی باتیں مشہور تھیں۔ ''مولانا'' کا لفظ اس دور میں زیادہ مستعمل نہ تھا۔ یہ بزرگ اگرچہ علم و فضل میں مولانا کی روایتی

اصطلاح سے بہت آگے نکلے ہوئے تھے لیکن لوگ انھیں یا تو مولوی صاحب کہتے تھے یا صوفی صاحب یا بابا جی- اب تو زمانہ بدل گیا ہے"صوفی" کا لفظ سنتے ہی بعض لوگ بدک جاتے ہیں اور اس طرح غصے سے اچھل پڑتے ہیں جس طرح کسی جانور کی دم پر پاؤں رکھ دیا جائے تو وہ اچھل پڑتا ہے- ان کا نقطہ نظر یہ ہے کہ "صوفی" لوگ اچھے نہیں ہوتے- "اچھے نہیں ہوتے" تو میں نے بہت نرم لفظ بولا ہے ورنہ وہ تو بہت کچھ کہتے ہیں-

اصل بات یہ ہے کہ اس زمانے میں بہت ہی نیک آدمی کو "صوفی" کہا جاتا تھا- اور مولانا محمد سلیمان بہت ہی نیک آدمی تھے-

میرے دادا کا نام محمد تھا اور لوگ انھیں میاں محمد کہا کرتے تھے- مولانا محمد سلیمان کے وہ بہت مداح تھے اور ان کے دوست بھی تھے- ان سے ملاقات کے لیے وہ روڑی جایا کرتے تھے- سچی بات یہ ہے کہ مجھے مولانا محمد سلیمان روڑی والے سے کسی قسم کا تعلق رکھنے والوں اور ان کے دور ونزدیک کے رشتے داروں سے دلی پیار ہے- اس کی اصل وجہ یہی ہے کہ میرے دادا مولانا مرحوم سے دوستانہ اور عقیدت مندانہ تعلق رکھتے تھے- نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ والد کے دوست کا احترام کرنا چاہیے، جس کا مطلب یہ بھی ہے کہ والد کے دوست کے تعلق داروں کی اولاد سے بھی تعلق قائم کرنے اور قائم رکھنے کی کوشش کرنی چاہیے اور الحمدللہ میں یہ کوشش کرتا ہوں- میں بہت چھوٹا تھا، شاید بغدادی قاعدہ پڑھتا ہوں گا کہ میرے دادا مجھے ان کی خدمت میں لے گئے- وہ مسجد کے حجرے میں بیٹھے تھے اور زیادہ تر وہیں رہتے تھے- اس حجرے اور مسجد سے انھیں بہت پیار تھا- میرے دادا سے وہ کھڑے ہو کر ملے اور میرے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا اور مجھے "بیٹا" کہہ کر پکارا- "بیٹا" کا لفظ میں نے پہلی دفعہ انہی کی زبان سے سنا تھا جو مجھے اب تک یاد ہے-

ان کا انداز کلام نہایت دھیما، انتہائی پیارا اور بے حد میٹھا تھا- بقول کسے گڑ سے بھی میٹھا- کافی دیر وہ میرے دادا سے باتیں کرتے رہے، میں خاموشی سے ان کی باتیں سنتا رہا- وہ کیا باتیں کرتے رہے؟ اس کا مجھے کچھ پتا نہیں-

اس سے کئی سال بعد وہ ہمارے ہاں (کوٹ کپورہ) تشریف لائے- ہمارا کام وہاں

ٹرانسپورٹ کا تھا۔ اب بھی جڑانوالہ (ضلع فیصل آباد) میں ہمارے بہت سے رشتے دار یہ کام کرتے ہیں۔ انھیں ہماری آمدنی کے بارے میں کچھ شک گزرا کہ یہ حلال بھی ہے یا نہیں؟ اور ان کے گھر سے کھانا پینا کیسا ہے؟

ان سے ساری بات عرض کی گئی تو ان کا شک دور ہوا اور انھیں تسلی ہوئی کہ ان کی آمدنی کے ذرائع ناجائز نہیں ہیں اور ان کے ہاں سے کھانے پینے میں کوئی حرج نہیں...... وہ چار پانچ دن ہمارے ہاں تشریف فرما رہے۔ وہاں کی انجمن اصلاح المسلمین کے بعض سالانہ جلسوں میں بھی وہ شریک ہوئے تھے۔

اب شب و روز کا طویل سفر طے کر کے ۱۹۴۶ء کے جون میں آ جایئے۔ میں نے اور ہمارے ایک رشتے دار حاجی محمد علی (مرحوم) نے روڑی جانے کا پروگرام بنایا۔ فاضلکا بنگلہ سے براستہ مکتسر ایک گاڑی کوٹ کپورے آتی تھی جسے "چھوٹی گاڑی" کہا جاتا تھا۔ یہ گاڑی بٹھنڈہ سے ہوتی ہوئی ہے پور جاتی تھی اور اور یہی گاڑی اس وقت وہاں جانے کا ذریعہ تھی۔ اسی گاڑی سے رات کے آٹھ بجے کے قریب ہم روانہ ہوئے اور رات کے بارہ بجے سے تھوڑی دیر بعد لکڑ والی ریلوے اسٹیشن پر اترے۔ ضلع حصار ان دنوں سخت قحط کی زد میں تھا۔ بٹھنڈہ ریلوے اسٹیشن سے انجن میں پانی بھرا گیا تھا، اس سے دوسرا اسٹیشن "راماں منڈی" تھا۔ وہاں بہت سے مرد اور عورتیں پانی لینے کے لیے ہاتھوں میں برتن پکڑے کھڑے تھے۔ اس سے اگلا اسٹیشن "کالیاں والی منڈی" اور پھر "لکڑ والی" تھا۔ یہاں ہم اترے تو دیکھا کہ انجن سے پانی لینے والوں کی ایک بھیڑ ہے۔ چھوٹی گاڑی کا چھوٹا انجن تھا اور اس میں محدود مقدار میں پانی بھرا جاتا تھا' جو ہر ریلوے اسٹیشن کے ملازم ہر شخص کو مناسب مقدار کے ساتھ دیتے جاتے تھے، رات کو بھی یہی حال ہوتا تھا اور دن کو بھی۔ پانی لینے والے مردوں اور عورتوں کو دیکھ کر بے حد ترس آتا تھا۔

پانی اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے اور اس کے بغیر زندہ رہنا ناممکن ہے۔ انسان، حیوان، مال مویشی، درخت، فصل، کھیتی ہر چھوٹی بڑی شے کو اس کی ضرورت ہے۔ اس کی قدر اس وقت معلوم ہوتی ہے جب یہ میسر نہ آئے۔

قرآن نے کتنی دل لگتی بات کہی ہے۔

وجعلنا من الماء کل شئی حی (الانبیاء: ۳۰)

(ہم نے ہر شے کو پانی سے زندگی بخشی)

ہم لکڑ والی اسٹیشن سے اتر کر پلیٹ فارم سے باہر آئے تو چار پانچ اونٹوں والے یعنی شتربان کھڑے تھے۔ اونٹوں پر پالان کسے ہوئے تھے اور مالکوں نے ہاتھوں میں مہاریں پکڑ رکھی تھیں۔ وہ سواریوں کو مختلف مقامات پر لے جانے کے لیے اس طرح آوازیں دے رہے تھے جیسے تانگوں، ویگنوں، اور بسوں والے آوازیں دیتے ہیں۔ جہاں تک مجھے تاد پڑتا ہے یہ تمام شتربان سکھ تھے۔

اونٹ والا سکھ اونٹ کی مہار پکڑے ہمارے قریب آیا اور اپنے خاص لہجے میں پوچھا:

میاں جی! کہاں جائیں گے؟

ہم نے کہا: روڑی۔

کہا: بیٹھیے میں بھی روڑی کا رہنے والا ہوں اور وہیں جاؤں گا۔

پوچھا: کتنے پیسے لوگے؟

جواب دیا: یہاں سے روڑی بارہ کوس ہے۔ ایک آنہ کوس کے حساب سے بارہ آنے بنتے ہیں۔ اس نے ”اش اش“ کی آواز سے اونٹ بٹھا دیا اور ہمیں کہا: بیٹھیے اونٹ پر۔۔۔ ہم بیٹھنے لگے تو کہا یہ سامنے پانی کا نلکا ہے، پانی پی لیجیے، رات کا سفر ہے، روڑی تک پانی نہیں ملے گا۔ مجھے یاد پڑتا ہے راستے میں ایک دو گاؤں تو آئے تھے لیکن غالباً اس کا مطلب یہ تھا کہ رات کو کسی کے گھر آواز دے کر پانی مانگنا مشکل ہوگا۔ بہر حال ہم نے پانی پیا اور اونٹ پر بیٹھ گئے۔

شتربان نے مہار پکڑی اور تیزی سے چلنے لگا۔

پوچھا: روڑی کس کے گھر جائیں گے؟

ہم نے کہا: حکیم عبداللہ کے گھر

بولا: بڑے مولوی صاحب بابا جی تو دن رات مسجد ہی میں رہتے ہیں اور اللہ خیر کرے

ہم نماز کی اذان کے وقت مسجد میں پہنچ جائیں گے۔ بابا جی اللہ لوگ ہیں، ہر وقت اللہ اللہ کرتے رہتے ہیں اور اللہ ان کی سنتا ہے۔

تھوڑی دور آگے جا کر اس نے مہار ہمیں پکڑا دی اور خود اونٹ کے پیچھے ہو کر اسے تھوڑا سا بھگا دیا اور جوتی ہاتھ میں پکڑ کر خود بھی بھاگنے لگا۔ وہ جوان آدمی تھا۔ اونٹ رات اور ریت کے سفر میں بہت خوش رہتا ہے۔ ریت کی ہموار سطح پر وہ رقص کرتا ہوا تقریباً ڈھائی گھنٹے میں روڑی پہنچ گیا۔ شتربان نے مسجد کے سامنے اونٹ بٹھا دیا۔ خود ہی اس نے بارہ آنے کرایہ مانگا تھا۔ ہم نے اس کو ایک روپیہ دیا تو نہایت خوش ہوا۔ ہمیں اتار کر جانے لگا تو کہا:

میاں جی! واپسی کب ہوگی؟ میں آپ کا سیودار ہوں، جب حکم کریں آ جاؤں گا۔ اس بہانے بابا جی کو سلام بھی کر لوں گا۔ مولانا مسجد میں تھے، ہم ان سے ملے، انھوں نے خیر و عافیت پوچھی۔ ان کے دوست میرے دادا تو وفات پا چکے تھے، میں نے انہی کے نام سے اپنا تعارف کرایا تھا۔ نماز فجر کے بعد ہمیں وہ اپنے حجرے میں لے گئے جس کی چھت پرانے زمانے کے مطابق بن کی لکڑی اور سرکیوں کی تھی۔

فرمایا: میں پرانا آدمی ہوں، میرا گھر بھی پرانا ہے۔ (اپنے فرزند گرامی حکیم عبداللہ کا نام لے کر کہا) عبداللہ نئے زمانے کا آدمی ہے، اس کا گھر بھی نئے زمانے کے گھروں جیسا ہے۔

تھوڑی دیر بعد حکیم صاحب سے ملاقات ہوئی، وہ ہمیں مہمان خانے میں لے گئے۔ ان کا کتب خانہ دیکھا جو کئی کمروں میں تھا اور ہر موضوع کی بہت سے کتابوں پر مشتمل......!

وہیں چودھری نذیر احمد سے ملاقات ہوئی جو نائب تحصیل دار تھے اور ملازمت چھوڑ کر جماعت اسلامی میں شامل ہوئے تھے۔ چند لفظوں میں ان کا تذکرہ اس مضمون میں کر چکا ہوں جو ”مولانا ابوالاعلیٰ مودودی اور ان کی جماعت اسلامی“ کے عنوان سے اکتوبر ۱۹۸۹ء کے ”قومی ڈائجسٹ“ میں چھپا تھا۔ مزید تذکرہ ان شاء اللہ اس مضمون میں کروں گا جو اپنے کرم فرما حکیم عبداللہ کے متعلق لکھا جائے گا۔

دو دن ہمارا قیام روڑی میں رہا- اس اثنا میں حکیم عبداللہ صاحب سے بہت سی باتیں ہوئیں اور ان کے والد محترم مولانا محمد سلیمان کے ارشادات سے بھی فیض یاب ہونے کا موقع ملا-

اب آیئے مولانا محمد سلیمان کے آباواجداداوران کے اسلاف کی طرف......!

یہ خاندان کئی پشتوں سے اس علاقے میں مرجع خلائق تھا اور اس کے بزرگوں نے بدعات ورسوم کی مخالفت اور توحید وسنت کی اشاعت کو اپنے آپ پر فرض قرار دے لیا تھا- مولانا محمد سلیمان کے دادا کا نام مولانا غلام حسن تھا جن کا شمار اس علاقے کے ممتاز اہل علم میں ہوتا تھا- ان کے ایک بھائی حافظ قادر بخش تھے- ان دونوں نے حصار، کرنال، پٹیالہ، رہتک اور اس کے گردونواح کے علاقوں کو اپنی تبلیغی مساعی کا ہدف بنایا- جہاں انھوں نے مسلمانوں کو ان دینی مسائل سے روشناس کرانے کی مہم شروع کی جنھیں وہ بھول چکے تھے، وہاں غیر مسلموں کے سامنے بھی اسلام کا صحیح تصور پیش کیا اور ان کے فہم کے مطابق آسان الفاظ میں انھیں اسلامی آداب واحکام سے باخبر کرنے کی جدوجہد کی-

حافظ قادر بخش بصارت سے محروم تھے، لیکن اللہ تعالیٰ نے بصیرت کی بے پایاں نعمت سے انھیں نواز دیا تھا- قرآن مجید اس طرح ازبر تھا کہ اس کی مثال پیش کرنا مشکل ہے- اگر کسی حافظ سے کسی آیت کا کوئی چھوٹا بڑا ٹکڑا پڑھ کر پوچھا جائے کہ اس کے آگے کیا ہے تو وہ آسانی سے اگلی آیات سنا دے گا، لیکن اگر کوئی آیت پڑھ کر اس سے پہلی آیت پوچھی جائے تو اسے بتانا بہت مشکل ہوگا- حافظ قادر بخش کو اللہ تعالیٰ نے یہ خوبی ودیعت فرمائی تھی کہ وہ جس روانی سے اگلی آیات پڑھتے تھے اسی روانی سے پچھلی آیات پڑھنے پر قادر تھے-

علاوہ ازیں صحیح قرآن پڑھتے تھے- اگر ان کے سامنے قرآن پڑھتے ہوئے کوئی غلطی کرتا تو فوراً غلطی پر متنبہ فرماتے- اس باب میں عجیب تر معاملہ یہ تھا کہ وہ سو رہے ہیں اور ان کے قریب قرآن مجید پڑھتے ہوئے کسی شخص نے کوئی غلط لفظ پڑھ دیا ہے یا اسے کہیں مشابہ پڑ گیا ہے تو اسی وقت ان کی آنکھ کھل جاتی اور وہ پڑھنے والے کی تصحیح کرتے-

پنجابی زبان تو حافظ قادر بخش کی مادری زبان تھی، اس کے علاوہ سن سنا کر اردو، عربی،

فارسی اور پشتو وغیرہ کئی زبانوں سے ان کی اچھی خاصی شناسائی ہوگئی تھی۔ بہت سی حدیثیں یاد تھیں اور دینی مسائل سے خوب آگاہ تھے۔

مولانا غلام حسین کے ایک بیٹے کا نام صوفی غوث الدین تھا اور ان سے چھوٹے کا حافظ جمال الدین......! صوفی غوث الدین کا جوانی میں انتقال ہوگیا تھا۔ یہ مولانا محمد سلیمان کے والد مکرم تھے۔ نہایت عابد وزاہد، متقی، شریف النفس اور سخاوت پیشہ۔ ایثار اور رحم دلی میں مشہور......!

ان کے برادر صغیر حافظ جمال الدین بڑے جرأت مند شخص تھے۔ قرآن وحدیث، فقہ واصول فقہ، صرف ونحو اور فلسفہ ومنطق کے عالم۔ بعض عنوانات سے متعلق کتابیں بھی تصنیف کیں۔ اچھے طبیب بھی تھے، دونوں بھائی تبلیغ دین اور اصلاح خلق کے شائق تھے۔ چنانچہ اپنے علاقے میں انھوں نے خوب تبلیغ کی اور دین پھیلایا۔ مبلغ شوق تبلیغ کے ساتھ اپنے اندر اگر صالحیت کے جوہر بھی رکھتا ہو تو اللہ تعالیٰ اس کی مدد فرماتا ہے اور اس کی آواز میں تاثیر بھر دیتا ہے۔ یہ دونوں بھائی تبلیغ کا شوق وجذبہ رکھتے تھے اور صالحیت نفس سے بہرہ ور تھے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس میدان میں ان کی مدد فرمائی اور لوگ ان کی باتوں سے اثر پذیر ہوئے اور انھوں نے صراط مستقیم کو اپنایا۔

حافظ جمال الدین کے بیٹے حکیم علاء الدین تھے۔ انھوں نے اپنے قابل احترام باپ کا انداز اختیار کیا اور اسی راہ پر قدم فرسا ہوئے جس پر ان کے اسلاف قدم فرسا تھے۔ اس راہ میں ان حضرات کو بسا اوقات بے حد مشکلات کا سامنا بھی کرنا پڑا اور مالی وسائل کی فراہمی میں بھی رکاوٹیں پیدا ہوئیں، لیکن یہ ہر موقعے پر ثابت قدم رہے اور ہر مشکل کا پامردی سے مقابلہ کیا۔

یہ تو اس خاندان کے مردوں کا حال تھا۔ اب ان کی خواتین کے زہد واتقا کی چند مثالیں ملاحظہ فرمایئے۔

صوفی غوث الدین کا ذکر گزشتہ سطور میں ہم نے پڑھا۔ ان کی بیوی کا ایک واقعہ حکیم عبدالوحید سلیمانی کی وساطت سے پیش کیا جاتا ہے۔ انہوں نے ایک دن ابھی مغرب کی

نماز پڑھنا شروع کی تھی کہ سامنے سانپ نظر آیا- وہ گھر میں اکیلی تھیں- پہلے تو گھبرائیں، پھر یہ سوچ کر کہ فرض نماز پڑھ رہی ہیں، اس میں نہ گھبرانا چاہیے، نہ نماز توڑنی چاہیے' نماز میں مصروف رہیں-

اس کے بعد سانپ ٹانگ پر چڑھ گیا- اب خوف کی ایک لہر دل میں اٹھی، لیکن پھر سوچا کہ نماز توڑ کر جان بچانے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے- زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ سانپ ڈسے گا اور موت آجائے گی- آخر مرنا تو ہے ہی، کیوں نہ نماز کی حالت میں مرا جائے- اب سانپ قمیص کے نیچے سے ہوتا ہوا کندھے پر آگیا- یہ انتہائی دہشت ناک وقت تھا، لیکن وہ اللہ کی نیک بخت بندی بہ دستور نماز پڑھتی رہیں- نماز ہی کی حالت میں تھیں کہ سانپ اتر کر چلا گیا-

اس کے کچھ دیر بعد گھر کے افراد آئے تو یہ واقعہ ان سے بیان کیا- انھوں نے یہ مسئلہ بتایا کہ نماز کی حالت میں موذی جانور سامنے آئے تو مار دینا چاہیے-

مولانا محمد سلیمان جن کے بارے میں یہاں چند باتیں بیان کرنا مقصود ہے- اسی صالحہ خاتون کے فرزند تھے اور اسی کی آغوش میں انھوں نے تربیت کی منزلیں طے کی تھیں......

اب حکیم عبدالوحید ہی کی زبانی مولانا محمد سلیمان کی ایک بہن کا واقعہ سنیے، یہ واقعہ بھی نہایت حیرت انگیز ہے- یہ اس بلند مرتبت خاتون کی بیٹی تھیں جن کا ذکر ابھی ہمارے مطالعے میں آیا ہے-

وہ ایک بار گلی سے گزر رہی تھیں کہ کسی راہ گزر کا کندھا ان کے کندھے سے ٹکرا گیا- اسی وقت گھر آئیں اور کہا کہ کسی غیر محرم مرد کا کندھا میرے کندھے سے چھو گیا ہے- اب وہ جگہ آگ کی طرح جل رہی ہے، جی چاہتا ہے، اس کو استرے سے کاٹ دوں- گھر کے افراد نے اسے شدت احساس پر محمول کیا، لیکن جب انھوں نے اس جگہ کے کاٹ دینے پر بہت زیادہ اصرار کیا تو جسم کے اس حصے کو چھیل دیا گیا، اب انھیں چین آیا اور تکلیف رفع ہوئی-

مولانا محمد سلیمان کے آباؤ اجداد میں سے مولانا غلام حسن، حافظ قادر بخش، صوفی غوث الدین، حافظ جمال الدین، حکیم علاء الدین کا تذکرہ اختصار کے ساتھ ہمارے علم میں آیا اور ہمیں پتا چلا کہ ان تمام حضرات کا شمار علمائے دین اور مبلغین اسلام میں ہوتا تھا۔ لیکن یہ معلوم نہ ہوسکا کہ ان حضرات نے کن بزرگان عالی قدر سے علم حاصل کیا تھا اور کن کن اساتذہ سے کون کون سی کتابیں کہاں کہاں پڑھی تھیں............ یہ بھی ہمیں معلوم ہوا کہ ان میں سے بعض حضرات نے کتابیں تصنیف کی تھیں لیکن ان کی تصنیف شدہ کتابوں کے ناموں سے ہم مطلع نہیں ہوسکے۔ اگر ان باتوں تک ہماری رسائی ہوجائے تو اس خاندان کے اکابر کی تاریخ بہت حد تک نکھر جاتی ہے اور ان کے علمی، فکری اور مسلکی رجحان واضح ہوجاتے ہیں۔ اور مجھے اس کتاب میں موضوع کے اعتبار سے اصل تعلق مسلکی رجحان سے ہے۔ مسلکی رجحان اگرچہ ان کی تبلیغی سرگرمیوں سے واضح ہوجاتا ہے لیکن اساتذہ کے اسمائے گرامی اور تصانیف سے تو بالکل صراحت ہوجاتی ہے۔

اس سلسلے میں ہماری مدد حکیم عبدالوحید سلیمانی ہی کر سکتے ہیں اس لیے ہم ان کے باب تحقیق پر دستک دیں گے کہ وہ کسی طرح اس کی کھوج لگائیں اور لوگوں کو ان کے اساتذہ اور تصانیف سے مطلع فرمائیں۔

اب آیئے مولانا محمد سلیمان کے بارے میں چند باتیں بیان کرتے ہیں، جن کا ہمیں علم ہوسکا ہے۔ ان باتوں کا ایک ماخذ تو وہ بزرگ ہیں جن سے ہم نے یہ باتیں سنی ہیں۔ دوسرا ماخذ جسے ہمارے نزدیک مستند ماخذ کی حیثیت حاصل ہے، ہمارے دوست حکیم عبدالوحید سلیمانی ہیں، جو حکیم عبداللہ صاحب کے لائق فرزند اور مولانا محمد سلیمان کے نیک اطوار پوتے ہیں۔ انھوں نے ادارہ مطبوعات سلیمانی، اندروں رحمان مارکیٹ، غزنی سٹریٹ، اردو بازار، لاہور کی طرف سے مشہور کتاب ''الحزب المقبول من احادیث الرسول'' مع ترجمہ وحواشی کے شائع کی ہے۔ اس کے آخر میں اپنے قدیم بزرگوں، اپنے جد امجد اور اپنے والد محترم حکیم عبداللہ کے حالات سپرد قلم کیے ہیں۔ یہ حالات اگرچہ مختصر ہیں مگر نہایت دلچسپ ہیں اور ان کی حیثیت ''ساعتے چند بہ صحبت اولیا'' کی ہے۔ ہم یہاں انہی سے

استفادہ کر رہے ہیں۔

مولانا محمد سلیمان جو مستجاب الدعوات عالم دین تھے ۱۸۵۵ء کے پس و پیش پیدا ہوئے۔ آٹھ سال کے تھے کہ والد گرامی صوفی غوث الدین وفات پا گئے۔ دینی علوم کی تحصیل حافظ قادر بخش، حافظ جمال الدین اور اپنے چچا زاد بھائی حکیم علاء الدین سے کی۔ حضرت میاں سید نذیر حسین دہلوی اور حضرت امام عبدالجبار غزنوی سے بے حد قلبی تعلق رکھتے تھے۔

بقول حکیم عبدالوحید کے ''ان کی خدمت میں اکثر حاضر ہوتے اور دینی علوم میں رہنمائی حاصل کرتے۔''

حکیم صاحب فرماتے ہیں ''روڑی (ضلع حصار) اگرچہ ایسی جگہ واقع تھا جہاں میلوں تک کوئی سڑک اور ریلوے لائن نہیں تھی، سفر اونٹوں پر یا پیدل کیا جاتا تھا، تاہم حضرت الامام (مولانا عبدالجبار غزنوی) اور حضرت محدث دہلوی (میاں سید نذیر حسین) نے متعدد بار مولانا محمد سلیمان سے ملاقات کے لیے روڑی کا عزم کیا۔ حضرت میاں صاحب ۲۷ جولائی ۱۸۹۴ء کو وہاں گئے تھے اور ریلوے اسٹیشن لکڑ والی سے اونٹ پر سوار ہو کر وہاں پہنچے تھے۔

مولانا سید محمد داؤد غزنوی اپنے آباؤ اجداد کی طرح علمائے عظام اور بزرگان دین سے بے پناہ علاقہ رکھتے تھے اور گوناگوں مصروفیات کے باوجود اکابر دین کی خدمت میں جاتے تھے۔ وہ کئی دفعہ اس دور دراز علاقے میں مولانا محمد سلیمان کی خدمت میں روڑی گئے۔

ایک مرتبہ مولانا غزنوی روڑی گئے تو انھیں مسجد سے نکلتے وقت دائیں بائیں پاؤں کا خیال نہ رہا۔ مولانا سلیمان نے اس طرف ان کی توجہ مبذول کرائی اور فرمایا کسی سنت کو بھی چھوٹا نہیں سمجھنا چاہیے، ہر سنت کو ہر آن پیش نگاہ رکھنا چاہیے۔ پھر فرمایا میری بات کا برا تو نہیں مانا؟

مولانا داؤد غزنوی نے جواب دیا: میں تو سیکڑوں میل کا سفر کر کے آپ کی خدمت میں محض اس لیے حاضر ہوا ہوں کہ اپنی اصلاح کر سکوں۔ اگر آپ توجہ نہ فرماتے تو میری

اصلاح کیسے ہوتی- آپ کا توجہ دلانا ہماری دنیوی اور اخروی بہتری کے لیے ہے-
میرا خیال ہے اتنا تکلیف دہ سفر اختیار کر کے اس قسم کے پاکیزہ خصال لوگوں کی محفل اچھی باتیں سننے کے لیے بہت کم لوگ کہیں جاتے ہوں گے-
آیئے اس مرد صالح کی صحبت میں چند لمحے گزارنے کی کوشش کرتے ہیں کہ
صحبت صالح ترا صالح کند
مولانا محمد سلیمان نے اپنی زندگی کا زیادہ تر حصہ مسجد میں گزارا- مسجد سے ان کو بے پناہ لگاؤ تھا- حیات مستعار کے آخری چالیس سال تو مسجد میں ہی گزرے- نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد کے سائے میں رہنے والے کی بڑی تعریف فرمائی ہے-
المومن فی المسجد کالسمک فی السماء
پنجابی کے ایک شاعر نے اس کا ترجمہ اس طرح کیا ہے:
مومن بندہ مسجد دے وچ جیوں مچھلی وچ پانی
یعنی مومن آدمی مسجد میں اسی طرح خوش رہتا ہے جس طرح مچھلی پانی میں خوش رہتی ہے-
انھوں نے مسجد کے اس حجرے میں، جس میں وہ خود رہتے تھے قرآن مجید اور قاعدے سپارے فروخت کے لیے رکھ لیے تھے- سلسلہ طبابت پشتوں سے ان کے خاندان میں چلا آرہا تھا- مولانا محمد سلیمان بھی طبیب تھے لیکن طبابت کرتے نہیں تھے- کوئی مریض آتا تو اسے نسخہ لکھ کر دے دیتے تھے- اللہ شفا عطا فرماتا تھا-
ایک مرتبہ ایک شخص ان کی خدمت میں آیا- عرض کیا کافی عرصے سے بیمار ہوں، بہت علاج کرائے آرام نہیں آیا- انھوں نے کاغذ پر نسخہ لکھ دیا اور فرمایا: ”اسے پانی میں جوش دے کر پیو-“ چند روز بعد اس سے ملاقات ہوئی تو پوچھا دوا استعمال کی تھی؟
کہا: کون سی دوا؟ دوا تو آپ نے دی ہی نہیں- میں نے وہی تعویذ پانی میں جوش دے کر پیا جو آپ نے دیا تھا، اسی سے آرام آ گیا-
نسخے کو جو مولانا نے کاغذ پر لکھ کر دیا تھا اس نے تعویذ سمجھا اور اسی کو پانی میں جوش دے

کر پیا- اللہ نے شفا دے دی-

مشرقی پنجاب میں ایک گاؤں "مُڈاہر کلاں" تھا- ایک دفعہ وہاں گئے اور حسب معمول وعظ و نصیحت کی- لوگوں نے عرض کیا کہ یہاں ایک ملنگ رہتا ہے، جس کا نام عالم شیر ہے- اس نے اپنے ڈیرے میں ایک باغیچہ سا بنا رکھا ہے، جس میں اسی قماش کے لوگ آتے ہیں اور ہر وقت بھنگ، چرس اور افیون، گانجے کا دور چلتا ہے- گاؤں کے شریف لوگ اس سے نہایت پریشان ہیں، آپ دعا فرمائیں کہ اس مصیبت سے لوگوں کو نجات حاصل ہو-

فرمایا: آؤ مجھے بتاؤ، وہ ملنگ کہاں ہے؟ میں اس سے بات کرتا ہوں- لوگوں نے عرض کیا: آپ اس کے پاس نہ جایئے- وہاں ہر وقت بد اطوار لوگوں کی بھیڑ لگی رہتی ہے- وہ لوگ آپ سے نامناسب انداز میں بات کریں گے جسے ہم برداشت نہ کر سکیں گے اور معاملہ بگڑ جائے گا-

فرمایا: گھبرانے کی کوئی بات نہیں- آؤ میرے ساتھ چلو، اللہ بھلی کرے گا- چنانچہ مولانا نے عصا پکڑا جو ہمیشہ ان کے ہاتھ میں رہتا تھا اور عالم شیر کے باغیچے میں پہنچ گئے- اس وقت بھنگ گھوٹی اور چھانی جا چکی تھی اور پیالوں میں ڈالی جا رہی تھی- بلند آواز سے کہا "السلام علیکم"! عالم شیر اور اس کے ساتھی انھیں اچانک دیکھ کر گھبرا گئے- عالم شیر نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو مولانا نے اسے گلے لگا لیا- وہ اس کی کمر پر ہاتھ پھیرتے جاتے تھے اور فرماتے جاتے "کون کہتا ہے عالم شیر غلط آدمی ہے- کون کہتا ہے عالم شیر بھنگی چرسی ہے- یہ تو مولوی عالم شیر ہے- عالم بھی ہے اور شیر بھی ہے-"

مولانا کو زیادہ تر لوگ "باباجی" کہا کرتے تھے...... عالم شیر کا بیان کہ "باباجی" سے معانقہ کرنے اور یہ الفاظ ان کی زبان سے سننے کے بعد مجھے ایسا محسوس ہوا کہ کوئی بڑی وزنی چیز میرے دل سے اتر کر زمین پر گر گئی ہے- میری ظاہری آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے اور باطن کی آنکھیں کھلتی جا رہی تھیں- میں نے اسی لمحے گزشتہ گناہوں سے توبہ کر لی-

باباجی نے فرمایا: "مولوی عالم شیر! تمھارا باغیچہ مجھے بہشت کا نمونہ معلوم ہوتا ہے-"

یہ الفاظ تین دفعہ کہے اور فرمایا: ''دیکھو تو سہی کیا یہ بہشت کا نمونہ نہیں''؟

عالم شیر کہتا ہے: میرے تعجب کی انتہا نہ رہی کہ وہ میرے باغیچے جیسا باغیچہ نہ تھا بلکہ سچ مچ بہشت کا ٹکڑا معلوم ہو رہا تھا۔ چند لمحوں کے بعد وہ منظر نظروں سے اوجھل ہو گیا......''

حکیم عبدالوحید سلیمانی یہ واقعہ سننے اور دیکھنے والوں کی زبانی بیان کرتے ہیں کہ: ''اس کے بعد عالم شیر کی حالت بالکل بدل گئی۔''

نگاہ مرد مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

بلاشبہ محمد سلیمان کی نظر سے اس کی حالت بدل گئی اور وہ تاریخ صالحیت کا ایک زریں ورق ہو گیا۔

مولانا محمد سلیمان رحمتہ اللہ علیہ ایک دفعہ نماز عشاء پڑھنے کے لیے مسجد کو جا رہے تھے، شدید بارش ہو چکی تھی، گلیاں جوہڑ بنی ہوئی تھیں۔ تین چار آدمی ان کے ساتھ تھے۔ اچانک ان کا پاؤں پھسلا اور ایک گڑھے میں گر گئے جو پانی سے بھرا ہوا تھا۔ ان کے بھانجے میاں محمد ابراہیم ساتھ تھے۔ سب پریشان ہو گئے اور سوچنے لگے کہ گڑھے سے انھیں کیسے نکالیں، مگر دیکھا کہ وہ ایک دم باہر نکل آئے ہیں۔ جسم پر کہیں خراش تک نہیں آئی تھی۔ کپڑے بھی بالکل خشک تھے۔ ہم نے نہایت تعجب سے اس منظر کو دیکھا، لیکن اس کی تہ تک نہ پہنچ سکے، اور نہ مولانا سے پوچھ ہی سکے۔

ضلع فیروز پور، ضلع حصار اور ریاست بیکانیر کے سنگم میں ایک مشہور قصبہ ہے بازید پور......! اس علاقے میں مسلمان بہت کم تعداد میں تھے۔ وہاں مسلمانوں نے ایک چھوٹی سی مسجد بنائی، لیکن اس سے ملحقہ زمین ایک نہایت متعصب ہندو کی تھی، جو اپنی زمین میں کسی مسلمان کو قدم بھی نہیں رکھنے دیتا تھا، جب کہ مسجد میں جانے کا راستہ اس پلاٹ سے گزرتا تھا۔ ایک دن مولانا محمد سلیمان اس قصبے میں آئے تو مسلمانوں نے اپنی پریشانی سے آگاہ کیا۔ آپ نے انھیں اطمینان دلایا اور فرمایا گھبراؤ نہیں اللہ بھلی کرے گا۔ خدا کی قدرت دیکھیے کہ ابھی وہیں کھڑے تھے کہ وہی ہندو آیا۔ آتے ہی بابا جی کے پاؤں میں گر گیا اور ہاتھ جوڑ کر کہا آپ مجھے کوئی حکم دیں جس پر عمل کر کے میں آپ کو خوش کر سکوں۔

فرمایا: مجھے تم سے کوئی کام نہیں، لیکن یہ لوگ خدا کا نام لینا چاہتے ہیں ان کو تنگ نہ کرو اور زمین انھیں دے دو۔

فوراً کہا: آپ جتنی زمین پر نشان لگا دیں وہ مسجد کی رہی......! مولانا نے مناسب جگہ لے کر مسجد کے حوالے کر دی۔ ہندو نے اس کے بعد مولانا سے درخواست کی کہ میری شادی ہوئے مدت بیت چکی ہے، اولاد کی نعمت سے محروم ہوں، میرے لیے دعا فرمائیں۔

مولانا نے بارگاہ ایزدی میں دعا کی اور اللہ تعالیٰ نے اسے اس دعا اور کار خیر کی طفیل صاحب اولاد کر دیا۔

مولانا کا احترام مسلمان تو کرتے ہی تھے، ہندو اور سکھ بھی ان کی بے حد تکریم بجا لاتے تھے۔ جس راستے سے ان کا گزر ہوتا، ہندو اور سکھ دور ہی سے انھیں دیکھ کر تعظیماً ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہو جاتے اور جب تک وہ نظروں سے اوجھل نہ ہو جاتے اسی طرح کھڑے رہتے۔ یہ بھی دیکھنے میں آیا کہ وہ ان کے وضو کا پانی اکٹھا کر کے لے جاتے۔ اسے اپنے بیماروں کو پلاتے اور برکت حاصل کرنے کے لیے منہ پر ملتے۔

قیام پاکستان کے وقت پورے قصبے کے ہندو اور سکھ ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور رو رو کر کہنے لگے کہ ہمیں چھوڑ کر نہ جائیں۔ آپ گئے تو برکت اٹھ جائے گی اور ہم یتیم ہو جائیں گے۔ ہم آپ کی حفاظت کریں گے۔ باہر کے علاقے سے اگر کسی غنڈے نے حملہ کیا تو اس کا مقابلہ کریں گے اور آپ کو کوئی گزند نہیں پہنچنے دیں گے۔

لیکن مولانا نہیں مانے۔ جب وہ اس علاقے کے مسلمانوں کی رفاقت میں گھر سے نکلے تو پورے قصبے کے ہندو اور سکھ کئی میل تک انھیں رخصت کرنے کے لیے ان کے ساتھ آئے اور پھر آہیں بھرتے واپس ہو گئے۔

ان کا قافلہ بے شمار عورتوں، بچوں اور مردوں پر مشتمل تھا۔ رات کو ایک جگہ قیام ہوا تو وہاں کے سکھوں نے قافلے پر حملہ کرنے کا منصوبہ بنایا۔ نہتے مسلمان جن کے پاس سبزی کاٹنے والا چاقو بھی نہ تھا، ان کا کیا مقابلہ کرتے۔ مولانا سے درخواست کی کہ اس مصیبت سے بچنے کے لیے کچھ کیجیے۔ فرمایا اللہ کے سامنے جھک جاؤ اور اسی سے دعا مانگو۔ تم بھی دعا

کرو میں بھی دعا کرتا ہوں۔ لوگوں نے دیکھا کہ حملہ آور بوکھلا کر الٹے پاؤں بھاگ رہے ہیں۔ ان سے کسی نے پوچھا تم نے تو مسلمانوں کو لوٹنے اور قتل کرنے کا لمبا چوڑا منصوبہ بنایا تھا، اب بھاگ کیوں رہے ہو؟

جواب دیا: کچھ سمجھ میں نہیں آتا کیا ہوا۔ جب قدم آگے کی طرف بڑھاتے ہیں تو یوں لگتا ہے جیسے ہزاروں گنومانا راستہ روکے کھڑی ہیں۔ واپس مڑتے ہیں تو کچھ نظر نہیں آتا۔ آخر تنگ آ کر اپنا ارادہ بدل لیا۔

ایک بزرگ میاں اللہ دتہ مرحوم تھے۔ انھوں نے یہ واقعہ سنایا کہ ۱۹۴۷ء کے فسادات کے دوران ایک مقام پر مسلمانوں کا بے حد نقصان ہوا۔ کئی عالم فاضل شہید ہو گئے۔ میرے ایک بازو پر گولی لگی اور بازو ناکارہ ہو گیا۔ گرتے پڑتے پاکستان پہنچا اور مظفر گڑھ ہسپتال میں مرہم پٹی کراتا رہا، مگر زخم مندمل نہیں ہوا۔ ہڈی ٹوٹ گئی تھی، اس سے پیپ بہنے لگی، اور اس طرح چار مہینے گزر گئے۔

اسی دوران لاہور آئے تو شیخ قمر الدین مرحوم سے اپنے شیخ طریقت مولانا محمد سلیمان رحمۃ اللہ علیہ کا پتا معلوم ہوا، اور رات کی گاڑی میں سوار ہو کر علی الصبح جہانیاں پہنچ گئے۔ جمعے کا دن تھا۔ خدمت میں حاضر ہوئے۔ انھیں پریشان دیکھ کر اور بندھی ہوئی پٹی دیکھ کر پوچھا یہ کیا ہوا؟ تفصیل بتائی تو فرمایا: پٹی کھول دو۔ اللہ کے حکم سے یہ زخم اب بالکل ٹھیک ہے۔ لیکن بیٹا یاد رکھو تمھاری موت اسی زخم سے ہو گی اور اس وقت یہ پھر ہرا ہو جائے گا۔ اللہ تمھیں شہادت کی موت نصیب کرے گا۔ بس ان کی زبان مبارک سے یہ بات نکلنے کی دیر تھی کہ پھر نہ زخم، نہ درد، نہ پیپ۔ اسی روز بازو درست ہو گیا۔ پندرہ سال بعد بغیر کسی ظاہری سبب کے وہ زخم پھر ہرا ہو گیا۔ ہر چند علاج کے لیے کہا گیا، لیکن اللہ دتہ نہیں مانے اور یہی کہتے رہے کہ اب میں بچوں گا نہیں...... چنانچہ چند روز بعد خالق حقیقی سے جا ملے۔

اس طرح کے بہت سے واقعات سننے میں آئے ہیں۔ ان کا کہنا تھا، اللہ رب العزت جب چاہتا ہے اپنے کسی بندے پر کوئی حقیقت منکشف کر دیتا ہے۔ یہ کوئی اولیائی کی سند نہیں ہے۔

ان میں سب سے بڑی صفت یہ تھی کہ قرآن وسنت ہی کو منبع ہدایت سمجھتے تھے اور ایک ایک لمحہ اتباع سنت میں گزارنے کی کوشش کرتے تھے۔ خلوت میں صرف اللہ کے حضور گڑگڑاتے، اس کے سامنے جھکتے اور حمد و تسبیح میں وقت صرف کرتے۔ جلوت میں تلقین حق کا فریضہ سرانجام دیتے............ اپنی خداداد صلاحیتیں اور کوششیں وبا کی طرح پھیلی ہوئی بدعات، غیر شرعی رسوم اور مشرکانہ عقائد کے خلاف مختص کردی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی مساعی جمیلہ کو شرف قبولیت بخشا۔ ان کی صحبت میں بیٹھنے والے ان پڑھ بھی بعض عالموں اور واعظوں سے زیادہ علم رکھتے تھے۔ اگر کبھی باہر سے آنے والا کوئی عالم غیر ثقہ بات کہہ دیتا یا کوئی موضوع اور ضعیف روایت بیان کرتا تو عام لوگ ہی اس کی اصلاح کردیتے اور صحیح مسئلے سے اسے آگاہ کردیتے تھے۔

مولانا محمد سلیمان رحمۃ اللہ علیہ نے پوری زندگی تہجد کی نماز قضا نہیں کی۔ نماز عشا کے بعد دیر تک ذکر اذکار میں مشغول رہتے۔ ہر نماز کے بعد لمبا وظیفہ پڑھتے۔ اشراق باقاعدگی سے ادا کرتے، نماز پڑھتے وقت ان پر رقت طاری ہوجاتی۔ آیات عذاب آتیں تو روتے روتے ہچکی بندھ جاتی اور بسا اوقات بے حال ہوجاتے۔ اسی عذر کی بنا پر نماز کی امامت سے گریز کرتے کہ کہیں دوسرے لوگ اتنی لمبی قرأت کو بار نہ سمجھنے لگیں۔ تبلیغ کے ڈھنگ سے خوب آگاہ تھے۔ موقع و محل دیکھ کر دین کی دعوت دیتے اور اس انداز میں بات کرتے کہ دل کی گہرائیوں میں اترتی چلی جاتی۔

ایک شخص نے کئی سال پہلے ذکر کیا کہ میں ایک دفعہ روڑی گیا اور جلدی جلدی نماز پڑھ کر مسجد سے باہر نکلنے لگا۔ میری عمر اس وقت اٹھارہ انیس سال کے لگ بھگ تھی۔ مولانا کی نظر مجھ پر پڑی تو مجھے بلا کر کہا ماشاء اللہ تم نوجوان ہو، ہاتھ پاؤں میں طاقت ہے، قوت ہے، پھرتی ہے، ہر کام جلدی جلدی کرتے ہو۔ ہم تو بوڑھے ہوگئے، قوئ جواب دے گئے۔ مسجد میں گئے تو وہیں پڑے رہے، جلدی جلدی اٹھا نہیں جاتا، رکوع میں گئے تو جلدی اٹھ نہیں سکتے...... اس شخص نے بتایا کہ ان کے اس انداز کلام سے میں بے حد متاثر ہوا، اور اس واقعے پر تیس سال سے زیادہ عرصہ بیت گیا ہے لیکن جب بھی نماز پڑھنے لگتا ہوں بابا جی کی

بات یاد آجاتی ہے اور خود بخود نماز میں خشوع پیدا ہو جاتا ہے۔

برائی کے خلاف تیغ براں تھے۔ جہاں کہیں کوئی غیر شرعی اور غیر اخلاقی بات دیکھتے اسے رفع کرنے میں پوری کوشش کرتے۔ تقسیم ملک سے چند سال پہلے کی بات ہے، روڑی میں ایک ہندو تھانیدار نیا نیا آیا تھا، اس نے تھانے کے ساتھ بنی ہوئی مسجد کے باہر سازندوں کو بلا کر موسیقی کا پروگرام رچایا۔ مولانا کو پتا چلا تو جوش میں آگئے۔ کہنے لگے ہمارے ہوتے ہوئے ان ہندوؤں کی یہ جرأت...... فوراً عصا اٹھایا اور تھانے پہنچ گئے۔ تھانیدار کو پہلے ہی خبر مل گئی تھی کہ بابا جی آرہے ہیں۔ اس نے ان کے آنے سے قبل ہی اس لاؤ لشکر کو بھگا دیا اور خود بھی وہاں سے رفو چکر ہو گیا۔ اس وقت ان کی عمر اسی سال سے زیادہ تھی۔

وہ پنجابی کے قادر الکلام شاعر تھے، لیکن صرف نصیحت آموز شعر کہتے تھے۔ پنجابی زبان میں بیس کے قریب کتابیں لکھیں جن میں سے موعظۃ للمتقین، زینت الاسلام، سراج الاسلام، کتاب التعویذات، عجائب القرآن، فریضہ جمعہ، دروازہ بہشت، مرویات صحابہ، قدرت رحمان، سی حرفی، چودھویں صدی دا حال اور چہل حدیث کے متعدد مجموعے شامل ہیں۔ ان کتابوں میں قرآن واحادیث کے احکام ومسائل کا پنجابی اشعار میں ترجمہ کیا گیا ہے۔ عجائب القرآن میں قرآن مجید کے بارے میں ایسے ایسے باریک نکتے بیان کیے گئے ہیں جو کسی ''فنافی القرآن'' ہی کو سوجھ سکتے ہیں۔

ہر معاملے میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بتائے ہوئے طریقے پر چلتے تھے، کئی مرتبہ خواب میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت سے شرف یاب ہوئے۔

جہانیاں میں قیام پذیر تھے کہ طبیعت بے حد خراب ہو گئی، جب محسوس ہوا کہ اب آخری وقت آپہنچا ہے تو اپنے اعزہ واقارب سے کہا کہ جمعے کے دن میرا خیال رکھنا، وہ رخصت کا دن ہے۔ جمعے کا دن آیا تو طبیعت بہت زیادہ بگڑ گئی، نبضیں جواب دے گئیں۔ غشی طاری ہو گئی اور سب لوگ زندگی سے مایوس ہو گئے۔ معاً آنکھیں کھولیں اور فرمایا حدیث میں جمعے کی فضیلت تو بہت بیان ہوئی ہے لیکن محبوب خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال

پیر کو ہوا تھا۔ اس کے بعد طبیعت سنبھل گئی۔ تین دین ٹھیک رہے اور پیر کے روز ۲۱ نومبر ۱۹۴۹ء کو اپنے مولا سے جا ملے۔

اس فقیر کو ان کی خدمت میں جہانیاں حاضر ہونے کی سعادت بھی حاصل ہوئی ہے۔ یہ ۱۹۴۹ء کے وسط کی بات ہے۔ میں وہاں گیا اور اپنے دادا مرحوم کا نام لے کر اپنا تعارف کرایا۔ نہایت خوش ہوئے اور دعائیں دیں۔ میانہ قد، سفید داڑھی، گورا رنگ، خوب صورت نقش و نگار۔ میں ایک رات وہاں رہا۔ مولانا حکیم عبداللہ صاحب وہیں تھے، ان سے ملا۔ انھوں نے اپنا دواخانہ دکھایا۔ وہاں جن حضرات سے ملاقات ہوئی، ان میں ایک صاحب محمد صادق تھے، جو سلیمانی دواخانے سے منسلک تھے اور جماعت اسلامی سے تعلق رکھتے تھے اور اسی قسم کی باتیں کرتے تھے، جس قسم کی جماعت کے لوگ اس زمانے میں کیا کرتے تھے۔

مولانا محمد سلیمان مرحوم کی وفات کی اطلاع ملی تو میں نے ۲ دسمبر ۱۹۴۹ء کے ''الاعتصام'' میں مندرجہ تعزیتی شذرہ لکھا۔

''یہ اطلاع اہل حدیث کے تمام حلقوں میں افسوس سے سنی جائے گی کہ مولانا حکیم عبداللہ صاحب روڑی والے کے والد ماجد مولانا محمد سلیمان قریب قریب سو سال کی طویل عمر پا کر ۲۱ نومبر ۱۹۴۹ء کو انتقال فرما گئے۔'' انا للہ وانا الیہ راجعون

''مولانا مرحوم اپنے عقیدہ و عمل کی پاکیزگی و استواری کے لحاظ سے تمام جماعت میں مشہور تھے۔ ان کا شمار ان بزرگوں میں ہوتا تھا جو ظاہری خوبیوں کے ساتھ ساتھ باطن کے محاسن سے آراستہ ہونا بھی ضروری سمجھتے ہیں۔ یہ اہل حدیث کے ان اولین نمونوں کی نمائندگی کرتے تھے جن کے زہد و ورع کے چرچوں سے دوسرے دائرے بھی متاثر ہوتے تھے۔ چنانچہ ضلع حصار اور اس کے اردگرد کے لوگوں میں ان کی کرامات اور قبولیت دعا کا بڑا شہرہ تھا۔ اللہ تعالیٰ انھیں مراتب علیا سے سرفراز فرمائے۔

''تمام مقامات کی جماعت اہل حدیث سے درخواست ہے کہ ان کی نماز جنازہ غائبانہ پڑھی جائے۔''

اس زمانے میں جمعیت اہل حدیث لاہور کارپوریشن کے صدر حافظ محمد اسماعیل ذبیح مرحوم (خطیب جامع مسجد اہل حدیث مغل پورہ) اور ناظم اعلیٰ حاجی محمد اسحاق حنیف مرحوم تھے۔ لاہور کارپوریشن کی مجلس عاملہ کا اجلاس ۱۶ دسمبر ۱۹۴۹ء کو بعد از نماز جمعہ حافظ محمد اسماعیل ذبیح کی زیر صدارت مسجد مبارک میں ہوا تھا۔ اس اجلاس میں مولانا ابوالقاسم سیف بنارسی، مولانا محمد حسین ہزاروی، مولانا محمد سلیمان روڑی والے اور مولانا شبیر احمد عثمانی کی وفات پر تعزیتی قرارداد منظور کی گئی تھی۔

اللهم اغفرلهم وارحمهم وعافهم واعف عنهم

❀❀❀

مولانا نور حسین گھر جاکھی

(وفات ۱۸ دسمبر ۱۹۵۱)

اب وہ نسل تیزی سے ختم ہو رہی ہے جس نے متحدہ پنجاب کے بلاد وقصبات اور دیہات کی مسجدیں دیکھی تھیں جو نمازیوں سے آباد تھیں، جن میں دینی مدارس جاری تھے اور قال اللہ وقال الرسول کی صدائیں بلند ہوتی تھیں۔ جگہ جگہ تبلیغی جلسے منعقد کیے جاتے تھے اور مختلف مقامات سے علمائے کرام تشریف لا کر ان جلسوں میں لوگوں کو اللہ اور اس کے رسول کے احکام سناتے تھے۔ ان سے متاثر ہو کر جہاں خود مسلمانوں کی زندگیوں میں تبدیلی پیدا ہوتی تھی، وہاں ایسا بھی ہوتا کہ غیر مسلم اپنا آبائی مذہب چھوڑ کر اسلام قبول کر لیتے تھے اور پھر وہ اسلام کے بہت بڑے مبلغ اور پرچارک ہو جاتے تھے۔

پنجاب بڑے بڑے انتیس ضلعوں میں پھیلا ہوا متحدہ ہندوستان کا تیسرا بڑا صوبہ تھا۔ اس وقت پورا برصغیر گیارہ صوبوں پر مشتمل تھا۔ اس کا سب سے بڑا صوبہ یوپی تھا جو چھتیس اضلاع کا احاطہ کیے ہوئے تھا۔ اس سے چھوٹا بنگال تھا جس کا پھیر بتیس ضلعوں کا تھا اور تیسرا نمبر پنجاب کا تھا جو انتیس ضلعوں پر محیط تھا۔

ہندوستان کے تمام صوبوں کے مختلف مقامات میں مسلمان تبلیغی جلسے کرتے تھے جن میں توحید وسنت کے وعظ کہے جاتے تھے۔ پنجاب میں بھی یہ سلسلہ باقاعدگی سے جاری رہتا تھا۔ میرا تعلق پنجاب کی اس نسل سے ہے جس نے تبلیغی جلسوں کے انعقاد کا نظارہ کیا ہے اور واعظین کے وعظ سنے اور سامعین کو ان کے بارے میں اپنے تاثرات کا اظہار کرتے دیکھا ہے اور پھر ان کے تاثرات کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔

اس زمانے کے سامعین تو تھوڑی بہت تعداد میں موجود ہیں اور کہیں کہیں نظر آ جاتے ہیں، لیکن اس دور کے واعظین سے یہ علاقہ خالی ہو گیا ہے، اگر کہیں کوئی واعظ ہے بھی تو اس

کی حیثیت آثار قدیمہ کی سی ہے۔

ان واعظین میں ایک بزرگ مولانا نور حسین گرجاکھی تھے جو پنجابی کے بہت اچھے واعظ تھے اور بہت مقبول تھے اور تبلیغی جلسوں میں ان کی بڑی مانگ تھی۔ میں نے ان کو تقسیم ملک سے کئی سال پہلے اپنے وطن میں انجمن اصلاح المسلمین کے ایک سالانہ جلسے میں دیکھا تھا اور وہیں ان کی تقریر سنی تھی۔ گھٹا ہوا جسم، میانہ قد، گول سرخ چہرہ، سر پر مشہدی پگڑی، سیاہ داڑھی نہ چھوٹی نہ بڑی، گھٹنوں سے اوپر شلوار، وعظ کا انداز مؤثر، پیار کے لہجے میں بولتے تھے۔ پنجابی کے شاعر تھے اور وعظ میں شیریں آواز میں شعر پڑھتے تھے۔ مناظر بھی تھے۔ عیسائیوں، آریہ سماجیوں، مرزائیوں، شیعوں اور بریلویوں کے ساتھ مناظرے کرتے تھے۔

اب آئندہ سطور میں ان کے آباواجداد سے ان کے حالات کا آغاز کرتے ہیں۔

ڈھائی تین سو سال پہلے اس خاندان کے لوگ موجودہ ضلع حافظ آباد کے ایک گاؤں ''نھوسویا'' میں سکونت پذیر تھے اور وہاں کی ہنجرا برادری سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ لوگ اسلامی احکام پر عمل پیرا ہوئے تو سکھوں نے سخت برا مانا اور ان کے درپے آزار ہو گئے۔ چنانچہ ان میں ایک لڑکا مارے ڈر کے وہاں سے بھاگا اور گرجاکھ میں ایک لوہار کے پاس آ گیا اور وہیں رہنے لگا۔ اس نے لوہار سے کچھ کام سیکھا اور اپنی کما کر کھانے لگا۔ لوہار نے اسے شریف نوجوان سمجھ کر اپنی اکلوتی بیٹی اس کے نکاح میں دے دی۔ وہ اس خاندان کا پہلا مسلمان تھا جسے صاحب دین کہا جانے لگا اور پھر وہ اسی نام یعنی ''صاحب دین'' سے مشہور ہو گیا۔ تمام لوگ اسے بابا صاحب دین کہا کرتے تھے۔ اس کا بیٹا قطب دین تھا۔ نہایت نیک آدمی تھا اور جمعے کی نماز قلعہ میہاں سنگھ جا کر حضرت مولانا غلام رسول رحمۃ اللہ علیہ کی اقتدا میں پڑھا کرتا تھا۔ قطب دین اپنے باپ کا ایک ہی بیٹا تھا۔

قطب دین کے دو بیٹے ہوئے۔ ایک کا نام سوہندا تھا اور دوسرے کا نام دسوندھی۔ سوہندا پہلوانی کے فن سے دلچسپی رکھتا تھا اور بڑا طاقت ور تھا۔ ایک ہی وقت میں وہ کئی سیر گھی پی جاتا تھا اور گھی بہ آسانی اسے ہضم ہو جاتا تھا۔

اس زمانے میں لوگ بالعموم پیدل سفر کرتے تھے اور رات کو کرتے تھے۔ ایک مرتبہ وہ گھی کا گھڑا سفر پر اٹھائے رات کو اپنے کسی رشتے دار کے ہاں جا رہا تھا۔ ایک جگہ محسوس کیا کہ آگے چور قسم کے کچھ لوگ بیٹھے ہیں۔ اس نے وہیں گھڑا سر سے اتارا اور بیٹھ کر سارا گھی پی گیا اور گھڑا وہیں پھینک دیا۔ اب آگے گیا تو واقعی چند آدمی بیٹھے تھے۔ انھوں نے پوچھا: تم چلتے چلتے رک کیوں گئے تھے؟

کہا: میرے سر پر گھی کا گھڑا تھا۔ سوچا رات کا وقت ہے، اسے کہاں اٹھائے پھروں، اسے پینے کے لیے رک گیا تھا۔ خالی گھڑا وہاں پڑا ہے۔

انھوں نے یہ بات سنی تو راستہ چھوڑ کر دور ہٹ گئے۔ خیال کیا، یہ جن ہوگا جو گھی کا بھرا ہوا گھڑا پی گیا ہے اور اب انسانی شکل میں ہمارے سامنے کھڑا ہے۔

ان دنوں ایک کھیل ہوتا تھا جسے ''سونچی'' کہا جاتا تھا۔ یہ کبڈی اور جوڈو کراٹے کی قسم کا کھیل تھا۔ ایک شخص دوسرے کی طرف جاتا تو اسی طرح سے تھا' جس طرح کبڈی والا جاتا ہے، لیکن مقابل سے بچنے کے لیے اس کے سینے پر دوہتھڑ مار کر نکلنے کی کوشش کرتا تھا۔ سوہندا بھی سونچی کھیلتا تھا۔ ایک مرتبہ ایک سکھ جوان اس کے مقابلے کے لیے نکلا۔ سوہندا نے اس کے سینے پر دوہتھڑ مارے تو اس کا سینہ پھٹ گیا، اسے خون کی قے آئی اور تھوڑی دیر بعد وہ مر گیا۔

ایک مرتبہ سوہندا نے گاؤں کے کھلے میدان میں دیکھا کہ بہت سے لوگ گول دائرہ بنائے کھڑے ہیں۔ وہاں گیا تو ایک شخص نے لکڑی کے سوہاگے کے درمیان چادر ڈالی اور اسے دانتوں سے پکڑ کر گھٹنوں تک اٹھایا۔ اس پر لوگ زور زور سے تالیاں بجانے لگے۔ ان کے نزدیک یہ اس کے طاقت ور ہونے کا اعتراف اور اس کو داد دینے کا ایک انداز تھا۔

اس شخص نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے اکھاڑے کا چکر لگایا، کسی نے اس کو پیسے دیے اور کسی نے وہ چادر اس کی نذر کی جو اپنے جسم پر اوڑھ رکھی تھی۔ سوہندا نے بھی ایک چادر اوڑھی ہوئی تھی، جس کو اس شخص نے ہاتھ سے پکڑ کر کھینچ لیا۔ سوہندا نے کہا چادر تم لے لو، لیکن یہ کوئی طاقت کا مظاہرہ نہیں ہے جو تم نے کیا ہے۔

اس شخص نے یہ الفاظ سنتے ہی چادریں پھینک دیں اور سوہندا سے کہا تم نے مجھے للکارا ہے، آؤ مرد میدان بنو اور میرا مقابلہ کرو۔

سوہندا نے چادر سہاگے کے درمیان ڈالی اور دانتوں سے پکڑ کر سہاگے کو چھاتی کے برابر تک اٹھایا اور پھر ایک جھٹکے کے ساتھ اس کو سر سے کے اوپر سے پیچھے پھینک دیا۔

سوہندا کا ایک اور واقعہ سنا کر آگے چلتے ہیں۔ ایک دفعہ وہ دوپہر کے وقت کہیں سفر پر جا رہا تھا کہ سخت پیاس لگی۔ قلعہ دیدار سنگھ کے نواح اگوچک میں ایک رہٹ چل رہا تھا۔ اس زمانے میں میں لکڑی کے رہٹ ہوتے تھے اور پانی والی ''ٹنڈیں'' مٹی کی ہوتی تھی۔ انھیں باہم ملانے کے لیے رسی سے باندھا جاتا تھا۔ سوہندا پانی پینے کے لیے ایک ٹنڈ کھولنے لگا تو کنوئیں کے مالک زمیندار نے کہا ''اتنے بڑے جوان ہو، رہٹ چلا کر پانی پیو، ٹنڈ نہ کھولو'' سوہندا نے سمجھا زمیندار ہنسی مذاق کر رہا ہے، اس نے ٹنڈ کھولنے کا عمل جاری رکھا۔ زمیندار کو غصہ آیا تو اس نے ٹنڈ میں مٹی ڈال دی اور کہا رہٹ چلاؤ اور پانی پیو۔

سوہندا پانی پیے بغیر اسی وقت وہاں سے اٹھا اور واپس گھر آ گیا۔ شام کو اس کے ایک دوست نے اسے دیکھا تو کہا تم تو صبح سفر پر گئے تھے، اب واپس بھی آ گئے۔ اس نے واقعہ سنایا تو دونوں گھرجاکھ سے چلے اور اس کنوئیں پر آ گئے۔ ٹنڈیں کھول کر کنویں میں پھینک دیں اور اس کا تمام سامان چرکھڑی وغیرہ اٹھا کر گھرجاکھ لے آئے اور اسے ایک جوہڑ میں پھینک دیا، جسے مٹھائی ڈھاب کہا جاتا ہے۔

سورج نکلے زمیندار کنوئیں پر آیا تو اس کا یہ حال دیکھ کر حیران ہوا کہ یہ کیا معاملہ ہے۔ وہ پاؤں کے نشانات کی مدد سے گھرجاکھ اس جوہڑ پر آیا جس میں تمام سامان پھینکا گیا تھا۔ سخت متعجب ہوا کہ اتنے وزن کا سامان بغیر بیل گاڑی کے کون لے کر آیا ہے۔ اسے آدمی تو اٹھا نہیں سکتا کوئی جن ہی لایا ہوگا۔ گاؤں کے لوگ اکٹھے ہوگئے اس نے لوگوں سے کہا مجھے وہ آدمی دکھاؤ جو اسے سر پر اٹھا کر لایا ہے۔ چنانچہ سوہندا اس کے پاس آیا تو وہ اسے دیکھ کر اپنی اس حرکت پر بے حد شرمندہ ہوا جو دوپہر کے وقت ایک مسافر کے ساتھ اس نے کی تھی اور اسے پانی نہیں پینے دیا تھا۔ اس نے اسے پانچ روپے انعام دیے، ساتھ ہی پگڑی

دی جس کا مطلب یہ تھا کہ آئندہ وہ اس کا مخلص ترین دوست اور بھائی ہے۔

یہ سارا سامان وہ بیل گاڑی پر لاد کر اپنے گاؤں لے گیا۔

سوہندا کا ایک ہی بیٹا تھا' جس کا نام کرم الٰہی تھا۔ وہ نہایت خوش وضع اور خوش پوش تھا۔ گوجرانوالہ کے گھرجاکھی دروازے میں اس کی دکان تھی اور وہ اینٹیں پکانے والے بھٹوں کی چمنیاں بنایا کرتا تھا اور اسے مستری کرم الٰہی کہا جاتا تھا۔ اس کی نرینہ اولاد چار بیٹے تھے، جن کے نام بالترتیب یہ تھے: محمد علی، نور حسین، فضل کریم اور عبدالغنی۔

کرم الٰہی صرف بتیس سال عمر پاکر ۱۹۰۳ میں عین عالم جوانی میں فوت ہو گیا۔ باپ کی وفات کے وقت بڑے بیٹے محمد علی کی عمر بارہ سال تھی۔ وہ ۱۸۹۱ میں پیدا ہوئے تھے اور نور حسین کا سال ولادت ۱۸۹۳ تھا، وہ اس وقت صرف دس سال کے تھے، جب کہ فضل کریم اور عبدالغنی ان سے بھی چھوٹے تھے۔

یہ اس خاندان کے لیے نہایت پریشانی کا دور تھا۔ کرم الٰہی بھٹوں کی چمنیاں بناتا تھا تو اس کی آمدنی سے خاندان کی روٹی پانی کا سلسلہ چلتا تھا۔ اس کی وفات کے بعد یہ آمدنی بند ہو گئی تھی، اس کے لڑکے چھوٹے تھے جو یہ کام نہیں کر سکتے تھے اور نہ ان کو یہ کام سکھایا گیا تھا۔ لوگ ان کے پاس چمنیاں بنوانے کے لیے آتے تھے مگر یہ بچے نہیں بنا سکتے تھے۔ ایک دن ایک عجیب معاملہ ہوا۔ محمد علی نے خواب میں دیکھا کہ اس کے والد کرم الٰہی نے اس سے دو چمنیاں بنوائیں۔ وہ بیٹے سے چمنیاں بنوا بھی رہا ہے اور اسے بتا بھی رہا ہے کہ اس طرح بناؤ۔ محمد علی صبح اٹھا، دکان پر گیا تو اسی طرح چمنیاں بنانے لگا جس طرح خواب میں باپ نے بنوائی تھیں اور بنانے کا طریقہ بتایا تھا۔ یہ گویا اللہ کی طرف سے ایک رہنمائی تھی جس کے مطابق محمد علی نے یہ کام شروع کر دیا۔ یہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ محمد علی کو لوگ مولوی محمد علی کہا کرتے تھے، اس لیے کہ وہ قرآن مجید بہت اچھی طرح پڑھتے تھے۔ لوگ فجر کی نماز کے لیے ان کا انتظار کرتے تھے کہ وہ آئیں تو نماز پڑھائیں۔ محمد علی کا کوئی بچہ نہ تھا۔ والدہ کی خدمت اور چھوٹے بھائیوں کی نگہداشت ہی ان کا اصل کام تھا۔ ان کے علاوہ گھر کا کوئی فرد سادہ قرآن بھی نہیں پڑھ سکتا تھا۔

اب آیئے مولانا نور حسین کی طرف!

یہ ۱۸۹۳ میں پیدا ہوئے تھے اور جب ۱۹۰۳ میں باپ کی وفات ہوئی تو ان کی عمر دس برس کی تھی۔ پڑھنا لکھنا بالکل نہیں جانتے تھے۔ لکڑی کا کچھ کام سیکھ لیا تھا، اس لیے لوگ انھیں مستری کہا کرتے تھے۔ مستری کے طور پر صوبہ سرحد میں کوہاٹ کے آگے رئیساں ریلوے اسٹیشن پر ملازم ہو گئے تھے۔ اٹھارہ برس کی عمر میں ۱۹۱۱ میں ان کی شادی ہوئی۔ شادی سے کچھ عرصہ بعد محکمہ ریلوے کی سرکاری ملازمت چھوڑ کر گھر آ گئے تھے اور بڑے بھائی محمد علی کے ساتھ دکان پر کام کرنے لگے تھے۔ یہ دکان ان کے والد کرم الٰہی نے جیسا کہ پہلے بتایا گیا، گوجرانوالہ میں گھرجاکھی دروازے میں کھولی تھی۔

اب دیکھتے ہیں حصول علم کا شوق نور حسین کے دل میں کس طرح کروٹ لیتا ہے۔

ایک دفعہ سسرال گئے تو سسر نے اس خیال سے کہ لڑکا کچھ پڑھا لکھا ہوگا چند مسائل پوچھے، لیکن یہ کچھ نہ بتا سکے اس لیے کہ مسئلے مسائل سے انھیں کوئی تعلق نہ تھا۔ دل میں بے حد شرمندہ ہوئے۔ اس وقت گوجرانوالہ میں حضرت مولانا غلام رسول (قلعہ میہاں سنگھ والا) کے شاگرد مولوی علاء الدین اس مسجد میں امامت و خطابت کا فریضہ انجام دیتے تھے جو اب چوک نیائیں میں اہل حدیث کی مشہور مسجد ہے اور جس میں حضرت مولانا محمد اسماعیل سلفی کے درس و تدریس اور خطابت کا سلسلہ ۱۹۲۱ سے لے کر فروری ۱۹۶۸ (یعنی ان کی وفات) تک جاری رہا۔ مولوی علاء الدین کے زمانے میں یہ چھوٹی سی مسجد تھی اور تھوڑے سے نمازی تھے۔

نور حسین سسرال سے گھر آتے ہی مولوی علاء الدین کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ وہ انھیں قرآن مجید پڑھائیں۔ اس وقت ان کی عمر بیس سال کے قریب تھی۔ مولوی علاء الدین نے ان کو قرآن مجید کا ترجمہ پڑھانا شروع کر دیا۔ انھوں نے کہا حضرت میں تو بالکل ان پڑھ ہوں، آپ مجھے پہلے عربی کا قاعدہ پڑھایئے اور پھر سادہ قرآن مجید کی طرف آیئے۔ میں تو سادہ قرآن نہیں پڑھ سکتا، اس کا ترجمہ کیسے پڑھوں گا۔

مولوی صاحب نے فرمایا گھبراؤ نہیں، قرآن مجید کا ترجمہ پڑھنا شروع کرو، آسانی

سے پڑھ لو گے- اس طرح انھوں نے بیس سال کی عمر میں تعلیم کا آغاز کیا- چند پارے قرآن مجید کے ترجمے کے پڑھے تھے کہ ساتھ ہی مشکوٰۃ شریف شروع کرادی- اس طرح تھوڑے عرصے میں انھوں نے کافی کچھ پڑھ لیا-

اب تو گھرجاکھ گوجرانوالہ کے ایک محلے کی حیثیت اختیار کر گیا ہے، اس وقت گوجرانوالہ سے دو میل کے فاصلے پر تھا- مولانا نور حسین روزانہ تہجد کے وقت اٹھتے اور گوجرانوالہ کو روانہ ہو جاتے- راستے میں راجباہ تھا، اس میں وضو کرتے، مسجد میں آ کر باجماعت فجر کی نماز پڑھتے، بسا اوقات تہجد کی نماز مولوی علاء الدین کے ساتھ آ پڑھتے- نماز فجر کے بعد مولوی صاحب سے سبق پڑھ کر طلوع آفتاب کے وقت گھرجاکھی دروازے آ کر دکان کھولتے اور اپنے بڑے بھائی محمد علی کے آنے سے پہلے دکان کی صفائی وغیرہ سے فارغ ہو جاتے تھے-

چند سال یہ معمول رہا- پھر وہ اچھے خاصے عالم ہو گئے تھے اور روزانہ پیش آنے والے ضروری مسائل براہ راست عربی اور اردو کی دینی کتابوں سے حاصل کر لیے تھے- مسلک اہل حدیث کے اہم پہلوان کے علم ومطالعہ میں آ گئے تھے اور ان کی وضاحت کرنے لگے تھے- ان کے گھر کے افراد ان کے علم سے تو بہت خوش تھے لیکن ان کی اہل حدیثیت سے انھیں کوئی تعلق نہ تھا- رسوم ورواج کا وہی سلسلہ چلتا تھا جو پہلے سے چلا آ رہا تھا- مولانا نور حسین کے لیے یہ سلسلہ سخت پریشانی کا باعث تھا-

مولانا نور حسین نے حصول تعلیم کے ساتھ ساتھ وعظ وتبلیغ کا کام بھی شروع کر دیا تھا- مولانا علاء الدین جمعے کا خطبہ عربی میں دیتے تھے- خطبے کے بعد اعلان کر دیتے تھے کہ نماز کے بعد نمازی بیٹھے رہیں، مولوی نور حسین وعظ کریں گے- عصر کی نماز تک ان کا وعظ جاری رہتا- لوگ بڑے شوق اور توجہ سے وعظ سنتے- اس طرح وہ وعظ وتقریر کے میدان میں اترے- ان کے وعظ وتقریر کی شہرت بہت جلد گوجرانوالہ شہر میں بھی پھیل گئی تھی اور شہر سے باہر بھی آہستہ آہستہ لوگوں کو اس کا علم ہو گیا تھا- اس زمانے میں گوجرانوالہ بہت چھوٹا شہر تھا اور معاشرتی زندگی نہایت سادہ تھی-

مولانا نور حسین اپنا کاروبار بھی کرتے تھے اور وعظ وتقریر کا سلسلہ بھی جاری رکھتے تھے- کاروباری معاملے میں وہ کوہاٹ، مالاکنڈ، چکدرہ اور رسال پور بھی کچھ عرصہ رہے اور اس علاقے میں بطور واعظ بھی ان کی شہرت پھیلی-

ان کے بڑے بھائی مولوی محمد علی ۱۹۱۵ کے پس وپیش گوجرانوالہ سے شیخوپورہ چلے گئے تھے- دو سال کے بعد مولانا نور حسین نے بھی شیخوپورہ کا عزم کیا- وہاں کی پرانی آبادی میں ورکاں والی مسجد میں مولانا نور حسین خطبہ جمعہ دیتے تھے اور ان کے بھائی محمد علی جماعت کراتے تھے- لوگوں میں مشہور تھا کہ وعظ مولوی نور حسین بہت اچھا کرتے ہیں اور قرآن ان کے بھائی مولوی محمد علی نہایت عمدہ پڑھتے ہیں- اس طرح دونوں بھائیوں کی وہاں کافی شہرت ہوگئی تھی-

شیخوپورہ ہی میں مولانا نور حسین کو ٹی بی کا عارضہ لاحق ہوگیا- ان کی بیماری سے بڑے بھائی مولوی محمد علی نہایت پریشان ہوئے- وہ اللہ کی بارگاہ میں رو رو کر ان کے لیے دعاے صحت کرتے- آخر اللہ تعالیٰ نے فضل کیا اور بھائی کی دعا قبول ہوئی اور مولانا صحت یاب ہوگئے- صحت یابی کے بعد انھوں نے تبلیغ دین کے لیے مندرجہ ذیل ذرائع اختیار کیے-

☆ وعظ وتقریر

☆ مناظرات ومباحث

☆ تصنیف وتالیف

یہ نہایت اہم ذرائع تبلیغ تھے جو انھوں نے اختیار کیے اور اس زمانے کے حالات کے عین مطابق......! اب اس کی کچھ تفصیل ---

اس دور میں مسلمان اور غیر مسلمان اکٹھے رہتے تھے اور ہر مذہب کے لوگ اپنے مذہب کی سچائی ثابت کرنے اور لوگوں میں اس کے اثرات پھیلانے کے لیے عام جلسوں کے انعقاد یا انفرادی وعظوں کی صورت میں اپنی سرگرمیاں جاری رکھتے تھے- اس کے لیے مولانا نور حسین کو بھی بلایا جاتا تھا اور وہ اپنے اسلوب خاص سے بہت اچھا وعظ کہتے تھے- اپنے مافی الضمیر کا اظہار وہ پنجابی زبان میں لوگوں کی سمجھ کے مطابق ان کی ذہنی سطح سے ہم

آہنگ ہو کر کرتے تھے، جس سے لوگ نہایت متاثر ہوتے تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ توحید وسنت کی زیادہ اشاعت انہی واعظین ومقررین کی وجہ سے ہوئی ہے جو اپنے سامعین کی نفسیات کو اچھی طرح سمجھتے اور اسی آواز اور اسی زبان میں بات کرتے تھے جسے ان کے کان سننے اور ذہن قبول کرنے کے عادی تھے۔ زیادہ علمی اور مشکل باتیں کرکے ان کے ذہن پر بوجھ نہیں ڈالتے تھے۔ زیادہ علمی اور گہری باتیں کرنے والے مقررین کے بارے میں سامعین کو یہ تو پتا چل جاتا ہے کہ یہ بہت بڑا عالم ہے، لیکن وہ کہتا کیا ہے، اس کا انھیں کچھ پتا نہیں چلتا۔ مبلغ اور مقرر کو ہمیشہ اپنے سامعین کی ذہنی سطح کا خیال رکھنا چاہیے اور وہی بات کرنی چاہیے جو وہ آسانی سے سمجھ سکیں۔

وعظ میں بسا اوقات مولانا نور حسین کی آنکھیں اشک بار ہو جاتی تھیں۔ یہی اثر ان کے سامعین پر پڑتا تھا۔ ان کی آنکھوں سے بھی آنسو جاری ہو جاتے تھے۔

وعظ میں مسلک اہل حدیث کی حقانیت وہ نہایت سادہ اور آسان الفاظ میں موثر طریقے سے بیان کیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ گوجرانوالہ سے متصل موضع ''کھوکھر کے'' میں بریلوی، دیوبندی اور اہل حدیث کا مشترکہ جلسہ ہوا۔ صدر جلسہ بریلوی مسلک کے بزرگ تھے اور پہلی تقریر مولانا نور حسین گھرجاکھی کی تھی جو ایک گھنٹا جاری رہی۔ تقریر ختم ہوئی تو صدر جلسہ نے ان کی تقریر کے تاثرات بیان کرتے ہوئے کہا کہ اگر وہابی اسی قسم کے ہوتے ہیں جس کا ذکر مولانا نور حسین نے کیا ہے تو مجھے آج سے وہابی سمجھا جائے۔

ایک دفعہ وعظ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی قرہ بن ایاس رضی اللہ عنہ کا واقعہ بیان کیا کہ ان کی قمیص کا اوپر کا بٹن کھلا رہتا تھا۔ کسی نے اس کی وجہ پوچھی تو فرمایا میں نے اپنے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا ہے کہ ان کا یہ بٹن کھلا تھا۔ میں نے اسی وقت یہ بٹن کھول لیا اور پھر بند نہیں کیا۔ مولانا نور حسین نے یہ واقعہ بیان کرکے فرمایا کہ میں نے ۳۳ سال پہلے یہ واقعہ پڑھا تھا۔ اس وقت سے میں نے قمیص کا اوپر کا بٹن بند نہیں کیا --- اس واقعہ کا سنت نبوی سے کوئی تعلق نہیں، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی نے چونکہ آپ کا بٹن کھلا دیکھ کر اپنا بٹن بند نہیں کیا تھا، اس لیے مولانا نور حسین نے بھی بٹن بند نہیں کیا۔

ضلع حافظ آباد میں سکھوں کا ایک گاؤں تھا جس کا نام ''ونی'' تھا۔ وہاں مولانا نور حسین وعظ کے لیے گئے تو پتا چلا کہ یہاں مسلمانوں پر اذان کہنے کی پابندی عائد کر دی گئی ہے۔ مولانا نے وعظ میں بابا نانک کی بانیاں سنانا شروع کر دیں اور کہا کہ بابا جی تو خود اذان کہتے تھے اور اب سکھوں کے لیے اذان سننا مشکل ہو گیا ہے اور انھوں نے اذان پر پابندی عائد کر دی ہے۔

یہ وعظ سکھوں نے بھی سنا اور صبح ان کے سرکردہ افراد مولانا کے پاس آئے اور کہا کہ ہم نے اذان بند نہیں کی۔ ہم نے مسلمان بھائیوں سے یہ کہا تھا کہ یا تو اذان چھوڑ دو یا حقہ چھوڑ دو۔ انھوں نے حقہ نہیں چھوڑا اذان چھوڑ دی۔ سکھوں نے مولانا سے کہا کل آپ مسلمانوں کے مہمان تھے، آج ہمارے مہمان ہیں۔ رات کو آپ کا وعظ ہم کرائیں گے۔۔۔۔۔۔اس کے بعد اس گاؤں میں اذان ہونے لگی۔

ایک دفعہ وعظ کے لیے (ضلع شیخوپورہ کے قصبے) فیروز وٹواں گئے۔ نہایت موثر وعظ کیا۔ ایک شخص مولانا کے پاس آیا اور کہا کہ اس کا بیل بہت مارتا ہے۔ اسے کھولنا اور باندھنا بے حد مشکل ہے۔ آپ اللہ اللہ کر کے اس پر کوئی دم کریں گے تو ہمیں یقین ہے بیل مارنا بند کر دے گا۔ مولانا نے فرمایا بیل کے کان میں کہو کہ مولوی نور حسین کہتا ہے مار انہ کر۔ اس شخص کا بیان ہے کہ اس کے بعد جوان، بوڑھے اور بچے بھی بیل کو پکڑ لیتے تھے۔ اس نے کبھی کسی کو نہیں مارا بلکہ کسی کے سامنے کبھی کان بھی نہیں ہلائے۔

بلاشبہ مولانا ایک صالح بزرگ تھے۔ پنجابی کے بہت اچھے واعظ تھے اور پنجاب کے مختلف علاقوں میں وعظ کے لیے انھیں بلایا جاتا تھا، وہ جاتے تھے اور نہایت موثر وعظ کہتے تھے۔

مناظرے میں بھی ان کا ایک انداز تھا اور یہ انداز انھوں نے حضرت مولانا ثناء اللہ امرتسری رحمۃ اللہ علیہ سے سیکھا تھا۔ وہ کسی سے مناظرہ شروع کرنے سے پہلے دو نفل پڑھتے اور پھر اللہ سے کامیابی کی دعا کر کے مناظرے کا آغاز کرتے تھے۔ انھوں نے کئی مرتبہ عیسائیوں، آریہ سماجیوں، مرزائیوں اور دیگر مذاہب کے مشہور مناظرین سے مناظرے

کیے اور ہر مناظرے میں اللہ تعالیٰ نے کامیابی عطا فرمائی۔

ان کے مناظرے کا ایک واقعہ جو مولانا محمد حنیف ندوی نے سنایا تھا، میں نے پہلے بھی ایک کتاب میں لکھا تھا، پیش نظر کتاب میں بھی مولانا محمد ابراہیم سیالکوٹی کے تذکرے میں مرقوم ہے۔ یہاں بھی ملاحظہ فرماتے جائیے۔

پادری عبدالحق عیسائیوں کا ایک مشہور اور بہت پڑھا لکھا مناظر تھا۔ مناظرے میں زیادہ تر منطقی اصطلاحیں استعمال کرتا تھا کہ فلاں چیز کلی ہے یا جزی۔ اس طرح حریف کو منطق کے زور سے دبائے رکھتا تھا۔ ایک دفعہ گوجرانوالہ میں اس کا مناظرہ مولانا محمد ابراہیم سیالکوٹی سے ہوا۔ یہاں بھی اس نے یہی سلسلہ شروع کیا۔ مولانا سیالکوٹی خود بہت بڑے عالم اور منطق وفلسفہ کے ماہر تھے۔ ان کے لیے اس کا مقابلہ کوئی مشکل کام نہ تھا، لیکن مولانا اکثر اوقات غصے میں آجاتے تھے اور پادری کو ان کی طبیعت کا علم تھا، وہ انھیں غصے میں لانا چاہتا تھا، غصہ مناظرے کے اصولوں کے منافی ہے۔ مولانا غصے میں آئے تو پادری نے اس سے فائدہ اٹھا کر اعتراضات کا سلسلہ تیز کر دیا۔ مولانا نور حسین بھی موجود تھے، انھوں نے دو تین دفعہ مولانا سے گزارش کی کہ انھیں پادری صاحب کے اعتراضات کا جواب دینے کا موقع دیا جائے، لیکن انھیں موقع نہیں دیا گیا۔ بالآخر مولانا نور حسین نے زیادہ منت سماجت کی تو انھیں پادری عبدالحق کے مقابلے میں آنے کی اجازت دی گئی۔ اب پادری بہت خوش ہوا کہ یہ زیادہ پڑھے لکھے نہیں ہیں اور منطق وفلسفے کے مسائل سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے، ان سے جلد ہی نمٹ لیا جائے گا۔

مولانا نور حسین نے سٹیج پر آتے ہی پادری صاحب سے کہا:

"پادری صاحب! مجھ سے بات کیجیے۔ میں ابھی آپ کی کلیوں ولیوں کو آگ لگا کر راکھ کا ڈھیر بنا دوں گا۔"

"کلی" پنجابی میں جھونپڑی کو کہا جاتا ہے۔ گوجرانوالہ کے زیادہ تر عیسائی کلیوں (جھگیوں اور جھونپڑیوں) میں رہتے تھے۔ مولانا نور حسین کی دھمکی سنتے ہی وہ ہاتھ جوڑ کر پادری عبدالحق کے سامنے کھڑے ہو گئے کہ خدا کے لیے مناظرہ بند کر دیجیے۔ آپ تو

چلے جائیں گے اور یہ مسلمان ہم غریب لوگوں کی کلیوں کو آگ لگا کر جلا دیں گے۔ پادری نے ان سے بہت کہا کہ منطق کی کلی اور ہے، رہائش کی اور --- لیکن عیسائی نہیں مانے، مولانا نور حسین کا تیر چل چکا تھا۔ اس طرح وہ مناظرہ جو کئی گھنٹوں سے جاری تھا اور کلیوں میں الجھا ہوا تھا، مولانا نور حسین کی حاضر جوابی سے پانچ منٹ میں ختم ہو گیا۔

اب آیئے ان کی تصنیفات کی طرف............!

انھوں نے چھوٹی چھوٹی متعدد کتابیں تصنیف کیں۔ لیکن ان میں زیادہ تر کتابیں پنجابی نظم میں ہیں اور اہل حدیث مسلک سے متعلق ہیں۔

پنجابی کے وہ بہت اچھے شاعر تھے اور نور تخلص کرتے تھے۔ ان کی پہلی کتاب کا نام "وفات نامہ" ہے جو گوجرانوالہ کے اسلامیہ ہائی سکول کے بانی مولوی محبوب الٰہی کے متعلق ہے۔ وہ ۱۹۱۴ میں فوت ہوئے تھے۔ اس شہر اور ضلعے کی معروف شخصیت تھے۔ ان کی وفات پر مولانا نور حسین نے پنجابی نظم میں کتاب لکھی تھی جو انہی دنوں شائع ہوئی تھی اور چند روز میں ختم ہو گئی تھی۔

اس زمانے میں پنجابی کے ایک مشہور شاعر "سائیں نقد" کا گوجرانوالہ میں بڑا شہرہ تھا۔ ان کی صدارت میں ہر مہینے پنجابی مجلس مشاعرہ منعقد ہوا کرتی تھی۔ مولانا نور حسین اس میں شریک ہوتے تھے، لیکن سائیں نقد نے ایک روز ان سے کہا کہ یہاں آنے والے شاعر اچھے کریکٹر کے لوگ نہیں ہیں، بسا اوقات بڑی فضول باتیں کرتے ہیں، تم سے مجھے ہمدردی ہے، تمھیں اس مجلس سے دور ہی رہنا چاہیے۔ اس کے بعد مولانا اس مجلس میں تو نہیں گئے البتہ شعر بہ دستور کہتے رہے۔

ان کی کتاب "وفات نامہ" کا ذکر ہو چکا ہے جو ۱۹۱۴ میں لکھی۔ ۱۹۱۴ ہی میں شہادت حسین لکھی۔ یہ بھی پنجابی نظم میں ہے۔ ۱۹۱۶ میں تحقیق الایمان لکھی۔ اس کے بعد عید الفطر، معراج جسمانی در تردید قادیانی، مناظرہ پھلوکے۔ یہ اس مناظرے کا قصہ ہے جو مولانا نے قادیانیوں سے موضع پھلوکے میں کیا تھا۔ مرزے دا ترل منارہ، اختلاف ائمہ در تقلید، بجلی آسمانی ہر ملا ملتانی، امام اعظم، گلدستہ نور، آسمانی گولا بر بدعتی ٹولا، ختم نبوت، رفع الیدین،

رسالہ آمین بالجہر، رسالہ قبر پرستی، رسالہ علم غیب، مسائل رمضان مع تحقیق التراویح، نصیحت بے نمازاں، احوال گور، اربعین باحادیث المرسلین، تحریف اناجیل، تقابل اربعہ، چودھویں صدی کا دجال اور فضائل مصطفیٰ وغیرہ کئی رسائل لکھے جن میں سے زیادہ چھپ گئے ہیں اور ان کے متعدد ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ بعض کے مسودے محفوظ ہیں۔

مولانا کی مالی حالت ماشاءاللہ بہت اچھی تھی۔ انھوں نے چار حج کیے۔ پہلا حج ۱۹۲۶ میں کیا۔ اس سے ایک سال پہلے ۱۹۲۵ میں سلطان عبدالعزیز ابن سعود نے حجاز پر قبضہ کیا تھا۔ سلطان سے ان کی ملاقات بھی ہوئی تھی۔ دوسرا حج ۱۹۳۹ میں، تیسرا ۱۹۴۶ میں اور چوتھا ۱۹۴۸ میں کیا۔ وہ تہجد گزار اور ہمدرد خلائق عالم تھے۔

ان کا زمانہ بھرپور سیاست کا زمانہ تھا۔ لیکن ان کا عملی سیاست سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ نہ وہ کانگرسی تھے نہ مسلم لیگی، نہ کسی اور سیاسی جماعت سے وابستہ۔ البتہ ذاتی تعلقات مقامی طور پر سب لوگوں سے تھے اور وہ ان کا بے حد احترام کرتے تھے۔ ہندو اور سکھ بھی انھیں تکریم کی نظر سے دیکھتے تھے۔

اس موقعے پر ان کی اولاد کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے۔

ان کا پہلا بیٹا ۱۲ دسمبر ۱۹۱۴ کو پیدا ہوا جس کا نام عبدالواحد رکھا۔ یہ غزل، نظم، حمد اور نعت کے بہت بڑے شاعر تھے۔ راسخ ان کا تخلص تھا۔ ان کے کئی شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ میرے دوست تھے اور ''الاعتصام'' میں ان کا کلام شائع ہوتا رہتا تھا۔ مولانا نور حسین پنجابی کے شاعر تھے تو بیٹا اردو کا شاعر ہوا۔

مولانا نور حسین کے بڑے بھائی محمد علی اولاد سے محروم تھے۔ عبدالواحد پیدا ہوا تو بالخصوص محمد علی نے بے حد خوشی کا اظہار کیا اور کئی قسم کی غیر شرعی رسمیں کیں۔ لیکن مولانا نور حسین ان رسوم کو ترک کر چکے تھے، انھوں نے اس پر احتجاج کیا تو گھر کا سارا ماحول بدل گیا اور سب نے غلط رسوم سے توبہ کی۔

مولانا کے بھائی محمد علی نے ستمبر ۱۹۲۴ میں وفات پائی، جب کہ ان کے چھوٹے بھائی اس سے تقریباً ڈھائی سال قبل مارچ ۱۹۲۲ میں فوت ہو گئے تھے۔

۱۹ جنوری ۱۹۱۹ کو مولانا کے دوسرے بیٹے کی پیدائش ہوئی، جس کا نام عبدالخالق رکھا گیا- وہ کچھ بڑے ہوئے تو طلب معاش کے لیے افریقہ چلے گئے تھے، پچیس سال کے بعد وطن واپس آئے تھے-

تیسرے بیٹے کی ولادت ۱۱ جنوری ۱۹۲۲ کو کو ہوئی، جس کا نام اس کے تایا محمد علی نے خالد رکھا--- اور یہ وہی خالد ہیں جو مولانا خالد گھرجاکھی کے نام سے معروف ہیں اور کئی کتابوں کے مصنف ہیں- اس فقیر کے مخلص دوستوں میں ان کا شمار ہوتا ہے- ۱۹۴۱ میں یہ عاجز گوجرانوالہ میں حضرت حافظ محمد گوندلوی اور مولانا محمد اسماعیل سلفی کے حلقہ شاگردی میں شامل تھا- اس وقت خالد گھرجاکھی صاحب میرے ہم جماعت تھے-

چوتھے بیٹے کی پیدائش ۲۵ جنوری ۱۹۲۴ کو ہوئی، ان کا نام عبدالحق ہے-

پانچواں بیٹا ۱۶ جولائی ۱۹۲۹ کو پیدا ہوا- یہ سب سے چھوٹے ہیں اور ان کا نام ہے عبدالغنی- اچھے شاعر ہیں اور انھیں ثاقب عرفانی کہا جاتا ہے- یہ اپنے بڑے بھائی راسخ عرفانی صاحب کے ساتھ بھی مجھے اور مولانا محمد حنیف ندوی سے ملاقات کے لیے کئی دفعہ ادارہ ثقافت اسلامیہ گئے اور راسخ عرفانی کی وفات کے بعد بھی گئے-

مولانا نور حسین گھرجاکھی کو میں نے پہلی دفعہ اپنے پرانے وطن کوٹ کپورہ میں انجمن اصلاح المسلمین کے اجلاس میں دیکھا تھا اور ان کی تقریر سنی تھی- وہ کئی دفعہ وہاں گئے تھے-

قیام پاکستان کے بعد جمعیت اہل حدیث کی پہلی کانفرنس مئی ۱۹۴۹ کے آخر میں لاہور میں منعقد ہوئی تھی- اس وقت میں مرکزی جمعیت کا آفس سیکرٹری تھا- اس کانفرنس میں مقرر کی حیثیت سے مولانا نور حسین کو ضرور بلایا گیا ہوگا اور وہ تشریف لائے ہوں گے اور انھوں نے تقریر بھی کی ہوگی، لیکن مجھے یاد نہیں-

اگست ۱۹۴۹ میں مولانا محمد حنیف ندوی کی ادارت میں گوجرانوالہ سے اخبار "الاعتصام" جاری ہوا تو مجھے معاون مدیر کی حیثیت سے گوجرانوالہ بھیجا گیا- میں ان دنوں اخبار میں "ہمارے علما" کے عنوان سے اہل حدیث علمائے کرام کے مختصر حالات لکھا کرتا تھا- مولانا نور حسین کے مولانا محمد اسماعیل سلفی اور مولانا محمد حنیف ندوی سے بے تکلفانہ

مراسم تھے اور یہ تینوں بزرگ ایک ہی شہر گوجرانوالہ کے رہنے والے تھے۔ مولانا نور حسین کا سال ولادت ۱۸۹۳، مولانا محمد اسماعیل کا ۱۸۹۶ اور مولانا محمد حنیف ندوی کا ۱۹۰۸ تھا۔ اس طرح مولانا نور حسین سے مولانا محمد حنیف ندوی پندرہ سال اور مولانا اسماعیل سلفی سے تیرہ سال چھوٹے تھے، لیکن آپس میں بے تکلف تھے۔ ایک دن چند حضرات نماز ظہر کے بعد مولانا اسماعیل مرحوم کی مسجد میں بیٹھے تھے کہ مولانا نور حسین نے مجھ سے کہا: ''تم علماے کرام کے حالات کس طرح لکھتے ہو اور جس انداز سے لکھتے ہو یہ انداز تم نے کس سے سیکھا ہے............''؟ از راہ کرم یہ بھی فرمایا: ''بہت اچھا لکھتے ہو۔''

مولانا محمد اسماعیل صاحب یہ الفاظ سن کر مسکرائے (وہ مولانا نور حسین کو صرف نور حسین کہا کرتے تھے) مجھے مخاطب کرکے فرمایا: تمھیں پتا چل گیا نور حسین نے تم سے یہ سوال کیوں کیا ہے؟ یہ حسن طلب ہے۔ اس نے دراصل تم سے یہ کہا ہے کہ میرے بارے میں بھی لکھو۔ تم اس کی خواہش پوری کردو اور اس پر مضمون لکھ دو۔

مولانا کی یہ بات سن کر مولانا نور حسین سمیت سب حاضرین مجلس ہنس پڑے، لیکن میں مودبانہ شکل بنائے خاموش بیٹھا رہا۔

اس کے بعد مولانا نور حسین سے مجھے بارہا سلام عرض کرنے اور ان سے باتیں کرنے کی سعادت حاصل ہوئی۔

اب تک میں نے مولانا نور حسین کا مسکن گھرجاکھ نہیں دیکھا تھا۔ اس وقت وہ گوجرانوالہ سے دو میل کے فاصلے پر ہوگا، اب شہر کے ساتھ مل گیا ہے۔ میرے پرانے دوست چودھری غلام حسین تہاڑیہ اس وقت گورنمنٹ کالج گوجرانوالہ کے لائبریرین تھے اور گھرجاکھ میں ان کی رہائش تھی۔ ایک دن وہ مجھے اپنے مکان پر گھرجاکھ لے گئے۔ مغرب کی نماز ہم نے مولانا نور حسین کی مسجد میں پڑھی۔ لیکن یہ یاد نہیں کہ مولانا اس وقت وہاں تشریف فرما تھے یا نہیں۔ یہ میرا گھرجاکھ کا پہلا چکر تھا۔ دوسری دفعہ مولانا کی وفات پر گیا۔

مولانا کے بیٹے ان کے بے حد وفادار اور خدمت گزار تھے۔ بڑے بیٹے راسخ عرفانی مرحوم کا کاروبار مولانا اسماعیل صاحب کی مسجد کے قریب تھا اور وہیں ان کی سکونت تھی اور وہ

لائق اکرام باپ کو وفات سے کچھ عرصہ پہلے اپنے گھر لے آئے تھے- سردیوں کے دن تھے- ایک روز شام کے بعد مجھے کسی نے بتایا کہ مولانا نور حسین وفات پا گئے ہیں- اس وقت مولانا اسماعیل سلفی مغرب کی نماز پڑھ کر اپنے مکان پر تشریف لے جا رہے تھے- میں نے دوڑ کر انھیں یہ خبر سنائی تو انھوں نے انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھا اور فرمایا اخبار چھپنے کے لیے کب جائے گا؟ میں نے عرض کیا: کل! فرمایا: میں ابھی گھر سے ہو کر آتا ہوں- تم مولوی حنیف کے پاس جاؤ اور ان سے کہو کہ کل اخبار پریس چلا جائے گا، آج وہ مولوی نور حسین کی وفات پر اداریہ لکھیں-

میں مولانا ندوی کے گھر گیا اور انھیں مولانا نور حسین کی خبر وفات سنائی اور اداریے کے لیے کہا تو وہ نہایت مغموم ہوئے اور فرمایا: اس پریشانی میں کیا لکھا جائے گا- اچھا کچھ لکھتا ہوں- میں واپس آیا تو تھوڑی دیر میں مولانا اسماعیل بھی تشریف لے آئے اور مولانا حنیف ندوی بھی آ گئے- چند اور حضرات بھی آ گئے اور مولانا نور حسین کی باتیں ہونے لگیں- مجھے حکم دیا کہ تم راسخ عرفانی کے گھر جا کر پتا کرو کہ میت کو گھرجاکھ تو نہیں لے گئے- میں گیا تو مولانا نور حسین چارپائی پر بیٹھے تھے اور حالت کافی بہتر تھی- وفات کی خبر یوں ہی کسی نے اڑا دی تھی-

میں نے واپس آ کر عرض کیا: تو میری بات سنتے ہی مولانا اسماعیل اور مولانا حنیف ندوی ہنس پڑے اور فرمایا: چلیے ان کے گھر چلتے ہیں- مولانا اسماعیل نے فرمایا: اسحاق نے تو آپ کی وفات کی اطلاع دے کر ہمیں مصیبت میں ڈال دیا تھا- آپ تو اچھے بھلے ہیں- مولانا ندوی نے فرمایا: میں نے تو آپ کی وفات پر اداریہ بھی لکھنا شروع کر دیا تھا اور چند سطریں لکھ بھی لی تھیں- مولانا نور حسین ہنسے اور بولے آپ کے دل میں میری بڑی عزت ہے اور میری موت پر اتنا افسوس کہ اخبار میں تعزیتی اداریہ لکھا جانے لگا- اب اداریے کا وہ حصہ مجھے سنایئے جو آپ نے لکھا ہے-

اس سے چند روز بعد ۱۸ دسمبر ۱۹۵۱ کو رات کے دس بجے وہ وفات پا گئے- مولانا محمد حنیف ندوی نے ان کی وفات پر اداریہ لکھا جو ۲۸ دسمبر ۱۹۵۱ کے ''الاعتصام'' میں شائع ہوا-

اس اداریے میں مولانا نور حسین گھر جاکھی کی تبلیغی سرگرمیوں کی پوری تصویر کھینچ دی گئی ہے۔

مولانا محمد حنیف ندوی نے ان کی معاشرتی زندگی، لوگوں کے ساتھ ان کے میل جول، ان کی خوش مزاجی وخوش طبعی، ان کے حسن اخلاق، ان کی صالحیت، ان کے گھریلو معاملات اور بچوں کے لیے ان کے انداز تربیت وغیرہ کی نہایت عمدہ پیرائے میں نشان دہی کر دی ہے۔

اداریہ مولانا نور حسین گھر جاکھی کی تاریخ کا ایک نہایت شان دار ورق ہے، اس لیے ہم اسے یہاں درج کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ اس کا عنوان ہے:

"آہ! مولانا نور حسین مرحوم"

ملاحظہ فرمائیے!

"دل نہیں مانتا کہ ایسا خوش گفتار اور ہمیشہ خنداں وفرحاں رہنے والا انسان بھی موت کی آغوش میں جا سکتا ہے اور اپنے متعلقین اور دوستوں کو غم واندوہ کے اتھاہ سمندر میں ڈال سکتا ہے، جس کا ایک خندہ وقہقہہ ہزار کلفتوں کو دور کر سکتا تھا۔ مگر اس کا کیا کہیے کہ موت کا قانون ہمہ گیر ہے۔ اس میں کوئی استثنا نہیں اور رب العزت کی پیدا کردہ سب مخلوق کو موت کا کڑوا پھل چکھنا ہے اور فنا وہلاکت کے گھاٹ اترنا ہے۔

"موت سے چند ہی دن پہلے مرحوم پر ذیابیطیس کا شدید حملہ ہوا اور غیر شعوری طور پر ان کو کچھ احساس سا ہو گیا کہ اب زندگی کا پیمانہ چھلکنے کو ہے۔ اس لیے جس سے ملتے اس طرح آب دیدہ ہو کر کہ گویا آخری ملاقات ہے۔ چنانچہ گھر جاکھ میں خطبہ جمعہ کے دوران میں جب کہ ابھی اچھے خاصے تھے لوگوں سے کہا کہ شاید میری یہ باتیں تم دوبارہ نہ سن سکو۔

"راقم الحروف ایک دن عیادت کے لیے گیا تو حسب معمول بڑے تپاک اور خلوص سے ملے۔ بیماری سے متعلق گفتگو ہوتی رہی۔ میں نے ہر چند یقین دلانے کی کوشش کی کہ یہ مرض ایسا خطرناک ہرگز نہیں ہے۔ اگر سخت پرہیز اختیار کی جائے اور کھانے پینے میں ضبط واحتیاط ملحوظ رہے تو برسوں تک اس میں مبتلا ہونے کے باوجود انسان اپنے مشاغل کو جاری رکھ سکتا ہے۔ لیکن ان کی باتوں سے محسوس ہوتا تھا کہ "قرب اجل" کا کھٹکا خاطر کو پریشان کیے ہوئے ہے اور اب ان کی نظریں دنیا سے ہٹ کر یکسر عقبیٰ کے مسائل واحوال

پر مرکوز ہو رہی ہیں۔

"بار بار پوچھتے تھے کہ میری حقیر خدمات بخشش کا سبب ہو سکتی ہیں؟ میں نے تسکین دہی کی غرض سے متعدد دفعہ موضوع بدلا اور لطائف بیان کیے تا کہ ان کی شدت احساس میں کسی قدر کمی ہو اور طبیعت بہلے، مگر ان کے کانوں میں ہاتف کی طرف سے بلاوے کی بھنک پڑ چکی تھی۔ اس لیے.........توجہ اسی طرف مڑی رہی اور دل برابر مشوش ہی رہا۔

"مرحوم میں کیا خوبیاں تھیں؟ احسان ناشناسی ہوگی اگر ان پر ہلکا سا تبصرہ نہ کیا جائے۔ جن لوگوں کے ذہن میں تقسیم ملک سے پہلے کا نقشہ موجود ہے، ان کو یاد ہوگا جب مرزا صاحب نے نبوت کا ڈھونگ رچایا اور اپنے تبلیغی ہتھکنڈوں سے کچھ پڑھے لکھے لوگوں کو پھانسنے میں کامیاب ہو گئے۔ جب دیانند نے ہندوؤں میں تعصب و نفرت کے بیج بوئے اور ان میں پہلی مرتبہ مسلمانوں کے خلاف نفرت و حقارت کے جذبات پیدا کرنے کی سعی کی۔ اور جب عیسائی مبلغین کی تلخ کامیوں سے متحدہ ہندوستان کے مسلمانوں میں اختلاف رائے اور آزردگیٔ خاطر کی ایک لہر پیدا ہوئی اور خود مسلمانوں کی صفوں میں بھی انتشار و تشتت کی آندھیاں چلیں۔ یہ وہ نازک دور تھا جب مسلمانوں پر ان کی دعوت فکر و عمل پر چاروں طرف سے تحریری و تقریری حملے ہو رہے تھے اور ہر کیمپ یہ سمجھ رہا تھا کہ اگر اسلام کو زک پہنچا دی گئی اور مسلمانوں کے جذبہ غیرت و حمیت کو کچل کر رکھ دیا گیا تو کفر جیت گیا اور اسلام سے صدیوں کی فتوحات کا انتقام لے لیا گیا۔

"تاریخ کے اس موڑ پر جن لوگوں نے دفاع و مناظرہ کے مورچوں سے دشمن کی تدبیروں کو شکست دی اور تقریر و تحریر سے اسلامی فکر و تصور کی حفاظت کا فریضہ انجام دیا ان کے سرخیل اور گل سرسبد مولانا ثناء اللہ صاحب مرحوم تھے۔ اللہ تعالیٰ ان کو کروٹ کروٹ جنت النعیم سے بہرہ مند کرے اور اپنی بے پایاں رحمتوں سے نوازے، ان کو اللہ تعالیٰ نے یہ صلاحیت بخشی تھی کہ نہایت خوش اسلوبی سے حریف کے واروں کو روکیں اور ایسے مزے کی چٹکی لیں کہ دشمن بھی داد دینے پر مجبور ہو جائے۔

"مولانا مرحوم جب تک زندہ رہے سب سے چومکھی لڑائی لڑتے رہے اور اسلام کے

نام کو روشن کرتے رہے۔ ان کے کام کا پھیلاؤ اس بات کا مقتضی تھا کہ مناظروں اور کامیاب مباحثہ کرنے والوں کی ایک فوج ترتیب دی جائے جو ان کی طرح ہر ہر محاذ پر حریف کے حملوں کا جواب دے۔ چنانچہ حضرت مولانا کی نگاہ کیمیا اثر نے تھوڑی ہی مدت میں جاں نثاروں اور مناظروں کی ایک جماعت تیار کرلی، مولانا نور حسین گھرجاکھی اس گروہ اور فوج کے قابل جرنیل تھے، جس کے میمنہ ومیسرہ کو خود مولانا ثناء اللہ صاحب مرحوم نے ترتیب دیا تھا اور اپنے ساتھ رکھ کر مناظرے کے داؤ پیچ اور اسرار بتائے تھے۔ جن لوگوں کو مولانا نور حسین صاحب کے مناظروں کو سننے کا اتفاق ہوا ہے وہ جانتے ہیں کہ انھوں نے کس قابلیت، ذہانت اور محنت سے عمر بھر یہ خدمت انجام دی۔

"مجھے مناظرہ ومباحثہ کی پوری پوری افادیت میں ہمیشہ شبہ رہا ہے، لیکن اس حقیقت سے مجال انکار نہیں کہ اہون البلیتین کے لحاظ سے اگر اس دور فتن وضلالت میں اس حربے سے کام نہ لیا جاتا تو ضلالت کے زیادہ امکانات ابھرتے اور لوگ اور بھی گمرہ ہوتے۔ تبلیغ واشاعت کا جذبہ مرحوم پر اس درجہ طاری تھا کہ اس کے مقابلے میں انھوں نے کبھی کسی مصلحت کی پروا نہیں کی اور کئی کئی ہفتے تقریر ومناظرہ کے سلسلے میں گھر سے غائب رہے۔

"مناظرے سے زیادہ ان کے مواعظ عمدہ ہوتے، ایسی فصیح وبلیغ پنجابی میں توحید وسنت کے نکات بیان کرتے اور لطائف واشعار سے تقریر کو سجاتے کہ مجمع جھوم جھوم جاتا۔ تاثیر کا یہ عالم تھا کہ گھرجاکھ میں جہاں کہ وہ خود رہ رہے تھے، جب پہلے پہل انھوں نے توحید کا علم گاڑا تو مخالفت وعناد کا ایک طوفان امڈ آیا............ اور اب ان کے وعظ وارشاد کی وجہ سے یہ حال تھا کہ جنازے میں گھرجاکھ اور اس کے ملحقہ دیہات کی ایک بھیڑ شریک ہوئی۔"

آپ یہ سن کر حیران ہوں گے کہ اتنے کامیاب مناظر اور پنجابی کے ایسے شگفتہ بیان واعظ نے جو قابلیت بھی حاصل کی یہ کسی مدرسے کی دریوزہ گری کا نتیجہ نہ تھا بلکہ محض شوق اور جدوجہد کا نتیجہ تھا۔

مزاح وظرافت تو مرحوم کی طبیعت کا خاصہ تھا، جہاں بیٹھتے باغ وبہار بن کر بیٹھتے اور

ایسے ایسے لطائف بیان کرتے کہ سننے والے مارے ہنسی کے لوٹ لوٹ جاتے۔ بسا اوقات ایسا ہوا کہ جلسہ ومناظرہ کے بعد یہ اپنے مخصوص حلقے میں بیٹھے اور وہ چٹکلے سنائے کہ طبیعت کا سارا تکدر جاتا رہا۔

"پھر لطیفے سننے والوں اور محفوظ ہونے والوں نے یہ منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ وہ رند جو ابھی ابھی ہنسی مذاق اور بذلہ سنجی کے جام پر جام لنڈھا رہا تھا، تہجد میں خدا کے حضور مناجات میں مصروف ہے اور فارغ اوقات میں اس کی زبان پر ذکر واوراد کا غلغلہ ہے۔

"کئی مفید رسالے اور کتابیں بطور یادگار چھوڑے ہیں۔ گھر میں ان کی تربیت اور اپنی زندگی کا رنگ کیسا تھا، اس کا اندازہ اس بات سے کیجیے کہ ان کی تمام اولاد ماشاء اللہ صالح اور متدین ہے۔

"ان کے ایک صاحب زادے جناب راسخ عرفانی تو نیکی اور سعادت کے ساتھ ساتھ شعر وسخن کا بھی نہایت صاف ستھرا ذوق رکھتے ہیں۔

"راقم الحروف کے ساتھ مرحوم کے تعلقات بدرجہ غایت مخلصانہ تھے۔ جب ملتے تو ایسے ڈھب سے جیسے دو ہم عمر اور برابر والے ملتے ہیں، حالانکہ خاکسار نے تعلیم وتربیت کی تمام منزلیں ان کے سامنے طے کیں اور اپنے کو ان کے مقابلے میں ہمیشہ خرد ہی تصور کیا۔

"ان کی موت سے ہماری جماعت میں ایسی جگہ خالی ہوئی ہے جو اب شاید پر نہ ہو سکے گی، کیونکہ اب وعظ ومناظرہ کا وہ دور کلیتہً ختم ہو رہا ہے جس کی یہ نشانی اور یادگار تھے۔ اب دوسری قسم کے مسائل کا سامنا ہے اور ملک کو اور ڈھب کے لوگوں کی ضرورت ہے۔

"لیکن کیا جماعت یہ سمجھتی ہے کہ آج پھر اسے مولانا ثناء اللہ کی ضرورت ہے جو اس دور کے فتنوں پر نظر رکھتا ہو اور ان فتنوں کے مقابلے کے لیے ایک فوج لکھنے اور بولنے والوں کی تیار کر سکے؟ کیا ہمارے علما کو اس کا احساس ہے کہ یہ مسند خالی ہے اور وقت کی مناسبتیں انھیں کام اور جدوجہد کی طرف دعوت دے رہی ہیں؟"

مولانا محمد حنیف ندوی کا اداریہ آپ نے پڑھا، اب مولانا محمد اسماعیل سلفی کا تعزیتی بیان ملاحظہ فرمایے

حضرت مولانا محمد اسماعیل سلفی مرحوم نے جو اس وقت مرکزی جمعیت اہل حدیث مغربی پاکستان کے ناظم اعلیٰ تھے، مولانا نور حسین کی وفات پر حسب حال تعزیتی بیان جاری فرمایا تھا۔ یہ بیان ۲۸ دسمبر ۱۹۵۱ کے ''الاعتصام'' شائع ہوا تھا۔

''مغفور و مرحوم اواخر اکتوبر میں ذیابیطیس سے بیمار ہوئے، ہر ممکن علاج کے باوجود تکلیف بڑھتی رہی، اوائل دسمبر ۱۹۵۱ میں علالت نے ناخوش گوار صورت اختیار کی۔ مقامی اطبا اور ڈاکٹروں کی طرف رجوع کے باوجود افاقہ نہ ہوا۔

''۱۴ دسمبر کو طبیعت پر غنودگی طاری ہونا شروع ہوئی اور خوراک میں کمی۔ ۱۸ دسمبر بعد دوپہر غنودگی اور بڑھ گئی۔ ۱۸ دسمبر ہی کی شب کو ساڑھے دس بجے مرحوم عالم بقا کی طرف انتقال فرما گئے۔

انا للہ وانا الیہ راجعون

''افسوس ایک خوش بیان واعظ، ایک راسخ العقیدہ موحد ہم سے جدا ہوگیا۔ اور ایک خوش نوا عندلیب رات کی تاریکیوں میں ایک ہی پرواز سے اس خاک دان فنا کو عبور کر کے خلد آشیاں ہوگیا۔''

''مرحوم ۱۸ دسمبر کی شب ہی کو موت و حیات کی کش مکش سے آزاد ہو کر اس آخری سفر کے لیے رخت سفر باندھ کر بالکل تیار ہو گئے تھے، لیکن ہماری مجبوریاں کہ ہم ۱۹ دسمبر کو گیارہ بجے سے پہلے انھیں الوداع کہنے پر قادر نہ ہو سکے۔ جنازے کا وقت صبح دس بجے مقرر کیا گیا تھا۔ گوجرانوالہ اور دوسرے مقامات سے احباب صبح ہی سے گھرجاکھ پہنچنا شروع ہو گئے تھے۔ ٹھیک دس بجے جنازہ اٹھایا گیا اور قریباً ساڑھے گیارہ بجے ہم لوگ فریضہ وداع سے فارغ ہوئے اور یہ تھکا ماندہ مسافر اپنی آخری آرام گاہ میں اطمینان سے محو خواب ہوگیا۔ **اللھم وسع مدخلہ واجعل جنت الفردوس ماواہ** ۔ جنازے میں اتنا ہجوم تھا کہ شاید کسی بڑے دنیادار کو نصیب نہ ہوگا۔

''امام احمد بن حنبلؒ کا ارشاد کس قدر صحیح ہے **الفرق بیننا وبینھم یوم الصلوۃ** (ہمارے اور ہمارے مخالفوں کے درمیان جو فرق ہے اس کا پتا جنازے کے دن ہوتا ہے)

"جہاں تک اہل ایمان کی شہادت کا تعلق ہے، میں نے کوئی بھی ایسا شخص نہیں دیکھا جسے مرحوم کی صلاحیت کے متعلق تذبذب ہو۔

"مرحوم کے پانچ لڑکے ہیں اور دو لڑکیاں۔ لڑکے سب شریف النفس ہیں اور کاروباری ہیں۔ اللہ تعالیٰ انھیں اپنے والد کے نعم البدل ہونے کی توفیق دے۔ عزیزی خالد کو مرحوم نے دینی تعلیم دلائی تھی۔ تھوڑی سی توجہ سے وہ مرحوم کی جگہ لے سکتے ہیں۔"

(محمد اسماعیل ناظم جمعیت اہل حدیث مغربی پاکستان)

جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا مولانا نور حسین گھرجاکھی کے بڑے صاحب زادے کا نام عبدالواحد تھا۔ وہ بہت اچھے شاعر تھے اور راسخ تخلص کرتے تھے۔ انھوں نے والد مرحوم کی وفات پر جو کچھ لکھا وہ بھی مولانا ندوی کے اداریے اور مولانا سلفی کے تعزیتی بیان کے ساتھ ۲۸ دسمبر ۱۹۵۱ کے "الاعتصام" میں چھپا۔ ملاحظہ فرمائیے

نالہ فراق

(بزرگ وار قبلہ مرحوم مولانا نور حسین گھرجاکھی کے نام)

اے میرے جانِ سکوں اے واعظِ معجز بیاں — داغ ہجراں دے کے ہم کو ہو گئے رخصت کہاں
فرطِ اندوہ والم سے قلب ہے نالہ کناں — گر رہی ہیں آسماں سے دل پہ غم کی بجلیاں

"تازِ آغوش وداعش داغ حیرت چیدہ است
ہمچو شمع کشتہ درچشمِ نگہ خوابیدہ است۔"

بھاگتا ہوں سوئے صحرا محفل عشرت سے میں — دیکھتا ہوں نظمِ عالم دیدۂ وحشت سے میں
بے خبر ہوتا تھا پہلے جذبۂ الفت سے میں — ہو گیا ہوں آشنا اب معنیٔ فرقت سے میں

داغِ ہجراں دے کے ہم کو کیوں روانہ ہو گئے
آپ کے نغماتِ الفت اک فسانہ ہو گئے

جا بسے ہو چھوڑ کر کیوں محفلِ احباب دور — مضطرب ہے آپ کی فرقت میں قلب ناصبور
خوابِ رنگیں بن گیا ہے بزم کا سوز و سرور — کون بتلائے گا ہم کو آپ بن راہِ شعور

سننے والے تو یہاں اب تک ہمہ تن گوش ہیں
آپ کے لب وائے حسرت آج کیوں خاموش ہیں

چشمِ موسیٰ پر عیاں اسرارِ یزدانی نہیں — وادئ ایمن میں اب وہ جلوہ افشانی نہیں
اب فلک پیما پر افکارِ انسانی نہیں — یعنی بحرِ زیست میں پہلی سی طغیانی نہیں

تیرگی طاری ہے دل پر اب سواد شام کی
ہے حقیقت کیا عجب انسان کے انجام کی

وائے حسرت یہ جہاں بھی ایک کہنہ دام ہے — مژدۂ راحت یہاں اک موت کا پیغام ہے
زندگی کیا ہے فقط مجموعۂ آلام ہے — چند آہوں کا جہاں میں زندگانی نام ہے

تگ ودوئے گردشِ ایامِ دنیا کچھ نہیں
ماسوائے کوششِ ناکام دنیا کچھ نہیں

لب کشا ہے یوں زبانِ حال سے یہ کائنات — قصۂ پارینہ ہے افسانۂ مرگ وحیات
دن جب آتا ہے تو کر دیتا ہے شب کو بے ثبات — دن کو بھی بے نور کر دیتی ہے جب آتی ہے رات

"موت ہر شاہ وگدا کے خواب کی تعبیر ہے
اس ستمگر کا ستم انصاف کی تصویر ہے"

غم نصیب
راسخ عرفانی

آہ! نور گھرجاکھی

(مولانا نور حسین گھرجاکھی کی وفات حسرت آیات پر)

طوفانِ اشک چشم تر سے موجزن ہے آج
ہر قلب غم شناس مصروفِ حزن ہے آج
کل تک تھا جس چمن میں بہاروں کا اہتمام
بادِ خزاں کی زد میں وہ سارا چمن ہے آج

نالہ کناں ہے کس کی جدائی میں عندلیب
سینہ فگار کیوں یہ ہر برگِ چمن ہے آج
کیوں رک گئی ہیں خاور وانجم کی گردشیں
کس کے الم میں سرنگوں چرخ کہن ہے آج
کون اٹھ گیا ہے دہر سے یہ غم کسارِ دین
ہر دل میں درد، لب پہ فریادِ حزن ہے آج
خلدِ بریں میں حوروں کو کس کا ہے انتظار
کس نیک دل کی لاش ملبوسِ کفن ہے آج
جس کی ندائے گرم کی کانوں کو ہے تلاش
خاموش اب وہ واعظِ شعلہ سخن ہے آج
ہر سمت چھا رہا ہے جمود و سکوتِ مرگ
ہر چیز سے ہویدا اندازِ محن ہے آج
وہ جس نے مردہ قوم کو بخشی تھی زندگی
آغوش گور میں وہی راحت فگن ہے آج
لرزاں تھا جس کے خوف وتدبر سے قادیان
رخصت وہ ہم سے بندۂ باطل شکن ہے آج
وہ نور جو کہ کفر میں جلوہ فگن ہوا
راسخ جدا وہ ہم سے اب باطل شکن ہوا

غم زدہ
راسخ عرفانی

نوحۂ غم

(تاریخ وفات حسرت آیات جناب والد بزرگ وار مولانا نور حسین صاحب مرحوم)

وہ نور جب جہاں سے خلد آشیاں ہوئے
تارے وفورِ درد سے گریہ کناں ہوئے
پھولوں کا تھا نصیب کہ روئیں وہ روز و شب
غنچوں کی چشمِ غم سے بھی آنسو رواں ہوئے
وہ نور جن کے نور سے روشن تھی زندگی!
وہ نور آج عازمِ خلدِ جناں ہوئے
اللہ رے ان کے حسن تکلم کا یہ اثر
ناچیز ذرے ہمسرِ صد آسماں ہوئے
ہوئی فلک پہ چشم ملائک بھی اشک ریز
جس لمحہ وہ شکارِ مرگِ ناگہاں ہوئے
تارے بھی اشک بار تھے، شبنم بھی اشک بار
ہفت آسمان کہنہ بھی محوِ فغاں ہوئے
ہاتف نے دی ندا مجھے سن عیسوی یہ لکھ
"جنت کی طرف والدِ راسخ رواں ہوئے"

۱۹۵۱

مولانا محمد ابراہیم میر سیالکوٹی

(وفات ۱۲ جنوری ۱۹۵۶)

۱۹۳۴ء کے فروری کا مہینا تھا کہ ہمارے شہر (کوٹ کپورہ مشرقی پنجاب) میں انجمن اصلاح المسلمین کا سالانہ جلسہ منعقد ہوا- جلسے کے دوسرے یا تیسرے دن کی بات ہے کہ فجر کی اذان کے ساتھ ہی میرے دادا میاں محمد مرحوم نے روزانہ کے معمول کے مطابق مجھے جگایا اور نماز کے لیے مسجد میں لے گئے- ہم نے جماعت کے ساتھ نماز پڑھی' جن عالم دین نے نماز پڑھائی تھی' ان کے سامنے قرآن مجید رکھا گیا تھا' وہاں بجلی نہیں تھی' سرسوں کے تیل کا دیا جلتا تھا-

مسجدوں میں لکڑی کا ایک سٹینڈ ہوتا تھا' جسے ''دیوٹ'' کہا جاتا تھا- اس کے اوپر تیل سے بھرا ہوا مٹی کا چوڑا سا دیا رکھ دیا جاتا تھا اور اس میں روئی کی تین چار موٹی موٹی بتیاں ڈال دی جاتی تھیں' اس سے روشنی کافی تیز ہو جاتی تھی اور اس کے ارد گرد بیٹھ کر لوگ قرآن مجید پڑھتے تھے' درسِ قرآن کا سلسلہ بھی اسی دیوٹ کی روشنی میں چلتا تھا-

انجمن اصلاح المسلمین کے اس جلسے کے دن فجر کی نماز کے بعد دیوٹ کی روشنی میں ایک گورے چٹے اور وجیہ و باوقار عالم دین نے قرآن مجید کھولا اور نہایت اثر انگیز اور گرج دار آواز میں سورۂ شوریٰ کی چند آیتیں تلاوت کیں' جن میں دو آیتیں یہ تھیں:

لله ملك السموات والارض يخلق ما يشآء يهب لمن يشآء اناثا ويهب لمن يشآء الذكور اويز وجهم ذكرانا و اناثا ويجعل من يشآء عقيما انه عليم قدير-

انھوں نے ان آیات کا ترجمہ نہیں کیا' تلاوت کے بعد پنجابی میں تقریر شروع کر دی اور اللہ نے انسان کو جن نعمتوں سے نوازا ہے ان کی تفصیل بیان ہونے لگی- فرمایا اللہ نے

انسان کو آنکھیں دیں، کان دیئے، زبان دی، عقل دی، شعور دیا، ہاتھ دیئے، پاؤں دیے۔ اس کے بعد کھانے پینے اور عام استعمال کی ضروری چیزوں کے بارے میں بتایا کہ اللہ نے انسان کو یہ چیزیں بڑی فراوانی سے عطا کی ہیں۔ پھر اس عطیے کی وضاحت کی جو علم و حکمت کی شکل میں انسان کو بخشا گیا ہے۔ تقریباً آدھ گھنٹے تک اس موضوع پر تقریر کا سلسلہ جاری رہا۔ وہ آسان پیرایۂ کلام میں یہ باتیں بیان کر رہے تھے، ہر بات سامعین کے ذہن میں اترتی جاتی تھی۔ پھر وہ ان آیات کے مضمون کی طرف آئے اور فرمایا زمین و آسمان کی بادشاہت اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ وہ جو چیز جس انداز اور جس مقدار میں چاہے پیدا کرتا ہے اور جس صورت میں چاہے انسانوں میں بانٹتا ہے، کوئی اس کی قدرت کاملہ میں دخل دینے والا نہیں۔ اس کا خزانہ بڑا وسیع ہے، اس نے بے شمار چیزیں انسان کو عطا فرمائی ہیں۔ وہی انسان کو اولاد عطا فرماتا ہے۔ جسے چاہتا ہے لڑکیاں دیتا ہے، جسے چاہتا ہے لڑکے دیتا ہے۔۔۔ اس قسم کی باتیں کرتے ہوئے جب انھوں نے اداس لہجے اور دردناک انداز میں کہا کہ بعض ابراہیم جیسے بدنصیب بھی ہیں، جنھیں کچھ بھی نہیں دیتا، تو یکا یک محفل کا رنگ بدل گیا۔ حاضرین پر افسردگی چھا گئی اور پورا ماحول غم سے نڈھال ہو گیا۔

اس واقعے پر ساٹھ سال سے زیادہ عرصہ گزر چکا ہے، لیکن لائق صد احترام مقرر نے جس الم و حزن میں ڈوبے ہوئے اسلوب میں یہ الفاظ کہے تھے، اس کا ہر گوشہ ذہن میں محفوظ ہے۔ اس وقت میری عمر نو سال کی تھی اور اب ستر سے چند منزلیں اوپر چلا گیا ہوں۔ اس وقت بھی ذہن نے اس کا بے حد اثر قبول کیا تھا، اب بھی وہی حال ہے، بلکہ جیسے جیسے وقت گزرتا جاتا ہے اور عمر کا سایہ دراز ہوتا یا سکڑتا جاتا ہے، ان الفاظ کا تاثر گہرا ہوتا جاتا ہے۔

(ان کے ان الفاظ سے عام لوگوں کو پتا چلا کہ یہ مولانا محمد ابراہیم سیالکوٹی ہیں اور اولاد کی نعمت سے محروم ہیں۔)

ایک فلسفی سے کسی نے پوچھا تھا: آپ کے کتنے بچے ہیں؟

اس فلسفی کا کوئی بچہ نہیں تھا۔ جواب دیا:

"اگر یہ ملک میرا ہے تو اس میں جو کچھ ہے، وہ میرا ہے اور اس کے بچے میرے

بچے ہیں۔“

ایک فلسفی کا جواب تو اسی قسم کا ہونا چاہیے تھا، لیکن سوال یہ ہے کہ کیا حقیقت میں ایسا ہی سمجھا جاتا ہے اور کیا اسی کو اصلیت قرار دیا جاتا ہے؟

مولانا سیالکوٹی پر جلال کا غلبہ تھا اور وہ بے حد نازک مزاج تھے، خلاف طبع کوئی بات برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ جس صبح کو انھوں نے قرآن مجید کا درس دیا، اسی دن نمازِ عشا کے بعد جلسۂ عام میں انھیں تقریر کرنا تھی، لیکن ان کی تقریر سے پہلے مولانا علی محمد صمصام کی تقریر تھی۔ مولانا صمصام اتنے پڑھے لکھے تو نہ تھے، البتہ پنجابی کے بہت اچھے شاعر اور واعظ تھے۔ آواز بڑی رسیلی تھی، ترنم سے پڑھتے اور مجمعے پر چھا جاتے تھے۔ دیہات کے لوگ تو ان کے گرویدہ تھے ہی، شہروں کے تعلیم یافتہ لوگ بھی ان سے بہت متاثر تھے۔ خود میں نے لاہور کے ایک جلسے میں دیکھا کہ ان کی تقریر میں سامعین اس طرح بیٹھے تھے جیسے جادو کر دیا گیا ہو۔ پھر ہر جماعت کا ایک مزاج ہوتا ہے، جماعت اہل حدیث کا مزاج کچھ ایسا ہے کہ اس سے تعلق رکھنے والے لوگوں کے نزدیک عام واعظوں کی باتیں زیادہ مرغوب ہوتی ہیں۔ علمی اور گہری باتیں ان کے لیے بسا اوقات پریشانی کا باعث بن جاتی ہیں۔ ان کے نزدیک شاید ”الدین یسر“ کا مطلب یہ ہے کہ ایسی آسان بات کی اور سنی جائے کہ ذہن و فکر کو سوچنے کی تکلیف نہ برداشت کرنی پڑے۔ جتنی دیر سوچنے میں لگائیں گے، اتنی دیر میں کوئی اور نیک کام کر لیں گے۔

بہر حال مولانا علی محمد صمصام تقریر کر چکے تو پروگرام کے مطابق مولانا سیالکوٹی کی تقریر کا اعلان کیا گیا۔ ان کی تقریر خالص علمی تھی، نہ اس میں پنجابی کا کوئی شعر تھا نہ عوامی قسم کی باتیں تھیں۔ تقریر البتہ پنجابی میں ہو رہی تھیں۔ آٹھ دس منٹ کے بعد ایک طرف سے آواز آئی۔

علی محمد صمصام کو وقت دیا جائے۔

یہ ایسی گستاخانہ حرکت تھی جو مولانا سیالکوٹی کے مزاج و طبیعت کے لیے قطعی ناقابل برداشت تھی۔ وہ طیش میں آ گئے۔ فرمایا میں ایسے لوگوں میں تقریر نہیں کر سکتا جو اللہ اور

رسول کی باتیں سننے کو تیار نہ ہوں- میں ابھی یہاں سے چلا جاؤں گا- میرے لیے ایسی جگہ رات گزارنا ممکن نہیں، جہاں علم پر جہالت کو اور قرآن و حدیث پر پنجابی شعروں کو ترجیح دی جاتی ہو-

مولانا کے علاوہ جلسے کے اصحاب انتظام کے لیے بھی اور حاضرین کے لیے بھی یہ نہایت تکلیف دہ صورت حال تھی- مولانا سے معافی مانگی گئی اور بڑی منت سماجت سے انھیں تقریر جاری رکھنے پر آمادہ کیا گیا- اس کے بعد دو تین دفعہ وہ ہمارے ہاں انجمن اصلاح المسلمین کے جلسے میں تشریف لے گئے، لیکن ان کی تقریر کا پروگرام کبھی کسی عوامی قسم کے پنجابی واعظ کے بعد نہیں رکھا گیا، ہمیشہ کسی بڑے عالم کے بعد انھیں تقریر کا موقع دیا گیا اور ان کے بعد بھی بڑے عالم ہی کی تقریر ہوئی-

جماعت اہل حدیث کے علمائے کرام مولانا کے علم و فضل کی وجہ سے ان کا بے حد احترام کرتے تھے اور عام واعظین و مقررین تو ان کے جلال کی بنا پر ان سے سہمے رہتے تھے- مجھے یاد پڑتا ہے اوپر جس جلسے کا ذکر کیا گیا ہے، مولانا علی محمد صمصام مارے ڈر کے اس سے اٹھ کر چلے گئے تھے- ویسے بھی ان سے ڈرنے ہی میں عافیت تھی، معلوم نہیں کس وقت کس کی طرف عنانِ توجہ مبذول ہو جائے اور پھر کیا کیا سننا پڑے-

حافظ محمد ابراہیم کمیرپوری مرحوم نے جو کچھ عرصہ جھنگ کی مسجد اہل حدیث میں بطور خطیب رہ چکے تھے، ایک دفعہ بتایا کہ مولانا سیالکوٹی کو ایک مرتبہ جھنگ کی جماعت اہل حدیث کے جلسے میں دعوت شرکت دی گئی جو ازراہِ کرم انھوں نے منظور فرمائی- بہت بڑا مجمع تھا، وہ تقریر کر رہے تھے کہ ان کی نظر سامعین میں سے دو آدمیوں پر پڑی جو آپس میں کوئی بات کر رہے تھے- مولانا جلال میں آ گئے، پہلے تو انھیں ڈانٹا کہ میں اللہ اور رسول کے احکام سنا رہا ہوں اور تم باتیں کر رہے ہو- اس کے بعد سخت الفاظ میں ان کو جلسہ گاہ سے نکل جانے کا حکم دیا اور وہ نکل گئے- لیکن اس کے بعد آنکھوں پر کپڑا باندھ لیا کہ ایسا نہ ہو کوئی اور شخص باتیں کرے اور میری نظر اس پر پڑ جائے- چند منٹ اسی طرح تقریر کرتے رہے، بڑی مشکل سے انھیں آنکھوں سے کپڑا اتارنے پر آمادہ کیا گیا-

ایک صاحب نے بتایا کہ مولانا نے اس لیے آنکھوں پر کپڑا باندھ لیا تھا کہ سامنے عورتیں بیٹھی تھیں۔ میرے خیال میں یہ صحیح نہیں۔ اس لیے کہ دینی جماعتوں کے جلسوں میں عورتوں کے بیٹھنے کا انتظام الگ سائبان میں ہوتا ہے' اور یہ سائبان ہر طرف سے محفوظ اور باپردہ ہوتے ہیں۔ مقرر کی یا کسی اور کی نظر ان تک نہیں پہنچ سکتی۔ بہر حال عورتوں کا قصہ ہو یا سامعین میں سے کسی شخص کی باتوں کا' مولانا نے اس کو غلط قرار دیا اور آنکھوں پر کپڑا باندھ لیا۔

ان کی صحت بہت اچھی تھی۔ مولانا محمد حنیف ندوی نے بتایا کہ ایک مرتبہ سردیوں کے دنوں میں مولانا سیالکوٹی ریل گاڑی میں سفر کر رہے تھے۔ کوٹ یا سویٹر وغیرہ سردیوں کا لباس زیب تن نہیں تھا' صرف شلوار قمیص پہنے ہوئے تھے۔ یہ سیکنڈ کلاس کا ڈبہ تھا۔ اسی ڈبے میں تین چار نوجوان بیٹھے تھے جو گرم لباس میں ملبوس تھے اور اس کے باوجود سردی کی وجہ سے ٹھٹھر رہے تھے۔ مولانا نے ان سے فرمایا تم نوجوان ہو اور گرم کپڑے پہنے ہوئے ہو' پھر بھی سردی سے ٹھٹھر رہے ہو۔ مجھے دیکھو' میں بوڑھا آدمی ہوں اور شلوار قمیص میں ہوں۔ اس عمر میں بھی میری صحت تم سے اچھی ہے۔

فرمایا: دو باتوں کا خیال رکھو۔ ایک سردی کا احساس نہ کرو' دوسرے ورزش کیا کرو۔

مولانا عام طور سے لمبی بات کرتے تھے اور ساتھ ساتھ یہ بھی کہتے جاتے تھے' سخت مصروف ہوں' ہر وقت لکھنے پڑھنے میں مشغول رہتا ہوں' کہیں آنے جانے یا کسی سے باتیں کرنے کی بالکل فرصت نہیں ملتی۔

اس قسم کا ایک دلچسپ واقعہ خواجہ عبدالحی فاروقی نے سنایا جو اصلاً ضلع گورداس پور (مشرقی پنجاب) سے تعلق رکھتے تھے۔ کلکتے میں کچھ عرصہ مولانا ابوالکلام آزاد کے ساتھ رہے تھے اور ان سے بہت متاثر تھے۔ پھر جامعہ ملیہ (دہلی) سے منسلک ہو گئے تھے اور وہاں تفسیر قرآن پڑھاتے تھے۔ آزادی سے چند سال بعد لاہور آ گئے تھے اور اسلامیہ کالج میں تفسیر قرآن کے پروفیسر مقرر کر لیے گئے تھے۔ لاہور ہی میں ۸ جنوری ۱۹۶۵ کو فوت ہوئے۔

خواجہ صاحب نے بتایا کہ ایک دفعہ ان کی تجویز سے جامعہ ملیہ کے پروفیسروں نے جامعہ کے پرنسپل ڈاکٹر ذاکر حسین خاں کو مشورہ دیا کہ جامعہ میں ہر مہینے کسی ایک اہل علم کو بلایا جائے کہ وہ یہاں کے اساتذہ اور طلبا کو کسی علمی موضوع پر لیکچر دیں۔ اس طرح ایک سال میں مختلف اصحاب علم کے بارہ لیکچر ہو جایا کریں گے۔ پھر ہر سال ان بارہ لیکچروں کو کتابی شکل میں جامعہ کی طرف سے چھاپ دیا جائے تا کہ لوگ اس سے استفادہ کر سکیں۔

بقول خواجہ صاحب کے ڈاکٹر ذاکر حسین خان نے یہ تجویز منظور فرمائی اور پروفیسروں سے کہا کہ وہ اپنی اپنی پسند کے مقرروں کی فہرست بنائیں۔ سب سے پہلے مجھے اپنی پسند کے مقرر کا نام پیش کرنے کو کہا گیا، اس لیے کہ تجویز میں نے دی تھی۔

خواجہ صاحب کہتے ہیں میں نے مولانا محمد ابراہیم میر سیالکوٹی کا نام پیش کیا، جس پر ڈاکٹر صاحب نے پسندیدگی کا اظہار کیا اور انہی سے اس سلسلے کا آغاز کرنا مناسب سمجھا اور ان کو دعوتی خط لکھا۔

مولانا سیالکوٹی وقت مقررہ پر دہلی پہنچے۔ ان کی آمد اور تقریر کا اعلان اخبارات اور اشتہارات کے ذریعے کر دیا گیا تھا۔ صدر جلسہ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں تھے۔ اچھا خاصا مجمع تھا۔ دہلی کے اہل حدیث حضرات خاص طور سے آئے تھے۔ ان کے علاوہ دینی اور دنیوی تعلیمی اداروں کے بہت سے استاد اور طالب علم شریک جلسہ تھے۔

خطبۂ مسنونہ کے بعد مولانا نے تقریر کا آغاز کیا۔ فرمایا فلاں تاریخ کو اتنے بجے ڈاکٹر صاحب کا دعوت نامہ ملا اور میں نے دوسرے دن اتنے بجے اس کا جواب لکھا، جس میں یہاں آنے کا وعدہ کیا۔ سخت مصروف ہوں۔ مصروفیت کی وجہ سے بعض نہایت ضروری کام بھی نہیں کر پاتا۔ ناک پر ہاتھ لگا کر فرمایا: یہ دیکھو میری ناک۔ اس پر یہ پھنسی تمھیں نظر آ رہی ہے۔ کئی روز سے اس کے درد میں مبتلا ہوں۔۔۔ یہ دیکھو میری جیب۔ اس میں یہ شیشی ہے اور اس شیشی میں وہ دوا ہے جو ڈاکٹر نے اس پھنسی پر لگانے کے لیے دی ہے۔ لیکن کثرت مصروفیات کی وجہ سے اتنا وقت نہیں ملتا کہ جیب سے یہ شیشی نکال سکوں اور دوا ناک کی پھنسی پر لگا سکوں۔۔۔ یہ انوکھی قسم کی مصروفیات تھیں، جن کے تذکرہ

بیان سے تمام حاضرین مجلس حیران تھے۔ لیکن صرف حیران تھے‘ مولانا سے اس سلسلے میں کچھ نہیں کہہ سکتے تھے۔

خواجہ صاحب کہتے ہیں‘ اس کے بعد مولانا کی تقریر شروع ہوئی۔ تقریر نہایت عالمانہ اور پر از معلومات تھی۔ انھوں نے تمام علوم کا فاضلانہ تجزیہ کیا‘ موجودہ نصاب تعلیم کی وضاحت کی اور اس میں جو نقائص پائے جاتے ہیں‘ ان کی تفصیلات بیان کیں۔ پھر اس کے مقابلے میں ہندوستان کے اس وقت کے حالات کی روشنی میں جس قسم کے نصاب تعلیم اور اسلوب تعلیم کی ضرورت تھی‘ اس کی نشان دہی کی۔ وہ ایک بہت بڑے ماہر تعلیم کی طرح ہر علم کا جائزہ لے رہے تھے اور نہایت صفائی اور دلائل سے اپنے خیالات کا اظہار کر رہے تھے۔

ڈیڑھ گھنٹا ان کی تقریر جاری رہی‘ لوگوں نے نہایت توجہ سے سنی اور ان کے افکار عالیہ سے بے حد متاثر ہوئے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین نے جن کی مہارت تعلیم کا پورے ملک میں شہرہ تھا‘ مولانا کی تقریر کی بڑی تعریف کی اور اپنی صدارتی تقریر میں خواجہ عبدالحی فاروقی کا شکریہ ادا کیا کہ ان کی وجہ سے مولانا کے ارشادات سے مستفید ہونے کا موقع ملا۔

مولانا سیالکوٹی کے بارے میں تین باتیں جامعہ سلفیہ (فیصل آباد) کے لائبریرین جناب اشرف جاوید صاحب نے مولانا محمد صدیق لائل پوری مرحوم (خطیب جامع مسجد اہل حدیث فیصل آباد) کے حوالے سے بیان کیں جو معزز قارئین کی خدمت میں پیش کی جا رہی ہیں۔

ایک بات انھوں نے یہ بتائی کہ سردیوں کا موسم تھا‘ مولانا سیالکوٹی ایک دن صبح کے وقت اپنی مسجد میں طلبا کو قرآن مجید کا درس دے رہے تھے۔ محلے کی ایک عورت آئی‘ اس نے مولانا سے بڑی لجاجت کے ساتھ کسی سلسلے میں تعویذ کے لیے عرض کیا۔

مولانا نے فرمایا: بیٹھ جاؤ طلبا کے درس سے فارغ ہو کر تعویذ لکھ دوں گا۔

وہ بیٹھ گئی‘ لیکن پانچ چھے منٹ کے بعد پھر تعویذ کا مطالبہ کیا۔

مولانا نے اب بھی وہی جواب دیا کہ ابھی ٹھہرو‘ تھوڑی دیر کے بعد فارغ ہوں گا تو لکھ دوں گا۔۔۔ دو چار منٹ بعد اس نے پھر تعویذ کے لیے کہا۔

مولانا نے پھر وہی جواب دیا۔

چوتھی پانچویں دفعہ اس نے تعویذ مانگا تو مولانا اپنی جگہ سے اٹھے' اس عورت کے پاس گئے' اسے اٹھایا اور مسجد کے وضو کرنے والے حوض میں پھینک دیا۔

واپس آ کر اپنی مسند پر بیٹھتے ہوئے غصے سے کہا:

کیا فضول رٹ لگا رکھی ہے' تعویذ دے دو' تعویذ دے دو---اس کا یہی علاج تھا۔ لے لے تعویذ۔ ڈال لے گلے میں۔ ہو جا تندرست۔

اس کے کپڑے حوض کے پانی سے بھیگ چکے تھے۔ وہ اٹھی اور اسی حالت میں گھر کو چل پڑی۔

طلبا نے عرض کیا: حضرت! آپ نے یہ کیا کیا؟ گھر جا کر بتائے گی تو گھر والے کیا اثر لیں گے۔

فرمایا: گھر جا کر بتائے گی تو وہ کوئی اثر لیں گے۔ یہ بتائے گی نہیں کہ میرے ساتھ یہ معاملہ ہوا ہے۔

دوسری بات یہ بتائی کہ ایک مرتبہ مولانا سیالکوٹی امرتسر گئے اور حسب معمول مولانا ثناء اللہ صاحب کے ہاں قیام فرمایا۔ امرتسر کے کسی محلے میں جماعت اہل حدیث کا جلسہ ہو رہا تھا' جس میں مولانا داؤد غزنوی کو تقریر کرنا تھی۔ اس میں مولانا ثناء اللہ صاحب بھی جانا چاہتے تھے۔ انھوں نے مولانا سیالکوٹی سے بھی شرکت کے لیے کہا۔ انھوں نے جواب دیا:

مولانا داؤد غزنوی کانگرسی ہیں۔ نہ میں ان کے جلسے میں جاؤں گا' نہ ان کی تقریر سنوں گا۔

مولانا ثناء اللہ نے فرمایا: یہ معاملہ کانگرسی یا غیر کانگرسی کا نہیں ہے' جماعت کا ہے۔ ہمیں اپنی جماعت کے جلسے میں جانا چاہیے---لیکن مولانا سیالکوٹی جانے پر آمادہ نہ ہوئے۔

اب مولانا ثناء اللہ صاحب نے اپنے بیٹے مولوی عطاء اللہ کو آواز دی اور کہا:

یہ تمھارا چچا بیٹھا ہے۔ اسے اٹھاؤ اور اسٹیشن پر لے جاؤ۔ جو گاڑی لاہور کو جانے والی

ہوا اس میں پھینک دو۔

مولانا سیالکوٹی یہ الفاظ سن کر مسکرائے اور مولانا ثناء اللہ صاحب کے ساتھ جلسے میں تشریف لے گئے۔ وہاں پہنچے تو مولانا داؤد غزنوی کے ساتھ سب سے زیادہ پیار کا اظہار کرنے والے وہی تھے۔

مولانا ثناء اللہ صاحب اخلاص و محبت کی وجہ سے ان پر حاوی تھے' اس لیے مولانا ثناء اللہ کی ایسی باتیں بھی وہ مان لیتے تھے جو ان کے ذہن و مزاج سے ہم آہنگ نہیں ہوتی تھیں۔

تیسری بات انھوں نے مولانا محمد صدیق مرحوم کے حوالے سے یہ بتائی کہ ایک مرتبہ مولانا سیالکوٹی جماعت اہل حدیث کے جلسے میں جھنگ گئے۔ سٹیج پر ان کے علاوہ چند اور علمائے کرام بھی تشریف فرما تھے۔ پروگرام کے مطابق مولانا محمد صدیق لائل پوری مرحوم کی تقریر کا وقت ہوا تو وہ مائک پر آئے۔ ان کی جوانی کا زمانہ تھا' خطبہ مسنونہ کے بعد انھوں نے کچھ اس قسم کے الفاظ سے تقریر کا آغاز کیا۔

وقت قلیل ہے' موضوع طویل ہے' طبیعت علیل ہے' لیکن فضل رب جلیل ہے۔۔۔ وغیرہ وغیرہ۔

مولانا سیالکوٹی نے یہ قافیہ ردیف سنا تو آواز دی:

تقریر بند کرو اور میرے پاس آؤ۔

مولانا صدیق نے حیران ہو کر ان کی طرف دیکھا' سامعین بھی بڑے متعجب ہوئے۔

ترش لہجے میں کہا:

دیکھتے کیا ہو۔ میں کہتا ہوں' تقریر بند کرو اور میرے پاس آؤ۔

انھوں نے مجبوراً تقریر بند کی اور ان کے پاس گئے۔

فرمایا: بیٹھو اور منہ کھولو۔

بیٹھنا تو خیر ٹھیک تھا' لیکن منہ کھولنے کا حکم بڑا عجیب و غریب تھا۔

گرج دار آواز میں بولے: میری بات نہیں سنی' میں نے کہا ہے منہ کھولو۔

انھوں نے منہ کھولا تو کچھ پڑھ کر پھونک ماری' جس کا اثر حلق تک گیا اور حلق سے ذہن و فکر تک پہنچ گیا۔

فرمایا: جاؤ' اب تقریر کرو۔

مولانا محمد صدیق صاحب کا بیان ہے کہ مولانا سیالکوٹی کے پھونک مارتے ہی ان کی حالت یکسر بدل گئی۔ جو تقریر سوچی تھی اور جس کی تیاری کی تھی وہ ذہن سے بالکل نکل گئی اور ایک نئی تقریر نئے انداز اور نئے اسلوب کے ساتھ ذہن میں اترنے اور الفاظ کے قالب میں ڈھلنے لگی۔

یہ مولانا سیالکوٹی کی روحانیت اور تقوے کی ایک حیرت انگیز مثال ہے جس کی اثر انگیزی کا کرشمہ اسی لمحے ظہور میں آ گیا۔

اللہ اللہ! اندازہ کیجیے' عمل و کردار اور فضل و کمال کے اعتبار سے یہ لوگ کس قدر اونچے مقام پر فائز تھے۔ موجودہ دنیا بالکل بدلی ہوئی ہے اور ان کے سوچ بچار کے پیمانے کچھ اور نوعیت کے ہیں۔ ان میں سے اکثر کو نہ ان کی مجلسوں میں حاضر ہونے کی سعادت نصیب ہوئی ہے اور نہ ان کی باتیں سننے کا موقع ملا ہے۔ اب مولانا ابراہیم سیالکوٹی جیسے لوگ کبھی پیدا نہیں ہوں گے۔ وہ زمانے لد گئے جن میں یہ لوگ ابھرے تھے' اور وہ سانچے ٹوٹ گئے جن میں ان اوصاف کے لوگ ڈھلے تھے۔

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ
افسوس! تم کو میر سے صحبت نہیں رہی

مولانا سیالکوٹی کے شاگردوں میں ایک عالم دین مولانا عبدالمجید خادم سوہدروی تھے جو اپنے دور کے بہت اچھے مقرر' کئی کتابوں کے مصنف اور صحافی تھے۔ عام فہم تقریر کرتے تھے اور انداز بیان موثر اور دل نشین تھا۔ وہ اپنی تقریر میں بالعموم تمباکو نوشی کے بارے میں اظہار خیال کیا کرتے تھے اور حساب لگا کر بتایا کرتے تھے کہ ہر تمباکو نوش روزانہ اتنا تمباکو پیتا ہے اور اتنے پیسے خرچ کرتا ہے۔ اس سے مالی نقصان بھی ہوتا ہے اور صحت بھی خراب ہوتی ہے' اسے ترک کر دینا چاہیے۔

مولانا محمد حنیف ندوی نے ایک مرتبہ بتایا کہ ایک جلسے میں جس میں مولانا عبدالمجید خادم سوہدروی کو تقریر کرنا تھی' مولانا سیالکوٹی بھی موجود تھے- انھوں نے ان سے کہا یہ جو آپ نے تمباکو نوشی کا حساب کتاب لگا رکھا ہے اور ہر جلسے میں لوگوں کے سامنے یہ بہی کھاتہ کھول کر بیٹھ جاتے ہو' اس سے کیا حاصل ہوتا ہے- آپ کی تقریر سے متاثر ہو کر کبھی کسی نے تمباکو نوشی ترک کرنے کا اعلان کیا؟ یا کسی نے یہ کہا کہ وہ ترک تو نہیں کر سکتا البتہ اس میں کمی ضرور کر دے گا- میری موجودگی میں جو تقریر کرو اس میں تمباکو کا ذکر مت کیا کرو- چار پانچ تقریریں کسی اور موضوع کی بھی یاد کر لو جو لوگوں کے لیے مفید ہو-

یہ ان کا اپنے سے عمر میں چھوٹے علمائے کرام اور شاگردوں کے لیے بات کہنے کا ایک ڈھنگ تھا' جس میں ''حاکمانہ'' عنصر اگرچہ غالب ہوتا تھا' لیکن ناصحانہ بھی تھا اور مزاحیانہ بھی---! یہ حضرات ان کا حکم نہ صرف مانتے تھے بلکہ شکر گزار ہوتے تھے کہ انھوں نے کسی امر کی طرف انھیں توجہ دلانا ضروری خیال فرمایا-

مولانا عبدالمجید سوہدروی کے حالات میں نے اپنی کتاب ''بزم ارجمنداں'' میں بیان کیے ہیں جو مکتبہ قدوسیہ غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور کی طرف سے شائع ہوئی ہے-

ایک صاحب نے بتایا کہ گرمیوں کا موسم تھا' مولانا اپنی مسجد میں درس قرآن دے رہے تھے- ایک شخص سے کہا پنکھے چلا دو- اس نے تعمیل حکم کی اور پنکھے چلا دیے- ایک شخص وہاں بیٹھے تھے جنھوں نے دو چار دن پہلے مسجد کے لیے پنکھا دیا تھا- انھوں نے پنکھا چلانے والے سے کہا: میرا پنکھا بھی چلا دو-

مولانا نے یہ الفاظ سنے تو جلدی سے اٹھے' کوئی چیز پاؤں کے نیچے رکھنے کے لیے منگوائی- پلاس یا کوئی اور چیز ہاتھ میں پکڑی اور وہ پنکھا اتار کر گلی میں پھینک دیا- جس شخص نے پنکھا دیا تھا' اس کی طرف غصے سے دیکھا اور فرمایا لے جاؤ' اپنا پنکھا--- کیا بکواس ہے' میرا پنکھا بھی چلا دو' میرا پنکھا بھی چلا دو--- یہ کہہ کر تم لوگوں کو بتانا چاہتے ہو کہ میں نے مسجد کو پنکھا دیا ہے- اب سب کو پتا چل گیا ہے- لے جاؤ اپنا پنکھا اور چلاؤ اسے اپنے گھر میں---!

میر عبدالجلیل بہت ہی قریب کی رشتے داری میں مولانا کے پوتے ہیں' میرے نہایت مہربان دوست ہیں اور ان سے میل جول کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ وہ سابق ڈائریکٹر جنرل ڈاک خانہ جات مغربی پاکستان ہیں۔ انھوں نے ایک دفعہ بتایا کہ ایک دن محلے کا ایک شخص (جو نماز نہیں پڑھتا تھا) مولانا کی مسجد میں آیا اور نہانے کے لیے غسل خانے میں داخل ہونے لگا۔ مولانا بھی اتفاق سے تشریف لے آئے۔ فرمایا: تم نماز پڑھتے نہیں اور یہاں نہانے کے لیے آ گئے ہو' چلے جاؤ یہاں سے!

اس نے گستاخانہ لہجے میں جواب دیا: میں نہاؤں گا' آپ کون ہوتے ہیں روکنے والے۔ آپ کے باپ کی مسجد ہے؟

فرمایا: ہاں! میرے باپ کی مسجد ہے' میں تمھیں یہاں نہیں نہانے دوں گا۔

اس کو دھکے دے کر مسجد سے باہر نکال دیا۔

مولانا ثناء اللہ صاحب سے مولانا سیالکوٹی کا بے پناہ تعلق تھا۔ مولانا ثناء اللہ ۱۸۶۸ء میں پیدا ہوئے جب کہ مولانا ابراہیم سیالکوٹی کا سن ولادت ۱۸۷۴ء ہے' اس طرح وہ مولانا سیالکوٹی سے عمر میں چھ سال بڑے تھے اور بڑا ہونے کی بنا پر مولانا سیالکوٹی ان کا بے حد احترام کرتے تھے اور ان کی ایسی باتیں بھی اطمینان سے سنتے اور برداشت کرتے تھے جو ان کے فکر و عمل کے مطابق نہیں ہوتی تھیں۔

آزادی وطن کے زمانے میں مولانا ثناء اللہ ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو لاہور پہنچے تھے۔ امرتسر میں ان کے اکلوتے بیٹے مولانا عطاء اللہ ثنائی کو قتل کر دیا گیا تھا اور تمام گھریلو سامان لوٹ لیا گیا تھا' کتب خانہ برباد ہو گیا تھا اور ساری جائداد غیروں کے قبضے میں چلی گئی تھی۔ وہ بالکل خالی ہاتھ انتہائی تکلیف کے ساتھ لاہور پہنچے تھے۔ حضرت مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی نے ایک مرتبہ بتایا کہ اسی دور میں ایک دن مولانا ابراہیم سیالکوٹی' مولانا اسماعیل صاحب سلفی اور مولانا داؤد غزنوی مسجد چینیانوالی میں بیٹھے تھے' خود مولانا عطاء اللہ بھی وہاں موجود تھے۔ اس وقت جو صورت حال پیدا ہو گئی تھی' اس سے متعلق گفتگو ہو رہی تھی کہ مولانا ثناء اللہ صاحب نے قدرے سخت لفظوں اور ترش لہجے میں مولانا سیالکوٹی سے پنجابی میں کہا:

”ابراہیم! کیا یہی وہ پاکستان ہے جس کے لیے تم بھاگے پھرتے تھے اور اپنے سے اختلاف کرنے والوں پر تنقید کیا کرتے تھے؟“

مولانا ابراہیم صاحب خاموشی سے بیٹھے سنتے رہے‘ انھوں نے ان کی کسی بات کا کوئی جواب نہیں دیا‘ دیگر حضرات میں سے بھی کسی نے کوئی بات نہیں کی۔ مولانا کی حالت دیکھ کر سب پریشان تھے اور آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔

مولانا ابراہیم صاحب نے ان سے صرف اتنی بات کہی کہ موجودہ حالات انتہائی خطرناک ہیں‘ وہ سیالکوٹ تشریف نہ لائیں‘ اس لیے کہ کشمیر کی سرحد سیالکوٹ سے قریب ہے اور کشمیر بہت حساس علاقہ ہے‘ وہاں پاکستان اور ہندوستان کے درمیان کسی وقت بھی جنگ چھڑ سکتی ہے اور اس کے قرب و جوار میں رہنے والے لوگ خطرات میں گھر سکتے ہیں۔

چنانچہ یہ واقعہ ہے کہ مولانا ثناء اللہ صاحب اپنے جگری دوست مولانا ابراہیم سیالکوٹی کے پاس سیالکوٹ نہیں گئے‘ مولانا اسماعیل صاحب انھیں گوجرانوالہ لے گئے تھے‘ کچھ دن وہ وہاں رہے‘ اس کے بعد سرگودھا چلے گئے تھے‘ وہیں ۱۵ مارچ ۱۹۴۸ء کو فوت ہوئے۔

مولانا سیالکوٹی سے متعلق واقعات میں یہ واقعہ بھی قابل ذکر معلوم ہوتا ہے کہ آزادی وطن سے بہت پہلے ایک مرتبہ میر حکیم نور الدین سے ملاقات کے لیے وہ لائل پور تشریف لے گئے۔ میر حکیم نور الدین دور و نزدیک سے ان کے رشتے دار تھے اور لائل پور کی معروف مذہبی‘ سیاسی اور سماجی شخصیتوں میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ ان کے صاحب زادے میر عبدالقیوم ایڈووکیٹ تھے‘ انھوں نے بھی بڑی شہرت پائی۔

مولانا سیالکوٹی دو تین دن وہاں قیام پذیر رہے۔ ان کو رخصت کرنے کے لیے بعض لوگ ریلوے اسٹیشن پر آئے۔ ٹکٹ لیا اور پلیٹ فارم پر گئے تو گاڑی چل پڑی۔ تھوڑی دیر بعد گارڈ نے پیچھے دیکھا تو اچانک مولانا سیالکوٹی پر نظر پڑی۔ اس نے اسی وقت ڈرائیور کو سرخ جھنڈی دکھائی اور گاڑی رک گئی۔ پھر اسے پلیٹ فارم پر لایا گیا اور مولانا سوار ہوئے تو گارڈ نے سبز جھنڈی لہرا کر ڈرائیور کو گاڑی چلانے کا اشارہ دیا۔

میر حکیم نور الدین لائل پوری کے بارے میں میرا طویل مضمون میری کتاب ”کاروانِ

سلف'' میں چھپا ہے۔ یہ کتاب مکتبہ اسلامیہ' بیرون امین پور بازار کوتوالی روڈ فیصل آباد کی طرف سے شائع ہوئی ہے۔

بلاشبہ مولانا سیالکوٹی جلیل القدر عالم تھے اور ہر حلقے میں ان کی تکریم کی جاتی تھی۔ مولانا غلام رسول مہر کی مجلس میں ان کا ذکر آ جاتا تو بڑے احترام سے ان کا نام لیتے اور ان کی فضیلت علمی کا تذکرہ کرتے۔ اہل علم کے جو حلقے اس دور کی صورت حال سے واقف ہیں' ان میں مشہور ہے کہ سورہ فاتحہ کی جو تفسیر انھوں نے ''واضح البیان فی تفسیر ام القرآن'' کے نام سے لکھی تھی اور پہلی دفعہ نومبر ۱۹۳۳ء میں چھپی تھی' وہ مہر صاحب کی تجویز و تحریک کا نتیجہ تھی۔

مولانا محمد حنیف ندوی نے بتایا کہ ایک مرتبہ (۱۹۳۲ء کے آخر یا ۱۹۳۳ء کے شروع میں) امرتسر میں جماعت اہل حدیث کا جلسہ تھا' اس میں مولانا سیالکوٹی بھی تشریف فرما تھے اور اس تفسیر کا مسودہ ان کے پاس تھا۔ عشا کے بعد انھوں نے مجھے آواز دی:

''حنیف' ادھر آؤ' میری بات سنو۔!''

میں حاضر ہوا تو فرمایا: تم نے دالعلوم ندوۃ العلماء (لکھنؤ) سے تفسیر قرآن میں درجۂ تخصص کیا ہے اور تمام تفسیریں تم نے نئی نئی پڑھی ہیں' جن کے مطالب تمھارے ذہن میں محفوظ ہیں۔ مسجد مبارک میں تمھارے درس قرآن کی بڑی شہرت ہے۔ یہ میری تفسیر کا مسودہ ہے جو میں نے ابوالکلام کے جواب میں لکھی ہے' اسے رات کو پڑھو اور پھر صبح کی نماز کے بعد مجھے بتاؤ' یہ کیسی تفسیر ہے۔

مولانا ندوی فرماتے ہیں' میں نے اپنے کمرے میں جا کر مسودہ دیکھا۔ چند سطریں شروع کی' چند درمیان کی اور چند آخر کی پڑھیں۔ ظاہر ہے انھوں نے اس پر بڑی محنت کی تھی اور اسلوب نگارش عالمانہ تھا۔ صبح کو ملاقات ہوئی تو پوچھا:

''مسودہ پڑھا؟''

عرض کیا: ''ابوالکلام کی تفسیر میں الفاظ ہیں اور یہاں شروع سے آخر تک علم ہی علم ہے۔''

بہت خوش ہوئے۔ بولے: میں نے دل میں سوچ رکھا تھا کہ مسودہ تمھیں دکھاؤں گا اور تم اس کے بارے میں صحیح راے دو گے۔

مولانا سیالکوٹی سے تعلق رکھنے والے حضرات ان کی اس قسم کی بہت سی باتیں بیان کرتے ہیں جو ان کے جلال کی آئینہ دار ہیں۔ گوجرانوالہ کے ایک بزرگ عبداللہ اہل حدیث تھے۔ لفظ ''اہل حدیث'' نے ان کے نام عبداللہ کے ساتھ لازمی جز کی حیثیت اختیار کر لی تھی اور وہ اسی نام یعنی عبداللہ اہل حدیث سے موسوم و معروف تھے۔ جماعت اہل حدیث کے اکثر علماے کرام انھیں جانتے اور ان کا احترام کرتے تھے۔ وہ پڑھے لکھے بالکل نہ تھے، لیکن مخلص آدمی تھے اور علما سے ربط و تعلق رکھتے تھے۔ مولانا سیالکوٹی سے بھی ان کے مراسم تھے اور مولانا ان کی تکریم کرتے تھے۔

انھوں نے بتایا کہ آزادی وطن سے کچھ عرصہ پیشتر وہ کسی جماعتی سلسلے میں مولانا کی خدمت میں سیالکوٹ گئے۔ ان کے ساتھ گوجرانوالہ کے بعض اور لوگ بھی تھے، جن کا شمار شہر کے معززین میں ہوتا تھا اور مولانا ان سے متعارف تھے۔

بقول عبداللہ اہل حدیث کے یہ چار پانچ آدمی جو وفد کی صورت میں مولانا کی خدمت میں گئے تھے، ان کے مکان پر پہنچے، دروازے پر دستک دی تو مولانا نے اوپر کے کمرے کی کھڑکی سے سر باہر نکالا اور پوچھا:

''کیا بات ہے۔؟''

انھوں نے نیچے کھڑے سلام عرض کیا اور کہا:

''آپ کی زیارت کے لیے حاضر ہوئے ہیں۔''

زیارت کا لفظ سن کر مولانا نے کھڑکی سے تھوڑا سا سر اور چہرہ باہر نکالا اور پنجابی میں فرمایا۔

''لئو ویکھ لئو میرا بوتھا۔''

(یعنی لو میرا منہ دیکھ لو)

یہ کہہ کر سر اندر کر لیا اور یہ لوگ واپس آ گئے۔

اس سے کچھ عرصہ بعد عبداللہ اہل حدیث پھر ان کی خدمت میں حاضر ہوئے' اب نہایت گرم جوشی سے ملے' پانی پلایا' کھانا کھلایا' چائے پلائی اور دیر تک باتیں کرتے رہے۔ اجازت لے کر واپس آنے لگے تو گھر سے باہر تک رخصت کرنے آئے۔ یہ ان کا جمال تھا جو ان کے اسلوب حیات کے ایک دوسرے پہلو کی نشان دہی کرتا تھا۔

مولانا محمد حنیف ندوی نے بتایا کہ ایک مرتبہ مولانا سیالکوٹی گوجرانوالہ کی انجمن اہل حدیث کے ایک جلسے میں شریک ہوئے' بہت سے علمائے کرام اس جلسے میں تشریف لائے تھے' جن میں مولانا عبدالواحد غزنوی' قاضی محمد سلیمان منصور پوری اور مولانا ثناء اللہ امرتسری شامل تھے۔ ایک شخص نے جلسے میں تشریف لانے والے علمائے کرام کو بڑی عقیدت سے کھانے پر بلایا۔ دستر خوان پر بیٹھے تو معلوم ہوا سالن میں مرچ زیادہ ہے۔ مولانا عبدالواحد غزنوی نے مرچ کا اثر زائل کرنے کے لیے چپکے سے اپنی پلیٹ میں تھوڑا سا پانی ڈال لیا اور کھانا شروع کر دیا۔ دیگر حضرات بھی کسی قسم کا احساس کرائے بغیر کھانے میں مشغول ہو گئے۔ لیکن مولانا سیالکوٹی طیش میں آ گئے۔ بولے:

"یہ کس احمق نے کھانا پکایا ہے۔ علما کو اس قسم کا کھانا کھلایا جاتا ہے۔"

مولانا حنیف ندوی کا بیان ہے کہ ان الفاظ سے سخت پریشان کن صورت حال پیدا ہو گئی۔ سب لوگ حیران اور صاحب خانہ تو مارے شرم کے بالکل خاموش کھڑا تھا۔ مولانا ثناء اللہ صاحب بھی موجود تھے اور وہ کھانا کھا رہے تھے۔ ان سے مولانا سیالکوٹی دبتے بھی تھے اور ان کا بے حد احترام بھی کرتے تھے۔ انھوں نے سختی سے کہا۔ آپ نہیں کھانا چاہتے تو نہ کھایئے' دوسروں کو کیوں پریشان کرتے ہیں۔

یہ الفاظ سن کر خاموش ہو گئے اور کھانا شروع کر دیا۔ اس کے بعد صاحب خانہ سے پیار کی باتیں ہونے لگیں۔

۲۸' ۲۹ مئی ۱۹۴۹ء کو مرکزی جمعیت اہل حدیث کا پہلا جلسہ عام لاہور میں منعقد کرنے کا فیصلہ ہوا۔ طے پایا کہ صدر استقبالیہ مولانا محمد حنیف ندوی اور صدر جلسہ مولانا محمد ابراہیم سیالکوٹی ہوں گے۔ اس کی منظوری لینے کے لیے چند سر کردہ حضرات کو سیالکوٹ

مولانا کی خدمت میں بھیجا گیا- انھوں نے مولانا سے بات کی تو جواب میں انتہائی خفگی کا اظہار کیا' جلسے میں شامل ہونے اور صدارت کرنے سے انکار کر دیا-

پانچ چھے دن کے بعد مولانا داؤد غزنوی' مولانا محمد حنیف ندوی' حاجی محمد اسحاق حنیف اور ان سطور کا راقم ان کی خدمت میں سیالکوٹ گئے- بڑے تپاک سے ملے اور بہ درجہ غایت احترام سے پیش آئے- کھانا کھلایا اور کشمیری چائے پلائی- پھر خربوزے آ گئے اور اپنے ہاتھ سے چیر کر ہر ایک کو پیش کیے- یہ ان کے جمال کی انتہا تھی- دو تین گھنٹے کی نشست میں بالکل احساس نہیں ہوا کہ انھیں کبھی غصہ بھی آتا ہوگا- یا صوفیا کی اصطلاح میں یوں کہیے کہ ان پر کبھی جلال کی کیفیت بھی طاری ہوتی ہوگی-

مولانا داؤد غزنوی نے جلسے کی صدارت کے لیے درخواست کی اور اپنے ساتھیوں کی طرف اشارہ کر کے فرمایا' یہ سب لوگ اسی مقصد کے لیے آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے ہیں-

یہ الفاظ سنتے ہی فوراً منظوری دے دی اور انکسار سے فرمایا' آپ کا حکم سر آنکھوں پر-

ان حضرات میں سے مجھے وہ نہیں جانتے تھے' لیکن جس پیار اور محبت کا سلوک ان سب سے کیا گیا' مجھے بھی اس کا حق دار سمجھا گیا- یہ ان کا کرم تھا- تھوڑی دیر بعد وہ حاجی محمد اسحاق حنیف کو علیحدگی میں لے گئے اور (بقول حاجی صاحب) ان سے میرے بارے میں پوچھا' یہ کون نوجوان ہے؟ انھوں نے بتایا یہ ریاست فرید کوٹ کے شہر کوٹ کپورے سے تعلق رکھتا ہے اور مرکزی جمعیت اہل حدیث کے دفتر کا ناظم ہے- (اس وقت اخبار "الاعتصام" جاری نہیں ہوا تھا)-

اس کے بعد مجھ سے مخاطب ہوئے اور فرمایا' میں تمھارے شہر میں کئی دفعہ وہاں کی انجمن اصلاح المسلمین کے سالانہ جلسوں میں گیا ہوں- پھر وہاں کے لوگوں کی تعریف کی اور اچھے الفاظ میں ان کی دین داری کا ذکر کیا- مولانا داؤد غزنوی نے بھی میرا ان سے ایسے انداز میں ذکر کیا جو میرے لیے بے حد مسرت کا باعث تھا-

یہ ان دونوں بزرگوں کی بارگاہِ فضیلت سے ایک بہت بڑا اعزاز تھا' جس کا اس فقیر کو

مستحق گردانا گیا۔

انجمن اصلاح المسلمین کے اجلاس کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ میں نے مولانا ابراہیم سیالکوٹی کو اچھی طرح دیکھا' ان کی مجلس میں بیٹھنے کا شرف حاصل کیا اور بہت ہی قریب سے ان کی باتیں سننے کی سعادت سے بہرہ مند ہوا۔ (گورے رنگ میں سرخی کی آمیزش' نہایت متوازن چہرا' نہ بالکل گول نہ لمبوترا۔ تیکھے نقوش' موٹی موٹی چمک دار آنکھیں' کھلی پیشانی' چوڑا سینہ' پورا قد' متناسب جسم' صاف ستھرا لباس' رعب دار آواز' عالمانہ لہجہ' پروقار طرزِ گفتگو' منکسرانہ اسلوب کلام اور جاذب نظر شخصیت کے مالک۔۔۔!)

ہم اجازت لے کر چلنے لگے تو سب کو خربوزے عطا کیے۔ مولانا داؤد غزنوی کو چھوٹی سی بوری میں ڈال کر پیش کیے اور فرمایا جو خربوزے آپ کو کھلائے گئے ہیں اور جو اب پیش کر رہا ہوں' یہ میرے اپنے کنوئیں اور اپنی زمین کے ہیں۔ ان کا بیج بہت اچھا ہے اور یہ بڑے میٹھے خربوزے ہیں۔

مولانا غزنوی سے خاص طور پر فرمایا: یہ آپ کے لیے آپ کی بھابی کا تحفہ ہے اور یہ تحفہ گھر جا کر ہماری بھابی کو پیش کر دیجیے گا اور ہماری طرف سے انھیں بہت بہت سلام کہیے گا۔

۲۸' ۲۹ مئی کے جلسے میں وہ تشریف لائے اور ان کی صدارت میں جلسہ ہوا۔ پروگرام کے مطابق مولانا محمد حنیف ندوی نے خطبہ استقبالیہ اور انھوں نے خطبہ صدارت پڑھا۔ اس وقت یہ دونوں خطبے چھپوائے نہیں گئے تھے۔ اس سے تین مہینے بعد اگست ۱۹۴۹ کو مولانا محمد حنیف ندوی کی ادارت میں اخبار ''الاعتصام'' جاری ہوا تو ان کا خطبہ استقبالیہ ۱۸' ۲۵ نومبر اور ۲ دسمبر ۱۹۴۹ء کی (تین) اشاعتوں میں چھپا۔ مولانا سیالکوٹی نے مجھے حکم دیا کہ میں ''نوائے وقت'' کے ایڈیٹر حمید نظامی (مرحوم) سے ملوں اور انھیں ان کا پیغام دوں کہ یہ خطبہ ''نوائے وقت'' میں شائع کر دیا جائے۔ چنانچہ ان کے حکم کے مطابق میں حمید نظامی صاحب سے ملا۔ ان کا پیغام پہنچایا اور نوائے وقت کی چند اشاعتوں میں یہ خطبہ چھپا۔

مولانا محمد حنیف ندوی نے بتایا کہ مولانا سیالکوٹی بعض دفعہ ایسی طنزیہ یا لطیفہ آمیز

بات کرتے کہ لطف آ جاتا- ایک مرتبہ ہندوستان کے شہر بنارس کی جماعت اہل حدیث کا جلسہ ہوا- اس میں مولانا سیالکوٹی سمیت پنجاب کے چھ سات علمائے کرام شامل تھے- مولانا حنیف ندوی بھی شریک جلسہ تھے- پنجاب کے ایک مشہور مقرر نے عربوں جیسا لمبا سا جبہ پہن رکھا تھا- وہ تقریر کے لیے کھڑے ہوئے تو مولانا نے فرمایا:

''تمھیں یہاں اللہ اور اس کے رسول کی باتیں سنانے کے لیے بلایا گیا ہے- یہ پشواز اتار دو- ایسے مواقع پر پشواز نہیں پہنی جاتی-''

اسی جلسے میں ایک اور عالم کو تقریر کرنا تھی- مولانا نے ان سے کہا:

''کل بھی تم نے تقریر کی تھی اور عربی عبارتیں غلط پڑھی تھیں- آج بھی تمھیں تقریر کرنی ہے' اگر کوئی عربی عبارت پڑھنے کا ارادہ ہے تو پہلے مجھے سنا دو تا کہ میں اس کی تصحیح کرا دوں-''

اگر کسی مقرر کو ترنم سے شعر پڑھنے کی عادت ہوتی تو مزاحاً اس سے کہتے' موسیقی سے بچو' یہ اسلام میں جائز نہیں-

جیسا کہ گزشتہ سطور میں عرض کیا گیا' سابق ڈائریکٹر جنرل ڈاکخانہ جات مغربی پاکستان میر عبدالجلیل سے عرصہ دراز سے میرے مراسم ہیں- میرے دفتر (ادارہ ثقافت اسلامیہ) میں ان کی آمد و رفت رہتی تھی- وہ مولانا کو ''باباجی'' کہا کرتے ہیں- ایک دن انھوں نے کچھ اس قسم کی بات کی جس کا مطلب یہ تھا کہ باباجی سخت مزاج تھے اور صاف سیدھی بات کرتے تھے- ایک دفعہ کسی شخص سے خفا ہوئے تو بولے:

''میں تیرے تھپڑ مار کے بوتھا دوجے پاسے کر دیاں گا-''

یہ الفاظ سن کر وہ ڈر گیا اور بھاگ کھڑا ہوا کہ کہیں سچ مچ ہی ''تھپڑ مار کر بوتھا دوجے پاسے'' نہ کر دیں- (یعنی میں تجھے اتنے زور سے تھپڑ ماروں گا کہ تیرا چہرہ دوسری طرف ہو جائے گا)-

میرا خیال یہ تھا کہ ان کی سخت مزاجی کی وجہ یہ ہوگی کہ وہ اولاد سے محروم تھے اور اس کا اظہار بھی کسی نہ کسی طریقے سے کرتے رہتے تھے' اس لیے کچھ مایوسی کا شکار ہو گئے تھے اور

طبیعت میں چڑچڑاپن آ گیا تھا- میر عبدالجلیل صاحب سے ایک دن اس خیال کا اظہار بھی کیا۔

انھوں نے بتایا کہ باباجی چھے یا سات بہنوں کے اکلوتے بھائی تھے اور سب سے چھوٹے تھے- ناز و نعمت میں پلے تھے- بچپن میں سب ان سے پیار کرتے تھے' جو جی چاہتا کرتے' کوئی کچھ نہیں کہتا تھا- کسی کو مارتے' کسی کو پیٹتے' کسی کو ڈانٹتے' کوئی چیز خراب کر دیتے' کسی بات کی جواب طلبی نہیں ہوتی تھی- بچپن کی یہ عادت عمر بھر ان کے ساتھ رہی اور ابتدا میں طبیعت جس نازک مزاجی کے سانچے میں ڈھل گئی تھی' زندگی کے آخری دم تک اسی حالت میں رہی-

ان کے جگری دوستوں میں مولانا ثناء اللہ امرتسریؒ کا اسم گرامی خاص طور سے لائق تذکرہ ہے- دونوں کا آپس میں گہرا یارانہ تھا- ہندوستان کے اکثر جلسوں میں اکٹھے جاتے' جماعت کی ہر مجلس میں ان کا ساتھ رہتا اور اس دور کے بڑے بڑے اجتماعات کی رونق کو ان کے دم قدم کی رہین منت خیال کیا جاتا تھا--- لیکن عجیب بات ہے کہ دونوں کی طبیعتوں میں نمایاں فرق تھا- مولانا ابراہیم بے حد نازک مزاج اور غصیلی طبیعت کے مالک تھے- ذرا سی خلاف طبع بات سے موڈ بدل جاتا اور طیش میں آ جاتے- بہ الفاظ دیگر سراپا جلال تھے- بسا اوقات ہلکی سے ہلکی بات برداشت کرنا بھی ان کے بس سے باہر ہو جاتا- اس کے برعکس مولانا ثناء اللہ بہ درجہ غایت متحمل مزاج' حلیم الطبع' متواضع اور نرم طبیعت--- ہر شخص کی بات سنتے اور اس کی ذہنی سطح کے مطابق اس سے گفتگو کرتے- تیز کلامی اور تلخ نوائی سے کوسوں دور---! اس طبعی تضاد اور تفاوت مزاج کے باوجود دونوں میں گاڑھی چھنتی تھی- لوگوں میں مشہور تھا کہ دونوں کی دوستی میں اصل قدر مشترک ان کی کشمیریت تھی- ان کے پوتے میر عبدالجلیل کا خیال بھی یہی ہے-

گزشتہ سطور میں مولانا ابراہیم سیالکوٹی کے بارے میں جو باتیں بیان کی گئی ہیں' ان سے ان کی زندگی کے ایک خاص گوشے کی نشان دہی کرنا مقصود تھا- بعض لوگ کسی بزرگ کے سوانح حیات معرض تحریر میں لاتے وقت محض اس لیے اس قسم کی باتیں قلم زد کر دیتے ہیں

کہ ان کے نزدیک ان میں اہانت کا پہلو پایا جاتا ہے۔ مجھے اس نقطہ نظر سے اتفاق نہیں۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ جب تک کسی شخص کی زندگی کے تمام پہلو ضبط کتابت میں نہ لائے جائیں' اس کی شخصیت نکھر کر قارئین کے سامنے نہیں آ سکتی۔

کسی کے مزاج وطبیعت کی مختلف کیفیتوں کی وضاحت کرنا اس کی توہین نہیں بلکہ اظہار واقعہ ہے۔ قرآن مجید میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طبعی سختی کا تذکرہ فرمایا گیا ہے' لیکن اس کے باوصف وہ اللہ کے لاڈلے پیغمبر تھے۔ حدیث وسیرت کی کتابوں میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی تلخ مزاجی کی طرف واضح اشارے موجود ہیں' بایں ہمہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:

لو كان بعد نبي لكان عمر۔

(میرے بعد اگر نبوت کا دروازہ بند نہ ہو گیا ہوتا تو یہ اعزاز عمر کے حصے میں آتا)

یہ حقیقت ہمیشہ ذہن میں رہنی چاہیے کہ نہ عام لوگ ایک ہی طبیعت کے مالک ہیں اور نہ سب علمائے کرام کا مزاج یکساں ہے۔ جس طرح مختلف افراد مختلف طبائع رکھتے ہیں' اسی طرح علمائے کرام اور مشائخ عظام بھی الگ الگ طبیعتوں کے مالک ہیں۔ کسی میں سختی کا پہلو نمایاں ہے اور کسی میں نرمی کا عنصر غالب۔ کوئی انتہائی نازک مزاج ہے اور کوئی بے حد متوازن ومعتدل۔ ان کی عادات واطوار کو صفحات قرطاس کی زینت بنانا اور ان کے طرز ادا اور نہج کلام کی مناسب الفاظ میں صراحت کرنا سوانح نگاری کا لازمی جز ہے۔ گلشن ہستی کی رونق اسی تضاد واختلاف سے قائم ہے اور اس عالم آب وگل کی گہما گہمی انہی اضداد و تناقضات کی مرہون منت ہے۔

گلہائے رنگ رنگ سے ہے زینت چمن
اے ذوق اس جہاں کو ہے زیب اختلاف سے

مولانا محمد ابراہیم سیالکوٹی اپنے عہد کے جلیل القدر عالم' منقول ومعقول کے ماہر' بہت بڑے مناظر' کثیر التصانیف مصنف' دین کے بارے میں نہایت غیور' عزت نفس کی حفاظت کے سلسلے میں انتہائی جری' بارعب اور صاحب جلال بزرگ تھے۔ غلطی پر ٹوکنا' برائی سے

روکنا اور صحیح راہ اختیار کرنے کی تلقین کرنا ان کے نزدیک ضروری تھا! اس ضمن میں وہ کسی کی پروانہ کرتے تھے۔ کوئی مانے یا نہ مانے وہ ہر حال میں کلمۂ حق بلند کرتے رہتے تھے۔

تقریر اور گفتگو میں مولانا سیالکوٹی کا لہجہ تو اپنا ہی تھا' لیکن تلفظ کی صحت اور حروف کے مخارج کا انھیں بہت خیال رہتا تھا۔ ذ' ز' ض اور ظ میں ث' س اور ض میں' ہائے ہوز اور حائے حطی میں' "ق" اور "ک" میں یا "ت" اور "ط" میں جو فرق مخارج ہے اسے وہ پوری طرح ملحوظ رکھتے تھے۔

حضرت مولانا محمد اسماعیل (گوجرانوالہ) بہت بڑے عالم اور کثیر المطالعہ بزرگ تھے اور مولانا سیالکوٹی کے حلقۂ تلمذ میں رہنے کا انھیں شرف حاصل تھا۔ مولانا حنیف ندوی نے بتایا کہ ایک دفعہ کسی مضمون میں انھوں نے "نکتہ" کو "نقطہ" یا لفظ "نقطہ" کو "نکتہ" تحریر فرما دیا۔ یہ مضمون مولانا سیالکوٹی کے مطالعہ میں آیا تو انھوں نے مولانا محمد اسماعیل صاحب کو خط لکھا جس میں اس غلطی (یا سبقت قلم) کی طرف اس انداز سے توجہ دلائی کہ تم عالم بنے پھرتے ہو' تمھیں تو یہ تک پتا نہیں کہ نکتے اور نقطے میں کیا فرق ہے۔ اتنا عرصہ تم مجھ سے پڑھتے رہے' مگر صحیح بات سمجھ نہ سکے۔۔۔ وغیرہ وغیرہ۔

یہ عجیب و غریب خط مولانا اسماعیل صاحب نے کتنے ہی لوگوں کو دکھایا اور سنایا جو مولانا سیالکوٹی کے "صاحب الجلال" ہونے کا بہت بڑا ثبوت تھا۔ اس سلسلے میں قابل ذکر بات یہ ہے کہ مولانا سیالکوٹی کی اس خط سے تسلی نہیں ہوئی' وہ ایک جلسے میں گوجرانوالہ تشریف لائے اور تقریر ارشاد فرمائی تو اس میں بھی اس کا ذکر فرمایا اور کہا: اسماعیل بے خبر ہے' لوگو! تم بھی اسے بے خبر کہو' جسے یہ معلوم نہیں کہ لفظ نقطہ کہاں استعمال کیا جاتا ہے اور نکتہ کہاں بولا اور لکھا جاتا ہے۔

حضرت مولانا محمد اسماعیل صاحب اس فقیر کے استاد تھے' مجھے ان سے متعلق یہ الفاظ لکھتے وقت نہایت تکلیف ہوئی ہے۔ لیکن میں نے واقعہ بیان کیا ہے اور پھر مولانا سیالکوٹی نے ان کے بارے میں جو الفاظ فرمائے تھے' وہ میں نے بیان نہیں کیے' ان کا ترجمہ یا متبادل الفاظ تحریر کیے ہیں۔

یہ واقعہ بھی مولانا سیالکوٹی کی ''جلالیات'' کی وسیع فہرست میں شامل ہے۔

قرآن مجید سے انھیں انتہائی شغف تھا اور اس کے ترجمہ و تفسیر کو مرکز توجہ قرار دیے رکھنا ان کے مقاصد حیات کا لازمی حصہ تھا۔ عام گفتگو اور تقریر میں نہایت مناسب مواقع پر قرآن کی آیات پڑھتے اور بکثرت پڑھتے۔ اگر کسی مقام میں ان کے نزدیک کوئی خاص نکتہ پنہاں ہوتا تو ایک اندازِ خاص سے الفاظ پر زور دے کر فرماتے:

''یہ نکتہ''---!

یا پنجابی میں کہتے:

''ایہہ نکتہ---'' لفظ ''نکتہ'' بولتے وقت حرف ''تہ'' کو لمبا کرتے۔

دورۂ تفسیر میں وہ بہت سے نکات طلبا کو نوٹ کراتے تھے۔

جہاں تک مجھے معلوم ہے' آزادی وطن سے پہلے اور اس کے بعد برصغیر پاک و ہند کے صرف دو شہروں میں دو علمائے کرام سال میں تین مہینے دورۂ تفسیر قرآن پڑھانے کا التزام کرتے تھے' اور وہ تھے لاہور میں مولانا احمد علی اور سیالکوٹ میں مولانا محمد ابراہیم رحمتہ اللہ علیہم۔

یکم رجب سے رمضان کی آخری تاریخ تک یہ دونوں بزرگانِ عالی مقام فارغ التحصیل حضرات کو تفسیر پڑھاتے تھے' دور و نزدیک سے شائقین آتے اور ان کے درس قرآن میں شریک ہوتے تھے۔ اس میں فقہی مسلک کا کوئی امتیاز نہ تھا۔ اہل حدیث طلبا مولانا احمد علی صاحب سے اور حنفی طلبا مولانا محمد ابراہیم صاحب سے استفادہ کرتے تھے۔

ہمارے دوست مولانا معین الدین لکھوی کو آزادی سے قبل دونوں حضرات سے مستفید ہونے کا موقع ملا۔ ایک سال مولانا سیالکوٹی سے اور ایک سال مولانا احمد علی صاحب سے۔

مولانا معین الدین صاحب علمی اعتبار سے خود بھی پنجاب کے مشہور خاندان کے فرد ہیں۔ ان کے پردادا حضرت حافظ محمد لکھوی وہ مفسر قرآن تھے جنھوں نے ''تفسیر محمدی'' کے نام سے پنجابی نظم میں سات جلدوں میں قرآن مجید کی تفسیر لکھی جو بار بار چھپی

اور بے حد مقبول ہوئی- ان کے خاندانی پس منظر کی وجہ سے حضرت مولانا احمد علی صاحبؒ اور مولانا سیالکوٹیؒ ان کا خاص خیال رکھتے تھے اور ان کے اکابر کے بعض واقعات طلبا کو سنایا کرتے تھے-

یہ اس زمانے کے لائق احترام اور عالی مرتبت بزرگان کرام تھے' جب بڑے سے بڑے عالم کو ''مولوی'' کہا جاتا تھا یا پھر زیادہ سے زیادہ ان کے نام کے ساتھ ''مولانا مولوی'' لکھا جاتا تھا- اس دور میں شاید زبدۃ العلما' عمدۃ المفسرین' قدوۃ الصالحین' رأس الاتقیا' شیخ القرآن والحدیث' امام العصر اور شیخ الاسلام وغیرہ القاب ایجاد نہیں ہوئے تھے' نہ علامہ اور فہامہ قسم کے الفاظ کبھی سننے میں آئے تھے- اب یہ حال ہے کہ القاب کی کثرت اور خطابات کی اگاڑی بچھاڑی میں میرے جیسے ناواقف کے لیے کسی عالم کا اصل نام تلاش کرنا مشکل ہو جاتا ہے-

پہلے پہل القاب نویسی کا رواج بریلوی حضرات نے ڈالا- پھر یہ مرض دیوبندی مقالہ نگاروں میں آیا اور اب کچھ عرصے سے یہ متعدی بیماری بعض اہل حدیث مصنفوں اور مضمون نویسوں کو لاحق ہو گئی ہے- علم گھٹتا جا رہا ہے اور اس کی جگہ القاب وخطابات لے رہے ہیں-

میں الحمدللہ ''جلسی'' نہیں ہوں' نہ کسی جلسے میں جاتا ہوں' نہ اس موضوع سے دلچسپی رکھتا ہوں- میں نے سنا ہے کہ بعض ایسے مقررین بھی ہیں کہ کوئی انھیں جلسے میں دعوت دینے اور تقریر کے لیے عرض کرنے آئے تو اس سے پوچھا جاتا ہے کہ کن کن عالموں کو جلسے میں شرکت کی دعوت دی گئی ہے- پھر اسے اپنے متعلق باقاعدہ ہدایت کی جاتی ہے کہ ان کا نام اشتہار میں سب سے پہلے لکھا جائے یا نمایاں کر کے اسے رنگین اور جاذب نظر چوکھٹے میں درج کیا جائے اور یہ یہ القاب اس کے آگے اور پیچھے لکھے جائیں-

میری شنید کے مطابق ایسا بھی ہوا کہ بعض مقرروں نے اشتہار پھاڑ دیے کہ ان کا نام دوسرے یا تیسرے نمبر پر لکھا گیا ہے' یا پھر محض اس بنا پر جلسے میں شریک ہونے سے انکار کر دیا کہ ان کے اسم گرامی سے پہلے اور بعد میں فلاں فلاں القاب کی لام ڈوری نہیں لگائی گئی-

آزادی سے پہلے یہ ہوتا تھا کہ تمام علمائے کرام کو الگ الگ جوابی پوسٹ کارڈ لکھ

دیے جاتے تھے اور جلسے کی تاریخ بتا دی جاتی تھی' منظوری آ جاتی تھی اور وہ خود ہی تشریف لے آتے تھے۔

موجودہ دور میں اس سے تو نہایت خوشی ہوتی ہے کہ علما نے موٹر کاریں رکھی ہیں اور ان کا معیار زندگی اونچا ہوا ہے' لیکن ان میں اور کئی قسم کی باتیں آ گئی ہیں۔ مثلاً یہ کہ وقت طے ہو جانے کے باوجود ایک یا دو آدمی ان کو لینے جائیں۔ پھر ان کی خدمت الگ کریں' ان کی گاڑی کے لیے پٹرول الگ دیں اور "ٹائر گھسائی" الگ دیں۔ ہر عالم کے ساتھ ایک ایک دو دو خادم بھی ہوتے ہیں' ان کی خدمت الگ کی جائے۔

تقسیم ملک سے پہلے ہم نے ہندوؤں کے گھروں میں دیکھا کہ ان کے خاندان کے برہمن کو کھیر کھلانے کے لیے کوئی ہندو گھر میں بلاتا تھا تو گائے کے دودھ کی کھیر اسے کھلائی جاتی تھی اور کھیر کھاتے ہوئے جو دانت گھستے ہیں اس کے پیسے دیے جاتے تھے' اسے کہا جاتا تھا۔ "دند گھسائی"۔ یعنی دانت گھسنے کا معاوضہ۔

اسی طرح ہمارے علمائے کرام کی موٹروں کا پٹرول الگ دیا جاتا ہے' اور "ٹائر گھسائی" کے پیسے الگ دیے جاتے ہیں۔

اب تو اکثر علمائے کرام اور مبلغین اسلام نے محافظ بھی رکھ لیے ہیں' جنھیں باڈی گارڈ کہا جاتا ہے۔ مبلغ صاحب ایک بڑی گاڑی میں سوار ہیں اور اس شان سے دین کی تبلیغ فرمانے جا رہے ہیں کہ فرنٹ سیٹ پر بندوق بردار یا کلاشن کوف بردار بیٹھا ہے۔ ڈرائیور سے پچھلی سیٹ پر ایک شخص دائیں جانب بیٹھا ہے اور ایک بائیں جانب' درمیان میں حضرت مبلغ تشریف فرما ہیں' ان کے پیچھے دو تین آدمی بیٹھے ہیں جو ان کے محافظ یعنی باڈی گارڈ ہیں۔ موبائل فون باڈی گارڈ کے ہاتھ میں ہے۔ اگر باہر سے آنے والی گولی سے کسی کو مرنا ہے تو آگے پیچھے اور دائیں بائیں بیٹھنے والے مریں۔ اس لیے کہ نہ وہ کسی کے بھائی ہیں' نہ بیٹے ہیں' نہ باپ ہیں' نہ شوہر ہیں' نہ کسی کے رشتے دار ہیں' صرف باڈی گارڈ ہیں۔ جب کہ مبلغ دین سب کے سب کچھ ہیں' جو اس طرح اسلحہ برداروں کے گھیرے میں بیٹھے ہیں جیسے بہت بڑا ڈکیت بیٹھا ہو۔ اگر وہ گاڑی سے باہر نکلتا ہے تو اسلحہ والے اس کے ساتھ باہر

نکلتے ہیں۔ اگر وہ جماعت کرائے یا تنہا نماز پڑھے تو بندوق بردار بندوق تانے اس کے سامنے بیٹھا ہے۔ اگر جلسے میں تقریر کرے تو ایک شخص بندوق یا کلاشن کوف یا موزر پکڑے اس کے دائیں کھڑا ہے اور ایک اس کے بائیں۔ شاید انھیں خطرہ ہے کہ یہ ڈاکو بڑی مشکل سے ہاتھ لگا ہے' کہیں بھاگ نہ جائے۔ اس کی پوری رکھوالی کی جائے اور ہر وقت اور ہر جگہ اسے پہرے میں رکھا جائے۔ بس ہتھکڑی اور بیڑی اسے نہ لگائی جائے' اس کے سوا جکڑنے اور قید رکھنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی جائے۔

عجیب بات یہ ہے کہ خوف کے مارے اور لوگوں سے سہمے ہوئے یہ مبلغ جلسے میں جا کر لوگوں کو صرف اللہ سے ڈرنے اور کسی بڑی سے بڑی طاقت سے خوف زدہ نہ ہونے کی تلقین فرماتے ہیں اور میدان جہاد میں نکلنے' دشمن کی فوجوں کا مقابلہ کرنے اور شہروں کے شہر اور ملکوں کے ملک فتح کرنے کا پورے زور و جذبے کے ساتھ درس دیتے ہیں۔ جہاد کے موضوع پر بلند آہنگی سے تقریر فرماتے ہوئے قرآن کی آیات پڑھتے ہیں' نبی ﷺ کی احادیث سناتے ہیں' اس سلسلے میں حضور کے عمل کا تذکرہ فرماتے ہیں۔ صحابہ کے واقعات بیان کرتے ہیں اور میدان جنگ کے نقشے سامعین کے سامنے رکھتے ہیں۔

جلسے کے منتظمین ان باتونی اور ڈرپوک اور بزدل مبلغوں کو اپنے جلسوں میں بلاتے ہیں' ان کو پیسے بھی دیتے ہیں۔ یہ نہیں سوچا تا کہ جو لوگ اکیلے دو قدم نہیں چل سکتے اور خود اپنے ہی لوگوں سے خوف زدہ ہیں' وہ دوسروں سے خاک لڑیں گے اور کیوں کر جہاد کریں گے۔

پہلے یہ بات نہ تھی' علمائے کرام جلسوں میں جاتے تھے اور لوگوں کو وعظ و نصیحت کرتے اور کلمہ حق سناتے تھے۔ کسی قسم کے تکلف اور اسلحہ برداری کا کوئی تصور نہ تھا۔

بات مولانا سیالکوٹی کی ہو رہی تھی جو موجودہ دور کے بزدل اور ڈرپوک مبلغوں تک پہنچ گئی۔

\مولانا ممدوح کا دور برصغیر میں مختلف مذاہب کا دور تھا' عیسائی' آریہ سماجی اور سناتن دھرمی وغیرہ' کتنے ہی مذاہب کے لوگ اس وسیع و عریض خطے میں آباد تھے۔ ان مذاہب

کے الگ الگ مبلغ اور پرچارک تھے جو اپنے اپنے مذہب کی تبلیغ کرتے اور دوسرے مذاہب کے مقابلے میں اس کی حقانیت ثابت کرتے تھے۔ ان مبلغوں کی مسلمانوں سے خاص طور پر ٹکر رہتی تھی۔ ان میں سے اکثر مبلغ عربی اور فارسی سے آشنا تھے اور قرآن وحدیث اور فقہ اسلامی کے بعض دقیق مسائل پر بھی ان کی نظر تھی اور اسلام کے بعض پہلوؤں پر اپنی تقریروں میں زبردست حملے کرتے تھے۔ ان کے مقابلے میں مسلمانوں میں بھی بہت سے مبلغ اور مناظر تھے جو ان کے مذہبی معاملات سے اچھی طرح آگاہ تھے اور اپنی تقریروں اور مناظروں میں انھیں ہدف تنقید ٹھہراتے تھے۔ مولانا سیالکوٹی بھی بڑے مشہور مناظر تھے جو غیر مسلم مناظروں سے مختلف مقامات پر بارہا پنجہ آزما ہوئے۔

عیسائی مبلغوں میں پادری عبدالحق کی بڑی شہرت تھی۔ وہ عیسائیوں کے بہت پڑھے لکھے اور باخبر عالم تھے۔ منطق اور فلسفہ ان کا خاص موضوع تھا اور حریف کو منطقیانہ اور فلسفیانہ مباحث کے جال میں پھنسانے کے فن میں بڑی مہارت رکھتے تھے۔ عربی کی عبارتوں کی عبارتیں مسلسل پڑھتے جاتے تھے اور صحیح پڑھتے تھے۔ بڑے ذہین' تیز طرار اور چرب زبان تھے۔ آزادی کے بعد صوبہ یوپی کے شہر آگرہ میں سکونت اختیار کر لی تھی اور وہیں فوت ہوئے۔

مولانا حنیف ندوی نے بتایا کہ ایک مرتبہ گوجرانوالہ میں مولانا سیالکوٹی سے پادری عبدالحق کا مناظرہ ہوا۔ دونوں بہت باخبر عالم تھے۔ پادری صاحب نے حسب عادت منطق وفلسفہ کی اصطلاحوں کا سہارا لیا۔ مولانا سیالکوٹی نے بھی مقابلے میں اپنے علم وفضل کے خوب جوہر دکھائے۔ پادری صاحب کو معلوم تھا کہ مولانا جلالی طبیعت کے مالک ہیں اور جلد طیش میں آجاتے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے بحث میں کچھ ایسا انداز اختیار کیا کہ مولانا واقعی جلال میں آگئے۔

پادری عبدالحق نے کسی مسئلے سے متعلق گفتگو کرتے ہوئے مولانا سے سوال کیا کہ منطق روسے یہ کلی ہے یا جزئی۔ اگر کلی ہے تو اس کی منطقی تفصیل بیان کی جائے۔

یہ ایسا مسئلہ نہیں تھا کہ مولانا سیالکوٹی کو اس کے جواب میں کوئی دقت پیش آتی۔

انھوں نے ہر سوال کا صحیح اور مدلل جواب دیا- لیکن پادری صاحب جب زیادہ آگے بڑھے تو مولانا کی جلالی طبیعت جوش میں آ گئی اور یہی وہ چاہتا تھا- اس وقت مولانا نور حسین گھر جاکھی (مرحوم) بھی موجود تھے' وہ اتنے بڑے عالم تو نہ تھے' البتہ مناظر بہت اچھے تھے- انھوں نے مولانا سیالکوٹی سے کہا کہ چند منٹ کے لیے انھیں بولنے کی اجازت دی جائے- پہلے تو مولانا نے انکار کیا' لیکن جب اصرار بڑھا تو اجازت دے دی- انھوں نے چھوٹتے ہی پادری عبدالحق سے کہا:

پادری صاحب! آپ میرے ساتھ بات کریں' میں ابھی آپ کی کلیوں کو آگ لگا کر راکھ کا ڈھیر بنادوں گا-

یہ الفاظ سنتے ہی دیہات کے رہنے والے وہ عیسائی جو مناظرہ سننے آئے تھے' کھڑے ہوگئے اور ہاتھ جوڑ کر پادری عبدالحق سے التجا کرنے لگے کہ جناب پادری صاحب مہربانی فرما کر مناظرہ بند کردیں ورنہ علاقے کے مسلمان ہم غریب لوگوں کی کلیاں جلادیں گے- ہم میں سے اکثر کی جائدادیہی کلیاں ہیں' اگر یہ جل گئیں تو ہم غریب لوگ کہاں رہیں گے- ہم بال بچوں والے ہیں- ہم پر رحم کیجیے اور بحث مباحثے کا سلسلہ روک دیجیے-

پادری صاحب نے ان کو ہر چند سمجھانے کی کوشش کی کہ یہ منطق کی کلی کی بات ہورہی ہے' رہائش کی کلیوں کا اس سے کوئی تعلق نہیں- دونوں کلیوں کا مطلب الگ الگ ہے- مگر عیسائی نہیں مانے اور پادری صاحب کو مناظرہ بند کرنا پڑا- پنجابی میں جھگی یا کٹیا کو ''کلی'' کہا جاتا ہے-

مولانا سیالکوٹی ایک خاص مزاج وطبیعت کے مالک تھے- ان کا جمال بھی مثالی حیثیت رکھتا تھا اور جلال بھی بڑا تیز تھا- ۱۹۵۰ء کی بات ہے کہ محرم کے مہینے میں ہفت روزہ ''الاعتصام'' کی مختلف اشاعتوں میں چند ایسے مضامین شائع ہوئے جن کا تعلق واقعہ کربلا اور حضرت حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے تھا- یہ مضامین مولانا محمد اسماعیل' مولانا محمد حنیف ندوی' قاضی عبدالرحیم اور مولانا محمد عبدہ کے تحریر فرمودہ تھے- ان میں ایک مضمون میرا تھا جس کا عنوان تھا'' داستان کربلا کی تاریخی حیثیت'' ان دنوں سیالکوٹ سے شیعہ حضرات کا

ایک ہفت روزہ اخبار شائع ہوتا تھا' جس کا نام "درنجف" تھا- مولانا سیالکوٹی نے "درنجف" میں "الاعتصام" کے ان مضامین کے خلاف لکھنا شروع کیا- مجھے تو ازراہ کرم یہ کہہ کر معاف فرما دیا کہ اس کے مضمون کی حیثیت تاریخی واقعہ بیان کرنے کی ہے اور مندرجات کے اعتبار سے اس میں کوئی قابل گرفت بات نہیں ہے' لیکن باقی حضرات کو آڑے ہاتھوں لیا اور ان کے مضامین کا خوب تیا پانچا کیا- ان کا یہ تنقیدی سلسلہ "درنجف" کی سترہ قسطوں میں چلا اور ہم نے مزے لے لے کر پڑھا-

انہی دنوں مجھے خط لکھا کہ آئندہ میرے نام "الاعتصام" نہ بھیجا جائے- میرا خط پڑھتے ہی میرے نام کا پرچہ بند کر دو' مجھے اس اخبار کو دیکھ کر سخت تکلیف ہوتی ہے- نہ میں اسے کھولتا ہوں نہ پڑھتا ہوں' اس اخبار سے مجھے شدید نفرت ہے-

اس زمانے میں "الاعتصام" گوجرانوالہ سے شائع ہوتا تھا- مولانا حنیف ندوی اس کے ایڈیٹر تھے اور میں بطور معاون مدیر کام کرتا تھا- مولانا سیالکوٹی نے یہ خط میرے نام تحریر فرمایا تھا اور میں نے ان کا یہ جلالی اور تاریخی خط نہایت احتیاط کے ساتھ سنبھال کر رکھا تھا- بہت سے حضرات کو یہ خط میں نے دکھایا- ارادہ یہ تھا کہ کبھی ان کے بارے میں کچھ لکھنے کا موقع ملا تو یہ پورا خط درج کر دوں گا- اب یہ مضمون لکھنے بیٹھا تو خط کی تلاش کے لیے تمام کاغذات دیکھ ڈالے' لیکن خط کہیں سے نہیں ملا- مولانا کی اس یادگار اور بابرکت تحریر کے جو کم و بیش چالیس برس میرے پاس رہی' گم ہو جانے کا مجھے انتہائی افسوس ہے- بزرگوں کی ڈانٹ اور اہل علم کی خفگی بسا اوقات باعث رحمت ہوتی ہے اور میں تو اسے ہمیشہ اپنے لیے باعث رحمت ہی سمجھتا ہوں-

< مولانا محمد ابراہیم اپریل ۱۸۷۴ء کو سیالکوٹ کے محلہ میانہ پورہ میں پیدا ہوئے- ان کے والد کا شمار سیالکوٹ کے اصحاب ثروت میں ہوتا تھا اور ان کا اسم گرامی قادر بخش میر تھا- مولانا نے قرآن مجید گھر میں پڑھا- اس کے بعد مشن ہائی سکول میں داخل ہوئے جو گندم منڈی میں واقع تھا- ۱۸۹۵ء میں میٹرک کا امتحان پاس کیا- اس اثنا میں دینی تعلیم بھی حاصل کرتے رہے- اس کے لیے سیالکوٹ کے مشہور عالم دین مولانا غلام حسن کے سامنے

زانوئے شاگردی تہہ کیا۔ مولانا غلام حسن سیالکوٹی کے پردادا سے مولانا ابراہیم صاحب کے دادا میاں حیات بخش میر نے حصول علم کیا تھا' اس طرح مولانا ابراہیم سیالکوٹی اور مولانا غلام حسن سیالکوٹی کا شاگردی اور استادی کا تعلق خاندانی تھا جس کا سلسلہ تین پشتوں سے چلا آ رہا تھا۔

میٹرک کے بعد مولانا نے مرے کالج (سیالکوٹ) میں داخلہ لیا' اس کالج میں علامہ اقبالؒ ان کے ہم جماعت تھے۔ دونوں نے مولانا میر حسنؒ سے بھی خوب استفادہ کیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ضلع گوجرانوالہ کے شہر وزیر آباد میں حضرت حافظ عبدالمنان کی مسند تدریس حدیث آراستہ تھی اور استاد پنجاب کی حیثیت سے وہ پورے ہندوستان میں شہرت حاصل کر چکے تھے۔ مولانا محمد ابراہیم سیالکوٹی کے والد محترم قادر بخش مرحوم سے حافظ صاحب کے دوستانہ مراسم تھے۔ ایک دفعہ وہ سیالکوٹ تشریف لائے تو اپنے دوست سے کہا کہ آپ اپنے بیٹے ابراہیم کو ہمارے پاس وزیر آباد بھیج دیں۔ ہم اسے دینی تعلیم دینا چاہتے ہیں۔ اس وقت مولانا کو مرے کالج میں داخل ہوئے ایک سال ہو چکا تھا' قادر بخش صاحب نے بیٹے کی کالج کی تعلیم روک دی اور انھیں حضرت حافظ صاحب کی خدمت میں وزیر آباد بھیج دیا۔ یہ ۱۸۹۶ء کا واقعہ ہے۔ وہاں انھوں نے تفسیر و حدیث اور مروجہ دینی تعلیم مکمل کی۔

مولانا سیالکوٹی بڑے ذہین تھے اور اللہ نے ان کو قوت حافظہ سے خوب نوازا تھا۔ ایک مرتبہ ماہ شعبان کے آخری دنوں میں ان کی والدہ مکرمہ نے بیٹے سے اس تمنا کا اظہار کیا کہ رمضان المبارک کی نماز تراویح میں وہ قرآن مجید سنائیں۔ لائق بیٹے نے ماں کی تمنا حیرت انگیز طریقے سے پوری کی۔ وہ دن کو روزے کے ساتھ روزانہ ایک سپارہ یاد کرتے اور تراویح میں اسے سناتے تھے۔ اس طرح ایک مہینے میں پورا قرآن مجید یاد کر کے نماز تراویح میں سنا دیا۔

حضرت حافظ عبدالمنانؒ وزیر آبادی سے حصول علم کے بعد عازم دہلی ہوئے اور حضرت شیخ الکل میاں سید نذیر حسین محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضری دی۔ کچھ عرصہ ان کی خدمت میں رہے اور سند و اجازہ حدیث سے مفتخر ہوئے۔ حضرت میاں

صاحبؒ کے یہ آخری دور کے شاگرد ہیں۔/

فارغ التحصیل ہونے کے بعد واپس وطن سیالکوٹ تشریف لائے اور اپنے محلے میانہ پورہ کی اس مسجد میں جو ان کے والد مکرم نے تعمیر کرائی تھی' درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ یہ سلسلہ مولانا کی مصروفیات کی وجہ سے کئی دفعہ بند ہوا اور کئی دفعہ جاری ہوا۔

درس و تدریس کے دوران انھوں نے ایک ماہانہ رسالہ ''الہدیٰ'' کے نام سے جاری کیا اور ایک رسالہ ''الہادی'' کا اجر بھی عمل میں لایا گیا۔ ان میں خالص علمی اور تحقیقی مضامین شائع ہوتے تھے۔ افسوس ہے یہ رسالے مستقل طور سے جاری نہ رہ سکے۔ ''الہادی'' کے چند شمارے میری نظر سے گزرے ہیں۔

ہندوستان میں جماعت اہل حدیث کے نظم و نسق کے لیے مولانا سیالکوٹی نے بڑی تگ و دو کی۔ دسمبر ۱۹۰۶ء میں آرہ (صوبہ بہار) میں جماعت اہل حدیث کا ایک جلسہ ہوا' جس میں اس مسلک کے بہت سے علمائے کرام اور زعمائے عظام نے شرکت کی۔ اسی اجلاس میں آل انڈیا اہل حدیث کانفرنس کی تشکیل کی گئی تھی۔ اس کے پہلے صدر مولانا حافظ عبداللہ غازی پوری (وفات ۲۲ نومبر ۱۹۱۸ء) کو اور ناظم اعلیٰ مولانا ثناء اللہ امرتسری کو منتخب کیا گیا تھا اور اس کا مرکزی دفتر دہلی میں قائم کیا گیا تھا۔

کانفرنس کے تعارف اور اس کو منظم کرنے کی غرض سے پورے ہندوستان کا دورہ کرنے کے لیے جو وفد ترتیب دیا گیا تھا وہ مندرجہ ذیل تین حضرات پر مشتمل تھا۔

(۱) مولانا عبدالعزیزؒ رحیم آبادی ------------- وفات اپریل ۱۹۱۹ء

(۲) مولانا ثناء اللہ امرتسری ----------------- وفات ۱۵ مارچ ۱۹۴۸ء

(۳) مولانا محمد ابراہیمؒ سیالکوٹی ------------- وفات ۱۲ جنوری ۱۹۵۶ء

آزادی سے قبل آل انڈیا اہل حدیث کانفرنس جماعت اہل حدیث کی موثر تنظیم تھی۔ آزادی کے بعد کچھ عرصہ ہندوستان میں اسی نام سے قائم رہی۔ کئی سال ہوئے اس کا نام بدل دیا گیا ہے اور اب اسے ''مرکزی جمعیت اہل حدیث ہند'' کہا جاتا ہے۔

لاہور میں جماعت اہل حدیث سے تعلق رکھنے والے حضرات کی تعداد بہت کم تھی۔

پروفیسر عبدالقیوم کے نانا مولوی سلطان احمد اور والد گرامی منشی فضل الدین موچی دروازے میں رہتے تھے۔ ۱۹۰۱ء میں انھوں نے اپنے مکان پر اہل حدیث حضرات کو جمع کیا اور ''حلقہ اہل حدیث'' کے نام سے ان کی تنظیم قائم کی' جس کا صدر مولوی سلطان احمد کو بنایا گیا تھا۔ اس کے بعد ۱۹۰۶ء میں اس کا نام ''حلقہ احباب اہل حدیث'' رکھا گیا۔ اب ان کی تعداد کافی بڑھ گئی تھی اور یہ ایک دوسرے سے متعارف ہو گئے تھے۔ ان کے اجتماعات کسی اہل حدیث بزرگ کے مکان پر ہوتے تھے۔ پنجاب کے بہت سے اہل حدیث علمائے کرام کو مختلف اوقات میں لاہور میں بلایا جاتا تھا اور کسی جگہ ان کی تقریریں کرائی جاتی تھیں' ۱۰ اپریل ۱۹۰۹ء (۱۷ ربیع الاول ۱۳۲۷ھ) کو پنجاب کے مشہور اور جلیل القدر علمائے اہل حدیث کا اجلاس ہوا۔ ان علمائے کرام میں مولانا محمد حسین بٹالوی' مولانا احمد اللہ امرتسری' مولانا محمد علی لکھوی' مولانا حافظ عبدالمنان وزیر آبادی' مولانا عطاء اللہ لکھوی' مولانا محمد حسین لکھوی' مولانا غلام حسن سیالکوٹی' مولانا ثناء اللہ امرتسری' قاضی عبدالاحد خان پوری اور مولانا محمد ابراہیم سیالکوٹی شامل تھے۔ ان سب حضرات کی متفقہ رائے سے لاہور کی جماعت اہل حدیث کا نام ''انجمن اہل حدیث'' رکھا گیا۔ وقت کے ساتھ ساتھ اس کے ارکان بدلتے گئے' لیکن انجمن وہی رہی۔ اب تک مسجد مبارک کا انتظام جو ۱۹۲۰ء میں تعمیر کی گئی تھی' اسی انجمن کے سپرد ہے۔

وہ تمام کارروائی جو ۱۰ اپریل ۱۹۰۹ء کے علما و زعما کے اس اجتماع میں ہوئی تھی' ایک رجسٹر میں درج ہے اور اس کی تفصیل میرے پاس محفوظ ہے۔ حاضرین مجلس کے اسمائے گرامی بھی ان کے دستخطوں کے ساتھ میرے پاس موجود ہیں۔ حضرت حافظ عبدالمنان وزیر آبادی نابینا تھے' ان کا اسم گرامی مولانا ابراہیم سیالکوٹی نے اس طرح لکھا تھا۔ (دستخط عبدالمنان وزیر آبادی۔

بقلم ابراہیم سیالکوٹی

اس انجمن کے لیے بہت سے شرکائے اجلاس نے چندہ بھی دیا تھا' ان کے چندے کی رقم رجسٹر میں مرقوم ہے۔ مثلاً لکھا ہے مولوی غلام حسن صاحب پانچ روپے' حافظ عبدالمنان

صاحب وزیر آبادی ایک روپیہ' مولوی ابراہیم صاحب سیالکوٹی ایک روپیہ- یہ رقم پکے ہندسوں میں لکھی ہے اور اس زمانے میں بہی کھاتوں میں اسی طرح رقمیں لکھی جاتی تھیں- مثلاً ایک روپیہ کو (عہ) دو کو (عا) اور پانچ کو (صہ) لکھا جاتا تھا-

یہ جماعت اہل حدیث لاہور کی ایک قدیم تاریخی دستاویز ہے جو بحمد اللہ اس عاجز کے پاس موجود ہے اور میں اس کا تذکرہ پانچ چھے سال قبل ایک مضمون میں کر چکا ہوں-

مولانا ثناء اللہ امرتسریؒ کی سعی و تجویز سے ۱۹۱۹ء کے آخر میں ہندوستان کے علمائے کرام کی تنظیم ''جمعیت علمائے ہند'' قائم ہوئی تو مولانا ابراہیمؒ سیالکوٹی اس میں شامل تھے اور اسی دور میں انھوں نے ملک کی سیاست میں حصہ لینا شروع کیا تھا- سیاسی اعتبار سے وہ ملک کا پر آشوب اور نازک ترین دور تھا- اس دور میں افق ہند پر بہت سے اہم مسائل ابھر آئے تھے' جن کے حل و کشود کے لیے علمائے دین سے رہنمائی حاصل کرنا ضروری قرار پایا تھا- مثلاً مسئلہ ہجرت' مسئلہ خلافت' ترک موالات' انگریزی حکومت سے مکمل عدم تعاون' انگریزوں کے سکولوں' کالجوں' یونیورسٹیوں اور عدالتوں کا بائی کاٹ اور ولایتی مال کے بجائے ملکی مصنوعات کے فروغ و استعمال کا معاملہ وغیرہ نہایت اہم امور تھے جن کے بارے میں علمائے کرام سے رائے لینا اور ان سے شرعی نقطہ نظر معلوم کرنا ضروری تھا- مولانا سیالکوٹی کا شمار اس عہد کے اجل علما میں ہوتا تھا' اس لیے ان مجالس میں ان کی شمولیت کو لازمی سمجھا جاتا تھا' جن میں اس قسم کے مسائل زیر بحث آتے تھے-

یہاں یہ یاد رہے کہ جمعیت علمائے ہند کے تاسیسی اجلاس (منعقدہ دسمبر ۱۹۱۹) میں مولانا شبیر احمد عثمانی شریک نہیں ہوئے تھے- کہا جاتا ہے کہ ان کی طبیعت اچانک خراب ہو گئی تھی-

پھر ایک وقت آیا کہ ملکی سیاسیات میں ''جمعیت علمائے ہند'' کانگرس کی ہم نوا ہو گئی- مولانا سیالکوٹی کو اس سے اتفاق نہیں تھا' وہ مسلم لیگ کے حامی اور تحریک پاکستان کے موید تھے- چنانچہ انھوں نے جمعیت علمائے ہند سے علیحدگی اختیار کر لی اور مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کے ساتھ مل کر ''جمعیت علمائے اسلام'' قائم کر لی- یہ ۱۹۴۵ء کی بات ہے- ''جمعیت علمائے

اسلام'' کلکتہ میں قائم کی گئی تھی اور اس کا پہلا اجلاس وہیں ۱۹۴۵ء کی آخری تاریخوں میں ہوا تھا' اس کا صدر مولانا عثمانی کو اور نائب صدر مولانا سیالکوٹی کو بنایا گیا تھا- یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ مولانا شبیر احمد عثمانی جمعیت علمائے اسلام کے پہلے تاسیسی اجلاس میں بھی ناسازیٔ طبع کی بنا پر شرکت نہیں فرما سکے تھے' اس کی صدارت مولانا ابراہیم سیالکوٹی نے کی تھی- بعد ازاں مولانا سیالکوٹی نے تمام ہندوستان کا دورہ کیا اور قیام پاکستان کے حق میں بڑے بڑے جلسوں میں تقریریں کیں- بلاشبہ وہ بہت بڑے مقرر تھے اور زوردار الفاظ میں دلائل کے ساتھ اپنا موقف پیش کرتے تھے-

وہ کثیر المطالعہ عالم تھے' تفسیر و حدیث' فقہ و اصول' تاریخ و تذکرہ' فلسفہ و منطق اور تقابل ادیان وغیرہ علوم سے متعلق ان کی معلومات کا دائرہ بہت وسیع تھا- اسلام اور احکام اسلام کے خلاف کوئی بات برداشت نہیں کر سکتے تھے- مناظرے میں بھی ان کی بڑی شہرت تھی- عیسائیوں' آریوں اور قادیانیوں کے ساتھ انھوں نے متعدد مقامات پر مناظرے کیے اور کامیاب رہے- بعض مسائل میں علمائے احناف سے بھی ان کے مباحثے ہوئے-

مولانا سیالکوٹی کو اللہ نے بہت سے فضائل و اوصاف سے نوازا تھا- جہاں وہ بہت بڑے عالم و فاضل' مبلغ و مقرر اور مناظر و مباحث تھے' وہاں بہت بڑے مصنف بھی تھے- مختلف موضوعات سے متعلق ان کی چھوٹی بڑی چوراسی کتابوں کا پتا چلتا ہے' جن میں سے تین غیر مطبوعہ ہیں اور وہ حسب ذیل ہیں:

(۱) تحفۃ الاذکیاء وطرفۃ الاصفیاء فی الاعتبار والاقتباس باحوال الانبیاء-

اس کتاب کا نام بڑا ہے اور کتاب چھوٹی ہے' جس کی حیثیت ایک رسالے کی ہے اس چھوٹے سے رسالے میں اس بات کی وضاحت کی گئی ہے کہ انبیائے کرام کو دین و دنیا کے ہر ہر معاملے میں ہادی و رہنما ماننا چاہیے-

(۲) خیر الخلائق والخصائل-

یہ رسالہ یکم فروری ۱۹۴۳ء کا تحریر فرمودہ ہے اور اسے ان کی مشہور تصنیف سیرت المصطفیٰ کی جلد دوم کے تتمے کی حیثیت حاصل ہے-

(۳) تائید ودودی در مخاطبت مودودی۔

بعض مسائل سے متعلق ۱۹۴۶ء میں مولانا مودودی سے ان کی خط وکتابت ہوئی تھی' اس میں اس کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔ اس ضمن میں مولانا مودودی نے ان کو آخری خط ۱۴ دسمبر ۱۹۴۶ء کو دارالسلام جمال پور پٹھان کوٹ سے لکھا تھا اور بحث ختم ہو گئی تھی۔

مولانا سیالکوٹی کی تمام تصنیفات اردو میں ہیں' لیکن ان میں سے اکثر کے نام عربی قسم کے ہیں۔ اب ذیل میں موضوع وار ان کی طبع شدہ تصنیفات کا ذکر کیا جاتا ہے۔ سب سے پہلے قرآنِ مجید۔

(۱) تعلیم القرآن: اس میں قرآن مجید کی تعلیمات بیان کی گئی ہیں۔ ۱۵۲ صفحات پر مشتمل ہے۔

(۲) واضح البیان فی تفسیر ام القرآن: یہ سورہ فاتحہ کی تفسیر ہے۔ پہلی دفعہ نومبر ۱۹۳۳ء میں چھپی۔ ۴۴۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ دوسری دفعہ فروری ۱۹۷۲ء میں طبع ہوئی۔ صفحات کی تعداد ۵۵۹ ہے۔

(۳) تفسیر سورۃ الکھف: اس میں سورہ کہف کی تفسیر نہایت علمی اور تحقیقی اسلوب میں معرضِ بیان میں لائی گئی ہے۔ اس کے صفحات ۱۳۰ ہیں۔ پہلی دفعہ دسمبر ۱۹۳۹ء میں چھپی تھی۔

(۴) ریاض الحسنات: قرآن مجید کی پانچ سورتوں سورہ سجدہ' سورہ یٰس' سورہ ملک' سورہ نوح اور سورہ مزمل کے ترجمے اور ضروری حواشی پر محتوی ہے۔ ابتدا میں ہر سورت کے فضائل بیان کیے گئے ہیں۔ پہلی مرتبہ ۱۹۴۶ء میں اور دوسری دفعہ جولائی ۱۹۵۸ء میں طبع ہوئی۔

(۵) حلاوۃ الایمان بتلاوۃ القرآن: اس میں قرآن مجید کے فضائل و آداب' قرأت و تجوید اور مخارج حروف وغیرہ کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ طبع اول رمضان المبارک ۱۳۵۹ھ (اکتوبر ۱۹۴۰ء)

(۶) تنویر الابصار: یہ دراصل ان کے خطبۂ جمعہ کی تقریر ہے جو ۱۲۷ کتوبر ۱۹۵۰ء کو "یاایھا الذین امنوا اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول و اولی الامر" کے موضوع پر ارشاد فرمائی۔ اس رسالے کا پورا نام "تنویر الابصار بانوار الائمۃ الابرار" ہے۔ طبع اول مئی ۱۹۵۱ء۔

(۷) تبصیر الرحمٰن فی تفسیر القرآن: پہلے' دوسرے اور تیسرے پارے کی تفسیر- پارہ اول کی تفسیر ۲۴۸ صفحات کا احاطہ کیے ہوئے ہے- ۱۹۵۱ء میں چھپی- پارہ دوم کی ۲۲۸ صفحات پر محیط ہے- ۱۹۵۵ء میں چھپی- پارہ سوم کی ۱۶۶ صفحات پر مشتمل ہے' ۱۹۵۸ء میں شائع ہوئی-

(۸) الدر النظیم فی تفسیر سور القرآن: یہ قرآن مجید کی آٹھ سورتوں کی تفسیر ہے- سورہ حجرات' قٓ' البلد' البینۃ' العصر' الفیل' القریش' الکوثر- ابتدا میں صفحہ ۳ سے ۲۸ تک الم سجدہ' سورہ ملک' سورہ نوح' سورہ مزمل کی تفسیر ہے- ۱۲۶ صفحات کی یہ کتاب ۱۹۴۱ء میں پہلی دفعہ طبع ہوئی-

(۹) تفسیر القرآن: مفسرین کرام نے تفسیر قرآن کے جو اصول و ضوابط بیان کیے ہیں' اس کتاب میں مولانا نے وہ تمام اصول و ضوابط خوب صورت اسلوب میں جمع کر دیے ہیں- بعض دیگر قرآنی مباحث بھی اس میں تحریر فرمائے گئے ہیں-

(۱۰) تفسیر سورہ ثلاثہ: یعنی سورہ النجم' سورہ الرحمٰن اور سورہ الواقعہ کی تفسیر- صفحات ۸۲ طبع اول ۱۹۴۰ء-

اب دیکھتے ہیں سیرت رسول ﷺ اور اس سے ملتے جلتے موضوع پر مولانا نے کیا خدمات سرانجام دیں- مسلسل نمبروں کے ساتھ ملاحظہ فرمائیے:-

(۱۱) تاریخ نبویؐ: یہ چھوٹی سی کتاب علامہ قاضی محمد سلیمان سلمان منصور پوری کی رحمۃ للعالمین اور شبلی کی سیرۃ النبیؐ سے پہلے کی تصنیف ہے-

(۱۲) اخلاق محمدیؐ: اسے بھی آنحضرتؐ کی سیرت کے موضوع میں شامل کیجیے- طبع اول ۱۹۱۱ء صفحات ۱۲۶-

(۱۳) اصلاح عرب: حضور ﷺ کی بعثت سے قبل کی حالت بیان کی گئی ہے اور پھر آپؐ کے بعد عربوں میں جو زبردست اصلاحی انقلاب آیا اس کی تفصیل معرض تحریر میں لائی گئی ہے-

(۱۴) بشارات محمدیؐ: اس میں رسول اللہ ﷺ کے متعلق بشارتوں اور پیشین گوئیوں کا تذکرہ کیا گیا ہے- اپنے اسلوب کی نہایت عمدہ کتاب ہے-

(۱۵) سیرت المصطفیٰ ﷺ: یہ جلد اول ہے اور حضورؐ کی سیرت کے متعلق ایک شان دار کتاب ہے۔صفحات ۲۰۰۔طبع اول ۱۹۴۴ء طبع دوم ۱۹۷۳ء۔

(۱۶) سیرت المصطفیٰ ﷺ: یہ جلد دوم ہے' صفحات ۲۰۸ طبع اول ۱۹۴۴ء طبع دوم ۱۹۷۳ء صفحات ۲۶۸۔

(۱۷) حبیبؐ خدا: اس میں بھی اختصار کے ساتھ آنحضرتؐ کی سیرت طیبہ بیان کی گئی ہے۔ پورا نام ہے اوجز الیسر فی احوال سید البشر''۔

(۱۸) سیرت محمدیہؐ: یہ ۲۴ صفحات کا رسالہ اکتوبر ۱۹۳۱ء کو چھپا۔

(۱۹) احکام المرام باحیاء مآثر علماء الاسلام: اس کتاب میں بائیس فقہا و محدثین کے حالات بیان کیے گئے ہیں' جن کے اسما گرامی یہ ہیں:

امام ابوحنیفہؒ' امام مالکؒ' امام شافعیؒ' امام احمدؒ' امام ابویوسفؒ' امام محمدؒ' امام عبداللہ بن مبارک' امام بخاریؒ' امام مسلمؒ' امام ترمذیؒ' امام نسائیؒ' امام ابن ماجہؒ' امام دارمیؒ' امام دارقطنیؒ' امام بیہقیؒ' امام طحاویؒ' امام نوویؒ' امام برہان الدینؒ صاحب ہدایہ' امام ابن تیمیہؒ' امام ابن قیمؒ' خاتمۃ الحفاظ حافظ ابن حجرؒ' اپنے موضوع کی یہ نہایت اہم کتاب ہے جو ۱۵۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ پہلی دفعہ ۱۹۰۶ء میں طبع ہوئی تھی۔ دوسری دفعہ پاکستان کے مشہور مصنف و محقق جناب محترم طالب ہاشمی صاحب نے جولائی ۱۹۹۱ (محرم ۱۴۱۲ھ) میں طبع کرائی۔

(۲۰) قوم اور مذہب: بتیس صفحات کے اس رسالے میں قوم اور مذہب کے لغوی اور اصطلاحی معنوں سے متعلق بحث کی گئی ہے۔

(۲۱) قنوت نازلہ مع دیگر اذکار مسنونہ:۔سولہ صفحات کا یہ رسالہ پہلی دفعہ ۱۹۳۷ء میں چھپا تھا۔

(۲۲) سراجاً منیراً: اس میں درود شریف اور کثرت استغفار وغیرہ کا ذکر ہے۔صفحات ۱۲۸۔ طبع اول ۱۹۴۴ء طبع دوم ۱۹۶۴ء' صفحات ۱۳۶۔

(۲۳) غازہ غائب برائے جنازہ غائب: اس میں غائبانہ نماز جنازہ پڑھنے کا ثبوت دیا گیا

ہے۔طبع اول ۱۹۳۸ء صفحات ۳۲۔

(۲۴) زاد المتقین: اڑتالیس صفحات کا یہ رسالہ پہلی دفعہ ۱۹۴۲ء میں اور دوسری دفعہ بعض اضافوں کے ساتھ ۱۹۵۲ء میں شائع ہوا تھا۔اس میں ازواج مطہرات وغیرہ کے حالات و کوائف کا ذکر ہے۔

(۲۵) انہتر خصائل ایمان: یہ بائیس صفحات پر مشتمل رسالہ ہے جو پہلی مرتبہ ۱۹۳۹ء میں چھپا تھا۔

(۲۶) الخیر الجاری: سولہ صفحات کے اس رسالے کا پورا نام ''الخیر الجاری فی بیان العلم المختص بالباری ہے۔اس میں دلائل سے بتایا گیا ہے کہ غیب کا علم صرف اللہ تعالیٰ کو ہے۔

(۲۷) نعم الرقیم فی مولد النبی الکریم: اس میں مروجہ میلاد النبی کی تردید کی گئی ہے۔صفحات ۱۶ طبع اول ستمبر ۱۹۵۵ء۔

(۲۸) گلدستہ سنت: یہ کتاب سات حصوں پر مشتمل ہے اور اپنے موضوع کی پر از معلومات کتاب ہے۔

(۲۹) انارۃ المصابیح لاداء صلوٰۃ التراویح: فضائل رمضان اور تعداد رکعات تراویح کے موضوع پر مشتمل ہے۔صفحات ۵۰۔طبع اول ۱۹۴۰ء

(۳۰) فرقہ ناجیہ: یہ کتاب پہلی دفعہ مارچ ۱۹۳۳ء میں اور چھٹی دفعہ ۱۹۶۹ء میں طبع ہوئی۔بیس صفحات کے اس مختصر سے رسالے میں بتایا گیا ہے کہ فرقہ ناجیہ کون سا ہے۔

(۳۱) تاریخ اہل حدیث: اپنے موضوع کی یہ نہایت معلوماتی کتاب ہے جو ۴۴۸ صفحات پر محیط ہے۔پہلی دفعہ ۱۹۵۳ء میں اور دوسری دفعہ ۱۹۷۰ میں چھپی تھی۔تیسری دفعہ ۲۰۰۰ میں مکتبہ قدوسیہ اردو بازار لاہور کی طرف سے شائع ہوئی ہے۔کاغذ' کمپوزنگ' طباعت' جلد نہایت عمدہ۔

(۳۲) اربعین نبویہ: چالیس احادیث اور ان کا ترجمہ وتشریح صفحات ۲۴ طبع اول ۱۹۳۵ء' طبع دوم ۱۹۴۸ء۔

(۳۳) نماز مسنونہ مترجم: یہ کتاب اپنی بے پناہ افادیت کی بنا پر کئی دفعہ چھپ چکی ہے۔

(۳۴) احیاء المیت: یہ کتاب ائمہ اہل سنت اور ائمہ اہل بیت کی تعظیم و تکریم کے موضوع پر ہے۔

(۳۵) الحج والثج: یہ رسالہ حج اور قربانی کے مسائل سے متعلق ہے۔

(۳۶) قرۃ العین بمسرۃ العیدین: اس میں عیدین کے مسائل بیان کیے گئے ہیں۔

(۳۷) العجالۃ الخضر یہ فی جمع الرسالۃ والبشریہ: اس میں رسول اللہ ﷺ کی بشریت ثابت کی گئی ہے۔

(۳۸) اسوہ حسنہ: اس میں قرآن مجید کی اس آیت کی کہ ”رسول اللہ ﷺ کی ذات اقدس تمھارے لیے بہترین نمونہ ہے“ کی تفسیر بڑے عمدہ طریقے سے بیان کی گئی ہے اور اس کی روشنی میں مسلمانوں کو اتباع سنت کی تلقین فرمائی گئی ہے۔ یہ سولہ صفحات کا رسالہ پہلی دفعہ اکتوبر ۱۹۳۷ء میں چھپا تھا۔

(۳۹) فلسفہ ارکانِ اسلام: بیس صفحوں کے اس رسالے میں جو پہلی مرتبہ ۱۹۳۸ میں طبع ہوا تھا' ارکانِ اسلام یعنی کلمہ شہادت' نماز' روزہ' حج اور زکوٰۃ کا بطریق احسن فلسفہ بیان کیا گیا ہے۔

(۴۰) صلوٰۃ النبی ﷺ: یہ رسالہ نماز جمعہ' نماز جنازہ اور نماز عیدین وغیرہ پر مشتمل ہے۔

(۴۱) خلافت راشدہ: اس میں خلافت کی صحت و حقانیت بیان کی گئی ہے۔

(۴۲) امان الخائفین: یہ رسالہ مولانا کی وفات کے بعد ان کے بھتیجے عبدالقیوم مرحوم نے جولائی ۱۹۵۸ء میں شائع کیا تھا' اس میں وہ دعائیں درج کی گئی ہیں' جو رسول اللہ ﷺ مختلف اوقات میں پڑھا کرتے تھے' اور ان میں بعض دعائیں مولانا سیالکوٹی نے اپنے کاغذات میں درج کی تھیں۔

(۴۳) خطبہ رمضان: رمضان شریف کے بارے میں حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کا ایک مشہور خطبہ حدیث کی بعض کتابوں میں مروی ہے۔ مولانا سیالکوٹی نے اس کی تشریح کی ہے۔ اس میں بہت سے مسائل بیان کر دیے گئے ہیں۔

(۴۴) افتراق امت اور طریق سنت: تبلیغی جنتری: یہ متعدد رسائل کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔

(۴۵) فضائل شعبان: سولہ صفحات کے اس رسالے میں ماہ شعبان کے فضائل بیان کیے گئے ہیں۔

(۴۶) برکات الصلوٰۃ: نماز استخارہ' نماز حاجت' نماز تسبیح' نماز اشراق' نماز توبہ اور نماز تہجد وغیرہ کے متعلق بتیس صفحات کا رسالہ جو پہلی مرتبہ اگست ۱۹۳۸ء میں چھپا تھا۔

(۴۷) برکات محمدیہ: مسنون دعاؤں کا خوب صورت مجموعہ جو سولہ صفحات پر مشتمل ہے۔ ۱۹۳۸ء میں طبع ہوا۔

(۴۸) نماز تہجد: تہجد کی نماز کے بارے میں بارہ صفحوں کا رسالہ سال طباعت ۱۹۳۸ء۔

(۴۹) توحید الٰہی اور مسنون زندگی: اس میں بتایا گیا ہے کہ اصل توحید یہ ہے کہ انسان اپنی زندگی کو رسول اللہ ﷺ کی حیات مبارکہ کے تابع کر لے۔

(۵۰) علمائے اسلام: یہ رسالہ مولانا سیالکوٹی کے رسالہ ''الہادی'' میں شائع شدہ ان مضامین پر مشتمل ہے' جن میں علمائے اسلام کی دینی خدمات کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

(۵۱) ثبوت جنازہ: اس میں نماز جنازہ کا طریقہ بیان کیا گیا ہے اور حدیث کی روشنی میں ثابت کیا گیا ہے کہ سری کے علاوہ جہری نماز جنازہ بھی پڑھی جا سکتی ہے۔

(۵۲) رسالہ یک روزہ: یہ رسالہ کسی عالم کے جواب میں لکھا گیا ہے اور اس میں بتایا گیا ہے کہ تراویح کی آٹھ رکعات ہی حدیث وسنت سے ثابت ہیں۔ یہ ایک ہی دن میں لکھا تھا اس لیے اس کا نام ''رسالہ یک روزی در تعداد رکعات تراویح'' رکھا گیا۔

اب دیکھتے ہیں ''رد قادیانیت'' کے بارے میں انھوں نے کون کون سی کتابیں تصنیف کیں۔ اس موضوع پر تصنیفات کی صورت میں علمائے اہل حدیث نے بے حد خدمات انجام دی ہیں۔ یہاں اس سلسلے میں نہایت اختصار سے مولانا سیالکوٹی کی خدمات کی نشان دہی کی جاتی ہے۔

(۵۳) شہادۃ القرآن (حصہ اول): یہ کتاب ۲۲۸ صفحات میں پھیلی ہوئی ہے۔ پہلی دفعہ ۱۹۰۳ء میں مرزا غلام احمد قادیانی کی زندگی میں شائع ہوئی تھی۔ ۱۹۵۸ء تک یہ چوتھی مرتبہ چھپی۔ اس میں قرآن مجید' صحیح احادیث' اجماع امت اور لغوی قرائن واستشہادات کی روشنی

میں حیات مسیح کے دلائل دیے گئے ہیں- اس کا پورا نام ہے ''شہادۃ القرآن باعلی النداء المسیح رفع حیاالی السماء'' - قادیانیت کی تردید میں یہ نہایت علمی اور تحقیقی کتاب ہے-

(۵۴) شہادۃ القرآن (حصہ دوم) یہ کتاب پہلی مرتبہ ۱۹۰۳ء میں اور تیسری مرتبہ مجلس تحفظ ختم نبوت کے زیر اہتمام ۱۹۵۸ء میں چھپی- اس کا پہلا حصہ بھی ۱۹۵۸ء میں مجلس تحفظ ختم نبوت پاکستان نے شائع کیا تھا- یہ حصہ ۱۳۲ صفحات پر مشتمل ہے- اس کا موضوع بھی وہی ہے جو پہلے حصے کا ہے-

(۵۵) سلم الوصول الی اسرار اسراء الرسول ﷺ: یہ بھی قادیانیت کے رد میں ہے- مرزا قادیانی نے رسول ﷺ کے معراج جسمانی کا انکار کیا ہے' اس لیے کہ یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے رفع الی السماء سے انکار کے لیے معراج جسمانی کے انکار کی ضرورت تھی- مولانا سیالکوٹی نے ۴۸ صفحات کی اس کتاب میں مرزا قادیانی کے نقطہ نظر کی تردید کی ہے- یہ کتاب ۱۹۰۶ء میں شائع ہوئی تھی-

(۵۶) نزول الملائکۃ والروح الی الارض: اس کتاب میں فرشتوں کی حقیقت بیان کی گئی ہے اور مرزا قادیانی کا نزول ملائکہ کے متعلق جو عقیدہ ہے' اس کا رد کیا گیا ہے-

(۵۷) آئینہ قادیانیت: ۵۴ صفحات کا یہ رسالہ بھی قادیانیت کی تردید میں ہے-

(۵۸) الخبر الصحیح من قبر المسیح: مرزا قادیانی کا کہنا ہے کہ حضرت مسیح وفات پا چکے ہیں اور ان کی قبر کشمیر میں ہے' مولانا نے اس رسالے میں اس کی تردید کی ہے اور ثابت کیا ہے کہ حضرت مسیح زندہ ہیں اور آسمان پر ہیں-

(۵۹) مرقع قادیانی: یہ رسالہ بھی رد قادیانیت سے متعلق ہے-

(۶۰) فیصلہ ربانی بر مرگ قادیانی: یہ پنجابی نظم رد قادیانیت میں ہے-

(۶۱) رحلت قادیانی بمرگ ناگہانی:

(۶۲) رسائل ثلاثہ: یہ دراصل تین موضوع ہیں- امام زماں' مہدی' منتظر اور مجدد دوراں- اس میں مرزا قادیانی کے مختلف دعووں کی تردید کی گئی ہے-

(۶۳) صدائے حق: یہ رسالہ ۱۹۳۲ء میں شائع ہوا تھا- اس کا بھی یہی موضوع ہے-

(۶۴) تردید مغالطات مرزائیہ: جیسا کہ نام سے ظاہر ہے اس میں مرزائیوں کے پیدا کردہ بعض مغالطوں کی تردید کی گئی ہے۔

(۶۵) فص خاتم نبوت: یہ بھی سلسلہ رد مرزائیت کی ایک کڑی ہے۔

(۶۶) کھلی چٹھی نمبرا ونمبر۲: یہ ایک مرزائی غلام رسول کے لیے بصورت چٹھی ایک رسالہ ہے جو ۱۹۳۸ء کا تحریر کردہ ہے۔

(۶۷) ختم نبوت: تیس صفحات کا یہ رسالہ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے' ختم نبوت سے متعلق ہے۔

(۶۸) قادیانی مذہب مع ضمیمہ خلاصہ مسائل قادیانیہ: اس کا موضوع بھی یہی ہے۔

(۶۹) ختم نبوت اور مرزا قادیانی: یہ کتاب بھی جیسا کہ اس کے نام سے پتا چلتا ہے' قادیانیت کے رد میں ہے۔

مولانا سیالکوٹی کے حریف عیسائی بھی تھے' ان کے مختلف پادریوں کی کتابوں کے جواب میں مولانا نے جو کچھ تحریر فرمایا' اس کی تفصیل پر ایک نظر ڈال لیے۔

(۷۰) عصمت انبیا: کسی عیسائی نے ایک رسالہ ''بے گناہ نبی'' کے نام سے لکھا تھا۔ اس کے بعد ایک پادری اکبر مسیح کی تصنیف ''انکار عصمت انبیا'' شائع ہوئی۔ ان دونوں کتابوں میں حضرت آدمؑ' حضرت نوحؑ' حضرت ابراہیمؑ' حضرت موسیٰؑ' حضرت داوٗدؑ' حضرت سلیمان اور حضرت محمد ﷺ کو (نعوذ باللہ) گناہ گار لکھا گیا تھا۔ صرف حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بے گناہ ثابت کیا گیا تھا۔ مولانا سیالکوٹی نے اپنی تصنیف ''عصمت انبیا'' میں سب پیغمبروں کو معصوم ثابت کیا ہے۔ عیسائیوں کے رد میں یہ بڑی مدلل کتاب ہے۔ ایک سو بیس صفحات کی یہ کتاب پہلی مرتبہ ۱۹۱۰ء میں شائع ہوئی تھی۔

(۷۱) تائید القرآن بجواب تاویل القرآن: پادری اکبر مسیح نے ایک کتاب ''تاویل القرآن'' لکھی تھی جس میں قرآن مجید کو ہدف اعتراض قرار دیا تھا۔ مولانا سیالکوٹی نے اس کا جواب ''تائید القرآن بجواب تاویل القرآن'' کے نام سے تحریر فرمایا۔ صفحات ۲۹۹' سن اشاعت ۱۹۰۵ء۔

(۷۲) عصمت النبی ﷺ: یہ رسالہ بھی عیسائیوں کے رد میں ہے جو ۱۹۱۱ء میں طبع ہوا تھا۔

(۷۳) عصمت و نبوت: یہ ۹۴ صفحات کی کتاب ہے جو ۱۹۱۲ء میں شائع ہوئی۔ عیسائی پادری توحید' رسالت' عصمت انبیا وغیرہ کے سلسلے میں جو اعتراضات کرتے ہیں' اُس میں ان اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے۔

(۷۴) کسر الصلیب: یہ بھی عیسائیوں کے جواب میں ہے' اس میں مولانا نے ثابت کیا ہے کہ حضرت مسیح کو نہ قتل کیا گیا نہ مصلوب۔

(۷۵) اعجاز القرآن: اس میں مولانا نے اکبر مسیح کی کتاب ''تنویر الاذہان فی فصاحۃ القرآن'' کا جواب دیا ہے۔ ۱۴۸ صفحات کی یہ کتاب ۱۹۰۸ء میں چھپی تھی۔

اب آیئے شیعیت کی طرف۔ اس ضمن میں مولانا کی تصنیفات درج ذیل ہیں:

(۷۶) تبصیر بجواب اشتہار تنویر: سیالکوٹ کے شیعہ حضرات کی طرف سے' ۱۸ ذی الحجہ ۱۳۴۳ھ (۱۰ جولائی ۱۹۲۵ء) کو بعض مسائل سے متعلق ایک اشتہار شائع کیا گیا تھا' مولانا نے اس کا جواب دیا ہے۔

(۷۷) الکواکب المضیۃ لازالۃ شبہات الشیعۃ: یہ ۹۶ صفحات کی کتاب ہے۔ ۱۹۵۵ء میں چھپی تھی۔ مولانا نے بعض مسائل سے متعلق اس میں شیعہ حضرات کو جواب دیے ہیں۔

بعض اور کتابوں مثلاً خلافت راشدہ میں بھی مولانا نے شیعہ کے بعض اعتراضات کا مفصل جواب دیا ہے۔

آریہ سماجیوں سے بھی مولانا کی ٹکر رہی۔ مختلف موضوع کی کتابوں میں انھوں نے ان کے خلاف بہت کچھ لکھا ہے لیکن اس سلسلے میں ان کی مستقل کتاب شاید ایک ہی ہے یا ہمارے علم میں ایک ہی آئی ہے۔

(۷۸) الحق: اس میں آریہ سماج کے عقاید و نظریات کا ابطال کیا گیا ہے۔

سیاسیات میں وہ مسلم لیگ کے حامی تھے اور ان کا وہی نقطہ نظر تھا جو مسلم لیگ کا تھا' اس سلسلے میں انھوں نے تقریریں بھی کیں اور مضامین بھی لکھے اور ایک کتاب بھی لکھی۔ لیکن وہ مسلم لیگ کے رکن نہیں تھے۔ نہ انھوں نے آزادی برصغیر کے بعد سیاست میں حصہ لیا۔

کتاب کا نام یہ ہے۔

(۷۹) پیغام ہدایت در تائید مسلم لیگ: یہ ان کے گیارہ مضامین کا مجموعہ ہے جو انھوں نے مسلم لیگ کی تائید میں تحریر فرمائے۔

ان کے بعض خطبات بھی شائع ہوئے ہیں جو انھوں نے مختلف جلسوں کی صدارت کے مواقع پر ارشاد فرمائے۔ وہ خطبات مندرجہ ذیل ہیں۔

(۸۰) جمہور در جلسہ لائل پور: ۱۳۱ اکتوبر و یکم، دو نومبر ۱۹۴۱ء کو انجمن اہل حدیث لائل پور کے زیر انتظام جمعیت تبلیغ اہل حدیث کا دوسرا سالانہ جلسہ مولانا کی صدارت میں منعقد ہوا تھا، اس میں تحریری خطبہ صدارت انھوں نے ''جمہور در جلسہ لائل پور'' کے نام سے شائع کرایا تھا۔

(۸۱) ۲۸، ۲۹ مئی ۱۹۴۹ء (مطابق ۲۹، ۳۰ رجب ۱۹۶۸ھ) کو مرکزی جمعیت اہل حدیث مغربی پاکستان کا پہلا جلسہ شیش محل روڈ لاہور میں بصدارت مولانا سیالکوٹی منعقد ہوا تھا۔ اس میں انھوں نے جو خطبہ صدارت ارشاد فرمایا وہ ''احتفال الجمہور فی بلدۃ لاہور'' کے نام سے چھپا۔

تین غیر مطبوعہ کتابوں سمیت جن کے نام پہلے درج کیے جا چکے ہیں، ان کی کل چھوٹی بڑی تصنیفات کی تعداد چوراسی تک پہنچتی ہے۔ یہ بہت بڑی تصنیفی خدمت ہے جو انھوں نے حالات کے مطابق سرانجام دی۔ ممکن ہے بعض معاملات میں ان کے نقطہ نظر سے کسی کو اختلاف ہو اور اختلاف کرنا کوئی بری بات نہیں، لیکن ان کے علم و فضل کی فراوانی میں قطعاً کوئی شبہ نہیں۔ وہ تحریر و تقریر میں اپنی بات زور اور دلائل کے ساتھ پیش کرتے تھے۔ وہ قادر الکلام مقرر، وسیع العلم مصنف اور کثیر المطالعہ عالم تھے۔ اپنے ہم عصروں میں وہ بڑے ذہین و طباع اور نکتہ رس تھے۔ ان کے پرتاثیر مواعظ اور بلاغت بیان کی کشمیر سے راس کماری تک دھوم تھی۔ دفاع اسلام کے لیے ان کی تگ و تاز مجاہدانہ نے آدھی صدی سے زیادہ عرصے تک اس دور کے ہندوستان کا احاطہ کیے رکھا۔ ملک کے علمی حلقوں میں ان کی آواز کو ہمیشہ پذیرائی حاصل رہی۔ قد و قامت، وضع قطع، چہرے مہرے، رہن سہن، طرز گفتگو اور لباس کے

اعتبار سے بھی وہ باوقار اور بارعب شخصیت کے مالک تھے۔ کوئی شخص ان کی مجلس میں ہلکی بات نہیں کر سکتا تھا۔ افسوس ہے جس طرح جماعت اہل حدیث کے کسی بڑے اور مشہور عالم کا کوئی جانشین پیدا نہ ہو سکا' اسی طرح مولانا سیالکوٹی کا بھی کوئی جانشین نہیں ہے' جس کی طرف ان کے بعد رجوع کیا جا سکتا۔

مولانا محمد علی قصوری (ایم اے کینٹب) نے ۱۲ جنوری ۱۹۵۶ء (۲۶ جمادی الاولیٰ ۱۳۷۵ھ) کو صبح ساڑھے نو بجے دل کی دھڑکن بند ہو جانے سے وفات پائی۔ میں ان دنوں ہفت روزہ ''الاعتصام'' میں ادارتی فرائض سرانجام دیتا تھا۔ ان کی تدفین کے بعد شام کو واپس دفتر آئے تو مولانا سید محمد داؤد غزنوی کے نام سیالکوٹ سے آیا ہوا یہ برقیہ برق تپاں بن کر گرا کہ مولانا محمد ابراہیم میر سیالکوٹی ۱۲ جنوری ۱۹۵۶ء کو شام پانچ بجے اس بزم جہاں سے کوچ کر گئے --- انا للہ وانا الیہ راجعون --- یہ برقیہ مولانا سیالکوٹی کے بھتیجے جناب عبدالقیوم صاحب کی طرف سے آیا تھا --- ہمارے لیے یہ انتہائی غم انگیز خبر تھی۔ اسی وقت ہم نے یہ خبر ریڈیو سے نشر کرائی اور اخبارات کو بھجوائی جو صبح کو شائع ہوئی۔ بہت سے حضرات کو ٹیلی فون کیے اور مسجدوں میں ان کی وفات کا اعلان کرایا۔ اسی وقت مولانا حافظ عبداللہ روپڑی کو اطلاع دی گئی۔

یہ جمعرات کی شام کے بعد کا وقت تھا۔ تھوڑی دیر بعد جماعت کے بہت سے حضرات مولانا داؤد غزنوی کی اقامت گاہ (شیش محل روڈ) پر جمع ہو گئے اور مولانا سیالکوٹی کے جنازے میں شامل ہونے کا پروگرام بنانے لگے۔ نماز جمعہ کے بعد جنازہ پڑھنے کا اعلان کیا گیا تھا۔

جمعے کے روز ساڑھے نو بجے صبح حاجی محمد اسحاق حنیف کی گاڑی سے ہم چھے آدمی سیالکوٹ کے لیے روانہ ہوئے۔ وہ تھے مولانا داؤد غزنوی' مولانا محمد حنیف ندوی' مولانا حافظ عبداللہ روپڑی' مولانا عطاء اللہ حنیف' حاجی محمد اسحاق حنیف اور ان سطور کا راقم --- جمعہ ہم نے سیالکوٹ میں مولانا سیالکوٹی کی مسجد میں پڑھا۔

نماز جمعہ کے بعد مسجد سے جنازہ اٹھا تو سیالکوٹ اور مختلف بلاد و قصبات اور

دیہات کے بے شمار لوگ شریک جنازہ تھے۔عیدگاہ کے میدان میں جنازہ پڑھا گیا تھا اور جنازہ مولانا حافظ عبداللہ روپڑی نے پڑھایا تھا۔ وفات سے چوبیس گھنٹے بعد شام کے پانچ بجے علم وعمل کے اس کوہ گراں کو سپرد خاک کردیا گیا۔اللھم اغفرلہ وارحمہ و عافہ واعف عنہ۔

مولانا حافظ عبداللہ روپڑی تورات کو سیالکوٹ ہی رہے لیکن تدفین کے بعد ہم پانچوں ایک ہوٹل میں پہنچے پہلے مغرب کی نماز پڑھی' پھر چائے پی۔ساڑھے چھے بجے وہاں سے روانہ ہوئے اور ساڑھے نو بجے کے لگ بھگ لاہور پہنچ گئے۔

ہم چھے آدمی جو مولانا سیالکوٹی کے جنازے میں شرکت کے لیے لاہور سے اکٹھے سیالکوٹ گئے تھے'ان میں سے میں ابھی تک زندہ ہوں' پانچ بزرگ بہ ترتیب ذیل اللہ کو پیارے ہوگئے۔

مولانا سید داؤد غزنوی نے شمسی حساب سے مولانا سیالکوٹی کے انتقال سے سات سال گیارہ مہینے چار دن بعد ۱۶ دسمبر ۱۹۶۳ء کو'

مولانا حافظ عبداللہ روپڑی نے آٹھ سال سات مہینے آٹھ دن بعد ۲۰ اگست ۱۹۶۴ء کو'

حاجی محمد اسحاق حنیف نے تیرہ سال سات مہینے چھبیس دن بعد ۸ ستمبر ۱۹۶۹ء کو'

مولانا محمد حنیف ندوی نے اکتیس سال چھے مہینے ایک دن بعد ۱۳ جولائی ۱۹۸۷ کو---

اور مولانا عطاء اللہ حنیف نے مولانا سیالکوٹی کی وفات سے اکتیس سال نو مہینے بیس دن بعد ۱۲ اکتوبر ۱۹۸۷ء کو وفات پائی۔

رحمھم اللہ تعالیٰ

حافظ محمد حسین روپڑی

(وفات ۱۲ اکتوبر ۱۹۵۹ء)

۱۹۳۳ء میں ہمارے قدیم وطن کوٹ کپورہ (ریاست فرید کوٹ' موجودہ ضلع فرید کوٹ' مشرقی پنجاب) میں خطابت و تدریس کے لیے حضرت مولانا عطاء اللہ حنیف کی خدمات حاصل کی گئی تھیں۔ چار سال (دسمبر ۱۹۳۶ء تک) وہاں ان کا قیام رہا۔ چند افراد کے علاوہ وہاں کی تمام آبادی اہل حدیث مسلک کی حامل تھی اور بائیس مسجدیں تھیں جو سب کی سب اہل حدیث کی تھیں۔ سنا تھا کہ ہمارے زمانۂ ہوش بلکہ پیدائش سے بھی بہت پہلے حنفی مسلک سے تعلق رکھنے والے ایک اسٹیشن ماسٹر کی وہاں تقرری ہوئی تھی' اس نے کوشش کر کے ریلوے کی حدود میں ایک مسجد تعمیر کرائی تھی' جسے شاید احناف کی مسجد کہا جاتا ہوگا' لیکن ہم نے جب وادئ ہوش میں قدم رکھا تو یہی دیکھا کہ اس مسجد کا امام اہل حدیث تھا اور مقتدی بھی اہل حدیث تھے۔

بہت مدت سے کوٹ کپورہ میں ''انجمن اصلاح المسلمین'' قائم تھی' جس کے زیر انتظام ہر سال تبلیغی جلسہ منعقد کیا جاتا تھا۔ متحدہ ہندوستان کے اہل حدیث حلقوں میں اس جلسے کی بڑی شہرت تھی اور بہت سے علمائے کرام اس میں شرکت فرماتے اور تقریریں کرتے تھے۔ ان علمائے کرام میں مولانا ثناء اللہ امرتسری' مولانا محمد جونا گڑھی' مولانا ابوالقاسم بنارسی' مولانا محمد ابراہیم سیالکوٹی' مولانا محمد علی لکھوی' مولانا سید محمد داؤد غزنوی' حافظ عبداللہ روپڑی' حافظ محمد گوندلوی' مولانا محمد اسماعیل سلفی' مولانا عبدالقادر قصوری' مولانا محمد حنیف ندوی' حافظ محمد زکریا غزنوی' سید سلیمان ندوی اور مولانا عبدالمجید سوہدروی کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔ رحمہم اللہ تعالیٰ

۱۹۳۵ء کے جلسے میں مولانا احمد الدین گکھڑوی' مولانا حافظ محمد حسین روپڑی اور مولانا لال حسین اختر بھی شریک تھے- ان تینوں بزرگوں کا وہ عہد شباب تھا- لال حسین اختر مسلکاً حنفی تھے اور احناف کے دیوبندی حلقے سے وابستہ تھے- کسی زمانے میں مرزائیت سے تعلق تھا اور طویل عرصے تک مرزائیوں کے پرجوش مبلغ رہے تھے- پھر مرزائیت سے تائب ہو گئے تھے- بڑے تیز کلام تھے اور مرزائیت پر عبور حاصل تھا- عربی زیادہ نہیں جانتے تھے اور ان معنوں میں عالم نہ تھے' جن معنوں میں یہ لفظ بولا جاتا ہے' البتہ مرزائیت کے موضوع پر خوب تقریر کرتے تھے- قیام پاکستان کے بعد لاہور آ گئے تھے اور جمعیت علماے اسلام سے منسلک ہو گئے تھے- مجھ سے بہت اچھے مراسم تھے- میں جب ہفت روزہ ''الاعتصام'' کا ایڈیٹر تھا' میرے پاس اکثر دفتر تشریف لایا کرتے تھے- دین پور (ضلع رحیم یار خاں) میں مدفون ہیں- مولانا عبیداللہ سندھی کی قبر کے ساتھ ان کی قبر ہے-

کوٹ کپورہ سے سات آٹھ میل کے فاصلے پر ایک گاؤں ''شیر گھری'' کے نام سے موسوم تھا- وہاں مرزائیوں کے چند گھر آباد تھے- وہاں کے اہل حدیث حضرات میں سے ایک شخص کو (جن کا میں نام بھول رہا ہوں) قاضی صاحب کہا جاتا تھا- خشخشی داڑھی اور طویل قامت خوب صورت جوان- نہایت مستعد اور تبلیغ دین میں سرگرم-! اچھی خاصی زمین جائداد کے مالک تھے اور اپنے علاقے میں اثر و رسوخ رکھتے تھے- تقسیم ملک کے بعد معلوم نہیں کہاں آباد ہوئے- البتہ تقسیم کے ابتدائی زمانے میں اپنی زمینوں کی الاٹ منٹ کے سلسلے میں کئی دفعہ لاہور آئے اور مجھ سے ملے- مولانا عطاء اللہ حنیف کے معتقد تھے- اس زمانے کے رواج کے مطابق خوش لباس اور خوش کلام-!

۱۹۳۵ء کے جلسے میں اپنے چند رفقا کے ساتھ کوٹ کپورے آئے اور حضرت مولانا عطاء اللہ حنیف سے ملے--- بتایا کہ ہمارے گاؤں کے مرزائیوں کی دعوت پر ایک مرزائی مبلغ جلال الدین شمس وہاں آئے ہیں اور انھوں نے اعلان کیا ہے کہ جس عالم کا جس موضوع پر جی چاہے' ان کے ساتھ مناظرہ کر لے-! ہم چاہتے ہیں کہ جلسے میں شرکت کرنے والے علما میں سے دو یا تین عالم ہمارے ساتھ وہاں تشریف لے جائیں اور مرزائی

مبلغ سے مناظرہ کریں۔۔۔سواری کے لیے وہ حضرات چار پانچ اونٹ لے کر آئے تھے۔

جلسہ تین روز کے بعد ختم ہوا تو مولانا عطاء اللہ حنیف نے حافظ محمد حسین روپڑی' مولانا احمد الدین گکھڑوی اور مولانا لال حسین اختر سے بات کی اور یہ حضرات وہاں جانے کے لیے تیار ہو گئے۔ مولانا عطاء اللہ حنیف بھی ان کے ساتھ گئے تھے' میں بھی گیا تھا' اور بھی چند لوگ ان کے ہم راہ تھے۔

ایک بڑی بلڈنگ کے وسیع صحن میں مہمانوں کے لیے کرسیاں اور چارپائیاں رکھ دی گئی تھیں۔ اور ایک بڑی میز صحن کے وسط میں رکھی گئی تھی۔ لوگ بہت بڑی تعداد میں جمع تھے' بلڈنگ کے صحن میں بھی' گلیوں میں بھی اور ارد گرد کے مکانوں کی چھتوں پر بھی۔!

مجمعے میں مسلمان بھی تھے اور غیر مسلم بھی۔ غیر مسلموں میں زیادہ تعداد سکھوں کی تھی۔ ہندو بہت کم تھے' یوں بھی ہندوؤں کی آبادی پنجاب کے دیہات میں زیادہ نہ تھی۔ البتہ دکان دار ہندو ہوتے تھے اور ہر گاؤں میں آبادی کے مطابق ان کی دکانیں ہوتی تھیں' جہاں روزمرہ کی عام ضرورت کی چیزیں فروخت کی جاتی تھیں۔ ہندو زیادہ تر پنجاب کے شہروں میں آباد تھے۔

صحن میں رکھی ہوئی بڑی میز کے اوپر چڑھ کر مولانا لال حسین اختر نے مرزائیوں اور ان کے مبلغ کو میدان میں آنے کی دعوت دی' مگر کسی نے نہ کوئی جواب دیا' نہ کوئی مقابلے میں آیا۔ لال حسین اختر کرسی پر بیٹھ گئے۔

اب جلسہ باقاعدہ شروع ہو چکا تھا اور لوگ مقررین کی باتیں سننے کے لیے بے تاب تھے۔ تلاوتِ قرآن کے بعد مولانا احمد الدین گکھڑوی کی تقریر کا اعلان کیا گیا۔ اللہ نے ان کو علم بھی دیا تھا' بولنے کے ڈھنگ سے بھی نوازا تھا' اور حافظہ بھی مضبوط عطا فرمایا تھا۔ بڑی روانی سے تقریر کرتے تھے اور جس موضوع پر زبان کو حرکت دیتے اس موضوع کے حوالوں کے حوالے دیتے چلے جاتے تھے۔ مرزائیوں کو آڑے ہاتھوں لیتے تھے اور ان کے لٹریچر پر عمیق نگاہ رکھتے تھے۔ مرزا صاحب کی نفسیات کا خوب تجزیہ کرتے تھے اور مرزائی مبلغوں کے اسلوب کلام سے اچھی طرح آگاہ تھے۔ ان کے متعلق بات کرتے وقت ان کی زبان

میں رزم کی سی کیفیت پیدا ہو جاتی تھی اور لہجہ گرم ہو جاتا تھا۔ ان کی تقریر نے خوب سماں باندھا' لیکن کسی طرف سے نہ کسی مرزائی مبلغ کی آواز آئی اور نہ مرزائیت سے تعلق رکھنے والے کسی شخص نے لب کشائی کی۔

ان کی تقریر ختم ہوئی تو حضرت مولانا حافظ محمد حسین روپڑی سٹیج پر تشریف لائے۔ کشیدہ قامت' سرخی مائل گوری رنگت' تیکھے نقوش' سفید تہبند اور سفید قمیص پہنے ہوئے۔ سر پر سفید عمامہ' صحت مند جوان' یہ آج سے کم و بیش پینسٹھ سال قبل کی بات ہے' وہ ان کا دور شباب تھا اور گورے رنگ کے چہرے پر سیاہ داڑھی۔! جاذب نظر شخصیت کے مالک۔ قرآن کے حافظ' حدیث کے ماہر اور علوم دین پر عبور۔ جچے تلے الفاظ میں تقریر کا آغاز کیا اور تا اختتام کلام ایک سا انداز اختیار کیے رکھا۔ قرآن کی آیات مبارکہ' نبی ﷺ کی احادیث پاک اور واقعات صحابہ و ائمہ کے بیان سے تقریر کو مدلل کیا اور حقیقت یہ ہے کہ جو کچھ وہ فرما رہے تھے' لوگ انتہائی توجہ اور انہماک سے سن رہے تھے۔ کسی کے لیے بولنے اور اعتراض کرنے کی کہیں گنجائش نہ تھی۔ حافظ محمد حسین کی تقریر اور اسلوب کلام سے لوگ بہت متاثر ہوئے۔ ان کی خوب صورتی اور جوانی نے بھی اپنا جلوہ دکھایا اور لہجے کے زیر و بم نے بھی رنگ باندھا۔ سچی بات ہے' میرے ذہن پر تو ان کا اس قدر اثر پڑا کہ میں نے اپنے دادا اور والدین سے کہہ کر اپنے چھوٹے بھائی کا نام محمد حسین رکھا' جب کہ میرے دادا مرحوم نے اس کا نام محمد الیاس رکھا تھا۔ میں نے دادا سے اپنے بچپن کی بولی میں اس کا نام محمد حسین رکھنے کی وجہ بتائی تو وہ مسکرا کر خاموش ہو گئے اور محمد حسین نام پکا ہو گیا۔

یہاں یہ یاد رہے کہ اس وقت اس علاقے میں نہ بجلی تھی اور نہ لاؤڈ سپیکر کا کوئی تصور تھا۔ لیکن مقرروں کی آواز صاف الفاظ میں لوگوں کے کانوں تک پہنچ رہی تھی اور وہ ہر بات اچھی طرح سمجھ رہے تھے۔

ان مقرروں میں سے آئندہ سطور میں ہم صرف حافظ محمد حسین روپڑی کے بارے میں اپنی معلومات کے مطابق کچھ گزارشات پیش کرنا چاہتے ہیں' لیکن مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پہلے چند الفاظ میں ان کا خاندانی پس منظر بیان کر دیا جائے۔

حافظ صاحب ممدوح کے آباو اجداد کا تعلق دراصل ضلع گوجرانوالہ کے ایک مقام ایمن آباد سے تھا- مہاراجا رنجیت سنگھ کے عہد حکومت میں ضلع امرتسر کی تحصیل اجنالہ میں اس خاندان کے ایک سربراہ کو جس کا نام ''کبیر'' تھا' کچھ جاگیر عطا کی گئی تھی- کبیر کے ایک بھائی کا نام ''کمیر'' تھا- کبیر نے ایمن آباد سے کمیر کو بھی اپنی جاگیر میں بلا لیا تھا- پھر ان دونوں بھائیوں نے وہاں ''کمیر پور'' کے نام سے ایک گاؤں کی بنیاد رکھی اور ان کی برادری کے تمام لوگ ایمن آباد کی سکونت ترک کر کے کمیر پور پہنچ گئے- بیان کیا جاتا ہے کہ اس جاگیر کا کل رقبہ پانچ سو ایکڑ تھا' جس میں گاؤں بھی آباد ہوا اور برادری کے افراد میں بھی اسے تقسیم کیا گیا- پھر جیسے جیسے برادری کے افراد بڑھتے گئے' یہ رقبہ تقسیم در تقسیم کے مراحل سے گزرتا ہوا سمٹتا گیا' یہاں تک کہ خاندان کے سب افراد کا وہاں رہ کر اس سے گزر بسر کرنا ممکن نہ رہا- آہستہ آہستہ بہت سے لوگ وہاں سے نکل گئے اور روزگار کی تلاش میں کوئی کہیں چلا گیا' کوئی کہیں-

حافظ محمد حسین روپڑی' جن کے حالات اس وقت ہمارے زیر مطالعہ ہیں' پنجاب کے ممتاز و مشہور عالم حضرت حافظ عبداللہ روپڑی کے برادرِ صغیر تھے اور حضرت حافظ عبداللہ روپڑی کے حالات جو ہمیں مل سکے' ہم اپنی کتاب ''بزم ارجمنداں'' میں بیان کر چکے ہیں- یہ کتاب مکتبہ قدوسیہ' اردو بازار' غزنی سٹریٹ' لاہور نے شائع کی ہے- وہاں اس خاندان کی کچھ تفصیل بیان کی گئی ہے- تاہم یہاں بھی چند الفاظ میں اس دودمانِ عالی کردار کے متعلق کچھ عرض کرنا ضروری ہے-

حافظ محمد حسین مرحوم و مغفور کے والد گرامی کا نام نامی میاں روشن دین تھا- وہ اپنے عہد کے ایک صالح اور باعمل بزرگ تھے- نیک لوگوں کی رفاقت اختیار کرنا اور علمائے دین سے ربط و تعلق رکھنا ان کا مقصد زندگی تھا- وہ زیادہ پڑھے لکھے نہ تھے' لیکن پڑھنے لکھنے کا انھیں بے حد شوق تھا-

اس زمانے کے پنجاب میں اہل حدیث کے دو علمی مراکز تھے اور یہی تدریسی مراکز بھی تھے' جو عوام و خواص میں بہت مشہور تھے اور لوگ درس و تدریس اور علمی استفادے کے

انہی دو مراکز کی طرف رجوع کرتے تھے- ایک مرکز امرتسر کا تھا جس کا نام دارالعلوم تقویۃ الاسلام تھا اور وہ مدرسہ غزنویہ کے نام سے معروف تھا- یہ مرکز یا مدرسہ حضرت سید عبداللہ غزنوی (وفات ۱۵ ربیع الاول ۱۲۹۸ھ-فروری ۱۸۸۱ء) کے فرزند عالی قدر حضرت الامام سید عبدالجبار غزنوی (وفات ۲۵ رمضان ۱۳۳۱ھ- ۲۷ اگست ۱۹۱۳ء) نے قائم کیا تھا- دوسرا مرکز حضرت حافظ محمد لکھوی (وفات ۱۳ صفر ۱۳۱۱ھ- اکتوبر ۱۸۹۳ء) نے مدرسہ محمدیہ کے نام سے قائم فرمایا تھا- پنجاب کے اہل حدیث علمائے کرام بلاواسطہ یا بالواسطہ انہی دو مدرسوں کے فیض یافتہ ہیں- تقسیم ملک کے بعد امرتسر کا دارالعلوم تقویۃ الاسلام لاہور منتقل ہو گیا تھا اور اللہ کے فضل سے اس میں تدریسی خدمات کا سلسلہ جاری ہے-لکھوکے کا مدرسہ قیام پاکستان کے بعد اوکاڑہ میں قائم کر دیا گیا تھا جو جامعہ محمدیہ کے نام سے موسوم ہے اور متعدد اساتذہ وہاں درس و تدریس میں مصروف ہیں-

حافظ محمد حسین روپڑی کے والد مکرم میاں روشن دین کے دل میں حصول علم کا شوق ابھرا تو انھوں نے لکھوکے کا عزم کیا اور حضرت حافظ محمد لکھوی کی خدمت میں پہنچے- یہ ۱۳۰۱ھ (۱۸۸۴ء) کا واقعہ ہے- اپنی ذہنی صلاحیت کے مطابق انھوں نے استفادہ کیا اور پھر اپنے علم کی روشنی میں عمر بھر دین کی تبلیغ کرتے رہے- انھوں ۱۹۲۴ء کو روپڑ میں وفات پائی-

ان کی بہت بڑی خواہش یہ تھی اور اس خواہش کو وہ عملی شکل میں لانے کے لیے کوشاں ہوئے کہ ان کی اولاد علوم دینیہ سے بہرہ ور ہو اور اس کی نشر و اشاعت کو اپنی زندگی کا نصب العین قرار دے لے- اللہ نے ان کی یہ خواہش پوری کی اور ان کی اولاد و احفاد کو اللہ نے اپنے دین کی تبلیغ کا جذبہ عطا فرمایا-

ان کے سب سے بڑے بیٹے مولوی رکن الدین نے حصول علم کے لیے لکھوکے کا عزم کیا اور وہاں کے اساتذہ سے مستفید ہوئے- وہ اپنے چھوٹے بھائی حافظ عبداللہ روپڑی کو بھی وہیں لے گئے تھے- کچھ عرصہ یہ بھی وہاں تعلیم حاصل کرتے رہے- حافظ صاحب امرتسر کے مدرسہ غزنویہ میں کئی سال اقامت گزین رہے اور حضرت امام سید

عبدالجبار غزنوی اور دیگر اساتذہ کے حضور زانوئے شاگردی تہہ کیا۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ حافظ عبداللہ روپڑی نے لکھوی اور غزنوی علمائے کرام سے بلاواسطہ فیض حاصل کیا اور پھر جن حضرات نے حضرت حافظ صاحب سے حصول علم کیا' وہ لکھوی اور غزنوی اہل علم کے بالواسطہ شاگرد ہوئے۔

حافظ محمد حسین (۱۸۹۳ء۔ ۱۳۱۰ھ) کے لگ بھگ موضع ڈوبہ ضلع قصور میں پیدا ہوئے۔ تحصیل علم امرتسر کے مدرسہ غزنویہ دارالعلوم تقویۃ الاسلام سے بھی کی اور اپنے برادر کبیر حضرت حافظ عبداللہ روپڑی سے بھی کی۔! یہاں یہ یاد رہے کہ حافظ عبداللہ صاحب کا مولد و مسکن تو کیر پور (ضلع امرتسر) ہی تھا' لیکن تحصیل علم کے بعد وہ ۱۹۱۴ء کو روپڑ چلے گئے تھے۔ روپڑ اس وقت ضلع انبالہ کی تحصیل تھا۔ اب اسے ضلعے کی حیثیت حاصل ہے۔ حافظ محمد حسین بھی روپڑ تشریف لے گئے تھے' اس لیے یہ حضرات "روپڑی" کہلائے اور ان میں سے جن بزرگوں نے کیر پور میں سکونت اختیار کیے رکھی' وہ "کیرپوری" کی نسبت سے مشہور ہوئے۔

حافظ محمد حسین بڑے ذہین اور حصول علم کے بے حد شائق تھے۔ جوانی کی سرحدوں تک پہنچنے کے ساتھ ہی مروجہ دینی علوم حاصل کر لیے تھے۔ انھوں نے اپنے ذہن میں یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ تدریس کا سلسلہ ضرور جاری رکھیں گے اور طلبا کو درسی کتابیں پڑھائیں گے' لیکن کسی مدرسے سے اس کا معاوضہ نہیں لیں گے' گزر اوقات کے لیے اپنا کاروبار کریں گے۔ چنانچہ ان کا یہ فیصلہ اس طرح عمل میں آیا کہ انھوں نے امرتسر میں کھڈیوں کے کپڑے کا کاروبار شروع کیا جو منافع بخش کاروبار تھا۔ وہ اپنے اس کاروبار کی نگرانی بھی کرتے تھے اور طلبا کو پڑھاتے بھی تھے۔ کچھ عرصہ وہ اپنے برادر بزرگ وار حضرت حافظ عبداللہ روپڑی کے پاس روپڑ میں فریضہ تدریس انجام دیتے رہے۔

— وہ جری اور غیور اہل علم تھے۔ اپنے مسلک کے خلاف کوئی بات سننا گوارا نہ کرتے تھے۔ انتہا درجے کے پابند سنت نبویؐ تھے۔ دورِ جوانی میں اس درجے بہادر اور شجاع تھے کہ اگر کوئی مخالف گروہ ان پر حملہ آور ہوتا تو تنہا مقابلے کے لیے آ کھڑے ہوتے۔ روپڑ میں

ایک مرتبہ عیدالاضحیٰ کے موقعے پر گائے کی قربانی کے مسئلے پر سکھوں سے جھگڑا ہو گیا تو میدان میں نکل آئے اور چند ساتھیوں کی مدد سے سکھوں کے بہت بڑے جتھے کو بھگا دیا۔ اس کے بعد کبھی اس نواح میں اس قسم کا جھگڑا نہیں ہوا۔

مخالف کے مقابلے میں جرأت و شجاعت کا مظاہرہ کرنے کا جذبہ ان میں زندگی کے آخری دور تک قائم رہا۔ لاہور کی مسجد قدس کا جو اہل حدیث کی مشہور مسجد ہے، حدود اربعہ ابتدا میں مسلک اہل حدیث کے بالکل خلاف تھا۔ لاہور شہر میں رقبے کے اعتبار سے یہ بہت بڑی مسجد ہے۔ اس جگہ کا حصول نہایت مشکل تھا اور خطرات سے پر۔! بعض بااثر اور لڑائی فساد کے رسیا لوگ برملا کہا کرتے تھے کہ مر جائیں گے یا مار دیں گے لیکن یہاں وہابیوں کی مسجد نہیں بننے دیں گے۔ اس مسجد کی جگہ کے حصول کے لیے جو افراد سب سے پیش پیش تھے، ان میں حافظ محمد حسین روپڑی اور اس وقت کی سپریم کورٹ کے سپرنٹنڈنٹ چودھری عبدالکریم مرحوم کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں۔ ایک دفعہ دست بدست لڑائی بھی ہوئی اور اس میں حافظ صاحب کو شدید چوٹیں آئی تھیں، غالباً ان کا ایک بازو ٹوٹ گیا تھا اور وہ میو ہسپتال پہنچ گئے تھے۔ حضرت مولانا محمد داؤد غزنوی اور ان سطور کا راقم کئی مرتبہ ان کی مزاج پرسی کے لیے میو ہسپتال گئے۔ مولانا نے ہسپتال کے ڈاکٹروں کو ان کے علم و فضل کے متعلق بتایا اور ان کے علاج کے لیے تاکید فرمائی۔ وہ کئی روز ہسپتال میں داخل رہے تھے، لیکن نہایت مطمئن تھے۔۔۔ آخر مسجد وہیں تعمیر ہوئی۔!

درسی کتابوں پر تو ان کو عبور حاصل تھا ہی، اس کے علاوہ دینی علوم کے تمام گوشوں میں مہارت رکھتے تھے۔ مطالعہ وسیع تھا اور اپنے موقف کی وضاحت عمدگی اور صفائی سے کرتے تھے۔

فن مناظرہ سے بھی باخبر تھے اور اس کے تمام پہلوؤں پر ان کی نظر تھی۔ ان کا زمانہ مناظروں اور مباحثوں کا زمانہ تھا اور اس میں وہ خوب چہکتے تھے۔ مناظرے میں حریف ان پر کوئی اعتراض کرتا یا ان کے موقف کی تردید کرتا تو اسی کے عائد کردہ اعتراضات و الزامات میں اسے الجھا دیتے اور وہ لاجواب ہو جاتا۔

درس و تدریس کا سلسلہ انھوں نے عمر بھر جاری رکھا- قیام پاکستان کے بعد لاہور آئے تو یہاں بھی ان کا تدریس سے تعلق رہا- کھڈیوں کے کپڑے کا کاروبار انھوں نے لاہور میں بھی شروع کیا تھا-

غالباً ۱۹۵۶ء میں حضرت مولانا سید محمد داؤد غزنوی نے ان سے درخواست کی کہ امرتسر میں اپنے زمانۂ طالب علمی میں وہ دارالعلوم تقویۃ الاسلام میں تعلیم حاصل کرتے رہے ہیں' اب وہ یہاں معلم کی حیثیت سے تشریف لائیں گے تو انھیں نہایت مسرت ہو گی- چنانچہ انھوں نے مولانا کی درخواست قبول فرمائی اور دارالعلوم میں فریضۂ تدریس انجام دینے لگے- ایک سال وہ اس منصب پر فائز رہے- میرا زیادہ تر تعلق ان سے اسی زمانے میں ہوا- میں اس وقت ہفت روزہ ''الاعتصام'' کی خدمت ادارت پر مامور تھا اور اس کا دفتر دارالعلوم کی بلڈنگ میں تھا- حضرت حافظ صاحب تدریس سے فارغ ہو کر بالعموم میرے کمرے میں تشریف لے آتے تھے' وہ مجھ سے نہایت شفقت کا برتاؤ فرماتے تھے- میں انھیں عرض کیا کرتا تھا کہ آپ کا یہاں تشریف لانا' یوں تو اس فقیر کے لیے مسرت و سعادت کا باعث ہے' لیکن جب آپ فارغ ہوں تو مجھے حکم فرمایا کریں' میں حاضر خدمت ہوا کروں گا-

وہ ازراہ شفقت فرمایا کرتے تھے کہ جی میرا تمھارے پاس آنے کو چاہتا ہے تو مجھے ہی آنا چاہیے- پھر یہ کہ میں اس وقت فارغ ہوتا ہوں اور تم مصروف ہوتے ہو' میں تمھیں اپنے پاس آنے کی کیوں تکلیف دوں-

یہ ان کی اس گنہگار پر شفقت کی انتہا تھی- کیا موجودہ دور میں کوئی ایسا عالم دین ہے جو اس طرح چھوٹوں پر شفقت کا اظہار کرے- یہ نک چڑھوں کا دور ہے اور ہر شخص جو چار حرف پڑھ لیتا ہے' پھوں پھوں کرتا ہے-

اتباع سنت کا جذبہ اور مسلک سلف کی پابندی کا داعیہ ان کی حیاتِ مستعار کا جوہر اساسی تھا- اس کا اندازہ ان کی وصیت کے بعض اجزا سے کیا جا سکتا ہے- یہ اجزا ہر مسلمان کے لیے مشعل راہ اور نمونۂ عمل کی حیثیت رکھتے ہیں- ملاحظہ فرمایئے:

۱- کوئی غیر محرم عورت میرا چہرہ نہ دیکھے۔
۲- میری تجہیز و تکفین اور تغسیل میں صرف وہ لوگ حصہ لیں جو متبع سنت اور سلفی العقیدہ ہوں۔
۳- مجھے قبر میں وہ لوگ اتاریں جو صوم و صلوٰۃ کے پابند، متبعین سنت اور حاملین عقیدۂ سلف ہوں۔
۴- میرے بیٹوں کو اسی نہج و طریق سے تعلیم دی جائے، جس نہج و طریق سے میں دیتا رہا ہوں۔
۵- میرے تمام دوستوں کو میرا سلام پہنچایا جائے۔

حافظ صاحب مرحوم مرض دق میں مبتلا تھے اور کئی سال تکلیف و علالت کی کیفیت سے دوچار رہے۔ بہت علاج کرائے اور بہت سے یونانی طبیبوں اور ایلوپیتھی ڈاکٹروں سے رجوع کیا گیا لیکن کہیں سے افاقہ نہ ہوا۔ آخر فرشتۂ اجل آ پہنچا اور وہ ۱۲ اکتوبر ۱۹۵۹ء (۲۸ ربیع الاول ۱۳۷۹ھ) کو جمعے کے روز اس جہانِ فانی سے عالم جاودانی کو رخصت ہو گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

ادھر موذن فجر کی اذان سے فارغ ہوا اور ادھر مرحوم کی روح قفس عنصری سے جدا ہو کر جنت کو پرواز کر گئی اور اس مقام پر پہنچ گئی، جہاں کسی کو ہماری دعائے صحت کی ضرورت نہیں رہتی۔ البتہ دعائے مغفرت کی احتیاج بہر حال رہتی ہے۔ آیئے بہ یک آواز دعا کریں۔

اللھم اغفرله وارحمه و عافه و اعف عنه

نمازِ جنازہ کا نماز عصر کے بعد چار بجے پڑھنے کا اعلان کیا گیا تھا۔ نماز جمعہ ادا کر کے جو لوگ سب سے پہلے ان کے گھر پہنچے ان میں مرکزی جمعیت اہل حدیث مغربی پاکستان کے بہت سے ارکان شامل تھے۔ اس وقت پاکستان دو حصوں پر مشتمل تھا۔ ایک حصہ مشرقی پاکستان کہلاتا تھا اور ایک مغربی پاکستان۔ مشرقی پاکستان کی جمعیت اہل حدیث الگ تھی، جس کے صدر مولانا عبداللہ الکافی تھے اور مغربی پاکستان کی الگ تھی، جس کے امیر مولانا سید محمد داؤد غزنوی تھے۔ اب مشرقی پاکستان کی جمعیت کا نام جمعیت اہل حدیث بنگلہ دیش ہے

اور مغربی پاکستان کی جمعیت کو مرکزی جمعیت اہل حدیث پاکستان کہا جاتا ہے۔

میں اس دور کی جماعت کی تاریخ تازہ کرنے کے لیے ذیل میں جمعیت کے ان چند ارکان کے نام مع ان کے اس وقت کے عہدوں کے درج کرتا ہوں جو نماز جنازہ پڑھنے کے لیے جمعے کے فوراً بعد حضرت حافظ محمد حسین روپڑی کے مکان پر پہنچے تھے۔

۱۔ مولانا سید محمد داؤد غزنوی۔ امیر مرکزی جمعیت اہل حدیث مغربی پاکستان۔

۲۔ حاجی محمد اسحاق حنیف ناظم نشر و اشاعت مرکزی جمعیت اہل حدیث مغربی پاکستان۔

۳۔ مولانا محمد عطاء اللہ حنیف۔ امیر جمعیت اہل حدیث لاہور شہر۔

۴۔ حکیم ہدایت اللہ۔ نائب امیر جمعیت اہل حدیث' لاہور شہر۔

۵۔ مولانا محمد رمضان۔ ناظم اعلیٰ جمعیت اہل حدیث' لاہور شہر۔

۶۔ مولانا محمد عبدہ۔ مدرس دار العلوم تقویۃ الاسلام۔ لاہور

۷۔ چودھری عبدالکریم (سپرنٹنڈنٹ سپریم کورٹ) رکن مجلس عاملہ جمعیت اہل حدیث لاہور۔

۸۔ اس فقیر کو بھی اس فہرست میں شامل کیجیے۔ یہ اس وقت مرکزی جمعیت اہل حدیث کے ترجمان "الاعتصام" کا مدیر تھا۔

اوپر درج کیے گئے تمام حضرات وفات پا چکے ہیں' رحمہم اللہ تعالیٰ۔ البتہ یہ فقیر جو واقعہ کا راوی ہے' ابھی تک زندہ ہے۔

ان کے علاوہ اور بھی بہت سے لوگ نہایت تیزی کے ساتھ وہاں پہنچ گئے تھے۔ ساڑھے تین بجے ان کی عارضی قیام گاہ (۱۰۰۔ جے بلاک) ماڈل ٹاؤن سے ان کی میت اٹھائی گئی' چار بجے ان کا جنازہ ان کے برادر کبیر حضرت حافظ عبداللہ روپڑی نے پڑھایا اور پھر اس سے تھوڑی دیر بعد ان کی ابدی قیام گاہ ماڈل ٹاؤن کے قبرستان میں ہزاروں افراد کی موجودگی میں انھیں دفن کر دیا گیا۔

اللھم نور مرقدہ و وسع مدخلہ و اغسلہ بالماء و الثلج و البرد۔

حضرت مرحوم نے اپنے پیچھے چار بیٹے چھوڑے' جن کے نام علی الترتیب یہ ہیں۔

۱- حافظ عبداللہ: یہ کراچی رہتے ہیں اور کاروبار کرتے ہیں۔

۲- حافظ عبدالرحمٰن مدنی: انھوں نے گارڈن ٹاؤن (لاہور) میں جامعہ رحمانیہ کے نام سے دارالعلوم جاری کیا ہے، جس میں کئی سال سے تدریسی خدمات کا سلسلہ جاری ہے۔

۳- حافظ عبدالوحید: لاہور میں مقیم ہیں اور معروف کاروباری شخصیت ہیں۔

۴- حافظ عبدالماجد: کراچی میں ان کا سلسلہ کاروبار جاری ہے۔

ماشاء اللہ چاروں بھائی حافظ قرآن ہیں---! انھوں نے "روپڑی" کی نسبت ترک کر دی ہے جو ان کے خاص نقطۂ فکر کی شناخت اور اس کے اظہار کی علامت تھی۔ اس کے بجائے انھوں نے "مدنی" کی نسبت اختیار کر لی ہے۔ میرا خیال ہے یہ سبھی "مدنی" کہلاتے ہیں۔ البتہ حضرت حافظ عبداللہ روپڑی اور ان کے مرحوم بھائی حافظ عبدالرحمٰن کے بیٹوں اور پوتوں نے اس نسبت کو برقرار رکھا ہے، چنانچہ وہ "روپڑی" کی نسبت سے پکارے جاتے ہیں۔

حافظ عبدالرحمٰن مدنی جامعہ رحمانیہ کے ساتھ ساتھ سیاسی کاروبار بھی کرتے ہیں۔ کاش وہ سیاست کا دھندا چھوڑ کر خالص علمی میدان کو اپنا لیں اور اپنی زندگی اسی کے لیے وقف کر دیں۔ وہ "محدث" کے نام سے ماڈل ٹاؤن سے ماہانہ رسالہ بھی شائع کرتے ہیں جو ایک علمی اور تحقیقی رسالہ ہے۔ اپنے خاندان کے بزرگوں کے حالات کسی روپڑی اہل علم نے نہیں لکھے۔ موجودہ دور کے کسی غزنوی اور لکھوی عالم کو بھی اللہ نے اپنے اکابر کی علمی سرگرمیاں معرض کتابت میں لانے کی توفیق نہیں دی۔

❀❀❀

سید ابوبکر غزنوی

(وفات ۲۴ اپریل ۱۹۷۶ء)

۲۴ جولائی ۱۹۴۸ء کو مرکزی جمعیت اہل حدیث کا قیام عمل میں آیا تھا اور اس کا دفتر شیش محل روڈ پر دارالعلوم تقویۃ الاسلام کی بلڈنگ میں تھا۔ اسی سال اس کے ناظم دفتر کی حیثیت سے میں لاہور آیا تو رہائش کے لیے مجھے جو کمرہ دیا گیا' وہ سید ابوبکر غزنوی کے کمرے سے ملحق تھا۔ جمعیت کے دفاتر اور یہ کمرے اس بلڈنگ کی دوسری منزل میں تھے۔ مولانا سید محمد داؤد غزنوی کی سکونت تیسری منزل میں تھی۔

سید ابوبکر غزنوی اس وقت پنجاب یونیورسٹی میں ایم اے (عربی) کے طالب علم تھے اور بہت پڑھتے تھے۔ رات کا اکثر حصہ پڑھنے میں گزر جاتا تھا۔ بالعموم وہ اونچی آواز سے پڑھا کرتے تھے۔ دو تین روز ہی میں ہمارا باہم تعلق پیدا ہو گیا تھا۔ مجھے بھی پڑھنے کی عادت تھی' اس لیے شب کا کافی حصہ اسی شغل کی نذر ہو جاتا تھا۔

بارہا ایسا ہوتا کہ رات کے گیارہ ساڑھے گیارہ بجے کے قریب وہ اپنے کمرے سے نکلتے اور میرے کمرے کے دروازے پر دستک دیتے اور ساتھ ہی آواز آتی:

اسحاق صاحب! زندہ ہیں؟

میں جواب دیتا: ابھی زندہ ہوں۔

ان کی طرف سے آواز آتی: باہر آ کر زندگی کا ثبوت دیجیے۔

ہم بھاٹی دروازے کے چوک میں جاتے' وہاں تکے یا کباب کھاتے' ایک ایک کپ چائے کا پیتے اور واپس آ کر پھر پڑھنے کا سلسلہ شروع ہو جاتا جو ڈیڑھ دو بجے تک جاری رہتا۔

ایک دن عجیب لطیفہ ہوا۔ مجھے کہا چلو' آج عیاشی کریں۔ فلیٹی ہوٹل اس وقت لاہور

کا بہت بڑا ہوٹل تھا۔ ہم وہاں پہنچے۔ کافی دیر وہاں بیٹھے ادھر ادھر کی باتیں کرتے اور کھاتے پیتے رہے۔ بیرے سے بل طلب کیا تو چالیس روپے کے قریب تھا۔ انھوں نے اپنی جیب سے پیسے نکالے تو چوبیس یا پچیس روپے تھے۔ میں نے اپنی جیب ٹٹولی تو کل پونجی چھے یا سات روپے تھی۔ مجھے کہا اپنے پیسے جیب میں ڈال لیے اور وہ نہایت اطمینان سے اٹھے اور کاؤنٹر پر آئے۔ عام طور سے وہ ننگے سر رہتے تھے' لیکن اتفاق سے اس دن خاکستری رنگ کی شان دار قراقلی ٹوپی ان کے سر پر تھی۔ کاؤنٹر پر پانچ روپے بہ طور ٹپ بیرے کی پلیٹ میں ڈالے جو اس زمانے میں بہت بڑا ٹپ تھا اور وہاں بیٹھے ہوئے آدمی سے کہا: یہ لیجیے بیس روپے اور یہ لیجیے ٹوپی ---- جس دن ہم ادھر آئیں گے' پیسے دے کر ٹوپی لے جائیں گے۔

وہ یہ الفاظ سن کر نہایت حیران ہوا۔ کھڑا ہو کر کہا: جناب! مجھے شرمندہ نہ کیجیے' یہ پیسے بھی لیجیے اور ٹوپی بھی لیجیے۔

اس نے ٹوپی تو مجبور کر کے دے دی' لیکن بیس روپے ہم نے اس سے نہیں لیے' وہ اس کی میز پر رکھے اور جلدی سے باہر آ گئے۔ دو تین روز کے بعد میں ادھر گیا تو اسے باقی پیسے دیے' لیکن نہایت مشکل سے۔!

اپنے سے بڑوں میں سے جس میں وہ نیکی کا جوہر دیکھتے' اس کے سامنے سر نیچا کر لیتے تھے۔ حضرت مولانا عطاء اللہ حنیف کے سسر کا اسم گرامی میاں نور الدین تھا۔ تقسیم ملک کے بعد اپنے گاؤں بھوجیاں (ضلع امرتسر) سے ترک مکانی کر کے بہ طور پناہ گزین وہ گوندلانوالا (ضلع گوجرانوالہ) میں آ بسے تھے۔ ان کے اخلاف اب بھی وہیں ہیں۔ مولانا عطاء اللہ صاحب اور اپنے دوسرے عزیزوں سے میل ملاقات کے لیے لاہور ان کی آمد و رفت رہتی تھی۔ نماز وہ دار العلوم تقویۃ الاسلام میں پڑھتے تھے۔ مولانا داؤد غزنوی نے دار العلوم کے امام صاحب سے کہہ رکھا تھا کہ میاں صاحب جتنے دن یہاں رہیں' جماعت کے لیے انھی سے عرض کیا جائے۔ وہ نہایت پرہیز گار بزرگ تھے اور مولانا داؤد غزنوی کے والد مکرم حضرت امام مولانا عبد الجبار غزنوی کے ارادت مند تھے' اس لیے مولانا ان کا بہت

احترام کرتے تھے۔ ایک دن ابوبکر صاحب دارالعلوم کے صدر دروازے سے متصل محمد ادریس کی دکان پر کسی سے باتیں کر رہے تھے۔ ادھر سے میاں صاحب بھی تشریف لے آئے۔ انھوں نے حسب عادت وہاں کھڑے ہوئے لوگوں کو السلام علیکم کہا اور فرمایا: ''مجھے یہاں اپنے مرشد کی خوشبو آ رہی ہے۔''

ابوبکر صاحب نے یہ الفاظ سنے تو فوراً ادھر متوجہ ہوئے اور گردن جھکا کر نہایت ادب سے میاں صاحب کو سلام کیا اور انتہائی نرم آواز میں ان سے دعا کی درخواست کی۔

عربی زبان سے انھیں بے حد پیار تھا' بالخصوص جدید عربی سے وہ انتہائی دلچسپی رکھتے تھے اور دراصل یہی ان کا موضوع تھا۔ خود وہ عرب بھی ان کی عربی دانی کا اعتراف کرتے تھے' جن سے انھیں بات چیت کا موقع ملتا تھا--- ایک مرتبہ سعودی سفارت خانے کے چند اعلیٰ حکام مولانا داؤد غزنوی سے ملاقات کے لیے لاہور آئے۔ ایمبیسیڈر ہوٹل میں ان کا قیام تھا۔ انھوں نے مولانا کو ٹیلی فون کیا۔ مولانا اس وقت گھر پر نہیں تھے۔ ابوبکر صاحب نے ٹیلی فون سنا اور عربی میں گفتگو کی۔ وہ ان کے لہجے اور زبان سے بہت متاثر ہوئے اور اس کا ذکر مولانا سے کیا۔

ابوبکر صاحب بعض دفعہ بڑی بے تکلفی کا مظاہرہ کرتے تھے۔ مئی ۱۹۶۵ء میں پندرہ سال کی ادارت کے بعد میں ہفت روزہ ''الاعتصام'' سے الگ ہوا تو ہم نے جولائی ۱۹۶۵ میں ہفت روزہ ''توحید'' جاری کیا۔ اس کے پبلشر سید عمر فاروق غزنوی اور نگران سید ابوبکر غزنوی تھے۔ ایڈیٹر میں تھا۔ ایک دن شام کے بعد میں اور ابوبکر صاحب' مولانا محی الدین احمد قصوری کی خدمت میں گئے کہ وہ ''توحید'' کے لیے مضمون عنایت فرمایا کریں۔ وہ مزنگ روڈ کی کوٹھی نمبر ۵۳ میں سکونت پذیر تھے۔ ان سے مل کر ہم چوک صفاں والا سے ٹمپل روڈ کی طرف گھومے تو ایک ریڑھی والا کھڑا تھا' جس نے برف کی ایک سل پر میٹھے لگا رکھے تھے۔ ابوبکر صاحب نے اسے دیکھا تو وہیں رک گئے اور مجھے کہا: آگے کہاں جا رہے ہو؟ اللہ کا نام لے کر ٹوٹ پڑو ان پر---!

وہاں کھڑے کھڑے ہم نے بیس بائیس میٹھے رگڑ ڈالے---!

یہاں یہ بھی سنتے جایے کہ اخبار ''توحید'' تھوڑا عرصہ ہی جاری رہ سکا تھا' اکتوبر ۱۹۶۵ء میں یہ فقیر ادارہ ثقافت اسلامیہ سے وابستہ ہو گیا تھا۔

ایک دن دس بجے کے قریب کسی کام سے میں مولانا غزنوی کے کمرے میں گیا تو ابوبکر صاحب وہاں بیٹھے تھے اور ان کی داڑھی کچھ بڑھی ہوئی تھی۔ اس سے قبل وہ روزانہ شیو کرتے تھے۔ مجھے یہ تو معلوم تھا کہ اب ان کی دنیا بدل گئی ہے' لیکن کئی روز سے ملاقات نہیں ہوئی تھی اور انھیں اس حالت میں نہیں دیکھا تھا' جس حالت میں اب دیکھ رہا تھا۔

مولانا نے جاتے ہی مجھ سے پوچھا: آپ حجامت کہاں سے بنواتے ہیں؟ جس حجام سے آپ حجامت بنواتے ہیں' اس کے پاس ابوبکر کو لے جایے۔

اس وقت انارکلی کے دھنی رام روڈ کی ایک گلی میں ایک حجام کی دکان تھی' جس کا نام محمود تھا اور وہ صوبہ یوپی کے شہر ''سیوہارہ'' کا رہنے والا تھا جو مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی مرحوم کا شہر تھا۔ وہ پڑھا لکھا حجام تھا اور کئی ادیب' صحافی اور شاعر اس سے حجامت بنواتے تھے۔ میں کچھ عرصہ پیشتر اس سے ملنے کی غرض سے گیا تو دیکھا کہ اس نواح کا پرانا سلسلہ ختم ہو چکا ہے۔ حجام کا کچھ پتا نہیں کدھر گیا۔ اس کی دکان فیشن ایبل ملبوسات کی دکان سے بدل گئی ہے۔

میں ابوبکر صاحب کو اس حجام کی دکان پر لے گیا۔ ان کا تعارف کرایا تو وہ بہت خوش ہوا۔ اس نے بڑے شوق اور پیار سے ان کا خط بنایا۔ چھوٹی چھوٹی مونچھیں خوب صورتی سے بنائیں۔ لیکن ابوبکر صاحب کو مونچھیں پسند نہیں آئیں۔ انھوں نے گھر آ کر مونچھیں ختم کر دیں' باقی سب کچھ اسی حالت میں رہنے دیا۔

اگر میں یہ کہوں کہ ان کی داڑھی رکھنے کے ''افتتاح'' میں ایک طرح سے میرا بھی حصہ ہے تو غلط نہ ہوگا۔

دارالعلوم تقویۃ الاسلام میں ان کی خطابت جمعہ کا معاملہ بھی اسی طرح کا ہے۔ جولائی ۱۹۶۵ء کی بات ہے کہ میں نے ان سے کہا' آپ دارالعلوم میں خطبہ جمعہ شروع کر دیں۔ انھوں نے جواب دیا' میں اسی مسجد (چینیاں والی) میں جمعہ پڑھا کروں گا' جہاں میرے بابا

پڑھا کرتے تھے۔ ان کا یہ مطلب ہرگز نہ تھا کہ وہ اس مسجد میں جمعہ پڑھانے کے متمنی ہیں۔ ان کا مقصد صرف یہ تھا کہ وہیں نماز جمعہ کے لیے جایا کریں گے' جہاں ان کے والد مکرم جایا کرتے تھے --- میں نے کہا' وہ دور تو ختم ہو گیا۔ آئندہ آپ یا آپ کے خاندان کے کسی فرد کی اس مسجد کے منبر و محراب تک رسائی نہیں ہو سکے گی۔ بہر حال ان کے انکار کے باوجود میں نے اخبار "توحید" میں اعلان کر دیا کہ آئندہ دارالعلوم تقویۃ الاسلام میں سید ابوبکر غزنوی نماز جمعہ پڑھایا کریں گے --- اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہاں کثیر تعداد میں دور دراز سے لوگ جمعے کے لیے آنے لگے۔ ان کی وفات کے بعد کئی سال ہمارے دوست پروفیسر حافظ محمد ایوب (انجینئرنگ یونیورسٹی) لاہور وہاں جمعہ پڑھاتے رہے --- اب ابوبکر صاحب کے صاحب زادے سید جنید غزنوی خطبہ جمعہ دیتے ہیں۔ بہت حاضری ہوتی ہے اور وہ ماشاء اللہ اچھی تقریر کرتے ہیں۔

یہاں یہ یاد رہے کہ ۱۹۶۳ء میں جب مولانا داؤد غزنوی کی صحت زیادہ بگڑ گئی تھی اور جمعے کے لیے کسی مسجد میں جانا ان کے لیے ممکن نہیں رہا تھا تو انھوں نے چند جمعے دارالعلوم میں پڑھے تھے۔ لیکن وہ عارضی معاملہ اور مجبوری کا قصہ تھا۔ اب ابوبکر صاحب نے مستقل طور سے یہ سلسلہ شروع کر دیا تھا۔ میں کہنا دراصل یہ چاہتا ہوں کہ دارالعلوم میں ان کے خطبہ جمعہ کے افتتاح میں بھی اس فقیر کا حصہ ہے۔

خطابت و تقریر میں ان کا مقام بڑا اونچا تھا۔ جس موضوع پر کچھ کہنا ہوتا' اس کی پوری تیاری کر کے آتے تھے۔ ایک دفعہ انھیں حکیم محمد سعید مرحوم کی طرف سے "شام ہمدرد" میں تقریر کے لیے دعوت دی گئی' شام ہمدرد کے جلسوں میں بہت سے پڑھے لکھے حضرات شرکت کرتے تھے۔ ادارہ ثقافت اسلامیہ کے اس وقت کے ڈائریکٹر ایس ایم اکرام بھی اس میں شامل ہوتے تھے۔ مجھے بھی دعوت نامہ بھیجا جاتا تھا۔ اکرام صاحب انڈین سول سروس کے پرانے آدمی تھے اور متعدد انگریزی اور اردو کتابوں کے مصنف --- ! بے شمار مشہور و ممتاز اہل علم کو انھوں نے دیکھا اور سنا تھا۔ اب شام ہمدرد میں سید ابوبکر غزنوی کی تقریر سننے کا بھی انھیں موقع ملا۔ دوسرے دن وہ دفتر آئے تو ابوبکر صاحب کی تقریر کی بہت تعریف

کی --- بے شک جس موضوع پر انھوں نے اظہار خیال کیا' اس کے تمام پہلوؤں کی خوب صورتی کے ساتھ بادلائل وضاحت کی- ان کی بہت بڑی خوبی یہ تھی کہ تقریر میں اردو' عربی اور فارسی کے (بلکہ بعض اوقات پنجابی کے اشعار بھی) برمحل پڑھتے تھے اور تقریر کو آیات قرآن' احادیث رسول اور اقوال صلحا سے مزین کرتے تھے- تقریر کو وہ وعظ کہا کرتے تھے- مثلاً اگر اپنی پچھلی کسی تقریر کا حوالہ دینا ہوتا تو فرماتے میں نے اپنے پہلے وعظ میں یہ کہا تھا-

زندگی کے آخری دور میں ان کی حالت بالکل بدل گئی تھی- زیادہ وقت وظائف اور یاد خدا میں گزرتا تھا- ہمارے دوست پروفیسر ڈاکٹر محمد یحییٰ (صدر شعبہ اسلامیات انجینئرنگ یونیورسٹی لاہور) کا شمار ان کے شاگردوں میں ہوتا ہے- انھوں نے بتایا کہ ایک مرتبہ وہ ان کی ہدایت کے مطابق اپنے ایک نہایت ضروری کام کے لیے کسی صاحب سے ملنے کے لیے روانہ ہونے لگے تو کہا اول آخر درود شریف اور ۳۱۳ دفعہ حسبی اللہ ونعم الوکیل پڑھنا- وہ کہتے ہیں میں ان کا بتایا ہوا وظیفہ پڑھنے لگا تو پڑھتا ہی چلا گیا- واپس آیا تو پوچھا' کتنی دفعہ پڑھا تھا-

عرض کیا: بے شمار دفعہ-

فرمایا: جتنی دفعہ بتایا جائے اتنی دفعہ ہی پڑھنا چاہیے- اس کا معاملہ معالج کی بتائی ہوئی دوا کی طرح ہے' جتنی مقدار میں وہ بتائے' اس کی ہدایت کے مطابق اتنی ہی مقدار میں دوا استعمال کرنی چاہیے-

ابوبکر صاحب نے خوب تدریسی کام کیا اور بے شمار لوگ ان کے حلقہ شاگردی میں داخل ہوئے- ان کے شاگردوں کی وسیع فہرست میں ڈاکٹر ذوالفقار علی ملک' ڈاکٹر خورشید حسن رضوی' ڈاکٹر خالد علوی' ڈاکٹر سعید اقبال' ڈاکٹر محمد یحییٰ' ڈاکٹر جمیلہ شوکت' ڈاکٹر محمد اسحاق قریشی' ڈاکٹر خلیل الرحمٰن' خالد بزمی' حافظ ثناء اللہ خان' چودھری عبدالحفیظ' عابد حسن' ساجدہ قریشی اور حافظ عبداللہ (بھکر) شامل ہیں- ان حضرات میں سے بعض وفات پا چکے ہیں- دعا ہے اللہ تعالیٰ زندہ دوستوں کی عمر دراز فرمائے اور ان کے لیے زیادہ سے زیادہ علم و فن کی خدمت کے مواقع فراہم کرے اور وفات پا جانے والوں کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ

عطا فرمائے-آمین

اب ملاحظہ فرمایئے' ان کا وہ شجرۂ نسب جو ہمیں معلوم ہے اور ان کے آباؤ اجداد کے بارے میں چند باتیں اور خود ان کے واقعات و حالات کی ایک جھلک---! اور واقعہ یہ ہے کہ ان کا وجود ایک جھلک ہی تھا- دنیا میں آئے' ایک جھلک دکھائی اور غائب ہو گئے- ان کی ولادت سے لے کر ان کے سفر آخرت تک کی یہ کہانی نہایت مختصر ہے' بالکل اسی طرح جس طرح ان کی زندگی مختصر تھی- لیکن اس اختصار میں پھیلاؤ بھی بہت ہے- ان سے استفادہ کرنے والوں کی خدمات جس قدر پھیلتی جائیں گی' اختصار کا دائرہ پھیلتا جائے گا-

کسی کو ان سے اختلاف ہوگا' کسی کو اتفاق- کوئی ان کا معتقد ہوگا' کوئی مخالف--- اور دنیا میں ہمیشہ سے یہی ہوتا آیا ہے' نہ سب کسی سے متفق ہوتے ہیں' نہ سب کسی کی مخالفت کرتے ہیں- موافقت اور مخالفت کا سلسلہ برابر چلتا ہے- جس نے کسی سے اتفاق کیا' اس نے بھی اس کی حیثیت کو مان لیا اور جس نے اختلاف کیا اس نے بھی مان لیا- بلکہ میرے نزدیک صحیح بات یہ ہے کہ اختلاف کرنے والے نے اتفاق کرنے والے کی بہ نسبت اسے زیادہ مانا اور زیادہ اہمیت دی- اس میں کوئی کمال تھا تو اس سے اختلاف کیا گیا اور اس کے افکار و تصورات کے بارے میں اہل علم کی رائے میں تغیر رونما ہوا-

ابوبکر صاحب کا سلسلہ نسب یہ ہے:

ابوبکر بن مولانا محمد داؤد بن مولانا عبدالجبار بن مولانا عبداللہ بن محمد بن محمد شریف---! یہ تمام حضرات اپنے اپنے وقت میں علم و معرفت کی دولت سے مالا مال اور مرجع خلائق تھے-

مولانا سید عبداللہ غزنوی جو سید ابوبکر غزنوی کے پردادا تھے' ۱۲۲۶ھ (۱۸۱۱ء) کو قلعہ بہادر خیل میں پیدا ہوئے جو افغانستان کے شہر غزنی کے مضافات میں واقع ہے اور خواجہ بلال پہاڑ کے قریب ہے- اسے ''قریہ صاحب زادگان'' بھی کہا جاتا ہے' معلوم ہوتا ہے ''صاحب زادگان'' سے یہی لوگ مراد تھے اور اس نواح میں ان کی دین داری کا بڑا شہرہ تھا' اور یہی وجہ ہے کہ انھیں صاحب زادگان کہا جاتا تھا-

مولانا عبداللہ غزنوی بہت بڑے عالم اور عارف باللہ تھے- چوں کہ وہ خالص کتاب و سنت کی تبلیغ کرتے اور اسی کو مدار عمل ٹھہراتے تھے' اس لیے ۱۸۵۷ء سے کچھ عرصہ بعد افغانستان کی حکومت نے ان کو ملک بدر کر دیا تھا- حکومت کے ایوانوں اور وہاں کے علما وزعما میں اس تقویٰ شعاری کا چلن نہ تھا' جس سے اللہ نے حضرت عبداللہ غزنوی کو بہرہ مند فرمایا تھا--- اس لیے نہایت اذیتوں میں مبتلا کر کے انھیں وہاں سے نکال دیا گیا- اپنے اہل و عیال سمیت پہلے وہ غزنی سے پشاور آئے اور کچھ عرصہ وہاں رہے- پھر لاہور آ گئے- بعد ازاں پنجاب کے شہر امرتسر کے بعض سرکردہ لوگ ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انھیں امرتسر لے گئے-

امرتسر میں انھوں نے کتاب و سنت کی تبلیغ کا سلسلہ شروع کیا' عربی اور فارسی کی متعدد کتابوں کے اردو زبان میں ترجمے کرائے اور انھیں شائع کر کے افادہ عوام کے لیے تقسیم کیا- امرتسر میں ایک دارالعلوم قائم کیا جو "مدرسہ سلفیہ غزنویہ" کے نام سے موسوم ہوا- اس دارالعلوم سے بے شمار علما وطلبا نے استفادہ کیا- انھوں نے ربیع الاول ۱۲۹۸ھ (۱۸۸۱ء) میں وفات پائی- میں ان کے مفصل حالات جو کم و بیش ۸۰ صفحات پر مشتمل ہیں' اپنی کتاب فقہائے ہند کی نویں جلد میں لکھ چکا ہوں جو تیرھویں صدی ہجری کے فقہائے پاک و ہند پر مشتمل ہے-

مولانا عبداللہ غزنوی کے بارہ بیٹے تھے' جن کو اللہ تعالیٰ نے تقویٰ اور علم و فضل کی دولت عطا فرمائی تھی- ان میں سے ایک بیٹے مولانا عبدالجبار غزنوی تھے' جو جلیل القدر عالم اور نہایت متقی اور پرہیزگار بزرگ تھے- وہ ۱۲۶۸ھ (۱۸۵۲) کو غزنی میں پیدا ہوئے تھے اور والد مکرم کے ساتھ ہی امرتسر آ گئے تھے- ۲۵ رمضان المبارک ۱۳۳۱ھ (۲۷ اگست ۱۹۱۳ء) کو امرتسر میں فوت ہوئے-

مولانا عبدالجبار غزنوی کے بیٹے مولانا سید محمد داؤد غزنوی تھے' جن کی ولادت ۱۸۹۵ء کو امرتسر میں ہوئی- وہ تحریر و تقریر' فضیلت علمی' دین داری اور تقوے میں اپنے اسلاف کے صحیح ترین جانشین تھے- انگریزی حکومت کے خلاف انھوں نے سیاسیات میں

بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور مختلف سیاسی تحریکوں میں مجموعی طور پر دس سال قید کاٹی- ان کی تاریخ وفات ۱۶ دسمبر ۱۹۶۳ء ہے-

مولانا محمد داؤد غزنوی کے چار بیٹے تھے' سید عمر فاروق' سید ابوبکر غزنوی' سید محمد یحییٰ اور غزالی-! عمر فاروق اور سید ابوبکر وفات پا چکے ہیں اور محمد یحییٰ اور غزالی اللہ کے فضل سے زندہ ہیں- آئندہ سطور میں ہم سید ابوبکر غزنوی کے حالات بیان کرنا چاہتے ہیں-

سید ابوبکر غزنوی ۲۲ مئی ۱۹۲۷ کو امرتسر میں پیدا ہوئے- اس وقت مولانا داؤد غزنوی کا قیام امرتسر میں تھا اور لاہور کی چینیاں والی (جامع مسجد اہل حدیث) کے خطیب ان کے حقیقی چچا حضرت مولانا عبدالواحد غزنوی تھے- ۱۹۳۰ء میں مولانا عبدالواحد غزنوی فوت ہوئے تو ان کی جگہ اس مسجد کی مسند خطابت پر مولانا داؤد غزنوی کو فائز کر دیا گیا تھا- وہ امرتسر سے لاہور آ گئے تھے' لیکن ان کے اہل وعیال کچھ مدت امرتسر ہی میں رہے- چنانچہ ابوبکر غزنوی نے حصول علم کا آغاز امرتسر میں کیا-

لاہور کا خزانہ گیٹ ہائی سکول' ان دنوں امرتسر میں تھا- یہ سکول تقسیم ملک کے بعد لاہور منتقل ہوا تھا- ابوبکر صاحب نے امرتسر میں اسی سکول سے میٹرک پاس کیا- اس وقت ماسٹر عبدالغفور صاحب اس کے ہیڈ ماسٹر تھے' جو علمائے غزنویہ کے عقیدت مند تھے- ایک معلم شیخ محمد جمیل تھے- یہ بھی مولانا سید محمد داؤد غزنوی کے ارادت کیشوں میں سے تھے- یہ دونوں بزرگ سید ابوبکر صاحب کے معلمین میں سے تھے-

بی- اے انھوں نے ایم اے او کالج امرتسر سے کیا- یہ کالج آزادی کے بعد ۱۹۴۷ میں امرتسر سے لاہور منتقل ہو گیا تھا-

۱۹۵۰ء میں انھوں نے پنجاب یونیورسٹی سے ایم- اے (عربی) کیا- پورے پنجاب میں اول آئے اور گولڈ میڈل حاصل کیا-

ایم- اے پاس کرنے کے بعد پنجاب یونیورسٹی سے ایل ایل بی کیا- وہ اس قدر ذہین اور تیز فہم تھے کہ ایل ایل بی کرنے کے بعد اگر وکالت کا پیشہ اختیار کرتے تو بہت بڑے وکیلوں میں ان کا شمار ہوتا' مگر انھوں نے تعلیم وتعلم کی راہ اختیار کی اور یہی ان کے

لیے صحیح راہ تھی جو ان کے آباواجداد کی راہ تھی۔

پنجاب یونیورسٹی کے اورینٹل کالج میں جن اساتذہ سے انھوں نے استفادہ کیا' وہ حسب ذیل ہیں۔

۱۔ شیخ عنایت اللہ: ۱۹۰۹ میں امرتسر میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم وہیں حاصل کی۔ وہیں بی اے پاس کیا۔ پھر اورینٹل کالج لاہور میں داخلہ لیا۔ وہاں عربی کے علاوہ فرانسیسی اور جرمن زبانیں سیکھیں۔ ۱۹۳۳ء میں ایم۔ اے عربی کر کے اسلامیہ کالج (ریلوے روڈ) لاہور میں لیکچرار مقرر ہوئے۔ بعد ازاں برطانیہ سے پی۔ ایچ۔ ڈی کیا۔ لاہور واپس آئے تو گورنمنٹ کالج میں شعبہ عربی کے صدر مقرر کیے گئے۔ اورینٹل کالج میں وہ عربی کے جز وقتی استاذ بھی تھے۔

۲۔ پروفیسر محمد مراکشی: اپنے عہد کے مشہور عالم اور اورینٹل کالج میں جدید عربی کے استاذ تھے۔ عالم اسلام کے محقق ڈاکٹر تقی الدین مراکشی ہلالی کے چھوٹے بھائی تھے۔

۳۔ ڈاکٹر برکت علی قریشی: ۱۸۹۶ میں غازی آباد (یوپی ہندوستان) میں پیدا ہوئے۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے تعلیم حاصل کی۔ پہلی تقرری بہ طور لیکچرار دہلی کے ایک کالج میں ہوئی۔ ۱۹۲۴ میں برلن (جرمنی) سے پی ایچ ڈی کیا۔ ۱۹۲۸ کو واپس آئے تو اسلامیہ کالج لاہور میں بہ حیثیت صدر شعبہ عربی تقرر ہوا۔ پھر اورینٹل کالج میں آ گئے۔ مختلف اوقات میں اردن' لبنان اور شام میں پاکستان کی طرف سے سفیر بھی مقرر کیے گئے۔

۴۔ پروفیسر عبدالقیوم: عربی کے مشہور عالم و مصنف تھے۔ لدھیانہ' گجرات اور لاہور کے گورنمنٹ کالج میں عربی کے پروفیسر رہے۔ اورینٹل کالج میں بھی پڑھاتے رہے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد پنجاب یونیورسٹی کے انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کے سینئر ایڈیٹر مقرر کیے گئے تھے۔ ۸ ستمبر ۱۹۸۹ کو وفات پائی۔

یہ حضرات گزشتہ دور کے اساتذہ میں بڑی شہرت کے مالک تھے۔ ابوبکر صاحب نے ان سے استفادہ کیا اور نہایت محنت اور انہماک سے تعلیم حاصل کی۔

عربی اور فارسی سے انھیں خاص دلچسپی تھی۔ بالعموم کہا کرتے تھے کہ میں اگر انگریزی

میں فیل ہو جاؤں تو اس کا مجھے کوئی افسوس نہیں ہوگا' لیکن عربی اور فارسی میں جو میرے آباد اجداد کی زبانیں ہیں' مجھے اچھے نمبروں میں کامیاب ہونا چاہیے۔

۱۹۵۰ میں وہ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد اسلامیہ کالج لاہور (سول لائن) میں عربی کے لیکچرار مقرر کیے گئے۔ اس کالج میں عربی اور اسلامیات کے شعبوں کے سربراہ بھی رہے۔ اس زمانے میں اورینٹل کالج (لاہور) کے پرنسپل ڈاکٹر سید عبداللہ تھے۔ انھوں نے ان کو اپنے کالج میں جدید عربی کے جز وقتی لیکچرار مقرر کرلیا' جدید عربی ان کا خاص موضوع تھا۔

دینیات کی تعلیم انھوں نے باقاعدگی سے حاصل نہیں کی تھی' اگرچہ اپنے والد محترم مولانا سید داؤد غزنوی' مولانا عبدالرحیم (حسین خاں والا) مولانا عطاء اللہ حنیف اور مولانا محمد عبدہ سے مختلف اوقات میں پڑھتے رہے تھے' لیکن وہ کسی حد تک باقاعدہ پڑھنا چاہتے تھے۔ اس کا انھیں بہت احساس تھا اور ان کی شدید خواہش تھی کہ یہ کمی پوری کی جائے' چنانچہ ۱۹۶۰ میں گرمیوں کی تعطیلات ہوئیں تو وہ فیصل آباد (اس زمانے کے لائل پور) پہنچے اور پیپلز کالونی میں مکان کرائے پر لیا۔ اس وقت جامعہ سلفیہ میں حضرت حافظ محمد گوندلوی اور مولانا شریف اللہ خان خدمت تدریس انجام دیتے تھے۔ انھوں نے حضرت حافظ صاحب سے تفسیر بیضاوی اور بعض کتب حدیث پڑھیں اور مولانا شریف اللہ خاں سے صرف و نحو کی بعض کتابیں پڑھیں۔ انہی دنوں ان کا تعلق پروفیسر غلام احمد حریری سے ہوا جو اس وقت اسلامیہ کالج لائل پور میں پڑھاتے تھے۔ ان سے علم نحو کی کتاب الفیہ کی شرح ابن عقیل کا کچھ حصہ پڑھا۔ اس طرح انھوں نے مختلف لائق اساتذہ سے دینیات کی تعلیم مکمل کرلی۔

۱۹۶۴ء میں وہ انجینئرنگ یونیورسٹی سے منسلک ہوئے اور انھیں علوم اسلامیہ کی سربراہی کا منصب عطا کیا گیا۔ اس یونیورسٹی میں انھوں نے بڑی محنت کی' جس کے نتیجے میں اسلام سے قلبی تعلق رکھنے والے طلبا کا اچھا خاصا حلقہ وہاں قائم ہوگیا۔

ستمبر ۱۹۷۵ء میں انھیں اسلامیہ یونیورسٹی بہاول پور کا پہلا وائس چانسلر مقرر کیا گیا۔ اس سے قبل اسے ایک دینی درس گاہ کی حیثیت حاصل تھی' جسے جامعہ عباسیہ کہا جاتا تھا۔ صدر

ایوب کے دور حکومت میں اس کے نصاب تعلیم میں اسلامی علوم کے ساتھ کچھ جدید علوم شامل کر دیے گئے تھے' لیکن اسے مکمل یونیورسٹی کا درجہ ذوالفقار علی بھٹو کے عہد حکومت (۱۹۷۵) میں دیا گیا تھا' ابوبکر غزنوی اس کے اولین وائس چانسلر مقرر ہوئے- انھوں نے اس کی تعمیر و ترقی کے لیے بڑی تگ ودو کی-

اب ان کی قلمی جدوجہد کی طرف آیے- وہ نہایت ذہین اور قدیم و جدید علوم سے باخبر تھے اور تحریر و کتابت سے بھی لگاؤ تھا' لیکن انھوں نے اس میدان میں بہت زیادہ جدوجہد نہیں کی' بس چند رسائل ان کی یادگار ہیں' اگرچہ وہ اپنے اندر اختصار کا پہلو لیے ہوئے ہیں تاہم بڑے مفید اور لائق اعتنا ہیں- وہ رسائل مندرجہ ذیل ہیں-

۱- اسلام میں گردش دولت: (اردو' انگریزی)
۲- حقیقت ذکر الٰہی-
۳- ادب محبت کا پہلا قرینہ ہے-
۴- قربت کی راہیں-
۵- اسلام اور آداب معاشرت (اردو' انگریزی)
۶- اس دنیا میں اللہ کا قانون جزا و سزا-
۷- خطبات جہاد-
۸- واقعہ کربلا-
۹- قرآن کے صدری و معنوی محاسن-
۱۰- تاریخ اسلام (عہد بنو امیہ و بنو عباس)
۱۱- سورۂ محمد' سورہ فتح اور سورہ حجرات کی تفسیر و ترجمہ-
۱۲- تعلیم و تزکیہ-
۱۳- اسلامی ریاست کے چند ناگزیر تقاضے (اردو' انگریزی)
۱۴- کتابت حدیث عہد نبوی میں-
۱۵- عہد حاضر میں استاذ اور شاگرد کا رشتہ-

ان رسائل کے مصنف شہیر کا نقطہ نظر یہ تھا کہ لوگوں کے پاس بڑی بڑی کتابیں پڑھنے کے لیے وقت نہیں ہے' اس لیے کسی موضوع پر چھوٹا سا رسالہ لکھنا چاہیے تا کہ کم سے کم وقت میں پڑھا جا سکے۔ یہ ان کا خیال تھا --- لیکن واقعہ یہ ہے کہ چھوٹا سا رسالہ محفوظ رہنا بہت مشکل ہے۔ پڑھ کر رکھا اور کاغذات میں گم ہو گیا۔ بڑی کتاب جلد کی تحویل میں آ جاتی ہے اور محفوظ رہتی ہے۔

اگر وہ تصنیف و تالیف کی طرف زیادہ عنانِ توجہ مبذول کرتے تو اس میدان میں بہت کامیاب رہتے' اس لیے کہ اللہ نے ان کو دلکش زبان اور خوب صورت اندازِ نگارش سے بھی نوازا تھا' علم و مطالعہ کی دولت بھی عطا فرمائی تھی' ذہانت و فطانت سے بھی بارگاہِ خداوندی سے انھیں بہرۂ وافر حاصل ہوا تھا اور قوت اظہار کا ملکہ بھی ودیعت فرمایا گیا تھا۔

ان کی ایک کتاب کا نام "حضرت مولانا داؤد غزنوی" ہے۔ یہ کتاب جو ۴۶۴ صفحات پر مشتمل ہے' درحقیقت بہت سے اہل قلم کے ان مضامین کا مجموعہ ہے جو انھوں نے مختلف عنوانات سے مولانا سید محمد داؤد غزنوی کے متعلق تحریر فرمائے۔ ان مضامین میں ایک طویل مضمون سید ابو بکر غزنوی کا ہے' جس میں انھوں نے اپنے آبا و اجداد کے حالات بیان کیے ہیں' یہ حالات مختصر ہونے کے باوجود اپنے اندر بڑی جامعیت رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے مختلف عنوانات سے متعلق مضامین و مقالات سپرد قلم کیے جو بعض مجلات و جرائد میں شائع ہوئے۔

تقریر و خطابت میں ان کا ایک خاص اسلوب تھا جو لوگوں کو متاثر کرتا تھا۔ اپنی تقریر کو وہ عام طور سے وعظ کہا کرتے تھے۔ تقریر اور مجلسی گفتگو میں قرآن کی آیات اور نبی ﷺ کی احادیث مبارکہ کثرت سے پڑھتے تھے۔ عربی' فارسی اور اردو کے بے شمار اشعار انھیں یاد تھے جو برمحل پڑھتے تھے اور نہایت صفائی اور وضاحت سے اپنے مافی الضمیر کا اظہار کرتے تھے۔

اپنی بات وہ بڑے زور اور خاص جذبے کے ساتھ سامعین تک پہنچاتے تھے' جس سے وہ اثر پذیر بھی ہوتے تھے اور مرعوب بھی۔ تقریر میں اگر اسلاف میں سے کسی بزرگ کا

کوئی واقعہ بیان کرنا مقصود ہوتا تو بالعموم عربی یا فارسی کے انہی الفاظ میں بیان کرتے جو اس واقعہ سے متعلق کسی کتاب میں ان کے مطالعہ میں آئے ہوتے۔ اصل الفاظ بیان کرنے کے بعد ان کا ترجمہ کرتے تاکہ سامعین پوری صورت حال سے آگاہ ہو سکیں۔

نہایت باحمیت اور خود دار اہل علم تھے اور بعض اوقات خود داری اپنے اصل دائرے اور حد سے آگے نکل جاتی تھی۔

میانہ قد' گول چہرہ' سرخ گندمی رنگ' کشادہ پیشانی' چوڑا سینہ' ناک نقشہ جاذب نظر' آنکھوں میں چمک' آواز میں کھنک' صاف ستھرا لباس اور بے حد نفاست پسند۔

ابتدا سے لے کر ایم۔ اے تک انھوں نے تعلیم حاصل کی۔ یہ ایک طویل مدت ہے جو سکول کے پہلے درجے سے لے کر یونیورسٹی کے آخری درجے تک پھیلی ہوئی ہے۔ اس اثنا میں اردو' عربی' فارسی اور انگریزی کے بہت سے اساتذہ سے انھوں نے حصول علم کیا۔ دینیات کے مختلف شعبوں کی کتابیں پڑھیں' لیکن انھوں نے کبھی نہیں بتایا کہ کس استاذ گرامی قدر سے کون سی کتاب پڑھی اور سکول یا کالج یا یونیورسٹی کے کس معلم یا پروفیسر سے زیادہ متاثر ہوئے یا دینی علوم کے کون بزرگ ان کے نزدیک کس علم میں کس مرتبے کے حامل تھے' یہی وجہ ہے کہ نہ ان کے اساتذہ کی تفصیل کا کسی کو علم ہے اور نہ یہ معلوم ہے کہ انھوں نے کس صاحب سے کیا پڑھا۔ گزشتہ سطور میں جن چند علمائے کرام اور اساتذہ عالی قدر کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ انھوں نے ان سے استفادہ کیا' اس کا پتا اس لیے چلا کہ یہ موجودہ دور سے تعلق رکھنے والے اہل علم کے سامنے کا معاملہ تھا' پھر ان حضرات کے اسمائے گرامی ان بعض مضامین میں بھی مندرج ہیں جو ان کی وفات کے بعد مختلف اصحاب قلم نے ان کے بارے میں لکھے اور اخبارات میں شائع ہوئے۔ ان اساتذہ گرامی میں سے بھی بعض نے ان کی زندگی میں یا ان کی وفات کے بعد اس کا ذکر کیا اور بتایا کہ وہ ان کے شاگرد تھے۔

وہ عربی اور اردو کے شاعر بھی تھے۔ اگرچہ انھوں نے خاص طور سے اس طرف توجہ نہیں کی اور بہت کم شعر کہے' تاہم ان کا جو کلام بعض اخبارات میں چھپا' وہ بڑا جان دار

ہے' مگر یہ معلوم نہ ہو سکا کہ ابتدا میں وہ کس شاعر سے اصلاح لیتے رہے۔عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ عام طور سے شاگرد اپنے اساتذہ کے بارے میں لوگوں کو بتاتے ہیں اور جن سے استفادہ کیا ہو ان کا تذکرہ کرتے ہیں' لیکن سید ابو بکر غزنوی اسے ضروری نہیں سمجھتے تھے اور واقعی یہ کوئی ضروری بات نہیں ہے کہ کسی کو اپنے اساتذہ کے بارے میں بہ ہر حال بتایا جائے۔

واقعہ یہ ہے کہ سید ابو بکر غزنوی کو اللہ نے بہت سی صلاحیتوں سے نوازا تھا' جہاں وہ علم وادراک' تقریر وخطابت اور تدریس وتعلیم میں اپنا ایک مقام رکھتے تھے' وہاں حسن وخوب صورتی کی دولت بھی بارگاہِ الٰہی سے انھیں عطا کی گئی تھی اور یہ وہ چیزیں تھیں جو انھیں اپنے آبا واجداد سے ورثے میں ملی تھیں۔

وہ بذلہ سنج' لطائف وظرافت کے ماہر' خوش کلام' خوش مزاج' دوستوں کے دوست اور حاضر جواب تھے۔عام گفتگو میں آسانی سے کسی کے قابو میں نہیں آتے تھے۔علمی بات کا جواب علم سے' شعر کا جواب شعر سے' لطیفے کا جواب لطیفے سے' طنز کا جواب' طنز سے اور تصوف سے متعلق بات کا جواب تصوف سے دیتے تھے۔

علم فلسفہ سے بھی انھیں دلچسپی تھی' چنانچہ مولانا محمد حنیف ندوی سے اس موضوع پر ان کی خوب گفتگو ہوتی تھی' اس لیے کہ مولانا فلسفے کے تمام پہلوؤں سے آگاہ تھے۔

کسی سے مرعوب ہونا اور کسی کے سامنے جھکنا ان کی خاندانی روایت اور ذاتی فطرت کے خلاف تھا۔ وہ وقار سے رہتے تھے اور اپنے مقام ومرتبے کو ملحوظ رکھتے تھے۔ اصحاب اقتدار کے پاس جانے سے احتراز کرتے تھے۔ان میں ایک خوبی یہ تھی کہ جس طرح اردو اور پنجابی میں روانی سے بات کرتے تھے' اسی طرح عربی' فارسی اور انگریزی میں بے تکلفی اور روانی سے گفتگو کرتے تھے۔مولانا ابوالکلام آزاد سے وہ نہایت متاثر تھے اور ان کے انتہائی مداح---! مولانا کے الہلال' البلاغ اور تذکرہ کے صفحات انھیں زبانی یاد تھے' غبار خاطر کا بہت سا حصہ ان کے نوک زبان تھا۔مولانا نے اپنی تصانیف میں عربی' فارسی اور اردو کے جو اشعار درج کیے ہیں' ان میں سے بہت سے اشعار انھوں نے اپنے ذہن میں

محفوظ کر لیے تھے۔ مولانا کی عبارتیں وہ اپنی تقریروں میں بے تکلفی سے استعمال کرتے تھے۔۔۔اور یہ ان کی ذہانت اور قوت حافظہ کا کمال تھا۔

بعض معاملات میں وہ نہایت سخت تھے یا یوں کہیے کہ بے حد باقاعدہ تھے۔ کسی کے ہاں جانا ہوتا تو اس سے وقت لے کر جاتے تھے، اطلاع دیے اور وقت مقرر کیے بغیر نہیں جاتے تھے۔ اسی طرح اگر کوئی ان کے ہاں آنا چاہے تو وقت مقرر کر کے آئے۔

سید ابوبکر غزنوی کی زندگی کو ہم دو عہدوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ پہلا عہد حصول علم، حصول ملازمت اور بعض دیگر مشغولیتوں کا تھا جو تقریباً ۱۹۶۰ء تک چلا۔ اس کے بعد دوسرا عہد شروع ہوا جس کے بہت سے گوشے پہلے عہد سے بالکل مختلف تھے۔ یہ ذکر الٰہی، وظائف واوراد، مجالس ذکر کے انعقاد، عبادت وتصوف، وعظ وتقریر، خطبات جمعہ کے التزام کا عہد تھا۔ اس عہد میں انھوں نے بڑی شہرت پائی اور ان کے ان اشغال سے بے شمار لوگوں نے فیض حاصل کیا۔

۱۶ دسمبر ۱۹۶۳ء کو مولانا سید محمد داؤد غزنوی نے وفات پائی تو ۱۷ دسمبر کو خاندان غزنویہ کا سربراہ بھی انھیں مقرر کیا گیا۔ دارالعلوم تقویۃ الاسلام کا اہتمام بھی ان کے سپرد ہوا اور یہ بڑی ذمہ داری تھی جسے وہ سرانجام دیتے رہے۔ یہ ان کے آبا واجداد کا قائم کردہ دارالعلوم تھا، جس کے انتظامی امور کو انھوں نے بہ طریق احسن انجام دیا۔

اب ان کی زندگی کے بالکل آخری دور میں آجایے۔

وہ ۱۹۷۶ء میں اسلامیہ یونیورسٹی بہاول پور کے وائس چانسلر تھے۔ اسی سال کے ماہ مارچ کے آخر میں کسی سرکاری کام سے لاہور آئے۔ اپریل میں لندن میں اسلامک فیسٹیول منعقد ہو رہا تھا۔ اس میں مقالہ پڑھنے کے لیے حکومت پاکستان کے وفد کے ساتھ (جس کے سربراہ اس زمانے کے مرکزی وزیر حج واوقاف مولانا کوثر نیازی تھے) لندن روانہ ہوئے۔ ۴، ۵ اپریل کی درمیانی شب کو لندن کی ایک سڑک عبور کرتے ہوئے، تیز رفتار کار کی زد میں آگئے۔ یہ حادثہ اتنا شدید تھا کہ ہنسلی ٹوٹ گئی، دونوں ٹانگیں ٹوٹ گئیں اور ریڑھ کی ہڈی بھی ٹوٹ گئی۔ اسی وقت انھیں لندن کے ویسٹ سنٹر ہسپتال میں داخل کرا دیا گیا اور اس

ہسپتال کے کنگ جارج وارڈ میں ان کا علاج شروع ہوا۔

اس سے تھوڑی دیر بعد (غالباً) ڈاکٹر محمد راشد رندھاوا کو لندن سے بذریعہ ٹیلی فون اس حادثے کی اطلاع آئی۔ دوسرے دن کے اخبارات میں جلی سرخیوں کے ساتھ یہ خبر شائع ہوئی، جس سے ان کے متعلقین و احباب انتہائی تشویش سے دوچار ہوئے اور ان کی صحت کے لیے بے شمار لوگوں نے اللہ سے دعائیں کیں۔

لندن میں جانے والے سرکاری وفد کے ساتھ مشہور پبلشر شیخ محمد اشرف بھی شامل تھے اور جس دن یہ حادثہ ہوا اس دن وہ وہیں تھے اور ابوبکر صاحب کا پتا لینے ہسپتال گئے تھے۔ انھوں نے واپس آ کر بتایا کہ ضربیں نہایت شدید اور خطرناک ہیں، لیکن وہ ہوش میں ہیں اور باتیں کرتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ نماز کے لیے نہ وہ تیمم کر سکتے ہیں، نہ وضو کا کوئی انتظام ہے، نہ طہارت ہو سکتی ہے، اس لیے وہ چاہتے ہیں کہ ان کی اہلیہ یہاں آ جائیں تو کسی حد تک یہ پریشانی رفع ہو سکتی ہے --- لیکن جلدی سے ان کی اہلیہ محترمہ کے وہاں جانے کا انتظام نہ ہو سکا۔ شیخ صاحب نے یہ بھی بتایا کہ وہ کہتے تھے میں حج بیت اللہ کے لیے گیا اور بالکل تندرست رہا۔ یورپ کے کسی ملک میں پہلی دفعہ آیا ہوں تو یہ حالت ہو گئی ہے۔

ڈاکٹروں نے انتہائی محنت اور توجہ سے ان کا علاج کیا، جس کی اطلاع لاہور کے اخبارات میں روزانہ آتی رہی۔ لیکن ۲۴ اپریل ۱۹۷۶ کو اسی ہسپتال میں ان کا انتقال ہو گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

اس سانحہ کی خبر نمایاں سرخیوں کے ساتھ اخبارات میں شائع ہوئی۔

۲۹ اپریل کو پی آئی اے کے جہاز سے ان کی میت لاہور پہنچنا تھی۔ اسی روز اخبار ''امروز'' میں جو اس زمانے کا ایک بڑا اخبار تھا، ان کے متعلق میرا مضمون شائع ہوا جو اس سے ایک دن پیشتر اس کے ایڈیٹر حمید جہلمی کے کہنے سے میں نے لکھا تھا۔ اسی دن ریڈیو پاکستان لاہور میں ان کے حالات میں میری تقریر نشر ہوئی۔ اس طرح اس فقیر کو یہ سعادت حاصل ہے کہ اس نے ان کی وفات کے بعد سب سے پہلے ان پر اخبار میں مضمون لکھا اور ریڈیو میں تقریر کی۔

دن کو گیارہ بجے کے قریب ان کی عارضی اقامت گاہ دارالعلوم تقویۃ الاسلام میں تابوت میں بند ان کی میت پہنچی تو میں وہیں تھا۔ دارالعلوم کا ہال عورتوں اور مردوں سے بھرا ہوا تھا اور ایک کہرام بپا تھا۔ جو حضرات دارالعلوم کے صدر دروازے سے پی آئی اے کی ایمبولینس سے ان کی میت اٹھا کر ہال میں لائے' ان میں سب سے آگے ایک طرف میرے اور ان کے مرحوم دوست حمید المکی تھے اور دوسری طرف مشتاق صاحب تھے۔

تابوت رکھنے کو کہیں جگہ نہ تھی اور لوگ ان کا چہرہ دیکھنے کے لیے بے تاب تھے۔ حزن و ملال کے عالم میں میں وہیں کھڑا تھا کہ حمید المکی مرحوم نے مجھے آواز دی۔

بھٹی صاحب! خدا کے لیے ہماری مدد کیجئے' ان لوگوں کو پیچھے ہٹایئے تا کہ ہم تابوت نیچے رکھ سکیں۔

لوگوں کو بڑی مشکل سے پیچھے ہٹا کر تابوت کے لیے جگہ بنائی گئی۔ لائنیں بنا کر شیشے کے اندر سے لوگوں نے چہرہ دیکھا' بالکل پہلے کی طرح تھا۔ چہرہ اب بھی آنکھوں کے سامنے ہے۔

نماز مغرب کے بعد جنازہ اٹھایا گیا۔ تابوت کے ساتھ لمبے لمبے بانس باندھے گئے تھے تا کہ زیادہ سے زیادہ لوگ کندھا دے سکیں یا کم از کم بانسوں ہی کو ہاتھ لگا سکیں۔ لاہور کے لوگوں کے علاوہ مختلف مقامات سے بے شمار لوگ جنازے میں شرکت کے لیے کاروں' اور بسوں پر آئے تھے۔ بسوں کی چھتوں پر بھی لوگ بیٹھے تھے اور آیات قرآنی پڑھ رہے تھے۔ جنازہ یونیورسٹی گراؤنڈ میں سید ابوبکر غزنوی کے بڑے بھائی مولوی عمر فاروق غزنوی کے کہنے سے مولانا معین الدین لکھوی نے پڑھایا تھا۔ گراؤنڈ لوگوں سے بھر گئی تھی۔ اس سے باہر بھی بے شمار لوگ بائیں اور دائیں جانب کی سڑکوں پر کھڑے تھے۔ ہر حلقۂ فکر کے لوگ جنازے میں شامل تھے۔

میرے دائیں جانب ایس اے رحمان تھے جو اس وقت سپریم کورٹ کے جج تھے اور بائیں جانب پاکستان کے مشہور صحافی م ش (میاں محمد شفیع) تھے۔ م ش مرحوم نے مجھے کہا بہت بڑی تعداد میں لوگ جنازے میں شریک ہوئے ہیں۔ جسٹس ایس اے رحمان نے

(جو خود بھی اہل حدیث تھے) مسکراتے ہوئے جواب دیا:

میاں صاحب! آپ بھی وہابی ہو جایئے' اسی کثرت کے ساتھ لوگ آپ کے جنازے میں شریک ہوں گے۔

لاؤڈ سپیکر کا انتظام تھا اور علامہ احسان الٰہی ظہیر مرحوم لوگوں کو صفوں میں کھڑے ہونے کی تلقین کر رہے تھے۔ سنت کے مطابق جنازہ اونچی آواز میں پڑھا گیا تھا۔ امام جنازہ مولانا معین الدین لکھوی نے نہایت خشوع و خضوع کے ساتھ کئی دعائیں پڑھیں جو مختلف احادیث میں مروی ہیں۔

غزنوی خاندان کے اس عظیم فرزند کو قبرستان میانی صاحب میں ان کے والد مکرم مولانا سید محمد داؤد غزنوی کے پہلو میں دفن کیا گیا۔ انھوں نے ۴۹ برس عمر پائی--- جب سے میرا ان سے تعلق ہوا' میں انھیں ''ابوبکر صاحب'' کہا کرتا تھا۔ اس مضمون میں بھی ان کے لیے زیادہ تر یہی لفظ استعمال کیا گیا ہے۔

مجھے یاد پڑتا ہے ان کی شادی ۱۹۵۸ میں ہوئی تھی۔ ان کے دو بیٹے ہیں' بڑے سید جنید غزنوی اور چھوٹے حماد غزنوی---!

جنید کاروبار کرتے ہیں اور دارالعلوم میں جمعہ بھی پڑھاتے ہیں۔ حماد نے صحافتی لائن اختیار کر لی ہے اور وہ آج کل انگریزی اخبار ''دی نیشن'' سے منسلک ہیں۔ سید جنید غزنوی نے کئی دفعہ مجھ سے اس خواہش کا اظہار کیا ہے کہ میں دو کتابیں تصنیف کر دوں۔ ایک کتاب سید ابوبکر غزنوی کے حالات میں اور دوسری حضرت مولانا سید عبداللہ غزنوی سے لے کر تمام خاندان غزنویہ کے علما و اکابر کے حالات میں---!

میں نے یہ خدمت انجام دینے کا ان سے وعدہ بھی کیا اور کام شروع بھی کر دیا' لیکن افسوس ہے تکمیل کو نہیں پہنچا۔

یہاں یہ عرض کر دوں کہ غزنوی اور لکھوی دو خاندانوں سے اس فقیر کو بے حد عقیدت ہے۔ میرے اکابر ان خاندانوں کے اکابر کے فیض یافتہ تھے۔ غزنوی خاندان کے اس وقت سب سے زیادہ عمر کے رکن سید عثمان غزنوی ہیں جو حضرت مولانا سید محمد داؤد غزنوی

کے بھتیجے اور حافظ محمد سلیمان غزنوی مرحوم کے صاحب زادے ہیں۔ انھوں نے اپنے خاندان کے بہت سے اکابر کو دیکھا ہے اور نہایت شوق اور خاص جذبے کے ساتھ ان کے حالات بیان کیا کرتے ہیں، وہ مجھے کہا کرتے ہیں کہ میں تمھیں خاندان غزنویہ ہی کا فرد سمجھتا ہوں، اس لیے کہ تمھیں اس خاندان سے قلبی محبت ہے اور تم ان کے حالات سے باخبر ہو اور حالات بیان بھی کرتے ہو--- یہ ان کی اس فقیر پر شفقت کا اظہار ہے اور میں اس پر ان کا نہایت شکر گزار ہوں۔[1]

تیسرا خاندان جس کے اکابر نے ان دونوں سے استفادہ کیا، روپڑی خاندان ہے اور مجھے یہ سعادت حاصل ہے کہ میں نے ان تینوں خاندانوں کے بزرگان عالی قدر پر لکھا ہے اور نہایت عقیدت سے لکھا ہے اور کسی کے کہے بغیر اپنے شوق اور پیار کے جذبات سے لکھا ہے جس کی تفصیل کچھ اس طرح ہے۔

میرے سلسلۂ "فقہائے ہند" کی اس جلد میں جو تیرھویں صدی ہجری کے برصغیر کے علما و فقہا کے حالات پر مشتمل ہے، حضرت مولانا سید عبداللہ غزنوی سے متعلق کم و بیش ۸۰ صفحات کا مضمون ہے، جس میں اس فقیر نے پورے خاندان غزنویہ کے علما کی تاریخ بیان کرنے کی سعی کی ہے۔ اس میں ان بہت سے حضرات کا تذکرہ بھی آ گیا ہے، جنھوں نے ان سے استفادہ کیا۔ یہ کتاب ادارہ ثقافت اسلامیہ کی طرف شائع ہوئی تھی اور سید عثمان غزنوی صاحب نے اس کتاب کا مطالعہ کر کے ازراہ کرم نہایت مسرت کا اظہار کیا تھا اور اس کے پچاس یا ساٹھ نسخے خریدے تھے، وہ اسے دارالعلوم تقویۃ الاسلام کے نصاب میں شامل کرنا چاہتے تھے۔

اسی کتاب میں حضرت مولانا غلام رسول (قلعہ میہاں سنگھ) پر بھی میں نے ایک طویل مضمون لکھا تھا، اس کی ضخامت بھی ۸۰ صفحات کے لگ بھگ تھی۔ وہ حضرت سید عبداللہ غزنوی کے دوست اور مرید تھے۔ مناسب مواقع اور مختلف مقامات میں اس مضمون میں بھی

---

[1] افسوس ہے ان سطور کی تحریر سے چند روز بعد سید عثمان غزنوی ۲۴ جولائی ۲۰۰۱ کو وفات پا گئے۔

حضرت سید عبداللہ غزنوی رحمۃ اللہ علیہ کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

پھر اپنی کتاب ''نقوش عظمت رفتہ'' میں مولانا سید محمد داؤد غزنوی پر اپنی دانست میں بھرپور مضمون لکھا ہے جو کتاب کے ۱۱۲ صفحات کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔

اسی طرح ہفت روزہ ''الاعتصام'' کی بعض اشاعتوں میں مولانا سید داؤد غزنوی کے چچا زاد بھائی مولانا اسماعیل غزنوی اور ان کے برادر صغیر حافظ سلیمان غزنوی پر میرے مضامین شائع ہو چکے ہیں۔

زیر مطالعہ مضمون کا تعلق سید ابوبکر غزنوی سے ہے۔ ان سے متعلق پنجاب یونیورسٹی کے انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کے لیے بھی اس کے ارباب انتظام کی طلب پر مقالہ بھیج چکا ہوں۔

اب لکھوی خاندان کی طرف آیئے۔

سب سے پہلے حضرت حافظ محمد لکھوی سے متعلق مجھ سے انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کے مرحوم چیئرمین ڈاکٹر سید عبداللہ نے مقالہ لکھوایا جو شائع ہو چکا ہے۔ علاوہ ازیں بہت عرصہ ہوا حافظ محمد صاحب لکھوی پر روزنامہ ''امروز'' میں میرا ایک مضمون دو یا تین قسطوں میں چھپا تھا۔ حضرت حافظ محمد لکھوی رحمۃ اللہ علیہ کے والد گرامی حضرت حافظ بارک اللہ لکھوی پر میں نے اپنی کتاب فقہائے پاک و ہند کی آٹھویں جلد میں طویل مضمون لکھا۔

پھر اپنی کتاب ''بزم ارجمنداں'' میں مولانا محمد علی لکھوی اور مولانا معین الدین لکھوی کے حالات میں مضامین تحریر کیے۔ اس کتاب میں جو قارئین کے پیش نگاہ ہے' مولانا محی الدین لکھوی اور ان کے فرزند کبیر مرحوم حافظ محمد لکھوی سے متعلق دو الگ الگ مضامین شائع ہوئے ہیں۔

غزنوی اور لکھوی خاندانوں سے فیض یافتہ روپڑی خاندان ہے' جس کے علمائے کرام کی تدریسی اور تبلیغی خدمات سے لاتعداد علما و طلبا مستفید ہوئے۔ اس خاندان کے عالم کبیر مولانا حافظ عبداللہ روپڑی سے متعلق میری کتاب ''بزم ارجمنداں'' میں کئی صفحات پر مشتمل مضمون معرض اشاعت میں آیا۔ پھر زیر نظر کتاب میں مولانا حافظ محمد حسین روپڑی' حافظ عبدالرحمٰن

روپڑی اور حافظ عبدالقادر روپڑی پر مضامین مندرج ہیں- حافظ اسماعیل روپڑی مرحوم کے حالات میں کئی سال پہلے میں نے ''الاعتصام'' میں مضمون لکھا تھا-

پنجاب کے اہل حدیث کا ایک خاندان قصوری خاندان ہے' جس کے سربراہ اعلیٰ مولانا عبدالقادر قصوری تھے- اس خاندان سے متعلق ''قصوری خاندان'' کے نام سے میری کتاب جو اس موضوع کی اولین کتاب ہے' چھپ چکی ہے- یہ کتاب ۱۹۹۴ میں دارالعلوم تعلیم الاسلام ماموں کانجن کی طرف سے میرے مرحوم دوست قاضی محمد اسلم سیف نے شائع کی تھی-

عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ یہ فقیر غزنوی خاندان' لکھوی خاندان' روپڑی خاندان' قصوری خاندان کے متعدد اکابر کے حالات ضبط کتابت میں لاچکا ہے-

زندگی رہی تو ان شاء اللہ اپنے محدود علم و مطالعے کی روشنی میں ان تمام خاندانوں سے تعلق رکھنے والے مزید علمائے کرام کے واقعات و کوائف سے اپنے کرم فرماؤں کو روشناس کرانے کی کوشش کی جائے گی-

اللھم وفقنا لما تحب و ترضاہ

سید ابوبکر غزنوی کے بارے میں میری گزارشات ختم ہوئیں- اس سے آگے اپنے عزیز دوست پروفیسر ڈاکٹر محمد یحییٰ (صدر شعبہ اسلامیات انجینئرنگ یونیورسٹی' لاہور) کے وہ واقعات تھوڑے سے ردوبدل کے ساتھ تقریباً انہی کے الفاظ میں درج کیے جارہے ہیں جو انھوں نے میری طلب پر تحریری صورت میں مجھے بھجوائے- ان واقعات سے جہاں یہ پتا چلتا ہے کہ ابوبکر صاحب ان سے کس درجہ مشفقانہ تعلق رکھتے تھے اور مختلف حالات میں ان پر کتنا اعتماد کرتے تھے' وہاں ان کی زندگی کے بعض نئے پہلو بھی نظر و بصر کے زاویوں میں آتے ہیں- ملاحظہ فرمایئے:

۱- ۱۹۶۳ کے غالباً مئی کا مہینا تھا- اسلامیہ کالج سول لائنز کی عربی فارسی سوسائٹی نے یو اے آر (یونائیٹڈ عرب ریپبلکن) مصری ادارے کے تعاون سے اس کے ڈائریکٹر کے اعزاز میں تقریب کا اہتمام کیا' جس کا وقت بعد دوپہر مقرر کیا گیا تھا-

سوئے اتفاق سے ان دنوں سید ابوبکر غزنوی کے والد محترم حضرت مولانا سید محمد داؤد غزنوی گلاب دیوی ہسپتال (لاہور) میں زیر علاج تھے اور پروگرام کے دن ان کی طبیعت کچھ زیادہ ناساز تھی۔ سید ابوبکر صاحب نے سارا پروگرام میرے سپرد کیا' میں اس وقت اسلامیہ کالج میں بی-اے سال دوم کا طالب علم تھا اور عربی فارسی سوسائٹی کا جنرل سیکرٹری تھا۔ سید ابوبکر غزنوی صاحب کو اپنے والد مکرم کی تیمار داری کے لئے ہسپتال جانا تھا' اس لیے طے پایا تھا کہ عربی بات چیت کا سلسلہ حافظ احمد یار (مرحوم) چلائیں گے۔

اس وقت اسلامیہ کالج کے پرنسپل پروفیسر حمید احمد خان مرحوم تھے۔ خاں صاحب سید ابوبکر غزنوی صاحب کا نہایت احترام کرتے تھے اور غزنوی صاحب بھی ان کی بے حد تک تکریم بجالاتے تھے۔ حمید احمد خاں اس پروگرام میں مہمان خصوصی تھے' چنانچہ پروگرام کے دن پروفیسر حمید احمد خاں صاحب' وقت مقررہ پر تشریف لائے۔ یو اے آر (یونائیٹڈ عرب ری پبلکن) کے ارکان بھی پہنچ گئے۔ خاں صاحب نے مجھ سے پوچھا کہ غزنوی صاحب کہاں ہیں؟ میں نے بتایا کہ ان کے والد صاحب گلاب دیوی ہسپتال میں زیر علاج ہیں اور ان کی طبیعت زیادہ ناساز ہے' اس لیے انھیں ہسپتال جانا تھا۔ خاں صاحب نے مجھے حکم دیا کہ آپ میری گاڑی پر غزنوی صاحب کی خدمت میں جائیں اور ان سے عرض کریں کہ تھوڑی دیر کے لیے اسی گاڑی پر تشریف لے آئیں اور پھر اسی گاڑی پر تشریف لے جائیں۔

میں ڈرتے اور سہمتے ہوئے سید ابوبکر غزنوی صاحب کی خدمت میں دارالعلوم تقویۃ الاسلام آیا اور دروازے پر دستک دی' وہ باہر آئے اور میں نے آمد کا مقصد بیان کیا۔ فرمایا: بھائی میں نے آپ کو کہا بھی تھا کہ میری مجبوری ہے' سارا پروگرام خود ہی سنبھال لینا۔ پھر میرے پاس آنے کی کیا ضرورت تھی۔

اس کے بعد پروفیسر حمید احمد خاں کی گاڑی میں ہمارے ساتھ تقریب میں تشریف لے آئے اور آتے ہی خاں صاحب سے سامنا ہوا تو بڑے جلال سے قرآن کی یہ آیت پڑھی -- شَهِدَ شَاهِدٌ مِنْ اَهْلِیْ (یہاں "اھلہا" کو لفظ "اھلی" میں بدلتے ہوئے میری

طرف اشارہ کیا)

یہ (یعنی یحییٰ) میرا اپنا آدمی ہے اس نے جو کچھ میرے والد کے متعلق آپ کو بتایا ہے وہ غلط نہیں۔

مجھے وہ منظر یاد ہے کہ پروفیسر حمید احمد خاں نے مولانا داؤد غزنوی کی بیماری کا سن کر ہمدردی کا اظہار کیا اور کوئی دوسرا لفظ زبان سے نہیں نکالا۔

بہر حال تقریب شروع ہوئی۔ تلاوت قرآن کے بعد سید ابوبکر غزنوی نے عربی زبان میں استقبالیہ اور ترحیبی تقریر کی۔ تقریر فی البدیہہ تھی، مگر نہایت جامع اور مربوط۔ یو اے آر کے ڈائریکٹر فرید الدین نے جو کہ نسلاً عرب تھے اور عرب کے بہت بڑے عالم تھے، اپنے جوابی کلمات میں بالوضاحت اعتراف کیا کہ مجھے اپنے پاکستان اور ہندوستان کے قیام کے دوران جن عربی دان حضرات سے ملاقات کے مواقع ملے ہیں، ان سب میں سید ابوبکر غزنوی پہلے شخص ہیں جو اہل زبان کی طرح عربی بولتے ہیں، جن کے لہجے اور تعبیر میں صحیح عربی زبان کے طالب علم کی جھلک موجود ہے۔

تقریر کے بعد سید ابوبکر غزنوی واپس دار العلوم تشریف لے آئے، کیونکہ انھیں اپنے والد کی خدمت میں گلاب دیوی ہسپتال جانا تھا۔ باقی پروگرام حافظ احمد یار صاحب نے تکمیل کو پہنچایا۔

۲۔ ۱۹۷۴ء کے موسم گرما کی تعطیلات ہوئیں تو ایک روز مجلس ذکر کے بعد چودھری عبدالحفیظ کے دولت کدہ پر راقم الحروف، ڈاکٹر محمد راشد رندھاوا، چودھری عبدالحفیظ، ملک غلام مرتضیٰ، ڈاکٹر خواجہ صادق حسین، ڈاکٹر منور حیات، میاں سلمان اور سید ابوبکر غزنوی اکٹھے ہوئے۔ مختلف قسم کی باتیں ہوئیں اور طے پایا کہ میاں سلمان صاحب نے خانسپور ایوبیہ میں جو بیرک خریدی ہے گرمی کی ان چھٹیوں میں کچھ وقت وہاں گزارا جائے اور یک سوئی کے ساتھ کچھ دن اللہ کا ذکر کیا جائے۔ خانسپور ایوبیہ ایک پُرفضا مقام ہے۔ مری کی نسبت سطح سمندر سے زیادہ بلند۔ ہر قسم کا انتظام سلمان صاحب کے ذمے تھا۔ بندہ عاجز اور چودھری عبدالحفیظ کو "ہراول دستے" کے طور پر کچھ خورد و نوش اور گرم کپڑوں کے ساتھ ایک روز پہلے

روانہ ہونے کو کہا گیا۔

راقم الحروف اور چودھری عبدالحفیظ تمام ساتھیوں کا سامان وغیرہ لے کر عازم خانسپور ہوئے۔ رات راولپنڈی میں میرے عزیزوں کے ہاں بسر کی اور اگلے روز علی الصبح خانسپور ایوبیہ کے لیے بس پر سامان لادا اور روانہ ہو گئے۔ راستے میں مری کو عبور کر کے بلند و بالا پہاڑوں کے راستے سے سخت بارش اور طوفان باد و باراں میں آہستہ آہستہ ہم ایوبیہ پہنچے۔ سلمان صاحب کی بیرک میں سامان رکھا اور کچھ کھانے پینے کا انتظام کیا۔

ادھر ابوبکر صاحب اور ان کے باقی ساتھی ڈاکٹر منور حیات صاحب کی ذاتی کار میں اسی روز شام کو خانسپور ایوبیہ پہنچ گئے۔ مغرب کی نماز کے بعد رات کا کھانا کھایا' کچھ آئندہ کے پروگرام کے متعلق باتیں ہوئیں اور عشا کی نماز کے بعد تھکاوٹ کی وجہ سے فوراً سو گئے۔ وہاں ہمارا یہ معمول ہوتا تھا کہ فجر کی نماز کے بعد سید ابوبکر صاحب ہمیں معرفت الٰہی کے متعلق وعظ فرماتے اور حقیقت ذکر الٰہی کا درس دیتے۔ اس کے بعد چائے کا دور چلتا اور پھر اپنے اپنے اوراد و وظائف کے لیے کچھ وقت نکالتے' دوپہر کا کھانا ظہر کی نماز کے متصل ہوتا تھا اور پھر کچھ دیر قیلولہ کرتے۔ عصر کی نماز کے بعد سیر کے لیے نکل جاتے۔ ہر شخص کو اجازت تھی کہ جدھر چاہے سیر کے لیے جائے۔

ایک دن میں' ڈاکٹر ملک مرتضیٰ' چودھری عبدالحفیظ' ڈاکٹر منور حیات اور میاں سلمان ''پنج تن پاک'' کا یہ قافلہ ایک چشمہ دیکھنے گیا' جو پہاڑوں کے اندر نشیبی جگہ پر تھا۔ ہم بیرک سے کوئی دو سو قدم باہر نکلے ہوں گے کہ کالی گھٹا اٹھی جو دیکھتے ہی دیکھتے پورے آسمان پر چھا گئی۔ ڈاکٹر منور حیات نے موسم کے تیور بھانپ لیے اور واپس بیرک میں چلے گئے۔ ہمیں بھی کہا کہ ایسے پہاڑوں میں ایسی گھٹاؤں میں باہر نہیں نکلنا چاہیے' یہ گھٹائیں جب برستی ہیں تو خوب برستی ہیں۔ ہماری جوانی کے جذبے نے ڈاکٹر صاحب کے مشوروں کو ماننے سے انکار کر دیا۔۔۔ ڈاکٹر صاحب واپس چلے گئے اور ہم چاروں اس چشمے کی طرف چل پڑے۔ ہم نے چشمے پر جا کر ٹھنڈا میٹھا پانی پیا اور کچھ دیر وہاں بیٹھے۔ اتنے میں موسلا دھار بارش شروع ہو گئی اور اس زور سے برسی کہ چاروں طرف سے برساتی نالے بھر کر زور شور

سے بہنے لگے۔ ہم چاروں کے پاس ایک ہی چھتری تھی۔ چنانچہ ہم چاروں آمنے سامنے کھڑے ہو کر ایک دوسرے سے معانقے کے بعد "مباطنہ" کرنے لگے اور "یک جان چہار قالب" کی صورت بن گئے۔ ہمارے لیے ایسے طوفانی موسم میں واپس آنا ممکن نہ تھا' اس لیے کہ راستے میں کئی طوفانی نالے بہہ رہے تھے اور کئی جگہ تو نوے درجے کے زاویے میں پانی اس زور سے گر رہا تھا کہ بڑے بڑے درخت جڑوں سے اکھڑ رہے تھے۔ میاں سلمان صاحب نے مشورہ دیا کہ بارش تھمنے کے کم از کم ایک گھنٹا بعد تک ہمیں یہیں رہنا چاہیے۔ پانی کا بہاؤ ختم ہو جائے تو یہاں سے روانہ ہونا چاہیے۔ خطرہ ہے کہ کسی نالے کے پانی کے ریلے کی زد میں نہ آ جائیں۔

ادھر ڈاکٹر منور حیات نے سید ابوبکر غزنوی کو ہمارے متعلق بتایا کہ ہم لوگ چشمے پر گئے ہیں۔ یہ سن کر وہ بہت پریشان ہوئے۔ طوفان باد و باراں اور پھر شام بھی ہو رہی تھی۔ وہ بڑے بے چین تھے اور تشویش کے سوا کچھ نہ کر سکتے تھے۔ البتہ ہمارے لیے دعائیں کرتے رہے اور نہایت اخلاص سے رو رو کر اللہ سے تعالیٰ سے ہماری عافیت کے طالب ہوئے۔ بہرحال اللہ تعالیٰ نے کرم کیا اور ہم خیر و عافیت سے واپس بیرک میں پہنچے تو غزنوی صاحب نہایت خوش ہوئے اور فرمایا دیکھو جب ڈاکٹر صاحب نے آپ لوگوں سے واپس آنے کو کہا تھا تو آپ کو ان کی بات مان لینی چاہیے تھی۔ بہرحال مفنی ما مضیٰ گرم چائے اور گرم پکوڑوں سے ہماری تواضع کی اور گرم کپڑے پہننے کی ہدایت کی۔

اس طرح پروگرام کے مطابق ہم لوگوں نے وہاں ایک ہفتہ قیام کرنا تھا اور اس کے بعد غزنوی صاحب کے اہل خانہ نے وہاں پہنچنا تھا اور تعطیلات وہیں گزارنا تھیں۔ اتفاق سے اس سال بارش معمول سے زیادہ ہوئی اور ہمارے خانسپور کے قیام کے دوران پہاڑوں میں تودے گرنے سے راستے بند ہو گئے اور غزنوی صاحب کے اہل خانہ پروگرام کے مطابق راستے بند ہونے کی وجہ سے نہ پہنچ سکے۔ ڈاکٹر حضرات اتنا وقت نہیں نکال سکتے تھے' وہ اپنے پروگرام کے مطابق نتھیا گلی اور ایبٹ آباد کے راستے سے ڈاکٹر منور حیات صاحب کی کار پر واپس آ گئے اور مجھے غزنوی صاحب نے یہ کہہ کر روک لیا کہ ان کے ساتھ

بات چیت کے لیے کسی شخص کو تو رہنا چاہیے۔

چنانچہ میں اور غزنوی صاحب ایک ہفتہ ان کے اہل خانہ کے انتظار میں خانسپور رکے۔ اس دوران ہم نے موڑتو یہ کا سفر بھی کیا جہاں ان کے ہم زلف کرنل صلاح الدین بہ سلسلہ ملازمت مقیم تھے۔ ان سے ملاقات اور وائرلیس کے ذریعے پتا چلا کہ غزنوی صاحب کے اہل خانہ پہنچ رہے ہیں۔ اب ہمارا معمول یہ ہوتا تھا کہ عصر کی نماز کے بعد سیر کو نکل جاتے اور مغرب کی نماز تک سیر کرتے۔ غزنوی صاحب کو پہاڑوں سے طبعی مناسبت تھی' وہ ہر سال پہاڑوں پر ضرور جاتے اور چند روز وہاں قیام کرتے۔ جب سیر کو جاتے تو غزنوی صاحب بہت سی باتیں کرتے۔ پند و نصائح کے ساتھ ہنسی مذاق بھی رہتا' وہ مجھ پر نہایت شفقت فرماتے تھے۔

ایک روز ہم سیر کو نکلے تو باتوں باتوں میں مجھ سے پوچھا۔ بھئی کیا کچھ پڑھا ہے؟ (وہ میری تعلیم کے بارے میں جانتے تھے صرف ڈویژن پوچھنا چاہتے تھے) میں نے عرض کیا حضرت ایم اے عربی اور ایم اے اسلامیات۔۔۔! کہنے لگے ایم اے اسلامیات میں ڈویژن کون سی ہے؟ عرض کیا فرسٹ ڈویژن۔ فرسٹ ڈویژن کا لفظ سن کر ان کا چہرہ کھل اٹھا اور قہقہے کے ساتھ بے ساختہ فرمایا تو پھر کام بن گیا!

''تو پھر کام بن گیا!'' کا میں بالکل مطلب نہ سمجھ پایا۔ نہایت ادب سے عرض کیا' حضرت میں کچھ سمجھا نہیں۔ کہنے لگے ہمارے ہاں یعنی شعبہ علوم اسلامیہ انجینئرنگ یونیورسٹی (لاہور) میں' اسلامیات کے اساتذہ کی بھرتی کے لیے دو پوسٹیں پیدا ہو رہی ہیں اور یونیورسٹی ٹیچر کے لیے متعلقہ مضمون میں فرسٹ ڈویژن ہونا ضروری ہوتا ہے اور یہ شرائط آپ پوری کرتے ہیں' اس لیے آپ کو ہم اپنے شعبے میں رفیق کار کے طور پر رکھیں گے۔ یہ باتیں سن کر میری خوشی کی انتہا نہ رہی کہ اس محسن کے ساتھ جن کی صحبت میں ۱۹۶۱ سے اب تک چودہ سال کا عرصہ گزر چکا تھا' اب مجھے ان کے رفیق کار ہونے کا بھی موقعہ مل جائے گا۔

یونیورسٹی میں غزنوی صاحب کے پاس میرا آنا جانا تھا۔ ہر جمعرات کو مجلس ذکر میں

حاضر ہوتا اور پھر ٹریننگ کے لیے مجھے دو سال یعنی ۱۹۷۳ء ۱۹۷۴ء تک جز وقتی استاد بھی رکھا۔ یہ سب ان کی شفقت اور اعتماد تھا جو وہ بندہ عاجز پر کرتے تھے۔

ان کے اہل خانہ خانسہور پہنچے تو مجھے پند و نصائح کے ساتھ روانہ کیا اور کہا اب آپ لاہور جائیں' لاہور میں ملاقات ہوگی اور باقی پروگرام وہیں بنائیں گے۔ البتہ ایک ضروری وظیفہ کرنے کو بتایا کہ ہر روز "حسبی اللہ و نعم الوکیل" ۳۱۳ دفعہ اول آخر درود شریف کے ساتھ پڑھا کریں اور اس پر استمرار کریں۔

اب میں واپس لاہور آیا تو بتائی ہوئی تعداد سے زیادہ بار بار پڑھنے لگا کہ سب کام جلدی اور آسانی سے ہو جائیں۔ جب غزنوی صاحب واپس تشریف لائے تو ملاقات پر سب سے پہلے وظیفے سے متعلق پوچھا کہ کیسا چل رہا ہے؟ عرض کیا حضرت میں تو لاتعداد دفعہ پڑھتا ہوں۔ سن کر بڑے منطقی طریقے سے سمجھایا کہ بھئی یہ وظائف روحانی غذا ہوتے ہیں اور اگر ان کو Over Doze کر لیا جائے تو بجائے فائدے کے نقصان ہو سکتا ہے۔ جتنا آپ کو بتایا تھا اتنا ہی پڑھا کرو اور آئندہ یہ بات پلے باندھ لو کہ جس طرح ڈاکٹر کہے اسی طرح دوا استعمال کیا کرو۔

۳۔ ۱۹۷۵ء کے آخر میں ایک دن اپنے شعبہ علوم اسلامیہ انجینئرنگ یونیورسٹی میں دوپہر کو میں' غزنوی صاحب' چودھری عبدالحفیظ اور حافظ محمد ایوب چائے پی رہے تھے۔

یہاں یہ بھی بتا دوں کہ یونیورسٹی میں مجھے وہ اپنے رفیق کار (Coeque) سے زیادہ اپنا عزیز اور بھائی سمجھتے تھے۔ دوپہر کی چائے اور خورد و نوش کا انتظام میرے ذمے تھا اور ٹھیک گیارہ بجے وہ اپنے خاص لہجے میں آواز دیتے:۔۔۔"یحیٰ"

میں ان کے مزاج سے اچھی طرح واقف تھا۔ گیارہ بجے کھانے پینے کی تمام چیزیں سجا کر پیش کرتا تو نہایت خوش ہوتے۔ چائے میں ہمارے شعبے کے تمام اساتذہ شامل ہوتے تھے۔

ایک دن فرمانے لگے کہ ملک غلام نبی نے جو اس وقت وزیر تعلیم تھے' مجھے کہا ہے کہ ہم آپ کو اسلامیہ یونیورسٹی بہاول پور کا وائس چانسلر مقرر کرنے لگے ہیں۔ میں نے ان سے کہا

ہے کہ بھائی میں عزلت پسند آدمی ہوں۔ ان ہنگاموں میں پڑنا نہیں چاہتا۔ میرا کام کرنے کا ایک انداز ہے اور وہ میں اپنے انداز سے کر رہا ہوں۔۔۔ مگر اصرار ان کی طرف سے زیادہ ہے' کیا کرنا چاہیے؟ گویا یہ ہم لوگوں سے ایک مشورہ لیا جا رہا تھا جو ان کی عظمت کو ظاہر کرتا ہے۔ ہم سب نے بیک زبان عرض کیا! حضرت اللہ تعالیٰ آپ سے کوئی بڑا کام لینا چاہتے ہیں' آپ یہ پیش کش قبول فرما لیں۔ چونکہ ہمیں وہ اپنے دست و بازو سمجھتے تھے' اس لیے کہنے لگے کام مشکل ہے' لیکن اگر آپ لوگوں کی ہمدردیاں اور دعائیں شامل حال رہیں تو سب آسان ہو جائے گا۔

چنانچہ بعض شرائط کے ساتھ انھوں یہ عہدہ قبول کر لیا اور باقاعدہ یونیورسٹی کا انتظام و انصرام سنبھالنے کے بعد پہلا کام یہ کیا کہ ملک کے نامور اساتذہ کرام کو چن چن کر اور منہ مانگی تنخواہیں دے کر یونیورسٹی میں جمع کیا۔ ان اساتذہ میں پروفیسر غلام احمد حریری' عبدالحی صدیقی اور بشیر احمد صدیقی کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔ یونیورسٹی کے لیے باقاعدہ نیو بغداد کیمپس کے لیے وسیع و عریض قطعہ ارض حاصل کیا اور نئے کیمپس کی بنیاد رکھی' جو اب اللہ کے فضل و کرم سے عظیم بلڈنگ کی شکل میں تمام تدریسی شعبوں اور رہائشی عمارات پر مشتمل ہے۔

اسلامیہ یونیورسٹی بہاول پور کے قیام کے دوران ۱۹۷۶ء کے مارچ کے آخر میں وہ لاہور تشریف لائے۔ خطبہ جمعۃ المبارک دارالعلوم تقویۃ الاسلام میں ارشاد فرمایا۔ نماز جمعہ کے بعد پروفیسر خواجہ غلام صادق صاحب کے ساتھ پنجاب یونیورسٹی طلبا یونین کے عہدے دار دارالعلوم کی لائبریری میں ملاقات کے لیے حاضر ہوئے۔ اس ملاقات میں بندہ عاجز' حافظ محمد ایوب اور ڈاکٹر محمد راشد رندھاوا بھی موجود تھے۔

پروفیسر خواجہ صادق صاحب پنجاب یونیورسٹی (لاہور) میں شعبہ فلاسفی کے سربراہ تھے۔ اردو بازار لاہور میں ان کی رہائش تھی اور جمعہ باقاعدگی سے دارالعلوم تقویۃ الاسلام میں ادا کرتے تھے اور اسلامیہ کالج سول لائنز میں ابوبکر صاحب کے رفیق کار تھے اور Dean کے عہدے پر فائز تھے۔ ابوبکر صاحب اور خواجہ صادق صاحب آپس میں گہرے

دوست تھے اور ایک دوسرے کی بڑی عزت کرتے تھے۔ آج جب یونین کے عہدے داروں نے غزنوی صاحب کو یونین کے افتتاحی اجلاس اور اپنے اپنے عہدوں کا حلف لینے کے لیے دعوت دی تو ان دنوں وہ بہت مصروف بھی تھے اور کچھ علیل بھی تھے۔ لیکن ان کے وہ الفاظ میرے کانوں میں گونج رہے ہیں جو اس وقت انھوں نے فرمائے: ''خواجہ صادق صاحب جیسے پیارے دوست کی دعوت کو کس طرح رد کرسکتا ہوں۔''

خواجہ صادق صاحب اس وقت پنجاب یونیورسٹی طلبا یونین کے سرپرست اعلیٰ تھے جو طلبا کے ساتھ دعوت دینے کے لیے آئے اور ابوبکر صاحب کو مہمان خصوصی اور حلف لینے کے لیے عرض کیا۔ حلف برداری کی تقریب آئندہ پیر منگل کو ہونی تھی۔ غزنوی صاحب نے ڈاکٹر راشد صاحب اور ہم لوگوں سے مشورہ لیا کہ اب واپس بہاول پور جاؤں یا لاہور ہی میں رک جاؤں؟ ڈاکٹر راشد صاحب نے مشورہ دیا کہ صرف ایک دن بروز ہفتہ Working day ہے۔ لمبا سفر ہے۔ آپ لاہور میں پیر تک رک جائیں۔

ڈاکٹر راشد صاحب کے مشورے کے مطابق بہاول پور جانے کا ارادہ ترک کردیا۔

جمعۃ المبارک ہی کو مولانا کوثر نیازی کی طرف سے جو اس وقت وزیر مذہبی امور تھے' اسلامک فیسٹیول (لندن) میں شمولیت کے لیے دعوت نامہ موصول ہوا تھا' جس میں غزنوی صاحب کو شمولیت اور وہاں تقریر کرنے کی دعوت دی گئی تھی۔ اس میلے میں شمولیت کی دعوت اور مقالہ پڑھنے کے علاوہ کسی اور پروگرام وغیرہ کا کوئی پتا نہ تھا۔ اب پنجاب یونیورسٹی طلبا یونین کی حلف وفاداری کی تقریب کی دعوت قبول کرنے کے بعد ڈاکٹر راشد صاحب کے کلینک میں بندہ عاجز' حافظ ایوب اور ڈاکٹر راشد ڈاکٹر صاحب کی گاڑی میں پہنچے تاکہ ٹیلی فون کے ذریعے اسلام آباد سے لندن میں منعقد ہونے والے اسلامی فیسٹیول کے پروگرام کا پتا کیا جائے۔ ان دنوں دارالعلوم میں غزنوی صاحب کا ٹیلی فون عارضی طور پر منقطع تھا۔ وزارت مذہبی امور سے رابطہ کرنے پر معلوم ہوا کہ آپ منگل کے روز شام ساڑھے سات بجے کی فلائٹ سے انگلینڈ کو روانہ ہوں گے۔ اپنا پاسپورٹ اور شناختی کارڈ فوری طور پر بھیج دیجیے تاکہ ویزے وغیرہ کا بندوست کیا جاسکے۔

اب پھر مسئلہ پیدا ہوا کہ شناختی کارڈ اور پاسپورٹ تو بہاول پور میں سیف کے اندر پڑے ہیں' وہاں سے کس طرح اسلام آباد پہنچائے جائیں اور اپنے کس بااعتماد آدمی کو بہاول پور بھیجا جائے جو وہاں سے پاسپورٹ اور شناختی کارڈ لائے۔ اس آدمی کو غزنوی کے صاحب زادے جنید اور حماد بھی جانتے ہوں اور گھر میں کام کرنے والی ملازمہ بھی اس سے واقف ہو (وہ ملازمہ ضلع سرگودھا سے تعلق رکھتی تھی) چونکہ میرا غزنوی صاحب کے گھر آنا جانا تھا اور میں غزنوی صاحب کا پرسنل سیکرٹری ہوتا تھا' دارالعلوم کے دفتر کی نظامت بھی میرے سپرد تھی' اس لیے مجھے حکم دیا گیا کہ آپ آج ہی کسی وقت بہاول پور روانہ ہو جائیں۔ چنانچہ میں اسی روز چار بجے کی ٹرین سے بہاول پور روانہ ہو گیا۔ رات کے تقریباً ایک بجے بہاول پور پہنچا اور سیدھا وی سی ہاؤس گیا۔ ملازمہ نے مجھ سے کھانا وغیرہ پوچھا' لیکن میں ٹرین میں کھانا کھا چکا تھا' اس لیے آرام کرنے کے لیے کہا تو اس نے فوراً بستر وغیرہ لگا کر علیحدہ کمرے میں مجھے آرام کرنے کو کہا اور ساتھ ہی کہا کہ صبح میں ناشتہ تیار کر دوں گی اور پاسپورٹ اور شناختی کارڈ بھی نکال دوں گی۔ چنانچہ علی الصبح میں اٹھا' غسل کر کے ناشتہ کیا' ڈرائیور نے جس کا مجھے نام یاد نہیں رہا۔ یونیورسٹی کی گاڑی میں مجھے ریلوے سٹیشن پر پہنچایا۔ چونکہ کوئی سیٹ وغیرہ ریزرو نہ تھی اس لیے ڈرائیور نے مجھے پولیس کے ایک ڈبے میں بٹھا دیا اور میں اسلام آباد کے لیے روانہ ہو گیا۔ حافظ محمد زاہد نے مجھ سے کچھ کاغذات لاہور ریلوے سٹیشن سے لینا تھے جو کہ اسی روز غزنوی صاحب کو پہنچانا تھے۔ میں لاہور تقریباً ڈیڑھ بجے پہنچا۔ حافظ زاہد ریلوے پلیٹ فارم پر موجود تھے۔ میں نے ان کو وہ کاغذات دیے اور پاسپورٹ اور شناختی کارڈ لے کر راولپنڈی کو روانہ ہو گیا۔ سوئے اتفاق سے گوجرانوالہ اور راہوالی کے درمیان ریل کا انجن فیل ہو گیا اور گاڑی راہوالی سٹیشن پر رک گئی۔ تقریباً تین گھنٹے کے بعد لاہور سے دوسرا انجن پہنچا اور گاڑی راولپنڈی کے لیے روانہ ہوئی۔ میں بروز ہفتہ تقریباً بارہ بجے راولپنڈی پہنچا۔ اب اسلام آباد جانے کا کوئی فائدہ نہ تھا۔ رات ہو چکی تھی اور دفاتر بند تھے۔ چنانچہ میں اپنے عزیزوں کے ہاں راولپنڈی رات بسر کرنے کے لیے چلا گیا۔ اگلے روز علی الصبح وزارت مذہبی امور میں ٹیلیفون کیا۔ اس دن اتوار تھا۔ جواب

ملا کہ آج اتوار کو بھی دفتر کھلا ہے۔ آپ غزنوی صاحب کا پاسپورٹ اور شناختی کارڈ لے کر فوراً دفتر وزارت مذہبی امور اسلام آباد پہنچ جائیں۔ میں جب دفتر پہنچا اور استقبالیہ سے پوچھا تو انھوں نے متعلقہ آدمی سے رابطہ قائم کیا۔ رابطہ کار افیسر نے جواب دیا کہ ہمارا آدمی باقی مندوبین کے پاسپورٹ وغیرہ لے کر ویزے کے لیے روانہ ہو گیا ہے۔ وہ جب استقبالیہ پر پہنچے تو اسے روک لینا' لیکن مسٹر یحییٰ کو فوراً اندر بھیج دو۔ ویزے لگوانے والے کو روک لیا گیا اور جب میں اندر پہنچا تو متعلقہ افسر نے مجھے کہا کہ اگر پانچ منٹ لیٹ ہو جاتے تو غزنوی صاحب کا ویزا نہ لگ سکتا۔

میں نے پاسپورٹ اور شناختی کارڈ متعلقہ آدمی کے سپرد کیا۔ پروگرام کی ایک کاپی لی اور فارغ ہو کر واپس عازم لاہور ہو گیا۔ تقریباً دو اڑھائی بجے لاہور دارالعلوم پہنچا۔ سارا پروگرام غزنوی صاحب کو بتایا اور اسی روز شام کی فلائٹ پر جانے کو کہا تو مجھے کہنے لگے' تم فوراً گھر جاؤ اور آرام کرو۔ بڑا لمبا سفر کیا ہے۔ ساڑھے پانچ یا چھ بجے آنا' پھر باتیں کریں گے۔

میں ساڑھے پانچ بجے حاضر ہوا۔ میرے سفر پر بڑے خوش ہوئے کہ سارے کام بہ طریق احسن انجام پائے' البتہ ایک چیز دیکھ کر خفا ہوئے۔ وہ یہ تھی کہ میں نے لاہور سے بہاول پور اور بہاول پور سے اسلام آباد کا سفر تھرڈ کلاس میں کیا تھا۔ فرمانے لگے "آپ کو کس کافر نے کہا تھا کہ تھرڈ کلاس میں سفر کریں۔ آپ کی تو Intitle ment فرسٹ کلاس کی ہے۔ فرسٹ کلاس افیسر ہیں' کیا دارالعلوم آپ کو فرسٹ کلاس کا کرایہ ادا نہیں کر سکتا۔ اب آئندہ آپ نے کبھی تھرڈ کلاس میں سفر نہیں کرنا' ہمیشہ فرسٹ کلاس میں سفر کرنا ہے۔"

ان کے الفاظ میں ہمدردی اور شفقت بھی تھی اور خوشی بھی۔ اب دارالعلوم میں کچھ کام کرنے اور گھر میں دروازے وغیرہ اور تالوں کی تاکید کی اور کچھ لباس اور سامان پیک کرنے کو کہا۔ ہر قسم کی تیاری ہو گئی تو ڈرائیور جس کا تعلق بلتستان سے تھا (نام مجھے یاد نہیں رہا) گاڑی تیار کر کے دارالعلوم کے دروازے پر کھڑا ہو گیا۔ غزنوی صاحب نے مجھے ڈرائیور کے ساتھ اگلی سیٹ پر بیٹھنے کو کہا۔ پچھلی سیٹ پر محمد یعقوب کو جوان کا خادم تھا اور اب بھی

دارالعلوم میں رہتا ہے' اپنے ساتھ بٹھا کر ڈرائیور سے کہا کہ ایئر پورٹ چلو۔ اب ہم چار افراد کا قافلہ لاہور ایئر پورٹ کی طرف روانہ ہوا۔

مجھے غزنوی صاحب کے معمولات کا پتا تھا۔ وہ پان کھایا کرتے تھے' اور میں لا کر دیتا تھا۔ میں نے ڈرائیور کو اشارہ کیا کہ الفلاح بلڈنگ کے پاس رکے تاکہ دو چار پان پیک کروا کر انھیں دے دوں۔ راستے میں کھا لیں گے۔ جب گاڑی رکنے لگی تو انھوں نے رکنے کی وجہ پوچھی۔ میں نے عرض کیا حضرت! پان لینے کے لیے روکی ہے۔ اپنے خاص انداز میں فرمایا ''آپ کی معلومات کے لیے بتادوں کہ میں نے پان کھانا چھوڑ دیا' چلتے رہو۔'' چنانچہ ہم ایئر پورٹ پہنچ گئے۔ ایئر پورٹ پر اس روز دوبئی سے فلائٹ آئی تھی۔ اس زمانے میں جب دوبئی سے فلائٹ آتی تھی تو لاؤنج میں کسی دوسرے کو اندر جانے کی اجازت نہیں ہوتی تھی۔ میں سامان اٹھائے جب ساتھ جانے کے لیے اندر داخل ہوا تو سیکیورٹی والوں نے Sorry کہہ کر مجھے روک لیا۔ غزنوی صاحب نے کہا یہ میرے سیکرٹری ہیں' مگر انھوں نے معذرت کی۔ چنانچہ سامان لے کر خود اندر داخل ہوئے۔ میں اور یعقوب دوسری طرف سے جنگلے کے ساتھ کھڑے ہو کر دیکھنے لگے کہ وہ جہاز پر جائیں تو سلام کریں۔ جب ہم جنگلے کے قریب پہنچے تو چودھری عبدالحفیظ اور حافظ ایوب صاحبان بھی پہنچ گئے۔ ان کی آخری ملاقات جنگلے کے پار سے ہوئی۔ ہم سب نے ان کو الوداعی سلام کیا اور وہ جہاز میں سوار ہو کر انگلینڈ کی وادیٔ موت کو روانہ ہو گئے اور ہمیں ہمیشہ کے لیے چھوڑ گئے۔ پھر ان کی میت (Dead body) لاہور پہنچی تو بے پناہ مخلوق خدا تھی جو چہرہ دیکھنے اور جنازہ پڑھنے کے لیے امڈی چلی آ رہی تھی۔

مولانا محمد یعقوب ملہوی

(وفات ۱۳ نومبر ۱۹۸۱ء)

۱۹۴۸ء کے جولائی کی ۲۴ تاریخ کو لاہور میں مرکزی جمعیت اہل حدیث مغربی پاکستان کے نام سے جماعت اہل حدیث کی تنظیم قائم کی گئی تو مجھے اس کا ناظم دفتر مقرر کیا گیا تھا- یہ بہت بڑا اعزاز تھا' جس کا جماعت کے علما و زعما کی طرف سے اس فقیر کو مستحق گردانا گیا- لیکن میں نے اس اعزاز کو ''اعزاز'' نہیں سمجھا بلکہ جماعت کی خدمت کا ایک ذریعہ قرار دیا' اور حقیقت یہ ہے کہ خدمت جماعت کے اس ذریعے سے مجھے بہت فائدہ پہنچا اور بے شمار اہل علم سے میرے تعلقات استوار ہوئے' ان اہل علم میں برصغیر پاک و ہند کے حضرات بھی شامل تھے اور بعض دیگر ممالک کے اصحاب فکر بھی-!

مرکزی جمعیت اہل حدیث کا دفتر شیش محل روڈ پر دار العلوم تقویۃ الاسلام کی بلڈنگ کی دوسری منزل میں تھا' وہیں ایک کمرے میں میری رہائش تھی- ہر وقت دار العلوم کے طالب علموں سے رابطہ رہتا تھا اور میں خود بھی طالب علم تھا' اور ہر شخص کو جو علم سے دلچسپی رکھتا ہے' خود کو طالب علم ہی سمجھنا چاہیے- وہ خود کو طالب علم سمجھے گا تو حصول علم کی کوشش کرے گا اور علم کے جس شعبے میں وہ کمزور ہے اسے رفع کرنے کی سعی کرے گا- اگر اس نے اپنے آپ کو طلبا کی صف سے باہر نکال لیا تو سمجھ لیجیے کہ اپنے لیے طلب علم کا دروازہ بند کر لیا-

جمعرات کو نماز عشا کے بعد طلبا کا جلسہ ہوتا تھا' جس میں ہر طالب علم چند منٹ کسی موضوع پر تقریر کرتا تھا- یعنی طلبا کو تقریر کرنے کی مشق کرائی جاتی تھی- مجھے عام طور پر اس ''جمعراتی'' جلسے کا صدر بنایا جاتا تھا- اس طرح طلبا سے میرا اور بھی قریبی رابطہ رہتا تھا- میں نہ اس وقت تقریر کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا' نہ اب رکھتا ہوں' لیکن طلبا کو تقریر کرنے کے طریقے (''یا گُر'') ضرور ''سمجھاتا تھا''- آپ کہہ سکتے ہیں کہ جیسا میں خود مقرر تھا'

ویسے ہی انھیں تقریر کے ''گر'' سمجھاتا ہوں گا۔

اسی ''جمعراتی'' جلسے کے موقعے پر ایک دن میں نے تجویز پیش کی کہ پنجاب کے اہل حدیث طلبا کو اپنی تنظیم قائم کرنی چاہیے اور اس کا نام رکھا جائے ''جمعیت طلباے اہل حدیث پنجاب''۔ یہ تجویز منظور ہوئی اور فیصلہ کیا گیا کہ اس سلسلے میں پنجاب کے مدارس اہل حدیث کے ارباب اہتمام، مدرسین اور طلبا کا تعاون حاصل کرنے اور ان کو اپنا ہم نوا بنانے کے لیے چار آدمی ان کے پاس جائیں اور انھیں اس تنظیم کے فوائد سے مطلع کریں۔ وہ چار آدمی مندرجہ ذیل تھے۔

۱۔ حافظ محمد یحییٰ عزیز میر محمدی:۔ اس وقت وہ دارالعلوم تقویۃ الاسلام کے طالب علم تھے۔ اب بہت سالوں سے ضلع قصور کے ایک گاؤں ''بنگا بلوچاں'' میں مقیم ہیں۔ یہ گاؤں دریاے راوی کے ہیڈ بلوکی کے قریب ہے۔ یہاں انھوں نے تبلیغ دین کا مرکز قائم کیا ہے۔ نہایت صالح، متقی، دردِ دل رکھنے والے اور عالی کردار مبلغ اسلام ہیں۔ میرے ساتھ ان کا اسی زمانے سے تعلق ہے اور میری بے عملی کے باوجود مجھ سے بہت اچھے مراسم رکھتے ہیں۔ دعا ہے اللہ تعالیٰ ان کی مساعی تبلیغ دین کو زیادہ سے زیادہ وسعت دے اور اس کا دائرہ اثر دور دراز تک پھیلے۔

۲۔ ابوبکر صدیق:۔ تقسیم ملک سے قبل سے میرے ان سے دوستانہ تعلقات قائم ہیں۔ دارالعلوم تقویۃ الاسلام سے فراغت کے بعد سرکاری امتحانات دے کر لاہور کے ایک ہائی سکول میں سلسلہ تدریس شروع کر دیا تھا۔ ریٹائر ہونے کے بعد بھی یہ سلسلہ قائم رکھا ہے۔ لاہور کے علاقہ احاطہ تھانیدار کی جامع مسجد اہل حدیث کی خطابت بھی ان کے سپرد ہے۔ مخلص اور نیک طینت عالم دین ہیں۔ لیکن تقریر اور خطابت میں ہم دونوں برابر ہیں۔

۳۔ خلیل اثری:۔ ان کا تعلق سکونت ضلع فیصل آباد کی تحصیل سمندری کے ایک گاؤں چک نمبر ۴۷۹ گ ب سے ہے۔ فراغت کے بعد اپنے گاؤں چلے گئے تھے۔ ان کا شمار میرے اخلاص پیشہ دوستوں میں ہوتا ہے۔ اچھے خاصے زمیندار ہیں اور انکسار و تواضع ان کی زندگی کا لازمی جز ہے۔

آج سے باون سال پہلے یہ حضرات نوجوانی کے عالم میں تھے- اب ماشاء اللہ بیٹے بیٹیوں کی منزل سے آگے نکل گئے ہیں اور پوتے پوتیوں اور نواسے نواسیوں کے جھرمٹ میں رہتے ہیں- اللہ ان سب چھوٹے بڑوں کا حامی و ناصر ہو- آمین-

۴- چوتھا ان میں یہ فقیر تھا-

ہم نے حافظ محمد یحییٰ عزیز کو امیر سفر بنایا اور چل پڑے- سردیوں کے دن تھے- مختلف مقامات سے ہوتے ہوئے اوڈاں والا چک نمبر ۴۹۳ گ ب پہنچے- یہ گاؤں تحصیل سمندری (ضلع فیصل آباد) میں واقع ہے اور اس کے مدرسے کا نام تھا "دارالعلوم تعلیم الاسلام"- یہ دارالعلوم مشہور بزرگ صوفی عبداللہ مرحوم (وفات ۲۸ اپریل ۱۹۷۵ء) نے قائم کیا تھا- اس وقت اس میں ڈیڑھ سو کے لگ بھگ طلبا تعلیم حاصل کرتے تھے' جن میں سے اکثر طلبا تقریر اور کلام و بیان میں کافی تیز تھے- جو حضرات وہاں فرائض تدریس انجام دیتے تھے' ان میں سے چند حضرات کے اسمائے گرامی یہ ہیں:

۱- حضرت حافظ عبداللہ بڈھیمالوی:- ۸ مئی ۱۹۸۷ کو وفات پائی-

۲- مولانا عبدالصمد رؤف:- اب بھی اسی دارالعلوم میں طلبا کو پڑھاتے ہیں-

۳- مولانا محمد صادق خلیل:- فیصل آباد میں تصنیف و تالیف میں مصروف ہیں-

۴- پیر محمد یعقوب قریشی:- جامعہ اثریہ جہلم میں فریضہ تدریس انجام دینے پر مامور ہیں-

۵- مولانا محمد یعقوب ملہوی:- آئندہ سطور میں انہی کا تذکرہ مقصور ہے-

یہیں پہلی دفعہ مولانا محمد یعقوب ملہوی سے ملاقات ہوئی- وہ اس وقت ستائیس اٹھائیس برس کے جوان تھے' لیکن دیکھنے سے پتا چلتا تھا کہ جوانی پر متانت و صالحیت نے قبضہ جما رکھا ہے- نکلتا ہوا قد' متناسب جسم' نہ دبلے نہ فربہ اندام' کچھ سانولا سا رنگ' تیکھی ناک' ستواں چہرہ' سفید دانت' باریک ہونٹ' آنکھوں میں حیا' نرم کلام' پیکر

انکسار اور مجسمہ تواضع -!

مولانا محمد یعقوب ملہوی دراصل کہاں کے رہنے والے تھے اور کب سے چک نمبر ۴۹۳ گ ب اوڈاں والا میں مقیم تھے-؟ انھیں ''ملہوی'' کی نسبت سے کیوں پکارا جاتا تھا-؟ تعلیم و تعلم کا سلسلہ کہاں سے شروع ہوا اور پھر یہ سلسلہ کیوں کر آگے بڑھا؟

ان کے بارے میں یہ اور اس قسم کے متعدد سوالات سطح ذہن پر ابھرتے ہیں- آیئے! مندرجہ ذیل سطور میں ان سوالات کا جواب تلاش کرتے ہیں-

مولانا محمد یعقوب کا خاندان درحقیقت ضلع اوکاڑہ کی تحصیل رینالہ خرد کے ایک قریبی گاؤں چک نمبر ۲۰ الف کا رہنے والا تھا- رینالہ خرد کو اس نواح کے زیادہ تر لوگ ''ملہیاں والا'' کے نام سے موسوم کرتے ہیں' اس لیے ہمارے ممدوح مولانا محمد یعقوب کو اس کی طرف منسوب کر کے ''مولانا محمد یعقوب ملہوی'' کہا جانے لگا اور یہ نسبت ان کے نام کا جز بن گئی-

مولانا موصوف ۱۹۲۱ کو چک نمبر ۲۰ الف میں پیدا ہوئے- والد کا نام نامی صوفی محمد یوسف تھا اور خاندان راجپوت بھٹی تھا- صوفی محمد یوسف اپنے خاندان اور علاقے کی ایک صالح شخصیت تھے- اوڈاں والا کے ممتاز بزرگ صوفی عبداللہ مرحوم و مغفور سے تعلق ارادت رکھتے تھے اور جماعت مجاہدین سے وابستہ تھے- اس جماعت کا اصل مقصد ہندوستان سے انگریزوں کو نکال کر یہاں خالص اسلامی حکومت قائم کرنا تھا- اس مقصد کے لیے مولانا اسماعیل شہید دہلوی' سید احمد شہید رائے بریلوی اور ان کے رفقائے کرام ۱۸۲۶ میں آزاد قبائل میں وارد ہوئے- انھوں نے ۶ مئی ۱۸۳۱ء کو بالاکوٹ میں جام شہادت نوش کیا- ابتدا میں ان کا مقابلہ پنجاب کی سکھ حکومت سے ہوا- پھر اس جماعت پر کئی دور آئے- ۱۸۴۶ میں پنجاب پر انگریزوں کا قبضہ ہوا تو اس جماعت کی جنگ انگریزی حکومت سے شروع ہو گئی- انگریزوں کی اس مخالف جماعت نے جو کلیتاً اہل حدیث حضرات پر مشتمل تھی' ملک کی تمام سیاسی اور اسلامی جماعتوں سے زیادہ عمر پائی- یعنی ۱۸۲۶ سے لے کر ۱۹۴۷ تک تقریباً سوا سو سال یہ جماعت انگریزی حکومت سے پنجہ آزما رہی- اس کی پاداش میں اس جماعت

نے تمام انگریز مخالف جماعتوں سے زیادہ تکلیفیں اٹھائیں۔ انگریزی حکومت اس کی شدید مخالف تھی اور ''وہابی تحریک'' درحقیقت اسی کا نام تھا جس سے انگریزوں نے اسے موسوم کیا تھا۔ اس کے متعلق پاکستانی اور ہندوستانی اہل قلم کے علاوہ خود انگریز مصنفین نے متعدد کتابیں لکھی ہیں جن کے اردو وغیرہ مختلف زبانوں میں ترجمے ہو چکے ہیں۔

انگریزی حکومت اس جماعت کے ہر رکن کی گہری نظر سے نگرانی کرتی تھی اور اس کی ہر ہر حرکت سے باخبر رہنے کے لیے کوشاں رہتی تھی۔ انگریزوں کے خلاف اسلحہ اور جنگی سامان تیار کرنے کے لیے اس جماعت کے کارکن اپنے انداز سے لوگوں سے روپیہ پیسہ اکٹھا کرتے تھے۔ یہ سب انتہائی خفیہ طریقے سے ہوتا تھا۔ خفیہ طریقے سے روپیہ دیا جاتا تھا اور خفیہ طریقے ہی سے وصول کیا جاتا تھا۔ روپیہ دینے اور لینے والوں کا حکومت کو پتا چل جاتا تو دونوں کو شدید سزائیں دی جاتی تھیں۔ یہ سلسلہ حصول آزادی (سوا سو سال) تک جاری رہا۔ انگریزی دور حکومت میں مجاہدین کو روپیہ پیسہ دینے والا بھی یوں سمجھیے کہ موت کے منہ میں چلا جاتا تھا اور لینے والا بھی موت کے دروازے پر کھڑا ہوتا تھا۔ اور مولانا محمد یعقوب ملہوی کے والد محترم صوفی محمد یوسف کی جرأت کی داد دیجیے کہ وہ جان ہتھیلی پر رکھ کر مجاہدین کے لیے مختلف مقامات سے روپیہ جمع کر کے مجاہدین کے مرکز میں بھیجتے تھے تاکہ وہ انگریزی حکومت سے لڑنے کے لیے اسلحہ حاصل کریں۔ یہ بہت بڑی مہم تھی، جس کے سر کرنے کے لیے صوفی صاحب کو مامور کیا گیا تھا۔

یہی دونوں صوفیا یعنی صوفی عبداللہ اور صوفی محمد یوسف کے باہمی مراسم کا بنیادی سبب تھا۔ دونوں کا ایک ہی مقصد اور ایک ہی نقطہ فکر تھا اور وہ تھا اس ملک کو انگریزی حکومت کی غلامی سے نجات دلانا اور پھر یہاں اسلامی نظام حکومت کے نفاذ کے لیے فضا ہموار کرنا۔

صوفی محمد یوسف کے دو بیٹے تھے، ایک کا نام محمد ابراہیم تھا اور دوسرے کا محمد یعقوب۔!

وہ اپنے دونوں بیٹوں کو صوفی عبداللہ مرحوم کے پاس اوڈاں والا لے گئے تھے۔ یہ ۱۹۳۵ کے لگ بھگ و پیش کی بات ہے۔ محمد یعقوب کی عمر اس وقت چودہ برس کی تھی۔ محمد یعقوب نے ابتدائی تعلیم یعنی قرآن مجید اور اردو کی بعض کتابیں اپنے آبائی گاؤں چک نمبر ۲۰ الف میں پڑھی

تھیں- اوڈاں والا میں انھوں نے درس نظامی کے مروجہ نصاب کے مطابق حصول علم کا
آغاز کیا- اس وقت وہاں مولانا حافظ محمد اسحاق صاحب (حسین خاں والا' ضلع قصور)
مولانا محمد داؤد بھوجیانی رحمانی' مولانا علی محمد (چک نمبر ۴۴۷ گ ب' تحصیل سمندری' ضلع
فیصل آباد) اور مولانا حافظ محمد ابوالقاسم بھٹوی فرائض تدریس سرانجام دیتے تھے- مولانا محمد
یعقوب ملہوی نے ان حضرات سے بہت سی درسی کتابیں پڑھیں- سب سے زیادہ عرصہ
انھوں نے مولانا حافظ محمد اسحاق صاحب سے اکتساب علم کیا' یہ عرصہ چھے سال پر محیط ہے-
۱۹۴۵ تک وہ اوڈاں والا کے دارالعلوم میں تحصیل علم کرتے رہے' اس اثنا میں وہاں کے
نصاب کی تکمیل کرلی-

۱۹۴۵ ہی میں وہ گوجرانوالا میں حضرت حافظ محمد گوندلوی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں
حاضر ہوئے اور ان سے بعض انتہائی کتابیں پڑھیں- ایک سال ان کی خدمت میں رہے-
اس سے قبل جب حضرت حافظ صاحب اوڈاں والا میں فریضہ تدریس انجام دیتے تھے' اس
وقت بھی وہ ان کے حلقہ درس میں شامل رہے تھے- انھوں نے تین سال حضرت حافظ
صاحب رحمۃ اللہ عیہ سے استفادہ کیا-

گوجرانوالہ میں ایک مشہور دیو بندی عالم دین مولانا محمد چراغ فروکش تھے- ان
سلسلہ تدریس وہاں "جامعہ اسلامیہ عربیہ" میں جاری تھا- مولانا محمد یعقوب ملہوی نے قیام
گوجرانوالہ کے زمانے میں ان کے باب علم پر بھی دستک دی اور ایک سال ان کی خدمت
میں رہے اور ان سے علم فقہ کی انتہائی کتابیں پڑھیں-

۱۹۴۶ میں سند فراغ حاصل کی تو اوڈاں والا میں آگئے اور وہاں کے دارالعلوم کے
مہتمم حضرت صوفی عبداللہ مرحوم کے حکم سے مسند تدریس پر متمکن ہوگئے- اس دارالعلوم کی
بہت بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے زیادہ تر مدرسین یہیں کے فارغ التحصیل ہیں- صوفی
صاحب مرحوم کی عادتِ مبارکہ تھی کہ جو طالب علم وہاں سے فارغ ہوتا تھا' اسے وہیں مدرس
مقرر کرلیتے تھے- مولانا محمد یعقوب ملہوی کو بھی انھوں نے وہیں سلسلہ تدریس شروع
کرنے کا حکم دیا اور انھوں نے تعمیل حکم کی- صوفی صاحب ان کی صالحیت' انکسار اور نرم کلامی

سے بہت متاثر تھے۔

جن حضرات نے مولانا محمد یعقوب ملہوی کے ساتھ یا کچھ عرصہ ان سے آگے پیچھے تعلیم حاصل کی‘ ان میں سے چند حضرات کے اسمائے گرامی یہ ہیں۔

۱۔ مولانا پیر محمد یعقوب جہلمی:۔ شیخ الحدیث دارالعلوم اثریہ جہلم۔

۲۔ مولانا عبدالقادر ندوی:۔ مہتمم جامعہ تعلیم الاسلام ماموں کانجن (ضلع فیصل آباد)

۳۔ مولانا عبدالصمد رؤف:۔ مدرس دارالعلوم تقویۃ الاسلام اوڈاں والا (ضلع فیصل آباد)

۴۔ مولانا محمد صادق خلیل:۔ متعدد کتابوں کے مصنف و مترجم (فیصل آباد)

۵۔ مولانا محمد اسحاق چیمہ مرحوم:۔ مشہور مدرس۔ ادارہ علوم اثریہ فیصل آباد کے بانی۔

۶۔ مولانا حافظ ثناء اللہ مرحوم:۔ بہت اچھے مدرس تھے۔ (جنڈاں والا۔ ضلع فیصل آباد)

۷۔ مولانا عتیق اللہ مرحوم:۔ جھوک دادو (ضلع فیصل آباد) میں خدمت تدریس انجام دیتے تھے۔

دعا ہے اللہ تعالیٰ ان میں سے موجودین کو خدمت دین کے زیادہ سے زیادہ مواقع فراہم کرے اور مرحومین کو اپنے جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔ آمین یارب العالمین۔

مولانا محمد یعقوب ملہوی کی شادی ۱۹۴۹ میں حضرت مولانا حافظ عبداللہ بڈھیمالوی کی ہمشیر سے ہوئی تھی۔ حضرت حافظ صاحب اس سال اوڈاں والا میں شیخ الحدیث کے منصب عالی پر متمکن تھے اور مولانا محمد یعقوب صاحب بھی وہیں خدمت تدریس انجام دینے پر مامور تھے۔ ان کی اہلیہ محترمہ کا نام زینب بی بی تھا۔ نہایت نیک سیرت‘ صالحہ اور بلند اخلاق خاتون تھیں۔ بے حد صابرہ‘ عابدہ‘ زاہدہ‘ تہجد گزار اور بہ کثرت تلاوت قرآن کرنے والی۔ میری والدہ مرحومہ کی خالہ زاد تھیں اور اس رشتے کا انھیں بہت لحاظ تھا۔ اس کی رو سے وہ ہماری خالہ ہوتی تھیں۔

۱۵۔ اکتوبر ۱۹۹۶ کو ماموں کانجن میں قاضی محمد اسلم سیف کا انتقال ہوا تو میں ان کے جنازے میں گیا۔ جنازہ ہمارے دوست مولانا ارشاد الحق اثری نے پڑھایا تھا۔ جنازے

کے بعد میں برادرِ مکرم مولانا عبدالقادر ندوی کے ساتھ اوڈاں والا چلا گیا تھا' جو ماموں کانجن سے تین میل کے فاصلے پر ہے- رات وہاں رہا- ۱۶- اکتوبر کو برادرِ عزیز حافظ محمد امین کے ساتھ ان کے گھر گیا اور خالہ محترمہ زینب بی بی کو سلام عرض کیا- عمر کی تقریباً ۸۰ منزلیں طے کر چکی تھیں- میرے حاضر خدمت ہونے اور سلام عرض کرنے پر نہایت خوش ہوئیں' دعائیں دیں اور اپنے بیٹے حافظ محمد امین کو بعض قریبی رشتے داروں کے متعلق بتایا- یہ ان کی خدمت میں میری آخری حاضری تھی اور آخری سلام---! اس سے کچھ عرصہ بعد وہ وفات پا گئیں- انا للہ وانا الیہ راجعون-

مولانا محمد یعقوب ملہوی تقریباً ۳۳ برس اوڈاں والا میں صوفی عبداللہ مرحوم کے زیر سایہ رہے- ۱۹۳۵ سے ۱۹۴۵ تک طالب علم کی حیثیت سے اور ۱۹۴۶ سے ۱۹۶۸ تک دارالعلوم کے معلم کی حیثیت سے- ۱۹۵۸ میں گاؤں کی امامت وخطابت کا فریضہ بھی انہی کے سپرد کر دیا گیا تھا-

۱۹۶۸ کو دارالعلوم اوڈاں والا سے ماموں کانجن منتقل کر دیا گیا تھا اور صوفی صاحب بھی ماموں کانجن تشریف لے گئے تھے' لیکن گاؤں کے لوگوں نے مولانا محمد یعقوب ملہوی کو (جو وہاں کے امام اور خطیب بھی تھے) ماموں کانجن نہیں جانے دیا اور وہیں دارالعلوم تقویۃ الاسلام کے نام سے یہ قدیم درس گاہ جاری رکھنے پر اصرار کیا- ان کا نقطہ نظر یہ تھا کہ اس درس گاہ کی وجہ سے اس گاؤں نے بے حد شہرت حاصل کی ہے- اگر یہ پورا سلسلہ یہاں سے ماموں کانجن چلا گیا تو گاؤں کی علمی رونق ختم ہو جائے گی اور درس وتدریس کی جو روایت اور تاریخ اس کے ساتھ وابستہ ہے' اس کا نام ونشان باقی نہیں رہے گا' اس لیے ضروری ہے کہ یہاں بھی یہ دارالعلوم قائم رہے- چنانچہ قائم رہا اور مولانا محمد یعقوب ملہوی کی کوشش رنگ لائی اور اس دارالعلوم نے خوب ترقی کی- جو مدرسین وہاں رہے' ان میں ہمارے دوست مولانا عبدالصمد رؤف بھی شامل ہیں جو ماشاءاللہ بہت اچھے مدرس ہیں اور درسی کتابوں کی تدریس ان کی زندگی کا محبوب مشغلہ ہے-

یہاں قابل ذکر بات یہ ہے کہ دارالعلوم کا بہت بڑا حصہ ماموں کانجن منتقل ہو گیا تھا

اور صوفی صاحب نے بھی ماموں کانجن کو اپنی قیام گاہ بنا لیا تھا لیکن مولانا محمد یعقوب ملہوی نے بہ دستور ان کے ساتھ رابطہ رکھا اور اطاعت شعاری کی قدیم روایت کو جوان کے والد مکرم صوفی محمد یوسف مرحوم کے دور سے چلی آ رہی تھی' خوب نباہا۔ صوفی صاحب نے بھی مولانا کو ہمیشہ اپنا برخوردار سمجھا اور ان پر دست شفقت رکھا۔ دارالعلوم اوڈاں والا سے ۱۹۶۸ کو ماموں کانجن منتقل ہوا تھا اور صوفی صاحب نے اس سے سات سال بعد اپریل ۱۹۷۵ کو وفات پائی تھی۔ اس اثنا میں مولانا نے بھی ہر لمحے صوفی صاحب کو لائق تکریم گردانا اور صوفی صاحب نے بھی مولانا پر نگاہ بزرگانہ رکھی۔ مولانا عبدالقادر ندوی کا معاملہ بھی یہی رہا۔ انھوں نے مولانا کا نام ہمیشہ انتہائی اکرام کے لہجے میں لیا اور ان کے بچوں کا ذکر بھی احترام آمیز مشفقانہ انداز میں کیا۔

یہ بڑے لوگوں کی بڑی باتیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان پر اپنا شامیانہ رحمت ہر آن سایہ فگن رکھے۔ آمین

مولانا محمد یعقوب ملہوی نے اوڈاں والا کے دارالعلوم تقویۃ الاسلام کو نہایت اچھے انداز سے چلایا۔ طلبا کے لیے وسیع دارالاقامہ تعمیر کرایا' ہزاروں کتابوں پر مشتمل کتب خانہ قائم کیا۔ اس کتب خانے میں تفسیر' حدیث' فقہ' تاریخ وغیرہ موضوعات کی بہت سی کتابیں موجود ہیں اور نہایت اچھی ترتیب سے رکھی گئی ہیں' عربی کتابیں بھی' اردو کتابیں بھی۔ اس کتب خانے میں مولانا کی وفات کے بعد ان کے صاحب زادۂ گرامی حافظ محمد امین نے بھی کافی اضافہ کیا اور اضافے کا سلسلہ بہ دستور جاری ہے۔

نہایت خوش قسمت ہے یہ گاؤں جہاں طویل عرصے سے قال اللہ وقال الرسول کی روح پرور صدائیں بلند ہو رہی ہیں۔ انتہائی عالی بخت ہیں یہاں کے لوگ جو اس سلسلے کو قائم رکھنے کے لیے پوری تگ و دو کر رہے ہیں۔ بے حد قابل ستائش ہیں مولانا محمد یعقوب ملہوی مرحوم جنھوں نے یہاں اس دارالعلوم کی جڑیں مضبوط کیں' اور بہ درجہ غایت مستحق اکرام ہیں ان کے صاحب زادۂ گرامی حافظ محمد امین اور یہاں کے مدرسین جنھوں نے اس دارالعلوم کی خدمت کو اپنی زندگی کا نصب العین قرار دے رکھا ہے۔ یہ مرحومین و موجودین کا

صدقہ جاریہ ہے‘ جس کا اجر بارگاہِ الٰہی سے انھیں ہمیشہ ملتا رہے گا۔

مولانا محمد یعقوب ملہوی بے شمار خصوصیات کے مالک تھے اور بہت سے معاملات میں عام علمائے کرام سے مختلف رجحانات کے حامل---!

طلبا کے علاوہ اپنے گاؤں (اوڈاں والا) کے لوگوں کا خاص طور سے خیال رکھتے بلکہ ان کی دینی تربیت فرماتے---نماز عصر کے بعد روزانہ گاؤں کا چکر لگاتے‘ بوڑھوں اور کم زوروں سے حال احوال پوچھتے اور مریضوں کی بیمار پرسی کرتے۔ انھیں مسئلے مسائل بتاتے اور اللہ کا ہر حال میں شکر ادا کرنے اور ہر تکلیف میں صبر کرنے کی تلقین فرماتے۔

پورا خیال رکھتے کہ گاؤں میں کہیں کوئی خلافِ شرع کام نہ ہو‘ عورتوں سے پردے کی پابندی کراتے‘ گلی یا کسی گھر میں بلند آواز سے ٹی وی‘ ریڈیو اور ٹیپ وغیرہ نہ چلنے دیتے۔ شادی بیاہ میں گانے بجانے‘ ڈھول ڈھمکے‘ ناچ کود‘ آتش بازی‘ پٹاخے چلانے اور سہرابندی وغیرہ رسوم کے ارتکاب سے سختی کے ساتھ منع فرماتے اور لوگ ان کے فرمان پر عمل کرتے‘ کسی کو ان کی مخالفت کی جرأت نہ ہوتی۔

مسجد میں درس قرآن دیتے‘ صبح کے وقت بچوں کو قرآن مجید پڑھاتے‘ چلتے پھرتے ہر چھوٹے بڑے کو السلام علیکم کہتے۔ لوگ بھی انھیں سلام کرنے میں سبقت لے جانے کی کوشش کرتے۔ سب لوگ انھیں اپنا محسن قرار دیتے اور ان کی تعظیم کرتے تھے۔

لوگوں کی امانتیں ان کے پاس جمع رہتیں اور وہ انھیں بہت بڑا امین سمجھتے۔ نقد روپے کی صورت میں امانت رکھنے والے کی اجازت سے غریب اور حاجت مند لوگوں کو اس میں سے قرضِ حسنہ دیتے اور اسے بتا دیتے کہ یہ قرض کسی کی امانت سے دیا جا رہا ہے۔ قرض لینے والا وعدے کے مطابق واپس کر دیتا۔ امانت اور قرض وغیرہ کا سلسلہ کافی وسیع تھا۔

نہایت نیک نفس‘ سادگی پسند‘ جفاکش‘ متواضع‘ منکسر‘ مخلص اور پیکر استغنا تھے۔ ہر شخص سے اس کی قوتِ فہم اور رسائی ذہن کے مطابق بات کرتے۔ ان کی نرم گفتاری اور عام میل جول کی وجہ سے اکثر بڑے چھوٹے انھیں ”چاچا جی“ کہہ کر پکارتے تھے۔

لالچ‘ طمع‘ حرص‘ دنیوی مال و متاع اور روپے پیسے کی محبت سے دل بالکل خالی تھا۔

اس کا اندازہ اس حقیقت سے کیجیے کہ وفات کے وقت ان کی ماہانہ تنخواہ صرف تین سو پچاس روپے تھی' جب کہ اس زمانے میں ان کے شاگردوں کی تنخواہیں اس سے کہیں زیادہ تھیں۔ ان کی تنخواہ میں اضافے کے متعلق جب بھی کسی نے بات کی تو انھوں نے جواب دیا کہ میرا اس سے گزارا ہو رہا ہے' میرے لیے یہی کافی ہے' اس سے زیادہ کی مجھے ضرورت نہیں۔

حضرت مولانا محمد اسماعیل سلفی مرحوم نے ایک دفعہ ایک ممتاز مدرس کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ بعض علمائے دین اپنے آپ کو نیلام کی منڈی میں لے آئے ہیں' جس نے زیادہ بولی دی' سب چھوڑ چھاڑ کر اس کے ساتھ چل پڑے۔ ایک جگہ استقلال اور صبر کے ساتھ بیٹھ کر نہ خطابت کر سکتے ہیں' نہ تدریس۔

عام خطبا و مدرسین کے بارے میں مولانا کا یہ فرمان بالکل صحیح تھا' وہ چل پھر کر میلہ دیکھنے کے عادی ہوتے ہیں۔ لیکن مولانا محمد یعقوب کی عادت اور ذہنی کیفیت اس کے بالکل الٹ تھی۔ ان کے دل کے کسی گوشے میں پیسے کی محبت نہ تھی' ان کا دل خدمت دین کے جذبے سے بھرپور تھا۔ یہی ان کی زندگی کا مقصد اور یہی ان کا حاصل حیات تھا۔ وہ قوت لایموت کے عادی تھے' پیسا جمع کرنا اور اسے مقصد حیات قرار دے لینا ہرگز ان کا شیوہ نہ تھا۔ یہی وہ چیز ہے جو انھیں موجودہ دور کے عام علمائے کرام سے ممتاز کرتی ہے۔ اب اس قسم کے بے لوث اور بے غرض لوگوں سے دنیا تیزی کے ساتھ خالی ہو رہی ہے۔ اس مادی دور نے سب کے ذہن بدل دیے ہیں' الا ماشاء اللہ۔

وہ خطبہ جمعہ دیتے تھے' لیکن دھواں دھار اور پر جوش تقریر نہ کرتے تھے۔ سیدھے سادے انداز میں لوگوں کو نیکی کی باتیں بتاتے' اخلاق حسنہ اختیار کرنے کی تاکید فرماتے اور آسان پیرائے میں ایسا رویہ اپنانے کی طرف توجہ دلاتے جو دنیا میں بھی فائدہ مند ہو اور آخرت میں بھی نفع رساں ہو۔

درس میں یا وعظ میں اختلافی مسائل بیان کرنے سے حتی الامکان گریز کرتے۔ اگر کسی اختلافی مسئلے کے بیان و وضاحت کی ضرورت ہوتی تو خوب صورت اسلوب میں اس کو منقح کرنے کی سعی فرماتے۔ لڑائی جھگڑے اور بحث و مناظرے کی راہ پر نہ آتے۔

احقاق حق اور ابطال باطل میں نہایت سخت تھے۔ اس باب میں کسی بڑے سے بڑے دنیا دار اور چودھری کی پروانہ کرتے۔ سچی بات برملا کہتے اور سب کے سامنے اس کا اظہار کرتے۔ اس ضمن میں چھوٹے بڑے اور امیر غریب کو ایک ہی سطح پر رکھتے۔ کلمہ حق کے مقابلے میں کسی کی رعایت کرنا یا اس کے سامنے جھکنا جانتے ہی نہ تھے۔

ان کی صاف گوئی اور سادہ کلامی سے گاؤں کے لوگ بھی متاثر تھے اور اردگرد کے دیہات کے لوگوں پر بھی اس کا اثر تھا۔ چنانچہ متعدد دیہات کے لوگ ان کی اقتدا میں جمعہ پڑھنے اور ان کی تقریر سننے آتے تھے۔ وہ میٹھے اور نرم انداز سے وعظ فرماتے اور لوگ ان سے سبق حاصل کرتے۔

وہ گاؤں میں رہتے تھے اور گاؤں میں رہنے والے لوگوں کے دکھ سکھ میں شریک ہوتے تھے۔ ان کی شادیوں میں شرکت کرتے اور اس موقعے پر لڑکے اور لڑکی کو تحفے تحائف پیش کرتے --- یہ تحفے کبھی کسی دینی کتاب کی شکل میں ہوتے تھے' کبھی قرآن مجید کی شکل میں اور کبھی نقد روپے کی صورت میں۔! گاؤں کے لوگوں سے ان کا تعلق اسی طرح کا تھا' جس طرح باہمی رشتے داروں کا ہوتا ہے۔

گاؤں کے غریب اور نادار افراد کا انھیں علم تھا۔ ان کی اس طرح مالی امداد کرتے یا انھیں کپڑے وغیرہ دیتے کہ کسی کو پتا نہ چلے اور ان کی عزت نفس مجروح نہ ہو۔ بیاہ شادی اور بچے کی ولادت کے مواقع پر اس قسم کے لوگوں کی بالخصوص مدد کرتے اور بعض اوقات اپنے خاص آدمیوں کو ان کی مدد کے لیے کسی نہ کسی انداز سے آمادہ کرتے۔

وقت کے انتہائی پابند تھے۔ کہیں آنے جانے میں وقت کی پوری پابندی کرتے۔ جو وقت کسی سلسلے میں کسی سے مقرر ہوا' اس پر پورا اترتے۔ گرمی ہو' سردی ہو' بارش ہو' آندھی ہو' عین وقت پر پہنچتے۔ مشہور تھا کہ ان کی پابندیٔ وقت کو دیکھ کر لوگ گھڑیوں کا وقت درست کرتے تھے۔

طلبا کی تعلیم کے ساتھ ساتھ ان کی تربیت کا اہتمام فرماتے۔ درسی کتابوں کا خود بھی طلبا میں بیٹھ کر مطالعہ کرتے' طلبا کو بھی مطالعے کی ترغیب دیتے اور مطالعہ کراتے۔

دوسرے دن جو سبق پڑھانا یا پڑھنا ہے' رات کو اس کا اچھی طرح مطالعہ کرنا ان کے نزدیک ضروری تھا۔

صدق مقال' ایفائے عہد' بڑوں کا احترام' نماز باجماعت کی پابندی وغیرہ پر خود تو عامل تھے ہی' طلبا کو بھی ان امور پر عمل پیرا ہونے کی تاکید فرماتے' نمازوں کے اوقات میں خود دارالاقامہ میں جاتے اور طلبا کو نماز باجماعت کے لیے مسجد میں جانے کا حکم دیتے۔

ٹھیک وقت پر مسند درس پر بیٹھ جاتے' زیر درس کتاب کا ہر مسئلہ ہر طالب علم کو اچھی طرح سمجھاتے۔ کند ذہن طالب علم کا خاص طور سے خیال رکھتے اور آسان سے آسان پیرائے میں اسے سمجھاتے' جب تک وہ بات سمجھ نہ لیتا' آگے نہ چلتے۔ طلبا کے لباس کا خیال رکھتے کہ شریعت کے خلاف نہ ہو۔ اس کے ساتھ ہی انھیں صاف ستھرا لباس پہننے کی تاکید فرماتے۔ نادار اور غریب طلبا کی خفیہ طریقے سے مدد کرتے۔

پڑھائی میں بالکل ناغہ نہ کرتے۔ مدرسے آتے اور باقاعدہ طلبا کو تعلیم دیتے۔ اگر کہیں سفر پر جانا ہوتا تو جانے سے پہلے یا سفر سے واپسی پر متعلقہ اسباق پڑھانا ان کے نزدیک ضروری تھا۔ یہی وجہ ہے کہ تعلیمی سال کے اختتام پر ان کی کتابیں آسانی سے بروقت ختم ہو جاتی تھیں۔

تمام ائمہ کرام اور علمائے دین کا نام نہایت احترام سے لیتے۔ کسی سے اظہار اختلاف ضروری ہوتا تو بے حد تکریم کے الفاظ میں کرتے' انتہائی شائستگی اور بہ درجہ غایت اکرام کے لہجے میں ---! ائمہ فقہ اور اہل علم کے باہمی فقہی اختلافات کا ذکر بھی نہایت نرم اسلوب کلام اور انتہائی اعتدال و احتیاط کے ساتھ کرتے۔

اپنے اساتذہ کی بے حد عزت کرتے۔ نہ ان کے برابر بیٹھتے' نہ ان کی موجودگی میں درس دیتے' نہ جمعہ جماعت کراتے' نہ اونچی بولتے۔ نہایت مؤدب اور دو زانو ہو کر نظر نیچی کر کے ان کے حضور بیٹھتے۔ اپنے شاگردوں کی موجودگی میں اپنے اساتذہ کی جوتیاں اٹھاتے۔ فرماتے باادب بانصیب' بے ادب بے نصیب۔!

غالباً ۱۹۷۵ کی بات ہے' میں ضلع بہاول نگر کے ایک مشہور شہر "حاصل پور" اپنے

عزیزوں کی ایک شادی پر گیا- پتا چلا کہ اس شادی میں حضرت حافظ عبداللہ بڈھیمالوی اور مولانا محمد یعقوب ملہوی بھی تشریف لائے ہیں- جہاں ان کا قیام تھا' وہیں میرے قیام کا انتظام کیا گیا تھا- انھیں دیکھ کر اور مل کر نہایت خوشی ہوئی- مولانا محمد یعقوب کے ساتھ ان کے ایک صاحب زادے بھی تھے جو دس بارہ سال کے ہوں گے- ایک دن اور ایک رات ہم وہاں رہے- میں نے مولانا محمد یعقوب کو دیکھا کہ وہ حضرت حافظ صاحب کے سامنے نہایت آہستگی سے بات کرتے تھے- ان کے حضور سراپا ادب اور بے حد منکسر-! ان کے صاحب زادے کا نام یاد نہیں رہا- محمد امین تھا یا مسعود عالم-!!

مولانا نے اوڈاں والا میں چالیس اکتالیس برس سلسلہ تدریس جاری رکھا- اس طویل مدت میں درسیات کی ابتدائی کتابیں بھی پڑھائیں اور انتہائی بھی- ۱۹۶۸ کے بعد زندگی کے آخری دور تک تیرہ چودہ سال حدیث وفقہ اور دیگر علوم کی انتہائی کتابوں کا درس دیا- اس اثنا میں جب بھی کوئی مشکل مسئلہ ان کے سامنے آیا تو ان کا معمول تھا کہ اس کے حل وکشود کے لیے یا تو خود حضرت حافظ محمد گوندلوی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں پہنچتے یا کسی اہل علم کو ان کے ہاں بھیجتے- جب تک مسئلے کی گرہ نہ کھل جاتی انھیں چین نہ آتا-

ان سے جن حضرات نے استفادہ کیا اور باقاعدہ تحصیل علم کی ان کی صحیح تعداد کا اندازہ لگانا ممکن نہیں- چالیس سال میں بے شمار طلبائے علم ان کی خدمت میں آئے اور اپنی ذہنی و فکری استعداد کے مطابق ان سے فیض یاب ہوئے- کوئی شخص بھی ان کی صحیح تعداد نہیں بتا سکتا' وہ خود بھی زندہ ہوتے تو اپنے تمام شاگردوں کے نام اور ان کی تعداد سے مطلع نہ فرما سکتے- البتہ جن حضرات کا ہمیں علم ہو سکا ہے' ان کی فہرست یہاں درج کی جاتی ہے' لیکن یہ فہرست ادھوری ہے- ان میں سے بعض حضرات وفات پا چکے ہیں اور بعض اللہ کے فضل سے زندہ ہیں- لیکن ان کی خدمات کا دائرہ بڑا وسیع ہے- کسی نے تصنیف وتالیف کو اپنا مشغلہ بنایا' کسی نے خطابت کا سلسلہ شروع کیا اور کسی نے درس وتدریس سے تعلق پیدا کیا اور اس درس وتدریس کا تعلق خالص دینی مدارس سے بھی ہے اور سرکاری سکولوں اور کالجوں سے بھی-! تو آیئے ان قابل احترام شخصیتوں میں سے پہلے مرحومین کے اسمائے گرامی کا پتا

کرتے ہیں۔

۱۔ مولانا ابوالبرکات احمد:۔ جلیل القدر عالم اور ممتاز مدرس تھے۔ جامعہ اسلامیہ گوجرانوالہ میں خدمت تدریس انجام دیتے تھے۔ نہایت نیک اور متدین۔ اللہ ان کی مغفرت فرمائے۔ بے شمار علماو طلبا ان سے مستفید ہوئے۔ آبائی تعلق مدراس سے تھا۔

۲۔ حافظ فتح محمد فتحی:۔ ضلع چکوال کے ایک مقام کے رہنے والے تھے۔ پھر مکہ مکرمہ چلے گئے تھے اور بیت اللہ شریف میں باب بلال میں ان کی نشست رہتی تھی۔ پاکستان اور ہندوستان کے اکثر علمائے دین حج کے موقعے پر ان کی خدمت میں آتے تھے۔

۳۔ پروفیسر ظفر اللہ چودھری:۔ نہایت مستعد اور باہمت اہل علم تھے۔ کراچی میں اپنی کوشش اور بھاگ دوڑ سے جامعہ اسلامیہ ابوبکر قائم کی جو ان کا بہت بڑا کارنامہ ہے۔ اس میں مختلف ملکوں کے بہت سے طلبا تعلیم حاصل کرتے ہیں اور بہت سے ممالک سے تعلق رکھنے والے بہت سے اساتذہ انھیں تعلیم دینے پر مامور ہیں۔ پروفیسر ظفر اللہ چودھری اس جامعہ کے مدیر و منتظم تھے۔ ۳ جون ۱۹۹۷ کو لاہور سے کراچی جاتے ہوئے موٹر کار کے حادثے میں فوت ہوئے۔

یہ پانچ افراد کا قافلہ تھا۔ ایک خود چودھری صاحب' دو ان کے بیٹے' ایک بھانجا اور ایک خالہ۔! یہ حادثہ رحیم یار خاں کے قریب پیش آیا تھا۔ (چودھری ظفر اللہ کے حالات کے لیے اس فقیر کی کتاب ''کاروان سلف'' ملاحظہ کیجیے۔ یہ کتاب مکتبہ اسلامیہ' بیرون امین پور بازار' کوتوالی روڈ' فیصل آبادی کی طرف سے شائع ہوئی ہے۔)

۴۔ حافظ عزیز الرحمٰن لکھوی:۔ حضرت مولانا عطاء اللہ لکھوی کے چھوٹے صاحب زادے تھے۔ ذہین اور معاملہ فہم' بہت اچھے مدرس' اپنے اسلاف کی عادات و اطوار کا صحیح نمونہ' رینالہ خرد میں خدمت تدریس انجام دیتے تھے۔

۵۔ قاضی محمد اسلم سیف:۔ اللہ نے ان کو بہت سی خوبیوں سے نوازا تھا۔ زیادہ تر تعلیم اوڈاں والا میں حاصل کی۔ پھر یہ دارالعلوم ماموں کانجن میں منتقل ہوا تو وہیں سکونت اختیار کر لی۔ قریب کے ایک گاؤں چک نمبر ۲۰۶ گ ب کے آفاق ہائی سکول میں معلم تھے۔

جامعہ تعلیم الاسلام کے خدمت گزار تھے۔ تصنیف و تالیف سے دلچسپی تھی۔ کئی کتابیں تصنیف کیں اور جماعتی جرائد میں مضامین لکھے۔ صوفی عبداللہ مرحوم و مغفور کے ارادت مند اور میرے مخلص دوست تھے۔ بعض ذہنی پریشانیوں کے ہجوم نے گھیر کر انھیں کئی خطرناک بیماریوں میں مبتلا کر دیا تھا۔ طویل عرصہ ان بیماریوں میں مبتلا رہے۔ ۱۵۔ اکتوبر ۱۹۹۶ کو ماموں کانجن میں وفات پائی۔ اس وقت ساٹھ سال کے پس و پیش عمر تھی۔ ان کی وصیت کے مطابق مولانا ارشاد الحق اثری نے جنازہ پڑھایا۔ رات کے دس بجے ماموں کانجن کے قبرستان میں دفن کیے گئے۔

اللہ تعالیٰ سے عاجزانہ دعا ہے کہ ان سب مرنے والوں کا ٹھکانا جنت الفردوس میں ہو' آمین۔

۶۔ قاری محمد ایوب فیروز پوری:۔ اچھے خطیب' مقرر' مدرس اور مقالہ نگار تھے۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔

اب چند موجودین' ان کے مختصر تعارف کے ساتھ۔!

۱۔ مولانا عبداللہ امجد:۔ زیادہ تر تعلیم جامعہ محمدیہ (اوکاڑہ) میں حضرت مولانا حافظ عبداللہ بڈھیمالوی سے حاصل کی۔ ان کے حقیقی بھانجے بھی ہیں اور داماد بھی۔! فراغت کے بعد مختلف مقامات میں تدریسی خدمات میں مصروف رہے۔ آج کل مرکز الدعوۃ السّلفیہ ستیانہ (ضلع فیصل آباد) میں شیخ الحدیث ہیں۔ ایک متدین خاندان کے متدین رکن اور منجھے ہوئے مدرس۔

۲۔ حافظ محمد مدنی:۔ ہمارے مرحوم دوست حضرت حافظ عبدالغفور جہلمی کے فرزند کبیر۔ جن مدارس میں تعلیم حاصل کی' ان میں مجھے یاد پڑتا ہے' ادارہ علوم اثریہ (فیصل آباد) بھی شامل ہے۔ بعد میں مدینہ منورہ جا کر مدینہ یونیورسٹی میں داخل ہوئے۔ اسی بنا پر "مدنی" کہلاتے ہیں۔ وہاں سے فارغ ہوئے تو جامعہ اثریہ (جہلم) کی زمام انتظام ہاتھ میں لی۔ اچھے منتظم بھی ہیں اور مدرس بھی۔!

۳۔ مولانا عبدالرشید ارشد ہزاروی:۔ سند فراغ حاصل کرنے کے بعد کچھ عرصہ دارالعلوم

تعلیم الاسلام ماموں کانجن میں بہ طور مدرس بھی اور بہ طور لائبریرین بھی متعین رہے۔ پھر ساہیوال کی جامع مسجد اہل حدیث میں خطیب مقرر کیے گئے' دارالحدیث اوکاڑہ میں شیخ الحدیث کی مسند پر فائز ہیں۔ تدریس کے علاوہ تحریر کا پاکیزہ ذوق رکھتے ہیں۔

۴۔ مولانا عبدالرشید حنیف۔ کئی سال سے مسجد اہل حدیث جھنگ کی خطابت ان کے سپرد ہے۔ متعدد کتابوں کے مصنف۔ ملنسار اور وضع دار عالم دین۔ صاف ستھری مگر سادہ زندگی بسر کرتے ہیں۔

۵۔ مولانا محمد اسماعیل حلیم:۔ مشہور مقرر اور خطیب۔ اوکاڑہ کے قریب ایک گاؤں (غالباً چک نمبر ۴ جی ڈی) میں سکونت پذیر ہیں۔ مسلک اہل حدیث کے مبلغ اور جماعت اہل حدیث کے مخلص خادم۔!

۶۔ پروفیسر غلام نبی عارف:۔ انھوں نے ۱۹۴۸ میں حضرت مولانا محمد اسماعیل سلفی کے قائم کردہ مدرسہ محمدیہ (گوجرانوالہ) سے حصول علم کا آغاز کیا تھا۔ پھر اوڈاں والا اور جامعہ سلفیہ (فیصل آباد) کے اساتذہ سے فیض یاب ہوئے۔ بعدازاں فاضل عربی کا امتحان دے کر منزل بمنزل ایم اے (اسلامیات) تک پہنچے اور پھر ایک کالج میں استاد کی حیثیت سے تقرر ہوا۔ اسی اثنا میں تدریس کی تربیت کا کورس کرنے کے لیے محکمانہ طور سے ریاض (سعودی عرب) کی ایک یونیورسٹی میں گئے۔ وہاں تین سال رہے۔ کچھ عرصہ قبل گورنمنٹ کالج باغبان پورہ (لاہور) سے ریٹائر ہوئے ہیں۔ لکھنے پڑھنے اور ترجمے کا خاص سلیقہ رکھتے ہیں۔

۷۔ پروفیسر ڈاکٹر محمد اسماعیل گورایہ:۔ دینی علم کی تحصیل کے بعد ایم اے کا امتحان دیا اور ملتان کے ایک کالج میں سرکاری طور پر تدریسی ذمے داریاں سنبھالیں۔ ماشاءاللہ پی ایچ ڈی (ڈاکٹر) بھی ہوگئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے تدین وصالحیت کی دولت سے بھی نوازا ہے۔

۸۔ پروفیسر حبیب الرحمٰن مجاہد:۔ مولانا محمد یعقوب ملہوی کے یہ شاگرد کمرشل کالج فیصل آباد کے پرنسپل ہیں۔

۹۔ پروفیسر حافظ محمد شریف شاکر:۔ یہ بھی فیصل آباد میں سکونت پذیر ہیں اور وہاں کے

ایک کالج میں پڑھاتے ہیں۔

یہ ہمارے ممدوح مولانا محمد یعقوب ملہوی کے شاگردوں کی فہرست نہیں ہے۔ اس پر فہرست کے لفظ کا اطلاق بالکل نہیں ہوتا۔ اسے ہم ناقص اور نامکمل فہرست بھی نہیں کہہ سکتے۔ بس ان کے بے شمار شاگردوں میں سے یہ چند شاگردوں کے نام ہیں۔ مولانا تو استاذ الاساتذہ تھے ہی' یہ حضرات بھی استاذ الاساتذہ ہیں۔ افسوس ہے ان کی علمی حیثیت کے مطابق یہاں ہم ان کا تعارف نہیں کرا سکے۔ ان میں سے بعض وفات پا چکے ہیں اور بعض زندہ ہیں۔ وفات پانے والوں کے لیے ہم اللہ تعالیٰ سے مغفرت کی التجا کرتے ہیں اور زندوں کے لیے بارگاہِ الٰہی میں ہماری عاجزانہ دعا ہے کہ انھیں اس کے دین کی خدمت کے زیادہ سے زیادہ مواقع میسر ہوں۔ آمین۔

اب ہم مولانا محمد یعقوب ملہوی کی کتاب حیات کے آخری ورق پر پہنچ گئے ہیں اور چند لمحوں میں یہ ورق بھی ختم ہونے والا ہے۔

وہ طویل مدت سے دل کی تکلیف میں مبتلا تھے۔ پھر ایک وقت آیا کہ ان کے پاؤں کی انگلی کو کوئی اندرونی تکلیف ہوئی' جس نے ان کی جسمانی صحت کو ہلا کر رکھ دیا۔ آخر وہ انگلی کاٹنا پڑی۔ پھر دوسری انگلی میں تکلیف ہونے لگی' جو بہت جلد انتہائی شدت اختیار کر گئی۔ لیکن تکلیف کی انتہائی شدت کے باوجود وہ دارالعلوم آتے اور طلبا کو پڑھاتے رہے۔ جمعرات کے دن ۱۲ نومبر ۱۹۸۱ کو ان کی طبیعت بہت خراب ہو گئی تھی۔ مگر وقت مقررہ پر دارالعلوم آئے اور متعلقہ کتابوں کا درس دیا۔ دوسرے دن جمعہ تھا اور نومبر کی ۱۳ تاریخ۔۔۔ یہ پورا دن بے حد تکلیف میں گزرا۔ رات آ گئی اور تکلیف بڑھتی گئی۔ گھڑی کی سوئیاں بارہ کے ہندسے پر پہنچیں تو ان کی کتاب حیات کا آخری ورق جو ہم نے ابھی شروع کیا تھا' ختم ہو گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

شمسی اعتبار سے یہ ۱۹۸۱ کے نومبر کی ۱۳ اور ۱۴۔ اور قمری حساب سے ۱۴۰۲ھ محرم کی ۱۵ اور ۱۶ تاریخ کی درمیانی رات تھی۔

ہفتے کے روز نماز عصر کے بعد حضرت حافظ عبداللہ بڈھیمالوی رحمۃ اللہ علیہ نے جنازہ

پڑھایا۔ اس علاقے کا یہ بے مثال جنازہ تھا، جس میں دور ونزدیک کے لاتعداد لوگوں نے شرکت کی۔ دفن کر چکے تو لاہور سے ان کے استاذ گرامی شیخ الحدیث حضرت مولانا حافظ محمد اسحاق مدظلہ العالی بھی پہنچ گئے، جن سے وہ مسلسل چھے سال استفادہ کرتے رہے تھے۔ انھوں نے اپنے عالم و متقی شاگرد کی قبر پر جنازہ پڑھایا۔

اللھم اغفرلہ و ارحمہ و عافہ و اعف عنہ--- اللھم نور قبرہ و وسع مدخلہ و ادخلہ جنت الفردوس۔

مولانا محمد یعقوب ملہوی مرحوم کی اولاد تین بیٹیوں اور دو بیٹوں پر مشتمل ہے۔ بڑی بیٹی کی شادی اپنے ماموں زاد (یعنی حضرت حافظ عبداللہ بڈھیمالوی کے بڑے بیٹے) حافظ محمد شاکر سے ہوئی تھی۔ حافظ محمد شاکر صرف اڑتیس برس عمر پا کر اگست ۱۹۹۲ کو انتقال کر گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

دو بیٹوں میں سے ایک بیٹے کا نام نامی حافظ محمد امین ہے، جنھوں نے دینی علوم کی تکمیل کے علاوہ ایم اے عربی کیا اور گولڈ میڈلسٹ ہوئے۔ اوڈاں والا کے دار العلوم تقویۃ الاسلام کی نظامت کے ساتھ، اس میں تدریسی خدمت بھی انجام دیتے ہیں۔ گاؤں کی خطابت و امامت اور درس قرآن کا سلسلہ بھی ان کے سپرد ہے۔

قابل تکریم والد کی طرح نہایت ملنسار، متواضع، پابند اوقات، عالی کردار اور بلند اخلاق عالم دین---! گاؤں کے لوگوں سے اسی قسم کے تعلقات رکھتے ہیں، جس قسم کے ان کے والد مکرم رکھتے تھے۔ وہاں کے لوگ بھی ان کے اوصاف گوناگوں کی بنا پر انھیں مستحق تکریم قرار دیتے ہیں۔ یہ اسی طرح اس گاؤں کے باشندے ہیں، جس طرح دوسرے لوگ۔

مولانا مرحوم کے چھوٹے بیٹے کا نام حافظ مسعود عالم ہے۔ وہ ایم بی بی ایس ڈاکٹر ہیں اور الائیڈ ہسپتال (فیصل آباد) میں متعین ہیں۔ انھیں ڈاکٹر حافظ مسعود عالم کہا جاتا ہے۔ صالحیت و شرافت اور اعمال خیر کی انجام دہی میں انھیں اپنے والد عالی قدر کی روایت کا پاسبان کہنا چاہیے اور بڑے بھائی کے نقوش قدم پر چلنے کو سعادت سمجھنے والے۔!

مولانا عبدالقادر ندوی (صدر جامعہ تعلیم الاسلام ماموں کانجن) اسی گاؤں کے رہنے

والے ہیں اور اپنے علاقے کے اچھے خاصے کاروباری آدمی ہیں- جامعہ کی نگرانی اور اپنے کاروباری سلسلے میں ان کا دن ماموں کانجن میں گزرتا ہے اور رات کو گاؤں چلے جاتے ہیں---ان کا شمار میرے مخلص ترین دوستوں میں ہوتا ہے- ان سے جب بھی ملاقات ہوتی ہے' میں حافظ محمد امین کے بارے میں ان سے ضرور پوچھتا ہوں' وہ ہمیشہ ان کا بہتر الفاظ میں ذکر کرتے ہیں اور مجھے ان کے اس قسم کے الفاظ سن کر نہایت خوشی ہوتی ہے-

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ان نیک خو اور خوش خصال لوگوں کی زندگی میں برکت پیدا کرے' ان کے اعمال خیر کے دائرے کو زیادہ سے زیادہ وسعت عطا فرمائے اور درس و تدریس' وعظ و خطابت یا تحریر و کتابت کی صورت میں انھوں نے دین کی تبلیغ و ترویج کے جو سلسلے شروع کر رکھے ہیں اور اس باب میں جو کوششیں یہ کر رہے ہیں' اس میں کامیاب ہوں اور دنیا و آخرت میں اللہ تعالیٰ انھیں کامرانی سے نوازے- آمین

ربنا اتنا فی الدنیا حسنة و فی الاخرة حسنة و قنا عذاب النار-

❀❀❀

صوفی نذیر احمد کاشمیری

(وفات ۵ دسمبر ۱۹۸۵)

۱۹۳۷ء میں میری عمر بارہ تیرہ سال تھی اور میں مرکز الاسلام میں مولانا عطاء اللہ حنیف کے حلقہ شاگردی میں شامل تھا۔ شدید سردیوں کا موسم تھا اور ہم دھوپ میں بیٹھے تھے۔ دن کے ایک بجے کا عمل ہوگا کہ ایک صاحب آئے اور بلند و بارعب آواز سے کہا: ''السلام علیکم......!''

لمبا قد، نہایت متناسب جسم، ستواں چہرہ، تیکھی اور اونچی ناک، لمبی خاکی سے رنگ کی قمیص اور اسی رنگ کی کھلے پائینچے کی شلوار، سر پر اونچی باڑ کی ٹوپی، پاؤں میں پرالی کی سی قسم کے موٹے موٹے تنکوں کی چپل، خوب صورت اور مرعوب کن شخصیت............

السلام علیکم کہنے کے بعد اسی گرج دار آواز میں کہا: ''مولوی محمد علی کہاں ہیں''؟

انھیں دیکھ کر اور ان کی آواز سن کر سب لوگ احتراماً کھڑے ہوگئے، جن میں مولانا عطاء اللہ حنیف اور مولانا محمد علی لکھوی کے صاحب زادے مولانا محی الدین اور معین الدین بھی شامل تھے۔

پھر اسی لہجے میں کہا: ''میرا نام صوفی نذیر احمد کاشمیری ہے، انھیں میری آمد کی اطلاع دو''

ہم نے سر سے پاؤں تک اس شخص کو دیکھا اور دیکھتے ہی رہے۔ اس ہیئت، اس لباس، اس وضع قطع اور اس انداز کلام کے شخص کو میں نے پہلی دفعہ دیکھا تھا۔

مولانا محمد علی لکھوی کو اطلاع دی گئی تو وہ تشریف لائے۔ معزز مہمان نے خود ہی اپنا تعارف کرایا اور نام بتایا۔ کہا:

میں پونچھ کا رہنے والا ہوں۔ اب لاہور سے آ رہا ہوں۔ مولوی داؤد سے ملنے کے

لیے چینیاں والی مسجد میں گیا تھا، لیکن پھر واپس آ گیا، وہ کانگریسی ہے، میں اس سے نہیں ملوں گا- میں نہ کانگرس کو صحیح سمجھتا ہوں، نہ جمعیت علماے ہند کو اور نہ مجلس احرار کو......! اب آپ کے پاس آیا ہوں- آپ سے چند باتیں کرنا چاہتا ہوں-

مولانا مسکراتے ہوئے ان کی باتیں سنتے رہے- ان کی کسی بات کا کوئی جواب نہیں دیا- وہ احرار کی شدید مخالفت کر رہے تھے اور اس سلسلے کی عجیب بات یہ ہے کہ خود مولانا کا تعلق احرار سے تھا اور وہ تھوڑی دیر بعد تین بجے کی ٹرین سے مجلس احرار کے جلسے میں شرکت کے لیے ملتان تشریف لے جا رہے تھے، چنانچہ گاڑی آنے میں جب چند منٹ رہ گئے تو مولانا نے ان سے فرمایا:

مجھے اجازت دیجیے، میں ایک ضروری سفر پر جا رہا ہوں- یہ مولانا عطاء اللہ صاحب اور میرے بیٹے محی الدین اور معین الدین ہیں، آپ ان سے باتیں کیجیے، میں ان شاء اللہ تین دن کے بعد واپس آؤں گا- پھر آپ سے باتیں ہوں گی-

مولانا تو ملتان چلے گئے- لیکن مجھے یاد نہیں کہ صوفی نذیر احمد کاشمیری وہاں رہے یا نہیں رہے اور کب واپس آئے- میرا خیال ہے، اس کے بعد وہ وہاں نہیں گئے-

اب آٹھ سال کا سفر طے کر کے دہلی چلیے- ۱۹۴۵ء کے اکتوبر کا مہینا تھا کہ جمعیت علماے ہند کے مرکزی دفتر دہلی میں ایک میٹنگ ہوئی، جس میں ان مختلف سیاسی جماعتوں کے رہنماؤں کو بلایا گیا تھا، جو مسلم لیگ سے اختلاف رکھتے تھے- میں نہ کسی جماعت سے تعلق رکھتا تھا اور نہ کسی جماعت کا رکن یا رہنما تھا- ان دنوں مرکز الاسلام میں خدمت تدریس انجام دینے پر مامور تھا- لیکن مجھے بھی اس میٹنگ میں بلایا گیا تھا اور میرے نام باقاعدہ دعوت نامہ بھیجا گیا تھا اور میں اس میں شریک ہوا تھا- معلوم نہیں میرے ڈاک کے پتے کا جمعیت کے دفتر کو کیسے علم ہوا- اس میٹنگ میں پنجاب کے پانچ آدمی شریک ہوئے تھے- مولانا سید محمد داؤد غزنوی، مولانا عبدالمجید سوہدروی، مولانا عطاء اللہ حنیف، مولانا عبدالواحد (گوجرانوالہ) اور ان سطور کا راقم............! ان میں سے مولانا عبدالواحد دیوبندی مکتب فکر سے تعلق رکھتے تھے، باقی چاروں اہل حدیث تھے- مولانا غزنوی جمعیت

علمائے دیوبند کے نائب صدر تھے۔ مولانا محمد اسماعیل سلفی اس اجلاس میں تو شریک نہیں تھے، البتہ جمعیت علمائے ہند کی پنجاب شاخ کے صدر تھے۔

جمعیت کا دفتر محلہ بلی ماراں کی گلی قاسم جان میں تھا۔ یہ گلی تو تنگ سی تھی البتہ دفتر کی عمارت کافی وسیع تھی اور کئی کمروں پر مشتمل تھی۔ دفتر کے دروازے میں ایک صاحب موٹے بان کی چوکھٹا بنی ہوئی چارپائی پر بیٹھے تھے اور وہ جمعیت علمائے ہند اور اس کے نقطہ نظر کی سخت مخالفت کر رہے تھے اور اس میٹنگ میں شرکت کے لیے آنے والے لوگوں سے کہتے تھے کہ یہ سارا سلسلہ غلط ہے، آپ اس غلط کام میں کیوں حصہ لے رہے ہیں.......... میں نے ان کو غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ یہ تو صوفی نذیر احمد کاشمیری ہیں جو آٹھ سال قبل مرکز الاسلام تشریف لے گئے تھے۔

میں مولانا عطاء اللہ صاحب کے ساتھ اس میٹنگ میں گیا تھا۔ میں نے ان سے پوچھا یہ وہی صوفی نذیر احمد کاشمیری تو نہیں جو مرکز الاسلام گئے تھے؟ انھوں نے فرمایا: وہی ہیں۔ وہی حلیہ، اسی قسم کا لباس، وہی لہجہ، بس فرق تھوڑا سا یہ پڑ گیا تھا کہ ۱۹۳۷ء میں ان کی داڑھی بالکل سیاہ تھی، اب اس میں کچھ سفیدی جھانکنے لگی تھی۔ ہم نے نہایت مؤدب ہو کر ان کو سلام کیا۔ پتا چلا کہ کچھ عرصے سے وہ جمعیت ہی کے دفتر میں قیام فرما ہیں اور اس کے سیاسی نقطہ فکر سے اختلاف رکھتے ہیں۔ تعجب ہوا کہ جس جماعت کے دفتر میں رہتے ہیں، اسی کی مخالفت فرما رہے ہیں اور جمعیت کے لوگ نہایت فراخ دلی سے اس مخالفت کو برداشت کر رہے ہیں۔ یہ ان تمام حضرات کی اخلاقی بلندی تھی۔ اختلافات بھی چل رہے ہیں اور تعلقات کا سلسلہ بھی جاری ہے۔

اجلاس کے دوسرے دن صوفی صاحب نے ایک کاغذ مولانا داؤد غزنوی کو دیا اور خود بھی ایک طرف ہو کر اجلاس میں بیٹھ گئے۔ مولانا نے وہ کاغذ پڑھا۔ پھر کھڑے ہو کر فرمایا: حضرات! صوفی صاحب نے ایک ریزولیشن یہاں پیش کرنے کے لیے دیا ہے جس کا عنوان ہے، دردسر --- یہ الفاظ سن کر شرکائے اجلاس ہنس پڑے اور صوفی صاحب بولتے ہوئے غصے سے باہر نکل گئے۔

یہاں یہ بھی سنتے جایے کہ مولانا داؤد غزنوی کی وفات ۱۶ دسمبر ۱۹۶۳ کو ہوئی تھی۔ اس وقت صوفی صاحب ہندوستان کے شہر بنارس میں تھے۔ وہیں سے انھوں نے مولانا کی وفات پر تعزیتی مضمون لکھ کر مجھے بھیجا' جس کا عنوان تھا ''سید السادات طاب ثراہ کے بعد'' نہایت درد بھرا مضمون تھا جس میں مولانا کی بہت تعریف کی گئی تھی۔ اور ان کی خاندانی' علمی' سیاسی اور انتظامی صلاحیتوں کو اجاگر کیا گیا تھا۔ میں نے یہ مضمون ۱۷ جنوری ۱۹۶۴ء کے ''الاعتصام'' میں شائع کیا۔

صوفی نذیر احمد کاشمیری کی زندگی نہایت عجیب وغریب واقعات پر مشتمل تھی۔ یہاں ان کا سوانحی خاکہ پیش کیا جاتا ہے اور ان کے خاندانی پس منظر کی ایک جھلک خوانندگان ذی احترام کے سامنے رکھی جاتی ہے۔ ہم اپنے مخلص ترین دوست اور صوفی صاحب کے اکلوتے صاحب زادے جناب سید مختار احمد ہاشمی (کھوٹہ آزاد کشمیر) کے انتہائی شکر گزار ہیں کہ انھوں نے اس سلسلے میں ہماری مدد فرمائی۔

ریاست کشمیر کے صدر مقام پونچھ شہر میں صوفی نذیر احمد ۱۹۰۱ میں عقیل الہاشمی خاندان میں پیدا ہوئے۔ والد کا اسم گرامی مولوی نجم الدین تھا۔

حالات کی رفتار کچھ اس طرح ہے کہ حضرت شاہ محمد غوث رحمتہ اللہ علیہ تبلیغ دین کے لیے ہر سال وادی کشمیر میں تشریف لے جایا کرتے تھے۔ صوفی صاحب کا خاندان اس زمانے میں صوبہ سندھ کے شہر ٹھٹھہ میں آباد تھا۔ اس خاندان کے ایک بزرگ مولوی محمد واسع تھے جو حضرت شاہ محمد غوث کے ہمراہ بغرض تبلیغ سری نگر جایا کرتے تھے۔ ایک سال ایسا ہوا کہ سری نگر سے واپس آتے ہوئے پونچھ شہر سے گزرے۔ اس دور میں ریاست کا حکمران ایک شخص رستم خاں تھا۔ اس نے حضرت شاہ محمد غوث سے درخواست کی وہ اپنے رفیق سفر مولوی محمد واسع کو یہیں رہنے کی اجازت دیں تاکہ یہ پونچھ کے مسلمانوں میں تعلیم کا فریضہ انجام دیں اور ان میں دین کی تبلیغ فرمائیں اور اسلامی احکام ومسائل سے انھیں آگاہ کریں۔ چنانچہ مولوی محمد واسع کو پونچھ کے لیے مامور کر دیا گیا۔ اس کے بعد انھوں نے پونچھ شہر ہی میں مستقل طور سے سکونت اختیار کر لی۔ یہاں انھیں جاگیر کے طور پر اچھی خاصی

اراضی دی گئی اور گزر بسر کے تمام سامان بہتر صورت میں میسر آ گئے۔

مولوی محمد واسع سے آگے چل کر چوتھی پشت میں اس خاندان میں تین جلیل القدر عالم پیدا ہوئے، وہ تھے۔نور بخش، محمد بخش، الٰہی بخش......! اس اثنا میں کچھ خاندانی اختلافات بھی ابھر آئے تھے جن کا نتیجہ یہ ہوا کہ الٰہی بخش گھر بار ترک کر کے افغانستان کے راستے سے ترکی چلے گئے۔ وہ خلافت عثمانیہ کا دور تھا۔تبحر علمی کی وجہ سے خلافت عثمانیہ میں الٰہی بخش کی بے حد پذیرائی ہوئی۔عوام وخواص میں انھیں بڑی شہرت ملی، وہیں شادی کی اور وہیں وفات پائی۔نور بخش اور محمد بخش پونچھ شہر میں مقیم رہے...... مسلمانوں کے عہد کے کشمیر میں اس خاندان کے پاس جاگیریں بھی تھیں، افتا کا محکمہ بھی انہی لوگوں کے سپرد تھا، مسلمانوں کے عائلی معاملات میں بھی انہی کا عمل دخل تھا۔کشمیر کے ڈوگرہ راج میں بھی یہ تمام معاملات ان کے سپرد تھے۔ان کے مشہور علماے دین میں شمس العلما مفتی غلام یاسین شاہ، مفتی ضیاء الدین اور مفتی غلام احمد شاہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

اب آیئے صوفی نذیر احمد کی طرف---! یہ اسی خاندان کے اخلاف میں سے ہیں اور ان کی زندگی عجیب وغریب منزلوں سے گزری جس کی کسی قدر تفصیل یہ ہے۔

انھوں نے ابتدائی تعلیم اپنے خاندان کے بزرگوں سے حاصل کی۔سترہ یا اٹھارہ برس کی عمر میں مزید حصول علم کے لیے عازم لاہور ہوئے۔ یہاں اندرون شہر کے مدرسہ غوثیہ میں علوم دینیہ کی تحصیل کی۔اس کے ساتھ ہی ادیب فاضل، منشی فاضل اور مولوی فاضل کے امتحانات پاس کیے۔اس زمانے میں فاضل اردو کو ادیب فاضل، فاضل فارسی کو منشی فاضل اور فاضل عربی کو مولوی فاضل کہا جاتا تھا۔یہ تینوں اس دور کے مشرقی علوم کے بہت بڑے سرکاری امتحانات تھے جو صوفی صاحب نے پاس کیے اور ڈگریاں حاصل کیں۔ پنجاب یونیورسٹی سے میٹرک کا امتحان بھی پاس کیا۔طالب علمی کے اس زمانے میں اپنے وطن پونچھ میں ان کی آمدورفت کا سلسلہ جاری رہا۔

ان تمام امتحانات سے فارغ ہو کر اور مروجہ دینی تعلیم کی تکمیل کے بعد ۱۹۲۴ء میں وطن واپس آئے اور سٹیٹ ہائی سکول پونچھ میں اردو فارسی کے معلم کے طور پر ملازمت اختیار

کر لی- انہی دنوں اپنے تایا مولوی جلال الدین کی صاحب زادی سے ان کی شادی ہوئی-

ملازمت کے ابتدائی دنوں میں نہایت عمدہ لباس پہنتے اور سکول کے کھیلوں میں حصہ لیتے تھے- اس کے ساتھ ہی مطالعہ کتب کثرت سے کرتے- فارسی شعرا میں سے حافظ شیرازی، عرفی، نظیری، قاآنی، خاقانی، سعدی شیرازی وغیرہ کے مجموعہ ہائے کلام بڑے شوق سے پڑھتے- ڈاکٹر اقبال سے بھی متاثر تھے- فارسی کے بہت سے شعرا کے بہت سے اشعار انھیں زبانی یاد تھے-

پھر یہ ہوا کہ عبادات کی طرف راغب ہو گئے، اور یہ رغبت روز بروز بڑھتی ہی چلی گئی- کبھی ایسا بھی ہوتا کہ رات بھر جاگتے اور دعا و مناجات کا سلسلہ اشک افشانی اور الحاح زاری کے ساتھ جاری رہتا- یہ صورت حال ستائیس برس کی عمر میں شروع ہوئی اور چونتیس برس کی عمر تک برابر چلتی رہی- انہی دنوں زبان بندی اختیار کر لی- بالکل خاموش رہنے لگے- کلاس روم میں البتہ ضرور جاتے اور طلبا کو تختہ سیاہ پر چاک سے لکھ کر کچھ سبق پڑھاتے- سکول کی ڈیوٹی کے بعد سکول کے احاطے کے ایک چھوٹے سے کمرے میں بند ہو جاتے- خوراک بھی بہت کم کر دی تھی- روزانہ دودھ کے ایک گلاس اور ایک آدھ کشمیری کلچے پر معدے کو پابند کر لیا تھا- گھر کی طرف آنا جانا بہت کم ہو گیا تھا- نہ خوش لباسی رہی تھی، نہ خوش قبائی- بس کھدر کے ڈھیلے ڈھالے کپڑے پہننے لگے تھے-

اسی زبان بندی کے زمانے میں قلب پر کچھ واردات گزریں جس کے نتیجے میں ۱۹۳۵ء میں ملازمت سے مستعفی ہو کر لاہور چلے گئے- لاہور میں یہ معمول رہا کہ صبح سویرے سبزی منڈی جا کر دس بارہ آنے کی مزدوری کرتے اور کھانے پینے کی چند چیزیں لے کر مصری شاہ میں میاں عبدالعزیز مالواڈا بیرسٹرایٹ لا مرحوم کے باغ میں جا کر خاموشی سے بیٹھ جاتے اور پھر یاد خدا میں مشغول ہو جاتے- یہ ہر روز کا معمول تھا- اس کے علاوہ زندگی کی کوئی راہ متعین نہیں تھی-

کچھ وقت اسی طرح گزار کر لاہور سے میاں والی کا رخ کیا اور واں بھچراں کے مشہور عالم دین مولانا حسین علی کی خدمت میں پہنچے اور ان سے تصفیہ قلب و روح کے لیے استدعا

کی۔ سال بھر سے کچھ زیادہ عرصہ وہاں قیام رہا۔ مولانا حسین علی نے اپنا اطمینان کر لینے کے بعد ہدایت فرمائی کہ کلکتے کا رخ کرو اور وہاں تبلیغ دین میں مصروف ہو جاؤ۔ چنانچہ وہیں سے سوئے کلکتے روانہ ہو گئے۔

۱۹۳۷ء میں گھر کی یاد آئی تو گھر واپس آئے اور دو اڑھائی مہینے پونچھ شہر میں گزار کر پھر کلکتے چلے گئے۔ بعد ازاں مستقل طور پر زندگی کی گاڑی کو سفر پر لگا دیا۔ آج یہاں، کل وہاں۔ ۱۹۴۰ء کے لگ بھگ علی گڑھ پہنچ گئے۔ وہاں سے دہلی اور سہارن پور کا عزم کیا۔ پھر واپس علی گڑھ آ گئے .... علی گڑھ میں سر ضیاء الدین مرحوم اور ڈاکٹر افضال قادری (شعبہ فلسفہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) کے ساتھ مراسم زیادہ تھے لہٰذا وہاں کافی عرصہ قیام رہا۔

اسی صحرانوردی میں جنوبی ہند کو روانہ ہوئے اور کچھ عرصہ حیدر آباد (دکن) میں اقامت رہی۔ وہاں ریاست کے وزیر اعظم سر اکبر حیدری سے کسی معاملے میں تلخی پیدا ہوئی تو اس سے مزید آگے جنوب کو مدراس اور میسور کی طرف جا نکلے۔ طویل تر سفر و سیاحت کے بعد واپس دہلی چلے آئے۔

یہاں جامعہ ملیہ کے ارباب انتظام اور اساتذہ کے ساتھ تعلق بڑھایا۔ دہلی سے آگے ندوۃ العلما (لکھنؤ) کے اصحاب علم کے ساتھ رسم و راہ پیدا کی۔ اب ان کی سفری تگ و تاز علی گڑھ، جامعہ ملیہ اور ندوۃ العلما کی مثلث پر آ کر رک گئی۔

برصغیر کی تقسیم سے تین سال قبل (۱۹۴۴ء میں) پونچھ شہر آئے اور دو ماہ کے قریب گھر میں قیام کیا، پھر واپس دلی چلے گئے .... دلی میں میں انھوں نے چند کتابیں تصنیف کیں۔ ان میں ایک کتاب برصغیر کے خانقاہی نظام کی اصلاح کے متعلق تھی۔ اس کا نام ”اصل ثابت“ رکھا۔ یہ کتاب دو جلدوں میں شائع ہوئی۔

اس کے ساتھ ہی کمیونزم کے خلاف بھرپور قلمی جہاد شروع کر دیا اور یہ جہاد زندگی کے آخری دم تک جاری رہا۔ بلکہ کہنا چاہیے کہ ان کی مساعی کا بڑا ہدف یہی تھا۔ تقسیم ملک کے بعد ہندوستان کی شہریت اختیار کر لی اور وہیں رہنے کا فیصلہ کیا۔

کمیونزم کی مخالفت کے سلسلے میں ہندو، سکھ، عیسائی، اہل علم کا ایک وفد لے کر پنڈت جواہر لال نہرو سے ملاقات کی اور انھیں کمیونزم کی حمایت سے باز رہنے پر زور دیا۔

تقسیم ملک کے زمانے میں سکھوں نے مسلمانوں پر جو بے پناہ مظالم ڈھائے تھے اس سے وہ بے حد متاثر تھے۔ چنانچہ سکھ لیڈروں سے ملے اور سکھ پنتھ سے تحریری اپلیں کیں اور ان پر واضح کیا کہ ان کے پہلے گرو بابا نانک ہندو سماج کے بے شمار دیوی دیوتاؤں اور ان کے ذات برادریوں اور اونچ نیچ کے طور طریقوں کے خلاف احتجاجاً ہندو سماج سے الگ ہو گئے تھے۔ وہ ان کے خداؤں کی کثرت کی مخالفت میں اللہ کی توحید کا پرچم لے کر نکلے۔ لیکن اب تم ہو کہ ان کے نام لیوا ہو کر پھر ہندو سماج کی کان نمک میں شامل ہو گئے ہو، اور نہ صرف یہ کہ اس میں شامل ہو کر نمک ہو گئے ہو بلکہ ان کے ہاتھوں میں کھیل کر انسانیت سوز مظالم پر اتر آئے ہو۔ تمھارے لیے بہتر یہی ہے کہ توحید الٰہی کی طرف واپس آ جاؤ اور ایک انسانی برادری میں شامل ہو جاؤ۔

جن لوگوں نے وہ زمانہ دیکھا ہے، انھیں اس کی شدتوں کا پورا علم ہے۔ اس زمانے میں اس قسم کی باتیں کرنا اور ہندوؤں میں رہ کر کسی مسلمان کا ہندوؤں اور سکھوں کے خلاف تحریری یا زبانی طور پر ان کے مقابلے میں آنا نہایت مشکل تھا اور صوفی صاحب نے ان مشکلات کا مقابلہ کیا اور مسلمانوں کی کھل کر حمایت اور سکھوں اور ہندوؤں کی سخت مخالفت کی۔ اس دور میں ہمارے نزدیک اصل مسلمان وہ تھے، جو ہندوستان میں رہ کر مسلمانوں کی نصرت و حمایت کا باعث ثابت ہوئے۔ ہمارے جیسے لوگوں کا "ہجرت" کے نام سے ترک وطن کرنا فرار تھا۔ ہندوستان سے تعلق رکھنے والے مسلم لیگی لیڈروں کو تو لازماً وہاں رہ کر ان مسلمانوں کی مدد کرنی چاہیے تھی، جنھوں نے ان کی ہر بات پر لبیک کہا تھا۔ وہ انھیں غیر مسلموں کے حوالے کر کے وہاں سے بھاگ آئے۔ صوفی نذیر احمد کاشمیری کا عملی سیاست سے کوئی تعلق نہیں تھا، وہ نہ صرف خود وہاں رہے بلکہ انھوں نے نہایت بہادری کے ساتھ ہندوؤں اور سکھوں کی مخالفت کی اور مسلمانوں کی حمایت کا علم بلند کیا۔

اس طوفانی دور میں وہ ایک لمحے کے لیے خاموش نہیں بیٹھے۔ انھوں نے ہندو جاتی

میں برہمن کے نسلی تفوق، بتیس کروڑ دیوی دیوتاؤں اور اونچ نیچ ذاتوں کے نظام کو انتہائی جرات مندانہ انداز میں چیلنج کیا۔ ان کا دل گردہ ملاحظہ ہو کہ وہ ہندوؤں کے اس مشہور آشرم میں جو یوپی کے ضلع اناؤ میں قائم ہے اور جسے گنگا گھاٹ آشرم کہا جاتا ہے، طویل مدت تک قیام پذیر رہے اور ہندوؤں کے عقیدہ کثرت الہ اور ذات برادری کے نظام پر کھل کر تنقید کرتے رہے۔

منوسمرتی کے مطابق ہندوؤں کے چار ورن یعنی چار ذاتیں ہیں۔ ایک برہمن، دوسرے کشتری، تیسرے ویش اور چوتھے شودر...... برہمن خالق کائنات برہما کے منہ سے پیدا ہوئے ہیں۔ کشتری بازوؤں سے، ویش رانوں سے اور شودر کی پیدائش ان کے پیروں سے ہوئی ہے۔ برہمنوں اور کشتریوں (یعنی راجپوتوں) کو ''سوَرن جاتیاں'' کہا جاتا ہے جس کے معنے سونے کی ذاتیں ہیں، یعنی نہایت اونچے درجے کی برادریاں۔ ویش (یعنی بنیے) اور تجارت پیشہ لوگ اپنے مال و دولت کی وجہ سے معاشرے (سماج) میں اپنا ایک مقام بنا لیتے ہیں، جس کی بنا پر سب لوگ ان کا احترام کرتے ہیں، لیکن شودروں اور نچلی جاتی کے لوگوں کو منوسمرتی (منو کے قوانین) کے مطابق سب سے کم درجہ دے کر ان سے ادنیٰ درجے کے کام لیے جاتے ہیں۔

ہندوؤں کے عقیدے کے مطابق ''منو'' کو انسانی مخلوق کا جداعلیٰ اور برہما کا بیٹا کہا جاتا ہے۔ ان کا نقطہ خیال یہ ہے کہ مختلف ادوار میں چودہ منو عالم وجود میں آئے ہیں۔

ہندوستان میں صوفی نذیر احمد کاشمیری نے ہندوؤں کے اس عقیدے کی شدید مخالفت کی اور اس وقت کی جب ان کے سامنے لب کشائی کرنا انتہائی مشکل تھا۔

صوفی صاحب نے آل انڈیا جمعیت اہل حدیث کے دفتر سے بھی رابطہ قائم رکھا اور جمعیت کے رہنماؤں سے ان کی ملاقاتوں اور مختلف معاملات میں باہم مشورے کا سلسلہ جاری رہا۔ وہ نہایت متحرک اور بدرجہ غایت مستعد بزرگ تھے۔ جمعیت علمائے ہند کے دفتر میں بھی ان کی آمدورفت رہی۔

۱۹۵۶ء میں وہ ویزے پر پاکستان آئے اور اسی زمانے میں ان سے میری ملاقات

ہوئی- قیام پاکستان کے بعد وہ پہلی دفعہ یہاں تشریف لائے تھے- ان دنوں ہفت روزہ ''الاعتصام'' کی ادارت میرے ذمے تھی اور الاعتصام کا دفتر یوں سمجھیے کہ ان کا مسکن تھا- ان کے بہت سے مضامین ''الاعتصام'' میں چھپے- مجھ سے وہ نہایت شفقت کا برتاؤ فرماتے تھے- وہ تقریباً دو مہینے پاکستان رہے- ان کا خانوادہ پونچھ سے نقل مکانی کر کے کھوٹہ (آزاد کشمیر) میں آ گیا تھا- وہ ان سب سے ملے- ''کمیونزم اور اسلام'' کے نام سے انھوں نے ایک کتاب لکھی جو ادارہ نوائے وقت کے توسط سے شائع ہوئی-

ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے وہ نہایت متفکر رہتے تھے- کم وبیش دو مہینے وہ پاکستان رہے- پھر واپس چلے گئے.......... لیکن کچھ عرصے کے بعد پھر پاکستان کا عزم کیا- ۱۹۶۴ء میں وہ پاکستان آئے تو انھوں نے ''نوائے وقت'' اور اس زمانے کے مشہور روزنامے ''کوہستان'' میں چند ایسے مضامین شائع کرائے جن میں ہندوستان کی حکومت کے بعض پہلوؤں کو سخت تنقید کا نشانہ بنایا گیا تھا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ واپس ہندوستان گئے تو وہ مضامین ان کے لیے بلائے بے درماں بن گئے- انھیں دہلی میں نظر بند کر دیا گیا اور ان کا پاسپورٹ ضبط کر لیا گیا- پاکستان میں قیام کے دوران انھوں نے ''جہاد اعظم کی تیاری'' کے عنوان سے ایک کتاب بھی لکھی تھی جو مکتبہ سلفیہ شیش محل روڈ لاہور کی طرف سے شائع ہوئی تھی-

ان کا ضبط شدہ پاسپورٹ ۱۹۸۳ء میں ایک ہندو لیڈر ایل کے ایڈوانی کی مداخلت سے انھیں واپس مل گیا تھا- یہ وہی ایل کے ایڈوانی ہیں جو نہایت متعصب ہندو ہیں اور موجودہ واجپائی حکومت میں وزیر داخلہ ہیں- ان کا پورا نام لال کرشن ایڈوانی ہے- یہ دراصل سندھی ہیں اور تقسیم ملک کے زمانے میں صوبہ سندھ سے ہندوستان گئے تھے- صوفی صاحب سے ان کے اچھے مراسم تھے اور یہ صوفی صاحب کا بے حد احترام کرتے تھے-

پاسپورٹ بحال ہوتے ہی ۱۹۸۳ء میں وہ ویزے پر اپنے گھر (فارورڈ کھوٹہ آزاد کشمیر) آئے اور ڈیڑھ ماہ کے قیام کے بعد واپس ہندوستان چلے گئے-

اپریل ۱۹۸۴ء میں وہ آخری دفعہ اپنے گھر (پاکستان) تشریف لائے اور ستمبر میں

واپس دلی چلے گئے-دلی جاتے ہی بیمار پڑ گئے-جون ۱۹۸۵ء میں بیماری نے شدت اختیار کرلی تو اپنے ایک مرحوم دوست ڈاکٹر برکت علی کے بیٹے محسن صاحب کے پاس نخاسہ بازار سہارن پور منتقل ہو گئے-

محسن صاحب نے ان کا بہت علاج کرایا-لیکن بیماری روز بروز شدید تر اور طویل تر ہوتی گئی-معدے میں کینسر ہو گیا تھا، جس سے لحہ بہ لحہ تکلیف بڑھتی چلی گئی............آخر ۵ دسمبر ۱۹۸۵ کو صبح آٹھ بجے راہ گزر عالم آخرت ہو گئے-انا للہ وانا الیہ راجعون

محسن صاحب کی طرف سے اطلاعِ وفات کا خط جو انھوں نے صوفی صاحب کے فرزند گرامی جناب مختار احمد ہاشمی کے نام تحریر کیا ۱۹ دسمبر ۱۹۸۵ کو فارورڈ کہوٹہ (آزاد کشمیر) پہنچا-

انھوں نے لکھا تھا کہ صوفی صاحب نے ۵ دسمبر ۱۹۸۵ کو زندگی کی آخری نماز فجر پڑھی-

پھر تھوڑی دیر بعد آٹھ بجے فرشتہ اجل آ گیا اور صوفی صاحب چوراسی سال عمر پا کر بارگاہ الٰہی میں پہنچ گئے-

اللهم اغفرله وارحمه وعافه واعف عنه

صوفی صاحب خالق کائنات کی طرف سے مضطرب دل اور متحرک وجود لے کر اس دنیا میں آئے تھے-ان کا سینہ مسلمانوں کی ہمدردی سے بھرپور تھا اور ان کی روح انسانیت کی محبت میں بے چین رہتی تھی-وہ ہر جگہ کے مسلمانوں کے معاون اور ہر مقام میں بسنے والے مظلوم انسانوں کے حامی تھے-ان کا طریق عمل واضح کرتا تھا اور ان کا اسلوب حیات پکار پکار کر کہتا تھا-

درویش خدا مست ہوں، شرقی ہوں نہ، غربی
گھر مرا نہ دلی نہ سفا ہاں نہ سمرقند

اندازہ کیجیے وہ کہاں پیدا ہوئے، کس طرح تعلیم حاصل کی، قافلہ حیات کن کن مراحل سے گزرا، کن کن لوگوں سے ملاقاتیں کیں اور کہاں وفات پائی- کشمیر کی سرزمین سے

ابھرے اور سہارن پور میں موحدوں کے قبرستان کی مٹی میں دفن کر دیے گئے۔

اللھم اکرم نزله ووسع مدخله و نور قبره و اغسله بالماء والثلج والبرد

صوفی صاحب نے بہت سی کتابیں تصنیف کیں۔ان کی جدوجہد کی جولان گاہ ہندوستان کی سرزمین تھی، اس لیے ان کے اثرات قلم ان مقامات میں موجود ہیں جہاں جہاں وہ قیام کرتے رہے تھے، بالخصوص جامعہ ملیہ (دہلی) اور سہارن پور میں وہ زیادہ سکونت پذیر رہے، اس لیے ان کے زیادہ مسودات وہیں ہونے چاہئیں۔تاہم ان کی چند تصانیف (بصورت رسائل اور پمفلٹ) حسب ذیل ہیں۔

۱۔اصل ثابت: حصہ اول و حصہ دوم	یہ کتاب خانقاہی نظام کی اصلاح کے لیے لکھی گئی۔
۲۔کمیونزم اور اسلام	یہ کتاب ادارہ نوائے وقت نے شائع کی۔
۳۔تجدید دین انسانی	اسے مکتبہ کارواں لاہور نے شائع کیا۔
۴۔جہاد اعظم کی تیاری	یہ کتاب مکتبہ سلفیہ شیش محل روڈ لاہور نے شائع کی۔
۵۔شورائیت ملی یا شخصی مرکزیت	ہندوستان میں شائع ہوئی۔
۶۔اطمینان وفلاح انسانی کی واحد راہ	ہندوستان میں شائع ہوئی۔
۷۔کشمیر عوامی سوشلسٹ کانفرنس کا دستوری خاکہ	سری نگر میں شائع ہوئی۔
۸۔ذہن انسانی کی حقیقت اور اس کی مختلف شکلیں	یہ پمفلٹ مکتبہ سلفیہ لاہور نے شائع کیا۔

9-Is it wise to Hinduise Muslims or to Islamic India?

10-Islam or Brahmanism and Communalism.

11-Need for a worldwide Religious or morale, social and Economic-Rovolution and its Definite form.

یہ تو وہ ریکارڈ ہے جو صوفی صاحب کے بیٹے سید مختار احمد ہاشمی وقتاً فوقتاً ان سے لیتے رہے- ان مطبوعہ کتب و رسائل کا کچھ پتا نہیں چل سکا جسے انھوں نے ہندوستان میں چھوڑا-
اب آیئے ان کے حلقہ تعارف اور دائرہ متعلقین کی طرف............!

یہ سلسلہ بہت وسیع تھا جو پاکستان اور ہندوستان بلکہ بنگلہ دیش میں بھی دور تک پھیلا ہوا تھا- ان کی زندگی کا زیادہ عرصہ ہندوستان میں گزرا اس لیے ان کے ذاتی رابطے زیادہ تر وہیں کے حضرات سے تھے- وہاں کی حکومت کے قائدین اور مختلف سیاسی جماعتوں کے افراد سے ان کے مراسم تھے- مثلاً ابو الکلام آزاد، گاندھی، جواہر لال نہرو، بھولا بھائی ڈیسائی، ڈاکٹر راجندر پرشاد، رفیع احمد قدوائی، آصف علی، ڈاکٹر سید محمود، جے پرکاش نارائن، رام منوہر لوہیا وغیرہ سب کانگرسی اور غیر کانگرسی زعما سے ان کے مراسم تھے- اسی طرح اکابر دیوبند میں سے مولانا اشرف علی تھانوی اور قاری محمد طیب سے، جمعیت علماے ہند کے رہنماؤں میں سے مولانا حسین احمد مدنی، مولانا احمد سعید دہلوی، مفتی کفاہت اللہ اور مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی وغیرہ سے، اکابر جامعہ ملیہ میں سے ڈاکٹر ذاکر حسین خاں اور ان کے ساتھیوں سے، اکابر ندوۃ العلما میں سے مولانا ابو الحسن علی ندوی اور ان کے رفقاے کرام سے، دار المصنفین اعظم گڑھ میں سید سلیمان ندوی، مولانا مسعود علی ندوی، حاجی معین الدین وغیرہ سے، ہندو لیڈروں میں سے ایل کے ایڈوانی، ڈاکٹر شیاما پرشاد مکرجی اور ان کے ہم نواؤں سے، اہل حدیث حضرات میں حاجی محمد صالح اور مولانا عبد الوہاب آروی وغیرہ سے ان کے علائق تھے- آر ایس ایس اور جن سنگھ وغیرہ جماعتوں کے چھوٹے بڑے سب لیڈر ان کا احترام کرتے تھے اور ان کی بات توجہ سے سنتے تھے-

ایک مرتبہ مجھے خود صوفی صاحب نے بتایا تھا کہ وہ کچھ عرصہ دہلی میں ہندو مہا سبھا کے دفتر میں رہے تھے- اس جماعت کے اس وقت کے صدر کا نام بھی انھوں نے مجھے بتایا تھا جو مجھے یاد نہیں رہا- صوفی صاحب نے فرمایا تھا کہ وہ مختلف غیر مسلم اہم شخصیتوں کو خطوط تحریر کیا

کرتے تھے جن میں اسلامی اقدار کی وضاحت کی جاتی تھی- یہ الفاظ دیگر تبلیغی خطوط تحریر کیا کرتے تھے، ہندو مہا سبھا کے صدر نے صوفی صاحب کو ٹائپ رائٹر کی سہولت بھی دے رکھی تھی- ٹائپ صوفی صاحب خود ہی کیا کرتے تھے-

صوفی صاحب نے بتایا کہ انھوں نے ان کو کھانے کی پیش کش بھی کی تھی، لیکن انھوں نے یہ پیش کش قبول نہیں کی اور شکریے کے ساتھ فرمایا کہ کھانا وہ اپنا کھائیں گے...... دو یا تین مہینے وہ ان کے دفتر میں رہے- اسلام کی حقانیت اور اس کے مقابلے میں دیگر مذاہب کی کمزوریوں کے متعلق صوفی صاحب کی ان سے گفتگو ہوتی رہتی تھی- یہ مسلمانوں کے خلاف انتہائی متعصب ہندوؤں کی جماعت ہے- یہ بھی ایک عجیب تاریخی حقیقت ہے کہ انگریزوں سے مسلمانوں کی حقوق طلبی کے لیے مسلم لیگ ۱۹۰۶ء میں قائم ہوئی تو اس کے مقابلے میں ہندو مہا سبھا ہندوؤں کے حقوق کے تحفظ کا دعویٰ لے کر اس سے اگلے سال ۱۹۰۷ء میں عالم وجود میں آ گئی-

صوفی صاحب نقطۂ نظر کے اختلاف کے باوجود تمام جماعتوں کی سرکردہ شخصیتوں سے میل جول رکھتے تھے- ۱۸ فروری ۱۹۵۸ کو مولانا ابوالکلام آزاد کے دماغ کی شریان پھٹی تو تمام اخباروں میں یہ الم ناک خبر شہ سرخیوں کے ساتھ شائع ہوئی تھی- صوفی صاحب اس دن لاہور میں تھے- میں صبح گھر سے شیش محل روڈ پر اپنے دفتر آیا تو ان سے ملاقات ہوئی- اس خبر سے وہ نہایت افسردہ تھے- فرمایا نہ صرف مسلمانوں کو بلکہ پورے ہندوستان کو اتنا صاحب فراست اور مدبر رہنما نہیں ملے گا- یہ بیماری جس نے مولانا پر حملہ کیا ہے نہایت خطرناک ہے- دعا کیجیے یا تو وہ اس سے بالکل صحت یاب ہو جائیں یا جلد سفر آخرت پر روانہ ہو جائیں- بیماری نے طول کھینچا تو وہ اس میں پھنس جائیں گے- چنانچہ چوتھے دن ۲۲ فروری ۱۹۵۸ کو ان کا انتقال ہو گیا-

ہندوستان کی جن سیاسی اور مذہبی جماعتوں کے رہنماؤں سے ان کے مراسم تھے، ان میں سے بعض رہنماؤں کا ذکر گزشتہ سطور میں گزر چکا ہے- اب ملاحظہ فرمایے پاکستانی حضرات کے نام جن سے صوفی صاحب متاثر تھے یا جو صوفی صاحب سے متاثر تھے، وہ تھے

میاں عبدالعزیز مالواڈہ مرحوم، حضرت حافظ محمد گوندلوی، مولانا محمد حنیف ندوی، چودھری محمد علی، مولانا عطاء اللہ حنیف، مولانا معین الدین لکھوی، حمید نظامی، پروفیسر مرزا محمد منور، ڈاکٹر برہان احمد فاروقی اور دیگر بہت سے حضرات............!

یہاں یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ صوفی صاحب نے دینی تعلیم لاہور میں بریلوی مکتب فکر کے مدرسے میں حاصل کی تھی جس کا نام مدرسہ غوثیہ تھا- ان کے صاحب زادے جناب سید مختار احمد ہاشمی نے ۳ مئی ۱۹۹۹ء کو مجھے ایک مکتوب ارسال فرمایا تھا، اس میں وہ لکھتے ہیں:

> ''مدرسہ غوثیہ اندرون شہر لاہور میں تعلیم حاصل کرنے کے باوجود اباجی ہمیشہ سلفی رہے- گھر میں بھی اس سلسلے میں اکثر ان کے ساتھ جھگڑا رہتا تھا-''

لاہور میں یوں تو صوفی صاحب کا حلقہ تعارف بہت پھیلا ہوا تھا لیکن وہ یہاں تشریف لاتے تو ان کا زیادہ تر قیام ''الاعتصام'' کے دفتر میں ہوتا تھا- ادارہ ''الاعتصام'' کے معزز رکن جناب علیم ناصری معروف شاعر ہیں اور صوفی صاحب بھی فارسی اور اردو میں کبھی کبھی شعر کہا کرتے تھے، جب یہ دونوں اکٹھے ہوتے تو ان کا سلسلہ شعر گوئی شروع ہو جاتا تھا-

صوفی صاحب کے چند اردو اشعار ملاحظہ ہوں-

ہوں مجبور ایک شوخ کی بندگی کا
مآل نظر تھا یہی زندگی کا
کھنچا جا رہا ہوں بخود سوے منزل
صلہ چاہوں کیا ایسی کارندگی کا
پلٹ جاؤں تجھ سے کہاں تاب مجھ میں
کروں ناز کیا ایسی فرخندگی کا
دل دور بیں سے ہے اتنی سہولت
سہارا سا ہے اک خوش آئندگی کا
الجھنے میں ہے لطف سعی مسلسل

یہ ہے جاذبہ جادۂ زندگی کا
یقین سے ہے مضبوط تعمیر انساں
یہی گام اول ہے پائندگی کا
کٹا دوں سر راہ سرکو وفا میں
صلہ یہ بھی ہے اک مری بندگی کا

چند شعر اور ملاحظہ ہوں۔

لطف ہے اک لطف ان کی دید میں
غوطہ زن ہوں چشمہ خورشید میں
غم سے تھی لبریز میری شام غم
عید کی خوشیاں ہیں میری عید میں
حق کے آئین پر ہے ہر شے گام زن
چاند سورج ہیں مری تائید میں
انتشار دہر کی شیرازہ بند
قوتیں مستور ہیں توحید میں
ایک رنگیں مسکراہٹ پہ اثر
خار و گل مصروف ہیں تجدید میں

اب چند فارسی اشعار پڑھیے

اوزمی باشم بمہاے سوگوار
انتظارے می کشم شبہاے تار
زندگی یعنی تپید یک نفس؟
مرگ؟ یعنی بحر نا پیدا کنار
ہر دواز آثار اظہار حیات

نغمہ پیہم نمودش زیروزار
تار و پودم ز امتزاج حسن وعشق
زاں سبب گہ پرسکوں گہ بے قرار
پر تو حسنم جہاں محبوب کرد
چار سو مشکبار لالہ زار

اب صوفی صاحب کے بارے میں ایک اور بات......!

میں ۲۰۰۰ء میں حج بیت اللہ کے لیے گیا تو مارچ کے پہلے عشرے میں جمعۃ المبارک کے بعد مسجد نبوی کے باب رحمت میں جامعہ اسلامیہ عمرآباد (مدراس ہندوستان) کے ان طلبا سے جو مدینہ یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کرتے ہیں اور برطانیہ کی جمعیت اہل حدیث کے معزز ارکان سے ملاقات ہوئی۔ اس موقعے پر ایک نوجوان نے (جن کا نام افسوس ہے میں پوچھ نہیں سکا) دو چیزیں عنایت کیں جو ایک لفافے میں بند تھیں۔ دونوں کا تعلق صوفی نذیر احمد کاشمیری سے ہے۔ نوجوان نے کہا:

"یہ آپ لے لیں، آپ کے کام کی چیزیں ہیں......" اس عنایت پر میں نے ان کا شکریہ ادا کیا اور حیران ہوا کہ انھیں کیسے پتا چلا کہ یہ میرے کام کی چیزیں ہیں۔

ان دونوں میں سے ایک مکتوب ہے جو ۹ نومبر ۱۹۹۸ء (۱۸ رجب ۱۴۱۹ھ) کو جناب ظہیر الدین صاحب نے عمرآباد (ہندوستان) سے مدینہ منورہ میں قاضی عبدالباسط صاحب کے نام ارسال کیا۔ بدقسمتی سے نہ میں ظہیر الدین صاحب سے واقفیت رکھتا ہوں نہ قاضی عبدالباسط سے......! البتہ ان کے علاوہ جن دوستوں کے نام اس مکتوب میں درج ہیں ان سے وہاں تعارف ہوا تھا۔ ڈاکٹر ضیاء الرحمٰن اعظمی نے تو میرے عزیز دوست ڈاکٹر طاہر محمود صاحب (مدینہ یونیورسٹی) کی وساطت سے رات کے کھانے پر بھی مدعو کیا تھا۔ ان کے مکان پر ضیا اعظمی کے نام کی تختی نصب تھی۔

دوسری چیز جو انھوں نے عنایت کی وہ ایک کیسٹ ہے جو صوفی نذیر احمد صاحب سے متعلق مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوری کی یادداشتوں پر مشتمل ہے۔ مولانا صفی الرحمٰن برصغیر کی

جماعت اہل حدیث کے نہایت معزز رکن ہیں جن کے علمی کارناموں میں ''الرحیق المختوم'' اپنی نوعیت کا بہت بڑا کارنامہ ہے- نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ پر یہ مہتم بالشان کتاب ہے-

مولانا ممدوح دسمبر ۱۹۸۴ء میں جب پاکستان تشریف لائے تھے تو مجھے ان کو سلام عرض کرنے کی سعادت حاصل ہوئی تھی- میں ہمیشہ اہل علم کو سلام عرض کرنے کا خواں رہا ہوں اور رہتا ہوں- بات درحقیقت یہ ہے کہ میں بہت بڑا غرض مند ہوں اور چاہتا ہوں کہ جہاں تک ممکن ہو اہل علم سے استفادہ کروں- یہ غرض ہر وقت میرے ساتھ رہتی ہے، یہی غرض مجھے مولانا صفی الرحمٰن کی خدمت میں لے گئی تھی- انھیں تو شاید میری حاضری کا علم نہیں ہوگا- ہمارا معاملہ بہرحال یہ تھا کہ ''سلام روستائی بے غرض نیست''

''الرحیق المختوم'' ان کی وہ عربی تصنیف ہے جس پر انھیں سعودی حکومت کی طرف سے پہلا فیصل ایوارڈ ملا تھا- خود ہی انھوں نے اس کا اردو ترجمہ کیا جو مکتبہ سلفیہ شیش محل روڈ لاہور کی طرف سے کتاب کی شان کے مطابق خوب صورت طریقے سے شائع ہوا اور نہایت مقبول ہوا-

اگر اللہ تعالیٰ نے زندگی عطا فرمائی تو مولانا صفی الرحمٰن مبارک پوری پر ان شاء اللہ مستقل مضمون لکھا جائے گا جو شخصیات کے کسی مجموعے میں شائع ہوگا-

اب آیئے پہلے ظہیر الدین صاحب کا خط پڑھتے ہیں

۹ نومبر ۱۹۹۸ء (۱۸ رجب ۱۴۱۹)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عزیز گرامی قدر جناب قاضی عبدالباسط صاحب حفظہ اللہ وتولاہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

الحمدللہ خیریت حاصل ومطلوب- آپ کا مرسلہ لفافہ مل کر کاشف احوال ہوا- جواب دینے میں قدرے تاخیر ہوگئی- کوئی خاص وجہ نہیں تھی- بس امروز وفردا میں یہ تاخیر ہوگئی-

صوفی نذیر احمد کاشمیری رحمۃ اللہ علیہ سے کب ملاقات ہوئی، یاد نہیں ہے- البتہ اتنا یاد ہے کہ پہلی ملاقات بنارس میں ہوئی تھی- یہ غالباً ۵۵-۱۹۵۶ء کی بات ہے- اس وقت صوفی

صاحب بنارس میں مقیم تھے، جہاں تک مجھے معلوم ہے ان کا کوئی مستقل ٹھکانا نہیں تھا- پھر ۸۷-۱۹۸۸ء[۱] میں عمر آباد تشریف لائے تھے- یاد پڑتا ہے کہ دو تین[۲] یہاں قیام رہا- ایک دن میں نے کہا کہ آج میرے گھر میں کھانا کھائیں- فرمایا کہ اس شرط کے ساتھ کہ روٹی سادی اور ترکاری کوئی ایک ہو- میں نے ویسا ہی کیا- بہت خوش ہوئے اور خوب سیر ہو کر کھایا- کھانے پینے اور لباس و گفتگو میں بڑے بے تکلف اور سادہ تھے-

ملاقات سے پہلے میری اور ان کی دور کی شناسائی تھی- لوگوں کی زبانی سن کر اور ترجمان (جمعیت اہل حدیث دہلی) اور صدق جدید (لکھنؤ) میں ان کے مضامین پڑھ کر...... چھوٹی بڑی کتابوں، پمفلٹ اور اخبارات و رسائل میں مضامین کی شکل میں اتنا کچھ لکھا کہ اگر ان تمام کو جمع کیا جائے تو بڑی بڑی مجلدات تیار ہو جائیں گی- میں نے ان کی چند چھوٹی چھوٹی کتابوں کو دیکھا ہے- ان میں ایک کا نام ہے "مذہب کی حقیقت اور اس کی عالم گیر شکل" صوفی صاحب کا مشن جس کے تنہا وہ مبلغ تھے ایک خدا کا عقیدہ- ایک عالم گیر بھائی چارہ کا تصور- انسانی شرافت (خلافت) کا عقیدہ- ان کے پورے مشن کو سمجھنے کے لیے انہی کی کتاب کا ایک اقتباس کافی ہے- فرماتے ہیں: "گزشتہ ۲۶ برسوں سے سارا ہندوستان ہندو مسلم فسادات کی جس آگ میں جل رہا ہے وہ کوئی نئی چیز نہیں، فرقہ پرستی ہندوستان میں اس وقت سے قائم ہے جب آریاؤں نے ہندوستان کو فتح کیا اور یہاں کے قدیم باشندوں کو اچھوت قرار دیا اور انھیں سارے انسانی حقوق سے محروم کر دیا-

"اب جب کہ حکومت پھر برہمن کے ہاتھ میں آئی تو قدرتی طور پر مسلمانوں کو بھی اچھوت کے مقام پر لانے کی مہم شروع کر دی گئی-

چونکہ آریائی دھرم میں مساوات انسانی کا تصور ایک گناہ کبیرہ ہے، اگر ہندوستانی معاشرے کو جمہوری مساوات کے سانچے میں ڈھالنا ہے تو پھر اس فسطائی دھرم اور ثقافت کو

---

[۱] فاضل مکتوب نگار کو سہو ہو گیا ہے- ۱۹۸۵ء میں تو صوفی صاحب وفات پا گئے تھے، ۱۹۸۷ء، ۱۹۸۸ء میں عمر آباد کیسے تشریف لے گئے؟ یہ کوئی اور سن ہوگا-

[۲] مکتوب میں "دو تین" ہی لکھا ہے- میرا خیال ہے، دو تین ہفتے یا مہینے ہوگا-

اسلام کے ایک رب العالمین کے اعتقاد اور ایک عالم گیر انسانی بھائی چارے اور عالم گیر انسانی شرافت (خلافت الٰہی) سے بدل دینا ضروری ہے۔ اس کی اور کوئی متبادل صورت نہیں ہے۔"

صوفی صاحب نے پنڈت نہرو اور جگ جیون رام سے لے کر تمام ہندو لیڈروں کو اپنی دعوت پہنچائی۔ پنڈت سندر لال اور پروفیسر رام سنگھ وغیرہ نے صوفی صاحب کی کتابوں پر مقدمے لکھے اور ان کے مشن کو بہت سراہا۔ امید کہ آپ بخیر ہوں گے۔

ظہیر الدین عمر آباد

دوسری اہم بات یہ ہے کہ میرے بڑے لڑکے زید سراج الدین اپنی اہلیہ کے ساتھ اس سال حج ۱۹۹۹ء کے لئے آ رہے ہیں، ان کا کور نمبر اس طرح ہے۔

کوڈ نمبر T.N.533-2

آپ مدینہ میں عمری طلبہ کو اطلاع کر دیں۔ اسی طرح کے نور محمد جو پی۔ ایچ۔ ڈی کر رہے ہیں، محمد الیاس اعظمی، سید حمید حسینی اور مظفر الاسلام اور مولوی سعید احمد صغیر پی۔ ایچ۔ ڈی اور جناب ڈاکٹر ضیاء الدین اعظمی وغیرہم کو بھی خبر کر دیں۔ ان کے مدینہ پہنچنے پر ان دونوں کے ساتھ بھرپور تعاون کریں۔ تمام عمری برادران اور پرسان احوال کو سلام پہنچائیں۔

ظہیر الدین عمر آباد

No. 31103 Main Road

OOMERABAD

اس مکتوب سے واضح ہوتا ہے کہ ہندوستان کے اہل علم بالخصوص اہل حدیث صوفی نذیر احمد کاشمیری سے قلبی تعلق رکھتے تھے اور ان کے حالات سے آگاہ ہونے کے خواہاں تھے اسی لیے قاضی عبدالباسط صاحب نے جناب ظہیر الدین صاحب کو عمر آباد میں خط لکھا۔

افسوس ہے تقسیم ملک کے بعد نہ ہندوستان کے حضرات پاکستان کے اہل علم سے پوری طرح واقف ہیں اور نہ پاکستان کے لوگ ہندوستان کے اصحاب علم سے زیادہ رسم وراہ

رکھتے ہیں۔یعنی تقسیم ملک سے علم بھی تقسیم ہو گیا۔چنانچہ یہ فقیر جناب ظہیر الدین سے بالکل متعارف نہیں جب کہ ان کے انداز تحریر سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ جامعہ عمر آباد میں یا تو منصب تدریس پر فائز ہوں گے یا اسی قسم کے اور علمی سلسلے سے منسلک ہوں گے۔

اب ملاحظہ کیجیے وہ کیسٹ جو صوفی صاحب کے متعلق مولانا صفی الرحمٰن کی یادداشتوں پر مشتمل ہے۔اس کی حیثیت ایک انٹرویو کی ہے جو مولانا ممدوح سے کسی صاحب نے کیا۔۔۔مولانا فرماتے ہیں:

''صوفی نذیر احمد ایک بار جامعہ سلفیہ (بنارس) تشریف لائے۔ان دنوں ان کے ساتھ مجلسیں ہوا کرتی تھیں اور مختلف مجلسوں میں انھوں نے مختلف باتیں بتائیں۔ایک بات ان کے متعلق یہ معلوم ہوئی کہ ان کے والد صوفی تھے۔اسی تعلق کی بنا پر انھوں نے بھی تصوف کی مشق کی اور اوراد و وظائف پڑھنے لگے۔اس تصوف میں گھسنے کے بعد آدمی پر کئی قسم کی کیفیتیں طاری ہوتی ہیں۔انھوں نے بتایا کہ میرے اندر بڑی خصوصیت یہ تھی کہ کبھی تو دنیا کی چیزوں سے اتنی عجیب و غریب محبت پیدا ہو جاتی کہ میں درختوں کو پکڑ لیتا اور ان سے لپٹ جاتا تھا اور لپٹ کر رونے لگتا۔کہا کہ ایک روز میں بیٹھا تھا کہ کچھ عجیب کیفیت طاری تھی۔ والد صاحب آئے اور کوئی کام کرنے کو کہا۔ میں جانگیہ پہنے ہوئے تھا تو والد صاحب میری کیفیت کو سمجھ گئے اور خاموشی سے واپس چلے گئے۔یہ کیفیت ہر اس شخص پر طاری ہوتی ہے جو تصوف کے سلسلے میں اپنا ورد و وظیفہ شروع کرتا ہے۔یہ کیفیت ایک طرح کی گمراہی کی خود فراموشی کی ہوتی ہے۔اگر آدمی اسی کے اندر گم ہو گیا تو وہ ہمیشہ کے لیے گمراہ ہو کر رہ جاتا ہے۔

''صوفی صاحب نے کہا میں بھی اس میں گم تھا۔اس تعلق کی بنا پر بہت سے اشعار کہتا اور باتیں کرتا تھا۔اس ضمن میں انھوں نے قصیدے بھی سنائے جو فارسی زبان میں کہے گئے تھے اور وحدت الوجود وغیرہ پر مشتمل تھے۔

''صوفی صاحب نے کہا میں اسی گردش میں تھا کہ بعض لوگوں نے میری دست گیری کی۔اس میں وہ خاص طریقے سے نام تو نہیں بتاتے تھے،البتہ ایک استاذ کا ذکر کرتے تھے

جو راولپنڈی کے قریبی علاقے رسال پور کے رہنے والے تھے۔ ان سے اس موضوع پر کچھ بات چیت ہوئی تو انھوں نے کچھ رہنمائی کی۔ ایک اور عالم سے بات چیت ہوئی تو انھوں نے بھی رہنمائی کی۔

''صوفی صاحب خاص طور سے کہا کرتے تھے کہ مجھ کو دو آدمیوں نے خودفریبی اور خود فراموشی سے نکال کر راہ حق پر لگایا۔ بقول ان کے حق کے راستے پر لگانے کے سلسلے میں کچھ شبہات کا جواب تو اس عالم نے خود دیا اور ساتھ ہی یہ کہا کہ آپ امام ابن تیمیہ رحمتہ اللہ علیہ کی کتاب منہاج السنۃ اور الجواب الصحیح کا مطالعہ کریں۔ صوفی صاحب فرماتے ہیں کہ جب میں نے ان کتابوں کو پڑھا تو میری آنکھیں کھل گئیں اور میں سمجھ گیا کہ کیا حق اور کیا باطل ہے اور یہ کہ میں کس قسم کی غلطی میں مبتلا تھا۔ پھر اللہ کے فضل سے میں اس دنیا سے نکل آیا اور رشد وہدایت کی دنیا میں آ گیا۔ صوفی صاحب ان دونوں کتابوں کے بہت زیادہ مداح تھے۔ کہتے تھے کہ بس انہی کتابوں نے درحقیقت میری رہنمائی کی ہے اور اگر کوئی آدمی شبہات میں مبتلا ہے اور حق وہدایت کا طالب ہے تو وہ ان دونوں کتابوں کا مطالعہ کرے، اس کی تشفی ہو جائے گی۔ دنیا میں جتنی گمراہیاں پھیلائی گئی ہیں ان سب کا رد ان کتابوں میں موجود ہے۔

''اللہ تعالیٰ کے بارے میں جو تصور پچھلے لوگوں میں پیدا ہوا، وہ یہودیوں میں ہوا، عیسائیوں میں ہوا یا خود مسلمانوں میں ہوا، اس کا تعلق زیادہ تر اسی قسم کی چیزوں سے تھا جن پر بعض صوفی حضرات چلتے ہیں۔ شیعوں کے اندر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے متعلق اور عیسائیوں میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق ہے۔

''صوفیا کی طرف جو عزت وعظمت کی نسبت کی جاتی ہے، اس کے تعلق سے صوفی صاحب بہت ہی زیادہ غیر مطمئن تھے۔ ایک دفعہ ان کی مجلس میں ابن عربی کا ذکر آیا تو جامعہ سلفیہ (بنارس) کے ایک استاد نے اچھی خاصی نرمی کے ساتھ ان کا ذکر کیا اور کہا کہ بہرحال ان کو وہ مقام ملنا چاہیے جس کے وہ مستحق ہیں اور بہت سے بزرگ ہیں جو ان کو مانتے ہیں اور ان کے قائل ہیں۔ انھوں نے اس قسم کی بات کی تو صوفی صاحب بگڑ گئے اور کہنے لگے،

ابن عربی کے بارے میں تمھارا یہ خیال ہے؟ اس طرح کی بات کرتے ہو حالانکہ وہ اپنی کتاب شروع کرتا ہے کفر سے، **سبحان الذی خلق الاشیاء** اس شخص کے بارے میں تمھارا کیا خیال ہے جس نے اپنی کتاب کا آغاز ہی کفر سے کیا؟

''تو یہ چیز صوفی صاحب میں تھی۔ اپنے تصوف کے دائرے سے نکلنے کے بعد ان کے نزدیک زہد کا اور اللہ کے نزدیک ہونے کا راستہ جو اسلام نے متعین کیا ہے اور حدیث میں آیا ہے، صبح کی، شام کی، رات کی، رات کے مختلف اوقات کی بہت سی دعائیں ہیں، جن پر صوفی صاحب کافی زور دیتے تھے اور کہتے تھے کہ یہ دعائیں پڑھنی چاہئیں اور فلاں موقعے پر فلاں دعا پڑھنی چاہیے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ یہ دعائیں پڑھی جائیں تو اللہ تعالیٰ سارے معاملات کے لیے کافی ہو جاتا ہے۔

''صوفی نذیر احمد اگرچہ صوفی کہلاتے تھے لیکن تصوف کا وہ معاملہ جو بعض لوگوں میں مشہور ہے انھوں نے ترک کر دیا تھا۔ صوفی کے لقب کو انھوں نے کیوں نہ چھوڑا؟ واللہ اعلم!

''اصل میں ہندوستان میں ہر وہ آدمی جو تقویٰ اختیار کرتا ہے، صوفی کہلاتا ہے، اس لیے غالباً وہ اس پر قائم رہے۔ ورنہ جن لوگوں نے تحقیق کر کے اسلام اور تصوف میں فرق کیا ہے ان کی تحقیق ہے کہ تصوف کے بعض گوشوں کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ بالکل ایک زائد چیز ہے اور عام طریقے سے یہ ایک متعارض چیز ہے۔ ویسے صوفی صاحب میں تصوف کے کچھ جراثیم باقی تھے کہ نہیں تھے؟ اس کا جواب دینا مشکل ہے۔ عملی طور پر ان میں اس طرح کی کوئی چیز نہیں تھی۔ مگر زہد و تقویٰ کے اعتبار سے بہر حال وہ اس معنی میں صوفی تھے جن معنوں میں ہندوستان میں لوگوں کو صوفی کہا جاتا ہے۔ ان معنوں میں نہیں تھے جن معنوں میں اصطلاحی صوفی کہلاتے ہیں۔

''ان کی تصنیفات کے سلسلے میں عرض ہے کہ انھوں نے مختلف چیزیں لکھی ہیں اور ظاہر بات ہے کہ اس وقت جو تحریکیں چل رہی تھیں ان کے رد میں لکھی ہیں۔ بعض چیزیں تبلیغی جماعت کے بارے میں لکھی ہیں، بعض چیزیں جماعت اسلامی کے متعلق لکھی ہیں۔ ایک کتاب ان کی خاصی ضخیم تھی، اس میں جماعت اسلامی کے مختلف ادوار اور مراحل کا

انھوں نے تجزیہ کیا تھا، اور اس میں اپنے بعض واقعات بھی بیان کیے تھے- بالخصوص ان کا یہ نقطہ نظر تھا کہ مولانا مودودی صاحب نے اسلامی ریاست کا جو نقطہ نظر پیش کیا ہے اور اسلامی ریاست کو ہی اسلام بنا ڈالا ہے تو یہ بالکل وہی نقطہ نظر ہے جو ہیگل نے پیش کیا تھا یعنی کلی ریاست کا- یہ سب اسی کا چربہ ہے، اسے اسلام پر فٹ کرنے کی کوشش کی گئی ہے-

''اس سلسلے میں ان کا ایک عجیب واقعہ ہے جو انھوں نے اپنی اس کتاب میں لکھا ہے- وہ یہ ہے کہ جب جماعت اسلامی کی تشکیل ہو رہی تھی، میں علی گڑھ یونیورسٹی میں تھا- میرے پاس خط آیا جو مولانا مودودی نے بھیجا تھا- میں نے جب خط پڑھا تو مجھے پسند آیا، میں نے جواب لکھ کر پوسٹ کر دیا کہ میں ان شاء اللہ اس اجتماع میں حاضر ہوں گا- یہ خط پوسٹ کر کے جب میں آ کر لیٹا تو خواب میں دیکھا کہ گھنے جنگل میں ہوں اور وہاں بہت سارے لوگ ''آک'' کا دودھ اکٹھا کر رہے ہیں اور مولانا مودودی صاحب ان کی نگہبانی کر رہے ہیں- میں نے پوچھا یہ کیا ہو رہا ہے؟ انھوں نے کہا: اصلی دودھ کی جگہ اب مارکیٹ میں یہی دودھ چلے گا- جب میں بیدار ہوا تو مجھے تردد ہوا کہ میں نے اس شخص کی دعوت قبول کر کے بہت غلط کام کیا ہے- صوفی صاحب نے غالباً یہ بھی کہا کہ میرا سینہ جلا جا رہا تھا- اٹھ کر آیا اور لیٹر بکس کے پاس کھڑا ہو گیا کہ ڈاکیا آئے تو اس سے اپنا خط واپس لے لوں- کوئی ایک گھنٹے بعد ڈاکیا آیا- میں نے اس سے کہا بھئی میں نے خط ڈالا ہے، میں اسے واپس لینا چاہتا ہوں اس نے لیٹر بکس سے سب خطوط نکالے اور میرے سامنے رکھ دیے- میں نے ان میں سے اپنا خط لیا اور چاک کر دیا اور چاک کرنے کے بعد میں نے نیا خط لکھا جس میں اپنے خیالات کا اظہار کیا-

''جس کتاب میں صوفی صاحب نے یہ واقعہ لکھا ہے- وہ کتاب جامعہ سلفیہ (بنارس) کی لائبریری میں موجود ہے اور میرے پاس بھی گھر پر ہونی چاہیے- یہ تصنیف ان کی خاصی اہم ہے اور اس میں انھوں نے اس طرح کے بہت سے واقعات ذکر کیے ہیں-

''ایک کتاب انھوں نے تصوف کے رد میں لکھی ہے- اس کے دو حصے ہیں- ایک میں صوفیا کا جو طریقہ ہے اس کا ذکر کیا ہے-

''صوفی صاحب نہایت تیز رفتاری سے لکھتے تھے۔ لکھنا پڑھنا ان کا نہایت تیز تھا۔ جتنی دیر میں آدمی پڑھتا ہے وہ اسی رفتار سے لکھتے تھے۔

''جب وہ شنکر نگر میں تھے تو کسی نے مولانا آزاد رحمۃ اللہ علیہ کی تفسیر اور مولانا مودودی کی تفسیر کے متعلق ان سے سوال کیا۔ انھوں نے اس ضمن میں جامعہ سلفیہ (بنارس) کے شیخ الحدیث مولانا نذیر احمد رحمانی کو بڑا لمبا چوڑا خط لکھا تھا جو چودہ پندرہ صفحات کا تھا۔ اس میں انھوں نے بڑی تفصیل سے بہت سی باتیں بیان کی تھیں اور دونوں تفسیروں کا جائزہ لیا تھا۔ انھوں نے تاسف کا اظہار کیا کہ مولانا آزاد نے جو کام شروع کیا تھا وہ پایہ تکمیل کو نہ پہنچ سکا یا مکمل محفوظ نہیں رہ سکا۔

''جس اساس سے انھوں نے کام شروع کیا تھا تفسیر کی وہی اساس ہے۔ اس کے برخلاف مولانا مودودی کی تفسیر سے متعلق انھوں نے لکھا:

''اسے قرآن کی تفسیر نہیں کہا جا سکتا۔ اس کے علاوہ آپ اس کا جو مرضی نام رکھ لیں۔ صوفی صاحب کبھی کبھار جمعے کا خطبہ دیتے تھے۔ عام گفتگو وہ بڑے اچھے انداز سے کرتے تھے لیکن جب وہ اسی گفتگو کو ضبط تحریر میں لاتے تو وہ مشکل ہی سے سمجھ میں آتی تھی۔

''ان کا یہ نظریہ تھا کہ دنیا میں دو گروہ ایسے ہیں جو جمہوریت کے سب سے بڑے دشمن ہیں۔ ایک برہمن اور دوسرے شیعہ۔ دونوں کے نظریات میں شورائیت کا کہیں تصور نہیں ہے۔''

مولانا صفی الرحمٰن کی اس کیسٹ سے مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کے بارے میں صوفی صاحب کی بیان فرمودہ بعض باتیں ہم نے حذف کر دی ہیں، اس لیے کہ صوفی صاحب وفات پا چکے ہیں، مولانا صفی الرحمٰن اور ہمیں یہ کیسٹ عنایت فرمانے والے دوست ہندوستان میں بیٹھے ہیں۔ لیکن یہ باتیں شائع کرنے والا فقیر جماعت اسلامی کے مجاہدوں کی گرفت میں آ جائے گا۔ جان اپنی ہو یا کسی اور کی اسے بچانا فرض ہے، وان لنفسک علیک حقا۔ لہٰذا مناسب یہی تھا کہ وہ باتیں حذف کر دی جائیں اور کر دی گئیں .... لیکن سچی بات بتاؤں، جو باتیں حذف کی گئی ہیں، وہ بالکل صحیح تھیں۔ میری کمزوری یا بزدلی سے نہ کوئی

غلط بات صحیح ہوسکتی ہے اور نہ صحیح بات کو غلط قرار دیا جا سکتا ہے۔

صوفی صاحب لاہور تشریف لاتے تو ان سے طویل نشستیں ہوتی تھیں---- مدت ہوئی وہ دور بھی ختم ہو گیا اور وہ نشستیں بھی قصہ پارینہ ہو گئیں۔

اب آخر میں چند الفاظ اور پڑھیے اور پھر آرام فرمایے۔۔ جس دوست نے جو کام کیا ہو اس کا شکریہ ادا کرنا میرے نزدیک ضروری ہے۔

میرے حلقہ احباب کے ایک اہم رکن جناب محمد رمضان یوسف سلفی فیصل آباد سے تعلق رکھتے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے ان کو تحریر و نگارش کے ذوق سے نوازا ہے۔ شخصیات سے متعلق مختلف رسائل و جرائد میں ان کے مقالات چھپتے رہتے ہیں۔ میں نے ان کو یہ کیسٹ صوفی نذیر احمد کاشمیری کے متعلق مولانا صفی الرحمٰن مبارک پوری کی یادداشتیں کاغذ پر منتقل کرنے کے لیے دی۔ انھوں نے میری گزارش مان لی اور یادداشتیں کاغذ پر منتقل بھی کر دیں، لیکن انھیں اس سلسلے میں بڑی دقت پیش آئی۔ انھوں نے مجھے ۳۰ اکتوبر ۲۰۰۰ء کو کیسٹ کا مواد بھجوایا اور اس کے ساتھ مندرجہ ذیل مکتوب ارسال کیا۔

مکرمی و محترمی!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ نے آڈیو کیسٹ سے مولانا صفی الرحمٰن مبارک پوری کی یادداشتیں جو کہ صوفی نذیر احمد کاشمیری سے متعلق تھیں کاغذ پر منتقل کرنے کو کہا تھا۔ الحمدللہ میں نے یہ کٹھن کام مکمل کر دیا ہے اور ابھی رات کے ساڑھے گیارہ بجے اس سے فارغ ہوا ہوں اور آپ کو خط لکھ رہا ہوں، ساتھ ہی یہ اہم گفتگو ارسال کر رہا ہوں۔ کیسٹ کی ریکارڈنگ بہت خراب تھی، بڑی مشکل سے سمجھ میں آتی تھی۔ پھر بھی کوشش کر کے کام پورا کر دیا گیا۔ دعاے خیر کی درخواست ہے۔

تمام دوست علی ارشد اور دیگر حضرات خیریت سے ہیں اور آپ کو بہت یاد کرتے ہیں۔ حافظ سلیمان صاحب کی کتاب ''درود وسلام'' پر آپ کا مقدمہ خوب ہے، پڑھ کر لطف آ گیا........... ''الاعتصام'' کی مسلسل دو اشاعتوں میں آپ کے دو تحقیقی مقالات پڑھے، بڑی معلومات حاصل ہوئیں۔ اللہ آپ کو صحت و سلامتی سے رکھے۔ آمین

صوفی نذیر احمد کاشمیری سے متعلق مواد ملنے پر اطلاع ضرور دیجیے گا- مجھے آپ کے خط کا شدت سے انتظار رہے گا-

والسلام

آپ کا عقیدت مند

محمد رمضان یوسف سلفی

مولانا شمس الحق سلفی

(وفات ۳ جولائی ۱۹۸۶ء)

دیار ہند کے جن اہل حدیث علمائے کرام کے متعلق میں لکھنا چاہتا ہوں' ان میں حضرت مولانا شمس الحق سلفی کا اسم گرامی میری مرتب کردہ ذہنی فہرست میں مرقوم تھا- انھوں نے ۳ جولائی ۱۹۸۶ کو اپنے گاؤں (بنکٹوا' ضلع مدھوبنی' صوبہ بہار' ہندوستان) میں وفات پائی- میں ان کی زیارت سے محروم ہوں- یہ ہندوستان کے جلیل القدر علما میں سے تھے- افسوس ہے ہم بہت سے ہندوستانی اہل علم کے حالات سے آگاہ نہیں' ملک کے ساتھ' علم بھی تقسیم ہو گیا- ادھر کا علم ادھر رہ گیا اور ادھر کا ادھر- حسن اتفاق سے ۲۹- اگست ۱۹۸۶ کے ہفت روزہ ''الاعتصام'' سے مجھے ان کے حالات میں ایک مضمون میسر آ گیا ہے جو ان کے صاحب زادہ گرامی اور ہمارے عزیز دوست جناب محمد عزیر شمس (ام القریٰ یونیورسٹی مکہ مکرمہ) کا تحریر کردہ ہے- اس مضمون میں حضرت مولانا مرحوم کے ضروری حالات بیان کیے گئے ہیں اور ان کی علمی' تبلیغی اور تدریسی سرگرمیوں کا تذکرہ کیا گیا ہے- محمد عزیر شمس صاحب اور الاعتصام کے شکریے کے ساتھ یہ مضمون یہاں درج کیا جا رہا ہے- خود عزیر شمس پر بھی اس کتاب میں مضمون موجود ہے-

اب ذیل میں ملاحظہ فرمایئے مولانا شمس الحق سلفی کے بارے میں ان کے صاحب زادے جناب محمد عزیر شمس صاحب کا مضمون---!

نہایت افسوس ہے مولانا شمس الحق سلفی ۲۵ شوال ۱۴۰۶ھ (۳ جولائی ۱۹۸۶ء) کو بروز جمعرات پونے تین بجے بعد دوپہر دربھنگہ میں انتقال کر گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ ادھر کچھ دنوں سے وہ سینے میں تکلیف محسوس کر رہے تھے۔ علاج کے لیے انھیں گھر سے دربھنگہ لے جایا گیا۔ آخری دن شدید درد اٹھا جس سے جاں بر نہ ہو سکے۔ وفات کے وقت ان کی عمر ستر سال سے متجاوز تھی۔ مولانا مرحوم کا شمار ہندوستان کے ممتاز علمائے اہل حدیث میں ہوتا ہے۔ انھوں نے کم وبیش پچاس سال تک تعلیمی، دعوتی اور اصلاحی خدمات انجام دیں۔ ذیل میں ان کے حالات زندگی اور ان کی علمی ودینی خدمات کا ایک خاکہ پیش کیا جاتا ہے۔

مرحوم ۱۳۳۳ھ (۱۹۱۵ء) میں اپنے آبائی وطن صوبہ بہار کے ایک گاؤں بنکٹوا ضلع مدھوبنی میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد مولانا رضاء اللہ اس علاقے کے جید علما میں سے تھے۔ انھوں نے اپنے بچوں کی ابتدائی تعلیم کے لیے گھر ہی میں ایک استاد مقرر کر رکھا تھا۔ مرحوم مولانا شمس الحق بھی ان ہی سے اردو، فارسی اور قرآن مجید پڑھتے رہے۔ کچھ ہوش سنبھالا تو علاقے ہی کے ایک مدرسے "مدرسہ محمدیہ" (دیودھا) بھیج دیے گئے، جہاں مولانا عبدالوہاب دیودھادی سے عربی پڑھنا شروع کی۔ ایک عرصے تک وہاں زیر تعلیم رہنے کے بعد دارالعلوم احمدیہ سلفیہ (دربھنگہ) چلے آئے۔ یہاں مولانا علی اصغر چھپروی، مولانا عبدالغفور جیراج پوری، مولانا محمد اسحاق آروی اور مولانا محمد عثمان ازہری وغیرہم سے مختلف علوم وفنون کی تحصیل کی۔ ۱۳۵۵ (۱۹۳۶ء) میں نصابی تعلیم سے فارغ ہوئے۔ فارغین کی تعداد اس سال سات افراد پر مشتمل تھی، جنھیں ان کی علمی صلاحیت اور قابلیت کی بنا پر آج تک "سبعہ سیارہ" کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ مرحوم کے علاوہ ان کے ساتھیوں میں ڈاکٹر سید عبدالحفیظ، مولانا مصلح الدین جیراج پوری، مولانا عبدالخالق (راج شاہی) مولانا عبدالودود گیاوی، مولانا محمد زکریا دربھنگوی، قاری عرفان دمکاوی شامل تھے۔

دارالعلوم سے فراغت کے بعد مولانا شمس الحق سلفی کا خیال تھا کہ کہیں ملازمت کے بجائے آزادی کے ساتھ علاقے میں اصلاحی وتبلیغی کاموں کا سلسلہ شروع کیا جائے اور گزر

بسر کے لیے تجارت کا پیشہ اختیار کیا جائے- اس منصوبے کے تحت انھوں نے ایک ڈیڑھ سال تک گھر پر قیام کیا اور اطراف و جوانب کا دورہ کرتے رہے- پھر لوگوں کے مشورے سے پنجاب یونیورسٹی (لاہور) سے "مولوی فاضل" کا امتحان دینے کی خاطر دہلی کا سفر کیا- وہاں ان کا قیام مسجد فتح پوری کے زیر اہتمام جاری مدرسے میں رہا' جہاں طلبا کو "مولوی فاضل" کے امتحان میں بیٹھنے کی تیاری کرائی جاتی تھی- مدرسے میں انھوں نے مولانا سعید احمد اکبرآبادی مرحوم سے خاص طور پر استفادہ کیا- ان کی زیر نگرانی عربی انشا و ترجمہ کی مشق کرتے رہے- استاد ان پر بڑی شفقت فرمایا کرتے تھے- مرحوم اپنے استاد سے متعلق بہت سی باتیں بیان کیا کرتے تھے- کئی بار انھوں نے ذکر کیا کہ مولانا اکبرآبادی فرمایا کرتے تھے کہ "اس وقت ہندوستان میں عربی کے تین ہی ادیب ہیں اور تینوں وہابی! (۱) مولانا محمد سورتی- (۲) مولانا عبدالعزیز میمن- (۳) مولانا عبدالمجید حریری-"

دہلی میں چند ماہ قیام کے بعد ان کا ارادہ ہوا کہ امتحان دینے کی بجائے گھر واپس چلے جائیں' کیوں کہ ان ڈگریوں سے انھیں کوئی مطلب نہ تھا' پھر اس خیال سے کہ کہیں لوگ بزدلی کا طعنہ نہ دیں' امتحان میں بیٹھنے کا عزم کیا اور ۱۹۳۸ء میں "مولوی فاضل" (آنرز ان عربک) کا امتحان اچھے نمبروں سے پاس کیا-

وطن واپس آ کر کئی سال تک اپنے بڑے بھائی مولانا عین الحق سلفی (م ۱۹۸۱ء) کے ساتھ مل کر ترائی نیپال کے اس علاقے میں جو ان کے مولد و منشا سے قریب ہے دعوتی و اصلاحی کام کرتے رہے- یہ علاقہ اس زمانے میں شعائر اسلام سے بالکل نابلد تھا- جہالت کے باعث طرح طرح کی ہندوانہ رسوم اور مشرکانہ اعمال مسلمانوں میں رائج تھے- ایک مسلم اور غیر مسلم کے درمیان نام کے علاوہ اور کوئی ظاہری فرق نہ تھا- ان حالات کے پیش نظر دونوں بھائیوں نے ضروری سمجھا کہ سب سے پہلے اپنے علاقے کی خبر لیں اور چوں کہ اس علاقے میں ان کا خاندان ہمیشہ سے محترم اور باعزت شمار ہوتا چلا آیا ہے' اور بغیر ان کی شرکت کے کسی دنیاوی یا دینی معاملے کا فیصلہ نہیں ہو پاتا تھا' اس لیے اس بات کی قوی امید تھی کہ ان کی کوشش سے وہاں کے حالات سدھر جائیں گے- الحمدللہ ان کی دعوت و تبلیغ کا

اثر یہ ہوا کہ وہاں کا نقشہ بدل گیا- جگہ جگہ انھوں نے دینی مدارس قائم کیے- بے شمار مسجدیں تعمیر کرائی- مسلمانوں کو اسلامی تعلیمات سے روشناس کرایا- اس سلسلے میں انھیں طرح طرح کی تکلیفیں برداشت کرنی پڑیں- بہت سے مواقع پر ان کا بائی کاٹ ہوا- کئی مقدمے چلائے گئے- طرح طرح کی دھمکیاں دی گئیں- لیکن دونوں بھائی اپنے مشن پر لگے رہے- بالآخر لوگوں کی عداوتیں روز بروز سرد پڑتی گئیں اور خدا کے فضل سے دونوں اپنے مقصد میں کامیاب ہوئے-

علاقے میں ایک مدت تک دعوتی و تبلیغی سرگرمیوں میں مشغول رہنے کے بعد چند سال دارالعلوم احمد یہ سلفیہ دربھنگہ (بہار) میں تدریسی خدمات انجام دیتے رہے- وہاں ان کا قیام ۱۳۶۲ھ (۱۹۴۳ء) سے ۱۳۶۵ھ (۱۹۴۶ء) تک رہا- پھر مولانا محمد عفان سلفی کی طلب پر مدرسہ نجم الہدیٰ (آحتلہ' مرشد آباذ بنگال) چلے گئے- جہاں دس سال تک مسلسل درس و تدریس کا کام کرتے رہے- ۱۳۷۵ھ (۱۹۵۶ء) میں مدرسہ اسلامیہ (صالح ڈانگہ- مرشد آباذ بنگال) چلے گئے- وہاں سے ایک سال کے بعد ۱۳۷۶ھ (۱۹۵۷ء) میں مدرسہ فیض عام (مئو- اعظم گڑھ (یوپی) میں منتقل ہو گئے- یہاں مسلسل دس سال تک تدریسی و دعوتی فرائض انجام دیتے رہے- اس عرصے میں ان سے سیکڑوں طلبا مستفید ہوئے اور تبلیغی جلسوں میں برابر شرکت کی وجہ سے عوام وخواص میں ان کی شہرت اور مقبولیت میں اضافہ ہوتا گیا- مدرسے میں شیخ الحدیث ہونے کے ساتھ ساتھ افتا کا کام بھی ان کے ذمے رہا- چھوٹے بڑے کئی سو فتوے تحریر کیے' جن میں سے بعض مئو میں طبع بھی ہوئے-

مئو میں قیام کے دوران (۱۳۸۰ھ/۱۹۶۱ء) میں پہلی بار حج بیت اللہ کے لیے گئے' جہاں حرمین شریفین کی زیارت کے علاوہ وہاں کے علما و فضلا سے ملاقاتیں کیں- دوسری بار ۱۴۰۴ھ (۱۹۸۴ء) میں حج کو گئے اور مرض و نقاہت کے باوجود تمام ارکان خود ادا کیے اور بہ سلامت واپس آئے-

مئو میں ایک طویل عرصے تک قیام کے بعد ۱۳۸۶ھ (۱۹۶۶ء) میں مستعفی ہو کر اپنے وطن چلے آئے- پھر دارالعلوم احمد یہ سلفیہ (دربھنگہ' بہار) کے اصحاب

انتظام کی طلب پر درمیان سال ہی میں اپنی مادرِ علمی میں دوسری بار بحیثیت استاذ و شیخ الحدیث چلے آئے۔ اس مرتبہ تقریباً ڈیڑھ سال وہاں رہے۔ ۱۳۸۷ھ (۱۹۶۸ء) میں نئے تعلیمی سال کے شروع میں پھر بنگال والوں کے اصرار پر مدرسہ دارالحدیث (بیل ڈانگہ مرشد آباد' مغربی بنگال) چلے گئے' جہاں ایک سال رہ کر ۱۳۸۹ھ (۱۹۶۹ء) میں مرکزی دارالعلوم (حال' جامعہ سلفیہ' بنارس) بحیثیت شیخ الحدیث تشریف لائے اور ۱۴۰۳ھ (۱۹۸۳ء) تک مسلسل ۱۴ سال یہیں درس و تدریس' افتا اور دعوت و تبلیغ میں مشغول رہے۔ اس زمانے میں انھوں نے بہت سے علاقوں کا دورہ کیا اور حسب ضرورت وہاں اصلاح کا کام کیا۔ بعض مقامات پر منکرین حدیث اور مبتدعین سے مناظرے بھی کیے' جن میں سے بعض کی تفصیل کتابی شکل میں شائع ہو چکی ہے۔

اس عرصے میں ان کا ایک اہم کارنامہ نیپال کے شہر جنک پور میں ''جامعہ سلفیہ'' کی تاسیس ہے جو ۱۳۸۶ھ (۱۹۶۶ء) میں دونوں بھائیوں (مولانا عین الحق اور شمس الحق) کی کوشش سے عمل میں آئی۔ گزشتہ سطور میں نیپال کے اس علاقے میں دونوں بھائیوں کی دعوتی سرگرمیوں کا مختصر تذکرہ آ چکا ہے۔ وہاں عرصے سے ایک مرکزی تعلیمی ادارے کے قیام کی ضرورت محسوس کی جا رہی تھی' جہاں اعلیٰ دینی تعلیم کا انتظام ہو۔ اس سے قبل ان دونوں نے اگرچہ بہت سی بستیوں میں چھوٹے چھوٹے مکاتب و مدارس کا ایک جال بچھا دیا تھا' جہاں مقامی طور پر کسی حد تک ابتدائی تعلیم کا نظم ہو جاتا تھا' مگر غریب و نادار بچوں کے لیے عربی تعلیم کی خاطر ہندوستان کے دور دراز علاقوں کے مختلف مدارس کا سفر کرنا بہت دشوار تھا۔ ان حالات کے پیش نظر جامعہ سلفیہ کا قیام عمل میں آیا' جس کا نام پہلے مولانا مرحوم کے نام کی مناسبت سے ''شمس الہدیٰ'' رکھا گیا' پھر ایک عرصے کے بعد اسے ''جامعہ سلفیہ'' سے بدل دیا گیا۔

جیسا کہ پہلے ذکر آ چکا ہے مولانا مرحوم ''جامعہ سلفیہ'' (بنارس) میں قیام کے آخری دو سال (۱۹۸۲-۱۹۸۳ء) شعبہ تبلیغ سے منسلک رہے' اس دوران انھیں مسلسل سفر میں رہنا پڑا' جس کا ان کی صحت پر اثر پڑنا اس عمر میں لازمی تھا' ایک بار میڈیکل چیک اپ کرایا۔

معلوم ہوا کہ ہائی بلڈ پریشر اور بلڈ شوگر کی شکایت ہے۔ چنانچہ کھانے میں نمک اور چینی وغیرہ سے مکمل پرہیز کرنے لگے' مگر اس کے بعد بھی تبلیغی سفر کرتے رہے۔ جامعہ سلفیہ (جنک پور) کے تعلیمی اور انتظامی امور سے تو ان کو اتنی دلچسپی رہتی کہ تعطیل کے ایام اس کی نذر ہو جاتے' موسم خواہ کتنا ہی خراب کیوں نہ ہو' کسی نہ کسی طرح گھر سے نکل کر جامعہ پہنچ جاتے۔ اس سلسلے میں انھیں بعض مرتبہ تکلیف بھی برداشت کرنی پڑی۔ ایسی ہی ایک میٹنگ سے ۱۹۸۳ء میں گھر واپس آ رہے تھے کہ راستے میں ان پر فالج کا کچھ اثر محسوس ہوا۔ فوراً ڈاکٹر سے رجوع کیا گیا' مگر اس وقت تک وہ آثار زائل ہو چکے تھے۔ دوسرے دن صبح گھر پر فالج کا حملہ ہوا۔ گویائی بند ہو گئی اور جسم کا داہنا حصہ متاثر ہوا۔ فوراً دربھنگہ' پھر دہلی لے جایا گیا' جہاں علاج کے بعد خود سے چلنے پھرنے کے قابل ہو گئے۔ گفتگو بھی رک رک کر آسانی کرنے لگے۔ ان کی تمام باتیں سمجھ میں آ جاتی تھیں۔ گھر آنے کے بعد حالت کچھ اور بہتر ہو گئی۔ مناسب سمجھا گیا کہ اب یہیں رہیں کہ ان کی اچھی طرح دیکھ بھال کی جا سکے۔ ان آخری تین سالوں میں ان کا معمول تھا کہ صبح و شام کھلی ہوا میں سیر و تفریح کے لیے جاتے۔ مقررہ اوقات پر پرہیزی غذا کھاتے۔ تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد ضرورت کے تحت کسی شہر یا گاؤں کا سفر بھی کرتے اور اس سلسلے میں کسی کی محتاجی محسوس نہ کرتے تھے۔ منع کرنے کے باوجود آخری رمضان کے تمام روزے رکھے۔ آخر تک ان کی صحت معمول کے مطابق رہی۔ پھر یہ ہوا کہ سینے میں کبھی کبھی درد ہونے لگا' جس کی وجہ سے کافی تکلیف محسوس کرتے۔ علاج سے کچھ افاقہ ہوا' مگر آخری دن (۳ جولائی کو) جب انھیں درد شروع ہوا تو اس سے جاں بر نہ ہو سکے۔

جیسا کہ گزشتہ سطور میں بتایا گیا' مولانا مرحوم ساری زندگی درس و تدریس اور دعوت و تبلیغ میں ہمہ تن مشغول رہے۔ فراغت (۱۹۳۶ء) کے بعد سے وفات تک لگ بھگ پچاس سال بہار' بنگال اور یوپی کے چھ سات مدارس میں بحیثیت استاذ و شیخ الحدیث کام کرتے رہے۔ اس طویل عرصے میں ان سے سیکڑوں طلبا مستفید ہوئے' جو ملک کے گوشے گوشے میں پھیلے ہوئے ہیں' بلکہ ان کی ایک کثیر تعداد بیرون ملک بھی اپنے علمی اور دعوتی کاموں

میں مصروف ہے۔ اس وقت اکثر اہل حدیث اداروں میں ان کے تلامذہ نظر آئیں گے بلکہ بعض ادارے تو ان کے تلامذہ ہی سے آباد ہیں۔

مرحوم جہاں بھی رہے دیگر فنون کے ساتھ حدیث کی اونچی کتابوں کا درس دیتے رہے۔ صحیح بخاری غالباً انھوں نے چالیس بار پڑھائی ہوگی۔ حدیث کی تدریس کے وقت وہ زیادہ تقریر کرنے کے عادی نہ تھے۔ صرف مشکل مقامات پر تنبیہ فرماتے یا طلبا کے سوالات کے جواب دیتے۔ امام بخاری سے انھیں بڑی عقیدت تھی۔ درس کے دوران مختلف مناسبتوں سے وہ امام بخاری کی فقاہت اور ان کی کتاب کی خصوصیات بیان فرماتے۔ "فتح الباری" برابر ان کے زیر مطالعہ ہوتی۔ "عمدۃ القاری" (عینی) اور دیگر شروح کی طرف بہت کم رجوع کرتے۔

مولانا نے حدیث کی کتابیں چار اساتذہ سے پڑھی تھیں جو حضرت میاں نذیر حسین محدث دہلوی (م ۱۳۲۰ھ) کے شاگرد ہیں۔ ان میں سے دو مولانا عبدالغفور جیراج پوری (م ۱۳۷۱ھ) اور مولانا محمد اسحاق آروی (م ۱۳۶۹ھ) ہیں' ان سے انھوں نے دربھنگہ میں سبقاً سبقاً کتب حدیث پڑھیں۔ باقی دو مولانا احمد اللہ پرتاب گڑھی (۱۳۶۲ھ) اور مولانا شرف الدین دہلوی (م ۱۳۸۱ھ) ہیں' ان سے قیام دہلی کے زمانے میں کتب حدیث کے اطراف پڑھ کر سند اجازت حاصل کی تھی۔ غالباً ان محدثین عظام سے تلمذ کا اثر تھا کہ ساری زندگی ان کا سب سے محبوب مشغلہ حدیث پڑھنا پڑھانا رہا۔ دوسرے فنون کی بھی اگرچہ وہ برابر تعلیم دیتے رہے' تاہم انھیں ہمیشہ ثانوی اہمیت دیتے تھے۔

مولانا شمس الحق سلفی جہاں بھی گئے تدریس کے علاوہ ان کے ذمے فتویٰ نویسی یا فتاوی پر نظر ثانی اور ان کی تصدیق کا کام ساتھ رہا' جسے وہ دیگر اوقات میں انجام دیا کرتے تھے۔ جامعہ سلفیہ (بنارس) میں مولانا محمد ادریس آزاد رحمانی مرحوم (م ۱۳۹۸ھ/۱۹۷۸ء) کی وفات تک یہ معمول رہا کہ مولانا آزاد مرحوم عموماً جواب لکھا کرتے اور مولانا شمس الحق اس پر نظر ثانی اور اس کی تائید و توثیق کرتے یا کبھی کبھی وضاحتی یا اختلافی نوٹ لکھتے۔ بہت سے فتوے خود مولانا شمس الحق کے تحریر کردہ بھی ہوتے۔ ان سب کی نقل جامعہ سلفیہ میں اب

تک محفوظ ہے- دوسرے مدارس میں جہاں مولانا کا قیام رہا' فتاویٰ کی نقل رکھنے کا دستور نہ تھا اس لیے ان کی تعداد کا صحیح اندازہ لگانا تو مشکل ہے- لیکن خیال یہ ہے کہ سیکڑوں کی تعداد میں ہوں گے-

فتاویٰ کے علاوہ مولانا نے بہت کم لکھا ہے- اگرچہ ان کے بعض مضامین ''الہدیٰ'' (دربھنگہ) اور میگزین مدرسہ فیض عام (مئو) وغیرہ میں شائع ہوئے' مگر باقاعدہ تصنیف و تالیف کے میدان میں وہ داخل نہ ہوئے- البتہ صرف ایک کتاب' جس کے لیے انھوں نے کافی مواد اکٹھا کر لیا تھا اور مئو کے زمانۂ قیام میں اس کا اچھا خاصہ حصہ لکھ بھی چکے تھے' اس عموم سے مستثنیٰ کی جا سکتی ہے- اس کتاب میں انھوں نے مولوی احمد رضا بجنوری حنفی کی ''مقدمۂ انوار الباری'' (جلد اول) کا علمی و تنقیدی جائزہ لیا ہے اور محدثین کے بارے میں عموماً اور امام بخاریؒ سے متعلق خصوصاً مؤلف کی غلط بیانیوں کا تحقیقی جواب دیا ہے- اس کتاب کا تالیف شدہ حصہ بنارس میں موجود تھا' مگر فی الحال ان کے مسودات اور کاغذات سے نہیں ملا- معلوم نہیں وہ کہاں دبا پڑا ہے؟ اسی موضوع پر مولانا (مرحوم) کے بعد مولانا رئیس احمد ندوی نے قلم اٹھایا- ان کی کتاب ''اللمحات'' کے نام سے دو جلدوں میں بنارس سے شائع ہو چکی ہے- ممکن ہے انھیں مولانا کے مسودے سے متعلق کچھ علم ہو-[1]

مولانا مرحوم کی تعظیم و تکریم علما اور طلبا جس قدر ان کی علمی صلاحیت اور تدریسی قابلیت کی وجہ سے کرتے تھے' عوام اس سے زیادہ ان کے وعظ و تقریر سے متاثر ہو کر کرتے تھے- جہاں بھی رہے جمعے کا خطبہ پابندی کے ساتھ کسی نہ کسی مسجد میں دیتے رہے- اس کے علاوہ مختلف جلسوں میں شرکت کے لیے دور دور سے بلائے جاتے تھے' خصوصاً تعلیمی سال کے اخیر میں اتنے مقامات سے طلب آتی کہ ہر جگہ جانا محال ہوتا- ان کے عقیدت مندوں کی ایک کثیر تعداد بنگال' بہار' یوپی اور دیگر صوبوں میں موجود ہے- ان کی تقریر کا ایک مخصوص انداز تھا- شروع میں بہت ہی پست آواز میں ٹھہر ٹھہر کر بولتے' پھر جوں جوں آگے بڑھتے'

---

[1] جناب محمد عزیز شمس صاحب کا یہ مضمون آج سے پندرہ سال قبل ۱۹۸۶ کا تحریر کردہ ہے' ممکن ہے اس کے بعد یہ مسودہ مل گیا ہو-

بیان میں روانی اور آواز میں بلندی آتی جاتی' یہاں تک کہ بعض اوقات انتہائی جوش کے عالم میں تھوڑا سا گرجتے برستے بھی تھے- اس وقت ان کا چہرہ سرخ ہو جاتا- پھر موڑ لیتے' کبھی جہنم یا موت یا قیامت کی ہولناکیوں کا ذکر اس طرح کرتے کہ خود ان پر اور دوسروں پر رقت طاری ہو جاتی- تقریر میں ہنسنا ہنسانا ان کی عادت نہ تھی اور نہ قصے کہانیاں بیان کرتے تھے- ہمیشہ قرآنی آیات' احادیث اور صحابہ کرام کے مستند واقعات مؤثر انداز میں پیش کرتے- تقریر میں کسی فرقے یا شخصیت پر طعن نہ کرتے' نہ ہمہ دانی کا دعویٰ کرتے ہوئے دوسروں کی تحقیر و تذلیل کرتے- ایک بات یہ بھی برابر دیکھنے میں آئی کہ کبھی کسی تقریر کے لیے پہلے سے کوئی تیاری نہ کرتے' کسی بھی موضوع کے لیے جتنا بھی وقت دیا جاتا اس کے اندر ہی اپنی تقریر سمیٹ لیتے' بلکہ اخیر میں ساری گفتگو کا خلاصہ مختصر الفاظ میں بیان کر دیتے-

ان کی زندگی کا ایک پہلو یہ ہے کہ جب تک صحت مند رہے' ہمیشہ تہجد گزار نظر آئے- ان کی عادت تھی کہ عشا کے بعد فوراً سو جاتے' سحر کے وقت اٹھتے اور ضروریات سے فارغ ہو کر تہجد کی نماز ادا کرتے- اس میں قرأت کے دوران یا دعا کرتے ہوئے ان کی ہچکیاں بندھ جاتی تھیں- کبھی کبھی ہم لوگوں کی آنکھیں اس اثنا میں کھل جاتیں تو ہم یہ منظر دیکھ کر بہت متاثر ہوتے- تہجد سے فارغ ہو کر اگر فجر کی اذان تک کچھ وقت ہوتا تو آرام کرنے کی بجائے کسی کتاب کا مطالعہ کرتے- پھر اذان کے بعد نماز کے لیے گھر سے نکلتے تو لوگوں کو اٹھاتے ہوئے مسجد میں جاتے- جہاں بھی رہے بالعموم امامت انہی کے ذمے رہی- فجر کی نماز میں مفصل کی دو لمبی سورتیں ٹھہر ٹھہر کر بلند آواز میں پڑھتے- رکوع' سجدے اور قیام نسبتاً طویل ہوتے- دوسری نمازوں میں قرأت اور دیگر امور میں سنت نبوی کا اتباع کرتے- ان کی سیاسی و سماجی خدمات کے ذکر کا یہ موقع نہیں- اختصار کے ساتھ اتنا بتا دینا کافی ہوگا کہ سیاسی طور پر کانگریس کے حامی تھے- مولانا ابوالکلام آزاد سے بڑی عقیدت تھی- ان سے ملاقات کی غرض سے سفر بھی کیا تھا-

اپنے علاقے میں سماجی فلاح و بہبود کی خاطر برابر کام کرتے رہے- مختلف نزاعات

کے فیصلے اور دنیاوی معاملات کے سلسلے میں لوگ ان کی طرف رجوع کرتے اور انھیں حکم متعین کرتے تھے۔ ان کے اور ان کے خاندان والوں پر لوگوں کے اعتماد کا یہ عالم تھا کہ بہت سے ہندوؤں تک نے اپنی زمینیں حفاظت کے خیال سے ان کے نام رجسٹری کر دی تھیں اور اس سلسلے کے تمام کاغذات بطور امانت ان کے پاس رکھ چھوڑے تھے' جو ان کی امانت سمیت ایک زمانے کے بعد اصل مالکوں کے حوالے کر دیے گئے تھے۔

اپنی بستی اور اس کے اطراف میں لوگوں کو تعلیم کی طرف توجہ دلائی۔ کتنے ہی افراد ایسے ہیں جنھیں اپنے ساتھ لے گئے اور اپنے خرچ پر انھیں پڑھانے لکھانے کا انتظام کیا۔ بہتوں کو مدارس میں وظیفے دلائے۔ ان کے بھائی مولانا عتیق الحق سلفی اور ان کی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ ان کی چھوٹی سی بستی اب بھی تعلیم کے اعتبار سے اطراف و جوانب کی تمام بستیوں سے ممتاز ہے۔

اخیر میں ان کے خاندان اور عائلی زندگی سے متعلق چند الفاظ میں تذکرہ کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

اس کے سلسلۂ نسب میں سات پشت اوپر تک آبا و اجداد کے نام معلوم ہیں جو ایک عرصے سے اس چھوٹی سی بستی بنکٹوا جسے "بن" (یعنی جنگل کاٹ کر بسایا گیا تھا) میں آباد چلے آئے ہیں۔ آبائی پیشہ زمینداری اور کاشت کاری تھا۔ خاندان میں سب سے پہلے ان کے والد مولانا رضاء اللہ نے دینی تعلیم حاصل کی اور علاقے میں دعوتی اور اصلاحی کاموں کا سلسلہ شروع کیا۔ ان کے چار لڑکے تھے۔ سب سے بڑے (۱) مولانا عین الحق سلفی (م ۱۹۸۱ء) جو عرصے تک دار العلوم احمدیہ سلفیہ میں مدرس رہے اور (۲) عبدالحق (مرحوم ہو چکے ہیں) (۳) ذکاء اللہ (بقید حیات ہیں) یہ دونوں بستی ہی میں کاشت کاری کرتے رہے (۴) مولانا شمس الحق اپنے بھائیوں میں سب سے چھوٹے تھے۔ انھوں نے اپنی زندگی میں یکے بعد دیگرے تین شادیاں کیں' جن سے سات لڑکیاں اور پانچ لڑکے موجود ہیں۔ لڑکوں کے نام علی الترتیب یہ ہیں۔ (۱) زہیر انور۔ ایم۔ اے (علیگ) یہ جواہر لال نہرو یونیورسٹی کے اسکول آف سوشل سائنسز میں کام کر رہے ہیں۔ (۲) راقم الحروف محمد عزیز ایم اے

(مکہ) جو فی الحال ام القریٰ یونیورسٹی (مکہ مکرمہ) کے شعبہ عربی میں ریسرچ اسکالر ہے۔ (۳) محمد عمیر' بی اے (مدینہ) جو آج کل جامعہ سلفیہ جنک پور (نیپال) میں مدرس ہیں۔ (۴) محمد زبیر جامعہ سلفیہ (جنک پور) کا طالب علم ہے۔ (۵) محمد نمیر والد کی وفات کے وقت جامعہ سلفیہ (بنارس) میں تعلیم حاصل کرتے تھے۔

دعا ہے اللہ تعالیٰ مرحوم کی مغفرت کرے اور ان کی خدمات کے صلے میں جنت نصیب فرمائے اور ان کے اخلاف کو ان کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق بخشے۔ آمین

یہاں جناب محمد عزیز شمس کا مضمون ختم ہوا۔

یہ مضمون پندرہ سولہ سال قبل کا لکھا ہوا ہے۔ جن زندہ حضرات کے نام اس میں درج ہیں' معلوم نہیں اب وہ کس عالم میں ہیں' نیز ان کے بھائی اس وقت جن امور میں مشغول تھے۔ معلوم نہیں اس کے بعد ان کی سرگرمیوں نے کیا رخ اختیار کیا۔

حافظ عبداللہ بڈھیمالوی

(وفات ۷ مئی ۱۹۸۷)

۱۹۳۳ء میں ان سطور کا راقم چوتھی جماعت میں پڑھتا تھا۔ پہلی دفعہ میں نے اسی زمانے میں حضرت حافظ عبداللہ بڈھیمالوی کو دیکھا تھا۔ ہمارے شہر کے ایک کھاتے پیتے گھرانے میں ان کی شادی ہوئی تھی اور وہیں حاجی نورالدین کی مسجد میں وہ طلبا کو درس نظامی کے مروجہ نصاب کی کتابیں پڑھاتے تھے۔ یہ مسجد ہمارے گھر سے دو ڈھائی فرلانگ کے فاصلے پر تھی۔ خاصی وسیع اور خوب صورت مسجد۔

حافظ صاحب میری والدہ کے خالہ زاد تھے اور سات آٹھ دن کے بعد ہمارے گھر آیا کرتے تھے۔

وہ تشریف لاتے تو ہماری والدہ مجھے اور میری چھوٹی بہنوں سے کہتیں، اپنے ماموں کو سلام کرو، ہم سلام کرتے تو وہ ہمارے سر پر ہاتھ پھیرتے اور ہمیں دعا دیتے۔

ہم نے بھینس رکھی تھی، مجھے یاد ہے، میری والدہ اس زمانے کے کلچر کے مطابق کانسی کے چھنے میں دودھ اور اس میں چینی ڈال کر حافظ صاحب کو دیتیں۔ بعض دفعہ وہ جلدی جانا چاہتے تو روک لیتیں۔ کہتیں بیٹھ جاؤ، دودھ پی کر جانا، دودھ پیے بغیر نہیں جاسکو گے۔

یہ باتیں حضرت حافظ صاحب کو زندگی بھر یاد رہیں اور مجھے کئی دفعہ سنائیں۔ اس واقعے پر طویل عرصہ گزر چکا ہے، لیکن ان کا اس زمانے کا حلیہ اور لباس اب بھی ذہن میں ہے اور ایسے معلوم ہوتا ہے کہ وہ زمانہ الٹی زقند لگا کر پلٹ آیا ہے اور حافظ صاحب میرے سامنے تشریف فرما ہیں اور میں انھیں اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں...... گورا رنگ، پورا قد، تیکھی ناک، خوب صورت آنکھیں، باریک ہونٹ، صاف چمکتے ہوئے دانت،

متناسب صحت مند جسم' سفید لباس' ہاتھ میں چھڑی' چال میں وقار' میٹھی اور نرم آواز' لبوں پر مسکراہٹ' تیئس چوبیس برس کے جوانِ رعنا۔ مردانہ حسن کے تمام اوصاف سے متصف......!

ایک دن میرے دادا میاں محمد مرحوم نے صبح صبح مجھے حکم دیا' چلو تمھیں حافظ عبداللہ کے پاس چھوڑ آؤں۔ سکول جانے سے پہلے وہاں جایا کرو' پھر سکول سے آنے کے بعد شام تک وہاں رہا کرو۔

اب میں حضرت حافظ صاحب کی خدمت میں حاضر تھا۔

فرمایا: قرآنِ مجید پڑھ لیا ہے؟

عرض کیا: جی۔!

پھر فرمایا: کچھ اردو پڑھ لیتے ہو؟

عرض کیا: جی۔!

اس سے قبل قرآن مجید اور اردو کی چند کتابیں' نیز حضرت حافظ محمد لکھوی کی تصنیفات احوال الآخرت' انواع محمدی اور زینت الاسلام وغیرہ کتابیں دادا مرحوم نے مجھے پڑھا دی تھیں۔ علاوہ ازیں سکول میں چوتھی جماعت میں داخل تھا' اس لیے اردو آسانی سے پڑھ لیتا تھا اور تھوڑا بہت لکھنا بھی جانتا تھا...... حافظ صاحب نے مجھے فارسی قواعد کی ابتدائی کتاب مصدر فیوض پڑھانا شروع کی اور ساتھ ہی فرمایا قرآن مجید کے دو رکوع روزانہ مجھے سنایا کرو۔

ان دنوں چودہ پندرہ طالب علم حضرت حافظ صاحب کے حلقہ درس میں شامل تھے جو مختلف مقامات سے تعلق رکھتے تھے اور حدیث وفقہ وغیرہ علوم کی کتابیں پڑھتے تھے۔ ان میں سے پانچ طلبا کے نام مجھے یاد ہیں۔

۱۔ مولوی عبدالرشید:۔ یہ موضع ڈھانی' ریاست بیکانیر کے رہنے والے تھے' حضرت حافظ صاحب کے ماموں زاد تھے میری والدہ کے بھی ماموں زاد تھے۔ قیامِ پاکستان کے بعد چک نمبر ۳۶ گ ب تحصیل جڑانوالہ (فیصل آباد) میں آباد ہو گئے تھے۔ وہیں فوت

ہوئے۔

۲۔ مولوی سردار علی:- حافظ صاحب کے آبائی گاؤں ''بڈھیمال'' کے رہنے والے تھے۔ وسط جون ۱۹۹۷ء کو چک نمبر ۳۶ گ ب میں فوت ہوئے۔

۳۔ مولوی عبدالجبار:- ضلع حصار (صوبہ ہریانہ) کے کسی مقام کے رہنے والے تھے۔ حافظ صاحب سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد دہلی چلے گئے تھے' بعد میں پتا نہیں چلا کہ کہاں ہیں۔

۴۔ مولوی محمد یعقوب:- تقسیم ملک کے بعد ایک ہی دفعہ ان سے ملاقات ہو سکی۔ معلوم نہیں زندہ ہیں یا اللہ کو پیارے ہو گئے ہیں۔ جلد ساز بھی تھے۔ وطنی تعلق ضلع حصار سے تھا۔

۵۔ محمد ادریس:- تقسیم ملک کے بعد صرف ایک دفعہ ملاقات ہوئی۔ یہ بھی ضلع حصار کے رہنے والے تھے۔

میں بہت تھوڑا عرصہ حضرت حافظ صاحب کے حلقہ درس میں رہا' اس اثنا میں مولانا عطاء اللہ صاحب حنیف بھوجیانی وہاں تشریف لے گئے تھے اور انھوں نے جامع مسجد میں درس و تدریس کا سلسلہ شروع فرمایا تھا جو ہمارے گھر سے بالکل قریب تھی' میں اس میں شامل ہو گیا تھا' لیکن مجھے یہ سعادت حاصل ہے کہ میں حافظ صاحب کے ابتدائی دور کے شاگردوں کی جماعت کا رکن ہوں۔

• حافظ صاحب یکم مارچ ۱۹۰۹ کو اتوار کے دن موضع ''بڈھیمال'' میں پیدا ہوئے۔ یہ ایک چھوٹا سا گاؤں ہے جو اس وقت ضلع فیروز پور کی تحصیل مکتسر میں واقع تھا۔ تقسیم ملک کے بعد مشرقی پنجاب میں چند نئے ضلعے وجود میں آئے تو یہ گاؤں اپنی تحصیل سمیت ضلع فریدکوٹ میں شامل ہوا۔

حافظ صاحب کا سلسلہ نسب اس طرح ہے: عبداللہ بن مولانا عبدالکریم بن میاں سلطان دین بن مکھن بن الیاس دین...... قوم راجپوت بھٹی۔

یہ خاندان کم و بیش سو سال بڈھیمال کی چھوٹی سی بستی میں آباد رہا۔ اگست ۱۹۴۷ء کے انقلاب میں یہاں کے لوگ نقل مکانی کر کے چک نمبر ۳۶ گ ب میں آ گئے تھے جو

ضلع فیصل آباد کی تحصیل جڑانوالہ کا ایک گاؤں ہے اور ستیانہ بنگلہ کے قریب ہے۔

حافظ صاحب کے ایک بھائی اور تھے' جن کا نام عبیداللہ تھا' وہ ان سے چھوٹے تھے اور چھوٹی عمر ہی میں فوت ہو گئے تھے۔

آٹھ سال کو پہنچے تو والدہ وفات پا گئیں جو نہایت نیک اور صالحہ خاتون تھیں۔ اس وقت ان کے والد مولانا عبدالکریم کی عمر چھتیس برس کی تھی۔ حافظ صاحب کی تین بہنیں تھیں۔ والدہ کی وفات کے بعد یہ گھرانا پانچ افراد پر مشتمل تھا تین بہنیں' ایک بھائی اور ایک والد مولانا عبدالکریم......!

بڈھیمال نیک لوگوں اور عالموں کی بستی تھی۔ وہاں ایک بہت بڑے عالم مولانا عبدالرحمٰن تھے جو صالحیت اور تقوے میں خاص شہرت رکھتے تھے۔ گاؤں کے نمبردار بھی تھے۔ وہاں ان کی مسند تدریس آراستہ تھی۔ ان سے قرب و جوار کے لوگوں اور خود بڈھیمال کے بہت سے حضرات نے استفادہ کیا۔ استفادہ کرنے والوں کی فہرست میں حافظ صاحب کے والد مولانا عبدالکریم کا اسم گرامی بھی شامل ہے۔ مولانا عبدالرحمٰن طلبا کو درس دیتے تو حافظ صاحب کو (جو بالکل چھوٹی عمر کے تھے) اپنے پاس بٹھا لیتے اور ان سے بے حد پیار کا اظہار فرماتے۔ ان کے کوئی اولاد نہ تھی۔ وہ عین عالم جوانی میں وفات پا گئے تھے۔

حافظ صاحب نے ابتدائی تعلیم اپنے والد محترم سے حاصل کی۔ قرآن مجید کی آخری منزل بھی ان سے یاد کی اور حضرت حافظ محمد لکھوی کی پنجابی نظم کی کتابیں احوال الآخرت اور زینت الاسلام وغیرہ بھی جو اس زمانے کے پنجاب میں گھروں میں پڑھائی جاتی تھیں' والد سے پڑھیں۔ اس وقت ان کی عمر بارہ سال کی ہو گئی تھی اور اس عمر تک انھوں نے اتنا علم حاصل کر لیا تھا۔ ان دنوں حافظ صاحب کے والد اپنی زمین خود کاشت کرتے تھے اور حافظ صاحب باپ کے ساتھ کھیتوں میں جاتے اور کام کاج میں ان کا ہاتھ بٹاتے تھے۔ انھوں نے بکریاں پال رکھی تھیں' حافظ صاحب دوسرے بچوں کے ساتھ بکریاں چراتے تھے اور اسی قسم کے گیت گانے لگے تھے جو ان کے ساتھی بچے گاتے

تھے۔ تعلیم سے توجہ بٹ گئی تھی اور گیت گانوں میں دلچسپی پیدا ہو گئی تھی---لیکن جلد ہی یہ سلسلہ ختم ہو گیا تھا اور حصول علم میں مشغول ہو گئے تھے۔

پڈھیمال میں ایک جگہ اونچا سا چبوترہ بنا ہوا تھا' شام کے وقت بعض لوگ وہاں بیٹھ جاتے اور بچوں سے گانے سنتے۔ پھر انھیں خوش کرنے کے لیے پیسے دیتے۔ لیکن جیسا کہ پہلے بتایا گیا مولانا عبدالرحمٰن کو حافظ صاحب سے بڑی محبت تھی۔ وہ ان سے فرماتے کہ جتنی سورتیں سناؤ گے' اتنے ہی پیسے ملیں گے۔ چنانچہ وہ قرآن کی سورتیں یاد کر کے سناتے اور پیسے لیتے۔ اس طرح انھوں نے کتنی ہی سورتیں یاد کر لیں۔

ریاست فرید کوٹ میں ایک گاؤں آرائیاں والا تھا۔ وہاں ایک بزرگ مولوی عبدالغنی نے دینی مدرسہ جاری کیا تھا' وہ تدریس کے لیے مولانا عبدالکریم کو وہاں لے گئے۔ اٹھارہ روپے ان کی ماہانہ تنخواہ مقرر ہوئی جو بالکل مناسب تنخواہ تھی۔ اس وقت حافظ صاحب کی عمر بارہ تیرہ سال کی ہوگی۔ مولانا بیٹے کو اپنے ساتھ ہی لے گئے تھے۔ وہاں وہ تین سال رہے اور اس اثنا میں بہت سے لوگوں نے ان سے استفادہ کیا--- حافظ صاحب نے ان دنوں مندرجہ ذیل کتابیں اپنے والد محترم سے پڑھیں۔

قرآن مجید کا مکمل ترجمہ' فارسی کی پہلی اور دوسری کتاب' کریما' نام حق' پند نامہ' تحفہ نصائح' گلستان' بوستان' صرف بہائی' ابواب الصرف' زرادی' زنجانی' دستور المبتدی' صرف میر' نحو میر' پنج گنج' مراح الارواح' فصول اکبری' شرح مائۃ عامل' ہدایت النحو' ایسا غوجی اور قال اقول۔

اس کے بعد گھریلو حالات کچھ ایسے ہو گئے تھے کہ مولانا عبدالکریم کو واپس اپنے گاؤں بڈھیمال جانا پڑا۔ ان کی جگہ ارائیاں والا میں ایک عالم دین مولانا محمد سلیم آ گئے جو طبیب اور شاعر بھی تھے اور خوش بیان واعظ بھی۔ انھوں نے حافظ صاحب کو والد کے ساتھ بڈھیمال نہیں جانے دیا' وہیں اپنے پاس رکھ لیا۔ وہ دو سال وہاں رہے اور حافظ صاحب نے اس دوران ان سے جو کتابیں پڑھیں' ان میں سے چند کتابیں یہ ہیں۔

مشکوٰۃ شریف' کافیہ' شافیہ' اصول شاشی' مرقات' قدوری' کنز الدقائق' سکندر نامہ'

حافظ صاحب کی عمر اب پندرہ سال کی ہو گئی تھی اور وہ ذہین اور محنتی طالب علم تھے۔ مولانا محمد سلیم نے ان کو مشورہ دیا کہ مزید حصول علم کے لیے انھیں حضرت مولانا عطاء اللہ لکھوی کی خدمت میں لکھو کے جانا چاہیے۔ انھوں نے فرمایا کہ وہ خود انھیں لکھو کے لے کر جائیں گے اور مولانا عطاء اللہ صاحب لکھوی سے کہیں گے کہ یہ ہونہار لڑکا ہے' اسے وہ محنت اور توجہ سے پڑھائیں۔ لیکن حافظ صاحب اکیلے ہی لکھو کے چلے گئے۔ مولانا محمد سلیم کو پتا چلا تو حضرت مولانا عطاء اللہ لکھوی کو خط لکھا کہ اس لڑکے کا خیال رکھیں۔

اللہ تعالیٰ نے حافظ صاحب کو اس خصوصیت سے نوازا تھا کہ جہاں وہ پڑھنے میں تیز تھے' وہاں اساتذہ کی خدمت میں بھی مستعد رہتے تھے۔ اس کا اندازہ اس سے کیجیے کہ ارائیاں والا میں اپنے استاذ مولانا محمد سلیم کی بھینس کے لیے وہ ایک میل کی مسافت سے سر پر چارا اٹھا کر لاتے۔ وہاں میٹھا پانی نہیں تھا' روزانہ دو میل سے ان کے لیے میٹھا پانی لاتے --- ان وجوہ سے استاذ ان پر نہایت خوش رہتے تھے۔

ایک دن فرمایا: عبداللہ! جب تم بڑے عالم ہو جاؤ گے تو تمھارے شاگرد تم سے پوچھیں گے کہ آپ نے کن کن اساتذہ سے علم حاصل کیا؟ اس وقت اپنے بڑے بڑے اساتذہ کے ساتھ کیا میرا نام بھی لوگے کہ میں چند روز ارائیاں والا گاؤں میں محمد سلیم سے بھی پڑھتا رہا ہوں؟

یہ نفسیاتی مسئلہ ہے' اس قسم کی باتوں سے شاگرد خوش بھی ہوتا ہے' اساتذہ کی تکریم بھی کرتا ہے اور دل لگا کر حصول علم میں بھی کوشاں ہوتا ہے۔ دور قدیم کے اساتذہ شاگردوں کا حوصلہ بڑھانے اور ان میں تحصیل علم کا شوق پیدا کرنے کے لیے اس قسم کی باتیں کیا کرتے تھے...... اب نہ اس درجہ ہم دردی کا اظہار کرنے والے استاد رہے ہیں اور نہ خدمت گزار اور حصول علم کا صحیح جذبہ رکھنے والے کہیں شاگرد نظر آتے ہیں...... یہ مادی دور ہے' ہر کام مادی نقطہ نظر سے کیا جاتا ہے اور اسی ترازو میں تمام معاملات کو تولا جاتا اور اسی معیار سے پرکھا جاتا ہے۔ خلوص اور للّٰہیت کے جذبات ختم ہو گئے ہیں...... ہر سو مفادات کا دور دورہ ہے اور ان پرانی قدروں کا جو بزرگانِ دین کے احترام کی

بنیادوں پر استوار ہوئی تھیں' تیزی کے ساتھ خاتمہ ہو رہا ہے۔ اس مشینی عہد میں انسان مشین ہو گیا ہے' اور مشینی زاویہ فکر سے ہر شے کا جائزہ لیتا ہے۔ اگر کوئی چیز اس مشین میں فٹ آ گئی تو ٹھیک' اگر فٹ نہ آئی تو معاملہ ختم......!

ذہن کی اس طرح کا یا پلٹ ہو گئی ہے اور حالات ایسی ڈگر پر چل پڑے ہیں کہ ہم اس قسم کے اساتذہ و تلامذہ کے حالات کسی سے سنتے یا کہیں پڑھتے ہیں تو ان کی صداقت پر یقین نہیں آتا اور ذہن ماننے پر آمادہ نہیں ہوتا کہ اس عالم آب و گل کو کبھی ان اوصاف کے حاملین سے بھی آشنائی کا موقع ملا ہے --- ہماری شناسائی موجودہ دور سے ہے' جب کہ واقعات کی آنکھوں سے حیا کا مادہ ختم ہو چکا ہے اور زمانے کا ذہن اساتذہ کی تکریم کے داعیے سے بے گانہ ہو گیا ہے۔ آئندہ نہ کسی استاذ کو حافظ عبداللہ بڈھیمالوی جیسے شاگرد ملیں گے اور نہ اس کینڈے کے کہیں استاذ نظر آئیں گے۔ ماضی کا وہ دور اپنی تمام رعنائیوں کے ساتھ رخصت ہو گیا۔

حافظ صاحب نے ارائیاں والا میں مولانا محمد سلیم سے خوب استفادہ کیا۔ وہ پانچ سال ارائیاں والا میں رہے' تین سال اپنے والد گرامی کے زمانہ قیام میں اور دو سال مولانا محمد سلیم کے عہد سکونت میں......! اسی اثنا میں ایک مرتبہ مولانا عطاء اللہ حنیف وہاں گئے' یہ ان کا طالب علمی کا دور تھا۔ انھوں نے حافظ صاحب کو مشورہ دیا کہ کسی وقت وہ حضرت حافظ محمد گوندلوی کی خدمت میں بھی جائیں اور ان سے تحصیل علم کریں۔

بہر حال ارائیاں والا کے عہد طالب علمی میں وہ لکھو کے گئے۔ اس وقت استاذ پنجاب مولانا عطاء اللہ لکھوی کے والد گرامی حضرت مولانا عبدالقادر لکھوی زندہ تھے اور وہاں کی مسند تدریس پر متمکن تھے۔ وہ اپنے دور کے محدث اور ماہر علوم مروجہ تھے۔ حافظ صاحب ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور مقصد حاضری بیان کیا...... انھوں نے نہایت مشفقانہ لہجے میں پوچھا:

روزانہ قرآن مجید کی کتنی تلاوت کرتے ہو؟

جواب دیا: ایک پاؤ --- چوتھے دن سیپارہ ختم کرتا ہوں۔

فرمایا: کس طرح؟

عرض کیا: تفسیر جلالین کا ایک سبق پڑھتا ہوں اور یہی میری منزل ہے۔

فرمایا: تمھیں روزانہ ایک پارہ پڑھنا چاہیے۔

حضرت مولانا کے اس ارشاد کا نتیجہ یہ ہوا کہ حافظ صاحب نے باقاعدہ قرآن مجید حفظ کرنا شروع کر دیا' آخری منزل پہلے سے یاد تھی' باقی چھے منزلیں بہت تیزی سے یاد کرلیں۔

حضرت مولانا عبدالقادر لکھوی کے چند ارشادات سننے کے بعد وہ واپس آ گئے۔ کچھ عرصہ گزرا تھا کہ انھوں نے باقاعدہ حصول علم کی غرض سے لکھوکے کا عزم کیا۔ وہاں پہنچے تو حضرت مولانا وفات پا چکے تھے۔

انھوں نے پچاس سال لکھوکے میں خدمت تدریس سرانجام دی اور برصغیر کے بے شمار بڑے بڑے علما نے اس چھوٹے سے گاؤں میں ان سے کسب علم کیا اور پھر آ گے چل کر انھوں نے اتنے لوگوں میں اس علم کی نشر و اشاعت کی کہ لا تحصی ولا تعد......! یہ درویش منش لوگ دین کی آبرو تھے اور انہی کی سرگرمیوں سے اس خطۂ ارضی میں اسلام پھیلا اور لوگوں نے اللہ اور رسول کی بتائی ہوئی سیدھی راہ پر چلنا شروع کیا۔ رحمهم الله تعالی۔

حافظ صاحب لکھوکے میں حضرت مولانا عبدالقادر محدث لکھوی سے تو حصول فیض نہ کر سکے' البتہ ان کے لائق ترین فرزند گرامی حضرت مولانا عطاء اللہ لکھوی کے حضور زانوے شاگردی تہ کرنے کی سعادت سے بہرہ یاب ہوئے' جو باپ کی طرح علوم و فنون کے تمام پہلوؤں پر عمیق نگاہ رکھتے تھے اور نہایت متواضع' منکسر المزاج اور حلیم الطبع عالم تھے۔ شاگردوں کی کثرت اور علوم میں درک و انہاک کی وجہ سے وہ استاذ پنجاب کے پرافتخار لقب کے مستحق قرار پائے۔ انھوں نے بائیس تیئس سال کی عمر میں ۱۹۰۵ء میں لکھوکے میں سلسلہ تدریس کا آغاز کیا تھا' اڑتالیس سال یہ خدمت انجام دی۔ ۲۶ نومبر ۱۹۵۲ء کو جامعہ محمدیہ اوکاڑہ میں وفات پائی۔

حضرت حافظ عبداللہ بڈھیمالوی تین سال ان کے حلقہ درس میں شریک رہے' وہ ان کے ذہین ترین شاگردوں میں سے تھے۔ انھوں نے جو کتابیں ان سے پڑھیں' ان میں یہ کتابیں شامل ہیں۔

ابوداؤد' ترمذی' ابن ماجہ' تفسیر جلالین' قرطبی' شرح تہذیب' قطبی' شرح وقایہ' ہدایہ اولین و آخرین' میبذی' شرح جامی' مختصر المعانی' نور الانوار۔

ان کے علاوہ دوسری متعدد کتابوں کی تکمیل کے بعد وہ واپس اپنے گاؤں بڈھیمال آ گئے۔ اس وقت ان کی عمر بیس سال تھی۔ کچھ عرصہ وہ گھر رہے۔ بعد ازاں حضرت حافظ محمد گوندلوی کی خدمت میں گوندلانوالہ (ضلع گوجرانوالہ) تشریف لے گئے۔ جیسا کہ پہلے بتایا گیا' وہاں جانے کا مشورہ انھیں اس سے چند سال پیشتر مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی نے دیا تھا جو ارائیاں والا میں ان کے دور طالب علمی میں ان سے ملے تھے۔

حافظ صاحب نے علوم آلیہ و عالیہ کی بعض کتابیں تو حضرت استاذ حافظ محمد صاحب سے طلبا کے ساتھ پڑھیں اور بعض تنہا پڑھیں۔ جو کتابیں تنہا پڑھیں' ان میں درج ذیل کتابیں شامل ہیں۔

صحیح بخاری' صحیح مسلم' موطا امام مالک' ترمذی' ابوداؤد' دلائل الاعجاز' مطول' اقلیدس نفیسی' مقامات حریری' حماسہ' متنبی' مقدمہ ابن صلاح' تصریح' سراجی اور چغمینی۔

جن کتابوں کی تکمیل دیگر طلبا کے ساتھ اشتراک سے کی' ان میں مندرجہ ذیل کتابیں قابل ذکر ہیں۔

ترجمہ قرآن' تفسیر بیضاوی' سلم العلوم' ملا حسن' حمد اللہ' صدرا' شرح اشارات' ارشاد الفحول' مسلم الثبوت' ہدیہ سعدیہ' توضیح تلویح وغیرہ۔

حافظ صاحب ایک سال گوندلانوالہ میں رہے اور وہاں دن رات محنت کر کے بڑی بڑی پینتیس کتابیں پڑھیں۔ حضرت استاذ ان پر نہایت خوش تھے اور انتہائی توجہ سے پڑھاتے تھے۔

اس سے قبل وہ قرآن مجید یاد کر چکے تھے۔ سالانہ رخصتیں ہوئیں تو گھر نہیں گئے'

ذہن نے فیصلہ کیا کہ قرآن مجید کی قرات و تجوید سیکھنی چاہیے۔ چنانچہ وہ موضع ''میر محمد'' (ضلع قصور) چلے گئے' جہاں حافظ محمد یحییٰ میر محمدی کے والد محترم حضرت حافظ قاری محمد مرحوم طلبا کو قرات و تجوید کی تعلیم دیتے تھے۔ حافظ صاحب ان کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انھوں نے انتہائی مسرت کے ساتھ انھیں اپنے شاگردوں کی جماعت میں شامل فرمایا۔ اس وقت وہ عمر کی اکیسویں منزل میں داخل ہو چکے تھے۔ دو یا تین مہینوں میں انھوں نے قرات و تجوید کا نصاب مکمل کر لیا اور حضرت حافظ قاری محمد میر محمدی رحمتہ اللہ علیہ نے انھیں سند فراغ عطا فرمائی۔

یہاں چند باتیں اور سنتے جایے۔

۱۔ حافظ صاحب جب قرات و تجوید کا علم حاصل کرنے میر محمد پہنچے تو وہاں کے مدرسے میں کئی فاضل اساتذہ اور پرانے واعظ و مدرس موجود تھے' لیکن استاذِ تجوید حضرت حافظ محمد صاحب نے صبح کی نماز کے بعد درس قرآن کی ذمے داری اپنے اس شاگرد اور طالب علم حافظ عبداللہ کے سپرد فرمائی۔ یہ درس اس قدر موثر اور علمی ہوتا تھا کہ اساتذہ وطلبا کے علاوہ وہاں کے مقامی لوگ نہایت شوق اور التزام سے اس میں شامل ہوتے اور اس نوجوان کے طریق کلام اور اسلوب تفہیم کی داد دیتے۔ جو شخص ایک دفعہ درس میں شامل ہو گیا' وہ ہر روز باقاعدہ شامل ہوتا۔

۲۔ اسی سال حضرت استاذ نے رمضان المبارک میں بھائی پھیرو کی ایک مسجد میں ان کے لیے نماز تراویح پڑھانے کا انتظام فرما دیا اور انھوں نے وہاں تراویح پڑھائیں۔ حفاظ قرآن کی اصطلاح میں ان کا یہ پہلا مصلّٰی تھا۔

۳۔ عید الفطر آئی تو لائق شاگرد کو ارشاد ہوا کہ وہ نماز عید پڑھائیں' چنانچہ استاذ مکرم کے حکم سے نماز عید پڑھائی گئی۔ مقتدیوں میں خود استاذ مکرم بھی شامل تھے۔

۴۔ استاذ ان کے طریق وعظ و تقریر سے اس درجہ متاثر ہوئے کہ حکم صادر ہوا کہ اردگرد کے دیہات میں جا کر تبلیغ دین کیا کرو۔ اس کارِ خیر کے لیے ایک گھوڑی خریدی گئی۔ جب پہلے دن انھیں تبلیغ کے لیے بھیجا گیا تو حضرت استاذ نے گھوڑی کی لگام

ہاتھ میں پکڑی اور شاگرد کو اس پر سوار ہونے کا حکم دیا۔ شاگرد نے ہچکچاہٹ محسوس کی تو فرمایا جھجکنے اور شرمانے کی ضرورت نہیں۔ اس پر سوار ہو جاؤ۔ چنانچہ وہ الامر فوق الادب کے تحت گھوڑی پر سوار ہو گئے۔ کچھ دور حضرت استاذ مکرم گھوڑی کی لگام پکڑے ہوئے' ان کے ساتھ گئے' پھر کامیابی کی دعا کر کے' لگام سوار کے ہاتھ میں تھما دی اور خدا حافظ کہہ کر ان کو رخصت فرمایا۔

یہ بہت بڑا تمغہ اعزاز تھا' جس کا عالی قدر اور صاحب تقویٰ استاذ کی طرف سے شاگرد کو مستحق گردانا گیا۔ اب کہاں ان اوصاف بوقلموں کے حامل استاذ ملیں گے اور کہاں اس قسم کے اطاعت گزار اور قابل شاگرد میسر آئیں گے۔ یہ لوگ ایک خاص دورِ دین داری کی پیداوار تھے' اب نہ وہ دور باقی رہا ہے اور نہ دین داری کی کہیں کوئی جھلک دکھائی دیتی ہے۔

فارغ التحصیل ہونے کے بعد ایک مرتبہ حافظ صاحب اپنے ذی احترام استاذ حضرت علام حافظ محمد گوندلوی کی خدمت میں گوندلاں والا گئے۔ مقصد ان سے مزید استفادہ کرنا تھا۔ فرمایا اب درسی کتابیں پڑھنے کی ضرورت نہیں۔ بس مطالعے کو اپنا معمول بناؤ اور کہیں درس و تدریس کا سلسلہ شروع کر دو۔

ایک مرتبہ پھر گئے تو حضرت استاذ شاگرد کو رخصت کرنے کے لیے تانگوں کے اڈے تک ان کے ساتھ تشریف لائے اور راستے میں یہ نصیحت فرماتے رہے کہ مختلف علوم وفنون کی کتابوں کا مطالعہ بھی کرو اور تدریس بھی جاری رکھو۔

علوم درسیہ کی تکمیل کے بعد حافظ صاحب اپنے گھر آئے اور والد مکرم کے ساتھ کھیتی باڑی کرنے لگے۔ کچھ عرصہ وہ اس میں مصروف رہے۔ کوٹ کپورے کے لوگوں کو ان کی تکمیل تعلیم اور گھر میں واپسی کا پتا چلا تو وہ انھیں اپنے ہاں لے گئے اور انھوں نے حاجی نور الدین کی مسجد میں درس و تدریس کا آغاز کر دیا' اسی سال کوٹ کپورے میں ان کی شادی ہوئی تھی --- یہ ۱۹۳۳ء کے پس و پیش کی بات ہے۔ ان کے زمانہ قیام ہی میں وہاں کی انجمن اصلاح المسلمین کی طرف سے جامع مسجد کی خطابت کے لیے

مولانا عطاء اللہ حنیف کی خدمات حاصل کی گئی تھیں جو حافظ صاحب کے پرانے دوست تھے۔ مولانا نے خطابت کے ساتھ تدریس کا سلسلہ بھی شروع کر دیا تھا۔

میں حافظ صاحب کے حلقہ شاگردی میں داخل ہوا تھا' لیکن افسوس ہے' ان سے زیادہ استفادہ نہ کر سکا' تاہم اس فقیر کو یہ شرف حاصل ہے کہ یہ اس جلیل القدر عالم و معلم کے زمرۂ تلامذہ میں شامل ہوا۔

حافظ صاحب دو سال وہاں رہے۔ پھر موضع ارائیاں والا کے مدرسے کے مہتمم مولوی عبدالغنی انھیں اپنے مدرسے میں لے گئے۔ اس سے بہت سال پہلے حافظ صاحب کے والد محترم بھی تین سال وہاں خدمت تدریس انجام دیتے رہے تھے اور مولانا محمد سلیم کا زمانہ ملا کر حافظ صاحب پانچ سال وہاں طالب علم کی حیثیت سے رہے تھے۔ یہ گاؤں اور مدرسہ ان کے لیے اجنبی نہ تھا۔ فرق یہ پڑا تھا کہ پہلے ان کا قیام وہاں بہ طور طالب علم کے تھا' اب وہ معلم اور استاذ کی حیثیت سے تشریف لائے تھے۔

کوٹ کپورے میں جو طلبا حافظ صاحب سے تحصیل علم کر رہے تھے' وہ سب ان کے ساتھ ارائیاں والا چلے گئے تھے' لیکن وہاں حالات کچھ ایسے پیدا ہو گئے تھے کہ وہ دو سال سے زیادہ عرصہ وہاں قیام نہ فرما سکے۔ وہیں انھوں نے خواب دیکھا جس میں حضرت مولانا عبدالرحمٰن بڈھیمالوی انھیں سختی کے ساتھ فرما رہے ہیں کہ بڈھیمال میں میرا مدرسہ اجڑ گیا ہے اور تم دوسرے مدرسے آباد کر رہے ہو' جاؤ' اس مدرسے کو آباد کرو۔

اس خواب کے بعد مولانا عبدالرحمٰن مرحوم کے مدرسے کا وہ پورا منظر ان کی آنکھوں کے سامنے آ گیا جو انھوں نے بچپن میں دیکھا تھا۔ بلاشبہ وہ مدرسہ اجڑ گیا تھا اور وہ رونقیں ختم ہو گئی تھیں جو مولانا مرحوم کے زمانے میں اس گاؤں کا طرہ امتیاز تھیں......

اب دل کی تہوں میں چھپی ہوئی پرانی محبت نے انگڑائی تو وہ اپنے گاؤں بڈھیمال تشریف لے آئے اور اللہ کا نام لے کر تدریس کا آغاز کر دیا۔ کچھ تو ارائیاں والے کے طلبا ان کے ساتھ آ گئے تھے اور کچھ مزید طلبا نے ادھر کا عزم کر لیا تھا۔

حافظ صاحب ابتدا ہی سے کامیاب مدرسین کی صف میں شامل ہو گئے تھے اور

انتہائی شوق اور لگن سے طلبا کو تعلیم دیتے تھے' پھر ان کا اندازِ تدریس بڑا میٹھا اور دل آویز تھا' جس سے طلبا بے حد متاثر ہوتے تھے۔

بڈھیمال میں انھوں نے اپنے انداز خاص سے تدریس کی طرح ڈالی تو ان کی شہرت سن کر ملتان سے ایک صاحب آئے جو حضرت مولانا عبدالوہاب دہلوی کے حلقہ درس میں رہ چکے تھے اور ان کے ارشد تلامذہ میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ انھوں نے حافظ صاحب سے صحیح بخاری شروع کی' وہ صاحب ان کے طریق درس سے نہایت متاثر ہوئے اور پوری صحیح بخاری ان سے پڑھی۔

حافظ صاحب بڑی محنت سے مطالعہ کر کے انھیں حدیث شریف کی اس سب سے اہم کتاب کا درس دیتے تھے...... یہ اولین شخص ہیں جنھوں نے ان سے صحیح بخاری پڑھی تھی۔

بڈھیمال ان کا اپنا گاؤں تھا اور یہی گاؤں ان کی جنم بھومی تھا۔ یہاں وہ صبح کی نماز کے بعد درس قرآن بھی دیتے تھے' جس میں گاؤں کے لوگ باقاعدگی سے شریک ہوتے تھے۔ یہاں ان سے بیرونی طلبا کے علاوہ مقامی طلبا نے بھی خوب استفادہ کیا۔ ان کے اس دور کے شاگردوں میں متعدد مشہور و ممتاز مدرس شامل ہیں' جن میں مولانا محمد عبدہ الفلاح (وفات یکم جولائی ۱۹۹۹) اور مولانا حافظ احمد اللہ بڈھیمالوی (وفات ۲۹ نومبر ۱۹۹۸) کے اسمائے گرامی خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ ان دونوں حضرات نے آگے چل کر بے پناہ تدریسی خدمات انجام دیں۔ ان کی حیثیت استاذ الاساتذہ کی تھی۔

بڈھیمال میں انھوں نے چار سال تعلیم دی' لیکن بعض لوگوں نے ایسے حالات پیدا کر دیے کہ وہاں تدریسی خدمت انجام دینا ان کے لیے مشکل ہو گیا' وہ چوں کہ ان کا اپنا گاؤں تھا اور اپنی ہی برادری کے لوگ آباد تھے' پھر وہاں کئی علمائے کرام بھی قیام فرما تھے' اس لیے معاصرت اور رقابت نے سر اٹھایا اور اندر ہی اندر حالات بے حد پیچیدہ ہو گئے۔ اس وقت ان کی عمر تیس سال کی ہو گئی تھی۔

ان دنوں ضلع فیصل آباد میں تاندلیانوالا کے قریب چک نمبر ۴۲۷ گ ب جھوک

دادو میں اس نواح کی طور برادری کے ایک متدین بزرگ میاں محمد باقر کا مدرسہ جاری تھا، لیکن معقول مدرس دست یاب نہ ہونے کی وجہ سے اب اس کی علمی رونق ختم ہو چکی تھی، میاں صاحب نے گوجرانوالہ میں حضرت مولانا محمد اسماعیل سے رابطہ قائم کیا اور کسی اچھے اور تجربہ کار مدرس کے بارے میں پوچھا۔ انھوں نے مشورہ دیا کہ حافظ عبداللہ بڈھیمالوی کی خدمات حاصل کر لیجیے، وہ بہت اچھے مدرس ہیں۔ ان کی آمد سے طلبا ادھر کا رخ کرنا شروع کر دیں گے اور حالات درست ہو جائیں گے۔ چنانچہ انھوں نے اپنے بڑے صاحب زادے حافظ محمد زکریا کو حافظ صاحب کی خدمت میں بڈھیمال بھیجا اور وہ ان کی خدمات حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

حافظ صاحب ان کے ساتھ بڈھیمال سے رخصت ہونے لگے تو ان پر اس درجہ افسردگی طاری ہوئی اور انھیں اس قدر افسوس ہوا کہ آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور فرمایا میں نے مشکل اور ناموافق حالات میں مولانا عبدالرحمٰن کا یہ مدرسہ دوبارہ جاری کیا تھا، لیکن افسوس ہے، بعض لوگوں کے عمل و حرکت سے حالات نے ایسا رخ اختیار کر لیا کہ میرا اس مدرسے میں تدریسی خدمات انجام دینا ممکن نہ رہا۔ اب میں انتہائی کرب کے ساتھ یہاں سے رخصت ہو رہا ہوں۔

حافظ صاحب کے جانے سے بڈھیمال کا مدرسہ نہایت متاثر ہوا اور وہاں کے طلبا حافظ صاحب کے پیچھے جھوک دادو پہنچ گئے اور اس مدرسے کی رونقیں بحال ہو گئیں۔

جھوک دادو جانے والے چند طلبا، جنھوں نے آگے چل کر دینی اور مذہبی حلقوں میں خاص شہرت حاصل کی، مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ مولانا ہدایت اللہ ندوی:۔ ان کا وطنی تعلق آرائیاں والا (ریاست فرید کوٹ) سے ہے اور مشہور مدرس، مصنف اور مترجم ہیں۔ آج کل میاں چنوں میں مقیم ہیں۔

۲۔ مولانا محمد یحییٰ شرق پوری:۔ ان کا اصل وطن ضلع حصار تھا، اسی لیے پہلے وہ حصاری کی نسبت سے معروف تھے۔ پھر شرق پوری کہلانے لگے۔ صاحب تقویٰ عالم دین ہیں۔ کتاب و سنت کی تبلیغ کا اللہ نے انھیں خاص سلیقہ عطا فرمایا ہے۔ قیام

پاکستان کے بعد سے شرق پور میں اقامت گزیں ہیں۔

۳۔ مولانا محمد یعقوب:۔ ریاست فرید کوٹ کے ایک گاؤں ''واندراں'' کے رہنے والے تھے۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد طویل عرصہ گوجرہ (ضلع فیصل آباد) میں تدریس وخطابت کی خدمات سرانجام دیتے رہے' وہیں وفات پائی۔

جھوک دادو میں حضرت حافظ صاحب تقریباً پانچ سال رہے۔ اس اثنا میں جن حضرات نے ان سے اخذ علم کیا' ان میں مولانا محمد صدیق فیصل آبادی' حافظ عبدالغفور جہلمی' مولانا عتیق اللہ بن میاں محمد باقر اور مولانا محمد شریف لکھوی کے اسمائے گرامی لائق تذکرہ ہیں' اور یہ وہ حضرات ہیں جنھوں نے تحصیل علم کے بعد تدریسی خدمات بھی انجام دیں اور وعظ وتقریر کے میدان میں بھی شہرت پائی۔

جھوک دادو کے عہد قیام میں انھوں نے لکھوی خاندان میں دوسری شادی کی۔ اس وقت ان کی عمر تینتیس برس کے قریب تھی۔ بیوی کو سب سے پہلے وہ فیروز پور لائے تھے اور اپنے پرانے دوست مولانا عطاء اللہ حنیف کے مکان پر ٹھہرے تھے۔

۱۹۳۸ء میں گنبداں والی مسجد میں مولانا عطاء اللہ صاحب نے ''دارالحدیث نذیریہ'' کے نام سے ایک درس گاہ قائم کی جس کے افتتاح کے لیے حضرت حافظ عبداللہ بڈھیمالوی کو دعوت دی گئی تھی...... عشا کی نماز کے بعد اس کا افتتاح ہوا' سردیوں کا موسم تھا۔ مسجد کے اندرونی حصے اور برآمدے میں لوگ اچھی خاصی تعداد میں موجود تھے۔ بجلی کی روشنی نے رات کو دن سے بھی زیادہ چمک دار بنا دیا تھا۔ حافظ صاحب منبر پر تشریف فرما تھے اور صاف ستھرے سفید لباس میں ملبوس...... ان کے چہرے مہرے اور وضع قطع سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ علم کا پہاڑ خوب صورت انسانی شکل میں انتہائی احترام کے ساتھ منبر پر رکھ دیا گیا ہے۔ میں نے ان کے حضور کھڑے ہو کر جامع ترمذی کی ابتدائی عبارت اور پہلی حدیث پڑھی۔ انھوں نے اس کا اردو میں ترجمہ کیا جو میں ان کے پیچھے پیچھے پڑھتا گیا۔ پھر مجھے بیٹھ جانے کا حکم دیا۔ اب انھوں نے جامع ترمذی سے متعلق تقریر کرنا شروع کی جو کم وبیش ایک گھنٹا جاری رہی۔ وہ انتہائی وقار کے ساتھ بولتے جاتے تھے اور

لوگ ادب و اکرام کے تمام تقاضوں کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے انتہائی جذبہ احترام کے ساتھ ان کی تقریر سن رہے تھے۔ عذوبت لسان اور لینت کلام کا یہ عالم کہ معلوم ہوتا تھا' پھولوں کی بارش ہو رہی ہے اور ہر شخص بقدر استطاعت انھیں چن رہا اور اپنے خزانہ ذہن میں محفوظ کر رہا ہے۔ ہر لفظ پوری صفائی اور کامل احتیاط سے ادا ہو رہا تھا۔

میں پہلے بھی ان کے حلقہ تلامذہ میں شامل تھا' اب بھی بہت سے پڑھے لکھے لوگوں کی موجودگی میں ان کی شاگردی کی سعادت حاصل کر رہا تھا۔

جھوک دادو چک نمبر ۴۲۷ گ ب میں وہ پانچ سال سے اقامت فرماتے اور بہت سے علما و طلبا ان سے مستفید ہو چکے تھے اور ہو رہے تھے۔ اب بڈھیمال کے لوگوں نے ان پر پھر دباؤ ڈالا کہ اپنے وطن واپس آ جائیں اور اس مدرسے میں دوبارہ سلسلہ تدریس شروع فرمائیں۔ چنانچہ ان کے مجبور کرنے پر انھوں نے پھر وہاں کا عزم کیا اور باقاعدگی سے طلبا کو تعلیم دینے لگے۔ ان کی عدم موجودگی میں وہاں اگرچہ حافظ احمد اللہ' مولانا قدرت اللہ اور وہیں کے ایک اور عالم مولانا عطاء اللہ خدمت تدریس پر مامور تھے' لیکن وہ چاہتے تھے کہ حضرت حافظ عبداللہ صاحب یہاں تشریف لے آئیں تاکہ مدرسے کی رونق میں مزید اضافہ ہو۔ جھوک دادو کے بعض طلبا بھی ان کے ساتھ ہی بڈھیمال آ گئے تھے' جن میں مولانا ہدایت اللہ ندوی اور مولانا محمد یعقوب شامل تھے۔ اب تدریس کے علاوہ وہاں کی خطابت و امامت بھی ان کے سپرد تھی' نماز فجر کے بعد درس قرآن بھی وہ ارشاد فرماتے تھے۔

ان کے درس قرآن کے بارے میں یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ یہ سلسلہ انھوں نے موضع ''میر محمد'' (ضلع قصور) میں اپنے استاذ قرات و تجوید حضرت حافظ محمد میر محمدی کے فرمان سے شروع کیا تھا جس پر وہ پوری پابندی کے ساتھ تمام عمر عمل پیرا رہے' جہاں گئے درس قرآن کو اپنا معمول ٹھہرائے رکھا۔ اللہ کے کلام کی تبلیغ اور اس کے اوامر و نواہی سے نرم الفاظ' میٹھی زبان اور عام فہم انداز میں لوگوں کو روشناس کرانا ان کا بہت بڑا کارنامہ تھا' جسے انھوں نے اپنی استطاعت کے مطابق ساری زندگی سرانجام دیا۔ ان کی مغفرت

کے لیے اللہ کے دربار میں یہی عمل کافی ہوگا۔

آزادی وطن سے قبل حافظ صاحب کافی عرصہ ہر سال نماز تراویح فرید کوٹ کی مسجد اہل حدیث میں پڑھاتے رہے۔ وہاں اہل حدیث کی ایک ہی مسجد تھی جو گھنٹا گھر کے قریب تھی۔ ایک مرتبہ وہ ۲۵ رمضان کو قرآن مجید ختم کر کے ہمارے ہاں کوٹ کپورے تشریف لے گئے۔ جامع مسجد میں نماز تراویح انھوں نے ان حافظ صاحب کے پیچھے پڑھی جو پہلے سے پڑھا رہے تھے۔ اس کے بعد نمازیوں کے کہنے سے انھوں نے دو رکعت کی نیت باندھی' قرآن پڑھنا شروع کیا تو پہلی رکعت میں دس پاروں تک پہنچ گئے۔ اس کے بعد دوسری رکعت میں دو پارے پڑھے۔ سلام پھیرا تو سحری کا وقت ہو چکا تھا۔ دوسرے دن قرآن مجید ختم کر دیا...... ان کا پڑھنے کا انداز ایسا تھا کہ سننے والا محسوس کرتا تھا کہ روح کو کوئی خاص قسم کی غذا مہیا ہو رہی ہے اور دل میں ایسی کیفیت کروٹ لے رہی ہے جسے الفاظ کے قالب میں ڈھالنا ممکن نہیں...... ان کی قرأت کے وقت اونگھ' نیند اور تھکاوٹ کا تصور بھی ذہن میں نہیں آتا تھا۔

اسی صبح کو فجر کی نماز کے بعد انھوں نے درس قرآن دیا' مجھے یاد پڑتا ہے سورہ زلزال پڑھ کر اس کا ترجمہ اور تشریح کی تھی۔ انھوں نے الفاظ میں قبر' قیامت اور جنت و دوزخ کا ایسا نقشہ کھینچا کہ ہر شے سامنے وقوع پذیر ہوتی نظر آ رہی تھی۔ درس قرآن پنجابی میں دیا تھا۔ اس پر پچاس سال سے زیادہ عرصہ گزر چکا ہے' لیکن ان کا طرز بیان اب بھی ذہن میں محفوظ ہے۔

دوسرے دن پھر درس دیا' اس میں اللہ کی ان نعمتوں کا ذکر فرمایا جو اس نے انسان کو عطا فرمائی ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ناک' کان' آنکھ' زبان اور ذہن و دماغ کی صورت میں جو کچھ انسان کو مرحمت فرمایا گیا ہے' اس کا تذکرہ کرتے ہوئے ایسے ایسے نکات بیان فرمائے کہ سبحان اللہ......!

جنت دوزخ وغیرہ عنوانات پر ہم نے بہت سے مقررین کی بہت تقریریں سنی ہیں' لیکن حافظ صاحب کا اس موضوع پر بولنے کا کچھ اور ہی ڈھب تھا' بقول غالب

ہیں اور بھی دنیا میں سخن ور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالب کا ہے اندازِ بیاں اور

انھیں سیاست سے کوئی تعلق نہ تھا' لیکن ایک دفعہ ہم انھیں سیاسی جلسے میں کھینچ لائے اور کرسی صدارت پر بٹھا دیے گئے۔

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ دوسری جنگ عظیم کے بعد جب ہندوستان کی برطانوی حکومت نے سیاسی قیدیوں کو رہا کیا اور پھر کچھ عرصے کے بعد ملک میں عام انتخابات کے انعقاد کا اعلان کیا تو مختلف سیاسی جماعتوں کے رہنماؤں نے دوروں کا سلسلہ شروع کر دیا تھا' جن میں اس عہد کے مشہور سوشلسٹ لیڈر جے پرکاش نارائن بھی شامل تھے۔ وہ پنجاب کے دورے پر آئے تو ان کی اہلیہ بھی ان کے ساتھ تھیں۔ وہ ضلع فیروز پور کے ایک شہر ''موگا'' پہنچے تو ریاست فرید کوٹ کی پرجا منڈل کے ہم چند ارکان انھیں فرید کوٹ آنے اور وہاں تقریر کرنے کی دعوت دینے گئے۔ وہ مان گئے اور پہلے سے طے شدہ پروگرام میں تبدیلی کر کے اپنی اہلیہ کے ساتھ دوسرے دن چار بجے فرید کوٹ پہنچے۔

گرمیوں کا موسم تھا اور رمضان کا مہینا...... فرید کوٹ شہر کی غلہ منڈی میں نماز عشا اور تراویح کے بعد دس بجے ان کی تقریر کا اعلان کیا گیا تھا۔ حضرت حافظ عبداللہ بڈھیمالوی اس زمانے میں ہر سال فرید کوٹ کی مسجد اہل حدیث میں نماز تراویح پڑھایا کرتے تھے۔ ہم ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور جلسے کی صدارت کے لیے عرض کیا۔ انھوں نے ہماری گزارش منظور فرمائی اور جلسے کی صدارت کی۔ سٹیج سیکرٹری کے فرائض میرے ذمے تھے۔ تلاوت قرآنِ مجید اور نظم کے بعد جے پرکاش نارائن کا تعارف کرایا گیا اور ان کی تقریر شروع ہوئی۔ شستہ اور عام فہم اردو میں انھوں نے اظہار خیال کیا۔

بہت بڑا مجمع تھا' حافظ صاحب نے وقت کے تقاضے اور مجمعے کے مزاج کے مطابق مختصر الفاظ میں چند منٹ تقریر کی اور لوگ اس سے متاثر ہوئے۔ میرا خیال ہے کسی سیاسی جلسے میں ان کی یہ پہلی اور آخری شرکت تھی اور پہلی اور آخری تقریر......!

اس زمانے میں جے پرکاش نارائن اور ڈاکٹر رام منوہر لوہیا ہندوستان کے دو مشہور سوشلسٹ لیڈر تھے' دونوں کا تعلق صوبہ بہار سے تھا اور دوسری جنگ عظیم کے زمانے میں (جو ۳ ستمبر ۱۹۳۹ء کو شروع اور چھ سال کے بعد جون ۱۹۴۵ء کو ختم ہوئی تھی) ان دونوں رہنماؤں کو انگریزی حکومت نے گرفتار کر کے لاہور کے قلعے میں بند کر دیا تھا...... ملک کی آزادی کے بعد جے پرکاش نارائن نے ''پرجا سوشلسٹ پارٹی'' کے نام سے اپنی نئی جماعت بنالی تھی۔

بہر کیف جلسہ رات کے ایک بجے ختم ہوا...... حاضرین اپنے گھروں کو چلے گئے اور حضرت حافظ صاحب اپنے مسکن پر تشریف لے گئے اور ہم لوگ اپنے شہر کوٹ کپورے کو روانہ ہو گئے۔ راستے میں جو کچھ ہمارے ساتھ بیتی وہ بھی ایک دلچسپ داستان ہے۔ لیکن میں اس کی تفصیل ''نقوش عظمت رفتہ'' کے اس مضمون میں بیان کر چکا ہوں' جو میں نے اپنے دیرینہ دوست اور پرانے ہم وطن آں جہانی گیانی ذیل سنگھ (سابق صدر ہندوستان) کے بارے میں لکھا ہے۔

حافظ صاحب بڈھیمال ہی میں تھے کہ ہندوستان آزاد ہو گیا اور پاکستان کی نئی مملکت نقشہ عالم پر ابھر آئی۔ اس وقت وہ عمر عزیز کی ساڑھے اڑتیں منزلیں طے کر چکے تھے' یعنی چالیس سال کو پہنچنے میں صرف ڈیڑھ سال باقی تھا...... اب مشرقی پنجاب میں فسادات شروع ہو چکے تھے اور سکھ بالخصوص مسلمانوں کے درپے آزار تھے۔ اس زمانے میں مسلمانوں کو سب سے زیادہ تکلیفیں سکھوں کے ہاتھوں پہنچیں اور اس قوم نے مسلمانوں کو بے پناہ اذیتوں سے دوچار کیا۔ جو لوگ ان کے ساتھ اب محبت کی پینگیں بڑھا رہے ہیں' ان میں زیادہ تر لوگوں کا تعلق ابتدا ہی سے مغربی پنجاب سے ہے' کیا انھیں پتا نہیں کہ اس قوم نے مسلمانوں پر کیا مظالم ڈھائے ہیں؟

ہم کہنا یہ چاہتے ہیں کہ جس طرح مشرقی پنجاب کے دیگر علاقوں کے لوگ گھروں سے نکل کر نامعلوم منزل کی طرف دوڑے' اسی طرح بڈھیمال کی چھوٹی سی بستی کے لوگ بھی اپنے سوسالہ مسکن سے کوچ کرنے پر مجبور ہوئے۔ مشکلات و مصائب کی وادیوں

سے گزرتا ہوا یہ قافلہ کچھ دور آگے بڑھا تو دیکھا کہ سامنے سے ایک سکھ نوجوان تلوار لہراتا ہوا آ رہا ہے۔ حافظ صاحب سب سے آگے تھے۔ اس نے ان پر نگاہ ڈالی تو آگے بڑھ کر تلوار کا وار کیا' لیکن وار خالی گیا' حافظ صاحب قد آور' صحت مند اور توانا جوان تھے' انھوں نے اسی آن حملہ آور کو پکڑا اور اسے اپنی مضبوط گرفت میں لے کر نیچے گرا لیا' اب اس کی تلوار ان کے ہاتھ میں تھی اور وہ اس کی چھاتی پر بیٹھے تھے۔ اسی کی تلوار سے اسے قتل کرنے لگے تو وہ خدا کا نام لے کر ہاتھ جوڑ کے معافی مانگنے لگا...... حافظ صاحب نے اسے معاف کر دیا......

ادھر ادھر کے چکر کاٹتے ہوئے یہ لوگ ضلع فیصل آباد کی تحصیل جڑانوالا کے ایک گاؤں چک نمبر ۳۶ گ ب پہنچ گئے۔ وہاں پہنچنے سے کچھ عرصہ بعد حافظ صاحب بیمار ہو گئے اور بیماری نے اس درجہ شدت پکڑی کہ وہ زندگی سے مایوس ہو گئے اور اپنے ایک پرانے ساتھی اور دوست مولانا قدرت اللہ کو بلا کر اپنے عزیزوں میں شریعت کے مطابق اپنی جائداد تقسیم کر دی۔ مولانا قدرت اللہ متقی اور تہجد گزار بزرگ تھے اور حافظ احمد اللہ بڈھیمالوی کے بڑے بھائی---!

پھر اللہ تعالیٰ نے انھیں صحت عطا فرمائی اور چلنے پھرنے لگے۔ قیام پاکستان کے بعد پہلا رمضان شریف آیا تو حافظ صاحب نے اپنے اس نئے گاؤں میں تراویح پڑھانا شروع کیں اور قرآن مجید سنایا۔

قرآن مجید سے انھیں بے حد لگاؤ تھا اور وہ بالعموم قرآن مجید کی تلاوت کرتے رہتے تھے۔ معلوم ہوا ہے کہ انھوں نے سیالکوٹ میں حضرت مولانا محمد ابراہیم سیالکوٹی سے بھی استفادہ کیا تھا اور ان کے دورہ تفسیر قرآن میں شامل ہوئے تھے' لیکن یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ کس سال ان کی خدمت میں گئے تھے۔

اب پاکستان میں ان کے سلسلہ تدریس کا آغاز ہوتا ہے۔ اس کا جائزہ لینا بھی ضروری ہے...... سب سے پہلے اوڈاں والا۔

حافظ صاحب اپنے گاؤں چک نمبر ۳۶ گ ب میں تھے کہ اوڈاں والا کے

دار العلوم تعلیم الاسلام کے مہتمم صوفی عبداللہ مرحوم کو پتا چلا کہ وہ آج کل فارغ ہیں' انھوں نے قاصد بھیج کر انھیں بلایا۔ حافظ صاحب وہاں گئے اور ان سے گفتگو ہوئی اور انھیں مدرس مقرر کر لیا گیا۔ لیکن اس وقت اس مدرسے کے صدر مدرس ہمارے مرحوم جگری دوست مولانا محمد اسحاق چیمہ تھے۔ دونوں کی طبائع میں بہت بعد تھا اور مزاج بالکل مختلف......جو بات چیمہ صاحب کے ذہن میں آتی تھی' حافظ صاحب کا اس کی تہہ تک پہنچنا مشکل تھا اور اگر کسی طرح پہنچ بھی گئے تو اس کا اظہار ان کی فطرت کے خلاف تھا۔ حافظ صاحب علم و فضل اور تدریسی تجربے کے اعتبار سے چیمہ صاحب سے بہت آگے تھے' پھر ذات برادری کے اعتبار سے بھی ان سے کم درجے کے نہ تھے' لیکن چیمہ صاحب طویل مدت سے وہاں مقیم تھے' اس مدرسے کے طالب علم بھی رہے تھے اور صدر مدرس ہونے کی بنا پر اب اس کے چودھری تھے......مگر حافظ صاحب اس قسم کی باتوں کو کوئی اہمیت نہ دیتے تھے۔ وہ جوڑ توڑ کے عادی نہ تھے' اپنے کام سے کام رکھتے تھے۔ طلبا بھی ان کے طریق تعلیم سے مطمئن اور خوش تھے۔

اس مختصر متن سے خوانندگان محترم یقیناً سمجھ گئے ہوں گے کہ اس کی شرح کتنی طویل ہے۔ دو سال حافظ صاحب وہاں رہے اور یہ شرح دو سالوں کے لیل و نہار پر محیط ہے۔ پھر یہ ہمارے دینی مدارس کی تاریخ کا ایک حصہ بھی ہے' جسے بیان کرنے میں کوئی حرج نہیں' لیکن بات یہ ہے کہ محمد اسحاق چیمہ میرا پیارا دوست تھا اور میں اس کے بہت سے معاملات سے آگاہ ہوں' اور حافظ صاحب میرے بزرگ بھی تھے اور استاد بھی۔ اس طرح میری دونوں سے آشنائی تھی' میں کسی سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ سارا معاملہ قارئین پر چھوڑتا ہوں' وہ اس کی شرح کر لیں۔ یہ شرح کوئی مشکل نہیں ہے' بہت آسان ہے۔

دو مہینے کی سالانہ چھٹیاں ہوئیں تو اساتذہ و طلبا اپنے گھروں کو چلے گئے۔ انہی دنوں اوکاڑا میں جامعہ محمدیہ کا جلسہ منعقد ہوا' حضرت مولانا محمد علی لکھوی سے ملنے کے لیے حافظ صاحب اوکاڑے گئے۔ اس زمانے میں مولانا عطاء اللہ لکھوی وہاں کی مسند تدریس پر متمکن تھے جو حافظ صاحب کے استاذ تھے۔ مولانا معین الدین لکھوی جامعہ

کے ناظم تھے۔ یہ تمام حضرات حافظ صاحب کی تدریسی صلاحیتوں سے آگاہ تھے' یہ ۱۹۵۰ء کا واقعہ ہے۔ ان سب نے اصرار کیا کہ وہ آئندہ اپنی تدریسی خدمات جامعہ محمدیہ کے سپرد کر دیں' اور یہ وہی جامعہ تھی جو لکھوکے (ضلع فیروز پور) سے یہاں منتقل ہوئی تھی اور جس میں حافظ صاحب طالب علم کی حیثیت سے رہے تھے اور وہی حضرت مولانا عطاء اللہ لکھوی تھے' جن کی شاگردی کا شرف لکھوکے میں حافظ صاحب کو حاصل ہوا تھا......

میاں محمد باقر کو اس کا پتا چلا تو انھوں نے مولانا معین الدین کو پیغام بھجوایا کہ اگر حافظ صاحب نے اوڈاں والا سے قطع تعلق کا فیصلہ کر ہی لیا ہے تو ہم انھیں اپنے مدرسے میں جھوک دادو لائیں گے' وہ تقسیم ملک سے پہلے یہاں رہ چکے ہیں اور ہمارے حالات سے واقف ہیں' ہم ان کی فضیلت علمی اور تدریسی قابلیت سے بھی باخبر ہیں' لہٰذا ان پر ہمارا حق مقدم ہے۔

مولانا معین الدین ؒ نے ان کے پیغام رساں کو اس کا یہ جواب دیا کہ آپ کو صرف مدرس کی ضرورت ہے' ہم نے حافظ صاحب سے بہت سے کام لینے ہیں' درس و تدریس کے علاوہ خطابت و امامت اور فتاویٰ نویسی کے فرائض بھی وہ یہاں انجام دیں گے...... دوسری بات یہ ہے جو درحقیقت اولین اہمیت کی حامل ہے کہ ہمارا مدرسہ بڑا بھی ہے اور قدیم بھی' اس لیے یہ مدرسہ اصل اور بنیاد ٹھہرا' جب کہ آپ کا مدرسہ اس کی شاخ ہے' اصل اور بنیاد قائم رہے گی تو شاخیں خود بخود ہری بھری رہیں گی۔

اوڈاں والا میں صوفی عبداللہ صاحب کے علم میں یہ بات آئی تو انھوں نے بزرگانہ خلوص کے ساتھ حافظ صاحب پر خفگی کا اظہار فرمایا...... حافظ صاحب نے خط کے ذریعے انھیں گزشتہ دو سال کی تمام کیفیت لکھ بھیجی اور تفصیل سے تحریر فرمایا کہ میں بعض حضرات کے رویے سے وہاں کس درجہ ذہنی کوفت میں مبتلا رہا ہوں' اب ان کے لیے میدان خالی ہے' وہ جو خدمت وہاں سرانجام دینا چاہتے ہیں' آزادی سے دیں۔

لکھوی خاندان کی اس عظیم درس گاہ یعنی جامعہ محمدیہ اوکاڑہ کی مسند تدریس پر وہ

(۱۹۵۰ سے ۱۹۶۲ تک) بارہ سال فائز رہے' تین سال اپنے استاذ محترم حضرت مولانا عطاء اللہ لکھوی کی معیت میں اور نو سال ان کی وفات کے بعد۔

اس اثنا میں انھوں نے تفسیر و حدیث' معانی و بیان' منطق و فلسفہ' صرف و نحو' فقہ و اصول' ادب و انشا' خطابت و امامت اور فتویٰ نویسی وغیرہ ہر محاذ پر اپنی قابلیت کے جوہر دکھائے اور ہر محاذ میں اللہ نے ان کو کامیابی سے نوازا۔ اس طویل مدت میں انھیں بہت سے مدارس کے سالانہ امتحانات لینے کے مواقع میسر آئے۔ مولانا سید محمد داؤد غزنوی نے تو دارالعلوم تقویۃ الاسلام (لاہور) کے سالانہ امتحانات کے لیے انھیں کئی مرتبہ دعوت دی۔ اسی اثنا میں دراصل ان سے مولانا غزنوی کا تعارف ہوا اور انھیں قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔

۱۹۶۲ء میں مولانا غزنوی کی دعوت پر وہ امتحان کے لیے لاہور تشریف لائے تو مولانا نے انھیں جامعہ سلفیہ (فیصل آباد) تشریف لے جانے کے لیے فرمایا۔ اس وقت جامعہ سلفیہ کے صدر مدرس اور شیخ الحدیث حضرت علام حافظ محمد گوندلوی تھے جو علم و عمل میں اپنی مثال آپ تھے۔

مولانا غزنوی کے فرمان کے مطابق حافظ صاحب اوکاڑے سے جامعہ سلفیہ میں فیصل آباد چلے گئے اور اس سے کچھ عرصہ بعد حضرت حافظ محمد صاحب واپس گوجرانوالہ تشریف لے گئے۔ انھیں اطمینان تھا کہ ان کے لائق شاگرد جامعہ کے تمام تعلیمی معاملات کو حسن و خوبی کے ساتھ چلا سکیں گے۔ وہ گیارہ سال جامعہ سلفیہ کے صدر مدرس اور شیخ الحدیث رہے۔

بعد ازاں صوفی عبداللہ صاحب کی دعوت پر دارالعلوم تعلیم الاسلام ماموں کانجن (ضلع فیصل آباد) تشریف لے گئے۔ یہ دارالعلوم اوڈاں والا سے ماموں کانجن منتقل ہو گیا تھا' لیکن اس کا اچھا خاصا حصہ اوڈاں والا ہی میں رہا' جس کا اہتمام و انتظام مولانا محمد یعقوب ملہوی کے ہاتھ میں تھا' وہ نیک نفس اور پارسا عالم دین تھے' حضرت حافظ عبداللہ بڈھیمالوی کے بہنوئی تھے۔ ان کی وفات (۱۳ نومبر ۱۹۸۱) کے بعد اس مدرسے

کے مہتمم اور شیخ الحدیث ان کے صاحب زادے حافظ محمد امین ہیں جو نہایت مناسب اور انتہائی بہتر طریقے سے یہ خدمت سرانجام دے رہے ہیں۔

ماموں کانجن حضرت حافظ صاحب صرف ایک سال رہے۔ اب جامعہ سلفیہ کے ارباب انتظام پھر ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور جامعہ سلفیہ کی مسند تدریس سنبھالنے پر اصرار کرنے لگے۔ صوفی صاحب انھیں چھوڑنے پر آمادہ نہ تھے' وہ فرماتے تھے کہ آپ کو جامعہ سلفیہ میں بالکل نہیں جانا چاہیے' اسی دارالعلوم میں رہنا چاہیے...... لیکن اصل معاملہ یہ تھا کہ جامعہ سلفیہ کے ارکان انتظام ان کے نام حضرت حافظ محمد گوندلوی کا تحریری حکم نامہ لے کر گئے تھے' جس میں انھوں نے زوردار الفاظ میں فرمایا تھا کہ آپ ہر حال میں جامعہ سلفیہ میں واپس آ جائیں' چنانچہ وہ استاذ مکرم کے حکم سے مجبور تھے اور یہی وہ مجبوری تھی جو انھیں دوبارہ جامعہ سلفیہ میں لانے کا باعث بنی۔ ورنہ وہ ذاتی طور سے وہاں جانے کے لیے بالکل آمادہ نہ تھے۔ اب کے وہ تین سال جامعہ میں رہے۔ اس طرح انھوں نے چودہ سال جامعہ سلفیہ میں فرائض تدریس انجام دیے۔

جامعہ سلفیہ کے بعد وہ تاندلیانوالا منڈی تشریف لے گئے۔ وہاں چار سال مقیم رہے۔ اس اثنا میں ان سے متعدد علما و طلبا نے استفادہ کیا۔ تاندلیانوالا کے دورِ قیام میں انھوں نے ۱۹۷۵ یا ۱۹۷۶ میں حج بیت اللہ کیا۔ اس سے قبل وہ جامعہ سلفیہ کے زمانہ تدریس میں اپنے والد مکرم مولانا عبدالکریم کو حج کرا چکے تھے۔

حافظ صاحب بحری جہاز سے حج پر گئے تھے' جہاز میں انھوں نے سلسلہ تبلیغ جاری رکھا۔ ان کا طریق وعظ و تبلیغ نہایت موثر تھا اور لوگ بڑے انہماک اور غور سے ان کی باتیں سنتے تھے۔ وہ مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ پہنچے تو وہاں ان کے بہت سے شاگرد موجود تھے' جنھوں نے ان کی خدمت کو اپنے لیے بہت بڑی سعادت سمجھا۔ وہاں بھی انھوں نے مختلف مقامات پر وعظ کہے اور وہ ہر جگہ حج کے احکام و فضائل اور دیگر ضروری مسائل تفصیل سے بیان فرماتے رہے۔

حج بیت اللہ سے واپس تاندلیانوالا تشریف لائے تو یہ فقیر ان کی زیارت و ملاقات

کے لیے حاضر ہوا' وہ حسب معمول نہایت خوش ہوئے' گھر کے تمام افراد کے بارے میں پوچھا' دوسرے رشتے داروں کی خیریت دریافت فرمائی' میرے تصنیفی کام کی تفصیلات معلوم کیں۔ جو لوگ ان سے ملاقات کرنے آئے تھے' ان کے بارے میں بتایا۔ میں نے انھیں سب کی طرف سے سلام پہنچایا' نہایت مسرت کا اظہار فرمایا' مجھے آب زمزم پلایا اور کھجوریں عنایت کیں' کھانے کے لیے اصرار فرمایا لیکن میں کھانا کھا چکا تھا۔ ڈیڑھ گھنٹا میں ان کی خدمت میں رہا' سفرحج سے متعلق بہت سی باتیں بیان فرمائیں۔ اس موقعے پر اس فقیر نے ان کی خدمت میں اپنی وہ تصنیفات پیش کیں جو اس وقت تک چھپ چکی تھیں۔

میں اجازت لے کر واپس آنے لگا تو ازراہ کرم دس روپے عنایت فرمائے۔ یہ آج سے پچیس برس پہلے کی بات ہے' جب دس روپے بڑی اہمیت رکھتے تھے۔ میرے خیال میں لاہور سے تاندلیانوالا تک کا آمدورفت کا کرایہ بھی اتنا ہی ہوگا۔

وہ تاندلیانوالا میں چار سال رہے۔ اب وہاں سے ان کی درس و تدریس کے سلسلے کی زندگی کا آخری سفر شروع ہوتا ہے یا یوں کہیے کہ ان کی کتاب حیات مقام تدریس کا آخری ورق الٹتی ہے۔

تاندلیانوالا سے تین ساڑھے تین میل کے فاصلے پر ایک گاؤں چک نمبر ۴۰۵ گ ب کمیانہ شریف والا کے نام سے موسوم ہے۔ یہ گاؤں ضلع فیصل آباد کی تحصیل سمندری میں واقع ہے۔ اس میں ایک بزرگ حاجی عبدالحق کمیانہ اقامت گزیں ہیں۔ انھوں نے حافظ صاحب کے مواعظ حسنہ سنے اور ان سے قریب ہو کر ان کا طریق تعلیم دیکھا اور ان کے اسلوب کلام سے مانوس ہوئے تو ان سے مستقل طور سے اپنے گاؤں تشریف لے جانے کی درخواست کی۔ یہ ۱۹۷۸ یا ۱۹۷۹ء کی بات ہے۔ حافظ صاحب نے ان کی درخواست کو شرف قبول بخشا' لیکن جب اس گاؤں میں پہنچے تو دیکھا کہ نہ وہاں بجلی ہے اور نہ کوئی اور مادی سہولت حاصل ہے۔ البتہ ایک مسجد موجود ہے۔ لیکن اگر نیت نیک ہو' عمل میں اخلاص کے جذبات موجزن ہوں اور دل صدائے حق بلند کرنے کے دواعی سے

معمور ہو تو اندھیروں میں روشنی نمودار ہو جاتی ہے۔ ردائے ظلمت پھٹ جاتی ہے اور فضا پرنور کا شامیانہ تن جاتا ہے۔ چنانچہ یہی ہوا' پختہ سڑک گاؤں سے ہم کنار ہو گئی' برقی قمقموں نے اس پس ماندہ علاقے کے چاروں طرف روشنی پھیلا دی' مدرسے کی وسیع عمارت تکمیل کا مرحلہ طے کر گئی' طلبا کے لیے دارالاقامہ تعمیر ہو گیا' مسجد نے وسعت اختیار کر لی اور شائقین علوم نے اس مقام غیر مانوس کو مرکز انس ٹھہرا لیا...... یہ کارِ خیر جہاں حضرت حافظ عبداللہ بڈھیمالوی کے نامہ اعمال میں بحروف جلی لکھا جائے گا' وہاں حاجی عبدالحق کمیانہ کے قرطاس حسنات میں بھی ابھرے ہوئے الفاظ میں مرقوم دکھائی دے گا۔

حافظ صاحب نے اس گاؤں کے دوران قیام میں میاں محمد باقر کے قائم کردہ مدرسۃ البنات (جھوک دادو) میں طالبات کو دو سال صحیحین اور حدیث کی دوسری کتابوں کا درس دیا۔ یہ غالباً ۱۹۸۳ یا ۱۹۸۴ کا زمانہ تھا۔

اب ہم چلتے چلتے ان کے واقعات لیل و نہار کے آخری موڑ پر پہنچ گئے ہیں اور یہ موڑ کاٹنا نہایت دشوار دکھائی دیتا ہے' لیکن کیا کیا جائے' انسان کو اس عالم ہست و بود میں جہاں بے شمار راحتوں سے واسطہ پڑتا ہے' وہاں اسے دشوار گزار گھاٹیوں سے بھی گزرنا پڑتا ہے' یا یوں کہیے کہ جہاں پھولوں سے آشنائی ہوتی ہے' وہاں کانٹوں سے الجھنا بھی لازمی امر ہے...... تو آیئے اب ان کے آخری لمحات ملاحظہ کیجیے۔

ایک مرتبہ انھیں پیشاب کی تکلیف لاحق ہوئی۔ علاج کے لیے لاہور کے میو ہسپتال میں داخل ہوئے' ڈاکٹروں نے آپریشن کیا اور تکلیف رفع ہو گئی۔ یہ فقیر ان دنوں ان کی خدمت میں ہسپتال حاضر ہوتا رہا۔

اس سے کچھ عرصہ بعد عارضہ قلب میں مبتلا ہو گئے...... لیکن اپنے تدریسی معمولات بہ دستور جاری رکھے۔ ۱۹۸۷ء کے مئی کا مہینا تھا اور ۱۴۰۷ھ کا ماہ رمضان المبارک' ستیانہ بنگلہ کے مرکز دارالدعوۃ السلفیہ میں دورہ تفسیر کرا رہے تھے کہ اچانک سینے میں درد کی شدید لہر اٹھی۔ انھیں اسی وقت گاؤں چک نمبر ۴۰۵ گ ب کمیانہ لایا گیا' رات وہیں

رہے۔ صبح کو تاندلیانوالا کے ہسپتال پہنچایا گیا۔ ڈاکٹروں نے دیکھا تو لاہور لے جانے کا مشورہ دیا۔ لاہور کو روانہ ہوئے تو اوکاڑہ کے قریب ست گرہ موڑ پر گاڑی روکنے کا حکم صادر فرمایا۔ تینوں سعادت مند صاحب زادے عظیم القدر باپ کی خدمت میں حاضر تھے۔ گاڑی رکی تو بیٹوں سے چند باتیں کیں۔ پھر پوچھا:

آج کیا دن ہے؟

عرض کیا گیا:- جمعۃ المبارک۔

اس کے بعد آنکھیں بند کرلیں اور ابدی نیند سو گئے۔ یوں فضل وکمال کا یہ نیر تاباں جو نصف صدی سے زائد عرصے تک درس وتدریس کے حلقوں میں علم کی روشنی بانٹتا رہا تھا' ۷ مئی ۱۹۸۷ء (۱۰ رمضان المبارک ۱۴۰۷ھ) کو جمعے کے دن صبح سات بجے اوکاڑہ کے نواح میں ست گرہ موڑ پر ہمیشہ کے لیے غروب ہو گیا اور یہ موڑ ان کی حیات مستعار کا آخری موڑ ثابت ہوا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

اب گاڑی میں ان کا بے جان لاشہ پڑا تھا اور روح اعلیٰ علیین کو پرواز کر گئی تھی۔ اسی وقت ان کی میت واپس کمیانہ پہنچائی گئی اور اس عالم اجل کی موت کی یہ اندوہناک خبر تیزی کے ساتھ سارے علاقے میں پھیل گئی۔ نماز عصر کے بعد مولانا معین الدین لکھوی نے نمازِ جنازہ پڑھائی' جس میں ہزاروں لوگوں نے شرکت کی۔ اللهم اغفرله وارحمه وعافه واعف عنه۔

اس علاقے کے لوگ ان سے انتہائی تعلق عقیدت رکھتے اور انھیں ولی کامل سمجھتے تھے۔ اندیشہ تھا کہ وہ ان کی قبر پر مشرکانہ رسوم کا ارتکاب شروع کر دیں گے' کیوں کہ اس نواح کے اکثر باشندے اسی قسم کے افکار کے حامل ہیں' لہٰذا انھیں مدرسے کے قریب ہی دفن کیا گیا۔ ہم عاجز اور گنہگار بندوں کی دعا ہے۔ اللهم اكرم نزله و نور قبره ووسع مدخله۔

انھوں نے پچپن سال درس وتدریس کا سلسلہ جاری رکھا۔ بلوغ المرام سے لے کر صحیح بخاری تک حدیث کی تمام کتابیں پڑھائیں۔ صرف بہائی سے لے کر شافیہ تک علم

صرف کی تعلیم دی۔ نحو میر سے لے کر شرح جامی تک علم نحو پڑھایا۔ پھر منطق، فلسفہ، عربی ادبیات، معانی و بیان، فقہ، اصول فقہ، اصول حدیث، ہندسہ، عقائد وغیرہ تمام علوم کی چھوٹی بڑی تمام کتابیں بے حد محنت اور شوق سے پڑھائیں اور بار بار پڑھائیں...... صحیح بخاری پچاس مرتبہ پڑھائی۔ بیضاوی، جلالین، جامع البیان اور طبری وغیرہ تفسیروں کا درس متعدد دفعہ دیا۔

اسلامی تاریخ اور حدیث و فقہ کے رجال پر ان کی گہری نظر تھی اور دل نشین طریقے سے اس پر گفتگو فرماتے تھے۔ خوارج، مرجیہ، قدریہ، معتزلہ، جہمیہ، وغیرہ فرقوں سے متعلق وہ کامل معلومات رکھتے تھے اور ان کی تاریخ کے تمام گوشوں سے آگاہ تھے۔ فقہیات کے اختلافی مسائل انھیں ازبر تھے اور مختلف ائمہ فقہ جس انداز سے ان مباحث سے عہدہ برآ ہوتے ہیں، اس کی تفصیلات کا انھیں پورا علم تھا......

وہ تہجد گزار اور متقی عالم دین تھے۔ بڑے خوددار اور وضع دار تھے۔ سادہ مگر صاف ستھرا لباس پہنتے تھے...... ان کی زندگی کی پوری عمارت اعتدال و توازن کے قابل رشک اور خوب صورت ستونوں پر استوار تھی۔ جس طرح ظاہر حسین تھا، اسی طرح ان کے باطن میں حسن کے جلوے کارفرما تھے۔

ان میں ایک خوبی یہ تھی کہ برادری کے سلسلہ ہائے نسب سے پوری دلچسپی رکھتے تھے۔ میرے والد مرحوم کو بھی اس موضوع سے تعلق تھا، چنانچہ جب حافظ صاحب ہمارے موجودہ گاؤں تشریف لے جاتے تو یہ دونوں اس ضمن میں ضرور گفتگو کرتے کہ فلاں کون تھا اور اس کا سلسلہ نسب کہاں تک پہنچا اور اس کی اولاد کون ہے اور کہاں ہے وغیرہ۔

ان کے اساتذہ کا ذکر ان کے دورِ طالب علمی کے حالات میں ہو چکا ہے، لیکن مناسب معلوم ہوتا ہے کہ قارئین کی سہولت کے لیے یہاں ایک ہی جگہ ان کے اسمائے گرامی درج کر دیے جائیں۔

۱۔ مولانا عبدالکریم بڈھیمالوی...... ان کے والد محترم۔

۲۔ مولانا محمد سلیم...... ان سے ارائیاں والا میں تعلیم حاصل کی۔

۳۔ مولانا عطاء اللہ لکھوی......استاذ پنجاب لکھو کے ضلع فیروز پور۔

۴۔ حضرت حافظ محمد گوندلوی......گوندلاں والا' ضلع گوجرانوالا۔

۵۔ حافظ محمد میر محمدی......استاذ قرات و تجوید۔ میر محمد ضلع قصور۔

۶۔ مولانا حافظ محمد ابراہیم سیالکوٹی......ان کے حضور دورہ تفسیر کیا۔

یہ وہ اساتذہ گرامی قدر تھے جن سے حضرت حافظ صاحب نے اکتساب علم کیا تھا' حافظ صاحب اس دنیا سے رخصت ہو گئے اور اس کے ساتھ ہی درس و تدریس کی رونقیں ماند پڑ گئیں۔ اس قسم کا اونچے مرتبے کا مدرس اب کہاں ملے گا۔

مجنوں جو مر گیا ہے تو جنگل اداس ہے

حضرت حافظ صاحب کی وفات کے وقت میں ادارہ ثقافت اسلامیہ سے وابستہ تھا اور مجلّہ ''المعارف'' کا ایڈیٹر تھا۔ اس کے علاوہ میں ان دنوں ہفت روزہ ''اہل حدیث'' کا اداریہ بھی لکھتا تھا۔ حضرت حافظ صاحب کی وفات پر میں نے ۱۵ مئی ۱۹۸۷ء میں مندرجہ ذیل اداریہ لکھا تھا۔ ان کی وفات سے قبل' متعدد حضرات کا انتقال ہوا تھا' جن پر میں نے اداریے لکھے تھے۔ اس اداریے میں ان فوت شدگان کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔ ملاحظہ فرمایئے ۱۴ مئی ۱۹۸۷ کا اداریہ۔ عنوان تھا۔ ''آہ! شیخ الحدیث حافظ عبداللہ بڈھیمالوی۔''

''یہ صفحات کئی ہفتوں سے ماتم کدہ بنے ہوئے ہیں۔ ہم نے لاہور کے خونی حادثے پر جماعت اہل حدیث کے ناقابل تلافی نقصان پر اظہارِ حزن و ملال کیا' علامہ احسان الٰہی ظہیر کے انتقال پر خطابت کی بلند آہنگی کے انقطاع کا مرثیہ پڑھا' میر علی احمد تالپور کی وفات پر سیاست و تدبر کے رخصت ہو جانے کا نوحہ کیا' مولانا عبدالخالق قدوسی کے اس دنیائے فانی سے رخت سفر باندھنے پر جماعت میں تحقیق و کاوش کی بزم آرائی کا ایک باب بند ہو جانے کا افسوس کیا' مولانا حبیب الرحمٰن یزدانی کی موت سے تبلیغ و تقریر کی ایک موثر آواز کے خاموش ہو جانے کا شیون کیا۔ میاں محمود علی قصوری کی رحلت پر ہمدردی خلائق' خلوص قلب اور بھرپور قانونی امداد کی ایک پرشکوہ روایت کے خاتمے پر

فریاد کناں ہوئے--- آج گردش شب و روز نے ہم کو حضرت مولانا حافظ عبداللہ بڈھیمالوی کے اس جہانِ ناپائیدار سے اچانک کوچ کر جانے پر جماعت اہل حدیث میں درس وتدریس کے ایک زریں دور کے ختم ہونے کا نالہ کرنے پر مجبور کیا ہے۔ وہ ۷ مئی ۱۹۸۷ء کو موضع کمیانہ چک نمبر ۴۰۵ گ ب (ضلع فیصل آباد) میں حرکت قلب بند ہو جانے سے جنت کو سدھارے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

''مولانا حافظ عبداللہ بڈھیمالوی جنھیں آج سے لرزتے ہاتھ اور کانپتے قلم سے مرحوم لکھنا پڑے گا' مشرقی پنجاب کے ضلع فیروز پور کی تحصیل مکتسر کے ایک چھوٹے سے گاؤں ''بڈھیمال'' میں پیدا ہوئے (تحصیل مکتسر آج کل ضلع فریدکوٹ میں شامل ہے) یہ گاؤں اس نواح میں اہل علم کا مرکز اور اصحاب خیر وصلاح کا مسکن تھا۔ اس گاؤں کے لوگ زمیندار اور مالی اعتبار سے آسودہ حال تھے۔ وہ مسلک اہل حدیث سے تعلق رکھتے تھے اور اس سلسلے میں نہایت نازک احساسات کے مالک تھے۔ تقریباً سب کا ایک ہی برادری سے تعلق تھا اور آپس میں گہری رشتے داریاں قائم تھیں۔ آزادیٔ وطن سے بہت عرصہ پہلے سے وہاں ایک دینی تعلیم کا مدرسہ قائم تھا' جس میں متعدد بیرونی طلبا تعلیم حاصل کرتے تھے اور گاؤں کے اہل علم فرائض تدریس انجام دیتے تھے۔ مولانا حافظ عبداللہ مرحوم بھی کافی عرصہ اپنے گاؤں میں منصب تدریس پر متعین رہے۔ مولانا حافظ احمد اللہ کا تعلق اسی گاؤں (بڈھیمال) سے ہے۔ تقسیم برصغیر کے بعد یہاں کے لوگ ضلع فیصل آباد کی تحصیل جڑانوالہ کے ایک گاؤں چک ۳۶ گ ب میں مقیم ہیں اور یہاں کے علما پنجاب کے مختلف مقامات میں درس وتدریس کا فریضہ انجام دے رہے ہیں۔

''مولانا حافظ عبداللہ کی ولادت ۱۹۰۹ء کے لگ بھگ ہوئی۔ ان کے والد گرامی مولانا عبدالکریم درسِ نظامی کے فارغ اور نہایت متدین بزرگ تھے۔ بیٹے نے ابتدائی کتابیں باپ سے پڑھیں۔ قرآن مجید بھی حفظ کیا۔ ایک دن انھوں نے ان سطور کے راقم کو بتایا کہ انھوں نے حفظ قرآن کے بعد مجمع عام میں قرآن مجید کی پہلی مرتبہ تلاوت کوٹ کپورہ (ضلع فریدکوٹ) کی انجمن اصلاح المسلمین کے سالانہ جلسے میں

کی تھی جس کی صدارت حضرت قاضی محمد سلیمان منصور پوری (مصنف رحمۃ للعالمین) فرما رہے تھے۔

''ضلع فیروز پور کے لوگ در حقیقت لکھوی حضرات سے متاثر تھے اور اکثر بزرگوں کا تعلق تلمذ و ارادت لکھوی اہل علم سے تھا۔۔۔لکھوکے (ضلع فیروز پور) اس زمانے میں مرکز درس و تدریس بھی تھا اور مرجع رشد و ہدایت بھی...... حافظ صاحب نے بھی وہیں کا عزم کیا اور مختلف علوم و فنون کی کتابیں استاذ پنجاب حضرت مولانا عطاء اللہ لکھوی مرحوم سے پڑھیں۔

''اس عہد میں گوندلانوالا (ضلع گوجرانوالا) میں حضرت الاستاذ مولانا حافظ محمد گوندلوی رحمۃ اللہ علیہ کا ہنگامہ درس جاری تھا۔ حافظ عبداللہ ان کی خدمت میں گئے اور ان سے مستفید ہوئے۔ منطق اور فلسفہ وغیرہ کی بعض انتہائی کتابیں انہی سے پڑھیں۔

''فارغ التحصیل ہونے کے بعد اپنے گاؤں میں سلسلہ تدریس کا آغاز کیا۔ کئی سال وہاں پڑھاتے رہے۔ کچھ عرصہ ہمارے شہر کوٹ کپورہ میں بھی خدمت تدریس سر انجام دی۔ اس زمانے میں ان سطور کے راقم کی عمر دس گیارہ برس کی ہوگی۔ راقم نے ان سے مصدر فیوض اور خلیفہ عماد الدین کی فارسی کی پہلی کتاب پڑھی اور ان کے شاگردوں کی وسیع فہرست میں شامل ہونے کا اعزاز حاصل کیا۔

''تاندلیانوالا کے قریب ضلع فیصل آباد میں اہل حدیث کا ایک گاؤں جھوک دادو ہے' وہاں ایک بزرگ میاں محمد باقر مرحوم فروکش تھے جنھیں مولانا حافظ عبدالمنان وزیر آبادی کے شاگرد ہونے کا شرف حاصل تھا۔ انھوں نے جھوک دادو میں دینی علوم کا ایک مدرسہ قائم کیا تھا' جو اب بھی قائم ہے۔ تقسیم ملک سے قبل میاں صاحب مرحوم نے حافظ صاحب کو وہاں تشریف لانے کی دعوت دی۔ حافظ صاحب نے ایک عرصے تک وہاں تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا۔ اس اثنا میں بہت سے علما نے ان سے استفادہ کیا۔

''اس کے بعد صوفی عبداللہ مرحوم نے ان کو اوڈاں والا (ضلع فیصل آباد) میں

اپنے مدرسے میں بلا لیا' کچھ عرصہ وہاں اقامت اختیار کیے رکھی اور علوم وفنون کی نشر و اشاعت میں مصروف رہے۔

''آزادیٔ ملک کے بعد اگست ۱۹۴۷ء میں لکھوکے (ضلع فیروز پور) کا دارالعلوم جو ''جامعہ محمدیہ'' کے نام سے موسوم ہے' اوکاڑا میں منتقل ہو گیا تھا' اس کی عنانِ اہتمام مولانا معین الدین لکھوی کے ہاتھ میں تھی اور وہ حافظ صاحب کے طریق تدریس اور علوم وفنون میں ان کی مہارت سے متاثر تھے' چنانچہ انھوں نے ان کو جامعہ محمدیہ (اوکاڑا) کی مسند تدریس پر متمکن ہونے کی دعوت دی اور حافظ صاحب مرحوم کافی عرصہ اس منصب پر فائز رہے۔ اس مدت میں بہت سے تشنگانِ علوم نے ان کی خدمت میں رہ کر اپنی علمی پیاس بجھائی۔

''بعد ازاں حضرت مولانا سید محمد داؤد غزنوی کے ارشاد کے مطابق جماعت اہل حدیث کے مرکزی دارالعلوم جامعہ سلفیہ (فیصل آباد) میں تشریف لے گئے اور کئی سال وہاں مقیم رہے۔ جامعہ سلفیہ میں ان سے بہت سے حضرات مستفید ہوئے۔

''دارالعلوم تعلیم الاسلام ماموں کانجن (ضلع فیصل آباد) میں بھی ان کی تدریسی سرگرمیاں جاری رہیں۔ کچھ عرصہ تاندلیانوالا کو مرکز تدریس قرار دیے رکھا۔ اب چھے سات سال سے تاندلیانوالا کے قریب ایک گاؤں کیمانہ چک ۴۰۵ گ ب شریف والا میں سکونت پذیر تھے اور وہاں ایک دارالعلوم قائم کر کے خدمت تدریس انجام دے رہے تھے۔

''حافظ صاحب مرحوم جماعت اہل حدیث کے نامور عالم اور ممتاز مدرس تھے۔ تفسیر' حدیث' فقہ' اصول حدیث' اصول فقہ' صرف ونحو' منطق وفلسفہ اور عربی ادبیات پر ان کی گہری نظر تھی' نہایت محنت اور دلجمعی سے پڑھاتے تھے اور طلبا ان کے اسلوبِ تدریس اور نہج تعلیم سے بے حد متاثر تھے۔ لب ولہجہ انتہائی میٹھا اور پیارا تھا۔ تدین و تقویٰ میں بھی اونچا مقام رکھتے تھے۔ تلاوتِ قرآن کثرت سے کرتے اور زبان ہر وقت ذکر الٰہی سے تر رہتی تھی۔

''نصف صدی سے زائد عرصے تک اقلیم درس و تدریس پر ان کی حکمرانی رہی۔ جس دارالعلوم میں گئے' ان کے علم و فضل کی بنا پر انھیں شیخ الحدیث کی مسند پر فائز کیا گیا۔ انھوں نے آخری دم تک قال اللہ وقال الرسول کی صدائے دل نواز بلند کیے رکھی اور اپنے منصب عالی کے وقار کو ہمیشہ ملحوظ خاطر رکھا۔ وہ نہایت باحمیت عالم دین تھے۔ انھوں نے اپنی عزت و احترام کے تقاضوں کو کبھی مجروح نہیں ہونے دیا...... ہزاروں شاگرد اپنے پیچھے چھوڑے جو اپنی اپنی جگہ خدمت علم و دین میں مشغول ہیں۔ بلاشبہ وہ استاذ الاساتذہ تھے۔

''وہ خطبہ جمعہ بھی دیتے تھے اور درسِ قرآن کا شغل سامعہ نواز بھی جاری رکھتے تھے' لیکن دھواں دھار تقریر کرنے کے عادی نہ تھے۔ پیار کے لہجے میں میٹھی میٹھی باتیں کرتے تھے جو انتہائی موثر ہوتیں اور قلب و روح کی گہرائیوں میں اترتی جاتی تھیں۔ قبر و قیامت اور جنت و دوزخ کا ذکر بدرجہ غایت پرتاثیر الفاظ میں کرتے۔ قرآن کی آیات پڑھ کر دوزخ سے ڈراتے اور جنت میں جانے کے لیے جن اعمال اور جس کردار کی ضرورت ہے' اس کا تفصیل سے تذکرہ فرماتے۔ ہم عاجز بندوں کو یقین ہے کہ اللہ نے ان کو اپنے رحم و کرم کی بنا پر جنت میں داخل کر دیا ہوگا۔

وہ صاف ستھرا لباس پہنتے اور ہاتھ میں چھڑی رکھتے تھے۔ چال میں تمکنت اور گفتار میں متانت۔ پورا قد' گورا رنگ' تیکھے نقش و نگار' خوب صورت عالم۔ ان کا ظاہر بھی پرکشش تھا اور باطن بھی۔ اسی (۸۰) سال کی عمر کو پہنچنے کے باوجود ان کے چہرے کے آثار اپنے اندر ایک خاص جاذبیت رکھتے تھے اور صحت جسمانی کے اعتبار سے وہ ''بسطة فی العلم والجسم'' کی صحیح تصویر تھے۔ بعض مابعد الطبیعیاتی مسائل کی تعبیر و توجیہ میں وسعت پذیر نقطہ نظر کے مالک تھے۔

''وہ اگرچہ عمر طبعی کو پہنچ گئے تھے' لیکن ان کا شمار ان حضرات میں ہوتا تھا جن کا ہماری ظاہر بین نگاہوں میں یہ عالم آب و گل ہمیشہ محتاج رہتا ہے۔

''بیٹیوں کے علاوہ ان کے تین بیٹے ہیں۔ حافظ محمد شاکر' پروفیسر احمد ساقی اور

حافظ محمود الحسن...... تینوں ماشاء اللہ لائق بیٹے ہیں۔ دعا ہے اللہ تعالیٰ ان کو بلند مرتبت باپ کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔

''ان کے شاگرد ہزاروں کی تعداد میں ہیں جو ملک کے مختلف حصوں میں مشغول خدمت قرآن وحدیث ہیں اور ان کے لیے اجر وثواب کا بہترین ذریعہ......

''ہم عاجز بندے ان کے لیے دعا ہی کر سکتے ہیں۔ اللھم اغفرلہ وارحمہ و عافہ واعف عنہ۔ اللھم اکرم نزلہ ووسع مدخلہ۔ اللھم ادخلہ جنت الفردوس''

یہ اداریہ اس فقیر نے ان کی وفات پر ہفت روزہ ''اہل حدیث'' (لاہور) میں لکھا تھا۔ اس وقت ان کے بڑے صاحب زادے حافظ محمد شاکر زندہ تھے۔

اب مندرجہ ذیل سطور میں ان مقامات کا مختصر الفاظ میں تعارف کرایا جاتا ہے' جہاں حضرت حافظ صاحب نے طلب علم کیا اور جہاں انھیں بحیثیت استاذ کے تدریسی خدمات سرانجام دینے کے مواقع میسر آئے۔ ان مقامات کا ذکر گزشتہ سطور میں ہو چکا ہے' یہاں تھوڑی سی وضاحت ملاحظہ فرمایے۔

۱۔ سب سے پہلے بڈھیمال:- یہ ایک چھوٹی سی بستی تھی جس کے قیام پر حافظ صاحب کی ولادت (۱۹۰۹) تک سو سال کا عرصہ بیت چکا تھا۔ یہ بستی ضلع فیروز پور کی تحصیل مکتسر میں واقع تھی' جسے نیک لوگوں کے مسکن اور اہل علم کے مرکز کی حیثیت سے حاصل تھی۔ ریت کے بڑے بڑے ٹیلوں میں گھری ہوئی یہ بستی اصحابِ تدین کا مرجع تھی۔ تقسیم ملک کے بعد مشرقی پنجاب کی حکومت نے فرید کوٹ کو ضلعی مقام کا درجہ دیا تو تحصیل مکتسر کو ضلع فرید کوٹ میں شامل کر دیا گیا تھا...... پاکستان کے مختلف مدارس میں یہاں کے بہت سے اہل علم مصروف تدریس ہیں جن کا اشارہ اس مضمون کے بعض مقامات میں کیا گیا ہے۔

۲۔ ارائیاں والا:- اس گاؤں میں تین سال حافظ صاحب کے والد مولانا عبدالکریم مقیم رہے۔ حافظ صاحب نے وہاں پانچ سال تعلیم حاصل کی اور دو سال وہاں کی مسند تدریس پر فائز رہے۔ اس طرح وہاں ان کا زمانہ قیام سات سال بنتا ہے۔ یہ گاؤں

ریاست فرید کوٹ میں شہر فرید کوٹ سے تین میل کے فاصلے پر واقع تھا۔ اس میں ارائیں برادری کی اکثریت تھی' اسی لیے یہ ''ارائیاں والا'' کے نام سے موسوم ہوا۔ یہاں کے لوگ اہل حدیث مسلک سے منسلک تھے' جن میں قدیم علوم سے تعلق رکھنے والے بھی تھے اور جدید علوم سے بھی......! بعض حضرات ریاست کے اونچے مناصب پر متمکن رہے۔ پاکستان میں بھی ان کی خدمات علمی کا سلسلہ جاری ہے۔ مولانا ہدایت اللہ ندوی کا تعلق اسی گاؤں سے تھا۔

۳۔ لکھوکے:- یہ چھوٹا سا گاؤں تحصیل اور ضلع فیروز پور میں واقع تھا۔ بہت پرانا گاؤں تھا۔ ۱۹۴۷ سے کم وبیش ڈیڑھ سو سال قبل سے یہ گاؤں رشد و ہدایت کا گہوارہ چلا آرہا تھا۔ اس میں درس وتدریس کے چشمے جاری تھے اور فضل وکمال کے سوتے پھوٹتے تھے۔ بے شمار تشنگان علوم نے یہاں اپنی علمی پیاس بجھائی اور لاتعداد لوگوں نے یہاں کے بزرگوں سے روحانیت کا درس لیا۔ تصنیف وتالیف کے میدان میں بھی وہاں خوب کام ہوا۔ متحدہ پنجاب کے لوگوں کا تو یہ گاؤں علمی اور روحانی مرجع تھا ہی' یوپی' دہلی اور راجستھان وغیرہ کے علما وطلبا نے بھی یہاں کے اصحاب رشد اور باکمال اساتذہ سے حصول فیض کیا۔ اب اس گاؤں کا دارالعلوم ''جامعہ محمدیہ'' کے نام سے اوکاڑہ میں جاری ہے۔ مولانا معین الدین لکھوی انہی بزرگوں کے نیک خصال اخلاف میں سے ہیں۔

حضرت حافظ عبداللہ صاحب نے لکھوکے میں حصول علم کیا اور وہاں کی درس گاہ جامعہ محمدیہ اوکاڑا میں طویل مدت تک سلسلہ تدریس جاری رکھا۔

۴۔ جھوک دادو چک نمبر ۴۲۷ گ ب:- یہ گاؤں ضلع فیصل آباد کی تحصیل سمندری میں منڈی تاندلیانوالا کے قریب واقع ہے۔ یہاں ایک مدرسہ میاں محمد باقر مرحوم نے جاری کیا تھا جو حضرت مولانا حافظ عبدالمنان وزیر آبادی اور لکھوی اساتذہ کے شاگرد اور فیض یافتہ تھے۔ طور برادری سے تعلق رکھتے تھے۔ اپنے علاقے کا یہ مشہور دینی مدرسہ تھا جو اللہ کے فضل سے اب بھی جاری ہے۔ جیسا کہ گزشتہ سطور میں قارئین کرام کے مطالعے میں آیا' حافظ صاحب تقسیم ہند سے قبل یہاں فریضہ تدریس انجام دیتے رہے ہیں۔

۴۔ اوڈاں والا چک نمبر ۴۹۳ گ ب:۔(تحصیل سمندری ضلع فیصل آباد) کا یہ ایک مشہور مقام ہے۔ایک بزرگ صوفی عبداللہ مرحوم نے یہاں ''دارالعلوم تعلیم الاسلام'' کے نام سے مدرسہ جاری کیا تھا' جس کے فارغ التحصیل حضرات کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ صوفی صاحب کی زندگی ہی میں یہ دارالعلوم ماموں کانجن میں منتقل ہو گیا تھا جو بڑی وسیع جگہ میں پھیلا ہوا ہے۔اس کی لائبریری کم و بیش ساٹھ ہزار کتابوں پر مشتمل ہے۔ یہ لائبریری مولانا عبدالقادر ندوی کی کوششوں کا نتیجہ ہے...... اس دارالعلوم کا ایک حصہ حضرت حافظ عبداللہ بڈھیمالوی کے لائق بھانجے حافظ محمد امین کے اہتمام میں اوڈاں والا میں جاری ہے جس کا نام دارالعلوم تقویۃ الاسلام ہے۔ میں نے یہ دارالعلوم دیکھا ہے جو بڑا کامیاب ہے۔اس کی لائبریری بھی بہت اچھی ہے۔ حضرت حافظ صاحب نے اوڈاں والا میں بھی خدمت تدریس انجام دی اور ماموں کانجن میں بھی۔

۵۔ کوٹ کپورہ:۔تکمیل تعلیم کے بعد حافظ صاحب نے سب سے پہلے کوٹ کپورہ میں تدریس کا آغاز کیا تھا۔ یہ شہر آج سے تین سو سال قبل ایک شخص چودھری کپورہ نے آباد کیا تھا۔اس کا نام اپنے نام کی نسبت سے اس نے کوٹ کپورہ رکھا۔ابتدا میں یہ ریاست فرید کوٹ کا دارالحکومت تھا۔۱۹۴۷ء تک اس میں دو بڑے بڑے سرکاری محل موجود تھے اور ایک چھوٹی اینٹ کا پرانا قلعہ تھا۔ساٹھ ہزار سے زیادہ آبادی پر مشتمل اس شہر کے چار بارونق بازار تھے اور بہت بڑی غلہ منڈی تھی۔ ریلوے جنکشن تھا' جہاں بمبئی ایکسپریس اور دوسری ٹرینیں رکتی تھیں جو بمبئی' دہلی' آگرہ' لاہور' راولپنڈی اور پشاور وغیرہ بڑے بڑے شہروں کو جاتی تھیں۔ ایک ٹرین وہاں سے حصار اور جے پور' جودھپور وغیرہ شہروں کو جاتی تھی۔ بہاول نگر اور فاضلکا بنگلہ کو بھی وہاں سے ٹرین جاتی تھی۔

مسلمانوں کی اس شہر میں اکثریت تھی اور وہ مالی اعتبار سے مستحکم حیثیت رکھتے تھے۔ فقہی مسلک کے اعتبار سے سب اہل حدیث تھے' شہر میں بائیس مسجدیں تھیں اور سب اہل حدیث مسلک کے حاملین کی تھیں۔لڑکے اور لڑکیوں کے سرکاری ہائی سکول تھے۔ مسلمانوں کا الگ سکول تھا۔دو بڑے بڑے ہسپتال تھے۔ ہماری پیدائش سے بہت

قبل سے وہاں انجمن اصلاح المسلمین قائم تھی، جس کا ہر سال سالانہ جلسہ ہوتا تھا، جلسوں میں اہل حدیث کے علاوہ حنفی علمائے کرام کو بھی دعوت شرکت دی جاتی تھی اور وہ تقریریں کرتے تھے۔ مجلس احرار کے معروف رہنما مولانا محمد علی جالندھری اور مولانا لال حسین اختر بھی وہاں تشریف لے گئے تھے اور لوگوں نے ان کی تقریریں نہایت شوق اور انہماک سے سنی تھیں۔ مولانا محمد شریف میانوی، سائیں محمد حیات پسروری، اور عبدالکریم وزیر آبادی جو مجلس احرار سے تعلق رکھتے تھے، کئی دفعہ انجمن کے جلسوں میں انجمن کی دعوت پر گئے۔ احرار کے مقرر تقریریں کرتے اور شاعر اپنے انداز میں احرار یانہ لہجے میں نظمیں پڑھتے تھے۔ مسلکی تعصب یا فرقہ پرستی کا کبھی نام سننے میں نہ آیا تھا۔ اس شہر کو ریاست فرید کوٹ کی تحصیل کا درجہ حاصل تھا۔

۶۔ فرید کوٹ:- اس شہر میں حافظ صاحب ہر رمضان المبارک میں نماز تراویح پڑھاتے اور قرآن مجید سنایا کرتے تھے۔ اہل حدیث کی وہاں ایک ہی مسجد تھی۔ دیوبندی حضرات کی کوئی مسجد نہ تھی۔ سب بریلوی حضرات کی مسجدیں تھیں۔ یہ شہر ریاست کا دارالحکومت تھا۔ تقسیم ملک کے زمانے کی ریاست فرید کوٹ کے حکمران کا نام ہراندر سنگھ تھا اور یہ اس ریاست کا آخری حکمران تھا، اس کے دور حکمرانی ہی میں ہندوستان کی کانگرسی حکومت نے ریاستیں ختم کر دی تھیں۔

اس شہر کی وجہ تسمیہ جو ریاست فرید کوٹ کی تاریخ میں مرقوم ہے، یہ ہے کہ ایک مرتبہ بابا حضرت فریدالدین گنج شکر نے پاک پتن سے اس علاقے کا رخ کیا۔ والدہ نے نصیحت کی کہ جو ''گودڑی'' تم نے اپنے جسم پر لپیٹ رکھی ہے، اسے اپنے سے الگ نہ کرنا، اپنے پاس ہی رکھنا۔ بابا صاحب موجودہ شہر فرید کوٹ کے نواح میں آئے تو دیکھا کہ وہ پورا علاقہ بے آباد ہے، وہاں ایک پیلو کا درخت تھا، جسے پنجابی میں ''ماہل'' کہا جاتا ہے۔ اس کے نیچے بیٹھ گئے اور ''گودڑی'' درخت پر لٹکا دی۔ پھر وہاں سے روانہ ہو گئے۔ دو میل آگے گئے تو ایک چودھری قسم کا آدمی چارپائی پر بیٹھا تھا اور مزدور اس کا مکان تعمیر کر رہے تھے۔ اس نے بابا صاحب کو دیکھا تو چودھریوں کے سے لہجے میں آواز دی: ادھر

آؤ۔ اچھے بھلے جوان ہو' کیا کر رہے ہو؟ لوہے کے تسلے کی طرف اشارہ کر کے کہا: یہ کڑاہیا اٹھاؤ اور اس میں گارا بھر بھر کر لاؤ اور یہ گارا دیوار کے اوپر چڑھ کر معمار کو پکڑاؤ۔ بابا جی نے کڑاہیا (یعنی تسلا) اٹھایا اور اس میں گارا ڈالا' مکان تعمیر کرنے والے معمار نے اور اس چودھری نے دیکھا کہ کڑاہیا بابا جی کے سر سے تقریباً دو فٹ اونچا ہے۔ یہ منظر دیکھ کر وہ خوف زدہ ہو گئے اور اٹھ کر کڑاہیا پکڑ لیا اور اس گستاخی کی معافی مانگی۔ انھیں یہ یقین ہو گیا کہ یہ کوئی اللہ کا ولی ہے' اسی لیے کڑاہیا اس کے سر سے اونچا رہتا ہے۔

اس کے بعد وہاں چھوٹا سا گاؤں بن گیا' جس کا نام بابا فریدالدین گنج شکر کے نام کی نسبت سے ''فرید کوٹ'' رکھا گیا...... پھر آہستہ آہستہ یہ اچھا خاص شہر ہو گیا' اور بعد ازاں کوٹ کپورے کے بجائے اسے ریاست کا صدر مقام قرار دیا گیا۔ تقسیم ملک سے کچھ عرصہ بعد اسے ضلع فرید کوٹ بنا دیا گیا۔

اس پیلو کے درخت یعنی ''ماہل'' پر چیتھڑے سے لٹکتے رہتے تھے' ان چیتھڑوں کو ''بابا فرید کی گودڑی'' کہا جاتا تھا۔ فرید کوٹ سے کوٹ کپورے جانے والی سڑک کے وہ درخت قریب ہی دائیں جانب تھا۔ ہر سال وہاں میلہ لگتا تھا' جس میں مسلمانوں کی بہ نسبت ہندو اور سکھ زیادہ تعداد میں شامل ہوتے تھے۔ اس جگہ کو ''بابا فرید دی ماہل'' کہا جاتا تھا۔ سنا ہے اب بھی وہاں ہر سال میلہ لگتا ہے۔

یہاں یہ یاد رہے کہ پاک پٹن کا اصل نام ''اجودھن'' تھا۔ یہ گاؤں دریائے ستلج کے کنارے واقع تھا...... مغل شہنشاہ جلال الدین محمد اکبر نے اس کا نام ''پاک پتن'' رکھا۔ انگریزوں کی بولی اور محکمہ مال کے کاغذات میں اس کی ''ت'' ''ٹ'' سے بدل گئی اور اسے پاک پٹن کہا جانے لگا۔

۷۔ چک نمبر ۴۰۵ گ ب کمیانہ شریف والا:۔ یہ گاؤں ضلع فیصل آباد کی تحصیل سمندری میں منڈی تاندلیانوالا سے تین چار میل کے فاصلے پر واقع ہے' جو وہاں کے ایک پرانے بزرگ محمد شریف کمیانہ کی طرف منسوب ہے' اس لیے ''چک نمبر ۴۰۵ گ ب کمیانہ شریف والا'' کہلاتا ہے۔ حضرت حافظ صاحب (جیسا کہ گزشتہ سطور میں عرض کیا گیا) ۱۹۷۸

کے لگ بھگ حاجی عبدالحق کی درخواست پر وہاں تشریف لے گئے تھے' پھر وہ زندگی کے آخری دم تک وہاں رہے اور وہیں کی مٹی میں دفن ہوئے۔ میں دو دفعہ اس گاؤں میں گیا ہوں۔ ایک مرتبہ حضرت حافظ صاحب کی وفات پر اور دوسری مرتبہ ان کے بڑے صاحب زادے حافظ محمد شاکر کی وفات پر۔ رحمہم اللہ تعالیٰ۔

۸۔ ستیانہ بنگلہ:- یہ مقام ضلع فیصل آباد میں ہے۔ پہلے اُس کی آبادی بہت مختصر تھی' اب یہ اچھے خاصے قصبے کی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔ وہاں جماعت اہل حدیث کا ایک مشہور دارالعلوم ہے جو مرکز الدعوۃ السلفیہ کے نام سے قائم ہے' اس کے بانی و مہتمم مولوی عتیق اللہ ہیں' خاصی تعداد میں وہاں طلبا تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ حضرت حافظ عبداللہ کے شاگرد اور داماد مولانا عبداللہ امجد وہاں کے شیخ الحدیث ہیں' ان کے علاوہ متعدد اساتذہ جن میں حضرت حافظ صاحب مرحوم کے شاگرد اور داماد مولانا عبدالشکور شاہ بھی شامل ہیں' وہاں تدریسی خدمات کی انجام دہی پر مامور ہیں...... حضرت حافظ عبداللہ صاحب پر وہیں دل کا دورہ پڑا تھا' جب کہ وہ طلبا کو دورہ تفسیر کرا رہے تھے۔

گزشتہ اوراق میں ہم نے مہد سے لحد تک حافظ صاحب کے منزل بہ منزل حالات اور ان کی علمی و تدریسی سرگرمیوں کا تذکرہ کرنے کی کوشش کی ہے......

اب آئندہ سطور میں ان کے صاحب زادوں کا تعارف......!

وفات کے وقت حافظ صاحب کے تین صاحب زادے تھے۔ حافظ محمد شاکر' پروفیسر احمد ساقی اور قاری محمود الحسن......!

حافظ محمد ۱۲ ذی الحجہ ۱۳۷۱ھ (ستمبر ۱۹۵۲) کو پیدا ہوئے۔ بڑے ذہین' معاملہ فہم' خوش اخلاق' ہنس مکھ اور خوب صورت تھے الولد سر لابیہ کی پوری تصویر......!

اٹھارہ سال کی عمر میں جامعہ سلفیہ سے سند فراغ لی۔ صحیح بخاری' صحیح مسلم اور حدیث کی دوسری درسی کتابیں والد محترم سے پڑھیں۔ والد کے ساتھ تاندلیانوالا میں فرائض تدریس انجام دیتے رہے۔ بہت اچھے خطیب تھے' اوکاڑے میں ریلوے اسٹیشن کے قریب ایک مسجد میں خطبہ جمعہ دیا کرتے تھے۔ ایک دفعہ مجھے بھی ان کی تقریر سننے اور ان

کی اقتدا میں نماز جمعہ پڑھنے کا موقع ملا تھا۔ اسلوبِ تقریر بڑا موثر تھا اور سامعین دور تک پھیلے ہوئے تھے۔ میں جمعے کے بعد ان سے ملا تو نہایت خوش ہوئے۔

چک نمبر ۴۰۵ کیانہ میں خاص طور سے انھوں نے بہت کام کیا۔ جوانی ہی میں عارضہ قلب لاحق ہوگیا تھا' بہت علاج کرایا' آپریشن تک نوبت پہنچی' مگر زندگی نے وفا نہ کی اور ۹ محرم ۱۴۱۱ھ (یکم اگست ۱۹۹۰) کو صرف اڑتیس سال عمر پا کر عین عالم شباب میں وفات پا گئے اور والد نامدار کے قریب دفن ہوئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

شادی پھوپھی کے گھر (مولانا محمد یعقوب ملہوی) کی صاحب زادی سے ہوئی تھی۔ اپنے پیچھے جوان عمر بیوہ اور چار چھوٹے چھوٹے بچے چھوڑے۔ ان کی وفات پر دس گیارہ سال گزر چکے ہیں۔ بچے ماشاءاللہ اب بڑے ہوگئے ہیں' جن کی تفصیل یہ ہے

۱۔ حافظ عبدالسلام خالد:۔ پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے عربی کر چکے ہیں۔ ایم فل بھی کرلیا ہے۔

۲۔ حافظ عبدالرحمٰن حامد:۔ جامعہ سلفیہ (فیصل آباد) سے فارغ التحصیل ہیں۔

۳۔ حافظ عبدالحنان:۔ حصول علم میں مصروف ہیں۔

۴۔ حافظ عبدالمنان:۔ یہ بھی تحصیل علم میں مشغول ہیں۔

لڑکی کوئی نہیں۔ لڑکے اللہ کے فضل سے چاروں حافظ قرآن ہیں۔

حافظ محمد کی جواں موت پر مرزا غالب سے متعلق ایک واقعہ یاد آیا۔ ان کے ایک عزیز زین العابدین خاں عارف تھے جو بالکل عالم جوانی میں کم سن بچے چھوڑ کر وفات پا گئے تھے۔ مرزا غالب کو عارف سے بہت پیار تھا۔ وہ ان کی موت پر بے حد غم گین ہوئے اور اس سانحے پر نہایت دردناک شعر کہے۔ جی چاہتا ہے' ان میں سے دو چار شعر یہاں درج کر دیے جائیں' اس لیے کہ حافظ محمد کی موت بھی جوانانہ موت تھی اور وہ بھی کم عمر بچے چھوڑ کر فوت ہوئے تھے۔

اے فلک پیر! جواں تھا ابھی عارف
کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور

تم ماہ شب چار دہم تھے مرے گھر کے
پھر کیوں نہ رہا گھر کا وہ نقشا کوئی دن اور
مجھ سے تمھیں نفرت سہی، نیر سے لڑائی
بچوں کا بھی دیکھا نہ تماشا کوئی دن اور
گزری نہ بہرحال یہ مدت خوش و ناخوش
کرنا تھا جواں مرگ گزارا کوئی دن اور

حافظ صاحب کے دوسرے بیٹے پروفیسر احمد ساقی ہیں۔ ان کی تاریخ ولادت ۳ محرم ۱۳۷۴ھ (۶ ستمبر ۱۹۵۴) ہے۔ بڑے طباع، بہت اچھے مقرر، ملنسار، بااخلاق اور ذہین۔ عربی میں ایم اے پاس کیا۔ آج کل گورنمنٹ کالج فیصل آباد میں پروفیسر ہیں۔ ان سے ملاقات کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔

قاری محمود الحسن حضرت حافظ صاحب کے تیسرے بیٹے ہیں، جو ۲۴ رجب ۱۳۷۷ھ (فروری ۱۹۵۸) کو پیدا ہوئے۔ انھوں نے گوجرانوالا میں جماعت اہل حدیث کے مشہور مدرس و عالم مولانا ابوالبرکات احمد مرحوم سے درسی کتابیں پڑھیں۔ اپنے والد مکرم سے صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی تکمیل کی۔ قاری محمد یحییٰ رسول نگری سے قرات و تجوید کا علم حاصل کیا۔ خوش الحان اور خوش آواز قاری ہیں، قرات و تجوید کے متعدد مقابلوں میں حصہ لیا اور اول پوزیشن حاصل کی۔ چک نمبر ۴۰۵ گ ب کمیانہ کے مدرسہ تحفیظ القرآن میں صدر مدرس کی حیثیت سے خدمات انجام دے رہے ہیں۔

آل احمد اور آل محمود کا مجھے علم نہیں۔ دعا ہے اللہ تعالیٰ سب کو خوش و خرم رکھے۔

حضرت حافظ صاحب کی پانچ صاحب زادیاں ہیں جن کی شادیاں علمائے دین اور خوش اطوار و نیک خصال حضرات سے ہوئیں۔

۱۔ بڑی صاحب زادی سید عبدالشکور شاہ صاحب کے عقد میں آئیں۔ شاہ صاحب چانگہ ہل میں فروکش ہیں اور دارالدعوۃ السلفیہ ستیانہ میں فریضہ تدریس انجام دینے پر مامور ہیں۔ نہایت سنجیدہ مزاج، عالی اخلاق اور سلف صالحین کا قابل رشک نمونہ---

انھوں نے کتابوں کی نشر و اشاعت کے سلسلے میں جو خدمات سرانجام دیں' وہ ایک مستقل مضمون کی متقاضی ہیں۔ اللہ تعالیٰ انھیں خوش رکھے۔ اس فقیر سے وہ بے حد مخلصانہ مراسم رکھتے ہیں۔

۲۔ دوسری بیٹی مولانا عبداللہ امجد کے حبالہ عقد میں آئیں۔ مولانا عبداللہ امجد نے حضرت حافظ صاحب سے خوب استفادہ کیا' ان کے یہ بھانجے بھی ہیں۔ عرصہ دراز سے منصب تدریس پر فائز ہیں۔ تجربہ کار اور منجھے ہوئے مدرس ہیں۔ آج کل مرکز الدعوۃ السلفیہ ستیانہ بنگلہ (ضلع فیصل آباد) میں مصروف درس و تدریس ہیں۔

۳۔ تیسری بیٹی کی شادی مولانا عبدالحلیم صاحب سے ہوئی جو طویل مدت سے جامعہ محمدیہ اوکاڑا کی مسند تدریس پر متمکن ہیں' ان کا شمار حضرت حافظ صاحب کے ارشد تلامذہ میں ہوتا ہے۔

۴۔ چوتھی بیٹی کا نکاح لکھوی خاندن کے ایک صالح رکن قاری محمد یوسف سے ہوا تھا۔ وہ باعمل عالم' نیک سرشت اور پیکر صالحیت تھے۔ علوم مروجہ کی تکمیل مولانا محمد عبدہ صاحب سے کی اور فن قرات و تجوید اس موضوع کے ماہر کامل جناب قاری اظہار احمد تھانوی سے سیکھا' قرآن مجید حافظ محمد یحییٰ میر محمدی کی نگرانی میں حفظ کیا۔ عالم جوانی میں ۲۸ نومبر ۱۹۹۲ کو فوت ہوئے اور حضرت حافظ صاحب کے پہلو میں دفن کیے گئے۔ قاری صاحب کے سب بچے اللہ کے فضل سے قابل اور سعادت مند ہیں۔ ان میں سے ایک بیٹے کا نام رانا تنویر قاسم ہے' جو مجھ سے ملتے رہتے ہیں۔ بڑے بیٹے قاری نوید الحسن کا شمار ممتاز قراء میں ہوتا ہے۔ وہ جامعہ سلفیہ میں تدریس کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔

۵۔ پانچویں بیٹی حضرت حافظ صاحب کے بھانجے اور مولانا یعقوب ملہوی کے فرزند عالی قدر مولانا حافظ محمد امین سے بیاہی گئیں۔ یہ حضرت کی سب سے چھوٹی بیٹی ہیں۔

عزیز القدر حافظ محمد امین نے ابتدائی کتابیں اپنے عالی قدر باپ سے پڑھیں' صحیحین کی تکمیل حضرت حافظ محمد گوندلوی سے کی۔ ایم اے عربی کیا اور گولڈ میڈل کے حق دار قرار پائے۔ اوڈاں والا (ضلع فیصل آباد) کی درس گاہ دارالعلوم تقویۃ الاسلام کا

اہتمام وانصرام انہی کے ہاتھ میں ہے اور یہ درس گاہ کامیابی کے ساتھ تعلیمی منزلیں طے کر رہی ہے...... اللہ تعالیٰ سے عاجزانہ دعا ہے کہ وہ ان تمام حضرات کو اپنے سایہ کرم میں رکھے اور ہر معاملے میں ان کا حامی وناصر ہو...... ان حضرات سے درخواست ہے کہ وہ بھی اس حقیر فقیر کو اپنی دعاؤں میں یاد رکھیں۔

حضرت حافظ صاحب پچپن برس مسند تدریس پر رونق افروز رہے۔ اس اثنا میں جو حضرات ان کے حلقہ تلمذ میں شامل رہے' انھیں حیطہ شمار میں لانا ممکن نہیں۔ وہ استاذ الاساتذہ تھے' پھر ان کے بہت سے تلامذہ بھی استاذ الاساتذہ کے شرف سے مشرف ہوئے۔ ان کے متعدد تلامذہ کا ذکر گزشتہ صفحات کے مختلف مقامات میں ہو چکا ہے۔ ان کے علاوہ جو حضرات میرے ذہن میں آئے ہیں' ان میں سے بعض کے اسمائے گرامی ذیل میں درج کیے جاتے ہیں:

۱۔ مولانا ابوالبرکات احمد مدراسی مرحوم...... گوجرانوالا۔
۲۔ مولانا حافظ محمد امین...... ناظم دارالعلوم تقویۃ الاسلام۔ اوڈاں والا۔
۳۔ مولانا عبدالعزیز طور مرحوم...... جھوک دادو۔ تاندلیانوالا۔ ضلع فیصل آباد
۴۔ مولانا عبدالسلام بھٹوی...... مدرس مریدکے' ضلع شیخوپورہ۔
۵۔ علامہ احسان الٰہی ظہیر مرحوم...... مشہور عالم ومقرر۔
۶۔ حافظ عزیز الرحمٰن لکھوی مرحوم...... رینالہ خرد۔ ضلع اوکاڑہ
۷۔ حافظ شفیق الرحمٰن لکھوی...... رینالہ خرد ضلع اوکاڑہ
۸۔ مولانا ارشاد الحق اثری...... ادارہ علوم اثریہ۔ فیصل آباد
۹۔ مولانا محمد حسین طور مرحوم...... جھوک دادو۔ تاندلیانوالہ۔ ضلع فیصل آباد
۱۰۔ مولانا عبدالرشید...... رام گڑھ۔ لاہور
۱۱۔ حافظ عبدالعزیز علوی...... جامعہ سلفیہ۔ فیصل آباد
۱۲۔ مولانا عبدالخالق قدوسی شہید...... مکتبہ قدوسیہ' لاہور۔
۱۳۔ ڈاکٹر مجیب الرحمٰن بنگالی...... راج شاہی یونیورسٹی۔ بنگلہ دیش۔ (اب امریکہ کی

کسی یونیورسٹی میں خدمات تدریس انجام دے رہے ہیں)

۱۴۔ پروفیسر عبدالحکیم سیف......کوٹ رادھا کشن۔ ضلع قصور۔

۱۵۔ مولانا سیف الرحمٰن الفلاح مرحوم......اوکاڑہ۔

۱۶۔ مولانا محمود احمد غضنفر......جامعہ الفیصل' لاہور۔

۱۷۔ میں نے بھی جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا' ان سے چند ابتدائی درسی کتابیں پڑھنا شروع کی تھیں۔ اس لیے مجھے بھی ان کے حلقہ تلامذہ میں شامل ہونے کی سعادت حاصل ہے۔ افسوس ہے میں ان سے زیادہ استفادہ نہ کر سکا۔

میں ان کے تلامذہ کرام سے معذرت چاہتا ہوں کہ نہ مجھے سب کے اسمائے گرامی کا پتا ہے اور نہ یہاں سب کے نام لکھنے کی گنجائش ہے۔

یہاں یہ بھی عرض کر دیں کہ حضرت حافظ صاحب بہت بڑے عالم اور ممتاز مدرس ہونے کے باوجود مصنف نہ تھے' لیکن ان کے شاگردوں کی وسیع فہرست میں وہ لوگ بھی شامل ہیں' جنھوں نے بہت سی کتابیں تصنیف کیں اور مصنف کی حیثیت سے شہرت پائی۔

وہ علوم عربیہ میں مہارت رکھتے تھے اور طلبا کو عربی کی بڑی بڑی کتابیں پڑھاتے تھے' مگر انھوں نے عربی کی کسی کتاب کا ترجمہ نہیں کیا' البتہ ان کے بعض شاگردوں نے ترجمے کیے اور تحقیق و تاریخ کی بعض کتابوں کو اردو میں منتقل کیا۔

وہ پر جوش مقرر اور ہنگامہ خیز خطیب نہ تھے' مگر ان کے بعض شاگردوں نے تقریر و خطابت میں بڑا نام پایا۔

وہ سیاسیات سے کوئی خاص دلچسپی نہ رکھتے تھے' لیکن ان کے شاگردوں کی جماعت کے بعض ارکان نے ملکی سیاسیات میں حصہ لیا۔

یعنی ان کے شاگردوں میں ہر قسم کا علمی کام کرنے والے حضرات شامل ہیں' جو عالی مرتبت استاذ کے لیے صدقہ جاریہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

ان کے بعض شاگرد بہت لائق اور علم و ادب سے گہرا تعلق رکھتے ہیں۔ درس و

تدریس کے حلقوں میں بھی ان کا بڑا نام ہے اور ترجمہ وتصنیف کے میدان میں بھی انھوں نے خوب تگ وتاز کی۔ لیکن ان میں سے کسی کو استاذ محترم کے بارے میں کچھ لکھنے کی توفیق نہ ہوئی --- ان کے سانحہ ارتحال پر بھی اس فقیر نے ان پر تعزیتی اداریہ لکھا تھا، اب بھی اس گنہگار ہی کو اللہ نے ان سے متعلق چند گزارشات پیش کرنے کی توفیق مرحمت فرمائی ہے۔ جنھوں نے سالہا سال ان سے استفادہ کیا، مختلف موضوعات کی کتابیں پڑھیں اور ان کی طرف نسبت شاگردی سے فائدہ اٹھایا اور اٹھا رہے ہیں، وہ سب مل کر بھی تحریری شکل میں رفیع القدر استاذ کو ہدیہ عقیدت پیش نہ کر سکے۔ اس صورت حال کے پیش نظر کہنا چاہیے

کامل اس فرقہ زہاد سے اٹھا نہ کوئی
کچھ ہوئے تو یہی رندانِ قدح خوار ہوئے

مولانا محمد حنیف ندوی

(وفات ۱۲ جولائی ۱۹۷۸ء)

۱۰ مئی ۱۹۰۸ء کو مولانا محمد حنیف ندوی گوجرانوالہ میں پیدا ہوئے۔ سرکاری سکول کی تعلیم صرف پرائمری تک حاصل کی۔ اس کے بعد مولانا محمد اسماعیل سلفی کے حلقہ درس میں شامل ہو گئے جو ۱۹۲۱ء میں گوجرانوالہ میں قیام پذیر ہوئے تھے۔ درس نظامیہ کی کتابیں مولانا محمد اسماعیل صاحب سے پڑھیں۔ اس زمانے میں لکھنؤ کے دارالعلوم ندوۃ العلما کا بڑا شہرہ تھا۔ اونچے درجے کے اساتذہ اور ارباب انتظام کی خدمات اسے حاصل تھیں۔ اس کا نصاب تعلیم جدید و قدیم کا حسین امتزاج تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ملک کے پڑھے لکھے گھرانے نہایت شوق سے اپنے بچوں کو ندوہ میں بھیجتے تھے تاکہ وہ اس سے فارغ ہو کر تدریس و تصنیف کی شکل میں اسلام اور مسلمانوں کی زیادہ سے زیادہ خدمت کر سکیں۔ تعلیم کے ساتھ ساتھ دارالعلوم ندوۃ العلما میں ذہنی و فکری تربیت کا بھی پورا خیال رکھا جاتا تھا اور وہاں کے فارغ التحصیل طلبا کو اسلامی تہذیب و ثقافت کا بہترین نمونہ سمجھا جاتا تھا۔ تحریر و نگارش کی طرف بھی ان کا رخ موڑا جاتا تھا۔ بلکہ ان کا رخ تحریر و نگارش کی طرف ہی رہا' تدریس کی طرف اس کے فارغ التحصیل حضرات نے زیادہ توجہ نہیں کی اور نہ انھیں تدریس کی تربیت ہی دی گئی۔ خطابت و تقریر سے بھی ان حضرات کو زیادہ تعلق نہیں رہا۔ چنانچہ نہ ہمیں کوئی ندوی اونچے درجے کا مدرس نظر آتا ہے نہ کوئی مشہور خطیب۔!

مولانا محمد حنیف ندوی نے ندوہ کے اس دور کے ناظم سید سلیمان ندوی مرحوم کے

نام مولانا اسماعیل سلفی کا سفارشی خط لے کر لکھنؤ کا عزم کیا اور ۱۹۲۵ء میں برصغیر کی اس مثالی درس گاہ میں پہنچ گئے۔ وہاں کے اساتذہ و علما سے انھوں نے خوب استفادہ کیا' وہاں کی ثقافت سیکھی اور طرز بود و باش سے متاثر ہوئے۔ اس وقت لکھنؤ کی زبان کو اپنی بعض خصوصیات کی بنا پر پورے برصغیر میں امتیازی حیثیت حاصل تھی۔ مولانا نے اس کے تیوروں کو سمجھا اور اس کی لوچ اور نزاکت کے تمام پہلوؤں کو اپنے اندر جذب کیا۔ کلام و بیان میں' تحریر و تسوید میں' تقریر و خطابت میں' لہجہ و اسلوب میں بالکل وہی رنگ غالب آ گیا جو لکھنؤ کے اصحاب علم اور اہل زبان کے ساتھ مختص تھا۔

لیکن تقسیم ملک کے بعد نہ وہ لکھنوی زبان رہی ہے' نہ تہذیب و ثقافت کا وہ انداز رہا ہے' نہ لہجہ و اسلوب کی خاص نزاکتیں باقی رہی ہیں۔ اب پنجاب کے سکھ بھی وہاں جا بسے ہیں اور ہندو بھی۔! ان کا اپنا ایک لہجہ اور اپنا اسلوب زیست ہے' جس نے وہاں کی تہذیبی اور لسانی صورت حال کو بہت متاثر کیا ہے۔

پانچ سال کے قریب مولانا وہاں رہے۔ ۱۹۳۰ء میں واپس آئے' اس وقت وہ بائیس برس کے جوان رعنا تھے اور پنجابی کے بجائے خالص لکھنوی معلوم ہوتے تھے۔ وہی زبان' وہی لباس۔ شلوار کی جگہ پاجامے نے' پگڑی کی جگہ ٹوپی نے اور کوٹ کی جگہ شیروانی نے لے لی تھی۔ نہ بول چال میں پنجابیت کی کوئی جھلک باقی رہی تھی' نہ لباس اور تہذیب و ثقافت میں۔!

ایک دن خود ہی بتایا کہ جب وہ لکھنؤ پہنچے تو کلے پر سفید ململ کی طرے دار پگڑی باندھے ہوئے اور لٹھے کی شلوار پہنے ہوئے تھے۔ وہاں کا ماحول اور نہج زیست بالکل مختلف تھا اور لڑکے انھیں دیکھ کر ہنستے تھے۔ کچھ عرصہ بعد پہلے دن پاجامہ اور ٹوپی پہن کر استاد کے حلقہ درس میں بیٹھے تو استاد نے مسکراتے ہوئے کہا: اب تم یہاں کی ثقافت سے آشنا ہو گئے ہو۔

مولانا نے لکھنؤ کی گھریلو زبان بھی سیکھی اور مستورات روزمرہ کی گفتگو میں جس انداز سے ایک دوسری سے مخاطب ہوتی ہیں اور جس لہجے سے ایک خاتون دوسری

خاتون کو پکارتی ہے' اس سے بھی آشنا ہوئے۔ وہ اس سلسلے کے تمام اسالیب تخاطب سے آگاہ تھے۔ بعض دفعہ شاہ محمد جعفر پھلواروی اور رئیس احمد جعفری سے اثنائے گفتگو میں اس موضوع پر ان کی دلچسپ باتیں ہوتی تھیں۔ شاہ صاحب اصلاً صوبہ بہار کے رہنے والے تھے اور رئیس احمد جعفری یوپی کے' لیکن دونوں مولانا کی زبان' لہجے اور اسلوب کلام کو مستند قرار دیتے تھے۔

دارالعلوم ندوۃ العلما میں جو حضرات ان کے ہم جماعت یا ہم مکتب تھے' ان کی فہرست بڑی وسیع ہے۔ وہ سب نہایت ہونہار اور ذہین طالب علم تھے' جنھوں نے فارغ التحصیل ہو کر علم و ادب اور تصنیف و تالیف کے میدان میں بڑی شہرت پائی۔ ان میں عبدالسلام قدوائی' نور اللہ مونگیری' عبدالمجیب سہالوی' محب اللہ لاری' ابراہیم عمادی' محمد جعفر پھلواروی' منت اللہ رحمانی' نجم الدین قدوائی' حامد لکھنوی' مسعود عالم ندوی' ابوالحسن علی ندوی' رئیس احمد جعفری' محمد اکبر بلاسپوری' محمد ناظم بہاری' عبدالمجید اعظمی اور نیاز احمد بندولی خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ سید ابوالحسن علی ندوی اور مسعود عالم ندوی' مولانا حنیف ندوی سے جونیئر تھے' لیکن انھوں نے علمی دنیا میں بڑا نام پایا۔

مولانا مسعود عالم ندوی ۱۹۵۰ء میں گوجرانوالہ میں رہتے تھے۔ وہاں انھوں نے ''دارالعروبہ'' کے نام سے عربی پڑھانے کا ایک ادارہ قائم کر رکھا تھا۔ مولانا حنیف ندوی ان دنوں ہفت روزہ ''الاعتصام'' کے ایڈیٹر تھے' جو گوجرانوالہ سے شائع ہوتا تھا۔ میں بھی وہیں تھا اور مولانا حنیف ندوی کے ساتھ ''الاعتصام'' میں معاون ایڈیٹر کی حیثیت سے خدمات سرانجام دیتا تھا۔ مولانا مسعود عالم ندوی کا دفتر الاعتصام میں آنا جانا تھا' میں اور مولانا حنیف ندوی بھی ان کے ہاں جاتے تھے۔ میں نے مولانا مسعود عالم ندوی کو دیکھا کہ وہ مولانا حنیف ندوی کا بے حد احترام کرتے تھے اور ان سے ملاقات کے متمنی رہتے تھے' بہت سی باتیں ان سے پوچھا کرتے تھے۔ یہی حال لاہور میں رئیس احمد جعفری اور شاہ محمد جعفر پھلواروی کا تھا۔

شاہ محمد جعفر پھلواروی ان سے عمر میں چھ سات سال بڑے تھے اور جس سال یہ

ندوے میں داخل ہوئے ہیں' اسی سال انھوں نے سند فراغ حاصل کی تھی' لیکن اس کے باوجود وہ ان سے نہایت تکریم کا برتاؤ کرتے تھے۔

لاہور میں' ایک پرانے ندوی حکیم رشید احمد بلیاوی تھے جو بہت اچھے طبیب تھے اور سمن آباد کے چوک میں ان کا مطلب تھا' مولانا اکثر ان کے ہاں تشریف لے جاتے تھے' کبھی علاج معالجے کے لیے اور کبھی محض ملاقات کی غرض سے' حکیم صاحب ان سے انتہائی عزت کے ساتھ پیش آتے تھے۔ مولانا کے جنازے میں بھی شریک تھے۔ یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ حکیم رشید احمد ندوی اور مولانا حنیف ندوی ندوہ میں اکٹھے رہے تھے یا بعد میں مراسم پیدا ہوئے۔ ایک ندوی اب بھی لاہور میں موجود ہیں ان کا نام ہے عبیدالحق ندوی۔ لیک روڈ لاہور میں مدرسۃ البنات' ان کا مشہور مدرسہ ہے۔

جن حضرات نے دارالعلوم ندوۃ العلما میں تعلیم حاصل کی' ان میں سے میرے خیال میں اب پاکستان میں صرف چار حضرات موجود ہیں۔ مولانا عبدالقادر ندوی ماموں کانجن (ضلع فیصل آباد) میں' مولانا ہدایت اللہ ندوی میاں چنوں (ضلع خانیوال) میں' عبیدالحق ندوی لاہور میں اور مولانا وصی مظہر ندوی حیدر آباد میں۔ وصی مظہر ندوی کی دلچسپیوں کا محور ملکی سیاست ہے۔ وہ دو تین مرتبہ ادارہ ثقافت اسلامیہ میں تشریف لائے تو مجھے ان سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ یہ معلوم نہیں کہ مولانا حنیف ندوی سے ان کے مراسم تھے یا نہیں تھے' البتہ مولانا عبدالقادر ندوی اور مولانا ہدایت اللہ ندوی مولانا سے عقیدت مندانہ تعلقات رکھتے تھے اور مستفیدانہ انداز میں ان سے بات کرتے تھے۔ اب بھی ان کا ذکر انتہائی احترام سے کرتے ہیں۔ لاہور میں عبیدالحق ندوی جو مکتبہ علمیہ کے مالک اور مدرسۃ البنات کے ناظم ہیں، مولانا سے بے حد محبت سے پیش آتے تھے۔

مولانا حنیف ندوی ندوہ سے فارغ ہونے کے بعد ۱۹۳۰ء میں وطن واپس لوٹے تو لاہور کی مسجد مبارک میں جو اسلامیہ کالج (ریلوے روڈ) سے متصل ہے' درس قرآن اور خطابت کے فرائض سرانجام دینے لگے۔ اس سے پہلے لاہور میں درس قرآن کے دو حلقے

قائم تھے' ایک مولانا احمد علی صاحب کا شیرانوالہ گیٹ کی مسجد میں اور دوسرا بادشاہی مسجد کے سابق خطیب مولانا غلام مرشد کا سنہری مسجد رنگ محل میں۔! اب تیسرا حلقہ درس مسجد مبارک میں مولانا حنیف ندوی کا قائم ہوا۔ یہ حلقہ اس اعتبار سے پہلے دونوں حلقوں سے منفرد تھا کہ اس میں قدیم اسلوب درس کے علاوہ جدید انداز بھی کارفرما تھا اور علوم وفنون نے جو پھیلاؤ اختیار کر لیا ہے' اس کا تذکرہ نہایت موثر اور اچھوتے انداز میں ہوتا تھا۔ نیز قرآن کے جن جن پہلوؤں کو مستشرقین نشانۂ اعتراض بناتے ہیں' اس کی وضاحت کی جاتی تھی اور معترضین کا نئے اسلوب کلام میں جواب دیا جاتا تھا۔

مولانا کے درس اور خطبۂ جمعہ میں اسلامیہ کالج کے پروفیسر اور طالب علم بھی آتے تھے' اور اس دور کے ادیب اور مختلف اخباروں سے تعلق رکھنے والے حضرات بھی شریک ہوتے تھے' اس لیے کہ مولانا ان کے ذہن وفکر کے پیمانوں کا خاص طور سے خیال رکھتے تھے اور اس ڈھنگ سے بات کرتے تھے کہ نئے ذہن اس سے متاثر ہوں اور ان کے دلوں میں قرآن سے فکری لگاؤ اور محبت کا جذبہ کروٹ لے۔ پھر مولانا کی زبان نہایت عمدہ تھی۔ سب علمائے کرام سے مختلف' علوم وادب کا دلکش مرقع۔!

یہاں چلتے چلتے یہ بھی عرض کر دیں کہ اس دور کے پنجاب میں (بلکہ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے پورے برصغیر میں) دو عالم ایسے تھے جو ہر سال شعبان' رمضان اور شوال میں تین مہینے پورے قرآن کا درس دیتے اور اس کی تفسیر بیان کرتے تھے' وہ تھے سیالکوٹ میں مولانا محمد ابراہیم میر سیالکوٹی اور لاہور میں مولانا احمد علی صاحب---! اس تین مہینے کے دورۂ تفسیر قرآن میں دور ونزدیک کے علاقوں کے فارغ التحصیل حضرات شرکت کرتے تھے۔ اپنی اپنی جگہ ان دونوں بزرگوں کے یہ حلقے بڑے مضبوط تھے اور ان میں قرآن کے ان اہم نکات کی وضاحت کی جاتی تھی' جن کا تعلق' لغت' نحو صرف' معانی' فصاحت وبلاغت اور مطالب کی بوقلمونی اور رنگارنگی سے ہے۔ اس قسم کے مقامات کو طالب علم باقاعدہ ضبط تحریر میں لاتے تھے۔

دارالعلوم ندوۃ العلما کے اساتذہ میں ایک استاذ مولانا عبدالرحمٰن نگرامی ندوی تھے

جو جید عالم، بہت بڑے فاضل، عربی کے ممتاز ادیب، منجھے ہوئے مدرس اور بہترین مقرر تھے۔ مولانا شبلی کے فیضان اور مولانا ابوالکلام آزاد کی تربیت کی بنا پر وہ تدریس و خطابت کی ایسی جامعیت سے بہرہ ور تھے کہ جو مشکل ہی سے کسی اور کے حصے میں آتی ہے۔ مولانا حنیف ندوی ان سے بہت متاثر تھے، وہ کہا کرتے تھے کہ ان کی وجہ سے طلبا کی علمی اور ذہنی سطح بہت بلند ہوئی --- افسوس ہے مولانا نگرامی صرف ستائیس برس کی عمر میں عین عالم جوانی میں ٦ مارچ ١٩٢٦ء کو وفات پا گئے۔

مولانا حنیف ندوی نے ایک مرتبہ بتایا کہ مولانا عبدالرحمٰن نگرامی کو قرآن مجید سے بے حد شغف تھا۔ ندوہ میں اس وقت قرآن مجید کا سادہ ترجمہ نہیں پڑھایا جاتا تھا، مولانا نگرامی نے اپنے طور پر طلبا کو ترجمہ پڑھانا شروع کیا تو بعض اساتذہ نے اس پر اعتراض کیا اور کہا: میاں سادہ ترجمہ تو لڑکیاں پڑھتی ہیں، یہ تو اچھے خاصے تعلیم یافتہ لوگ ہیں، انھیں عربی کی تفسیریں پڑھانا چاہئیں --- لیکن مولانا نگرامی نے یہ سلسلہ جاری رکھا۔

انھوں نے بتایا کہ مولانا نگرامی سلجھے ہوئے اور صاف بیان مقرر تھے، نرم لہجے میں تقریر کا آغاز کرتے تھے، جیسے جیسے آگے بڑھتے جاتے آواز بلند ہوتی جاتی اور پھر مجمعے پر چھا جاتے۔ تقریر اتنی موثر ہوتی کہ مخالف ہو یا موافق کوئی شخص ان کی تقریر سے اٹھنے کا نام نہ لیتا۔

سعودی حکومت نے حجاز میں برسر اقتدار آنے کے بعد انہدام قبہ کا جو سلسلہ شروع کیا تھا، اس میں ہندوستان کے بعض اہل علم اس کے مخالف تھے اور بعض حامی ---! مولانا عبدالرحمٰن نگرامی حامیوں کی فہرست میں شامل تھے اور مولانا عبدالباری فرنگی محلی کا اسم گرامی مخالفین کے زمرے میں آتا تھا۔ مولانا حنیف ندوی نے بتایا کہ ایک مرتبہ مولانا عبدالباری کے زیر صدارت لکھنؤ کے ایک چوک میں جلسہ ہوا، مقررین میں مولانا عبدالرحمٰن نگرامی بھی شامل تھے۔ ان کی تقریر میں انہدام قبہ کا ذکر آیا تو اس ضمن میں سعودی حکومت کی تائید کرنا شروع کر دی۔ مولانا عبدالباری بہت بڑے عالم تھے اور ہر حلقے میں عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے، وہ غصے میں آ گئے۔ بولے:

عبدالرحمٰن! میں تمھارا سر پھوڑ دوں گا۔

فاضل مقرر نے دوران تقریر میں سر جھکا کر جواب دیا: حضور۔! کاسۂ سر حاضر ہے لیکن بات وہی صحیح ہے جو یہ خاکسار عرض کر رہا ہے۔

مولانا عبدالباری نے فرمایا: اچھا تقریر جاری رکھو۔

اللہ اللہ! کس قدر بلند اخلاق اور اونچے ذہن کے حامل تھے یہ لوگ۔ اپنی بات بھی کہہ رہے ہیں اور اپنے سے اختلاف کرنے والے کی عزت و تکریم کے تقاضے بھی بطریق احسن پورے کیے جا رہے ہیں۔

مولانا عبدالرحمٰن نگرامی کا ذکر چھڑا ہے تو ایک اور واقعہ سنتے جائیے جو بہت سال ہوئے مولانا حنیف ندوی نے بیان کیا تھا اور اس سے کچھ عرصہ بعد مولانا عبدالماجد دریا بادی کی کتاب ''معاصرین'' میں بھی پڑھنے کا اتفاق ہوا --- مولانا نگرامی جیسا کہ عرض کیا گیا' بہت بڑے عالم اور نہایت صاف ستھرے ذہن کے آدمی تھے۔ وہ فوت ہوئے تو مولانا عبدالماجد دریا بادی نے سمجھا' ان کی بیوی بھی ایسی ہی لائق فائق اور خوب رو ہو گی۔ چنانچہ انھوں نے اس سے شادی کر لی۔ لیکن جب اسے دیکھا تو معلوم ہوا کہ اسے اپنے مرحوم شوہر سے کسی اعتبار سے کوئی نسبت ہی نہیں ہے۔ نہ رنگ روپ میں' نہ علم میں' نہ قابلیت میں' نہ سلیقہ شعاری میں --- بے چارے عبدالماجد دریا بادی غلط فہمی یا خوش فہمی میں مارے گئے تھے۔ پھر جلد ہی اسے طلاق دے دی تھی --- مگر اندازہ کیجیے مولانا عبدالرحمٰن جیسا ہمہ اوصاف موصوف شخص اس سے کس طرح گزارا کر رہا تھا۔ یہ ان کی بلندیٔ اخلاق اور علو کردار کی ایک بہت بڑی دلیل تھی۔ لیکن مولانا عبدالماجد دریا بادی کے متعلق میں کچھ نہیں کہنا چاہتا۔

ندوہ کے اساتذہ کا مولانا حنیف ندوی بڑی تعظیم سے نام لیتے تھے اور ان کی بعض باتیں مزے لے لے کر سنایا کرتے تھے۔ ایک دن ایک محترم استاذ کے بارے میں بتایا کہ ان کا تکیہ کلام ''جو ہے سو تو'' تھا۔ کسی سے کسی موضوع پر بات ہو رہی ہو' وہ عام طور سے دورانِ گفتگو میں کہتے ''اچھا جو ہے سو تو یہ بات ہے۔'' کوئی طالب علم ان کے درس

سے غیر حاضر ہوتا تو دوسرے دن پوچھتے ''جو ہے سو تو' کل تم کہاں تھے۔''

ندوہ کے ایک استاذ مولانا حفیظ اللہ تھے جو بہت بڑے محدث وفقیہ بھی تھے اور ماہر منطق وفلسفہ بھی۔ وہ مولانا شبلی نعمانی کے معاصر تھے اور مولانا شبلی سے ان کی خوب بحثیں رہتی تھیں۔ وہ علم کے مختلف گوشوں میں مولانا شبلی کو کوئی خاص اہمیت نہیں دیتے تھے۔ عام طور سے گفتگو میں وہ منطق کی اصطلاحیں استعمال کرتے تھے۔ بہت اچھے پیراک بھی تھے۔ دریائے گومتی میں اکثر پیراکی کا مظاہرہ کرتے۔ بڑے بڑے تیز پیراک ان کا مقابلہ نہ کر پاتے۔ مولانا حنیف ندوی نے بعض پرانے اساتذہ کے حوالے سے بتایا کہ ایک دن مولانا شبلی نے ان سے کہا: ہمیں پیراکی نہ آئی۔

بولے: یہ تو جزئیہ سالبہ ہوا کہ آپ کو پیراکی نہ آئی' جزئیہ موجبہ بولیے اور بتائیے آپ کو آتا کیا ہے؟ مولانا حفیظ اللہ مسلک کے اعتبار سے اہل حدیث تھے۔ ۱۸۵۶ء میں ضلع اعظم گڑھ کے ایک گاؤں بندی میں پیدا ہوئے اور ۷ ذی الحجہ ۱۳۶۲ھ (دسمبر ۱۹۴۳) کو وفات پائی۔

مولانا نے بتایا کہ ایک مرتبہ لکھنؤ کے ایک سینما میں کوئی تاریخی نوعیت کی فلم دکھائی جا رہی تھی۔ ندوہ کے چند طالب علم ایک دن وہ فلم دیکھنے چلے گئے۔ میں بھی ان کے ساتھ تھا۔ عشا کے بعد ایک استاذ کو اس کا شبہ ہوا' وہ ہوسٹل میں گئے' چند کمرے دیکھے اور طلبا کو نہ پا کر انھیں یقین ہو گیا کہ سینما دیکھنے گئے ہیں۔ دوسرے دن ان کی کلاس میں حاضر ہوئے تو پوچھا: رات تم لوگ کہاں تھے؟ سچ بتاؤ سینما دیکھنے گئے تھے؟

سب کا ایک ہی جواب تھا ''جی ہاں گئے تھے۔''

اب استاذ مجھ سے مخاطب ہوئے ''اے وہابی تم بھی گئے تھے۔؟''

میں نے کہا: جناب! وہ فلم کہاں تھی' وہ تو ایک تاریخی واقعہ بیان کیا گیا تھا جو ہم نے سنا اور دیکھا۔

فرمایا: یہ بات تھی تو پھر ٹھیک ہے۔

مولانا نے بتایا کہ ندوہ کے ناظم سید عبدالعلی حسنی ایلوپیتھی ڈاکٹر بھی تھے' یونانی

طبیب بھی تھے اور ہومیو پیتھی معالج بھی---! کوئی طالب علم بیمار ہوتا تو ان کے مطب میں جاتا' وہ نہایت شفقت اور توجہ سے بیمار کو دیکھتے۔ اگر ان کے پاس کوئی دوا ہوتی تو دے دیتے' نہ ہوتی تو پوچھتے' کون سی دوا کھاؤ گے' یونانی' ایلوپیتھی یا ہومیوپیتھی؟ دو پیسے یا آنے کی دوا لکھ کر دیتے اور اس کے استعمال سے افاقہ ہو جاتا' بعض اوقات دوا ان کے پاس نہ ہوتی تو پیسے دے دیتے کہ فلاں دکان سے لا کر استعمال کرلو۔

مولانا حنیف ندوی ندوہ سے فارغ ہو کر ۱۹۳۰ء میں لاہور آئے اور پھر خوب خدمات علمی سرانجام دیں۔ اس زمانے میں نوجوان بھارت سبھا نوجوانوں کی ایک سیاسی جماعت تھی' جو آزادئ ملک کے لیے کوشاں تھی۔ مولانا اس میں شامل ہو گئے۔ اپنے شہر اور ضلع گوجرانوالہ میں انگریزی حکومت کے خلاف تقریریں کیں اور گرفتار کر لیے گئے۔ چھے مہینے کی قید ہوئی' قید کی یہ مدت قصور جیل میں پوری کی۔

وہ نہایت شگفتہ مزاج عالم دین تھے۔ میں نے پہلی دفعہ ان کو ۱۹۳۹ء میں مسجد مبارک میں دیکھا تھا۔ سردیوں کا موسم تھا کہ میں مولانا عطاء اللہ حنیف کے ساتھ لاہور آیا۔ میری عمر اس وقت تیرہ سال کی تھی۔ ہم نے مغرب کی نماز مسجد مبارک میں پڑھی۔ امامت کسی اور شخص نے کرائی تھی' لیکن درس قرآن مولانا حنیف ندوی نے دیا۔ خشخشی داڑھی' گورا رنگ' قدرے چھوٹا قد' صاف ستھرا لباس' آدھ پون گھنٹے کے قریب انھوں نے درس قرآن دیا ہوگا۔ لوگ نہایت توجہ اور انہماک سے ان کی باتیں سن رہے تھے۔ درس کے بعد مولانا عطاء اللہ صاحب ان سے ملے' میں نے بھی سلام عرض کیا۔ وہ ہمیں اسلامیہ کالج کے مین گیٹ کے باہر ریلوے روڈ پر عرب ہوٹل میں لے گئے جو اس زمانے میں لاہور کے ادیبوں' شاعروں اور اخبار نویسوں کا مرکز تھا' وہاں انھوں نے ہمیں چائے پلائی۔ آزادی کے بعد بھی کچھ عرصہ عرب ہوٹل کی رونق قائم رہی۔ پھر آہستہ آہستہ بالکل ختم ہو گئی اور ہوٹل بھی ختم ہو گیا۔ البتہ وہ عمارت موجود ہے لیکن اس کے بڑے دروازے پر تالا لگا ہوا ہے۔

مولانا حنیف ندوی کی شخصیت میں بڑی جاذبیت تھی اور اسلوب کلام نہایت مؤثر

تھا۔ ۱۹۴۸ء سے لے کر ان کی وفات جولائی ۱۹۸۷ء تک تقریباً چالیس برس میرا ان سے تعلق رہا۔ تعلق کیا بے پناہ مراسم رہے۔ نہ میری کوئی بات ان سے مخفی تھی اور نہ میں ان کے کسی معاملے سے بے خبر تھا۔ اس ضمن کی تفصیلات میں نے "ارمغانِ حنیف" میں بیان کی ہیں' جو ان کے حالات میں ایک مستقل کتاب ہے۔ یہ کتاب ادارہ ثقافت اسلامیہ کی طرف سے ۱۹۸۹ء میں شائع ہوئی تھی۔

ارمغان حنیف دراصل مختلف حضرات کے ان مضامین کا مجموعہ ہے جو انھوں نے مولانا کی زندگی' ان کے علمی مرتبے' تصنیفی خدمات اور اسلوبِ نگارش کے بارے میں تحریر کیے ہیں۔ یہ مضامین مولانا کی زندگی میں مرتب بھی ہو گئے تھے اور ان کی کتابت بھی ہو چکی تھی۔ مولانا کے ملاحظہ گرامی میں بھی آ گئے تھے' خیال یہ تھا کہ انھیں "ارمغان حنیف" کے نام سے کتابی صورت میں شائع کیا جائے گا اور پھر ان کے اعزاز میں ایک تقریب منعقد کر کے یہ کتاب ان کی خدمت میں پیش کی جائے گی۔ مگر افسوس ہے' ایسا نہ ہو سکا۔ ان کی وفات کے ڈیڑھ سال بعد اس کی اشاعت ہوئی۔

یہ مضامین چوں کہ ان کی زندگی ہی میں کتابت کے مراحل سے گزر گئے تھے' اس لیے ان سب میں مولانا زندہ ہیں' صرف دو مضمون ایسے ہیں جو ان کی وفات کے بعد لکھے گئے' ایک ادارہ ثقافت اسلامیہ کے ڈائریکٹر جناب سراج منیر صاحب کا ابتدائیہ اور دوسرا اس راقم عاجز کا مضمون "مولانا محمد حنیف ندوی کا سفرِ آخرت۔"

ارمغان حنیف میں مندرجہ ذیل اہل قلم کے مضامین شامل ہیں۔

۱۔ ابتدائیہ: مولانا حنیف ندوی سے متعلق ادارہ ثقافت اسلامیہ کے ڈائریکٹر جناب سراج منیر کی جامع و مانع تحریر۔

۲۔ مولانا محمد حنیف ندوی خود اپنی زبانی: یہ اپنے بارے میں ان کا اپنا ایک مختصر سا مضمون ہے' جو نہایت دلچسپ ہے۔

۳۔ مولانا محمد حنیف ندوی کا اسلوبِ نگارش: یہ ملک کے مشہور و ممتاز ادیب اور اہل قلم جناب میرزا ادیب کا مضمون ہے' جو اگرچہ مختصر ہے تاہم اپنی نوعیت کا بہترین مضمون ہے۔

۴۔ تفسیر سراج البیان: مولانا حنیف ندوی کی تفسیر سراج البیان کے بارے میں مولانا سعید الرحمٰن علوی کا یہ معلومات افزا مقالہ ہے۔

۵۔ دین حنیف اور مولانا محمد حنیف ندوی: پروفیسر ڈاکٹر تحسین فراقی نے اس مضمون میں مولانا کی بعض تصانیف کی روشنی میں ان کے افکار و تصورات کے بعض گوشوں کا علمی انداز میں تجزیہ کیا ہے۔ مضمون لائق مطالعہ ہے۔

۶۔ مولانا محمد حنیف ندوی بحیثیت ریڈیو مقرر: عبدالحی قریشی (ریڈیو پاکستان اسلام آباد) کا یہ مختصر سا مضمون ہے، جس میں بتایا گیا ہے کہ ریڈیو کے مولانا نہایت کامیاب مقرر تھے۔

۷۔ مولانا محمد حنیف ندوی کی خدمات ادارہ ثقافت اسلامیہ کے لیے: اس میں راقم الحروف نے مولانا کی ان پندرہ کتابوں کا تعارف کرایا ہے جو انھوں نے ادارہ ثقافت اسلامیہ کے لیے لکھیں۔

۸۔ مولانا محمد حنیف ندوی کی خدمات گوناگوں: اس مضمون میں راقم نے مولانا کی ان علمی و تصنیفی خدمات کا تذکرہ کیا ہے جو انھوں نے ادارہ ثقافت اسلامیہ کے علاوہ دیگر اداروں میں سرانجام دیں۔

۹۔ مولانا محمد حنیف ندوی لطائف و ظرائف کے آئینے میں: راقم کا یہ مضمون جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہے، مولانا کے لطیفوں اور ان کی شگفتگی و خوش مزاجی سے متعلق ہے۔

۱۰۔ مولانا محمد حنیف ندوی کا سفر آخرت: یہ حزنیہ مضمون راقم نے مولانا کی وفات پر لکھا تھا۔

کوئی جلسہ ہوتا میٹنگ ہوتی، کوئی مشاعرہ ہوتا، کہیں جانا ہوتا تو عام طور سے ہم اکٹھے جاتے تھے۔

۱۹۵۴ء کی بات ہے کہ لاہور میں پاکستان اور ہندوستان کے درمیان کرکٹ میچ ہوا۔ وہ سردیوں کا موسم تھا۔ پاکستان کی طرف سے ہندوستان میں راجا غضنفر علی خاں، ہائی کمشنر کے عہدے پر متمکن تھے۔ انھوں نے کرکٹ میچ دیکھنے کے لیے پاکستان آنے

والوں کو نہایت کھلے دل سے ویزے دیے۔ سکھ خاص طور سے پاکستان آئے تھے۔ کہا جاتا تھا کہ ان کی تعداد پچاس ہزار سے زائد تھی۔ لاہور میں جدھر دیکھو سکھ ہی سکھ نظر آتے تھے۔ وہ پہلی دفعہ پاکستان آئے تھے' جن میں اخبار نویس' ادیب اور شاعر اچھی خاصی تعداد میں تھے۔ راجا غضنفر علی کا شمار مسلم لیگ کے پرانے رہنماؤں میں ہوتا تھا' انھوں نے اپنے دورِ ہائی کمشنری میں دونوں ملکوں کو ایک دوسرے سے قریب کرنے کے لیے بڑی جدوجہد کی اور اس میں بہت حد تک کامیاب بھی ہوئے۔ وہ تقسیم ملک سے قبل کی تمام سیاسی جماعتوں کے رہنماؤں سے تعلق رکھتے تھے۔ ۱۷-اپریل ۱۹۶۳ء کو فوت ہوئے۔

۱۹۵۴ میں کرکٹ میچ کے موقعے پر راجا صاحب خود بھی لاہور آئے تھے۔ ان کی کوشش سے گول باغ میں (جسے صدر ایوب کے زمانے سے مصر کے صدر جمال عبدالناصر کے نام سے ''ناصر باغ'' کہا جانے لگا ہے) پنجابی مشاعرے کا اہتمام کیا گیا تھا۔ بہت بڑا مجمع تھا۔ مشاعرے کی صدارت راجا غضنفر علی خاں نے کی تھی' جس میں بہت سے پاکستانی اور ہندوستانی شعرا نے اپنا کلام سنایا تھا اور بڑی داد پائی تھی۔

ایک شاعر نے جو نظم پڑھی' اس کا مطلب یہ تھا کہ متحدہ ہندوستان میں مسلمانوں اور غیر مسلمانوں میں انگریزی حکومت نے اختلاف پیدا کیا تاکہ یہ آپس میں لڑتے جھگڑتے رہیں اور ہم اطمینان سے ان پر حکومت کرتے رہیں۔ چنانچہ انگریزوں کی انگیخت سے ملک میں مسلم غیر مسلم جھگڑے فساد ہونے لگے اور معاملہ دور تک پہنچ گیا۔ اس شاعر کی طویل نظم کے تین شعر مجھے یاد ہیں جو درج ذیل ہیں۔

جدوں وچ سمندر طوفان آوے
لہراں نال لہراں پیاں لڑ دیاں نے
جدوں آن جھکھڑ انھیر چڑھدے
پھلاں نال سولاں پیاں اڑ دیاں نے
بھانڈے گھراں دے تدوں ٹھہکدے نے
چونکے جدوں کچیاں چڑھدیاں نے

ان اشعار کا مطلب یہ ہے کہ جب سمندر میں طوفان آتا ہے تو اس کی لہریں
آپس میں گتھم گتھا ہو جاتی ہیں اور خوب لڑتی ہیں۔
جب فضا میں جھکڑ چلتے اور آندھیاں آتی ہیں تو کانٹے اڑ اڑ کر پھولوں کے
ساتھ اڑنے لگتے ہیں۔
اچھے بھلے گھروں میں اس وقت دنگے فساد تک نوبت پہنچ جاتی ہے' جب مختلف
خاندانوں کی عورتیں بیاہ کر لائی جاتی ہیں اور صحن میں بیٹھ کر الگ الگ لہجے
میں باتیں کرتی اور بھائیوں کو بھائیوں سے لڑاتی ہیں۔

یہ مشاعرہ رات گئے تک جاری رہا اور میں نے اور مولانا محمد حنیف ندوی نے ایک ہی جگہ کھڑے ہو کر پورا مشاعرہ سنا۔ میرا بھائی سعید احمد اس وقت چار پانچ سال کا تھا' وہ بھی ہمارے ساتھ رہا۔ اب سعید احمد ماشاء اللہ دو بیٹیوں اور دو بیٹوں کا باپ ہے۔ بڑی بیٹی نے اسی سال بی اے پاس کیا ہے۔

اب مولانا محمد حنیف ندوی کے مولد گوجرانوالا کے بارے میں چند باتیں سنیے۔ یہ متحدہ پنجاب کا وہ شہر ہے' جس میں مختلف اوقات میں بڑی بڑی شخصیتیں پیدا ہوئیں۔ جلیل القدر عالم' مشہور بزرگ' نیک اطوار لوگ' ادیب' شاعر' سیاست دان' معلم' اخبار نویس' طبیب' لیڈر' خطاط' خوش نویس' مصنف' مقرر' پہلوان ہر شعبہ زندگی کے لوگ (گوجرانوالہ) کی مردم خیز سرزمین میں پیدا ہوئے اور پورے برصغیر میں ان کی شہرت پھیلی' بلکہ بعض حضرات کی خدمات کا دائرہ اتنا وسیع ہوا کہ برصغیر سے باہر بھی ان کی صدائیں سنی گئیں۔ دوسری جنگ عظیم کے زمانے میں ایک صاحب برلن ریڈیو سے ہندوستانی وقت کے مطابق روزانہ شب کو آٹھ بجے اردو میں محاذ جنگ کی تازہ خبریں سنایا کرتے تھے' ان کی آواز بڑی بارعب اور گرج دار تھی۔ ان کا نام عبدالرؤف تھا اور وہ گوجرانوالہ کے رہنے والے تھے۔ ہندوستان کی برطانوی حکومت نے برلن ریڈیو سننا ممنوع قرار دے دیا تھا' لیکن ممانعت کے باوجود باقاعدگی سے لوگ برلن ریڈیو سے عبدالرؤف کی زبانی جنگ کی تازہ ترین خبریں سنتے تھے۔

اسی ضلعے کا ایک قصبہ قاضی کوٹ ہے جو برصغیر کی تحریک آزادی کا ایک مستقل باب ہے' یہاں کے لوگوں نے ہندوستان سے انگریزوں کو نکالنے اور ملک کو آزادی وحریت سے ہم کنار کرنے کے لیے قید وبند کی بے پناہ اذیتیں برداشت کیں۔ یہاں کے لوگوں کا تعلق تحریک مجاہدین سے تھا' جسے وہابی تحریک کے نام سے بھی موسوم کیا جاتا ہے۔ یہ سب لوگ مسلک کے اعتبار سے اہل حدیث تھے۔

ضلع گوجرانوالہ میں اچھی خاصی آبادی پر مشتمل ایک گاؤں مرالی والا ہے' جو اس سڑک پر واقع ہے جو گوجرانوالہ سے شیخوپورہ کو جاتی ہے۔ ایک بہت بڑا ہندو فلسفی جس کا نام سوامی رام تیرتھ تھا' اسی گاؤں کا رہنے والا تھا۔ فلسفے کے موضوع پر انگریزی میں اس کی ایک یا دو کتابیں بھی ہیں' جو آزادئ وطن سے پہلے غالباً دہلی سے شائع ہوئی تھیں۔ فلسفیانہ حلقوں میں ان کتابوں کی بڑی مانگ تھی۔ اس کی تاریخ ولادت ۲۲- اکتوبر ۱۸۷۳ء ہے۔ تعلیم مکمل ہونے کے بعد اس نے جاپان' امریکہ اور مصر کا سفر کیا۔ مصر میں قاہرہ کی جامع مسجد میں اس نے بڑی شستہ فارسی میں تقریر کی تھی جو وہاں کے اس وقت کے مشہور اخبار ''الوہاب'' میں شائع ہوئی تھی۔ وہ بہت اچھا شاعر بھی تھا۔ علامہ اقبال نے ''سوامی رام تیرتھ'' کے عنوان سے ''بانگ درا'' میں اس کے متعلق نظم لکھی تھی۔ وہ ۱۹۰۶ء میں دریائے گنگا میں اشنان کرتا ہوا ڈوب گیا تھا۔ اس کا وہ مکان جس میں وہ سکونت پذیر تھا' اب بھی مرالی والا میں موجود ہے اور خستہ حالت میں ہے' اس میں جو خاندان آباد ہے' وہ مشرقی پنجاب کے کسی علاقے سے نقل مکانی کرکے مرالی والا میں آباد ہوا ہے۔ اسے معلوم ہی نہیں ہوگا کہ اس مکان میں کتنا بڑا آدمی رہتا تھا۔

کسی زمانے میں گوجرانوالہ پہلوانی میں بہت مشہور تھا' اس میں بڑے نامی گرامی پہلوان پیدا ہوئے ہیں۔ اب بھی پہلوانی کا کلچر وہاں موجود ہے۔

جماعت علما سے مولانا غلام رسول (قلعہ میہاں سنگھ) مولانا حافظ عبدالمنان وزیر آبادی' مولانا فضل الٰہی وزیر آبادی' مولانا محمد اسماعیل سلفی' مولانا عبدالمجید سوہدروی' مولانا احمد الدین گکھڑوی' قاضی عبدالرحیم اور دیگر بہت سے حضرات کا تعلق اسی ضلعے اور

شہر سے تھا۔

بلاشبہ گوجرانوالہ پنجاب کا مردم آفرین شہر اور ضلع ہے۔ مولانا حنیف ندوی کا تعلق اسی شہر سے تھا اور انھیں اپنے شہر سے بے حد پیار تھا۔

قدرت اپنے فضل و کرم کے بوقلموں اور بھرپور خزانوں سے بعض لوگوں کو انتہائی فیاضی اور نہایت فراخ دلی سے نوازتی ہے' مولانا حنیف ندوی کا شمار انہی حضرات میں ہوتا تھا۔ دبلے پتلے' قدرے چھوٹے قد کے اس شخص میں بلا کی کشش تھی۔ بے مثال ذہانت' گہری علمیت' غیر معمولی وسعت نظر اور بلندیٔ اخلاق کا عجیب وغریب مرقع۔ بات سے بات پیدا کرنا اور اسے علمی رنگ میں ڈھالنا ان کا وہ کمال تھا جس سے کم لوگ بہرہ مند ہوتے ہیں۔ علاوہ ازیں شگفتگیٔ کلام اور شائستگیٔ مزاج سے اللہ نے ان کو خوب نوازا تھا۔

ایک مرتبہ میرے بیوی بچے گاؤں چلے گئے اور میں گھر میں اکیلا تھا۔ میں نے مولانا سے کہا آج کل میں تنہا ہوں اور ساتھ ہی یہ آیت پڑھ دی۔ تنھی عن الفحشاء والمنکر۔

مولانا نے ''تنہا'' اور ''تنھی'' کا لفظ سن کر فرمایا کہ مشہور شاعر و عالم محمد یحییٰ تنہا کی شادی ہوئی تو ایک شخص نے ان سے کہا اب آپ ''تنہا'' نہیں رہے' کوئی اور تخلص سوچیے۔ مولانا حالی بھی اس مجلس میں موجود تھے' انھوں نے کہا ''تنہا'' تو یہ اب شادی کے بعد ہوئے ہیں اور آئندہ ہوں گے' پہلے ''تنہا'' نہیں تھے' صرف ایک ''تن'' تھے۔

مولانا سے تعلق رکھنے والا کوئی شخص ان کے سامنے اگر کوئی غلط لفظ بولتا تو کسی نہ کسی طرح اسے صحیح لفظ بتانے کی کوشش کرتے۔ مجھے تو صاف لفظوں میں بتا دیتے کہ صحیح یہ ہے۔ کسی اور کو بتانا مقصود ہوتا تو اس طرح کی بات اس کے سامنے کرتے کہ جس میں وہ لفظ آجاتا' تاکہ وہ سن کر اپنا تلفظ صحیح کرلے۔ ہمارے ہاں مناظروں کے زمانے میں حریف اگر غلط لفظ بولتا تو مقابلے میں جو دوسرا مناظر ہوتا' وہ اس کا مذاق اڑاتا اور کہتا کہ

یہ تو صحیح لفظ نہیں جانتا کہ کیا ہے' مناظرہ یہ کیا کرے گا۔ صحیح لفظ یہ ہے' جس کا اسے علم نہیں--- مولانا حنیف ندوی نے ایک دفعہ بتایا کہ مولانا ثناء اللہ امرتسری سے مناظرے یا گفتگو میں ان کا حریف کوئی غلط لفظ بولتا تو نہ وہ اسے ٹوکتے تھے' نہ صحیح لفظ بتاتے تھے۔ وہ فرمایا کرتے تھے' ہمیں کیا ضرورت ہے اس کے تلفظ کی تصحیح کرنے کی' جس طرح بولتا ہے' بولتا رہے۔

مولانا ندوی کو اپنی بیگم سے بہت پیار تھا' بیگم کو بھی نامدار شوہر سے بڑی محبت تھی۔ اس ضمن کے بعض واقعات وہ بڑے شگفتہ اسلوب میں سنایا کرتے تھے۔ اپنے بچوں اور پوتوں اور نواسوں سے بھی انھیں بے پناہ محبت تھی' ان کی بعض معصوم سی باتیں وہ نہایت دلچسپی سے بیان کیا کرتے تھے۔

مولانا کی سات اولادیں ہیں' دو بیٹیاں اور پانچ بیٹے۔ بیٹیاں بچوں والی ہیں۔ بڑی کا نام وردہ اور چھوٹی کا سدرہ ہے۔ بیٹوں میں سے تین کی شادی ان کی زندگی میں ہوگئی تھی۔ دو کی ان کی وفات سے کم وبیش ڈھائی سال بعد ہوئی۔ دو بیٹوں کے سوا سب صاحب اولا ہیں۔

بڑے بیٹے کا نام منت اللہ ہے' وہ ایڈووکیٹ ہیں اور اب کچھ عرصے سے بیمار ہیں۔

ان سے چھوٹے وقار الاسلام ہیں۔ اقبال اکیڈیمی میں کام کرتے تھے۔ بہت سال ہوئے' شادی ہوئی تھی۔ لیکن اولاد سے محروم ہیں۔ ملازمت سے ریٹائر ہو گئے ہیں۔

وقار سے چھوٹے سجاد ہیں۔ سعودی عرب میں مقیم ہیں۔ تقریباً بیس برس پہلے شادی ہوئی تھی' لیکن ابھی تک صرف میاں بیوی ہیں۔

اس سے چھوٹے جواد ہیں جو شادی شدہ ہیں۔

سب سے چھوٹے حماد فسیم ہیں' واپڈا میں انجینئر تھے' ۲۱ دسمبر ۱۹۸۹ء کو شادی ہوئی تھی۔ اس وقت ان کی بیوی گرلز کالج جڑانوالہ میں انگریزی کی پروفیسر تھیں۔ اب میاں بیوی کنیڈا چلے گئے ہیں۔

داماددوں سمیت گھر کے تمام افراد سے مولانا بے تکلفانہ انداز میں گفتگو کرتے

تھے۔ ان کی بیگم کا بھی ہمیشہ یہی حال رہا' ان کو بھی گھر کے کسی فرد سے کبھی تکلف نہیں رہا۔ ہمارے گھریلو معاشرے میں عام طور پر ساس کو بہو سے اور بہو کو ساس سے کوئی نہ کوئی شکایت رہتی ہے۔ پنجابی کی ایک ضرب المثل ہے' جس کا مطلب یہ ہے کہ جب تک میں بہو رہی مجھے ساس اچھی نہ ملی' جب ساس ہوئی تو بہو اچھی نہ ملی۔ ساس کوئی نہ کوئی بات طنزیہ انداز میں بہو سے کہتی رہتی ہے۔ اسی طرح بہو کسی نہ کسی رنگ میں ساس کو نشانۂ طنز بنائے رکھتی ہے۔ بعض سسر بھی کچھ ایسی فطرت کے مالک ہوتے ہیں کہ بہو کے نقائص تلاش کرنے کی کوشش میں رہتے ہیں۔ مولانا کے گھر میں ہم نے یہ بات نہیں دیکھی۔ اگر تھوڑی بہت کوئی بات کبھی ہو بھی گئی تو کسی پر اس کا اظہار نہیں ہوا۔

ساس اور بہو کے سلسلے میں کچھ پنجابی لوک گیت بھی ہیں' جن میں ایک دوسرے کے بارے میں دونوں کی سوچ کو واقعاتی رنگ میں بیان کیا گیا ہے۔ ساس کے رویے سے اکتائی ہوئی بہو کہتی ہے۔

سسیاں کپتیاں دے گل گھٹ دیو

صندوقاں اوہلے

یعنی صندوقوں کی اوٹ میں لے جا کر ساس کا گلا گھونٹ دو' یہ پریشان کرتی ہے۔

ایک گیت میں بہو اپنی ساس کے شکی مزاج ہونے کا ذکر کرتی ہے۔

میری سس بھرماں دی ماری

کھنگ کے نہ لنگھ منڈیا

یعنی وہ گلی محلے کے لڑکے سے کہتی ہے' میری ساس بڑی شکی مزاج ہے' تم ہمارے گھر کے آگے کھانستے ہوئے نہ گزرا کرو۔

عام طور سے دیکھا گیا ہے کہ بیٹی بھی گھر میں موجود ہے اور بہو بھی' مگر بہو کے مقابلے میں بیٹی کا بہت زیادہ خیال رکھا جاتا ہے اور کوشش کی جاتی ہے کہ بیٹی آرام کرے

اور بہو کام کرے۔ پنجابی محاورے کے مطابق ساس کہتی ہے' بیٹی کام کر' بہو کان کر۔ یعنی وہ مخاطب تو بیٹی سے ہوتی ہے کہ کام کر' لیکن دراصل اس کا روئے سخن بہو کی طرف ہوتا ہے کہ کان لگا کر سنو' تمھارا فرض ہے کہ کام کرو۔

کسی زمانے میں عورتیں آٹا چکی سے پیستی تھیں اور سوت چرخے سے کاتتی تھیں۔ اب زمانہ ترقی کر گیا ہے' نہ گھروں میں آٹا پیسنے کے لیے چکی رہی ہے اور نہ سوت کاتنے کے لیے چرخہ کہیں نظر آتا ہے--- لیکن پنجابی لوک گیتوں میں چکی بھی موجود ہے اور چرخہ بھی۔! بیٹی چرخے پر بیٹھی سوت کات رہی ہے اور کاتتے کاتتے اسے نیند آنے لگی ہے' وہ ماں سے کہتی ہے۔

نینداں آیاں مائیں نینداں آیاں نی

ماں جواب دیتی ہے

چک چرخہ ڈاہلا منجی دھیے نینداں لاہلانی

یعنی بیٹی ماں سے کہتی ہے کہ مجھے نیند آرہی ہے۔ ماں جواب دیتی ہے کہ تمھیں چرخہ کاتتے ہوئے نیند آرہی ہے تو چرخہ کا تنا بند کر دو' اور چارپائی بچھا کر سو جاؤ۔

اب بہو ساس سے کہتی ہے کہ چرخہ کاتتے ہوئے مجھ پر نیند نے غلبہ پالیا ہے' میں کیا کروں۔

نینداں آیاں سسے نینداں آیاں نی

ملاحظہ فرمایئے ساس کیا جواب دیتی ہے۔

چک چرخہ جھولے چکی نوہیں نینداں لاہلانی

یعنی چرخہ کاتتے ہوئے اگر تمھیں نیند آرہی ہے تو تمھاری نیند کا علاج یہ ہے

کہ چرخہ کاتنا بند کر دو چکی پر بیٹھ جاؤ اور آٹا پیسنا شروع کر دو۔ نیند اتر جائے گی۔

یہ ہے ماں اور ساس کے نزدیک بیٹی اور بہو کی نیند اتارنے کا الگ الگ طریقہ---! بیٹی کی نیند اتارنے کے لیے چارپائی اور بہو کی نیند دور کرنے کے لیے چکی۔!

مولانا کے گھریلو معاملے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے' یہ سخن گسترانہ بات مقطع میں آ پڑی تھی' کہنا یہ مقصود ہے کہ جہاں تک میں جانتا ہوں' مولانا کے گھر میں سب سے مساوی سلوک کیا جاتا ہے' وہاں ساس اور بہو یا ماں اور بیٹی کے درمیان امتیاز نہیں ہے۔

مولانا کو خط لکھنے کی عادت نہ تھی۔ بہت کم خط لکھتے تھے اور وہ بھی انتہائی مجبور ہو کر۔ میرے نام ان کے چھے خط حسن اتفاق سے محفوظ ہیں۔ چار ۱۹۶۰ء کے' ایک ۱۹۶۲ء کا اور ایک ۱۹۶۳ء کا۔ یہ ان دنوں کے خطوط ہیں جب ادارہ ثقافت اسلامیہ کی طرف سے رفقائے ادارہ کو اپنی مرضی کے مطابق موسم گرما میں کسی ٹھنڈے مقام پر جانے کی اجازت تھی اور اس کا انھیں خرچ دیا جاتا تھا' جسے ''ہل الاؤنس'' کہا جاتا تھا۔ میں اس زمانے میں ہفت روزہ ''الاعتصام'' کا ایڈیٹر تھا۔ مختلف مقامات سے میرے نام بھیجے ہوئے مولانا کے وہ خطوط ترتیب وار یہاں درج کیے جاتے ہیں۔

خط ہمیشہ رواروی میں لکھا جاتا ہے۔ اس کے چھپنے کا کسی کو خیال نہیں ہوتا۔ خط سے پتا چلتا ہے کہ لکھنے والا کتنا صاف بیان ہے اور اس کی تحریر میں ادبیت کی کتنی جھلک پائی جاتی ہے۔ نیز اندازہ ہوتا ہے کہ خط لکھنے والا کسی بات کے اظہار میں کیا اسلوب اختیار کرتا ہے۔ اب ملاحظہ ہوں مولانا کے خطوط---!

(۱)

۲۹-۷-۶۰

برادر عزیز-! اسلمہ اللہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔

میں کوئٹہ خیر و عافیت سے پہنچ گیا ہوں اور کسی حد تک یہاں کی آب و ہوا سے اپنے آپ کو ہم آہنگ بھی کر چکا ہوں۔ اتنا بڑا فاصلہ' میرے جیسا مریض و ناتواں انسان اور

اتنے طویل و عریض اور لق و دق سفر کی صعوبتیں۔ بس اللہ کی سازگاریوں کے طفیل یہ سب طے ہو گیا' ورنہ میں تو قدم قدم پر ڈر رہا تھا۔

یہاں کی جماعت اہل حدیث کے تمام اکابر و اصاغر سے مل چکا ہوں۔ آپ کے اخبار کا یہاں اچھا خاصا حلقہ ہے۔ اس نوٹ کی وجہ سے لوگوں نے مجھ سے ملنے اور مجھے ڈھونڈ نکالنے میں سبقت کی [۱] خدا کا شکر ہے' اب کوئٹہ میں میں مسافر نہیں ہوں' اچھی خاصی جان پہچان ہو گئی ہے۔

آئندہ اخبار یہیں بھیجیے اور یہ بھی بتایے کہ اس مضمون کو بحیثیت مجموعی کس نظر سے دیکھا گیا۔[۲] یہاں آتے ہی کاموں میں جت گیا ہوں۔ اگر فرصت ملی تو بشرط صحت ان شاء اللہ ''الاعتصام'' کے لیے ضرور کچھ لکھوں گا۔

جستہ جستہ خبریں اور حالات بتاتے رہیے تاکہ لاہور سے رابطہ قائم رہے۔ ہاں بیگم اسحاق کا کیا حال ہے۔ اب تو خدانخواستہ کوئی تکلیف نہیں ہے۔[۳]

مولانا غزنوی کی خدمت میں سلام اخلاص۔[۴]

خیر اندیش

محمد حنیف ندوی

معرفت رئیس احمد جعفری

خیر پور ہاؤس۔ کوئٹہ

ہاں۔! رئیس صاحب آپ کو سلام کہتے ہیں۔

---

۱ مولانا ان دنوں بیمار تھے' میں نے ''الاعتصام'' میں نوٹ لکھا تھا کہ وہ کوئٹے تشریف لے گئے ہیں اور کچھ عرصہ وہاں مقیم رہیں گے۔ سید رئیس احمد جعفری بھی ان کے ساتھ تھے اور ان دونوں حضرات کا قیام خیر پور ہاؤس میں تھا۔

۲ مولانا نے الاعتصام میں ایک مضمون لکھا تھا' اس کی طرف اشارہ ہے۔

۳ میری بیوی اس وقت بیمار تھی اس کا پوچھا ہے۔

۴ مولانا سید داؤد غزنوی مراد ہیں۔

(۲)

۶۰-۸-۲۵

برادرِ عزیز اسحاق صاحب

السلام علیکم۔

اخبار پہنچ رہا ہے' یاد فرمائی کا شکریہ۔ میں چاہتا ہوں پرویز صاحب کی کتاب لغات القرآن پر تنقید کروں' رئیس صاحب بھی اس کے لیے تیار ہو رہے ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ دوسروں کی محنت کا کریڈٹ انھیں ملے۔[1] براہ کرام کہیں سے اس کی پہلی جلد مہیا کر دیں۔ لیکن یہ کام لاہور آ کر ہی ہو سکے گا۔ کیا اس کے لیے کوئی جدوجہد کی جائے گی۔؟

یہاں کی جماعت کو دیکھ کر افسوس ہوتا ہے' ان میں زندگی کے کچھ آثار نہیں۔ سب اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہیں اور نظم سے بے گانہ۔ یہاں قادیانیوں کا ریڈنگ روم ہے' حالاں کہ وہ چند آدمی ہیں' ان کے ہاں درس کا بھی انتظام ہے۔ بہائیوں کی تعداد بھی کچھ زیادہ نہیں' ان کا بھی پٹیل روڈ پر ایک ریڈنگ روم ہے۔ اور تو اور دس گیارہ آغا خانی ہیں' ان کی بھی اچھی خاصی تنظیم ہے۔ مگر اہل حدیث بالکل گم نام اور قانع۔ خدا جانے انھیں کیا ہوا۔ ان کی دو مسجدیں ہیں اور دونوں خالصتاً ان کے قبضے میں نہیں۔

کہیے آپ کا کیا حال ہے؟ پھر دورے کی کیفیتیں تو نمودار نہیں ہوئیں؟[2]

کئی دن سے گھر سے کوئی خط نہیں آیا۔ اگر آپ وقار[3] سے مل کر پتا کریں اور بواپسی اطلاع دیں تو ممنون ہوں گا۔ کتاب پر مقدمہ لکھ رہا ہوں۔[4]

---

[1] مشہور تھا کہ لغات القرآن کے اصل مصنف مولانا محمد سورتی کے بیٹے مولانا عبدالرحمٰن طاہر سورتی تھے اور پرویز صاحب نے ان کو کچھ دے دلا کر کتاب اپنی طرف منسوب کر لی تھی۔

[2] میری بیوی بیمار تھیں اور بیماری کے دورے سے پڑتے تھے۔

[3] مولانا کے ایک بیٹے کا نام وقار الاسلام ہے' اسی سے پتا کرنے کو کہا گیا ہے۔

[4] اپنی تصنیف ''تعلیمات غزالی'' کا مقدمہ مراد ہے۔

حاجی[1] صاحب سے ملاقات ہوتی ہو تو میرا سلام پہنچائیں۔ محمود[2] صاحب کو بھی سلام کہیے گا۔ یہاں تو ہیضے نے کھانا پینا حرام کر رکھا ہے' وہاں کیا حال ہے۔؟

والسلام

محمد حنیف ندوی

خیر پور ہاؤس۔ کوئٹہ

(۳)

۳۱۔۸۔۶۰

برادرِ عزیز! سلمہ اللہ

السلام علیکم۔

خط ملا۔ میں اس پر تعجب کا اظہار کر رہا تھا کہ میاں شفیع صاحب نے میرا تذکرہ ''اقدام'' میں کیوں کیا' جب کہ میں نہ ''الاعتصام'' کا ایڈیٹر ہوں اور نہ میں نے مولانا کے دفاع میں کوئی مضمون ہی لکھا' کہ ''اقدام'' کے تازہ شمارے کے بہرۂ مراسلات میں کسی صاحب نے گرفت فرمائی اور کہہ دیا کہ میں نے اسحاق صاحب اور خاکسار کے مضامین پڑھے ہیں' دونوں بالکل سطحی ہیں۔ اس ستم ظریفی پر کیا کیا جائے۔ معلوم ہوتا ہے اقدام کے ایڈیٹر اور قارئین اصل معاملے سے بے خبر ہیں۔ مجھے بتائیے کہیں آپ

---

[1] ہمارے ایک پیارے دوست حاجی محمد اسحاق حنیف تھے۔ انارکلی میں نظام ہوٹل سے متصل اور دہلی مسلم ہوٹل کے سامنے ان کی دکان تھی۔ وہاں روزانہ شام کے بعد ہماری ایک نشست ہوتی تھی۔ ۸ ستمبر ۱۹۶۹ء کو لارنس روڈ پر وہ اپنی موٹر کار میں مردہ پائے گئے۔ ان کی موت کس طرح واقع ہوئی؟ اس کا کوئی پتا نہ چل سکا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

[2] مولانا محمد جوناگڑھی دہلوی کے صاحب زادے محمد محمود میمن دہلوی مراد ہیں جو ان دنوں لاہور میں کاروبار کرتے تھے۔ اس کے بعد روزنامہ ''وفاق'' (لاہور) میں ملازم ہو گئے تھے۔ پھر ''وفاق'' کے نمائندے کی حیثیت سے کراچی چلے گئے تھے۔ وہیں چار سال قبل اچانک وفات پائی۔

نے میرے پرانے مضامین میں سے تو کوئی مضمون درج نہیں کر دیا ہے۔ آپ مجھے صحیح صورتِ حالات لکھیں تا کہ میں میاں صاحب کو اس سلسلے میں خط لکھ سکوں۔[1]

مولانا امام خاں اگر کسی حلقے میں تعریفی کلمات استعمال کرتے ہیں تو واقعی یہ معجزہ ہے۔[2] میں تیزی سے کام کر رہا ہوں اور بفضلہٖ تعالیٰ تصوف اور اس کے متعلقات پر اس انداز سے لکھ رہا ہوں کہ اس سلسلے کے تمام شکوک رفع ہو جائیں گے۔ مضمون پھیلتا ہی چلا جا رہا ہے' دیکھیے اشہب قلم کہاں جا کر رکتا ہے۔

امید ہے ستمبر کے اواخر تک پہنچ جاؤں گا۔ لاہور بھولتا ہی نہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ لاہور باوجود اپنی گرمی اور تپش کے لاہور ہے' اور کوئٹہ اگرچہ ٹھنڈی جگہ ہے اور اگرچہ اس کی شامیں بڑی رومینٹک ہیں تاہم جو بانکپن لاہور میں ہے' وہ بلوچستان کے اس شہر میں کہاں؟ نہ وہ صحبتیں' نہ وہ جمگھٹے اور نہ وہ احباب۔

---

[1] بعض حضرات نے کسی زمانے میں مولانا ابوالکلام آزاد کے متعلق اس قسم کے مضامین بعض رسائل و جرائد میں لکھے تھے کہ وہ مکہ مکرمہ میں پیدا نہیں ہوئے' وہ اصلاً دہلی کے باشندے بھی نہیں ہیں' انھوں نے عراق وغیرہ کا سفر بھی نہیں کیا تھا' نیز یہ کہ ''الہلال'' کے فلاں فلاں مضامین مولانا نے نہیں لکھے تھے' سید سلیمان ندوی نے لکھے تھے' جو غلط طور سے مولانا کی طرف منسوب کر دیے گئے ہیں۔ اس کا جواب مولانا حنیف ندوی نے الاعتصام میں دیا تھا' میں نے بھی اس ضمن میں لکھا تھا۔ اس سے کئی سال بعد انہی لوگوں نے پھر مولانا سے متعلق اسی قسم کی باتیں لکھنا شروع کر دی تھیں۔ ان دنوں مشہور صحافی میاں محمد شفیع (م ش) کا ہفت روزہ ''اقدام'' جاری تھا' اس کے بہرۂ مراسلات میں میرے اور مولانا حنیف ندوی کے پرانے مضامین کا تذکرہ کیا گیا تھا' ظاہر ہے مخالف کو ہماری بات پسند نہیں آ سکتی تھی۔

[2] مولانا ابو یحییٰ امام خاں نوشہروی مشہور مصنف و مترجم تھے' انھوں نے بعض مجلسوں میں میری موجودگی میں مولانا ندوی کے مقالات و مضامین کی بہت تعریف کی تھی' میں نے ایک خط میں اس کا ذکر مولانا سے کیا اور اسے معجزہ قرار دیا تو انھوں نے جواب میں یہ الفاظ لکھے۔ یہاں یہ یاد رہے کہ مولانا ابو یحییٰ امام خاں نوشہروی' کسی اہل علم کے متعلق تعریفی کلمات استعمال کرنے میں بہت محتاط تھے۔ انھوں نے ۱۶ جنوری ۱۹۶۶ کو اپنے وطن سوہدرہ میں وفات پائی۔

پرویز صاحب کی لغات القرآن پر ماجد صاحب کے اخبار میں ایک نہایت پھپھسی تنقید چھپ رہی ہے' پڑھ کر سخت غصہ آتا ہے[1] ان شاء اللہ لاہور آ کر اس پر ایک فیصلہ کن تنقید لکھی جائے گی۔

بیماری کے اس دوران میں میں اپنے دل سے تمام تعصبات نکال چکا ہوں' سوا ایک تعصب کے اور وہ وہ ہے جس کا تعلق پرویز صاحب کی تحریک سے ہے۔ کیوں کہ میں محسوس کرتا ہوں کہ اس کی تہہ میں میرے محبوب اور پیارے مقتدا علیہ الصلوٰۃ والسلام کے منصب نبوت کا انکار کارفرما ہے۔ میں الحاد و زندقہ کی ہر شکل کو کسی حد تک قابل برداشت سمجھتا ہوں' مگر آنحضرت ﷺ کی نبوت سے تلعب جو بدترین قسم کی گستاخی ہے' میرے نزدیک قابل عفو نہیں۔

امید ہے تمام احباب خیریت سے ہوں گے۔

والسلام
محمد حنیف ندوی
کوئٹہ

(۴)

۷۔۹۔۶۰

محبی وحبیبی

السلام علیکم

ابھی ''نوائے وقت'' کا تراشہ ملا' اس قدر جلد توجہ فرمائی کا بہت بہت شکریہ۔ میں ۱۳ ستمبر کو کراچی میل سے آ رہا ہوں' ان شاء اللہ۔

کوئٹہ کی آب و ہوا بحیثیت مجموعی راس نہیں آئی۔ میری رائے یہ ہے کہ ہم لوگوں

---

[1] مولانا عبدالماجد دریابادی اور ان کا ہفت روزہ ''صدق جدید'' مراد ہے۔

کے لیے لاہور سے بہتر کوئی جگہ نہیں۔

میری کتاب اور اس پر مقدمہ مکمل ہو گیا ہے۔ خدا کے فضل و کرم سے تصوف پر نہایت جامع بحث ہو گئی ہے۔ لاہور آؤں گا تو پہلی فرصت میں لغات القرآن پر تبصرہ کروں گا۔ یہ فتنہ پھیلتا جا رہا ہے' اس کو یہیں روک دینا چاہیے۔ اے کاش' اچھا لکھنے والے' اونچے لیول کے لوگ کچھ لکھیں۔

مولانا کی خدمت میں میرا سلام عرض کیجیے گا[1] اور ان سے خصوصیت سے کہیے گا کہ میرے لیے دعا کریں۔ عوارض بڑھتے چلے جا رہے ہیں۔ خدا کرے ذہن و قلم کی شادابیاں قائم رہیں تاکہ اللہ کے ہاں جائیں تو کچھ "آثار قلم" کی متاع حقیر تو لیتے چلیں۔

کیا آپ سٹیشن پر آئیں گے؟

مولانا سے کہیے گا کہ میں نے تصوف کے متعلقات علمی و عملی پر اپنی اس کتاب[2] میں بحث کر کے اہل حدیث کی طرف سے فرض کفایہ ادا کر دیا ہے --- ان شاء اللہ یہ چھپ جائے تو مولانا بہت خوش ہوں گے۔ خدا کرے اسے قبول عام حاصل ہو۔

امید ہے گھر سے خیریت سے ہوں گے۔

رئیس صاحب آپ کو یاد کرتے ہیں اور بہت بہت سلام کہتے ہیں۔

والسلام

محمد حنیف ندوی

(۵)

یہ خط ستمبر ۱۹۶۲ء کو ایبٹ آباد سے لکھا تھا۔ اس سال گرمیوں میں وہ ایبٹ آباد گئے تھے۔

---

[1] مولانا سید داؤد غزنوی مراد ہیں۔

[2] تعلیمات غزالی مراد ہے

۲۶-۹-۶۲

پتا:

معرفت محمد جی ہوٹل والا۔

نواں شہر' ایبٹ آباد (ہزارہ)

برادر عزیز اسحاق صاحب!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ

کچھ دن ایبٹ آباد ٹھہرنے کے لیے بالآخر نواں شہر میں منتقل ہو گیا ہوں۔ یہ پر فضا اور بارونق قصبہ ہے' آب و ہوا بہت اچھی ہے' لوگ بھی عمدہ اور مسلمان قسم کے ہیں۔ مگر بات چیت اور گپ شپ کے مواقع بالکل میسر نہیں۔ آپ کی کمی رہ رہ کر محسوس ہوتی ہے۔

میرے ساتھ وقار بھی ہے' پانچ اکتوبر کو ہماری واپسی ہے' ایک دن کے لیے راولپنڈی رکنا چاہتا ہوں تاکہ وقار اچھی طرح گھوم پھر کر پنڈی دیکھ لے۔ آپ براہ کرم مولانا اسماعیل ذبیح کا مکمل پتا تحریر فرما دیجیے تاکہ ان کے ہاں سامان رکھیں اور سیر گشت کر سکیں۔[1]

جلسے کی تیاریاں زوروں پر ہوں گی۔[2] حاجی صاحب کس عالم میں ہیں' انھیں سلام کہیے گا۔[3]

مولانا کا کیا حال ہے' جب میں آیا تھا' ان کی طبیعت ناساز تھی۔ خدا کرے اب بہتر ہو۔ ان کی خدمت میں سلام عرض کیجیے گا۔[4]

---

[1] راولپنڈی کی جامع مسجد اہل حدیث کے خطیب مولانا حافظ اسماعیل ذبیح تھے۔ مرحوم نہایت ہمدرد' ملنسار اور مہمان نواز تھے' مولانا نے ان کا پتا پوچھا تھا۔ ان کی وفات ۲ مئی ۱۹۷۵ کو ہوئی۔

[2] مرکزی جمعیت اہل حدیث کی سالانہ کانفرنس۔

[3] حاجی محمد اسحاق حنیف۔

[4] مولانا داؤد غزنوی۔

یہاں قدرت کی فیاضیاں ہر چہار سو نظر و فکر کو آسودگی بخشتی ہیں۔ اونچے اونچے سبز پہاڑ، شفاف اور شیریں چشمے، تازہ اور صاف ہوا کے جھونکے اور سب سے بڑھ کر سادہ زندگی کے خوش آئند مناظر۔ مگر ذہن، ذوق اور لطائف معنوی کا افسوس ناک حد تک فقدان ہے۔

امید ہے جواب جلدی مرحمت فرمائیں گے۔

والسلام

محمد حنیف ندوی

(۶)

یہ اگست ۱۹۶۳ء کا خط ہے جو مولانا نے مجھے بی ہاؤس (زیارت بلوچستان) سے ارسال کیا تھا۔ اس سال کی گرمیوں میں وہ وہیں تھے۔ مولانا محی الدین احمد قصوری بھی ان دنوں وہیں مقیم تھے۔ وہاں کے کمشنر راجا احمد خاں تھے جو مولانا محی الدین احمد قصوری کے داماد تھے۔ مولانا حنیف ندوی کا وہ نہایت احترام کرتے تھے۔ یہ دونوں بزرگ کچھ عرصہ ان کے مہمان رہے۔ یاد رہے یہ وہی مولانا محی الدین احمد قصوری ہیں جن کا مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنی مشہور کتاب ''تذکرہ'' میں تذکرہ کیا ہے۔ مولانا عبدالقادر قصوری کے فرزند ارجمند تھے۔ ۲۴ جنوری ۱۹۷۱ کو فوت ہوئے۔ اس خاندان کے بزرگوں کے حالات میں نے اپنی کتاب ''قصوری خاندان'' میں وضاحت سے لکھے ہیں۔

۱۹۔۸۔۶۳

برادرِ عزیز اسحاق صاحب!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ

میں یہاں چھے اگست کو آ گیا تھا۔ روزانہ ارادہ کر رہا تھا کہ آپ کو خط لکھوں، مگر نہ لکھ سکا۔ بات یہ ہے کہ کام کا جو نقشہ میں بنا کر لایا تھا، اس کو یہاں آ کر بالکل بدل دینا پڑا، جس کی وجہ سے بالکل وقت نہ نکال سکا۔ اب بحمد اللہ قلم کچھ چل نکلا ہے اور زیر تصنیف کتاب کے مضامین بھی ترتیب و تعین کی ایک خاص صورت اختیار کر چکے ہیں۔ دعا کیجیے

قلعہ کوہ پر یہ چلہ کشی کامیاب رہے۔

جگہ بہت عمدہ ہے' مجھے ایک خیمے میں ٹھہرایا گیا ہے جو بڑے لان میں نصب ہے۔ اس میں اچھی خاصی وسعت ہے۔ پلنگ' میز' کرسی اور باتھ روم اس میں شامل ہیں۔ سبزہ' پھول اور سرد وخنک ہوائیں دل ودماغ کو تازہ رکھتی ہیں۔ راجا صاحب اور ان کے گھر کے لوگ نہایت عزت وتکریم کے ساتھ مہمان نوازی کے جوہر دکھا رہے ہیں۔ مولانا محی الدین صاحب کا قرب' صحبت بلکہ اتصال اس پر مستزاد۔ یہ سب نعمتیں اللہ کے فضل سے میسر ہیں۔ مگر کمی یہ ہے کہ یہاں کوئی اسحاق نہیں' نہ اس کی سی باتیں' نہ وہ غپ شپ' نہ انارکلی کی گہما گہمی اور نہ یارانِ نجد کی دلچسپ خبر س۔ بس ان محرومیوں سے کبھی کبھی دل بہت اچاٹ ہو جاتا ہے۔

آتی دفعہ تعلیماتِ غزالی کا ایک نسخہ احسان بی' اے صاحب کو دے آیا تھا' معلوم نہیں اس کا کیا ہوا۔[1] معارف' ترجمان القرآن اور برہان اگست کا دیکھیے گا' ممکن ہے ان میں ریویو چھپا ہو

کہیے مولانا غزنوی کا کیا حال ہے۔ ان کو میرا اسلام پہنچایئے گا۔

حاجی صاحب کے ہاں نشست رہتی ہے؟[2] کوئی خاص بات---؟ اگر اس عرصے میں ''الاعتصام'' آپ یہاں بھیجتے رہیں تو عنایت ہو گی۔ مولانا عطاء اللہ صاحب کا کیا ہوا' آج کل وہ کس حال میں ہیں[3] گھر میں اپنی بیگم کو سلام عرض کیجیے گا۔

سعید اگر یہیں ہو تو اسے بھی سلام کہیے۔ وہ مجھے بہت یاد آتا ہے۔ آپ کے گھر

---

[1] احسان بی' اے پاکستان کے ممتاز صحافی ہیں جو اس زمانے میں روزنامہ ''کوہستان'' میں کالم لکھتے تھے۔ مولانا ندوی نے اپنی کتاب ''تعلیمات غزالی'' ان کو ''کوہستان'' میں تبصرے کے لیے دی تھی۔

[2] حاجی محمد اسحاق حنیف۔

[3] مولانا عطاء اللہ حنیف مرحوم مراد ہیں۔ ان دنوں مولانا کسی الجھن میں تھے' اس کے متعلق پوچھا ہے۔

جاؤں تو وہ بڑی خدمت کرتا اور شوق سے چائے پلاتا ہے [1]

جواب کا شدید انتظار رہے گا۔ مولانا محی الدین صاحب آپ کو بہت یاد کرتے ہیں اور سلام کہتے ہیں۔

محمد حنیف ندوی

بی ہاؤس

زیارت

آج سے چالیس بیالیس برس قبل کے لکھے ہوئے مولانا کے چھے خطوط آپ نے پڑھے اب ایک اور چیز ملاحظہ فرمائے۔ یہ امراض چشم کا ایک طبی نسخہ ہے جو میرے کاغذات سے مولانا کے ہاتھ کا لکھا ہوا ملا ہے' یہ نسخہ ادارہ ثقافت اسلامیہ کے لیٹر پیڈ پر مرقوم ہے جو یہاں درج کیا جا رہا ہے۔

ھوالشافی

حضرت شاہ چراغ رحمہ اللہ کا تجویز کردہ نسخہ برائے جمیع امراضِ چشم۔ ہلیلہ سیاہ کو جو کوب کرلو اور اس کے بعد اس کو روغن بادام میں مجرب کرو۔ رات کو سوتے وقت چار ماشے مندرجہ ذیل بدرقوں کے ساتھ استعمال کرو۔

جنوری۔ فروری۔ فلفل دراز (مگاں)
اماشہ

مارچ۔ اپریل شہد
اماشہ

مئی۔ جون۔ گڑ
اماشہ

جولائی۔ اگست نمک لاہوری
اماشہ

---

[1] میرا چھوٹا بھائی سعید احمد۔ یہ ستائیس اٹھائیس برس پہلے کی بات ہے۔ اس وقت سعید بچہ تھا' اب ماشاء اللہ بچوں والا ہے۔

ستمبر۔اکتوبر کوزہ مصری

اماشہ

نومبر۔دسمبر سونٹھ

اماشہ

ایک عزیز دوست کا عطیہ۔نہایت مجرب ہے۔

محمد حنیف ندوی

☆☆☆

"ارمغانِ حنیف" میں مولانا کے چند مضامین کی فہرست دی گئی ہے، ان تمام مضامین کی فہرست نہیں دی جاسکی جو مختلف رسائل و جرائد میں شائع ہوئے۔ یہ ممکن بھی نہیں تھا' اس لیے کہ وہ رسائل دست یاب نہیں ہیں۔ البتہ متعدد مضامین کے بارے میں بتادیا گیا ہے کہ کہاں کہاں شائع ہوئے اور کب کب شائع ہوئے۔ ۳۰ دسمبر ۱۹۸۸ء کو ہفت روزہ "الاعتصام" کا مولانا محمد حنیف ندوی نمبر شائع ہوا تھا' اس میں ان مضامین کا اشاریہ دیا گیا ہے جو مختلف اوقات میں "الاعتصام" میں اشاعت پذیر ہوئے۔

۱۵ مئی ۱۹۵۱ء کو مولانا ادارہ ثقافت اسلامیہ سے وابستہ ہوئے تھے۔ جنوری ۱۹۵۵ء میں ادارے کا ترجمان ماہنامہ "ثقافت" جاری ہوا تھا' اس کے ادارۂ تحریر میں بالترتیب ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم (مدیر مسئول) محمد حنیف ندوی' محمد جعفر شاہ پھلواروی' مظہر الدین صدیقی' بشیر احمد ڈار' رئیس احمد جعفری اور شاہد حسین رزاقی شامل تھے۔ "ثقافت" کے دست یاب شماروں میں مولانا کے مندرجہ ذیل مضامین چھپے۔

۱۹۵۵

(۱) جنوری -- غزالی کی سرگزشت انقلاب۔ چودہ صفحات۔

(۲) ایک آیت کی تفسیر' چار صفحات۔

(۲) فروری -- اس میں "غزالی کی سرگزشت انقلاب" کے عنوان سے مضمون کی دوسری قسط چھپی ہے۔ جسے غزالی کی "المنتقذ من الضلال" کی تلخیص قرار دیا گیا

ہے۔ بعد میں یہ تمام مضامین اسی نام سے کتابی شکل میں شائع ہو گئے تھے۔ اداروں میں ایسا ہوتا ہے کہ زیر تصنیف کتاب کے کسی جز کو رسالے میں مضمون کی صورت میں چھاپ دیا جاتا ہے۔ ''ثقافت'' اور اس کے بعد ''المعارف'' میں بھی ایسا ہوتا رہا ہے۔ آئندہ سطور میں وہ مضامین درج نہیں کیے گئے جو بعد کو کتابی شکل میں چھپے۔ فروری ۱۹۵۵ء کے شمارے میں ایک آیت کی تفسیر چار صفحات پر محتوی ہے۔

(۳) مارچ --ایک آیت کی تفسیر --- تین صفحات۔

(۴) اپریل --ایک آیت کی تفسیر --- تین صفحات۔

(۵) جون --مشکلات القرآن --- ایک آیت۔ تین صفحات۔

(۶) جولائی -- ثقافت کے ادارتی شذرات کا مستقل عنوان ''تاثرات'' تھا۔ جولائی ۱۹۵۵ء کے تاثرات مولانا کے تحریر کردہ ہیں۔ چار صفحات۔ علاوہ ازیں
--- مشکلات القرآن --- ایک آیت۔ چار صفحات۔

(۷) اگست -- تاثرات (انڈیا آفس لائبریری۔ تذکار ابراہیم علیہ السلام۔ جشن استقلال اور ادارہ ثقافت اسلامیہ) چار صفحات۔
مشکلات القرآن -- ایک آیت -- چار صفحات۔

(۸) ستمبر -- تاثرات (سائنس دانوں سے --- ایک یونٹ تہذیبی نقطۂ نگاہ سے --- آہ خواجہ حسن نظامی) تین صفحے۔
--- مشکلات القرآن --- ایک آیت --- دو صفحے۔

(۹) اکتوبر --- تاثرات (انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کے منتظمین سے --- ترجمۂ قرآن کے لیے ایک اجتماعی کوشش کی ضرورت) چار صفحات۔
--- مشکلات القرآن --- ایک آیت --- پانچ صفحات۔

(۱۰) نومبر --- فقہ جدید کی ضرورت۔ آٹھ صفحات --- مشکلات القرآن --- ایک آیت۔ چار صفحے۔

(۱۱) دسمبر---تاثرات۔تین صفحے۔

۱۹۵۶

(۱۲) جنوری---ایک آیت---نحوی اشکال---چار صفحے۔

(۱۳) فروری---تاثرات---چار صفحے۔

---مسئلہ خلق قرآن کا تاریخی پس نظر---چار صفحے۔

(۱۴) مارچ---تاثرات۔تین صفحے---صحابہؓ کا طریق افتا و اجتہاد۔--چار صفحے۔

(۱۵) اپریل---معراج النبیؐ---تین صفحے۔

(۱۶) مئی---تاثرات۔تین صفحے۔اسلام میں نبوت کا تصور۔سات صفحات۔

(۱۷) جون---تاثرات۔چار صفحے۔

---اسلام میں نبوت کا تصور (دوسری اور آخری قسط) سات صفحے۔

(۱۸) جولائی---تاثرات۔چار صفحے۔ایمان اور اسلام کے اطلاقات۔آٹھ صفحے۔

(۱۹) اگست---تاثرات۔چار صفحے۔

(۲۰) اکتوبر---تاثرات۔چار صفحے۔

(۲۱) نومبر---تاثرات۔چار صفحے۔

(۲۲) دسمبر---تاثرات۔چار صفحات۔ابن خلدون کا نظریہ خلافت۔نو صفحات۔

۱۹۵۷

(۲۳) جنوری---تاثرات۔چار صفحات۔

(۲۴) فروری---تاثرات۔چار صفحات۔

(۲۵) مارچ---تاثرات۔چار صفحات۔ارسطو کی منطق پر ابن تیمیہ کے اعتراضات۔

---آٹھ صفحے (قسط اوّل)

(۲۶) اپریل---تاثرات۔چار صفحے---شب برات تین صفحے۔

(۲۷) مئی---تاثرات۔چار صفحے۔

ارسطو کی منطق پر ابن تیمیہ کے اعتراضات۔چار صفحے (دوسری قسط)

(۲۸) جون---تاثرات۔چار صفحات۔

(۲۹) جولائی---تاثرات۔تین صفحے۔

(۳۰) اگست---تاثرات۔دو صفحے۔

(۳۱) ستمبر---تاثرات۔چار صفحات---حسینؓ ابن علیؓ کا صدق وصفا۔چار صفحات۔

(۳۲) اکتوبر--- تاثرات۔ چار صفحات--- ارسطو کی منطق پر ابن تیمیہ کے اعتراضات---گیارہ صفحات (تیسری اور آخری قسط)

(۳۳) نومبر---تاثرات۔دو صفحے۔

(۳۴) دسمبر---تاثرات۔چار صفحات۔

۱۹۵۸

(۳۵) جنوری---تاثرات۔تین صفحات۔

(۳۶) فروری---تاثرات۔چار صفحے۔

(۳۷) مارچ---تاثرات۔ایک صفحہ۔

(۳۸) جون---تاثرات۔چار صفحے۔دائرۂ اجتہاد کی وسعتیں---پانچ صفحے۔

(۳۹) جولائی---کے تاثرات۔چار صفحات۔

---یونانی فلسفے پر غزالی کے اعتراضات۔چھ صفحے (پہلی قسط)

(۴۰) اگست---تاثرات۔چار صفحات۔

(۴۱) اکتوبر---تاثرات۔چار صفحات۔

(۴۲) نومبر---تاثرات۔چار صفحات۔

۱۹۵۹

(۴۳) جنوری---تاثرات۔چار صفحے۔

(۴۴) فروری---تاثرات۔تین صفحے۔

(۴۵) مئی---تاثرات۔چار صفحے۔

(۴۶) جون---تاثرات۔تین صفحے۔

---روایت ودرایت کے قرآنی پیمانے۔ آٹھ صفحے۔ (پہلی قسط)

(۴۷) جولائی ---غزالی کا نظریہ تعلیل۔ آٹھ صفحے۔

(۴۸) اگست ---روایت ودرایت کے قرآنی پیمانے۔ چار صفحے (دوسری اور آخری قسط)

۱۹۶۰

(۴۹) جون' جولائی کا شمارہ ''خلیفہ عبدالحکیم نمبر'' تھا۔ اس میں مولانا مضمون ہے ''مرحوم کی کچھ خوبیاں'' تین صفحے۔

(۵۰) دسمبر---فہم قرآن--بیس صفحات (پہلی قسط)

۱۹۶۱

(۵۱) جنوری ---تاثرات۔ تین صفحے---فہم قرآن۔ پندرہ صفحات (دوسری قسط)

(۵۲) اکتوبر---تاثرات۔ دو صفحے۔

(۵۳) نومبر---تاثرات۔ پانچ صفحات۔

نہایت افسوس ہے' ادارہ ثقافت اسلامیہ کے دفتر سے جہاں سے کہ ''ثقافت'' شائع ہوتا تھا' اس کے ۱۹۶۱ کے جنوری' جولائی' اگست' ستمبر' اکتوبر اور نومبر کے شمارے نہیں مل سکے۔ دست یاب شماروں میں مولانا کے جو مضامین درج ہیں' وہ یہاں درج کر دیے گئے ہیں۔ ان شماروں میں ایسے مضامین بھی ہیں' جن کا تعلق ان کی اس دور کی زیر تصنیف کتاب سے ہے' وہ یہاں درج نہیں کیے گئے۔

۱۹۶۲

(۵۴) جنوری --- تاثرات۔ چار صفحے (تاثرات کا عنوان ہے ''مسئلہ اصلاح نصاب'') اور یہ اس کی دوسری قسط ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ دسمبر ۱۹۶۱ کے شمارے میں اس کی پہلی قسط شائع ہوئی ہے' لیکن یہ شمارہ دست یاب نہیں۔

(۵۵) فروری ---تاثرات۔ تین صفحات۔

قرآن میں رمز واشارہ کی چند مثالیں۔ دس صفحات (پہلی قسط)

(۵۶) مئی ---قرآن میں رمز واشارہ کی چند مثالیں۔ تیرہ صفحات۔ (دوسری قسط)

(۵۷) جون---اسلام اور تصوف۔آٹھ صفحات۔

(۵۸) دسمبر---خطبات اقبال کا توضیحی تجزیہ۔بارہ صفحات۔

''قرآن میں رمز واشارہ'' کی صرف دو قسطیں شائع ہوئی ہیں۔ یہ ان کا ایک مقالہ ہے جو انھوں نے ۵ جنوری ۱۹۶۲ کو فلسفہ کانگرس کے سالانہ اجلاس منعقدہ راجشاہی میں پڑھا تھا۔

۱۹۶۳

(۵۹) جنوری---تاثرات۔تین صفحے۔

(۶۰) فروری---تاثرات۔چار صفحات۔

(۶۱) مارچ---تاثرات۔چار صفحات۔

(۶۲) اپریل---تاثرات۔تین صفحات۔

(۶۳) مئی---تاثرات۔چار صفحات۔

(۶۴) جون---تاثرات۔چار صفحات۔

(۶۵) جولائی---تاثرات۔چار صفحات۔

(۶۶) اگست---تاثرات۔تین صفحات۔

(۶۷) اکتوبر---تاثرات۔چار صفحات۔

(۶۸) دسمبر---تاثرات۔چار صفحات۔

۱۹۶۳ء کے ''ثقافت'' میں ''اہل منطق کی واماندگیاں'' کے عنوان سے قسط وار مضامین بھی ہیں' جو بعد کو ان کی کتاب ''عقلیات ابن تیمیہ'' میں شائع ہوئے' وہ اس فہرست میں شامل نہیں کیے گئے۔اسی طرح ''مسئلہ خلق قرآن ابن تیمیہ کے نقطہ نظر سے'' ان کا ایک اہم مضمون ہے' وہ بھی فہرست مضامین سے خارج کر دیا گیا ہے' اس لیے کہ وہ بھی عقلیات ابن تیمیہ میں معرض اشاعت میں آ گیا ہے۔

۱۹۶۴

(۶۹) فروری---تاثرات۔چار صفحات۔

مولانا کی عادت تھی کہ وہ بعض مضامین قسط وار لکھنا شروع کر دیتے تھے' لیکن اس کا تسلسل قائم نہیں رکھ پاتے تھے۔ مضمون کے آخر میں ''باقی آئندہ'' لکھ دیا' لیکن اس کا بقیہ حصہ شائع ہوا تین مہینے کے بعد۔! کئی بہترین علمی مضامین وہ مکمل ہی نہیں کر پائے۔ ہم اس کی تکمیل کا تقاضا کرتے رہے' وہ اس کے لیے تیار بھی ہوئے اور چند سطریں لکھ بھی لیں' لیکن معاملہ ختم۔ بس ''اب لکھوں گا' اب لکھوں گا'' کہتے رہے اور لکھ نہ پائے۔

تاثرات میں بھی ان کا انداز یہ تھا کہ بعض دفعہ کوئی ایسی اہم بحث ہوتی جس کی تفصیل میں جانا ان کے نزدیک ضروری ہوتا تو اسے قسطوں میں بانٹ دیتے۔ چنانچہ ''ثقافت'' ۱۹۶۳ء کے متعدد شماروں کے تاثرات کا عنوان ''احیائے اسلام کے فکری و عملی تقاضے'' ہے اور وہ قسط وار شائع ہوا ہے' اپنی نوعیت کا یہ نہایت عمدہ مضمون ہے۔

(۷۰) اپریل --- تاثرات۔ چار صفحات۔ احیائے اسلام کے فکری و عملی تقاضے۔
(قسط نمبر ۹) تاثرات میں پھیلا ہوا یہ مضمون ختم۔

۱۹۶۵

۱۹۶۵ کے ''ثقافت'' کے جنوری سے اگست تک کے شمارے دفتر میں موجود ہیں' ان میں مولانا کے وہی مضامین درج ہیں جو بعد میں ان کی کتاب ''عقلیات ابن تیمیہ'' میں شائع ہوئے۔ ستمبر' اکتوبر' نومبر اور دسمبر کے شمارے' افسوس ہے مل نہیں سکے' اس لیے نہیں کہا جا سکتا کہ ان میں سے کسی شمارے میں مولانا کا کوئی ایسا مضمون ہے جو ان کی کسی کتاب میں شائع نہیں ہوا۔

۱۹۶۶

جنوری تا اپریل (چار مہینوں) کا مشترکہ شمارہ ہے۔ اس میں مولانا کا ایک مضمون ''شیعہ فرقے --- نوعیت اختلاف'' کی دوسری قسط شائع ہوئی ہے' پہلی قسط غالباً نومبر یا دسمبر ۱۹۶۵ء کے شمارے میں چھپی ہوگی' لیکن وہ شمارے دفتر میں موجود نہیں ہیں۔ یہ مضمون ''عقلیات ابن تیمیہ'' کا حصہ ہے --- ۱۹۶۶ کے مئی' ستمبر اور اکتوبر کے شمارے دفتر میں نہیں ہیں۔

۱۹۶۷

(۷۱) اگست---ابوالحسن اشعری۔اٹھارہ صفحات۔

(۷۲) ستمبر---دیہاتی زندگی کے ارتقا میں علما اور ائمہ مساجد کا کردار۔سات صفحات

۱۹۶۸

جنوری ۱۹۶۸ میں ادارہ ثقافت اسلامیہ کے ڈائریکٹر شیخ محمد اکرام تھے۔انھوں نے "ثقافت" کے بجائے "المعارف" کا نیا ڈیکلریشن حاصل کر لیا تھا اور پھر یہ رسالہ اسی نام سے شائع ہونے لگا تھا۔"المعارف" جنوری' فروری ۱۹۶۸ کا مشترکہ شمارہ تھا۔اس وقت قیام پاکستان پر بیس سال گزر چکے تھے اور یہ شمارہ اس سلسلے کے بعض اہم مضامین پر مشتمل تھا۔اس شمارے میں مولانا کا جو مضمون شائع ہوا' اس کا عنوان تھا "ادارہ ثقافت اسلامیہ"۔یہ مضمون گیارہ صفحات پر محتوی ہے' جس میں ادارے کے قیام سے لے کر ۱۹۶۷ کے آخر تک اس کی علمی و تصنیفی خدمات کا جائزہ لیا گیا ہے۔

(۷۳) اپریل---تنقید و تبصرہ میں' پروفیسر محمد ایوب قادری کی تصنیف "مولانا محمد احسن نانوتوی" پر تبصرہ---ایک صفحہ۔

(۷۴) جون---سائنس اور فلسفے کی ترقی میں قرآن حکیم کا حصہ۔پندرہ صفحات۔

(۷۵) ستمبر' اکتوبر (مشترکہ شمارہ خاص نمبر) ۱۹۵۸ کا انقلاب اور اس کے فکری پہلو ---سات صفحات۔

۱۹۶۹

(۷۶) اکتوبر---ذرے کے بارے میں مسلمان مفکرین کی آراء۔چھ صفحات۔

۱۹۷۳

(۷۷) فروری' مارچ---تاثرات۔(شیخ محمد اکرام کی وفات پر) چار صفحے۔

(۷۸) اپریل' مئی---آنحضرتؐ کے پیغام و دعوت کی اہم خصوصیت۔آٹھ صفحے۔

(۷۹) اکتوبر---ایک آیت کی تفسیر۔پانچ صفحے۔

(۸۰) دسمبر---ایک آیت کی تفسیر۔چھ صفحے۔

۱۹۷۴

(۸۱) جنوری---ایک آیت کی تفسیر۔چار صفحے۔

(۸۲) اپریل---ایک آیت کی تفسیر۔تین صفحے۔

(۸۳) جولائی---ایک آیت کی تفسیر۔چار صفحے۔

(۸۴) اگست---ایک آیت کی تفسیر۔چار صفحے۔

(۸۵) ستمبر---ایک آیت کی تفسیر۔چار صفحے۔

(۸۶) اکتوبر---ایک آیت کی تفسیر۔چار صفحے۔

۱۹۷۵

(۸۸) جنوری---ایک آیت کی تفسیر۔تین صفحے۔

(۸۹) جون---ایک آیت کی تفسیر۔دو صفحے۔

(۹۰) جولائی---ایک آیت کی تفسیر۔تین صفحے۔

(۹۱) اگست، ستمبر (مشترکہ شمارہ) ایک آیت کی تفسیر۔تین صفحے۔

(۹۲) نومبر---ایک آیت کی تفسیر۔تین صفحے۔

(۹۳) دسمبر---تاثرات۔تین صفحے (دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے بارے میں)

۱۹۷۶

(۹۴) جنوری---ایک آیت کی تفسیر۔چار صفحات۔

(۹۵) فروری---تاثرات۔تین صفحے۔(ندوۃ العلما اور نصاب تعلیم کے بارے میں)

(۹۶) مئی---تاثرات۔تین صفحے۔(درس نظامی میں اصلاح کے سلسلے میں۔پہلی قسط)

(۹۷) جون---تاثرات۔تین صفحے۔(درس نظامی میں اصلاح کے سلسلے میں۔دوسری قسط)

۱۹۸۰

(۹۸) ستمبر---دینی اور لادینی علوم۔آٹھ صفحات۔

۱۹۸۱

(۹۹) جولائی ---اسلام کی عمرانی اساس۔آٹھ صفحات۔

۱۹۸۲

(۱۰۰) اگست ---مسئلہ رجم اور عقل و تعقل کے پیمانے۔گیارہ صفحات۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ قرآن میں چوں کہ زانی کی سزا رجم نہیں بیان کی گئی' جلدہ یعنی کوڑے بیان کی گئی ہے' اس لیے یہی سزا دینی چاہیے۔مولانا نے اس مضمون میں وضاحت کی ہے کہ حدیث رسول اللہ ﷺ میں غیر شادی شدہ زانی کی سزا کوڑے اور شادی شدہ کی رجم بتائی گئی ہے اور امت کا تعامل بھی یہی ہے' اس لیے وہی سزا دی جائے گی جو رسول اللہ ﷺ سے مروی اور تعامل امت سے ثابت ہے۔قرآن میں رجم کا ذکر اس لیے نہیں کیا گیا کہ اس جرم کی سزا کے لیے عربوں میں پہلے سے اس کا رواج تھا' کوڑوں کی سزا سے وہ آشنا نہیں تھے' لہٰذا اس کا ذکر فرما دیا گیا۔

۱۹۸۳

(۱۰۱) مارچ ---خلیفہ عبدالحکیم کی یاد میں۔سات صفحات۔

۱۹۸۴

(۱۰۲) جولائی ---اسلامی فلسفے کی فکر نو۔چھ صفحات۔

(۱۰۳) نومبر' دسمبر ۱۹۸۴ء' (خصوصی شمارہ) علامہ ابن حزم اندلسی کا ایک مکتوب' شارع نجات کے بارے میں۔بارہ صفحات۔(یہ ابن حزم کے ایک مکتوب کا اردو ترجمہ ہے)

۱۹۸۵

(۱۰۴) اپریل' مئی ---خصوصی شمارہ ۲۔معجزات قرآنی علوم جدیدہ کی روشنی میں--- چودہ صفحات۔

مولانا کے یہ مضامین جو ثقافت اور المعارف میں شائع ہوئے' نہایت علمی اور تحقیقی نوعیت کے ہیں۔تاثرات بھی جو دونوں رسالوں کے بہت سے شماروں میں چھپے نہایت عمدہ اور لائق مطالعہ ہیں۔تاثرات میں بعض کا تعلق لا کمیشن' عائلی کمیشن' تعلیمی کمیشن اور

دیگر اہم مسائل سے ہے اور بعض وفیات سے متعلق ہیں۔ مثلاً مولانا محمد ابراہیم سیالکوٹی' مولانا محمد علی قصوری ایم' اے کینٹب' خواجہ حسن نظامی' شیخ عبدالقادر' آغا خاں' مولانا ابوالکلام آزاد اور سردار عبدالرب نشتر کی وفات پر۔

(۱۰۵) آزادی سے قبل عبداللہ بٹ نے مولانا ابوالکلام آزاد کے بارے میں ایک کتاب شائع کی تھی' اس میں مولانا ابوالکلام کی تفسیر ترجمان القرآن پر مولانا محمد حنیف ندوی کا ایک مضمون شائع ہوا تھا۔

(۱۰۶) قرآن سے مظہر نبوت کی تشریح۔ نقوش رسول نمبر جلد اوّل۔ ۱۹۸۲

(۱۰۷) آنحضرت کا اسلوب دعوت وارشاد--- نقوش رسول نمبر جلد چہارم۔ جنوری ۱۹۸۳ء

شیخ محمد بن عبدالوہاب کی تصنیفات میں سے ایک کتاب کا نام "کتاب التوحید" ہے جو اہل علم میں مشہور اور متداول کتاب ہے۔ بعض حضرات نے عربی میں اس کی شرحیں لکھی ہیں جو کئی دفعہ چھپ چکی ہیں اور دست یاب ہیں۔ ان میں ایک شرح کا نام "فتح المجید" ہے جو شیخ محمد بن عبدالوہاب کے پوتے شیخ عبدالرحمٰن کے رشحات قلم کا نتیجہ ہے۔ ۱۹۶۸ء میں اس کا اردو ترجمہ مولانا عطاء اللہ ثاقب نے مکہ مکرمہ میں کیا تھا۔ وہ اسے سعودی حکومت کے خرچ پر چھاپنا چاہتے تھے' شاہ فیصل مرحوم نے اس کی منظوری دے دی تھی اور مولانا عطاللہ ثاقب کو ایک خط بھی لکھا تھا کہ وہ یہ کتاب شائع کریں۔

چھاپنے سے پہلے ثاقب صاحب کی خواہش تھی کہ میں ان کے ترجمے پر نظر ثانی کروں' چنانچہ ۱۹۷۰ء میں یہ ترجمہ میں نے پورے غور سے دیکھا اور اصل کتاب سے اس کا مقابلہ کیا۔ اس پر میں نے چند صفحات لکھے بھی جو ترجمے کے آغاز میں چھپ چکے ہیں۔ میرے کہنے سے ثاقب صاحب نے یہ ترجمہ مولانا محمد حنیف ندوی کو دکھایا' انھوں نے اس کا پہلا نصف حصہ دیکھا اور کتاب اور اس کے مصنف پر عربی میں تقریظ لکھی۔ ثاقب صاحب نے بتایا کہ عرب اردو ترجمہ تو پڑھ نہیں سکتے تھے' لیکن مولانا کی عربی میں لکھی ہوئی تقریظ بہت سے عرب اہل علم نے پڑھی اور اس کی بے حد تحسین کی۔

مولانا عربی میں بہت کم لکھتے تھے' لیکن جو لکھتے تھے اور جس موضوع پر لکھتے تھے' خوب لکھتے تھے۔ایک مرتبہ ادارہ ثقافت اسلامیہ میں الجزائر کے اہل علم کا ایک وفد آیا' مولانا نے ادارے کی طرف سے ارکانِ وفد کو عربی میں سپاس نامہ پیش کیا' معزز مہمان اس سے انتہائی خوش ہوئے اور مولانا کو ان کی ادبیت کی داد دی۔

ان مضامین و مقالات کے علاوہ مولانا کے اور بھی بہت سے مضامین ہیں' لیکن ان کے عنوانات و موضوعات کا اس وقت تک پتا نہیں چل سکتا' جب تک کہ وہ رسالے جن میں وہ چھپے ہیں' سامنے نہیں آ جاتے۔متعدد مضامین ماہنامہ ''حقیقت اسلام'' میں شائع ہوئے' جو آزادیٔ برصغیر سے قبل پیکولمیٹڈ (لاہور) کا رسالہ تھا۔یہ ایک علمی مجلّہ تھا۔

اس وقت ماہنامہ ''حقیقت اسلام'' (لاہور) کے اکتوبر ۱۹۳۶ء سے اگست ۱۹۳۷ء تک کے گیارہ شمارے پیش نگاہ ہیں جو عزیز دوست شبیر احمد خاں میواتی کی وساطت سے ملے۔اس کے حسب ذیل شماروں میں مولانا حنیف ندوی کے مضامین موجود ہیں۔

(۱) اکتوبر ۱۹۳۶ء (رجب ۱۳۵۵ھ): اس میں مولانا کے دو مضمون درج ہیں' ایک کا عنوان ہے ''اچھوتوں اور مسلمانوں کے لیے ایک لمحہ فکریہ''۔یہ مضمون دس صفحات پر مشتمل ہے۔

دوسرے کا عنوان ہے: ''فلسفہ زکوٰۃ''---یہ بارہ صفحات پر محتوی ہے۔

(۲) نومبر ۱۹۳۶ء (شعبان ۱۳۵۵ھ): اس میں ان کے دو مضمون ہیں۔ایک ہے ''احساس فرض'' تین صفحات۔

دوسرا ''پروازِ خیال۔'' صرف ایک صفحہ۔

(۳) دسمبر ۱۹۳۶ء (رمضان المبارک ۱۳۵۵ھ): اس میں ان کا مضمون ہے: ''اسلام میزان عقل و فلسفہ میں''---آٹھ صفحات۔

(۴) جنوری ۱۹۳۷ء (شوال ۱۳۵۵ھ): ''اسلام میزان عقل و فلسفہ میں''---کی دوسری قسط۔صفحات پانچ---مضمون کے آخر میں بریکٹ میں باقی باقی لکھا ہے' جس کا

مطلب ہے کہ سلسلہ مضمون کی اگلی قسط آئندہ شمارے میں آئے گی' لیکن اگست ۱۹۳۷ء تک کے شمارے میرے سامنے ہیں' ان میں سے کسی شمارے میں اس مضمون کے باقی حصے کا سراغ نہیں ملتا۔

(۵) مارچ ۱۹۳۷ء (ذوالحجہ ۱۳۵۵ھ): اس میں ایک مضمون ہے' جس کا عنوان ہے: ''نماز پر ایک خطبہ''---صفحات نو۔

(۶) مئی ۱۹۳۷ء (صفر ۱۳۵۶ھ)! ''نماز پر دوسرا خطبہ''---صفحات پانچ۔

(۷) اگست ۱۹۳۷ء (جمادی الاولیٰ ۱۳۵۶ھ): اس میں صرف دو صفحے کا ایک مضمون ہے جس کا عنوان ہے: ''ایک مکالمہ''---

یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ ''حقیقت اسلام'' کس سال جاری ہوا اور کب تک جاری رہا اور اس کے کن کن شماروں میں کن کن عنوانات پر مولانا کے مضامین معرض اشاعت میں آئے۔

''حقیقت اسلام'' پیکو لمیٹڈ (بیرون موچی دروازہ لاہور) کا رسالہ تھا اور اس کے مدیر مسئول ماسٹر محمد احسان تھے۔ میں نے ان کو دیکھا ہے۔ قد قدرے چھوٹا تھا اور وضع قطع کے اعتبار سے متشرع بزرگ تھے۔

مولانا سے اس رسالے کے بارے میں میری بات ہوئی تو انھیں یہ تو یاد تھا کہ پیکو لمیٹڈ کے ایک ماہانہ رسالے میں وہ لکھتے رہے ہیں' لیکن اس کا نام انھیں یاد نہیں رہا تھا۔ میں نے ایک دن ''حقیقت اسلام'' کہا تو بولے: ہاں۔! یہی نام تھا۔

اس کا کوئی شمارہ ان کے پاس نہیں تھا اور انھیں یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ کہاں سے اس رسالے کے دست یاب ہونے کی توقع ہو سکتی ہے۔

ہفت روزہ ''آفاق'' مضامین کے اعتبار سے ایک علمی اخبار تھا جو پروفیسر محمد سرور جامعی کی ادارت میں لاہور سے شائع ہوتا تھا۔ اس کا ۵ مئی ۱۹۴۹ء کا شمارہ اس وقت پیش نگاہ ہے' اس میں ''اسلام اور جمہوریت'' کے عنوان سے مولانا کا مضمون ایڈیٹر کے تعریفی نوٹ کے ساتھ اشاعت پذیر ہوا ہے۔ سرور صاحب سے مولانا کے بہت اچھے تعلقات

تھے، ممکن ہے ''آفاق'' میں مولانا کے اور مضامین بھی شائع ہوئے ہوں۔ لیکن ان کا ملنا مشکل ہے۔

آفاق کا عملہ ادارت اس زمانے میں تین ارکان پر مشتمل تھا' وہ تھے پروفیسر محمد سرور جامعی' میاں محمد شفیع (م ش) اور چوہدری علی محمد خادم۔!

سرور صاحب کے مولانا سے نہ صرف یہ کہ دوستانہ تعلقات تھے' بلکہ وہ مولانا کے عقیدت مند بھی تھے اور انتہائی احترام کے الفاظ میں ان کا ذکر کیا کرتے تھے' سرور صاحب مرحوم عربی کے عالم' انگریزی کے رمز شناس' اردو کے مصنف و مترجم اور فارسی سے آشنا تھے۔ مولانا ندوی کے علاوہ دیگر علمائے کرام سے بھی ان کے بہت اچھے روابط تھے۔

میاں محمد شفیع بھی اس دور کے علما سے نہایت ادب و تکریم سے پیش آتے تھے اور ان کی مجلسوں میں ان کی آمدورفت رہتی تھی۔ مولانا حنیف ندوی سے بھی ان کے تعلقات تھے۔

اسی طرح چوہدری علی محمد خادم پرانے مسلم لیگی تھے اور تحریک پاکستان کے سلسلے میں انھوں نے بڑی جدوجہد کی تھی۔

قیام پاکستان کے بعد مسلمانوں کی اس جدید نظریاتی مملکت میں بہت سے نئے مسائل ابھر آئے تھے۔ مثلاً

اسلامی ریاست کے کیا خط و خال ہیں؟ اسلام کا معاشی نظام کیا ہے؟ جمہوریت کا کون سا انداز اسلام سے ہم آہنگ ہے؟ اسلامی ریاست میں اقلیتوں کے کیا حقوق ہیں؟

یہ اور اس قسم کے بہت سے سوالات تھے' جن پر بعض مضامین میں مولانا نے اظہارِ خیال کیا تھا اور یہ مضامین ''آفاق'' وغیرہ میں شائع ہوئے ہوں گے' لیکن افسوس ہے' ''آفاق'' اور اس دور کے رسائل و جرائد ہمیں مل نہیں سکے۔

ماہنامہ ''اسلامی زندگی'' جس کے قیام پاکستان کے بعد بھی چند شمارے معرضِ اشاعت میں آئے' شرکت علمی لمیٹڈ (لاہور) کا رسالہ تھا اور اسے ملک کی اہم شخصیتوں

کے تحقیقی مضامین کے قلب نواز مجموعے کی حیثیت حاصل تھی۔ مولانا کچھ عرصہ اسے ایڈٹ کرتے رہے۔ یہ رسالہ بھی دست یاب نہیں‘ اس میں ان کے کئی مضامین شائع ہوئے۔ حضرت مولانا محمد اسماعیل سلفی کے بھی چند مضامین اس میں چھپے تھے۔

ہفت روزہ ’’مسلمان‘‘ سوہدرہ (ضلع گوجرانوالہ) سے شائع ہوتا تھا۔ کچھ عرصہ اس میں بھی مولانا نے کام کیا اور اس میں ان کے مضامین چھپے۔ اس ہفت روزے کے مالک و مدیر مشہور اہل حدیث عالم مولانا عبدالمجید سوہدروی تھے۔ اس کی مکمل فائل یقیناً مولانا عبدالمجید کے صاحب زادوں کے پاس سوہدرہ میں ہوگی‘ اس سے مولانا کے مضامین کا پتا چل سکتا ہے۔ جامعہ سلفیہ کی لائبریری کے لائبریرین جناب اشرف جاوید نے ایک مرتبہ بتایا تھا کہ ہفت روزہ ’’مسلمان‘‘ کے شمارے جامعہ سلفیہ (فیصل آباد) کی لائبریری میں موجود ہیں۔ افسوس ہے میں وہ شمارے دیکھ نہیں سکا۔

آزادی سے چند مہینے پہلے (غالباً جون 1947ء میں) گوجرانوالہ کی انجمن اہل حدیث نے مولانا کی ادارت میں ’’الاخوان‘‘ کے نام سے ایک ہفت روزہ جاری کیا تھا‘ جس کا ایک ہی شمارہ چھپا تھا جو پہلا بھی تھا اور آخری بھی۔ وہ ہفت روزہ اب کہیں سے نہیں مل سکے گا۔ اس میں مولانا کا اداریہ بھی ہوگا‘ جس میں اخبار کی پالیسی کی وضاحت کی ہوگی اور آئندہ کام کرنے کا جو منصوبہ بنایا گیا تھا‘ اس کی تفصیل بھی بتائی ہوگی‘ اداریے کے علاوہ ایک یا دو مضمون بھی لکھے ہوں گے‘ لیکن اب ’’الاخوان‘‘ بالکل نایاب ہے۔

ممکن ہے ان رسائل و جرائد کے علاوہ بھی ان کے مضامین کہیں چھپے ہوں‘ لیکن اس کے متعلق پورے معلومات حاصل کرنا بظاہر مشکل معلوم ہوتا ہے‘ اس لیے کہ وہ اپنے مضامین کا ریکارڈ رکھنے اور اپنی مطبوعہ چیزوں کی حفاظت کرنے کے عادی نہ تھے۔ ان کی کوئی تحریر کہاں چھپی۔؟ کب چھپی اور کس موضوع سے متعلق چھپی؟ اس کا انھیں کوئی علم نہ تھا۔ وہ عام طور سے مجھ سے پوچھا کرتے تھے کہ فلاں موضوع پر اگر ان کی کوئی چیز چھپی ہے تو بتایئے کہاں ہے اور کب چھپی ہے۔؟

عربی زبان میں بھی مولانا کام کرنا چاہتے تھے‘ اس کا ذکر انھوں نے کئی دفعہ کیا‘ ان

کی خواہش خطبات اقبال کو عربی کے قالب میں ڈھالنے اور اس پر مبسوط مقدمہ لکھنے کی تھی' افسوس ہے' جس طرح ان کی اور بہت سی تصنیفی و علمی خواہشیں پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکیں' اسی طرح یہ خواہش بھی پوری نہ ہو سکی۔ انسان زندگی میں کتنی ہی خواہشیں دل میں دبائے رکھتا ہے اور کتنی ہی خواہشیں ایسی ہیں جن کا بسا اوقات اظہار بھی کر دیتا ہے' مگر ضروری نہیں کہ ہر خواہش پوری ہو اور حالات اسی طرح کروٹ بدلتے رہیں' جس طرح وہ چاہتا ہے۔ تمام معاملات اللہ کے ہاتھ میں ہیں' وہ جس طرح چاہے کرتا ہے۔ ان اللہ علی کل شیء قدیر۔

مولانا خالص پنجابی تھے' لیکن عام طور سے بات چیت اردو میں کرتے تھے۔ گھر میں زیادہ تر پنجابی چلتی تھی اور پنجابی زبان سے انھیں پیار بھی تھا۔ میرے ساتھ اردو بولتے تو میں بعض اوقات پنجابی میں جواب دیتا۔ اس کے بعد وہ بھی پنجابی بولنا شروع کر دیتے۔ اپنی بیماری کے دنوں میں وہ اکثر رات کو مجھے گھر سے ٹیلی فون کرتے' بات شروع کرتے تو میں فوراً پنجابی میں عرض کرتا ''جناب پنجابی چ گل کرو۔'' (پنجاب میں بات کریں) وہ مسکراتے ہوئے پیار سے جواب دیتے ''لو پنجابی چ گل کر لینے آں۔'' (لیجیے پنجابی میں بات کر لیتے ہیں) پھر تمام گفتگو پنجابی میں ہوتی۔

پنجابی لوک گیت اور محاورے بڑے شوق سے سنتے اور ان میں جو صداقت پنہاں ہے اور جو حکمت بیان کی گئی ہے' اردو میں اس کی دلنشیں انداز میں تشریح کرتے۔ یہ واقعہ ہے کہ جو تشبیہات پنجابی میں بیان کی گئی ہیں اور اس کے لیے جو اسلوب اختیار کیا گیا ہے' وہ نہایت دلچسپ ہے۔

ادارہ ثقافت اسلامیہ کے دفتر میں مولانا کا کمرہ نیچے کی منزل میں تھا۔ میرا معمول تھا کہ میں دفتر آ کر سب سے پہلے مولانا سے ملتا' انھیں سلام کرتا' ان کے ساتھ چائے پیتا اور پھر اوپر اپنے کمرے میں جاتا۔ آدھ پون گھنٹے کی اس نشست میں سیاسی باتیں بھی ہوتیں' ان پر بحث بھی ہوتی' جس میں بعض اوقات ہم میں ہم آہنگی نہیں پائی جاتی تھی اور وہ مجھ سے کہا کرتے تھے کہ آپ بات سمجھتے ہی نہیں' نہ سمجھنا چاہتے ہیں' آپ

مسئلے کی تہ تک کیسے پہنچیں گے۔ علاوہ ازیں بعض ادبی پہلوؤں پر بھی گفتگو ہوتی، لطیفے بازی کا سلسلہ بھی چلتا اور پنجابی لوک گیتوں اور محاوروں کی تشبیہات بھی زیر بحث آتیں۔ ایک دن میں نے ان کو ایک لوک گیت سنایا، جس میں دوپٹے کو پیاز کے چھلکے جیسا باریک بتایا گیا ہے۔

چنی لے کے گنڈے دے پت ورگی
روٹی لے کے دیور دی چلی

اس میں پنجاب کے سماجی کلچر کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ بھابی کھیت میں دیور کی روٹی لے کر اس حالت میں چلی ہے کہ اس نے پیاز کے چھلکے جیسا باریک دوپٹہ سر پر لیا ہوا ہے۔

یہ لوک گیت سن کر مولانا بڑے محظوظ ہوئے اور الفاظ و معانی کے اعتبار سے پنجابی زبان کو بڑی وسیع زبان قرار دیا۔

اس طرح کے لوک گیت یا پنجابی بولیاں وہ بے حد شوق سے سنتے اور بعض دفعہ اردو میں خوب صورت انداز میں ان کی وضاحت کرتے۔

بعض پنجابی شاعروں کی وہ بہت تعریف کرتے اور ان کو اپنے فن کے ماہر قرار دیتے تھے۔ ہیر وارث شاہ کو ان کے نزدیک پنجابی ادب کے شاہکار کی حیثیت حاصل تھی۔ اس کے اشعار وہ شوق سے سنتے تھے۔ بعض اوقات اپنے انداز خاص میں ان کی تشریح بھی کرتے۔

اپنے عہد کے متعدد فحول علما سے مولانا کے مراسم رہے تھے اور ان کی صحبتوں میں بیٹھنے کے انھیں بے شمار مواقع میسر آئے تھے۔ ان کے بعض واقعات وہ مزے لے لے کر سنایا کرتے تھے۔ انھوں نے بتایا کہ ایک مرتبہ مولانا عبدالعزیز میمنی اور عربی کے ایک بہت بڑے عالم (غالباً پروفیسر عبدالواجد کانپوری کا نام لیا تھا) کے درمیان کافیہ ابن حاجب کے کسی نحوی مسئلے کے متعلق ایک ماہانہ رسالے میں بحث شروع ہو گئی۔ دونوں عربی ادب و لغت کے ماہر تھے اور ان کی معلومات کا دائرہ بے حد وسیع تھا۔ جس رسالے

میں یہ بحث چلی تھی' اس کا نام بھی انھوں نے بتایا تھا' افسوس ہے نام اب ذہن میں نہیں رہا۔ کئی مہینے سلسلۂ بحث جاری رہا اور اس موضوع سے تعلق رکھنے والے لوگوں کے علم میں اس سے بڑا اضافہ ہوا۔ بقول ان کے یہ بحث خالص فنی تھی اور بڑی دلچسپ۔ نحو کے کئی مشکل عقدے اس سے وا ہوئے۔ انھوں نے فرمایا کہ اس میں مولانا عبدالعزیز میمنی کا موقف صحیح تھا۔

مولانا نے بتایا انہی دنوں وہ علی گڑھ گئے اور مختلف دوستوں سے ملے۔ ایک دن مولانا میمنی کے ہاں جانے کا پروگرام بنایا تو ایک دوست نے کہا' آپ چائے یہیں سے پی جائیے' میمنی صاحب آپ کو چائے پانی کا بالکل نہیں پوچھیں گے۔ مشہور تھا کہ ملاقات کے لیے آنے والوں کو وہ چائے وغیرہ پیش نہیں کرتے تھے۔ مولانا نے فرمایا: میں نے ان دوست سے کہا مجھے وہ ضرور چائے پلائیں گے۔

تھوڑی دیر بعد وہ میمنی صاحب کے مکان پر پہنچے اور ان سے ملے۔ وہ نہایت گرم جوشی سے پیش آئے اور ان کی آمد پر اظہارِ مسرت کیا۔ مولانا نے ان سے کہا: صرف آپ کو مبارک باد دینے آیا ہوں کہ آپ نے نہایت علمی اور فنی بحث شروع کی ہے اور اس میں آپ کا نقطۂ نظر مبنی بر صحت ہے۔ دلائل نہایت مضبوط ہیں اور اس موضوع سے دلچسپی رکھنے والے اس سے مستفید ہو رہے ہیں۔ ایسے باریک نحوی نکات اس میں آ گئے ہیں' جن کا بہت سے اہل علم کو پتا نہ تھا۔ اساتذہ وطلبا بالخصوص اس سے استفادہ کر رہے ہیں اور ان کی معلومات میں بے حد اضافہ ہوا ہے۔

یہ الفاظ سن کر مولانا میمنی انتہائی خوش ہوئے اور تھوڑی دیر بعد چائے آ گئی اور کھانے کی بہت سی چیزیں دسترخوان پر رکھ دی گئیں۔ پھر فن نحو کے وہ مختلف مسائل بھی بیان ہونے لگے' جن کا کافیہ کے زیرِ بحث مسئلے سے تعلق تھا۔

آزادئ وطن سے کئی سال پہلے کی بات ہے کہ بعض مسائل کی تعبیر وتشریح کے سلسلے میں مولانا ثناء اللہ امرتسری اور مولانا حافظ عبداللہ روپڑی کے درمیان اختلاف پیدا ہو گیا تھا جو طویل عرصے تک جاری رہا تھا اور اس کے اثرات اب بھی کسی حد تک باقی ہیں۔ یہ

دونوں بزرگ مسلک اہل حدیث کے جلیل القدر عالم تھے۔ کسی نتیجے پر پہنچنے اور اختلاف ختم کرانے کے بارے میں جماعت اہل حدیث کے اہل علم کئی دفعہ مختلف مقامات پر جمع ہوئے مگر معاملہ حل نہ ہوا۔ یہ اختلاف ''ثنائی روپڑی نزاع'' کے نام سے معروف تھا۔ گفتگو کی ہر مجلس میں مولانا محمد حنیف ندوی کو شامل کیا جاتا تھا۔

جماعت اہل حدیث کے ایک جلیل القدر عالم مولانا محمد سورتی تھے اور عربی ادب و لغت، صرف و نحو، حدیث و فقہ، اخبار و انساب اور رجال و رواۃ پر عبور و استحضار میں درجۂ امامت پر فائز تھے اور ان علوم و فنون کے تمام گوشوں پر انھیں مجتہدانہ بصیرت حاصل تھی۔ مولانا حنیف ندوی نے بتایا کہ ثنائی روپڑی نزاع ختم کرانے کی غرض سے ایک مرتبہ مولانا سورتی کی طرف رجوع کیا گیا۔ فریقین سے بات چیت شروع کرنے سے پہلے مولانا سورتی نے فرمایا کہ حنیف ندوی بھی ان کے ساتھ بیٹھیں گے اور اس معاملے میں ان کی مدد کریں گے۔ جب گفتگو ہونے لگی اور متنازعہ مسائل کی تفصیلات میں پہنچے تو مولانا حافظ عبداللہ روپڑی نے اپنا موقف بیان کیا اور تائید میں بعض مشہور اور مستند متقدمین ماہرین لغت و ادب کے حوالے دیے۔ مولانا سورتی نہایت وسیع المطالعہ اور عمیق النظر عالم تھے اور بہت سے فنون کی ضخیم کتابیں ان کے حافظے کی گرفت میں تھیں۔ حضرت حافظ صاحب نے جن ماہرین لغت کے حوالے دیے تھے، مولانا سورتی نے ان پر تنقید کرنا شروع کر دی اور جہاں جہاں انھوں نے ٹھوکر کھائی تھی، ایک ایک کر کے ان کی نشان دہی کی اور ایسے ایسے ادبی و لغوی نکات بیان کیے کہ کسی کو ان کے سامنے بولنا مشکل ہو گیا۔

۷۔ اگست ۱۹۴۲ء کو جمعۃ المبارک کے دن مولانا سورتی نے وفات پائی۔

خدمت خلق کے اداروں اور ان افراد کی جنھوں نے لوگوں کی خدمت کو اپنا معمول بنا رکھا ہے اور عوام کی رفاہ و بہبود میں جن کا وقت صرف ہوتا ہے، مولانا ندوی کے دل میں ان کی بڑی قدر تھی۔ کوئی تیس پینتیس برس پہلے کی بات ہے، لاہور کی سڑکوں پر ایک عیسائی خاتون گھومتی ہوئی دکھائی دیتی تھی۔ وہ سانولے سے رنگ کی دیسی عیسائن تھی جو

ساٹھ پینسٹھ کے پیٹے میں ہوگی' اپنی کار وہ خود چلاتی تھی اور بھاری بھر کم جسم کی تھی' جس طرح وہ خود پرانی تھی' اسی طرح اونچی چھت کی اور کالے رنگ کی اس کی موٹر کار بھی بہت پرانی تھی' جسے دیکھ کر کچھ ایسا اندازہ ہوتا تھا کہ کارسازی کے کارخانے سے جو پہلی کار تیار ہو کر نکلی تھی' وہ شاید یہی ہوگی۔ بعض دفعہ دن میں کئی کئی بار اسے مختلف سڑکوں پر کار چلاتے ہوئے دیکھا گیا۔

مولانا نے ایک دن بتایا کہ یہ عورت عیسائیوں کے رفاہی ادارے کی سربراہ ہے اور اپنے کام کی حدود کو وسیع کرنے کی غرض سے یہ ہمیشہ لاہور کے مختلف علاقوں کے چکر لگاتی رہتی ہے۔ انھوں نے مسکراتے ہوئے کہا کہ ہماری عورتیں جب اس عمر کو پہنچ جاتی ہیں تو بہوؤں کے لیے مصیبت بن جاتی ہیں اور کسی نہ کسی بات پر انھیں پریشان کرتی رہتی ہیں' لیکن اس عیسائی عورت کو دیکھیے کہ اپنا تمام وقت خدمت خلق میں صرف کرتی ہے اور اسی کو اس نے زندگی کا اصل مقصد قرار دے رکھا ہے۔

مولانا کے بارے میں دو تین باتیں یہاں اور عرض کردوں۔ میرے خیال میں ۱۹۵۰ء کی بات ہے' گوجرانوالا کے ایک صاحب علم نے جن کا نام غالباً چودھری محمد طفیل تھا اور وہ سنٹرل ماڈل ہائی سکول لاہور میں یا کسی اور ہائی سکول میں ہیڈ ماسٹر تھے' مولانا سے سکول کے بچوں کے لیے انھوں نے تین یا چار نصابی کتابیں لکھوائی تھیں۔

چودھری صاحب کی اس زمانے میں مولانا کے پاس کافی آمدورفت تھی اور ان کی آپس کی بات چیت ان کے دیرینہ تعلقات کی نشان دہی کرتی تھی جو بعض اوقات بے تکلفانہ مزاح کی حدود میں پہنچ جاتی تھی۔ مولانا کی تحریر کردہ وہ کتابیں چھپی تھیں۔ اس کا معاوضہ بھی دیا گیا تھا۔ ان کتابوں کو مولانا کی معاشی مجبوری کا نتیجہ کہنا چاہیے۔

یہ اب یاد نہیں رہا کہ کس پبلشر نے یہ کتابیں شائع کی تھیں۔ اتنی بات البتہ یاد ہے کہ یہ کتابیں پسند کی گئی تھیں اور بچوں کے لیے بہت اچھی معلومات پر مشتمل تھیں۔ اسی طرح ایک دفعہ ٹیکسٹ بک پنجاب نے عربی کے نصابی سلسلے کی ایک کتاب مصنفین کے ایک پینل سے لکھوائی تھی جس میں مولانا حنیف ندوی، مولانا مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی

شامل تھے، مولانا کو ہر سال اس سرکاری محکمے کی طرف سے اس کی اچھی خاصی رائیلٹی بذریعہ چیک پیش کی جاتی تھی۔

مولانا کو طب سے بھی دلچسپی تھی۔ انھوں نے علم طب باقاعدہ پڑھا نہیں تھا' لیکن بعض امراض کے بارے میں وہ کافی معلومات رکھتے تھے اور مریض کی نفسیات کا خوب تجزیہ کرتے تھے۔

کہا کرتے تھے کہ معدے' جگر اور تلی وغیرہ کی بیماریوں کا علاج یونانی اطبا سے کرانا چاہیے۔ ایلوپیتھی ڈاکٹروں کا علاج ان امراض کے لیے زیادہ موثر نہیں ہوتا۔

وہ یہ بھی کہا کرتے تھے کہ اگر مرض شدت پکڑ جائے اور تکلیف بڑھ جائے تو اس کے فوری کنٹرول کے لیے ڈاکٹر سے رجوع کرنا چاہیے' اس کے بعد کسی اچھے طبیب سے رابطہ قائم کرنا چاہیے' تاکہ وہ اس طریقے سے علاج کرے کہ مرض کی جڑ کٹ جائے۔

لاہور کے ایک معروف طبیب حکیم عبدالمجید عتیقی تھے۔ وہ نابینا تھے۔ ملکی سیاسیات سے کسی زمانے میں ان کا بہت تعلق رہا تھا۔ بے شمار سیاسی واقعات انھیں یاد تھے اور سیاست دانوں کے بارے میں بے حد معلومات رکھتے تھے۔ کتنے ہی قدیم اردو شعرا کے اشعار ان کے خزانۂ ذہن میں محفوظ تھے جو وہ مزے لے لے کر سنایا کرتے تھے' مولانا کا ان کے ہاں آنا جانا تھا۔

میرے بھی ان سے تعلقات تھے۔ میں بھی مولانا کے ساتھ ان کے ہاں جاتا تھا اور مجھ سے وہ بڑی محبت کا برتاؤ کرتے تھے۔ کسی دور میں مولانا انہی سے علاج کراتے تھے۔

لاہور کے ایک پرانے طبیب حکیم فقیر محمد چشتی تھے۔ میں نے ان کو نہیں دیکھا' سنا ہے آزادی سے پہلے لاہور کے اکثر بڑے بڑے اخبار نویسوں اور مشہور ایڈیٹروں کی ان کے ہاں آمدورفت رہتی تھی۔ وہ بڑے ظریف اور لطیفے باز تھے۔ مولانا کا بھی ان کے ہاں آنا جانا تھا۔ وہ بعض دفعہ ان کے لطیفے بھی سنایا کرتے تھے۔ ایک دن بتایا کہ ان کے پاس علاج کے لیے ایک مغنیہ آئی جو قدرے سیاہ رنگ کی تھی' سردیوں کے دن تھے' اس نے شلوار ذرا اونچی کر کے پنڈلی کو کھجلایا تو اس پر سفید سفید لکیریں ابھر آئیں۔ حکیم صاحب کی ان لکیروں پر

نظر پڑی تو ان کی رگ ظرافت پھڑکی' بولے بی بی یہ سلیٹ پر کیا لکھا ہے۔

ہومیوپیتھی طریق علاج کی اثر انگیزیوں کے بھی مولانا قائل تھے۔کہا کرتے تھے اگر مرض ہومیوپیتھی معالج کی سمجھ میں آ جائے اور دوا مرض سے ہم آہنگ ہو جائے تو یہ بڑا مفید طریق علاج ہے اور سستا بھی ہے۔اس میں ایک فائدہ یہ ہے کہ اسے سیکھنا بہت آسان ہے۔اس کے لیے وہ عام طور پر پرانے اور مشہور صحافی احسان بی اے کے ہاں جایا کرتے تھے جو اس میں کافی درک اور تجربہ رکھتے تھے۔

مولانا اس وقت بھونڈ پورہ (مزنگ) میں رہتے تھے۔احسان بی اے کا مطب ان کے مکان کے قریب تھا۔علاج معالجے کے علاوہ بھی وہ شام کے بعد بعض دفعہ ان کے ہاں تشریف لے جاتے تھے اور باہمی دلچسپی کے موضوع کی باتیں ہوتی تھیں۔دوسرے دن دفتر آ کر بتایا کرتے تھے کہ رات وہ احسان بی اے کے مطب پر گئے اور کچھ دیر تک ان سے گفتگو کا سلسلہ جاری رہا۔

یہاں مولانا کے سلسلۂ سند کے بارے میں بھی سنتے جایے۔انھوں نے اپنے شہر گوجرانوالا میں مولانا محمد اسماعیل سلفی مرحوم سے حصول علم کیا تھا جو استاذ پنجاب حضرت حافظ عبدالمنان وزیر آبادی کے شاگرد تھے اور حافظ صاحب نے علم حدیث حضرت سید میاں نذیر حسین دہلوی سے حاصل کیا تھا۔اس اعتبار سے مولانا حنیف ندوی کا سلسلہ سند صرف ایک واسطے سے حضرت میاں صاحب تک پہنچتا ہے۔یہی معاملہ اس بندۂ عاجز کا ہے۔یہ فقیر ۱۹۴۱ء اور ۱۹۴۲ء میں مولانا محمد اسماعیل صاحب کے حلقۂ درس میں شامل تھا اور ان سے تفسیر بیضاوی' تفسیر جلالین' تفسیر جامع البیان' شرح وقایہ' متنبی' حماسہ' توضیح تلویح' قطبی اور بعض دیگر کتابیں پڑھی تھیں۔

دارالعلوم ندوۃ العلما (لکھنؤ) میں مولانا حنیف ندوی نے جن اساتذہ کے حضور زانوئے شاگردی تہ کیا' ان میں مولانا حیدر حسن ٹونکی اور شمس العلما مولانا حفیظ اللہ کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔مولانا حیدر حسن ٹونکی نے سند حدیث شیخ حسین عرب یمنی سے حاصل کی تھی' اس لحاظ سے مولانا حنیف ندوی اور شیخ حسین یمنی کے درمیان صرف ایک

واسطہ ہے۔

مولانا حفیظ اللہ صاحب کے استاذ مشہور عالم مولانا ابوالحسنات عبدالحی فرنگی محلی تھے' اس طرح مولانا حنیف ندوی کا سلسلہ سند صرف ایک واسطے سے مولانا عبدالحی فرنگی محلی تک پہنچتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں کہنا چاہیے کہ ان کی سند عالی تھی۔

اس سلسلۂ سند کا ذکر خود مولانا حنیف ندوی نے سے کیا تھا۔

مولانا حنیف ندوی ہمارے ملک کے طبقۂ علما کے بہت بڑے رکن تھے جو مذہبی و اصلاحی تمام قدیم و جدید تحریکوں پر عمیق نگاہ رکھتے تھے اور ان کے تحلیل و تجزیے میں انھیں عبور حاصل تھا۔ مسائل مذہبی اور ضروریات زمانہ کو وہ نہایت اچھی طرح سمجھتے تھے اور دونوں کا تطابق کرتے وقت مذہب کے پلڑے کو ہمیشہ بھاری ثابت کرتے تھے۔ ان کی تحریر و تقریر کا ایک ایک جملہ اور کلام و بیان کا ہر ہر لفظ ان کے علم و مطالعہ کی فراوانی کی شہادت دیتا تھا۔ ان کے افکارِ قلمی کا جو عکس منظر عام پر آ چکا ہے' وہ ان کی وسعت معلومات اور فضل و کمال کا بین ثبوت ہے۔

انھوں نے چھتیس برس ادارہ ثقافت اسلامیہ میں تصنیفی خدمات سرانجام دیں اور اپنے پیچھے نہایت قیمتی علمی ذخیرہ چھوڑا۔ ان کی وفات سے سب سے زیادہ فکری صدمہ ادارہ ثقافت اسلامیہ کو پہنچا تھا' جس کا ذکر اس زمانے کے ادارے کے مرحوم ڈائریکٹر سراج منیر اکثر کیا کرتے تھے۔ ادارے کے لیے انھوں نے اپنے آپ کو وقف کر دیا تھا۔ وہ ہماری بزم ثقافت کے لعل شب چراغ تھے جو عمل و کردار اور مشکل ترین مسائل و معاملات کی تبیین و توضیح میں اپنی مثال آپ تھے۔ ان کے فکر کی روشنی اور قلم کے بانکپن نے فلسفے کو ادب کا خلعت پہنا دیا' یا یوں کہیے کہ اس عالم اجل نے ادب کو فلسفے کا' اور فلسفے کو ادب کا حسین مرقع بنا دیا۔ اس قسم کے ہمہ گیر معلومات کے حامل لوگوں کی اصل ضرورت اس وقت محسوس ہوتی ہے' جب علمی تقاضے للکارتے اور اہم مسائل معاشرے پر حملہ آور ہوتے ہیں' اور پھر کوئی بھروسے کا آدمی نہیں ملتا' جس کی طرف ان کے حل و کشود کے لیے رجوع کیا جا سکے اور جس کی گفتگو سے قلب و ضمیر اطمینان کی دولت سے بہرہ ور

ہوسکیں۔ اس فاضل دوراں نے ۱۲ جولائی ۱۹۸۷ء (۱۵ ذیقعدہ ۱۴۰۷ھ) کو وفات پائی۔ اللہ انھیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔ ان کی نماز جنازہ مولانا فضل الرحمٰن بن محمد ازہری (خطیب مسجد مبارک لاہور) نے پڑھائی تھی۔

ہم مولانا محمد حنیف ندوی کی تاریخ ولادت سے لے کر تاریخ وفات تک پہنچ گئے ہیں۔ عیسوی حساب سے یہ ان کی زندگی کا ۷۹ سال پر پھیلا ہوا طویل عرصہ ہے جس میں رونما ہونے والے ان کے بہت سے واقعات ہمارے علم میں آئے' ان کے مضامین و مقالات کی ایک طویل فہرست بھی ہمارے سامنے آئی' لیکن ان کی کسی مستقل تصنیف کا ذکر نہیں کیا جاسکا، حالانکہ وہ وہ نہایت ضروری تھا' تو آیئے اب ان کی تصانیف کا ذکر کرتے ہیں اور تصانیف میں سب سے پہلے قرآن مجید کا---!

اس کتاب ہدیٰ اور صحیفہ ربانی سے مولانا کو ابتدائی زندگی ہی سے بے پناہ شغف تھا۔ ۱۹۲۵ء میں وہ استاذ محترم حضرت مولانا محمد اسماعیل کے فرمان کے مطابق اعلیٰ تعلیم کے لیے لکھنؤ جا کر دارالعلوم ندوۃ العلما میں داخل ہوئے تو قرآن مجید اور اس کے متعلقہ علوم کو اپنی دلچسپیوں کا محور ٹھہرایا اور اس موضوع پر ڈھائی سال میں درجہ تخصص کو پہنچے۔ پھر وطن واپس آ کر ۱۹۳۰ء میں لاہور کی مسجد مبارک (اہل حدیث) میں خطابت و تدریس کا آغاز کیا۔ درس قرآن وہ نماز مغرب کے بعد دیا کرتے تھے۔ مسجد مبارک اسلامیہ کالج سے متصل ہے' اس لیے کالج کے پروفیسر اور طلبا کثیر تعداد میں شریک درس ہوتے تھے۔ ۱۹۴۹ء تک یہ سلسلۂ درس جاری رہا۔ اس اثنا میں انھوں نے دو دفعہ قرآن مجید ختم کیا۔ قدیم و جدید تفسیروں کا مطالعہ کرکے وہ مسند درس پر بیٹھتے تھے۔

خطبہ جمعہ میں ہمارے ہاں رواج چلا آ رہا ہے کہ خطیب حضرات کوئی خاص آیت یا دو چار آیات تلاوت کر کے خطبے کا آغاز کرتے اور اپنی گفتگو کو آگے بڑھاتے ہیں' لیکن مولانا محمد حنیف ندوی نے ابتدائے قرآن سے خطبہ دینے کی طرح ڈالی۔ ہمارے استاذ عالی قدر حضرت مولانا محمد اسماعیل سلفی کا بھی یہی نہج خطابت تھا اور میرا خیال ہے پورے برصغیر میں یہ دو حضرات ہی اس پر عمل پیرا تھے۔ مولانا اسماعیل سلفی نے بھی روزانہ کے

درس قرآن کے علاوہ خطبہ جمعہ میں دو کے قریب قرآن مجید ختم کیے تھے۔ ان کی مدت خطابت ۱۹۲۱ سے لے کر ۱۹۶۸ء تک تقریباً اڑتالیس برس کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔

ہمارے زیادہ تر خطبائے کرام کی یہ عادت ہے کہ منبر پر مسنون عربی خطبہ پڑھنے کے بعد تبرکاً قرآن مجید کی دو تین آیتیں پڑھیں' پھر سیاست کا دھندا شروع کر دیا۔ تقریر کا یہ آسان ترین نسخہ ہے۔ نہ اس میں علم کی ضرورت' نہ کتابوں کے مطالعے کی حاجت' کسی کی تعریف کی' کسی کی تنقیص کی اور بات ختم ہو گئی۔ صرف صبح کو اخبار پڑھنا ہے' اس کے علاوہ کسی کتاب کو ہاتھ لگانے کی ضرورت نہیں۔ رنگ پتا نہیں چوکھا آتا ہے یا نہیں' البتہ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ''نہ ہنگ لگے نہ پھٹکڑی۔''

مولانا محمد اسماعیل سلفی اور مولانا محمد حنیف ندوی ملکی سیاسیات میں حضرت مولانا ابوالکلام آزاد کے ہم خیال تھے اور وہ انگریزی حکومت کا زمانہ تھا' لیکن جمعے کے خطبے اور روزانہ کے درس قرآن کو وہ ہنگامی اور وقتی سیاست کی بھینٹ نہیں چڑھاتے تھے' اپنے سامعین کو قرآن وحدیث سے آشنا کرنے کے لیے کوشاں رہتے تھے۔

اب ہر مولوی صاحب کے خطبہ جمعہ میں سیاست گھسی ہوئی ہے۔ جو خطیب اپنے ذاتی مفاد کی بنا پر جس سیاسی جماعت سے تعلق رکھتا ہے' اسی کی تعریف سے خطبہ شروع کرتا ہے اور اسی کی تعریف پر ختم کر دیتا ہے۔ حالاں کہ اس کے سامعین میں ہر سیاسی جماعت سے دلچسپی رکھنے والے لوگ موجود ہوتے ہیں' بعض کا کسی بھی جماعت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ یہ تمام لوگ اللہ اور اس کے رسول (ﷺ) کی باتیں سننے کے لیے آتے ہیں۔ اخبار تو وہ بھی پڑھتے ہیں اور خطیب صاحب سے زیادہ سیاسی حالات سے آگاہ ہوتے ہیں۔ لیکن خطیب صاحب ہیں کہ جبراً ان کے ذہن میں اپنے مفاداتی خیالات کا انجیکشن لگانے کی جدوجہد فرما رہے ہیں۔

بات مولانا محمد حنیف ندوی کی ہو رہی تھی جو سیاست زدہ خطیبوں تک پہنچ گئی۔ میں عرض یہ کرنا چاہتا ہوں کہ مولانا ندوی نے ۱۹۳۰ سے لے کر ۱۹۴۹ء تک بیس برس خطبات جمعہ اور ہر روز کے درس کی صورت میں قرآن مجید کی خدمت کو اپنا معمول بنائے

رکھا۔ بہ الفاظ دیگر یہ ان کی تقریری خدمت قرآن تھی۔ اب آیئے ان کی تحریری اور تصنیفی انداز کی خدمت قرآن کی طرف---!

تفسیر سراج البیان: ۱۹۳۳ء میں انھوں نے ''تفسیر سراج البیان'' کے نام سے قرآن مجید کی تفسیر لکھی جو لاہور کے ایک تاجر کتب نے چھاپی اور پھر بار بار چھپی۔ تفسیر کی زبان خالص علمی ہے۔ ہر صفحے میں قرآن کے مشکل الفاظ کے لغوی حل کا التزام کیا گیا ہے اور اس کا عنوان رکھا ہے ''حل لغات'' تفسیر میں مختلف مباحث کے الگ الگ عنوان قائم کیے گئے ہیں۔ مثلاً سورہ یٰس کی تفسیر میں یہ عنوانات ہیں: ضبطِ اعمال کا نظریہ' میں کیوں خدا کی عبادت نہ کروں' فطرت کے انعامات' قرآن اور نظریات جدیدہ' نرسنگا پھونکا جائے گا' اعضا بھی بولیں گے' پیغمبر شاعر نہیں ہوتا' انعاماتِ الٰہی کا تقاضا۔ یہ آٹھ عنوانات ہیں حل لغات ان کے علاوہ ہے۔

سنا ہے پہلے یہ تفسیر بڑے سائز پر چھپتی رہی ہے۔ خط' کاغذ' کتابت اور طباعت وغیرہ تفسیر کی شان کے عین مطابق۔ لیکن اب یہ تفسیر بہت چھوٹے سائز پر چھپی ہے اور پانچ جلدوں میں ہے۔ خط اتنا باریک ہے کہ پڑھنا نہایت مشکل ہے۔ جن حضرات کے پاس پہلے کی چھپی ہوئی بڑے سائز کی تفسیر موجود ہے' ان کا کہنا ہے کہ دونوں اشاعتوں کا تقابل کرنے سے پتا چلتا ہے کہ موجودہ اشاعت میں مختلف مقامات سے کئی کئی سطریں غائب ہیں۔ یعنی نہایت عمدہ تفسیر کو ناشر نے اپنی عدم توجہی سے ناقص بنا دیا ہے۔

تاہم اس بہت بڑے نقص کے باوجود یہ تفسیر زبان و بیان کے اعتبار سے مولانا کی قرآن فہمی کے جوہر کو خوب اجاگر کرتی ہے اور بتاتی ہے کہ علوم قرآن پر ان کی نظر کتنی عمیق اور کس درجہ گہری ہے۔

یہ تفسیر انھوں نے اس وقت لکھی تھی جب وہ پچیس برس کے جوان تھے اور ان کی علمی زندگی کا آغاز تھا۔ زندگی کے آخری دور میں بھی وہ اس موضوع کو کتابی شکل میں لانا چاہتے تھے اور لائے۔ یہ ۱۹۷۷ء کی بات ہے۔ سن و سال کے اعتبار سے وہ بوڑھے ہو گئے تھے اور ستر سال کی عمر کو پہنچ گئے تھے' لیکن ان کا قلم جوان تھا اور افکار عالم شباب میں

تھے اور واقعہ یہ ہے کہ ہمیشہ ان کی یہی کیفیت رہی' بڑھاپا کسی لمحے بھی ان کے افکار کی بلندی اور طرز بیان کی شگفتگی پر اثر انداز نہ ہوسکا' بلکہ عمر کی رفتار کے ساتھ فکر کی تازگی میں مسلسل اضافہ ہوتا رہا۔ چنانچہ انھوں نے ستر سال کی منزل میں داخل ہونے کے بعد قرآن مجید کے بارے میں مندرجہ ذیل کتابیں لکھیں جو ان کی فکری توانائی اور اسلوب نگارش کی بلند پروازی کا ثبوت بہم پہنچاتی ہیں۔

مطالعہ قرآن: ترتیب کے اعتبار سے قرآن کے بارے میں ان کی یہ دوسری کتاب ہے اور دورِ آخر کا بے مثال شاہکار-! اس کتاب میں قرآن مجید سے متعلق ان تمام مباحث و مسائل کا محققانہ انداز میں احاطہ کیا گیا ہے' جن سے قرآن فہمی میں مدد ملتی ہے اور جن سے قرآن کے علوم و معارف اور دعوت و اسلوب کی معجز طرازیوں کا تفصیلی نقشہ قاری کے سامنے آتا ہے۔ اس کتاب میں مولانا نے نہایت شگفتہ اسلوب اور حکیمانہ انداز میں مستشرقین کے ان اعتراضات کا بھی جواب دیا ہے جو ان کی طرف سے قرآن کے بعض مضامین پر کیے جاتے ہیں۔ کتاب بڑے بڑے سولہ عنوانات پر مشتمل ہے جو یہ ہیں۔ (۱) قرآن کا تصور وحی و تنزیل۔ (۲) قرآن مجید اور کتب سابقہ۔ (۳) قرآن حکیم اور اس کے اسماء و صفات۔ (۴) عہد نامہ جدید اور اناجیل اربعہ۔ (۵) اسفار خمسہ۔ (۶) قرآنی سورتوں کی قسمیں اور ترتیب۔ (۷) قرآنی سورتوں کی زمانی و مکانی تقسیم۔ (۸) جمع و کتابت قرآن کے تین مراحل (۹) قرآن حکیم کی لسانی خصوصیات۔ (۱۰) اعجاز قرآن اور اس کی حقیقت۔ (۱۱) محتویات قرآن۔ (۱۲) مشکلات قرآن۔ (۱۳) قرآن کے رسم الخط کے بارے میں نقطہ اختلاف۔ (۱۴) تفسیر۔ (۱۵) تفسیر کے دو مشہور مدرسۂ فکر۔ اصحاب الحدیث اور اہل الرائے' (۱۶) اولیات قرآن---!

یہ کتاب پہلی دفعہ ۱۹۷۸ء میں چھپی تھی۔ اب نہایت خوب صورت انداز میں اسے ''علم و عرفان پبلشرز اردو بازار لاہور'' نے شائع کیا ہے۔

لسان القرآن جلد اول: مطالعہ قرآن کے بعد انھوں نے قرآن مجید کا توضیحی لغت ضبط تحریر لانے کا عزم کیا۔ اس کا آغاز انھوں نے ۱۹۷۹ء کے آخر میں کیا تھا اور

۱۹۸۲ء کے آخر میں ایک جلد مکمل ہوگئی جس کا نام ''لسان القرآن'' رکھا گیا۔ حروف تہجی کی ترتیب سے یہ جلد پانچ حروف پر مشتمل ہے۔ یعنی حرف الف ''اب'' سے شروع ہوئی اور حرف ج (ج ی د) ''جید'' پر ختم ہوئی۔ یہ قرآن مجید کا ایک جامع تفسیری اور توضیحی لغت ہے، جس میں قرآن حکیم کے معانی و مطالب کو نہایت عمدہ طریقے سے نکھار کر بیان کیا گیا ہے۔ اس میں قرآن، حدیث، محاورات عرب اور قدیم و جدید علوم و تحریکات کی روشنی میں ان تمام اشکالات کا جائزہ لیا گیا ہے، جن کا کسی نہ کسی طرح عمرانیات، تاریخ فلسفہ یا سائنس سے ربط و تعلق ہے۔ اس کتاب کو معارف قرآن کا گنجینہ قرار دینا چاہیے۔ پیرایۂ بیان ایسا موثر اور دل نشین کہ کتاب کے مطالعہ سے وہ ذہن جسے قرآن سے ذرہ بھی لگاؤ ہے، دمک اٹھتا ہے اور قلب و باطن میں عظمت قرآنی کا نقش حسین مرتسم ہو جاتا ہے۔

۴۔ لسان القرآن جلد دوم: اس جلد کا انداز بھی وہی روح پرور اور چشم کشا ہے جو پہلی جلد کا ہے۔ اس میں تین حروف آئے ہیں۔ ح، خ، د۔ یعنی (ح ب ب) ''الحب'' سے شروع ہو کر یہ جلد (دی ن) ''الدین'' پر اختتام کو پہنچتی ہے۔ یہ جلد ۱۹۸۵ء میں چھپی --- اور پھر مولانا اس طرح بیمار ہوئے کہ سفر آخرت اختیار کر گئے۔ افسوس ہے، یہ سلسلہ پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکا۔

یہاں یہ عرض کر دوں کہ بعض حضرات کے اصرار پر میں نے کام شروع کیا جو 'ز' تک پہنچا اور وہ ''لسان القرآن جلد سوم'' کے نام سے ساڑھے تین سو صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ جلد شائع ہوئی اور دوستوں نے ازراہ کرم اس پر پسندیدگی کا اظہار کر کے میری حوصلہ افزائی کی۔ چوتھی جلد کے لیے حرف ''س'' سے کام کا آغاز ہوا ہے۔ دیکھیے اللہ کو کیا منظور ہے۔

یہ تینوں جلدیں ''علم و عرفان پبلشرز اردو بازار، لاہور'' نے شائع کی ہیں اور علمی حلقوں میں ان کی بہت مانگ ہے۔

یہ تو ہوئیں قرآن سے متعلق مولانا کی تصنیفات۔! اب آیے مولانا کے ان قرآنی

مضامین کی طرف جو ہفت روزہ ''الاعتصام'' میں شائع ہوئے۔ اس سے قبل ''ثقافت'' اور المعارف'' میں اس موضوع پر ان کے شائع شدہ مضامین کا ذکر ہو چکا ہے۔

۱۹۔ اگست ۱۹۴۹ء کو الاعتصام مولانا کی ادارت میں جاری ہوا تھا۔ وہ تقریباً تین سال اس کے ایڈیٹر رہے۔ پھر اس کا بار ادارت میرے کندھوں پر آ پڑا اور میں ابتدا ہی سے بہ طور معاون مدیر کے اس سے وابستہ تھا۔ مولانا کے اس اخبار میں مختلف عنوانات پر نہایت گراں قدر مضامین شائع ہوئے، جن میں سے بعض کا ذکر میری کتاب ''ارمغان حنیف'' میں آ چکا ہے، جو مولانا کے واقعات و حالات پر مشتمل ہے اور بعض کا ''الاعتصام'' کے ''مولانا محمد حنیف ندوی نمبر'' میں کیا جا چکا ہے۔ ۲۳۱ صفحات کا یہ نمبر مولانا کی رحلت سے تقریباً ڈیڑھ سال بعد دسمبر ۱۹۸۸ء میں شائع ہوا تھا۔ یہاں ہم صرف یہ بتانا چاہتے ہیں کہ ''الاعتصام'' میں انھوں نے ''قرآن کی منتخب آیات کی تفسیر'' کے عنوان سے بہت سی آیات کے متعلق لکھا اور خوب لکھا۔ اس کا آغاز انھوں نے ۲۵۔ اگست ۱۹۵۰ کی اشاعت سے کیا تھا اور مندرجہ ذیل الفاظ سے کیا تھا۔

''یہ فخر صرف قرآن مجید کو حاصل ہے کہ قریب قریب ہر ہر زمانے میں، ہر ہر نقطہ خیال سے اس پر غور کیا گیا ہے اور علوم و فنون کی بوقلمونی کے ساتھ اس کے عمق و گہرائی کا جائزہ لیا گیا ہے، تاہم ان تمام غواصان بحر معانی کو اعتراف ہے کہ کہیں بھی یہ حضرات اس کو اتھلا نہیں پا سکے۔ سیکڑوں اور ہزاروں شناوروں نے اس سمندر میں غوطہ زنی کی اور ہمیشہ معنی و مقصود کے موتیوں سے دامن بھر بھر کر ساحل پر آئے، مگر اس پر بھی اس کے خزائن میں کمی واقع نہیں ہوئی۔ یقین جانیے کہ اس کی ہر موج اور اچھال میں اب بھی اتنی دولت پنہاں ہے کہ پوری کائنات انسانی کو اس سے مالا مال کیا جا سکتا ہے، جستجو اور تحقیق شرط ہے۔

قُلْ لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمَاتِ رَبِّيْ لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ كَلِمَاتُ رَبِّيْ وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهٖ مَدَدًا۔ (الکہف:۱۰۹)

"(کہہ دیجیے' اگر میرے پروردگار کی باتوں کو قلم بند کرنے کے لیے سمندر کا پانی سیاہی کی جگہ ہو' تو قبل اس کے کہ میرے پروردگار کی باتیں تمام ہوں' سمندر نبڑ جائے گا' اگرچہ ویسا ہی اور سمندر اس کی مدد کو ہم لے آئیں۔)

"ہم اس شمارے سے یہ نیا اور مستقل تفسیری باب شروع کر رہے ہیں۔ تفسیر آیات کا انتخاب ان معنوں میں ہے کہ اختصار کے تقاضوں کو مدنظر رکھتے ہوئے' ہم کن آیات کو اپنے ذوق کی رعایتوں سے آپ کے سامنے لانا چاہتے ہیں۔ ورنہ یہاں متعارف معنوں میں انتخاب کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کیوں کہ یہاں تو ایک ایک آیت جان معنی اور روح انتخاب ہے۔

"اس باب میں ہم صرف ان آیات کو لائیں گے' جن کی ادبی' نحوی یا کلامی و فقہی اہمیتوں کو ہم اجاگر کر سکیں۔ مقصود یہ ہے کہ ہماری موجودہ پود کے دلوں میں قرآن کی عظمتوں کا صحیح احساس کروٹ لے اور انھیں یہ معلوم ہو کہ آج سے چودہ سو سال پہلے کی ایک کتاب میں کتنا اعجاز' کتنے معانی اور فکر و عمل کا کتنا نکھار مضمر ہے۔ امید ہے ہمارے قارئین اسے دلچسپی سے پڑھیں گے۔"

اس تمہیدی نوٹ کے بعد الاعتصام کے مختلف شماروں میں بہت سی آیات کی تفسیر قلم بند کی گئی جو اپنی نوعیت کی منفرد تفسیر ہے۔ اگر ان آیات کی تفسیر شائع کی جائے تو ایک اچھی خاصی کتاب بن سکتی ہے جو بہت سے علمی فوائد پر محیط ہوگی۔

ریڈیو پاکستان (لاہور) میں بھی قرآن کے مختلف پہلوؤں سے متعلق مولانا کی بہت سی تقریریں ہوئیں۔ پھر ٹیلی ویژن کا "بصیرت" پروگرام ایک مدت تک مولانا کرتے رہے' وہ بھی قرآنی آیات پر مشتمل تھا۔ یہ سب باتیں ہم نہایت اختصار کے ساتھ پیش کر رہے ہیں' بلکہ یوں کہیے کہ اشارے کیے جا رہے ہیں' ان کی تفصیل کا یہ محل نہیں۔

اب چند لفظوں میں مولانا ندوی کی خدمت حدیث کا تذکرہ---!

مولانا کے دل میں انکار حدیث اور منکرین سنت نبوی سے جو نفرت پائی جاتی تھی

اس کا اظہار ان خطوط سے بہ خوبی ہوسکتا ہے جو انھوں نے کوئٹہ سے میرے نام لکھے' وہ خطوط گزشتہ صفحات میں درج کیے گئے ہیں۔ علاوہ ازیں ان کے بہت سے مضمون "الاعتصام" وغیرہ اخبارات میں شائع ہوئے۔ پھر ان کی اس موضوع پر مندرجہ ذیل کتابیں بھی ہیں۔

مطالعہ حدیث: مستشرقین اور استشراق زدہ لوگوں نے ایک مدت سے حدیث وسنت کے بارے میں اس ہرزہ سرائی کو "علمی وتحقیقی" سانچے میں ڈھالنے کی جدوجہد شروع کر رکھی ہے کہ اس کی تدوین وتسوید کا سلسلہ محض تاریخی عوامل کی بنا پر معرض ظہور میں آیا۔ ہمارے ہاں کے کچھ لوگ بھی اس سے متاثر ہوئے اور انھوں نے مستشرقین کے اس اندازِ فکر کو آگے بڑھانے اور پھیلانے کی کوشش کی۔ مولانا محمد حنیف ندوی نے "مطالعۂ حدیث" میں اس کا مثبت اسلوب میں جواب دیا ہے اور بتایا ہے کہ حدیث نبوی ﷺ کی اشاعت وفروغ اور حفظ وصیانت کا سلسلہ عہد نبوی سے لے کر صحاح ستہ کی تدوین تک ایک خاص نوع کا تسلسل لیے ہوئے ہے' جس میں شک وریب کی کوئی گنجائش نہیں پائی جاتی۔ علاوہ ازیں مولانا نے اس کتاب میں حدیث کے علوم ومعارف پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے اور دلائل سے واضح کیا ہے کہ یہ مکمل سائنس ہے' جس میں رجال ورواۃ کی جانچ پرکھ کے پیمانوں کی تشریح کا اہتمام بھی کیا گیا ہے اور ان اصولوں کی وضاحت بھی کی گئی ہے' جن سے محدثین نے متن حدیث کی صحت واستواری کا تعین کیا ہے۔

یہ بہت اہم سوالات ہیں کہ اسلام کے احکام وفرامین میں حدیث وسنت کا کیا درجہ ہے؟ اس نے کب اور کس طرح تدوین وترتیب کے مرحلے طے کیے؟ یہ کن مؤثر اور معتبر ترین علمی ذرائع سے ہم تک پہنچی؟ اور اپنے آغوش میں یہ تحقیق وتفحص کے کن معیاروں کو سمیٹے ہوئے ہے؟

مولانا نے ان تمام سوالات کا جو بعض ذہنوں میں خلجان پیدا کرتے ہیں "مطالعۂ حدیث" میں تحقیقی جواب دیا ہے۔ یہ کتاب پندرہ عنوانات پر مشتمل ہے جو

حسب ذیل ہیں:

(۱) قرآن حکیم اور اطاعت رسول۔ (۲) سنت کن حقائق سے تعبیر ہے؟ (۳) سنت عہد نبوی میں۔ (۴) آنحضرت کا اسلوب دعوت وارشاد۔ (۵) صحابہ اور تابعین کے دور میں علم حدیث کی اشاعت کا جذبہ۔ (۶) صحابہ اور تابعین کے زمانے میں اشاعت حدیث کے اسباب وعوامل۔ (۷) روایت کی دو قسمیں۔ (۸) تدوین حدیث۔ (۹) حدیث کے بارے میں فن جرح وتعدیل۔ (۱۰) فتنہ وضع حدیث اور محدثین کی مساعی جمیلہ۔ (۱۱) اصطلاحاتِ حدیث۔ (۱۲) علوم حدیث (۱۳) حضرت ابوہریرہؓ۔ (۱۴) امام زہریؒ۔ (۱۵) کتب حدیث اور اس کے مؤلفین۔

ترجمہ صحیح بخاری: ۱۹۳۹ء میں انھوں نے ''شرکت علمی لمٹیڈ لاہور'' کی طرف سے ضروری حواشی کے ساتھ صحیح بخاری کے اردو ترجمے کا سلسلہ شروع کیا تھا' کچھ حصے کا ترجمہ کر بھی لیا تھا' لیکن مکمل نہ ہو سکا۔ اس ترجمے کے چند مطبوعہ صفحات میری نظر سے گزرے ہیں۔ بہت عمدہ کام تھا۔

چہرہ نبوت قرآن کے آئینے میں: میرے ''الاعتصام'' کے دورِ ادارت میں مولانا نے ''الاعتصام'' میں قرآن مجید کی روشنی میں نبی ﷺ کی سیرت مطہرہ کے متعلق ایک سلسلہ مضامین شروع کیا تھا' جس کا عنوان ہم نے ''چہرہ نبوت قرآن کے آئینے میں'' رکھا تھا۔ اس موضوع کا یہ ایک منفرد سلسلہ تھا جو افسوس ہے مکمل نہ ہو سکا۔ کچھ عرصہ پہلے میں نے ''الاعتصام'' میں شائع شدہ اس کی تمام قسطیں جمع کیں تو جو حصہ مولانا سے رہ گیا تھا' اسے مکمل کیا۔ یہ کتاب ہم دونوں کی تصنیف کے طور پر ''علم وعرفان پبلشرز' اردو بازار' لاہور'' کی طرف سے کچھ عرصہ پہلے شائع ہوئی ہے۔ میں اپنے تحریر کردہ ابواب کے بارے میں تو کچھ نہیں کہہ سکتا' البتہ یہ ضرور عرض کروں گا کہ مولانا کے رقم فرمودہ حصے میں قرآن' سیرت' سنت' سب چیزیں نہایت حسن وخوبی کے ساتھ آگئی ہیں اور میرے خیال میں اس کتاب میں آغاز نبوت سے لے کر نبی ﷺ کی رحلت تک کے تمام واقعات قرآن کی روشنی اور اس کے حوالوں سے ضبط کتابت میں لائے گئے ہیں۔

اس کتاب کو اللہ نے اتنی قبولیت عطا فرمائی کہ بہت قلیل عرصے میں دو یا تین دفعہ شائع ہو چکی ہے۔

اب مولانا کی دیگر تصانیف کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔

مرزائیت نئے زاویوں سے: مولانا نے ''الاعتصام'' کے ابتدائی زمانے میں ایک سلسلہ مضامین شروع کیا تھا' جس کا عنوان تھا۔ ''ختم نبوت اور اس کے حدود اطلاق---ایک نیا جائزہ---'' اور واقعی مرزائیت کے موضوع پر یہ ایک نیا جائزہ تھا۔ یہ مضمون کئی قسطوں میں چھپا تھا۔ اس عنوان کے علاوہ بھی مولانا نے مرزائیت کے بارے میں ''الاعتصام'' میں بہت سے مضامین سپرد قلم فرمائے تھے۔ مولانا نے حکومت پاکستان سے مطالبہ کیا تھا کہ مرزائیوں کو اقلیت قرار دیا جائے بلکہ خود مرزائیوں کو مشورہ دیا تھا کہ انھیں چاہیے کہ وہ حکومت سے مطالبہ کریں کہ انھیں ملک کی اقلیتوں میں شمار کیا جائے' اس لیے کہ پاکستان کے آئندہ مرتب ہونے والے آئین میں مرزائیوں کے لیے الجھن پیدا ہو گی جو ان کے لیے خطرات کا باعث ثابت ہو گی۔ یہ قیام پاکستان کے تھوڑا عرصہ بعد ۱۹۴۹ء کی بات ہے اور مرزائیوں کو اقلیت قرار دینے کی یہ پہلی آواز تھی جو ایک اہل حدیث عالم کی طرف سے ''الاعتصام'' کے صفحات پر پاکستان میں بلند ہوئی۔ اس سے پہلے مرزائیوں کو کافر تو ضرور کہا جاتا تھا (اور ان پر کفر کا فتویٰ بھی سب سے پہلے اہل حدیث کی طرف سے مرتب کیا گیا تھا) لیکن کسی طرف سے انھیں اقلیت قرار دینے کا مطالبہ نہیں کیا گیا تھا۔ مولانا کے یہ مضامین ''مرزائیت نئے زاویوں سے'' کے عنوان سے ۱۹۵۲ء کے آخر میں کتابی شکل میں شائع ہوئے تھے اور یہ کتاب چند روز میں ختم ہو گئی تھی اور اب بالکل نایاب تھی۔ حال ہی میں اسے ''طارق اکیڈمی فیصل آباد'' نے شائع کیا ہے اور میں نے اس پر مبسوط مقدمہ لکھا ہے۔ اہل حدیث اہل قلم کا فرض ہے کہ وہ اپنی اس تاریخ کو اجاگر کریں جس کا تعلق برصغیر کی تحریکات آزادی' جدوجہد پاکستان' تصنیف و تالیف' تراجم و حواشی' درس و تدریس' برصغیر کے مختلف مذاہب' (یعنی عیسائیوں' آریہ سماجیوں' سناتن دھرمیوں وغیرہ) سے اہل حدیث کے مناظرات و

مباحث' تحریک تحفظ ختم نبوت' صحافتی خدمات اور دیگر معاملات سے ہے۔ بقول حضرت مولانا محمد علی لکھوی رحمۃ اللہ علیہ کے اہل حدیث نے اپنی سرگرمیوں کو جلسوں اور کانفرنسوں تک محدود کر رکھا ہے۔ کوئی چھوٹا موٹا جلسہ کیا' کہیں سالانہ کانفرنس منعقد کی اور سمجھ لیا کہ بیڑا پار ہو گیا اور مسلک اہل حدیث کی خدمت کا حق ادا کر دیا گیا۔ کیوں کہ اس میں فلاں فلاں حضرات نے تقریریں کی ہیں اور فلاں فلاں قرار دادیں منظور فرمائی گئی ہیں۔

بہر حال مولانا محمد حنیف ندوی نے تصنیف و تالیف' مقالات و مضامین اور خطابت و تقریر کے رنگ میں اسلام کی بے حد خدمت کی --- یہ ان کی چند کتابوں کا ذکر ہے' اب ان کی دیگر تصانیف کی طرف آیئے۔

مسئلہ اجتہاد: اس کتاب میں اس حقیقت کی صراحت کی گئی ہے کہ اسلام جہاں اس بات کی وضاحت کرتا ہے کہ توحید کیا ہے' دلوں میں ایمان کے داعیے کس طرح پیدا ہوتے ہیں' تقویٰ کیسے ابھرتا ہے اور کردار و سیرت کی تشکیل کے کیا ذرائع ہیں' وہاں اس میں اس بات کا بھی پورا اہتمام پایا جاتا ہے کہ بدلتے ہوئے اجتماعی اور معاشرتی حالات میں احکام و مسائل کی کیا شکل ہو۔ یعنی وہ کون سے اصول اور پیمانے ہیں' جن پر قیاس اور اجتہاد کا قصر رفیع تعمیر ہوتا ہے۔ اس موضوع پر مولانا کی یہ نہایت عمدہ کاوش ہے۔ یہ کتاب ۱۹۵۲ء میں پہلی مرتبہ طبع ہوئی تھی۔

افکار ابن خلدون: علامہ ابن خلدون (ولادت ۷۳۲ وفات ۸۰۸ھ) عمرانیات و اجتماعیات کے ماہر اور تاریخ اور فلسفہ تاریخ کے عدیم المثال عالم تھے۔ اس کتاب میں ان کے حالات بھی بیان کیے گئے ہیں اور ان کے افکار و تصورات کا تذکرہ بھی کیا گیا ہے اور تجزیہ بھی کیا گیا ہے۔ یہ کتاب پہلی دفعہ ۱۹۵۴ء میں شائع ہوئی تھی۔

افکار غزالی: اس کتاب میں امام غزالی کی ''احیاء علوم الدین'' کے بعض اہم مضامین کا خلاصہ پیش کیا گیا ہے۔ اس پر طویل مقدمہ بھی ہے۔ پہلی مرتبہ ۱۹۵۶ء میں چھپی۔

تعلیمات غزالی: یہ کتاب غزالی کی ''احیاء علوم الدین'' کے گیارہ ابواب کی تلخیص ہے۔ وہ ہیں ابواب الصلوٰۃ' ابواب زکوٰۃ' حدیث صوم' اسرار حج' ذکر و دعا' تہذیب و آداب' نکاح و معاشرت' محبت و اخوت' معاملات' فہم قرآن' تفسیر بالرائے --- کتاب پر طویل مقدمہ بھی ہے۔ پہلی مرتبہ ۱۹۶۲ء میں طبع ہوئی تھی۔

سرگزشت غزالی: یہ غزالی کی ''المنقذ من الضلال'' کا ترجمہ ہے جو غزالی کی علمی زندگی کا نہایت دلچسپ حصہ ہے۔ پہلی مرتبہ ۱۹۵۹ء بھی طبع ہوئی تھی۔

تہافت الفلاسفہ: نہایت شگفتہ اور رواں دواں اردو میں یہ غزالی کی تہافت الفلاسفہ کی تفہیم و تلخیص ہے۔ پہلی مرتبہ ۱۹۷۲ء میں چھپی تھی۔

عقلیات ابن تیمیہ: مولانا کو ائمہ متقدمین میں سے جن حضرات عالی قدر سے قلبی اور فکری لگاؤ تھا' ان میں امام ابن تیمیہ کی ذات گرامی کو خاص مقام حاصل ہے۔ حضرت امام علوم و معارف اور عمل و سیرت کے اعتبار سے ہمہ گیر شخصیت کے مالک تھے۔ اس کتاب میں مولانا نے اگرچہ امام کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کی بھی وضاحت کی ہے' مگر زیادہ تر اس پہلو کو واشگاف کیا ہے کہ امام نے اپنے عہد کی عقلیات کو کمال ژرف نگاہی سے کھنگالا ہے اور تنقید و احتساب کی کسوٹی پر پرکھا ہے اور ثابت کیا ہے کہ اس کے مقابلے میں اسلام کا عقلی موقف کہیں زیادہ صحیح' کہیں زیادہ استوار اور متوازن ہے۔ یہ کتاب آٹھ فصلوں کو محتوی ہے اور اردو زبان میں امام کی منطق و عقلیات سے متعلق اولین کتاب ہے۔ پہلی دفعہ ۱۹۶۶ء میں چھپی۔

مسلمانوں کے عقائد و افکار (جلد اول): یہ علامہ ابوالحسن اشعری (ولادت ۲۶۰ھ وفات ۳۳۰ھ) کی مقالات الاسلامیین جلد اول کا اردو ترجمہ ہے۔ اس کتاب کے مطالعے سے جہاں یہ واضح ہوتا ہے کہ مسلمان نفسیات' اخلاق اور مادہ و روح کے بارے میں کن کن جواہر پاروں کو منظر عام پر لائے' وہاں یہ حقیقت بھی نکھر کر سامنے آتی ہے کہ ماضی میں فکر و نظر کی کجی نے کن کن گمراہیوں کو جنم دیا اور ان گمراہیوں کے مقابلے میں اسلام نے کسی معجزانہ انداز سے اپنے وجود کو قائم اور برقرار رکھا --- کتاب

پر طویل مقدمہ بھی ہے۔ پہلی دفعہ ۱۹۶۸ء میں معرض اشاعت میں آئی۔

مسلمانوں کے عقائد و افکار (جلد دوم): یہ علامہ ابوالحسن اشعری کی مقالات الاسلامیین کی دوسری جلد کا ترجمہ ہے۔ اس پر فاضل مترجم نے تیس صفحات کا مقدمہ لکھا ہے۔ پہلی دفعہ ۱۹۷۰ء میں شائع ہوئی۔

اساسیات اسلام: اس کتاب میں مولانا نے اس حقیقت کی وضاحت کی ہے کہ اسلام میں ہمارے تہذیبی' ثقافتی' سیاسی' اقتصادی اور روحانی مسائل کا حل بہ طریق احسن موجود ہے۔ اگر اس کے تمام پہلوؤں پر صدق دل سے غور کیا جائے اور انھیں محور عمل بنایا جائے تو پتا چلے گا کہ یہاں ہر شے پوری مقدار میں دست یاب ہے' کہیں تشنگی کا احساس نہیں ہوتا۔ یہ کتاب نو ابواب پر مشتمل ہے جن میں نظریہ توحید اور اس کی اساس' نماز اور اس کے اثرات' اسلام کا تصور ثقافت' اسلام اور اس کی سیاسی قدریں' اقتصادیات میں اسلام کا موقف اور اسلام کا نظریہ اخلاق شامل ہیں۔ ہر باب میں ذیلی عنوانات قائم کیے گئے ہیں۔ پہلی مرتبہ ۱۹۷۳ء میں شائع ہوئی۔

مکتوب مدنی: الٰہیات کے سلسلے میں یہ بحث خاص طور سے بڑی اہمیت کی حامل ہے کہ اللہ تعالیٰ اور کائنات میں ربط و تعلق کی نوعیت کیا ہے؟ اس ضمن میں ابن عربی نے وحدت الوجود کا نظریہ پیش کیا ہے' جس کا دو لفظوں میں مطلب یہ ہے کہ بحر وجود در اصل ایک ہے اور تمام کائنات اسی بحر بیکراں کی موجیں ہیں۔

مجدد الف ثانی نے اس کے مقابلے میں ''نظریہ شہود'' کی وضاحت کی ہے' جس میں دو وجود ہیں۔ ایک وجود دنیا کا اور دوسرا حقیقت وراء الورا کا---!

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے ان دونوں نظریوں کے درمیان تطبیق دینے کی کوشش کی ہے۔ شاہ صاحب سے ان کے دور کے مشہور عالم اسماعیل بن عبداللہ آفندی رومی مدنی نے اس سلسلے میں سوال کیا تو انھوں نے بذریعہ مکتوب اس کا تفصیلی جواب دیا جو کتابی شکل میں اشاعت پذیر ہوا۔ یہ مکتوب عربی زبان میں ہے اور مکتوب مدنی کے نام سے موسوم ہے۔

مولانا محمد حنیف ندوی نے شاہ صاحب کی اس اہم علمی کاوش کا شگفتہ اور سلیس اردو ترجمہ کر دیا ہے۔ وحدت وجود اور وحدت شہود کے موضوع پر گفتگو کرنے والوں کے لیے اس کا مطالعہ دلچسپی کا باعث ہوگا۔

قدیم یونانی فلسفہ: غزالی کی تصانیف میں ''مقاصد الفلاسفہ'' ان کی مشہور کتاب ہے جو یونانی فلسفے کے دقیق مباحث کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ مولانا حنیف ندوی نے ''قدیم یونانی فلسفہ'' کے نام سے اس کا اردو ترجمہ کیا جو ۱۹۵۹ء میں چھپا۔

مولانا ندوی نے اس اسلوب سے اس کا ترجمہ کیا ہے کہ علم وادب کے تقاضے پہلو بہ پہلو رہیں اور کسی طرح بھی مضامین کی خشکی اور زبان کا اغلاق قاری کی دلچسپیوں کو مجروح نہ کرنے پائے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ مولانا نے پوری کوشش کی ہے کہ غزالی کے اپنے پیرایۂ بیان کی خوبیوں کو اردو میں جوں کا توں برقرار رکھا جائے۔ بلاشبہ مولانا اس میں کامیاب رہے ہیں اور کتاب فلسفے کے ساتھ ساتھ اردو ادب کا دلکش حصہ بن گئی ہے۔

مولانا نے جس موضوع پر لکھا' خوب لکھا۔ ان کے قلم کا میدان اور معلومات کا دائرہ بہت وسیع تھا۔ ان کی تحریر و کتابت کی بوقلمونی کا اندازہ اس سے لگایے کہ انھوں نے قرآن وحدیث کے بحر بیکراں میں غوطہ زنی کی' اسلامی اوامر واحکام کو ہدف فکر ٹھہرایا' فلسفہ وکلام کی وسعتوں کا ان کے قلم حقیقت رقم نے احاطہ کیا اور منطق وحکمت کی وادیوں کے ہر گوشے کی ان کے خامہ عنبر شمامہ نے جی بھر کر سیاحت کی۔ تحریر کے ہر موڑ پر' تصنیف وتالیف کے ہر مرحلے میں اور ترجمے کی ہر منزل میں' ادبیت کی لطافت اور زبان کی حلاوت ان کے ہم رکاب رہی۔

بعض مقامات پر وہ الفاظ واصطلاحات کی انتہائی مشکلات سے دوچار ہوئے اور وادیٔ فن کی نہایت کٹھن منزلیں ان کے سامنے آئیں۔ لیکن ان کی رسائی فہم نے ہر موقعے پر ان کا ساتھ دیا اور ان کا رہوارِ قلم' علم وفن کے تمام نشیب وفراز سے نہایت سبک رفتاری سے گزرتا اور ہر گھاٹی کو انتہائی ہنر مندی سے عبور کرتا گیا۔

ان کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے فلسفہ و منطق کے پیچیدہ اور گنجلک ترین مسائل و مضامین کو ادب کا دلآویز خلعت پہنا دیا ہے اور قاری ان کی تصنیفات سے بہ یک وقت دو فائدے حاصل کر سکتا ہے۔ زیر بحث موضوع میں وسعت معلومات سے بھی اپنا دامن طلب بھر سکتا ہے اور ادب و زبان کی لطافتوں اور حلاوتوں سے بھی بہرہ اندوز ہو سکتا ہے۔ یبوست اور عبوست کا کوئی شائبہ نہ ان کی تحریر میں دخل اندازی کی جرأت کر سکا' نہ تقریر اور عام گفتگو میں راہ پا سکا۔

۱۹۵۸ء میں' میں نے سہ روزہ ''منہاج'' جاری کیا تھا جو چودہ مہینے جاری رہا تھا۔ مولانا کے اس میں بھی متعدد مقالات شائع ہوئے۔ پھر جولائی ۱۹۶۵ء میں ہفت روزہ ''توحید'' جاری ہوا تھا' جس کے ناشر حضرت مولانا سید محمد داؤد غزنوی کے بڑے صاحب زادے مولوی عمر فاروق غزنوی مرحوم تھے اور نگران سید ابوبکر غزنوی مرحوم و مغفور تھے' میں اس کا ایڈیٹر تھا۔ یہ اخبار بہت تھوڑا عرصہ جاری رہ سکا تھا' اس سے الگ ہو کر میں اکتوبر ۱۹۶۵ء میں ادارہ ثقافت اسلامیہ سے منسلک ہو گیا تھا' ''توحید'' میں بھی مولانا کے کچھ مضامین چھپے۔

روزنامہ ''امروز'' کسی زمانے میں بہت بڑا اور مشہور اخبار تھا۔ مختلف عنوانات پر اس میں بھی ان کے مقالات شائع ہوتے رہے۔ اور بھی بعض رسائل و جرائد میں ان کے رشحاتِ قلم نے جگہ پائی' لیکن افسوس ہے' ان سب تک ہماری رسائی نہیں ہو سکی۔ خود مولانا کو بھی علم نہیں تھا کہ ان کے کون کون سے مضامین کہاں کہاں چھپے اور کب چھپے۔ ان کے پاس نہ وہ اخبار تھا' جس میں ان کا کوئی مضمون چھپا اور نہ کسی ریڈیو تقریر کی کوئی نقل تھی۔ اس قسم کی کوئی چیز ان کے گھر میں موجود نہ تھی۔ حتیٰ کہ ان کی تفسیر ''سراج البیان'' کی بھی کوئی کاپی ان کے پاس نہ تھی' عجیب بات یہ ہے کہ انھیں اس تفسیر کا صحیح نام بھی یاد نہ تھا۔ ان کے ذہن میں اس کا نام ''سراج التفاسیر'' تھا۔ اس کا اندازہ اس وقت ہوا' جب ۳۰ جولائی ۱۹۸۴ء کو ادارہ ثقافت اسلامیہ کی طرف واپڈا ایڈیٹوریم (لاہور) میں ان کے ساتھ ایک شام منانے کا فیصلہ ہوا۔ میں نے اپنے ایک مرحوم دوست مولانا

سعید الرحمٰن علوی سے کہا کہ وہ اس موقع پر مولانا ندوی کی تفسیر کے بارے میں مقالہ پڑھیں۔ انھوں نے کہا: میں مقالہ لکھوں گا اور پڑھوں گا، لیکن تفسیر کہاں ہے جس پر مقالہ لکھا جائے؟ تفسیر کے بارے میں مولانا سے رجوع کیا گیا تو نہ ان کے پاس تفسیر تھی اور نہ انھیں صحیح طور سے اس کے نام کا پتا تھا، بس یہ معلوم تھا کہ ۱۹۳۳ء میں انھوں نے تفسیر لکھی تھی اور کئی دفعہ چھپی تھی۔ بالآخر خود علوی صاحب ہی نے بھاگ دوڑ کر پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں تفسیر کا سراغ لگایا تو اس کے صحیح نام کا پتا چلا۔ تفسیر کی انھیں صرف ایک جلد مل سکی، جس پر مصنف کا نام علامہ محمد حنیف ندوی لکھا تھا۔

مولانا نستعلیق عالم دین تھے۔ شکل و صورت اور وضع قطع دورِ گزشتہ کے اساتذہ فن سے ملتی ہوئی۔ شبہ گزرتا تھا کہ غالب، حالی، نذیر احمد اور شبلی کے قبیلے کا کوئی فرد اپنے ساتھیوں سے بچھڑ گیا ہے۔ لباس اور پہناوے کے اعتبار سے ایک خاص تہذیب و ثقافت کے پیکر۔ لب ولہجہ لکھنوی، اسلوب کلام میٹھا اور پیارا۔ لوگوں کو دھوکا ہوتا تھا کہ یوپی کے کسی شہر کے رہنے والے ہیں۔ بعض لوگ تو لکھنؤ کا باشندہ سمجھتے تھے۔ بارہا ایسا ہوا کہ مولانا کہیں بیٹھے ہیں، ایک شخص آیا، جھک کر آداب بجالایا اور پنجابیوں کے خلاف دل کی بھڑاس نکالنے لگا۔ مولانا ازراہ مروت سنتے رہے اور کوئی جواب نہ دے سکے۔ پھر ارشاد ہوا، ماشاءاللہ کس قدر مہذب ہیں آپ۔! یہ ہے ہماری اصل تہذیب۔ کس شہر سے تعلق ہے آپ کا؟ لکھنؤ سے ہوگا۔! چہرے بشرے اور لباس و معاشرت سے لکھنویت بول رہی ہے!!

اب مولانا کے چند لطیفے سنیے۔ لطائف سے انھیں بایں علم و کمال خاص تعلق تھا۔ ان کا موضوع اسلامی فلسفہ تھا اور اس موضوع کے آدمی کو عام طور سے خشک اور یبوست زدہ سمجھا جاتا ہے، لیکن مولانا حنیف ندوی کا معاملہ اس سے بالکل الٹ تھا۔ وہ لطیفہ بیان کرتے بھی تھے اور بڑے شوق سے لطیفہ سنتے بھی تھے۔

۱۹۵۱ء میں علامہ سید سلیمان ندوی جامعہ اشرفیہ کے جلسے میں لاہور تشریف لائے۔ اس وقت جامعہ اشرفیہ نیلا گنبد میں مول چند بلڈنگ میں تھا۔ ''الاعتصام'' ان

دنوں گوجرانوالا سے شائع ہوتا تھا اور میں معاون مدیر کی حیثیت سے اس اخبار سے منسلک تھا۔ میں اور مولانا ندوی' سید صاحب سے ملاقات کے لیے جامعہ اشرفیہ گئے۔ وہ ایک کمرے میں قیام فرماتے اور ایک صاحب ان کے پاس بیٹھے تھے۔ ہم گئے تو وہ صاحب اٹھ کر چلے گئے۔ شاید وہ اس انتظار میں تھے کہ کوئی آئے تو میں جاؤں۔ سید صاحب کو میں نے پہلی دفعہ دیکھا تھا اور پھر یہی رویت آخری رویت ثابت ہوئی۔ اس سے کئی سال پہلے سید صاحب مولانا اشرف علی تھانوی کے حلقہ بیعت وارادت میں شامل ہو چکے تھے۔

مولانا حنیف ندوی کو دیکھ کر سید صاحب بہت خوش ہوئے اور بغل گیر ہو کر ملے۔ خیر و عافیت کے مبادلے اور ادھر کی ادھر کی چند باتوں کے بعد مولانا نے سید صاحب سے فرمایا

آپ نے ''سیرۃ النبی'' کو بہشتی زیور کے قدموں میں ڈال دیا ہے۔

سید صاحب نیچے دری پر گاؤ تکیہ لگائے بیٹھے تھے۔ انھوں نے جسم کو تھوڑی سی حرکت دی اور مسکراتے ہوئے فرمایا:

آپ ہماری عمر کو پہنچیں گے تو آپ بھی یہی کریں گے۔

مولانا نے جواب دیا: میرا بھی یہی خیال ہے کہ آپ پر عمر کا اثر ہے۔

یہ الفاظ سن کر سید صاحب کے چہرے پر اور مسکراہٹ پھیل گئی اور خاموشی اختیار فرمالی۔

اس کمرے کی دیوار پر جس میں سید صاحب کا قیام تھا' جامعہ اشرفیہ کے اس جلسے کا اشتہار لٹک رہا تھا۔ مولانا کی اس پر نگاہ پڑی تو دیکھا کہ ہر عالم کے نام کے ساتھ ''حضرت'' کا لفظ مرقوم ہے' لیکن سید صاحب کو ''مورخ اسلام سید سلیمان ندوی'' لکھا گیا ہے۔ مولانا نے کہا:

''یہ اشتہار دیکھیے' اس حلقے میں آپ ہمیشہ ''مورخ اسلام'' ہی رہیں گے۔ آپ کی ''حضرت'' بننے کی خواہش یہاں کبھی پوری نہیں ہوگی۔ ''حضرت'' وہی لوگ ہوں گے جو

پہلے سے اس حلقے سے وابستہ ہیں۔ یہ اعزاز آپ کو نہیں ملے گا۔

سید صاحب نے ہلکا سا تبسم فرمایا' لیکن مولانا کے اس طنز کا کوئی جواب نہیں دیا۔

اس کے بعد اور باتیں ہونے لگیں۔ گھنٹے سوا گھنٹے کے قریب ہم وہاں رہے۔ واپسی کے لیے اجازت چاہی تو فرمایا آپ کا اخبار ''الاعتصام'' مجھے پہنچ رہا ہے۔ آپ کے مضامین پڑھ کر بہت خوشی ہوتی ہے' اس میں نئی نئی باتیں مطالعہ میں آتی ہیں۔

ایک دفعہ ایک مجلس میں ایک مشہور اور بڑے شاعر کے بارے میں کسی صاحب نے بتایا کہ وہ ایک خاتون سے شادی کرنا چاہتے تھے' لیکن اس سے ان کے استاد نے شادی کر لی' وہ بھی بہت بڑے اور معروف شاعر تھے۔ شاگرد کو اس سے تکلیف تو ہوئی' لیکن استاد کو کچھ نہ کہہ سکے۔ کرنا خدا کا کیا ہوا کہ تھوڑے عرصے بعد استاد وفات پا گئے۔ اب اس سے انہی شاگرد شاعر نے شادی کر لی جو پہلے کرنا چاہتے تھے--- مولانا نے یہ واقعہ سن کر فرمایا کہ شاعری کی اصطلاح میں اس کا مطلب یہ ہوا کہ ایک ہی مصرعے پر دو شاعروں نے گرہ لگائی۔

ایک دفعہ عیدالفطر کے دن مجھے فرمایا کہ کل اتنے بجے مولانا عطاء اللہ صاحب کے گھر پہنچ جاؤ' میں بھی پہنچ جاؤں گا۔ انھیں عید کی مبارک باد دیں گے۔ اتفاق ایسا ہوا کہ ہم دونوں ایک ہی وقت میں ان کے ہاں پہنچ گئے--- مولانا عطاء اللہ صاحب کا معمول یہ تھا کہ مولانا حنیف ندوی ان سے ملاقات کو جاتے تو وہ فوراً چائے منگواتے' لیکن اس دن کچھ اس طرح باتوں میں مشغول ہوئے کہ چائے کا خیال ہی نہ رہا۔ چند منٹ کے بعد مولانا ندوی نے فرمایا: مولانا آپ کا رمضان ابھی ختم نہیں ہوا۔

یہ سن کر مولانا عطاء اللہ صاحب مسکرائے اور فوراً چائے منگوائی گئی۔

ایک دفعہ ہم دونوں لائل پور (موجودہ فیصل آباد) گئے۔ بعض دوستوں سے ملے۔ پھر مشہور مصنف و مترجم پروفیسر غلام احمد حریری مرحوم کے متعلق مولانا نے فرمایا کہ ان سے ملنا ضروری ہے۔ ایک دوست نے بتایا کہ اس وقت وہ فلاں جگہ ہوں گے۔ وہاں پہنچے تو پتا چلا کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے یہاں سے گئے ہیں اور اب فلاں جگہ ملیں گے۔ وہاں

پہنچے تو کسی اور جگہ کی نشانی دہی کی گئی۔ اس طرح کئی مقامات کے چکر لگانے کے بعد ایک مقام پر ہم نے ان کو جا پکڑا۔ وہ ہمیں دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ مولانا نے فرمایا: حریری کا تو ہمیں پتا تھا' لیکن مقامات حریری کا آج پتا چلا ہے۔

''مقامات حریری'' عربی ادبیات کی ایک کتاب کا نام ہے جو ابو محمد قاسم بن علی بن محمد بن عثمان حریری کی تصنیف ہے اور عربی ادبیات کے نصاب میں شامل ہے۔ مولانا نے ''مقامات حریری'' کہہ کر اسی کتاب کی طرف اشارہ کیا تھا جو بالکل برمحل تھا۔

مسجد مبارک میں مولانا جمعہ پڑھایا کرتے تھے۔ ایک دن ایسا ہوا کہ جمعے کے بعد مولانا اٹھنے لگے تو ایک صاحب آئے اور انھوں نے باتیں شروع کر دیں۔ مولانا نے کچھ دیر ان کی باتیں سنیں اور پھر فرمایا اب مجھے اجازت دیجیے' میں جانا چاہتا ہوں۔ انھوں نے کہا مجھے آپ سے چند ضروری باتیں کرنی ہیں۔ مولانا نے فرمایا باتیں پھر کیجیے گا' اب مجھے ضروری کام ہے' اجازت دیجیے۔ انھوں نے کہا: مسلمان مسلمان کا آئینہ ہوتا ہے۔ فرمایا: آئینہ ہوتا ہے' سریش نہیں ہوتا۔

ایک دن ہم دونوں گھر جانے کے لیے ادارہ ثقافت اسلامیہ کے دفتر سے باہر نکلے تو ایک شخص نے ہمیں آ پکڑا اور سڑک پر کھڑے کھڑے باتیں شروع کر دیں۔ ان کا نام ماسٹر طالع محمد تھا اور وہ بہت باتیں کرتے تھے۔ ایک بات ختم ہوئی' اس کے ساتھ ہی دوسری شروع کر دی۔ اس طرح ان کا سلسلہ کلام مسلسل چلتا تھا' کسی اور کو بولنے نہیں دیتے تھے۔ جمعے کا دن تھا اور دیر ہو رہی تھی۔ مولانا بھی پریشان اور میں بھی پریشان۔! اکتا کر میں نے مولانا سے کہا: اب چلنا چاہیے' جمعہ پڑھنا ہے۔ مولانا نے نہایت آرام سے فرمایا: یہاں ماسٹر جی کا خطبہ سن لیں' پھر دو رکعتیں کہیں جا کر پڑھ لیں گے۔

۱۹۵۷ء میں' میں ''الاعتصام'' کا ایڈیٹر تھا۔ ہم نے فیصلہ کیا کہ مئی کے مہینے میں ''الاعتصام'' کا ۱۸۵۷ء نمبر شائع کیا جائے گا۔ میں نے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے مختلف پہلوؤں سے متعلق بہت سے اہل قلم سے مضامین کے لیے کہا اور انھوں نے از راہ

کرم مضامین دیے۔ مولانا غلام رسول مہر سے عرض کیا تو انھوں نے بھی مضمون بھجوا دیا۔ مولانا عبدالمجید سالک صاحب کے گھر جا کر میں ان سے مضمون کی درخواست کرنا چاہتا تھا--- میں نے مولانا حنیف ندوی سے عرض کیا کہ وہ میرے ساتھ ان کے مکان پر تشریف لے جائیں۔ مولانا نے فرمایا تم جاؤ اور مضمون کے لیے کہو وہ مضمون دے دیں گے۔ میں نے عرض کیا' میری درخواست پر وہ مضمون تو دے دیں گے' لیکن میری خواہش ہے کہ آپ میرے ساتھ تشریف لے چلیں۔ چنانچہ ہم دونوں مولانا عبدالمجید سالک کے مکان پر پہنچے۔ اس زمانے میں تقریباً تمام روزناموں ہفت روزوں اور ماہناموں کے ایڈیٹروں کا یہی مسئلہ تھا اور وہ اپنے رسائل و جرائد کے ۱۸۵۷ء نمبر شائع کر رہے تھے۔ یعنی برات عاشقاں برشاخ آہو والا معاملہ تھا۔ ہم گئے تو حصول مضامین کے لیے سالک صاحب کے پاس کئی ایڈیٹر صاحبان بیٹھے تھے۔ سالک صاحب ہمیں دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور کہا آپ کو میری ضرورت پڑ ہی گئی۔

وہ پلنگ پر بیٹھے لکھ رہے تھے۔ ایک صاحب نے کہا آپ کے پاس کرسیاں موجود ہیں اور میز بھی ہے۔ آپ پلنگ کے بجائے کرسی پر بیٹھ کر لکھیے' اس میں آسانی رہتی ہے' سالک صاحب نے تو ان صاحب کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا لیکن مولانا ندوی کی رگ ظرافت پھڑکی تو فوراً بولے: ہر کرائیٹو کام پلنگ پر ہوتا ہے۔

سالک صاحب جو اپنے عہد کے بہت بڑے لطیفے باز تھے' مولانا ندوی کا یہ جواب سن کر بہت محظوظ ہوئے۔

یہاں خود سالک صاحب کا بھی ایک لطیفہ سنتے جایے جو انھوں نے ایک مرتبہ مولانا حنیف ندوی پر چسپاں کیا تھا۔ ایک دفعہ میں اور مولانا ندوی ان کے دفتر گئے۔ مولانا کی داڑھی اس وقت معمول سے کافی بڑھی ہوئی تھی۔ سالک صاحب کی میز پر ''الاعتصام'' پڑا تھا۔ وہ مولانا ندوی کے بے تکلف دوستوں میں سے تھے۔ انھوں نے مولانا کو دیکھ کر ''الاعتصام'' ہاتھ میں پکڑا اور بولے یہ تو ہوا ہے ''الاعتصام''۔ پھر ان کی داڑھی کی طرف اشارہ کر کے مسکراتے ہوئے ان سے پوچھا: ''اور یہ حبل اللہ ہے۔''؟

۳۰ جولائی ۱۹۸۴ء کو ادارہ ثقافت اسلامیہ کی طرف سے مولانا کے ساتھ ایک شام منائی گئی تھی۔ اس تقریب میں بہت لوگ شامل ہوئے تھے اور متعدد حضرات نے مولانا کی علمی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو تقریر و تحریر کے ذریعے اجاگر کیا تھا۔ سامعین کو دعوت نامے میں نے بھجوائے تھے اور مقررین کو موضوع بھی میں نے ہی دیے تھے۔ لیکن ایک غلطی یہ ہوگئی تھی کہ پاکستان کے مشہور ادیب و شاعر جناب احمد ندیم قاسمی کے نام دعوت نامہ نہیں بھجوایا جاسکا تھا' حالاں کہ ان کا دفتر مجلس ترقی ادب ہمارے اس وقت کے دفتر ادارہ ثقافت اسلامیہ سے متصل تھا۔ پھر وہ مجلس ترقی ادب کے ڈائریکٹر ہیں اور ہمارے مخلص ترین اور بے تکلف دوستوں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ معلوم نہیں دعوت نامے بھجواتے وقت ان کا نام کیوں ذہن سے نکل گیا۔

دوسرے دن میں دفتر گیا تو مولانا سے کہا: یہ بہت بڑی غلطی ہوگئی ہے کہ قاسمی صاحب کو دعوت نامہ نہیں بھجوایا گیا۔ آیئے اب ان سے معذرت کریں۔ ہم ان کے دفتر گئے تو وہ حسب معمول نہایت تپاک سے ملے' لیکن دعوت نہ بھجوانے کا دوستانہ گلہ کیا۔ مولانا نے فرمایا: شرعی مسئلہ یہ ہے کہ نماز کا کوئی رکن رہ جائے تو سجدہ سہو لازم آتا ہے۔ آپ ہماری بزم احباب کے نہایت اہم رکن ہیں' یہ بہت بڑا سہو ہوا کہ آپ کو دعوت نامہ نہیں بھجوایا گیا' اب ہم سجدۂ سہو کرنے آئے ہیں۔

ایک لطیفہ اور سنیے۔ اگست ۱۹۴۹ء میں جب گوجرانوالا سے اخبار ''الاعتصام'' جاری ہوا تو اس کی ادارت مولانا کے سپرد ہوئی اور وہ اہل و عیال سمیت لاہور سے گوجرانوالا چلے گئے تھے۔ ان کی شادی وہیں ماموں کے گھر ہوئی تھی اور وہ سب سے پہلے انھی کے گھر گئے تھے۔ ایک دن کسی نے ان سے پوچھا: آپ نے یہاں رہائش کے لیے کیا انتظام کیا ہے؟

فرمایا: بہت اچھا انتظام ہوگیا ہے۔ میری بیوی اپنے میکے میں رہے گی' بچے اپنے ننھیال میں رہیں گے اور میں ماموں کے گھر رہوں گا۔

مولانا لطیفے میں محاورہ بھی فٹ کر دیتے تھے۔ ایک دن میں نے اپنے گھر چند

دوستوں کو کھانے پر بلایا۔ مولانا ان دنوں بیمار تھے اور ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق دلیا وغیرہ ہلکی غذا کھاتے تھے۔ ان سے میں نے عرض کیا تو تشریف لے آئے' لیکن جو کچھ انھوں نے کھانا تھا' وہ گھر سے کھا آئے تھے۔ دوست کھاتے رہے اور مولانا باتیں کرتے رہے۔ کھانے کی دوسری چیزوں کے علاوہ میٹھا پکوان کھیر تھا۔ ایک دوست نے مولانا سے کہا' میٹھا کھا لیجیے۔ فرمایا: میٹھا کیا ہے؟ بتایا گیا کھیر ہے---! فرمایا: کھیر کھا لیتے ہیں بشرطیکہ ٹیڑھی نہ ہو---! زیادہ مشکل کام درپیش ہو تو اردو میں بہ طور محاورے کے کہا جاتا ہے یہ ''بڑی ٹیڑھی کھیر ہے۔'' مولانا کا اشارہ اسی محاورے کی طرف تھا۔

اب مولانا کے بارے میں ایک قول مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کا ملاحظہ فرمایے۔! ایک دفعہ ادارہ ثقافت اسلامیہ میں ایک مذاکرہ علمیہ کا اہتمام کیا گیا تھا' جس میں مولانا مودودی بھی مدعو تھے اور انھوں نے تقریر کی تھی۔ کسی جماعت کا لیڈر کسی جلسے میں جائے تو پندرہ بیس سامعین اس کی رکاب میں جاتے ہیں۔ اس لیڈرانہ روایت کے مطابق مولانا مودودی کے ساتھ بھی ان کے سامعین اچھی خاصی تعداد میں ایک بڑی ویگن میں سوار ہو کر آئے تھے۔ جب مذاکرہ ختم ہوا تو مولانا مودودی اور ان کے رفقاے کرام واپس جانے کے لیے اپنی ویگن میں بیٹھ گئے۔ مولانا ندوی بھی گھر جانے کے لیے باہر نکلے۔ مولانا مودودی کی نظر ان پر پڑی تھی تو ویگن سے اتر کر ان کے پاس آئے اور فرمایا: آیے ہمارے ساتھ بیٹھیے' آپ کو گھر چھوڑ آئیں گے۔ مولانا نے فرمایا آپ کے پاس گنجائش ہے؟ مولانا مودودی نے نہایت نستعلیقانہ جواب دیا: ''کھدر کی گٹھڑی میں ریشمی رومال کے لیے ہر وقت گنجائش رہتی ہے۔''

ادارہ ثقافت اسلامیہ میں محمد جعفر پھلواروی بھی تھے اور رئیس احمد جعفری بھی۔ ایک دن ایک صاحب ان حضرات میں سے کسی صاحب سے ملاقات کے لیے تشریف لائے---مولانا ندوی نے فرمایا: ہم نے کبوتر اور کبوتری کی طرح جوڑا رکھا ہے' جعفر بھی اور جعفری بھی۔ فرمایے آپ کو اس جوڑے میں سے کس کی ضرورت ہے۔

شاہ محمد جعفر شاہ صاحب کا عام لباس قمیص' پاجامہ' شیروانی اور قراقلی ٹوپی تھا' لیکن

کسی شادی میں انھیں دعوت دی جاتی تو اکثر انگریزی لباس میں ملبوس ہوتے تھے۔ سوٹ پہنتے ٹائی باندھتے اور سر پر ہیٹ رکھتے۔! ادارہ ثقافت اسلامیہ کے بانی ڈائریکٹر خلیفہ عبدالحکیم کی صاحب زادی ڈاکٹر رفیعہ حسن کی شادی میں بھی وہ انگریزی لباس میں ملبوس تھے۔ نکاح کا وقت آیا تو خلیفہ صاحب نے مولانا حنیف ندوی سے کہا' کسی نکاح خواں کو بلایے۔ مولانا اٹھے اور شاہ صاحب کو پکڑ کر لے گئے۔ فرمایا: ''فوری طور پر کوئی مولوی تو ملا نہیں' پادری کو لے آیا ہوں۔''

یہ الفاظ سن کر سب لوگ کھل کھلا کر ہنس پڑے اور دیر تک ہنستے رہے۔ خود شاہ صاحب بھی اس لطیفے سے بے حد محظوظ ہوئے۔ ان کا چہرہ مہرہ' رنگ روپ اور داڑھی کی تراش خراش' سب کچھ پادریوں جیسا تھا۔

شاہ صاحب اور رئیس احمد جعفری کے متعلق میں الگ الگ مفصل مضامین اپنی کتاب ''بزم ارجمنداں'' میں لکھ چکا ہوں۔ یہ کتاب مکتبہ قدوسیہ' غزنی سٹریٹ' اردو بازار کی طرف سے شائع ہوئی ہے۔

مولانا کئی سال اسلامی نظریاتی کونسل کے رکن رہے۔ ایک دفعہ اس کے چیرمین (سابق چیف جسٹس سپریم کورٹ) مرحوم حمودالحق تھے۔ بریلوی مکتب فکر کے مولانا محمد بخش مسلم بھی اس کونسل کے رکن تھے۔ میٹنگ میں کسی مسئلے پر بحث ہو رہی تھی۔ مولانا نے ایک رائے دی تو چیرمین صاحب نے کہا مسلم صاحب نے آپ کے برعکس رائے دی ہے۔ مولانا نے فرمایا: ''یہ صحیح مسلم نہیں ہیں۔''

مولانا خالص پنجابی تھے' لیکن مجلس میں' تقریر میں' دوستوں کی محفل میں اردو بولتے تھے' زیادہ دیر پنجابی نہیں بول سکتے تھے۔ تقریر تو پنجابی میں بالکل نہیں کر سکتے تھے۔ نہ کوئی علمی گفتگو پنجابی میں کرنا ان کے لیے ممکن تھا--- ایک دن ایک مجلس میں گوجرانوالا کے چند دوستوں نے کوئی علمی بحث شروع کر دی اور مولانا سے کہا کہ وہ اپنے نقطہ نظر کی وضاحت پنجابی میں کریں۔ مولانا نے پنجابی میں زیادہ سے زیادہ پانچ منٹ بات کی ہوگی کہ فرمایا: اگر آپ چاہتے ہیں کہ میں اپنا سلسلہ کلام جاری رکھوں تو مجھے اردو

میں بات کرنے کی اجازت دیجیے ورنہ اپنا علم تو ختم ہو گیا ہے۔

مولانا حنیف ندوی کی خصوصیات میں سے ایک بہت بڑی خصوصیت تعبیر رویا تھی اور یہ خصوصیت شاہ محمد جعفر پھلواروی میں بھی پائی جاتی تھی۔

اس کی ایک مثال دیتا ہوں۔ حضرت سید احمد شہید بریلوی اور مجاہدین سے متعلق مولانا غلام رسول مہر کی کتابیں شائع ہوئیں اور میرے پاس ''الاعتصام'' میں تبصرے کے لیے انھوں نے بھجوائیں تو میں نے ان کا ایک لفظ پڑھ کر اپنے طور سے نہایت پیار سے تبصرہ کیا اور بعض مقامات کی طرف فاضل مصنف کو توجہ بھی دلائی کہ اصل معاملہ یہ تھا' انھیں لکھتے وقت سہو ہو گیا ہے۔ اس موضوع کی دوسری جلد پر تبصرہ پڑھنے کے بعد انھوں نے مجھے خط لکھا کہ اس سلسلے کی آخری جلد تکمیل کے مرحلے میں ہے اور میں اس کا مسودہ کاتب کو دینے سے پہلے تم سے ضروری مشورہ کرنا چاہتا ہوں۔ یہ ستمبر ۱۹۵۶ء کے آخری ہفتے کی بات ہے۔ اکتوبر ۱۹۵۶ء کے وسط میں مرکزی جمعیت اہل حدیث کی سالانہ کانفرنس علامہ خلیل عرب مرحوم کی زیر صدارت گوجرانوالا میں منعقد ہونا قرار پائی تھی اور میں اس میں مصروف تھا۔ میں نے مہر صاحب کو خط لکھا کہ کانفرنس کے بعد ان شاء اللہ آپ سے ملاقات ہو گی۔ اس سے قبل مصروفیت کی وجہ سے ملاقات کے لیے وقت نکالنا مشکل ہے۔

اب خواب سنیے!

۲۰ یا ۲۱ اکتوبر ۱۹۵۶ء کو نماز عصر کے بعد میں اپنے اخبار ''الاعتصام'' کے دفتر سے باہر نکلا۔ دیکھا کہ سامنے ایک نہایت مناسب قد و قامت کے بزرگ آ رہے ہیں۔ سرخی مائل گورا رنگ ہے' سفید داڑھی ہے' سر پر سفید کپڑے کی ٹوپی ہے: سفید کرتا اور سفید پاجامہ نما شلوار پہنے ہوئے ہیں اور ہاتھ میں لاٹھی ہے۔ بارعب شخصیت کے مالک۔! انھیں دیکھتے ہی میرے ذہن میں آیا کہ یہ تو حضرت سید احمد شہید ہیں۔ یہ میرے پاس دفتر تشریف لا رہے ہیں اور میں دفتر سے باہر آ گیا ہوں۔ پھر ایک دم سوچتا ہوں کہ یہ فارسی زبان میں بات کریں گے اور مجھے فارسی بولنے کی مشق نہیں ہے۔ معاً ذہن میں آیا

کہ گھبرانے کی کوئی بات نہیں' یہ پرانے زمانے کی فارسی بولیں گے' ان سے بات چیت کر لی جائے گی۔ اتنے میں وہ میرے قریب آ جاتے ہیں اور میں ان کے قریب ہو جاتا ہوں۔ میری طرف مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے فرماتے ہیں: السلام علیکم۔ میں گردن جھکا کر اور نظریں نیچی کر کے وعلیکم السلام کہتا ہوا دونوں ہاتھ ان کے ہاتھوں میں دے دیتا ہوں۔ اردو میں فرماتے ہیں: مہر صاحب کی کتابوں پر آپ نے جو تبصرہ کیا ہے' مجھے وہ بہت پسند آیا' آپ نے بہت اچھا تبصرہ کیا ہے۔ (یہ بات میرے ذہن میں نہیں رہی کہ انھوں نے صرف مہر صاحب کہا تھا یا غلام رسول مہر کہا تھا "مہر صاحب" کا لفظ بہر حال مجھے یاد ہے)۔ میں سر جھکائے ہوئے نہایت مودبانہ انداز میں ان کے سامنے کھڑا ہوں اور عرض کرتا ہوں' آپ کا نہایت کرم ہے اور میرے لیے انتہائی سعادت کی بات ہے کہ میرا لکھا ہوا آپ نے پڑھا اور پسند فرمایا۔ انھوں نے تبصرے کے بارے میں دو تین دفعہ وہی کچھ فرمایا جو پہلے فرمایا تھا' لیکن ہر دفعہ الفاظ بدل کر۔۔۔! میں نے بھی جواب میں وہی کچھ عرض کیا جو پہلے کیا تھا' لیکن ہر دفعہ الفاظ کی تبدیلی کے ساتھ۔!! خواب ختم۔۔۔!! اب آنکھ کھل جاتی ہے اور خواب میرے ذہن میں پیوست ہو جاتا ہے' میں سوچتا ہوں خواب تعبیر طلب ہے۔ اس زمانے میں میری اور مولانا حنیف ندوی کی روزانہ شام کے بعد کسی ہوٹل میں نشست ہوتی تھی' جس میں مختلف موضوعات کی بہت سی باتیں کی جاتی تھیں۔ اکثر اوقات اور دوست بھی آ جاتے تھے۔ یہ نشست گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے تک جاری رہتی تھی۔۔۔ میں نے سوچا آج مولانا سے اس خواب کی تعبیر پوچھیں گے۔ میں اس کی تعبیر کے لیے بہت بے تاب تھا۔ وقت مقررہ پر میں انارکلی میں دہلی مسلم ہوٹل پہنچا تو مولانا بھی تشریف لے آئے۔ سلام دعا کے بعد میں نے خواب بیان کیا تو فرمایا: خواب بہت اچھا ہے۔ سید صاحب نے آپ کے ساتھ اردو میں بات کی ہے اور مہر صاحب کی اردو کتابوں پر آپ کے تبصرے پر پسندیدگی کا اظہار کیا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ اردو میں رجال پر اسی قسم کا کام کریں گے جس قسم کا مہر صاحب نے کیا ہے اور آپ کے کام کو مہر صاحب کے کام کی طرح مقبولیت حاصل ہو

گی۔ میں نے یہ خواب شاہ محمد جعفر پھلواروی سے بھی بیان کیا' وہ بھی بہت اچھے معبر تھے۔ انھوں نے بھی یہی تعبیر دی' البتہ اس میں یہ اضافہ کیا کہ آپ نے جو پرانی فارسی کا نام لیا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کے حوالے پرانی فارسی کتابوں کے ہوں گے۔ یہ بات مولانا ندوی کی تعبیر سن کر خود مجھے بھی سوجھی تھی۔

تعبیر بہ ظاہر دل لگتی تھی اور صحیح معلوم ہوتی تھی۔ لیکن اس کے ظہور میں آنے کے آثار نظر نہیں آتے تھے--- وقت گزرتا گیا اور میں ''الاعتصام'' کی ادارت کا فریضہ انجام دیتا رہا۔ ۱۶ دسمبر ۱۹۶۳ء کو مولانا سید محمد داؤد غزنوی وفات پا گئے۔ پھر آہستہ آہستہ حالات ایسے پیدا ہوئے کہ پندرہ سال کے بعد ۳۰ مئی ۱۹۶۵ء کو میں ''الاعتصام'' کی ادارت سے الگ ہو گیا اور پھر ۲۱ اکتوبر ۱۹۶۵ء کو مجھے ادارہ ثقافت اسلامیہ سے منسلک کر لیا گیا۔ اس طرح نو سال کے بعد خواب کی تعبیر ظاہر ہوئی اور قرآن نے جس مدت کو ''بضع سنین'' کہا ہے' اس کا اطلاق تین سال سے لے کر نو سال تک کی مدت پر ہوتا تھا۔ ادارہ ثقافت اسلامیہ میں پہلے میں نے محمد بن اسحاق ابن ندیم کی کتاب ''الفہرست'' کا مع حواشی کے ترجمہ کیا' پھر ''برصغیر پاک و ہند میں علم فقہ'' لکھی اور اس کے بعد ''فقہائے ہند'' لکھی جو پہلی صدی ہجری سے لے کر تیرھویں صدی ہجری تک کے فقہا و محدثین کے حالات پر مشتمل ہے اور دس جلدوں پر محیط ہے۔ ۳۲ برس میں نے ادارہ ثقافت اسلامیہ میں تصنیفی خدمات انجام دیں۔ اب بھی رجال پر کام کر رہا ہوں اور اس سلسلے کی کئی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔

میں یہ دعویٰ ہرگز نہیں کر سکتا کہ میرا کام رجال سے متعلق اسی نوعیت کا ہے' جس نوعیت کا مہر صاحب مرحوم کا ہے۔ یہاں عرض کرنے کا مقصد فقط یہ ہے کہ مولانا حنیف ندوی کو بارگاہ خداوندی سے تعبیر رویا کا بڑا ملکہ ودیعت فرمایا گیا تھا۔

مولانا حنیف ندوی مرکزی جمعیت اہل حدیث کے بانیوں میں سے تھے۔ اس کی تمام کمیٹیوں اور سب کمیٹیوں کے رکن تھے۔ مرکزی جمعیت میں ان کی رائے کو بڑی اہمیت دی جاتی تھی۔ ۱۹۵۵ء میں جمعیت کی مرکزی درس گاہ لائل پور (فیصل آباد) میں

قائم ہوئی تو اس کا نام ''جامعہ سلفیہ'' مولانا ندوی نے تجویز کیا تھا' مقصد یہ تھا کہ اس کے فارغ التحصیل اپنے آپ کو ''سلفی'' کہلائیں۔ لیکن وہاں کے فارغ التحصیل صاحبان میں سے کوئی صاحب اپنے نام کے ساتھ ''سلفی'' کا لفظ نہیں لکھتے۔

۱۹۶۸ء میں اسی شہر (فیصل آباد) میں ایک تعلیمی ادارہ قائم کرنے کی تجویز زیر غور آئی تو مولانا نے اس کا نام ''ادارہ علوم اثریہ'' تجویز کیا تا کہ اس سے فارغ ہونے والے حضرات اپنے نام کے ساتھ ''اثری'' لکھا کریں۔ معلوم نہیں اس ادارے سے کتنے لوگ مستفید ہوئے لیکن ''اثری'' صرف ہمارے عزیز دوست مولانا ارشاد الحق کہلاتے ہیں' اللہ تعالیٰ نے بلاشبہ ارشاد الحق اثری کو آثار علم سے نوازا ہے اور نواز رہا ہے۔ دعا ہے اللہ تعالیٰ اس عالم دین کو صحت و عافیت سے رکھے اور اسے اپنے دین کی زیادہ سے زیادہ خدمت کے مواقع عطا فرمائے۔ آمین

لائل پور میں جب جامعہ سلفیہ کی عمارت نہیں بنی تھیں تو اس میں تعلیم کا آغاز لاہور میں شیش محل روڈ پر دارالعلوم تقویۃ الاسلام کی بلڈنگ میں ہوا تھا۔ اس وقت خود مولانا سید محمد داؤد غزنوی' مولانا محمد اسماعیل سلفی' مولانا محی الدین احمد قصوری' مولانا محمد حنیف ندوی اور مولانا عطاء اللہ حنیف طلبا کو پڑھاتے تھے۔ مولانا عطاء اللہ حنیف کو اس کے شیخ الحدیث کا منصب عطا ہوا تھا اور انھیں جامعہ سلفیہ کے اولین شیخ الحدیث ہونے کا اعزاز حاصل تھا۔

مولانا محمد اسماعیل صاحب ہفتے میں ایک دن گوجرانوالہ سے تشریف لا کر طلبا کو حدیث کی کتاب' غالباً ترمذی شریف پڑھاتے تھے۔ مولانا غزنوی موطا امام مالک کا درس دیتے تھے۔ عربی ادب کی کسی انتہائی کتاب کی تدریس مولانا حنیف ندوی کے ذمے لگائی گئی تھی۔

ادارہ علوم اثریہ میں بھی مولانا پڑھاتے رہے ہیں۔ وہ اس کے لیے ہر اتوار کو لاہور سے لائل پور جاتے تھے۔ یعنی ہفتے میں ایک دن۔

مولانا حنیف ندوی کو یہ اولیت بھی حاصل ہے کہ ۲۸' ۲۹ مئی ۱۹۴۹ء کو مرکزی

جمعیت اہل حدیث کی پہلی کانفرنس لاہور میں منعقد ہوئی تو اس کے صدر استقبالیہ مولانا ندوی کو بنایا گیا تھا' جب کہ اس کے صدر مولانا محمد ابراہیم سیالکوٹی تھے۔ دونوں بزرگوں کے تحریری خطبے تھے' جو انھوں نے کانفرنس کے پہلے اجلاس میں پڑھے تھے۔ ۱۹۶۷ء کی کانفرنس کے بھی مولانا ندوی صدر استقبالیہ تھے' جس کے صدر سید محب اللہ شاہ راشدی مرحوم تھے۔

مولانا نے اپنی علمی زندگی کا آغاز غربت کے عالم میں کیا تھا۔ ان کا آبائی مکان جو گوجرانوالہ میں تھا' بک چکا تھا۔ ۱۹۳۰ء میں انھوں نے مسجد مبارک میں درس و خطابت کا سلسلہ شروع کیا تو ستر روپے ماہانہ تنخواہ مقرر ہوئی تھی جو اس انتہائی سستے زمانے میں معقول تنخواہ تھی' لیکن مولانا فرمایا کرتے تھے کہ ان کی جیب نے کبھی ستر روپے نہیں دیکھے تھے۔ بقول ان کے ان کی تنخواہ غریب کی چھت کی طرح پورا مہینا ٹپکتی رہتی تھی' کبھی پانچ روپے ملے' کبھی آٹھ روپے اور کبھی زیادہ سے زیادہ دس روپے---!

وہ نہایت اجلا اور صاف ستھرا لباس پہنتے تھے' حالاں کہ ان کا ایک ہی جوڑا تھا' دوسرے تیسرے دن اسے دھلا لیتے تھے۔ بے حد صابر و شاکر' کبھی حرف شکایت زبان پر نہیں لاتے تھے۔ خندہ رو' خوش جبیں' شستہ کلام' شگفتہ مزاج۔ ان کے گھر کے افراد کا بھی یہی حال تھا۔

گوجرانوالا سے ''الاعتصام'' کا اجرا ہوا تو وہ اس کے ایڈیٹر تھے اور تنخواہ تھی سو روپے' جس میں سے سولہ روپے مکان کا کرایہ دیا جاتا تھا اور اس مکان میں بجلی نہیں تھی۔ بجلی والے مکان کا کرایہ بیس بائیس روپے تھا جو وہ نہیں دے سکتے تھے۔ یہ ۱۹۴۹ء اور ۱۹۵۰ء کی بات ہے۔ ۱۵ مئی ۱۹۵۱ء کو وہ ادارہ ثقافت اسلامیہ سے منسلک ہوئے' وہاں ان کی تنخواہ تین سو روپے ماہانہ تھی اور اس دور میں یہ بہت مناسب تنخواہ تھی۔ اب ان کی گھریلو زندگی میں کچھ آسودگی کے آثار ابھرے اور پھر ہمیشہ اللہ تعالیٰ کا فضل رہا۔ ان کی وفات کرائے کے مکان میں ہوئی تھی۔ وفات سے کچھ عرصہ بعد ان کے بچوں نے ماڈل ٹاؤن میں اچھی خاصی کوٹھی بنالی تھی اور وہ ٹھیک ٹھاک زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ان کی وہ

کتابیں جو ادارہ ثقافت اسلامیہ نے شائع کی تھیں اور جن کا پہلے ذکر ہو چکا ہے۔ اب علم و عرفان پبلشرز اردو بازار لاہور کی طرف سے شائع ہو رہی ہیں۔

میں نے مولانا کو پہلی دفعہ ۱۹۳۹ء میں دیکھا تھا' جب کہ میری عمر تیرہ چودہ سال کی تھی۔ اس کے بعد ان کی چند تقریریں سننے کا موقع ملا۔ ان سے علیک سلیک بھی ہوتی رہی۔ پھر جولائی ۱۹۴۸ء میں جب مرکزی جمعیت اہل حدیث کے نام سے جماعت کی تنظیم قائم ہوئی تو مجھے اس کا آفس سیکرٹری بنایا گیا اور مولانا سے تعلقات بڑھے۔ اس سے ایک سال بعد اگست ۱۹۴۹ء میں ''الاعتصام'' جاری ہوا اور وہ اس کے ایڈیٹر ہوئے تو مجھے نائب مدیر کی حیثیت سے ان کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا۔ اکتوبر ۱۹۶۵ء میں مجھے ادارہ ثقافت اسلامیہ سے وابستہ کیا گیا تو مولانا کے ساتھ مراسم و انسلاک میں اور زیادہ اضافہ ہوا۔ جولائی ۱۹۸۷ء میں ان کی وفات کا حادثہ پیش آیا۔ اس طرح میرے ان سے تعلقات تقریباً نصف صدی پر محیط ہیں اور میں ان کی زندگی کے ہر گوشے سے آگاہ ہوں۔ اس کی تفصیل میں اپنی کتاب ''ارمغان حنیف'' میں بیان کر چکا ہوں۔ اس مضمون میں بھی میں نے مولانا کی زندگی اور ان کی خدمات کے بہت سے گوشوں کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کوشش میں کہاں تک کامیاب ہوا ہوں؟ یہ ایک سوال ہے' جس کا جواب دینا میرے لیے مشکل ہے۔ اس کا صحیح جواب قارئین کرام ہی دے سکتے ہیں۔

اب مولانا کی بعض پرانی بلکہ بہت پرانی تحریریں نذر قارئین ہیں۔

سن و سال کا تعین اس کے سوا کچھ نہیں کیا جا سکتا کہ تقسیم ملک سے کئی سال پہلے میں نے چھوٹے سائز کا چند صفحات کا ایک پمفلٹ پڑھا تھا جو جلی خط میں لاہور سے شائع ہوا تھا اور اس کے ٹائٹل پیج پر مصنف کا نام لکھا تھا' مولانا محمد حنیف ندوی۔ اس کی حیثیت گاندھی کے نام ایک مکتوب کی تھی' جس میں انھیں اردو ہندی زبان میں دعوت اسلام دی گئی تھی۔ یہ پمفلٹ میں نے ایک ہی دفعہ دیکھا اور پڑھا تھا جو بے حد دلچسپ تھا اور اس میں خوب صورت انداز میں اسلام کے بعض معاملات کی وضاحت کی گئی تھی۔ میرے

ذہن میں اس کا نام تھا ''گاندھی جی کی سیوا میں شردھا کے پھول۔''

مولانا سے میں نے کئی دفعہ اس پمفلٹ کے بارے میں پوچھا' انھیں یہ تو یاد تھا کہ اس مضمون کا ایک پمفلٹ انھوں نے لکھا تھا' لیکن نہ ان کے پاس اس کی کوئی کاپی تھی اور نہ انھیں اس کا نام یاد رہا تھا ------ پچھلے دنوں میں دفتر ''الاعتصام'' گیا اور وہاں میں ہفتے میں ایک آدھ بار ضرور جاتا ہوں۔ اس اخبار سے' اس کے دفتر سے اور اس کے کارکنوں سے مجھے دلی محبت ہے' اس لیے کہ میں جو تھوڑا بہت لکھنے لگا ہوں' اس کا آغاز میں نے اسی اخبار سے کیا تھا' اس طرح یہ اخبار میرا بہت بڑا محسن ہے اور اخلاقی اور شرعی اعتبار سے محسن کو یاد رکھنا اور اس کے احسان کا اعتراف کرنا ضروری ہے۔ اگر میں کسی وجہ سے کچھ دن نہ جا سکوں تو دفتر سے ٹیلی فون آنا شروع ہو جاتے ہیں کہ تم اتنے دنوں سے آئے کیوں نہیں۔

مجھے اس کی ادارتی ذمے داریوں سے علیحدہ ہوئے ۳۸ برس ہو گئے ہیں' پھر بھی بعض دوست اس میں اشاعت کے لیے گھر کے پتے پر مضمون میرے نام ارسال فرما دیتے ہیں اور میں اپنے نام ارسال شدہ مضمون اخبار کو دینے سے پہلے ضرور پڑھتا ہوں اور اپنی دانست میں اگر اس میں ترمیم یا تبدیلی کی ضرورت سمجھوں تو وہ بھی کر دیتا ہوں۔ اگرچہ میرا اس کے مضامین وغیرہ سے کوئی دفتری تعلق نہیں ہے اور میں اس میں دخل دینے کا مجاز نہیں ہوں --- بہر حال میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ چند روز پیشتر میں حسب معمول ''الاعتصام'' کے دفتر گیا تو اس کے مدیر محترم حافظ عبدالوحید صاحب نے مجھے ایک پمفلٹ دکھایا' جسے دیکھ کر مجھے بے حد مسرت ہوئی۔ یہ پمفلٹ دراصل مولانا عبدالمجید خادم سوہدروی مرحوم کے اس کتب خانے سے برآمد ہوا ہے جو کچھ عرصہ پیشتر سوہدرہ سے دارالدعوۃ السّلفیہ (لاہور) کی لائبریری میں منتقل ہوا ہے۔ یہ پمفلٹ دارالدعوۃ السّلفیہ کے لائبریرین جناب خالد جاوید صاحب نے کتابیں مرتب کرتے وقت دیکھا تو انھوں نے حافظ عبدالوحید کو دیا اور حافظ صاحب نے مجھے دکھایا۔ میرے نزدیک دور ماضی کی یہ نہایت اہم یادگار ہے جو اس کتب خانے سے نکلی ہے۔ اسے یہاں

اس لیے درج کیا جا رہا ہے کہ تقسیم ملک سے قبل کی تبلیغ اسلام سے متعلق تاریخ کا ایک اہم حصہ ہے جو اس کتاب میں محفوظ ہو جائے گا۔ میرے خیال میں مولانا حنیف ندوی زمرہ علما کے اولین عالم ہیں جنھوں نے گاندھی جی کو قبول اسلام کی دعوت دی۔ پمفلٹ کے ٹائٹل پیج پر مندرجہ ذیل صورت میں یہ الفاظ مرقوم ہیں۔

"گاندھی جی کی سیوا میں

تین سندیش

دھن، استری اور اچھوت

کے سمبندھ میں

از

مولانا محمد حنیف ندوی

منجانب

جماعت المسلمین چوہٹہ مفتی باقر، لاہور

مقامی حضرات کو مفت اور بیرونی حضرات ایک آنے کا ٹکٹ بھیج کر منگوا سکتے ہیں۔

مولوی عبدالحمید جماعت المسلمین چوہٹہ مفتی باقر لاہور نے عالم گیر الیکٹرک پریس لاہور میں بہ اہتمام حافظ محمد عالم پرنٹر چھپوا کر شائع کیا

اشاعت نمبر ۱۶ بار دوم"

اس پر تاریخ اشاعت نہیں لکھی۔ کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ پمفلٹ کب چھپا ہے، لیکن یہ وہی پمفلٹ ہے، جس کی مجھے ایک عرصے سے تلاش تھی۔ مولانا کا پہلا مضمون ندوہ کی طالب علمی کے زمانے میں لکھنؤ کے ایک ماہنامے میں چھپا تھا۔ یہ اس کے کئی سال بعد کی اس زمانے کی تحریر ہے، جب وہ مسجد مبارک میں درس و خطابت کے فرائض انجام دیتے

میرا خیال ہے' یہ پمفلٹ اب کسی کے پاس نہیں ہوگا اور شاید موجودہ دور کے کسی صاحب کے مطالعے میں بھی نہ آیا ہو۔ اس کا دوسرا صفحہ بہت جلی حروف میں درج ذیل الفاظ پر مشتمل ہے۔

"شردھا کے پھول

گاندھی جی! جہاں آپ کے چرنوں میں چاندی اور سونے کے انبار لگائے جا رہے ہیں' وہاں اپنے ہم وطن ایک مسلمان کی طرف سے سچی شردھا کے یہ پھول قبول فرمایئے۔ یقین جانیے کہ مسلمان کے پاس اسلام سے زیادہ قیمتی کوئی چیز نہیں --- اور اس میں آپ کو دعوت شرکت ہے۔

ندوی"

اب اگلی عبارت ملاحظہ ہو۔

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

"اسلام کا سورج جب اپنی ساری کرنوں کے ساتھ نکلا تو بھومی کا چپہ چپہ روشن ہو گیا اور سنسار میں کسی جگہ اندھیاری نہ رہی- منشا کے تمام درجے برابر پرسن ہوئے' نہ کوئی اونچا رہا اور نہ پست' نہ چھوت نہ اچھوت' نیائے اور انصاف کا پرچم لہرانے لگا- انیائے اور اتیا چار ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اٹھ گیا- چاروں اور اجالا ہو گیا- وہ جو بل وان تھے' خاکساری کے زیور سے آراستہ ہو گئے اور جو بل ہین تھے' انھیں آتمک شکتی سے طاقت ور بنا دیا گیا- دھنوان اور دھن میں سب ایک سطح پر آ گئے- عورتوں کی دشا بالکل بدل گئی' ان میں استری مان کا بھاؤ پیدا کیا گیا' اور مردوں کو بتایا گیا کہ اتم منش وہ ہے جو اپنی استری سے اچھا سلوک کرتا ہے- اس طرح وہ تمام نقص جو سماج نے پیدا کر رکھے تھے دور ہو گئے اور کامل سوسائٹی کی بنیاد رکھی گئی' جو آئندہ چل کر سنسار کی ایک زبر

دست شکتی ثابت ہوئی۔

''آج بھی جیسے جیسے ہمارا تجربہ اور گیان بڑھتا جا رہا ہے' ہمیں اسلام کی صداقتوں اور سچائیوں پر مزید یقین ہو رہا ہے۔ آشا یہ ہے کہ چند سال گزرنے پر جب ہم سماجک' تجربے سے فارغ ہو چکیں گے اور جب ہمارا علم کامل ہو جائے گا اور دنیا ہمیں ہماری غلطیوں پر خود ٹوک دے گی' ہم شدت کے ساتھ محسوس کریں گے کہ اسلام واقعی وچار کے لائق ہے۔ انسانی انترک سبھاؤں سائیکالوجی' کا یہ تقاضا ہے کہ اس وقت تک وہ کسی بات کو ماننے کے یوگیہ نہیں سمجھتا جب تک واقعات کے رنگ میں اسے خود نہ دیکھ لے' اس لئے ہم شانتی کے ساتھ اس سمے کے منتظر ہیں جب سوری کی گرم گرم اور تیز تیز شعاعیں ہندوستان کے سوئے ہوئے لوگوں کو خود جاگنے پر مجبور کر دیں۔

''۱۹۲۶ میں سر تیج بہادر سپرو نے ایک لیکچر میں کیا خوب کہا تھا کہ ہمیں جہاں تک سماجک اصلاح کا سمبندھ ہے' اسلام کی روشنی سے لابھ اٹھانا چاہئے۔ لینن نے لکھا ہے' ہماری ایکتا کی تحریک مسجدوں میں زیادہ پھیلے گی' اس لیے کہ مسلمان دھارمک لحاظ سے ہمارے بہت قریب ہیں۔ اسی طرح متعدد نیتاؤں نے جو واقعات کو وقت سے پہلے دیکھنے کے عادی ہیں' اقرار کیا ہے کہ اسلام نہایت اچھا' کارآمد اور مفید دھرم ہے' اور اس کا صحیح اندازہ کرنے کے لیے کہ جو کچھ ہم کہہ رہے ہیں' وہ درست بھی ہے کہ نہیں' ہم ذیل کے تین وشوں پر وچار کریں گے۔ سرمایہ' عورت اور اچھوت۔ اور دیکھیں گے کہ اسلام نے ان تین مشکلات کا کیا حل تجویز کیا ہے جو ساری دنیا کے لیے آج وچار نیہ ہیں۔

سرمایہ یا دھن

''پہلے پہل' دھن اتہاس (تاریخ اقتصادیات) کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ لوگ سادگی سے زندگی بسر کرتے تھے اور انھیں لین دین میں روپیہ کی بالکل ضرورت نہ ہوتی تھی' زندگی کے لوازم محدود تھے' اس لیے تبادلہ اشیا سے سارے کام پورے ہو

جاتے تھے۔ یعنی ہر شخص اپنی محنت کے معاوضے میں دوسرے کی محنت کو خرید سکتا تھا۔ یہ سسٹم (نظام) اس لحاظ سے تو اچھا تھا کہ جب تک ساری سماج محنت نہ کرے زندگی کے سکھ پراپت نہیں ہو سکتے تھے' لیکن خود "محنت" کی قیمت مقرر نہ ہو سکی' جس سے بہترین عقل و دماغ رکھنے والے لوگ گھاٹے میں رہتے۔ اس لیے ضرورت لاحق ہوئی کہ کوئی درمیانی شئی ایسی ہو جو محنتوں کو معین کر دے اور وہ معیار کا کام دے۔ چنانچہ اس طرح روپیہ کی ایجاد ہوئی۔ یہ وسیلہ قرار پایا جس سے مختلف چیزوں کی مختلف قیمتیں مقرر کی جانے لگیں۔

"لیکن آئندہ چل کر زیادہ روپے والوں نے سرمایہ اکٹھا کرنا شروع کر دیا اور اس معیار سے ناجائز فائدہ اٹھایا۔ یعنی روپیہ کی او شکتا تو اس لیے تھی کہ ہر چیز کی صحیح صحیح قیمت مقرر ہو' لیکن سرمایہ داروں نے اپنی عقل و دماغ کو زیادہ قیمتی سمجھا اور مزدور کی مقدس قوت بازو کا انکار کر دیا۔ پھر انھوں نے غریب طبقے کے لوگوں پر اس طرح اتیاچار کرنا شروع کر دیا کہ روپیہ ان کی تجوریوں میں تو بھرا رہنے لگا لیکن عوام کی جھولیاں بالکل خالی ہو گئیں' جیسے جل زیادہ دیر تک بند رہنے سے اپوتر اور بدبودار ہو جاتا ہے' اسی طرح روپیہ بھی اگر صرف نہ کیا جائے تو بہت سی گھناؤنی خرابیاں پیدا کر دیتا ہے۔ اسلام نے سرمایہ کو جاری رکھنے کے لیے تین نیم ایسے بتائے جن سے یہ مشکل حل ہو گئی۔ ایک زکوٰۃ کا' دوسرے سود کی حرمت کا اور تیسرے وراثت کا۔

زکوٰۃ کا نیم

"زکوٰۃ کے معنی یہ ہیں کہ ہر سرمایہ دار اپنے مال کا ایک مقرر حصہ حاجت مندوں کو دے اور ہر سال دے۔ یہ روپیہ ایک قومی خزانے میں جمع ہو' وہاں سے ضرورت اور حاجت کے مطابق ہر مستحق کو دیا جائے۔ قرآن کریم نے زکوٰۃ کا بار بار ذکر فرمایا ہے اور کہا ہے کہ وہ لوگ جو اپنے مال سے زکوٰۃ نہیں دیتے اور دھن اور دولت کے انبار جمع کرتے ہیں' انھیں آئندہ زندگی میں یہی دھن عذاب کی صورت میں ملے گا۔ پھر زکوٰۃ

کے علاوہ سرمایہ داروں کو اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کے لیے ابھارا۔ اور زکوٰۃ کے علاوہ خیرات کرنے کے لیے بتاکید کہا' یہاں تک کہہ دیا کہ سرمایہ داروں کے مالوں میں مانگنے والوں اور محروموں کا ایک مقرر حصہ ہے۔ اصل شبد یہ ہیں۔ ''یہ حق'' ہے۔ یعنی یہ خیرات نہیں' اپنا حصہ ہے جو غریب امیر سے وصول کرتا ہے۔

''قرآن حکیم کے نزدیک دھن صرف اللہ کے ہاتھ میں ہے' دنیا میں کوئی اس کا سچا مالک نہیں۔ ہم اور آپ تو اس لیے پیدا کیے گئے ہیں کہ اس کا صحیح استعمال کریں' نہ اس لیے کہ اس سے ناجائز لابھ اٹھائیں۔

''اسی طرح جہاں اسلام نے سرمایہ دار کو حکم دیا کہ وہ باقاعدہ زکوٰۃ دے' غریب کو صبر و قناعت کی تعلیم دی اور اسے بتایا کہ مانگنا اچھا نہیں' دینا بہتر ہے۔

''ایک دفعہ حضور ﷺ کے پاس ایک مانگنے والا آیا۔ آپ نے پوچھا تمھارے پاس کچھ ہے بھی؟ اس نے کہا ہاں ایک ٹاٹ ہے' جس کا کچھ حصہ تو فرش کے کام آتا ہے اور کچھ حصہ میں خود پہن لیتا ہوں اور ایک پیالہ ہے جس میں پانی پیتا ہوں۔ آپ نے فرمایا ''لے آؤ'' وہ لے آیا' تو آپ نے اسے دو درہم سے بیچ ڈالا اور اسے ایک کلہاڑا خرید دیا اور کہا جاؤ جنگل میں لکڑیاں کاٹو اور بیچو۔ یہ مانگنے سے بہتر ہے۔

سود حرام ہے

''سرمایہ دار محض روپے کے بل پر روپے کی تجارت کرنا شروع کر دیتا ہے' اور بغیر کسی کشٹ کے گدوں اور کرسیوں پر بیٹھے ہوئے روپیہ بٹورنا شروع کر دیتا ہے اور چاہتا ہے کہ غریب اور مزدور کا آخری قطرہ خون بھی چوس لیا جائے۔ سود خواری ایک لعنت ہے' جس سے ہماری سماج تنگ آ گئی ہے اور اسے زیادہ دیر تک برداشت نہیں کیا جا سکتا۔ سود خواری مزدور کے خلاف ایک جنگ ہے' جس کے معنی صرف یہ ہیں کہ مزدور کو اس کی محنت کا کم سے کم معاوضہ دیا جائے' جس سے وہ ہمیشہ سرمایہ دار کا محتاج رہے۔ پھر اس کے علاوہ سود کا سمبندھ صرف دھن ہی سے نہیں' بلکہ اخلاق سے بھی

ہے۔ ایک سود خوار کے دل میں منش کے لیے کوئی درد نہیں ہو سکتا۔ وہ اپنے آپ کو ہمیشہ ایک ساہوکار ہی سمجھتا ہے' اور ساری دنیا کو آسامی۔ مردے کا کفن تک اتار لینے میں دریغ نہیں کرتا' اس لیے کہ معاملہ روپے کا ہے' اخلاق کا نہیں۔ ان وجوہ کی بنا پر اسلام نے جو سارے سنسار کا مشترکہ مذہب ہے' سود کو قطعی حرام قرار دیا اور اس طرح انسان پر وہ احسان کیا جو بھولنے کے لائق نہیں۔

وراثت

''ایک بہت بڑے سوشلسٹ کا قول ہے کہ وہ سب سے بڑا احمق ہے' جو جائداد کو غیر موروثہ سمجھتا ہے۔ اسلام نے وراثت کا قانون نافذ کیا اور بتایا کہ روپیہ صرف ایک کے قبضے میں نہیں رہنا چاہیے۔ ماں باپ' خاوند' بیوی' بچے بچیاں سب اس کے مستحق ہیں' چنانچہ قرآن شریف میں سب کے حصے مقرر ہیں۔ یہ کس قدر راستیا ہے کہ بچیاں' باپ کی بیماریاں اور اس کی شکل وصورت اور اس کی عادتیں' خصلتیں تو وراثت میں لیں' لیکن باپ کے دھن سے محروم رہیں۔

''وراثت کے اصول سے روپیہ تقسیم ہوتا چلا جاتا ہے' جس سے رشتہ داروں کو ایک گونہ مدد تو مل جاتی ہے' لیکن وہ خرابیاں نہیں پیدا ہوتیں' جو سرمایہ داری کا خاصہ ہے۔

عورت

''یہ بڑے اچرج کی بات ہے کہ ساری دنیا کا لٹریچر عورت کے حسن وجمال کا اعتراف کرتا ہے۔

ہر بات تیری فسانۂ حسن

''اور ہندی اس باب میں سب سے آگے ہے۔ ہندی نے عورت کو جو لٹریری درجہ دیا ہے' وہ دنیا کی کسی زبان میں نہیں۔ لیکن سوشل طور پر جب عورت کو صحیح معنوں

میں سمجھنے کی ضرورت پیش آتی ہے' اس کمزور طبقے سے زیادہ کوئی مظلوم نہیں رہتا- ہندی ساہتیہ (یعنی ہندی ادبیات) میں عورت نہایت پریم اور پیار کی یوگیہ ہے' لیکن حقوق سے بالکل محروم- اسلام نے عورت کو باپ کی وراثت کا حق دیا ہے اور بات بھی یہی خدا لگتی ہے کہ عورت جو آخری سانس تک تمھارے لیے سرمایہ راحت رہے' وہ تمھارے بعد بھی تمھاری بیوہ کہلائے اور تمھاری جائداد میں اس کا حصہ ہو-

''عورت پر سب سے بڑا ظلم یہ ہے کہ اسے مال ڈھور کی طرح قابل ہبہ سمجھا جاتا ہے' یعنی باپ یہ سمجھے کہ اپنی پتری کا مالک ہوں جسے چاہوں دان دے دوں اور عورت جب تک زندہ رہے' خاوند سے جدا نہ ہو چاہے خاوند اس قابل ہو چاہے نہ ہو' چاہے وہ رکھے چاہے نہ رکھے- بہر حال اسے رہنا ہوگا- ہندوستان میں ہزاروں کی تعداد میں ایسی دکھیا استریاں موجود ہیں جو اپنے پتی کے پاس نہیں رہنا چاہتیں اور وہ چاہتی ہیں کہ انھیں جس شخص کے ساتھ عمر بسر کرنا ہے وہ ان کے ہردے کا مالک ہو' ان کے دل میں دیوتا کے سمان رہے- وہ دل سے اس کی عزت کریں- وہ صرف ایک غلط قانون کی وجہ سے مصیبت میں نہ رہیں' بلکہ انھیں اخلاقی طور پر رعایتیں دی جائیں' جن سے وہ اپنی اصلاح کر سکیں۔ اسلام نے کہا دیکھو شادی کا مقصد ہی یہ ہے کہ تم ایک دوسرے کے لیے پریم پوردک' سکون و راحت کا سامان رہو' اور جب یہی نہیں تو پھر تم دونوں ایک دوسرے کے ساتھ رہنے کے لیے مجبور نہیں- یہ رشتہ تو محبت کے نازک تاروں سے مربوط ہے' جب محبت ہی نہیں تو پھر قانون کی آہنی زنجیریں کیا خاک آرام کا کارن ہو سکتی ہیں-

''عورت کے متعلق ایک بڑی غلط فہمی یہ بھی ہے کہ اسے ہر حالت میں مرد کا شریک کار رہنا چاہیے اور یہ غلط ہے- آج وہ ممالک بھی جنھوں نے عورت کو گھروں کی آرام دہ زندگی سے نکال کر' ملوں' کارخانوں اور سیاسی ایوانوں کی شورشوں میں دھکیلا تھا' اسے بزور پھر گھروں میں واپس بھیج رہے ہیں' لیکن اسلام نے پہلے ہی سے مردوں اور عورتوں کے فرائض علیحدہ علیحدہ مقرر کر دیے جن کی پابندی کرنے سے کسی بداخلاقی

کے پیدا ہونے کا احتمال ہی نہیں ہو سکتا۔ مرد باہر کے کام کاج کے لیے ہیں اور عورت گھر کے انتظام کے لیے۔ عورتیں گھر کا چراغ ہیں' سماج کی رونق نہیں' انھیں ہر طرح کی آزادی ہے' مگر یہ نہیں کہ وہ سرے سے استری تیج اور وشیا ہی سے محروم ہو جائیں۔

اچھوت بھی انسان ہیں

''اسلام کہتا ہے سارے انسان برابر ہیں' چھوت اچھوت میں کوئی فرق نہیں۔ سب ایک ایشور کے پوجاری ہیں' سب اس کے مندروں میں جانے کا حق رکھتے ہیں۔ اس کے نزدیک عزت' مان' دھن یا دولت پر موقوف نہیں بلکہ وہ جو ہردے کا پوتر ہے' وہ بڑے سے بڑے مان کے یوگیہ ہے اور جس کا دل ناپاک ہے' اس کی کوئی قیمت نہیں۔ اسلام اس کا قائل نہیں کہ برہمن اپنے پہلے کرموں کی وجہ سے برہمن ہے اور شودر اپنی پہلی زندگی کا ذمہ دار ہے۔ وہ کہتا ہے تمھاری یہ زندگی پہلی زندگی ہے۔ یہ سوسائٹی یا سماج کا ظلم ہے کہ تمھیں ابھرنے نہیں دیتی اور اس عقیدے پر قانع رکھتی ہے کہ تمھارا قصور نہیں' تمھاری پہلی زندگی کا قصور ہے۔ یہ عقیدہ یعنی آواگون' سرمایہ دار کی ایک چال ہے' جس سے غریب اچھوت میں رہی سہی ہمت بھی جاتی رہتی ہے' اور جب تک یہ موجود ہے اس وقت تک کوئی اصلاح ممکن نہیں۔

صرف دو راہیں

''ہر اس شخص سے جو اچھوت ادھار کا سچا حامی ہے نیائے اور انصاف صرف دو چیزیں چاہتا ہے۔ یا تو یہ کہ سماج میں یہ عقیدہ ایک دھارمک عقیدے کی صورت اختیار کر لے کہ سارا منش ماتر ایک ایسا ہے اور رنگ و نسل کا بڑے سے بڑا اختلاف بھی اس کو خدا کے درشنوں سے روک نہیں سکتا' ہر مندر اور مندر کا ہر گوشہ اچھوتوں کے لیے کھلا ہو' اور یہ اس وقت ہو سکتا ہے جب دلوں کے مندروں میں سے دوئی کے تمام دیوتاؤں کو نکال دیا جائے اور ایک خدا کو جگہ دی جائے۔ سب لوگ سچائی کے ساتھ یہ مان لیں کہ

ہم سب ایک ہی خدا کے پرستار اور پوجاری ہیں اور ہم سب اسی کی چوکھٹ پر اپنا سر جھکائیں- یہ عقیدہ بحالات موجودہ ہندوستان کی مختلف جاتیوں میں پیدا ہونا ناممکن ہے' اس لیے کہ یہاں اچھوت سے نفرت کرنا ایک دھارمک وشے کی حیثیت رکھتا ہے-

دوسری چیز یہ ہے کہ اچھوت کو آ گیا دی جائے کہ وہ جس سماج یا سوسائٹی میں اسے انسانیت کی تمام رعایتیں ملتی ہیں' چلا جائے اور اس کے لیے بڑی ادارتا' اور دل کی بلندی کی اوشکتا ہے- روپوں کی تھیلیوں سے یہ کام نہیں نکلے گا' اس کے لیے وسعت قلب کی حاجت ہے- اچھوت ہمارے شریر کا اہم انگ ہیں' جن سے ہم ان کی بیماری کی وجہ سے گھن کرتے ہیں اور جب علاج کی طرف دھیان بھی دیتے ہیں تو کہتے ہیں دیکھو صرف ویدک ہو' یونانی کی ہوا نہ لگے- کیا اس شخص کو آپ مریض کا سچا خیر خواہ سمجھیں گے' جو ایک قسم کے طریق علاج کے قائل ہو' حالانکہ دوسرے طریق سے فائدہ قطعی اور یقینی ہو- پھر جب ہم اچھوت ادھار چاہتے ہیں تو کیوں ہندو دھرم اور ہندو سماج کی قید کو باقی رکھیں- ہم اچھوت ادھار چاہتے ہیں اور جلد از جلد چاہتے ہیں- ہزار ہا سال کا مریض ایک دم میں اچھا ہونے کو ہے' صرف یہ کہہ دینے سے کہ میں مسلم ہوں' فوراً آسمان تک بلند ہو جاتا ہے--- اس کے بعد بھی اسے کہنا کہ نہیں ہندو ہی رہو' کیونکہ ہم تمھیں دیتے ہیں- کتنی بڑی ناانصافی ہے-

''وقت آ گیا ہے کہ وہ لوگ جو اب تک اسلام سے دور ہیں وہ اس کی خوبیوں کو جان کر اس میں گروہ در گروہ داخل ہوں اور یہ ثابت کر دیں کہ مذہب یا دھرم ایک قسم کا طریق علاج ہے' جس میں ہر وقت تبدیلی کی گنجائش ہے- وہ مسلک جو زیادہ سچا' زیادہ منشا کے قریب اور زیادہ مفید ہو' کیوں نہ قبول کر لیا جائے- روگ میں چاہے کسی قسم کا ہو تعصب جائز نہیں-

''آشا ہے کہ حق پسند طبیعتیں اسے قبول کریں گی اور اس سندیش سے پورا پورا لابھ اٹھائیں گی جو مکے اور یثرب والے نے ہمیں سنایا ہے اور جس سے ایک دم سب دکھ درد دور ہو جاتے ہیں-''

تقسیم ملک سے قبل کے تبلیغی سلسلے کی یہ ایک کڑی ہے اور اس پر لکھا ہے' اشاعت نمبر۱۶۔ نیچے یہ عبارت ہے۔

"نوٹ: ہمارا سارا سیٹ مقامی حضرات چار آنے اور بیرونی حضرات آٹھ آنے کے ٹکٹ بھیج کر منگوا سکتے ہیں۔ کتبہ محمد صادق"

مولانا محمد حنیف ندوی کی اس تحریر سے پتا چلا کہ جس قسم کے لوگوں کو تبلیغ کرنا مقصود ہو' ان کی ذہنی' فکری اور علمی سطح کے مطابق کرنی چاہیے اور اسی زبان اور انداز میں کرنی چاہیے جو ان میں مروج ہو اور جسے وہ آسانی سے سمجھ سکتے ہوں۔

یہاں مولانا کی ایک اور تحریر ملاحظہ فرمایئے --- اس تحریر کا پس منظر یہ ہے کہ علامہ سید سلیمان ندوی نے ۲۲ نومبر ۱۹۵۳ کو وفات پائی۔ ان پر مولانا مسعود عالم ندوی نے جماعت اسلامی کے اس زمانے کے ماہانہ رسالے "چراغ راہ" (کراچی) کے ماہ "اپریل" کے شمارے میں مضمون لکھا۔ لیکن اس مضمون کی اشاعت سے چند روز پہلے ۱۴۔ مارچ ۱۹۵۴ کو خود مولانا مسعود عالم ندوی وفات پا گئے۔ سید سلیمان ندوی کے بارے میں انھوں نے "چراغ راہ" میں جو مضمون تحریر کیا تھا' اس میں مولانا ابوالکلام آزاد کا ذکر بھی کیا تھا اور لکھا تھا کہ "مولانا ابوالکلام آزاد زبان وقلم کے بادشاہ ہیں' مگر ان کا علم ٹھوس نہیں۔"

اس زمانے میں ماہر القادری مرحوم کا رسالہ "فاران" کراچی سے شائع ہوتا تھا۔ انھوں نے اپریل ۱۹۵۴ کے شمارے میں مولانا مسعود عالم ندوی کے متعلق "یاد رفتگان" کے عنوان سے مضمون سپرد قلم کیا' جس میں تحریر فرمایا کہ مولانا مسعود عالم ندوی نے ایک موقعہ پر فرمایا تھا کہ مولانا ابوالکلام کی ذہانت وفطانت کے وہ قائل ہیں' مگر ان کو عربی نہیں آتی۔ نیز فرمایا کہ ڈپٹی نذیر احمد اور مولانا ابوالکلام آزاد نے قرآن کا جو ترجمہ کیا ہے' اسے پڑھ کر یہ حقیقت آشکار ہو جاتی ہے کہ ڈپٹی نذیر احمد عربی جانتے تھے' مگر ابوالکلام عربی نہیں جانتے --- اس پر مولانا محمد حنیف ندوی نے "الاعتصام" کی ۷ مئی' ۱۴ مئی' ۲۱ مئی اور ۲۸ مئی ۱۹۵۴ کی چار اشاعتوں میں ایک مضمون لکھا تھا'

جس کا عنوان تھا۔

''مولانا ابوالکلام عربی نہیں جانتے''

''دارالعروبہ کا عجیب و غریب انکشاف''

''کبرت کلمة تخرج من افواههم''

اس وقت مولانا حنیف ندوی ادارہ ثقافت اسلامیہ سے منسلک تھے اور ''الاعتصام'' کی ادارت میرے سپرد تھی۔

''دارالعروبہ'' کے نام سے مولانا مسعود عالم ندوی نے عربی کی تعلیم کے لیے ایک ادارہ قائم کیا تھا۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی اردو کتابوں کو عربی میں منتقل کرنے کا آغاز دارالعروبہ ہی نے کیا تھا۔

اب ذیل میں مولانا محمد حنیف ندوی کا مضمون ملاحظہ ہو۔

ممکن ہے اس مضمون کے بعض جملوں سے کسی دوست کو اتفاق نہ ہو---لیکن یہ زمانہ ماضی کی ایک یاد ہے۔ پھر جن کے بارے میں مضمون لکھا گیا ہے' وہ بھی کسی کو معاف فرمانے کے عادی نہیں تھے۔ نہ ان کے دھڑے کے لوگ اب کسی کو معاف کرتے ہیں۔

''چراغ راہ'' اپریل ۱۹۵۴ء میں مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم کا ایک تعزیتی مضمون چھپا ہے' جسے پڑھ کر ان کے اخلاص اور سید سلیمان صاحب ندوی کی عظمت کا نقشہ آنکھوں میں پھر گیا۔ اس میں سید صاحب مرحوم کی سیرت اور خدمات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ مسعود عالم صاحب ہمارے گہرے اور بے تکلف دوست تھے۔ ان کی موت کی خبر جب اچانک پہنچی تو نہ پوچھیے کہ کتنا صدمہ ہوا اور کتنی دیر تک ہوش و حواس کے پورے کارخانے میں ایک طرح کا تعطل سا برپا رہا۔ ابھی ہم سوچ ہی رہے تھے کہ ''الاعتصام'' میں ان کے حالات پر مفصل مضمون لکھا جائے کہ ''چراغ راہ'' میں ان کا تعزیت نامہ سے گزرا' جس میں کہ اپنے محسن و محبوب استاد کی خدمت میں انھوں نے درد و اخلاص میں ڈوبا ہوا نذرانہ پیش کر کے حق شاگردی ادا کیا تھا۔

آہ! کسے معلوم تھا کہ یہ شخص جو سید صاحب کے غم میں نڈھال ہے اور ان کی وفات سے حد درجہ متاثر ہے خود قبر کی آغوش میں آسودہ ہونے کو ہے اور اپنے دوستوں کو خون کے آنسو رلانے والا ہے۔

ہم جب مضمون کے اس حصے تک پہنچے کہ

''مولانا ابوالکلام زبان و قلم کے بادشاہ ہیں مگر ان کا علم ٹھوس نہیں''

تو حیرت ہوئی کہ اس تحقیق اور صاف بیانی کی کیا ضرورت تھی؟ اور اس سے دعوت اسلامی کے مقاصد کو کتنی تقویت حاصل ہوئی؟ ہم اس پر حیرت اور استعجاب کا اظہار کر ہی رہے تھے کہ ایک عزیز نے اپریل کا ''فاران'' دکھایا' اس میں ماہر القادری صاحب نے مولانا مسعود عالم پر ''یاد رفتگاں'' کے عنوان سے ایک مقالہ سپرد قلم فرمایا ہے۔ اس میں بھی مولانا آزاد کے بارے میں کچھ تاثرات آئے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ مولانا ابوالکلام کی ذہانت اور فطانت کے وہ قائل تھے مگر یہ جو ان کی عربی دانی کا چار دانگ عالم میں شہرہ ہے' اس کے بارے میں فرمایا کہ ان کو عربی نہیں آتی۔ کہتے تھے کہ ڈپٹی نذیر احمد اور مولانا ابوالکلام آزاد نے قرآن کا جو ترجمہ کیا ہے' اس کو پڑھ کر یہ حقیقت آشکار ہوتی ہے کہ ڈپٹی نذیر احمد عربی جانتے تھے' مگر ابوالکلام کو عربی نہیں آتی۔

''چراغ راہ'' اور ''فاران'' کے یہ دونوں مقام ہم نے بڑی ہی اذیت اور کوفت سے پڑھے اور ہم یقین رکھتے ہیں کہ ہماری طرح ہندوستان اور پاکستان کے بے شمار لوگوں کو اس طرح کے غیر ذمہ دارانہ اور غیر ضروری تنقیدی جملوں سے بے حد قلبی رنج پہنچا ہوگا۔ ماہر القادری صاحب کو تو ہم قطعی معذور سمجھتے ہیں' زیادہ سے زیادہ ان کی معلومات تذکیر و تانیث اور محاورے کے حدود تک محدود ہیں اور وہ بھی ناقص۔ اس سے آگے کی مصلحتوں اور اس سے آگے کے مسائل سے وہ واقف نہیں۔

بہر آئینہ ہمیں ان سے کوئی گلہ نہیں۔ ہم ادارہ ''چراغ راہ'' سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ مولانا مسعود عالم مرحوم کا یہ مضمون شائع کر کے انھوں نے دین کی کیا خدمت انجام دی ہے؟ کیا ان کو اس حقیقت کا علم نہیں کہ مولانا آزاد عالم ہی نہیں بلکہ علم و فضل

کی مثال بھی ہیں اور پورے عالم اسلامی میں ان کی ذات محبوبیت وعقیدت کا بہت بڑا مرکز شمار ہوتی ہے' اور کوئی اسلامی و دینی دعوت جو ان کے استخفاف و تحقیر پر مبنی ہو' جہلا اور بدذوقوں میں رواج پا جائے تو پا جائے' ارباب ذوق وعلم میں مقبول نہیں ہو سکتی۔

کیا جماعت اسلامی میں ایسے ذمہ دار حضرات نہیں ہیں جو اس غلطی کو محسوس کریں؟ ہم متوقع تھے کہ ''چراغ راہ'' کے مدیر جو جماعت اسلامی کے بہت بڑے مزاج شناس ہیں' اس مضمون کو نوٹ دیے بغیر شائع نہ ہونے دیں گے اور یہ بتائے بغیر نہ رہیں گے کہ مسعود عالم صاحب کی اس ''تحقیق'' سے ہم متفق نہیں ہیں اور یہ کہ یہ صرف ان کا ذاتی گمان یا انفرادی بدگمانی ہے' جماعتی رجحان اس سے مختلف ہے۔ جماعت اسلامی ہمیں بتائے کہ اس طرح کی تحقیق و کاوش سے اسلامی دعوت کی گاڑی کتنے قدم آگے بڑھی ہے؟ اور اس سے ان کے ارباب قلم کے مرتبہ علمی میں کس درجہ اضافہ ہوا ہے......؟

لطف یہ ہے کہ تجہیل اس ذات کی ہو رہی ہے جو مدت ہوئی' اپنے علم وفضل کا لوہا منوا چکی اور قلم و زبان کی معجزہ طرازیوں سے فارغ ہو چکی اور جس کی شخصیت کسی درجے میں بھی جماعت اسلامی کی راہ میں رکاوٹ نہیں۔ وہ جس نے ان کے مقابلے میں کبھی کوئی دکان نہیں سجائی۔ ''لٹریچر'' کے بیچنے اور پھیلانے میں ان کا مقابلہ نہیں کیا۔ کاروبار تبلیغ واشاعت کا کوئی مرکز قائم نہیں کیا۔ بیعت وارادت کے جال نہیں بچھائے اور چھوٹے درجے کے اخبار نویسوں اور مصنفوں کو اپنے گرد جمع کر کے قصیدے نہیں لکھوائے' جس سے دوسروں کی دل آزاری کے پہلو نکلتے ہوں۔ یہ تو ہوا کہ ہر کس و ناکس نے انھیں گالیاں دیں اور انھیں طرح طرح کی تہمتوں کا ہدف بنایا۔ لیکن کیا انھوں نے جواب میں ایک حرف بھی کہا......؟

یہ ٹھیک ہے کہ انھوں نے ''تذکرہ'' لکھا اور ''الہلال'' نکالا' جس کی نکتہ سنجیوں اور سحر بیانیوں نے ایک عالم کو متوالا کیا۔ لیکن یہ پرانی بات ہے۔ ''ترجمان القرآن'' کی دونوں جلدیں اور ''غبار خاطر'' البتہ تازہ کارنامہ ہے اور ایسا کارنامہ ہے کہ جس

بجا طور پر ادب وعلم ناز کر سکتا ہے۔ہم نے جس قدر سوچا اور جس پہلو سے غور کیا ہمیں کوئی دینی' دنیاوی اور کاروباری وجہ جواز نظر نہیں آئی' جس کی بنا پر کہ ابوالکلام کی تحقیر کی تاویل کی جا سکے اور اسے دعوت اسلامی کے فروغ کے لیے ضروری ٹھہرایا جا سکے۔

سوچنے کی بات یہ ہے کہ ایسا کوہ وقار اور قناعت وشرافت کا پیکر محسوس جس نے کبھی کسی کو حریف نہیں سمجھا اور لیگ جیسی بڑی اور عظیم الشان تحریک سے متاثر ہو کر بھی اس کے لیڈروں کے حق میں کوئی نازیبا کلمہ استعمال نہیں کیا' جماعت اسلامی کو کب اپنا حریف قرار دے سکتا ہے......؟ اور اگر یہ صحیح ہے کہ ان کا راستہ دوسرا ہے اور جماعت اسلامی کی دعوت کا رخ دوسرا ہے اور دونوں میں بظاہر کوئی وجہ رقابت موجود نہیں' تو پھر کیوں ان کی تذلیل پر جماعت اسلامی کو اصرار ہے؟

افسوس ہے کہ آج مولانا مسعود عالم ندوی زندہ نہیں' ورنہ ہم ان سے براہ راست اور نسبتاً ذرا تختی سے پوچھتے کہ انھوں نے یہ کیا شوشہ چھوڑا ہے۔اللہ تعالیٰ ان کی لغزشوں اور خشونتوں کو معاف فرمائے اور ان کی خدمات کے صلے میں انھیں جنت الفردوس کی نعمتوں سے نوازے۔

ہمیں ''دارالعروبہ'' کے اس ''انکشاف'' پر حیرت ہوئی ہے اور اگر یہ خطرہ نہ ہوتا کہ اس پر نوٹس نہ لینے کی صورت میں فتنہ بڑھے گا اور جماعت اسلامی کے ''مجتہدین'' (اور ان میں کون مجتہد نہیں ہے؟) کو جرأت ہوگی کہ امت کے ہر آدمی کے علم وفضل پر بے دریغ حملہ کریں اور جس کو چاہیں جاہل قرار دیں' تو ہم ان تعلقات کے پیش نظر جو مرحوم سے تھے' کبھی تردید کی ضرورت محسوس نہ کرتے۔ہماری رائے میں جس طرح مرحومین کے حقوق قابل لحاظ ہوتے ہیں' اسی طرح زندہ حضرات کے بھی حقوق ہیں' جن سے اغماض ممکن نہیں۔چنانچہ ہم نے سوچ سمجھ کر فیصلہ کیا ہے کہ اس گمراہ کن غلط فہمی کے خلاف احتجاج کیا جائے' اس لیے ہم مولانا مسعود عالم مرحوم کی روح سے مخلصانہ معافی طلب کرتے ہوئے چند باتیں کہنے پر مجبور ہیں۔

مسعود عالم صاحب نے حضرت مولانا ابوالکلام سے متعلق دو چیزیں بیان کی

ہیں- ایک یہ کہ مولانا کا علم ٹھوس نہیں' اور دوسرے یہ کہ مولانا کو عربی نہیں آتی - یہ دعویٰ بیان کرنے کی ضرورت دراصل یوں پیش آئی کہ علامہ سید سلیمان ندوی کی جامعیت ثابت کرنا مقصود تھی- اس سلسلے میں ان کو بڑے ہی تکلف کا سامنا کرنا پڑا ہے' کہیں بے چارے رشید رضا مرحوم و مغفور میں عیب نکالا اور کہیں امیر شکیب ارسلان کو دینیات میں مبتدی ٹھہرایا ہے- اسی لپیٹ میں ہمارے مولانا بھی آ گئے ہیں- اس ضمن میں خیریت البتہ یہ ہوئی کہ علامہ فراہی تنقید سے بچ گئے ہیں یا بچا لیے گئے ہیں تا کہ مولانا امین احسن اصلاحی صاحب کی رگ تلمذ نہ پھڑک اٹھے- آخر دوستی اور جماعت کا اتنا پاس تو ہونا ہی چاہیے- یہی وہ نزاکت تھی کہ جس کی وجہ سے علامہ فراہی سے تقابل نہیں ہو پایا ورنہ کیا عجب تھا کہ علوم تفسیر میں مہارت و امامت کے باوجود ان کے بارے میں بھی کہا جاتا کہ علوم حدیث میں یہ محض کورے تھے- مولانا فراہی کے اس طرح بچ جانے اور تنقید کا ہدف نہ بننے پر ہم مولانا امین احسن کی خدمت میں مبارک باد پیش کرتے ہیں-

جماعت اسلامی کے ''خردمندوں'' سے ہم ادب سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ کیا مولانا سید سلیمان مرحوم کی جامعیت ایسا ٹیڑھا مسئلہ تھا کہ دوسروں کو جاہل ٹھہرائے بغیر ثابت ہو ہی نہیں سکتا تھا؟

ہم علامہ مرحوم کی جامعیت کے دل سے قائل ہیں اور کسی مقابلہ و تنقیص کے بغیر یہ مانتے ہیں کہ بلاشبہ ان میں علم و فضل کی بہت سی خوبیاں جمع ہو گئی تھیں- لیکن اگر مولانا مسعود عالمؒ کے طرز تقابل اور انداز استدلال کو قائم رکھا جائے اور آگے بڑھایا جائے تو پھر اس میں خطرہ یہ ہے کہ ان کو جامع ثابت کرنے کے لیے تو ان تین شخصیتوں (ابوالکلام' رشید رضا اور شکیب ارسلان) کی توہین کرنا پڑی' مولانا ابوالاعلیٰ صاحب مودودی اور جماعت کے دوسرے حضرات کی جامعیت ثابت کرنے کے لیے کس کس کو جاہل ٹھہرایا جائے گا......؟

سوال یہ ہے کہ جس کی عربی دانی کا چار دانگ عالم میں شہرہ ہے' اسے عربی نہیں آتی یا اس کا علم ٹھوس نہیں' اس حقیقت کا اظہار کرنے والا کون ہے اور دونوں میں مرتبہ و

درجے کا کوئی فرق ہے یا نہیں؟ یہ سوال بہت اہم ہے۔ آیئے پہلے مولانا ابوالکلام کے رتبہ علمی کی تعیین کریں' ہمارے نزدیک سیاسیات میں' وہ اس لائق ہیں کہ سی آر داس' گاندھی اور موتی لال کے پہلو میں بیٹھیں' جو امرلال بھی ان کی برابری نہیں کر سکتے۔ یہ الگ بات ہے کہ سیاسی خوش بختیوں نے ان کے سر پر وزارت عظمیٰ کا تاج سجا رکھا ہے اور مولانا وزارت تعلیم پر قانع ہیں۔

اردو ادبیات میں ان کی رفاقت شبلی کے ساتھ ہو گی' ان سے کم درجے کے مصنفین ان کے ہم سر نہیں ہو سکتے اور ماہر القادری ایسے تہی فکر لوگوں کو تو قطعی حق نہیں پہنچتا کہ ان کی زبان اور پیرایہ بیان کو زیر بحث لائیں' کیونکہ زبان وہ نہیں جس کو لکھنؤ اور دہلی کے چند ہرزہ گو شعرا زبان قرار دیتے ہیں' بلکہ اس کے برعکس زبان شبلی اور ابوالکلام کی ادبی نگارشات کا نام ہے۔ دینی علوم' ذہنی فکر و تصور اور خالص اسلامی و مذہبی بصیرت و ژرف نگاہی کا جہاں تک تعلق ہے' اس میں مولانا اس دور کے لوگوں سے بہت آگے ہیں' اور اس بارے میں جب ان کے مرتبہ و درجہ کی تعیین کی جائے گی تو انھیں ابن قیم اور حافظ ابن تیمیہ کے قریب ہی کہیں جگہ ملنا چاہیے...... یہ بات صرف ہم ہی نہیں کہتے بلکہ علامہ سید سلیمان مرحوم کے بھی قریب قریب یہی تاثرات تھے۔

اب ان کو زبان و قلم کا بادشاہ ٹھہرانے کے باوجود عربی نہ جاننے کا طعنہ دینے والے کے علم و فضل کا جائزہ لیجیے۔ مرحوم مسعود عالم صاحب نے بلاشبہ جماعت اسلامی کی اخلاص کے ساتھ خدمت کی ہے اور اردو اور عربی میں تحریک اسلامی کے نقطہ نظر سے مفید اور عمدہ کتابیں لکھی ہیں' لیکن ان کی اردو تصنیفات کا جب تذکرہ آئے گا تو ان کا شمار نعیم صدیقی اور مولانا اصلاحی کے درجے کے لوگوں میں ہو گا' ان سے اونچے اور بڑے لوگوں میں نہیں۔

اسی طرح ان کے عربی ترجموں سے، علامہ رشید رضا اور شکیب ارسلان پر کڑی تنقید کرنے کے باوجود جن جن صلاحیتوں کا اندازہ ہوتا ہے' وہ صرف یہ ہے کہ مولانا ابوالکلام کے تلمیذ خاص مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کے بعد کہیں انھیں جگہ ملے گی۔

رشید رضا یا شکیب ارسلان یا اس صف کے دوسرے ادبا کی ادبی عظمتوں میں بہرآئینہ ان کا کوئی حصہ نہیں۔

یہ ہے نہایت مختصر الفاظ میں ان دونوں کے مرتبہ علم و فضل میں تفاوت کی مقدار' تو کیا اس کی روشنی میں مولانا مسعود عالم اس لائق ہیں کہ مولانا کے بارے میں ان کے اس انکشاف کو کوئی وزن دیا جائے؟

علاوہ ازیں غور طلب نکتہ یہ ہے کہ تنقید کے بھی کچھ طبعی اور جائز حدود ہوتے ہیں' جن سے تجاوز نہیں ہو سکتا اور اگر کوئی ان سے متجاوز ہوتا ہے تو اس کی بات بجائے اس کے کہ موثر ثابت ہو' الٹا اضحوکہ بن کے رہ جائے گی۔

مثلاً سعدی پر تنقید کا یہ انداز تو سمجھ میں آتا ہے کہ ان کی بعض کہانیوں میں وہی اخلاقی عنصر غائب ہے جو ان کا موضوع خاص ہے' لیکن یہ کہ سعدی کو فارسی نہیں آتی تھی' اس خرافہ کو کون مانے گا؟---غالب پر یہ تنقید بغیر کسی کھٹکے کے کیجیے کہ بسا اوقات ان کے خیالات کی بلند پروازی الفاظ کو پیچھے چھوڑ جاتی ہے' جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ معنی عنقا ہو کر رہ جاتا ہے' سب لوگ اس پر کان دھریں گے۔ لیکن اگر آپ یہ فرمانے لگیں کہ غالب فارسی تو اچھی طرح جانتے تھے مگر اردو نہیں' تو اس انداز تنقید کو کوئی نہیں مانے گا۔

اسی طرح اگر آپ شکسپیر کے متعلق یہ کہیں گے کہ ان کی زبان موجودہ زبان سے مختلف ہے اور موجودہ گرائمر کے اعتبار سے اس انگریزی کو حق بجانب ٹھہرانا بہت مشکل ہے' تو ہر کوئی اس پر صاد کرے گا' کیونکہ انگریزی زبان نے اس دور میں جو سلجھاؤ اور تعین اختیار کیا ہے' وہ شکسپیر کے وقت میسر نہیں تھا۔ لیکن کون بے وقوف ہے جو یہ کہے کہ شکسپیر غلط انگریزی لکھتا تھا۔

ٹھیک اسی نہج سے مولانا ابوالاعلیٰ مودودی پر تنقید کرتے وقت ان کے تصورات کو ہدف بحث ٹھہرایا جا سکتا ہے' ان سے اتفاق بھی ہو سکتا ہے اور اختلاف بھی---لیکن اگر کوئی صاحب یہ کہیں کہ ان سے قریبی تعلق رکھنے کے بعد یہ حقیقت سامنے آئی کہ ان

کو تو نماز جنازہ پڑھنا نہیں آتی' تو اس انکشاف کا ایک خندہ ترحم کے ساتھ استقبال کرنے کے سوا اور کوئی چارہ ہے؟

مولانا ابوالکلام کے مضامین اور ان کی کتابیں آج ہر شخص کے سامنے ہیں' ان میں کتنا علم ہے' کس درجہ گہرائی اور معنویت ہے اور عربی ماخذ اور دینی سرچشموں سے کتنا قریبی تعلق ہے اور استدلال کا محل قائم کرنے میں ان سے کتنی مدد لی گئی ہے' اس حقیقت سے ہر پڑھا لکھا آدمی آگاہ ہے--- ان کی سیاسیات کو زیر بحث لایا جا سکتا ہے' ان کی جدتوں اور طرفہ طرازیوں پر اعتراض ہو سکتا ہے اور دین و مذہب سے متعلق ان کے مخصوص و عمومی تصور پر بھی قیل و قال کی گنجائش نکل سکتی ہے اور کون ایسا صاحب علم ہے جس کی ہر بات مسلم ہو اور جس نے فکر و استدلال کی وادی میں کہیں ٹھوکر نہ کھائی ہو' لیکن یہ کتنا بڑا ظلم ہے کہ آپ اسی علم میں ان کو جاہل ٹھہرائیں' جس میں کہ انھوں نے اپنی علمیت کے علم گاڑے ہیں' اور اسی اقلیم میں ان کے اختیارات چھیننے کی سعی کریں کہ جس میں ان کی حکومت و سطوت کا سکہ بلا شرکت غیرے رواں ہے۔

مسعود عالم صاحب مرحوم کہتے ہیں کہ مولانا کا علم ٹھوس نہیں۔ ہم پوچھنا چاہتے ہیں کہ ٹھوس سے کیا مراد ہے؟ اگر وہ کہتے کہ ''ٹھس'' نہیں ہے' تو ہم اس دعوے کو بغیر کسی تذبذب کے تسلیم کر لیتے۔ واقعی ان کی نگارشات میں اتھلا پن نہیں' بے مزہ اور حد سے بڑھا ہوا پھیلاؤ نہیں' بے روح و بے کیف طوالت نہیں--- لیکن یہ کہ جو بات وہ کہتے ہیں اس کے ثبوت کے لیے متعلقہ ماخذ کی چھان بیان نہیں کرتے اور ان میں بحث و تمحیص کا مواد جمع کر کے قرینے اور سلیقے سے صفحات قرطاس پر نہیں پھیلاتے تو اس کو اس وقت تک کون مانے گا' جب تک کہ ان کی تصنیفات موجود ہیں اور جب تک کہ ذوق و علم کا قطعی فقدان نہیں ہو جاتا ہے؟

پھر کسی شخص کی عظمت کا اندازہ لگانے کے لیے اصول یہ نہیں کہ اس کی غلطیوں اور لغزشوں کو ٹٹولا جائے' بلکہ یہ ہے کہ فکر و علم کے جس گوشے میں اس کی شہرت ہے' دیکھا یہ جائے کہ اس میں اس کے کام اور خدمات کی نوعیت کیا ہے؟ کیونکہ اگر غلطی اور سہو و

نسیان سے کسی انسان کی بڑائی سے متعلق رائے قائم کی گئی تو پھر کون ہے جو اس سے دامن بچا سکے اور عصمت و پاکی کا دعویٰ کر سکے؟ ادیب وہ نہیں جس نے تذکیر و تانیث کی غلطی نہ کی ہو اور کہیں محاورہ و لسان کے تقاضوں سے روگردانی نہ کی ہو' بلکہ ادیب وہ ہے جس نے لغزشوں کے باوجود زبان کو نئے نئے خیالات و افکار سے مالا مال کیا ہو اور بحیثیت مجموعی اس کی خدمات ایسی ہوں کہ علم اس پر ناز کرے۔ فلسفی وہ نہیں جس نے افکار و عقائد کی بحثوں میں کبھی ٹھوکر نہ کھائی ہو۔ بلکہ فلسفی وہ ہے جس نے ان ٹھوکروں کے باوصف حقائق اشیا سے اس انداز سے تعرض کیا ہو کہ اس سے افکار کی دنیا میں سلجھاؤ پیدا ہوتا ہو اور اشہب فکر کو آگے بڑھنے کے لیے کچھ روشنی ملتی ہو۔ اسی طرح ایک شاعر' ایک موسیقار اور مصور کا کمال یہ نہیں کہ ان کے اظہار خیال میں کہیں خامی نہ ہو' ان کے پیش کردہ نغموں میں کہیں ناہمواری نہ ہو اور ان کے نقوش و مرقعہائے خیال آفرین میں کہیں جھول نہ ہو' بلکہ اس کے برعکس یہ ہے کہ ان کی شاعری سے افکار میں جلا پیدا ہوتی ہو۔ دلوں میں استہزاز وارتعاش کی کیفیتیں متموج ہوتی ہوں اور ایسا معلوم ہوتا ہو کہ جو کچھ کہا گیا ہے اس میں عمدہ ترین اور اعلیٰ ترین اقدار فکر کی ترجمانی کی گئی ہے۔ اسی طرح ایک اچھے موسیقار سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ جن نغموں کو وہ پیش کرتا ہے اس میں اکثریت ایسے نغموں کی ہو کہ پردہ گوش سے ٹکرا کر دلوں میں اتر سکیں اور زندگی و حیات کی معنویتوں کو بیدار کر سکیں، بالکل یہی کیفیت مصوری کی ہے' یہاں بھی معیار کمال یہ ہے کہ مصور ایسے نقوش پیش کر سکے جن میں بے جان خطوط کے پیچھے زندگی اور مقصد کا عجیب و غریب امتزاج جھلکتا ہو اور ایسا محسوس ہوتا ہو کہ صاحب فن کچھ کہنا چاہتا ہے۔ معاشرے کی تلخیوں کو اجاگر کرنا چاہتا ہے اور اپنے زمانے کے لوگوں کو کوئی مخصوص پیغام سنانا چاہتا ہے۔

مثالوں سے بھڑ کیے گا نہیں۔ بحث جائز و ناجائز کی نہیں اور اس چیز کی نہیں کہ موسیقی و مصوری ایسے مزخرفات کی دین میں حیثیت کیا ہے۔ بلکہ اس حقیقت کو یہاں ذہن نشین کرنا مقصود ہے کہ ایک اہل فن کا کمال صرف لغزشوں اور غلطیوں سے بچنا ہی

نہیں بلکہ یہ ہے کہ اس کی تحقیقات میں بحیثیت مجموعی کیا کیا خوبیاں اور کیا کیا محاسن پنہاں ہیں اور اس نے اپنے فن سے کن کن نئی سمتوں پر روشنی ڈالی ہے۔ معانی و مطالب کے کن کن نئے دروازوں پر دستک دی ہے اور فکر و نظر کی کن کن نئی راہوں کو کھولا ہے؟ ان مثالوں کو صرف توضیحی پیمانے تصور فرمایئے و تلك الامثال نضربها للناس و ما يعقلها الا العالمون اور اس خیال کو ذہن میں رکھیے کہ کسی شخص کے کمال اور خوبی کا اندازہ لگانے کے لیے اس میدان کا جائزہ لینا چاہیے' جس میں اس نے کچھ کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں، اس گوشے کو ٹٹولنا ضروری نہیں کہ جس میں اس نے یا تو کچھ کیا ہی نہیں اور یا ٹھوکریں کھائی ہیں۔

یعنی یہ نہ دیکھیے کہ ایک صاحب کا اشہب خیال کہاں کہاں بدکا ہے' بلکہ دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ کہاں پہنچا ہے اور کیسے پہنچا ہے' کیونکہ اگر اس کسوٹی کو صحیح کسوٹی نہ مانا جائے تو پھر کتنے ہی ایسے ادیب اور شاعر نکلیں گے جو زبان و محاورے کے حدود سے سرمو ادھر ادھر نہیں ہوتے، لیکن ادب میں ان کا کوئی مقام نہیں اور ان کا دامن علم و تحقیق کی دولت سے چونکہ یکسر تہی ہے اس لیے ان کی کوئی تخلیق بھی نہیں۔

اس مختصر تمہید کا مقصد یہ ہے کہ مولانا مسعود عالم زیادہ سے زیادہ کہنا یہ چاہتے تھے کہ مولانا آزاد نے ترجمان القرآن میں کہیں کہیں ترجمے کی غلطیاں کی ہیں اور ایسی چیزوں کا اظہار کیا ہے جو تقاضائے عربیت کے سراسر منافی ہیں۔ یہ دعویٰ بجائے خود محل نظر ہے اور ہم بتائیں گے کہ سورۃ مائدہ کے جس مقام کا حوالہ دیا گیا ہے اور جس غلطی کی نشان دہی کی گئی ہے' اس میں مولانا کی روش صحیح ہے اور مولانا مسعود عالم کی گرفت ایسے آدمی کی گرفت ہے جس نے کم از کم ترجموں کی نزاکت پر کبھی غور نہیں کیا اور جس کی نظر باایں انشا پردازی اور عربی نویسی کی مشق و مزاولت کے ''تفہیم القرآن'' کے صفحات سے آگے نہیں بڑھی۔ لیکن اس سے یہ کب ثابت ہوا کہ اس کے بعد ان کا نکالا ہوا یہ نتیجہ بھی درست ہے کہ مولانا کو عربی نہیں آتی۔ ترجمے میں غلطی ہو سکتی ہے، تعبیر میں ہر وقت خطا کا امکان ہے اور ہم کبھی مولانا آزاد کی خوبیوں اور کمالات کے اس درجے

قائل نہیں ہوئے کہ ان کو سہو و نسیان اور لغزش و خطا سے پاک جانتے ہوں۔ ان کے کتنے ہی افکار سے ہمیں اختلاف ہے اور کتنے ہی ایسے مقامات ہیں کہ جہاں ہماری رائے میں ترجمے کو اس سے زیادہ بہتر و اعلیٰ بنایا جا سکتا تھا اور شاید ہمیں اس رائے کے اظہار میں اولیت حاصل ہے کہ مولانا نے جس درجہ محنت' مطالب و فوائد کے سمجھانے میں کی ہے اتنی محنت ترجمے کے گیسوئے معقد کو سلجھانے میں نہیں کی۔ ہمیں یاد پڑتا ہے کہ ''الاعتصام'' میں کہیں ہم نے یہ لکھا ہے' مگر جو کچھ بھی ہو گیا ہے اور ان کی ذہانت' عبقریت اور مطالعہ و دقت نظر سے' ترجمے نے جو قالب بھی اختیار کر لیا ہے' اس کے بارے میں ہماری رائے یہ ہے کہ وہ اپنے معیار اور انفرادیت کے لحاظ سے اس سلسلے کی پہلی اور کامیاب کوشش ہے۔

ترجمہ کبھی بھی اصل خوبیوں کا غماز نہیں ہوتا اور پھر قرآن کا ترجمہ ان معنوں میں ہی کامیاب ترجمہ کہلا سکتا ہے کہ اس میں اس کے تمام ادراک اور اعجاز طرازیوں کو سمیٹ لیا جائے اور یاد رکھیے کہ اگر یہ ممکن ہے تو پھر قرآن کا جواب بھی ممکن ہے۔

ایک بڑی مشکل قرآن کے ترجمے میں یہ ہے کہ یہاں ایک لفظ' کئی کئی پہلو' کئی کئی سمتیں اور جہتیں رکھتا ہے اور کامیاب سے کامیاب مترجم کی فنی کوششیں بھی اس سے آگے نہیں بڑھ پاتیں کہ کسی ایک پہلو یا سمت و جہت کا احاطہ کر لیں۔ وہ جامعیت و شمول جو قرآن کے الفاظ میں ہے کہ تمام پہلوؤں کو گھیر رکھا ہے' کسی زبان میں منتقل ہو ہی نہیں سکتا۔

ترجمے میں اس جامعیت و شمول کو کہاں کہاں صدمہ پہنچتا ہے اور کس کس طرح اس کا معانی پر اثر پڑتا ہے' یہ معلوم کرنے کے لیے مولانا اشرف علی تھانوی مرحوم کی بعض کاوشوں کی داد دینا پڑتی ہے۔ انھوں نے جب محسوس کیا کہ ایک لفظ جو استنباط و استدلال کے کئی پہلو رکھتا ہے اور فقہ و استدلال میں ان سے کام بھی لیا جاتا ہے' لیکن مروجہ ترجموں میں اس کا اظہار نہیں ہوا تو اپنے ترجمے میں انھوں نے اس کا خصوصیت سے خیال رکھا کہ فقہی جامعیت اور استدلال اور استنباط کا شمول اس میں منعکس ہو

سکے- اس نقطہ نظر سے ہم نے ان کے ترجمے کا جائزہ لیا تو ہمیں کہنا پڑا کہ انھوں نے ایک نہایت ہی مفید کام کیا ہے-

لیکن قرآن کے ترجمے کے لیے کیا یہی کافی ہے کہ اس میں اصل نکات و معانی کا سراغ مل سکے' یا اس کے علاوہ بھی کوئی اہم تقاضا ہے جس کا خیال رکھنا بہت ضروری ہے- ہمارے خیال میں ترجمہ قرآن کی پہلی اور بنیادی خوبی یہ ہونی چاہیے کہ اس پر بجائے خود الہامی ہونے کا گمان ہو- اس اجمال کو اگر تفصیل سے دیکھنا ہو تو بائیبل کے اردو ترجمے پر غور فرمایئے- یہ ترجمہ گو نسبتاً پرانا ہے' اس پر بھی اس میں ایک نوع کا وقار' ایک طرح کی الہامی دل آویزی' اور سحراب بھی موجود ہے جو ہر پڑھنے والا اول دہلہ میں محسوس کر سکتا ہے- اس کے انگریزی ترجمے کے تو کیا کہنے' لیکن اس اردو ترجمے کے تیور بھی قابل صد داد ہیں' اس کے مقابلے میں ہمارے اردو ترجمے دیکھیے تو روکھے' پھیکے اور بالکل بے جان! حالانکہ قرآن اور صحف قدیمہ میں اعجاز و بلاغت کا جو فرق ہے وہ معمولی نہیں' غیر معمولی ہے-

مولانا آزاد کے ترجمے کی پہلی اور بنیادی خوبی ہمارے نزدیک یہ ہے کہ اس سے قرآن کی بلاغتوں اور سحر آفرینیوں کا کچھ کچھ اندازہ ہوتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ جب ترجمے کی حلاوت کا یہ عالم ہے تو اصل آیات کن اعجازات و خوارق کی حامل ہوں گی- رہا یہ سوال کہ آیا جو شخص عربی نہیں جانتا وہ اس کے مزاج اور اس کی خوبیوں اور محاسن کو اس طرح فنکارانہ طور پر دوسری زبان میں منتقل کر سکتا ہے؟ تو اس کے جواب میں کچھ کہنا' آپ کا کام ہے' ہمارا نہیں-

آیئے اب آیت زیر بحث پر غور کریں اور یہ دیکھیں کہ آیا مولانا نے اس کے ترجمے میں فی الواقع کوئی ایسی جدت کی ہے کہ جس کی وجہ سے ان کو اتنی بڑی سزا کا مستحق گردانا جائے اور بہ یک جنبش قلم عربیت کے ذوق صحیح سے محروم کر دیا جائے-

آیت یہ ہے-

إِنَّآ أَنزَلْنَا ٱلتَّوْرَىٰةَ فِيهَا هُدًى وَنُورٌ ۚ يَحْكُمُ بِهَا ٱلنَّبِيُّونَ ٱلَّذِينَ

اَسْلَمُوْا۔(المائدہ:٤٤)

اس کا ترجمہ مختلف علما نے کیا اختیار کیا ہے؟ اس کو بعد میں دیکھیے گا۔ پہلے ڈپٹی نذیر احمد کا ترجمہ ملاحظہ فرمایئے۔

"بے شک ہم نے توراۃ نازل کی جس میں ہر طرح کی ہدایت اور نور ہے۔ خدا کے فرماں بردار بندے انبیاے بنی اسرائیل اسی کے مطابق حکم دیتے چلے آئے ہیں۔"

ہاں! یہ وہی ڈپٹی نذیر احمد ہیں جن کی عربی دانی مولانا مسعود عالم مرحوم کے نزدیک بھی مسلم ہے۔ ان کے نزدیک بھی جب "یحکم بہا" کا ترجمہ یہی "حکم دیتے چلے آئے ہیں" صحیح ہے تو پھر غور فرمایئے کہ بے چارے مولانا آزاد کا کیا قصور ہے کہ بلاد عرب سے ہجرت پر ان کو مجبور کیا جائے؟

شیخ الہند مولانا محمود حسن اس آیت کے سلسلے میں فرماتے ہیں۔

"اس پر حکم کرتے تھے پیغمبر"

شاہ عبدالقادر دہلوی اردو میں السابقون الاولون' پہلے مترجم قرآن اس کا ترجمہ ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں

"اس پر حکم کرتے پیغمبر"

مولانا تھانوی رحمہ اللہ کے الفاظ یہ ہیں "انبیا جو کہ اللہ تعالیٰ کے مطیع تھے اس کے موافق یہود کو حکم دیا کرتے تھے"

فارسی ترجموں میں شاہ ولی اللہ صاحب فرماتے ہیں

"حکم مے کنند باآں پیغمبراں"

اور اگر سعدی کی طرف جو ترجمہ منسوب ہے' وہ صحیح ہے تو اس کے الفاظ بھی قریب قریب اسی مفہوم کو ادا کرتے ہیں۔

یہ سارے ترجمے آپ کے سامنے ہیں "فیصلہ دینا" صرف مولانا مودودی نے تفہیم القرآن میں لکھا ہے اور ہم اس ترجمے کو بھی غلط نہیں سمجھتے۔ ہمارا موقف یہ ہے کہ مولانا آزاد نے جو ترجمہ کیا ہے وہ زیادہ درست' موزوں اور سیاق وسباق کے مطابق

ہے' اور اگر مولانا مسعود عالم صاحب مرحوم' ان ترجموں پر ایک نظر ڈال لیتے اور کم از کم ڈپٹی نذیر احمد کے ترجمے ہی کو دیکھ لیتے' جن کی عربیت کے وہ خود بھی مداح ہیں تو اتنی بڑی بات ان کے منہ سے نہ نکلتی۔ ڈپٹی نذیر احمد کی عربیت کے ہم بھی قائل ہیں۔ ان کے ترجمے میں کیا کیا خامیاں ہیں؟ یہ بڑا ہی دلچسپ موضوع ہے جو الگ بحث چاہتا ہے۔ ان کی یہ خامیاں اور ترجمے کی غیر اختیاری لغزش ایسی نہیں کہ ان کا تعلق ان کی عربیت سے ہو۔ بلکہ اس کے برعکس ان کا معاملہ یہ ہے کہ قرآن کی ''لسان مبین'' کو وہ دلی کے روزمرہ میں سمونا چاہتے ہیں اور اگر کوئی روزہ مرہ ان کی نظروں میں جچ جائے تو قرآن کے مطالب و معانی کو اس کی بھینٹ چڑھا دیتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ کہیں کہیں ترجمے نے ابتذال کی شکل اختیار کر لی ہے۔

ان منقولہ ترجموں سے یہ بات تو واضح ہو ہی گئی کہ مولانا آزاد نے آیت زیر بحث کے ترجمے میں شاہ ولی اللہ' شاہ عبدالقادر' شیخ الہند' اور دوسرے مترجمین کا تتبع ہی کیا ہے' مخالفت نہیں کی اور اگر یہ لوگ بھی عربی نہیں جانتے' تو ہم مانے لیتے ہیں کہ عربی کیا مولانا آزاد اردو بھی نہیں جانتے۔ لیکن یہ دیکھ لیجیے کہ اس لپیٹ میں اور کون کون بزرگ آتے ہیں؟

اس میں شبہ نہیں کہ ''یحکم بھا'' کا ترجمہ فیصلہ دینا صحیح ہے۔ لیکن! ترجمے میں کئی اور چیزیں بھی دیکھی جاتی ہیں۔ عربی میں جس نے لغت و ادب کا سرسری مطالعہ بھی کیا ہے' وہ جانتا ہے کہ ایک عام قاعدہ اس میں تضمن کا بھی ہے' جس کا مطلب یہ ہے کہ ایک لفظ اگر ترجمہ و لغت کے اعتبار اور عام استعمال کے لحاظ سے ایک متعین معنی رکھتا ہے' مگر کبھی کبھی یہ کسی دوسرے معنی پر بھی مشتمل ہوتا ہے' پھر یہ اشتمال اور تضمن کبھی کبھی اتنا زبردست ہوتا ہے کہ اس سے لفظ کے پہلے تمام تقاضے ہی بدل جاتے ہیں۔ یعنی حالات تک میں تبدیلی آ جاتی ہے۔ تذکیر و تانیث میں اختلاف ہو جاتا ہے اور معنی کچھ کا کچھ ہو جاتا ہے۔ یہاں ''یحکم بھا'' میں بھی اسی تضمن کا یہ کرشمہ ہے کہ بجائے ''یقضی'' کے یہاں معنی ''یامر'' کے ہو گئے ہیں۔ مناسبت یہ ہے کہ اس آیت کریمہ

میں ذکر اس بنیادی اور اساسی حقیقت کا ہو رہا ہے کہ تورات وانجیل میں جو تعلیم ہے اور جن اصولوں کو اس میں بیان کیا گیا ہے' وہ ایسے مشترک اور عمومی ہیں کہ سارے انبیا انہی کو بیان کرتے اور دہراتے چلے آئے ہیں۔ اور یہی مامورات اور یہی منہیات دراصل نوع انسانی کی مشترکہ میراث اور دولت ہیں۔ لہٰذا ایسا کیوں ہے؟ کہ جب انہی اصولوں کو قرآن میں مع شئی زاید کے بیان کیا جاتا ہے اور اس کی روشنی میں ہدایت آسمانی کے کچھ بچے تلے قدم اٹھائے جاتے ہیں تو اہل کتاب اسی پر ناک بھوں چڑھانا شروع کر دیتے ہیں۔

غرض یہ ہے کہ اہل کتاب کو پھر انہی اصولوں کی طرف متوجہ کیا جائے کہ تورات و انجیل میں اصول و مبانی کے نقطہ نگاہ سے کوئی اختلاف نہیں۔ ظاہر ہے کہ یہاں کسی خاص متنازع فیہ جزئیہ سے بحث نہیں کہ اس کا ترجمہ ''فیصلہ دینا'' کیا جائے بلکہ سیاق کا تقاضا یہ ہے کہ پوری تعلیمات اور عقائد و ایمانیات کی پوری فہرست کو ملحوظ و مرعی رکھا جائے' اور اہل کتاب سے پوچھا جائے کہ تمھارا طرز عمل کیوں متعصبانہ ہے اور تم کیوں قرآن کی تعلیمات کو اچنبھے سے سنتے اور جہالت سے ٹھکراتے ہو؟

ہم سمجھتے ہیں کہ اس مختصر وضاحت سے ہمارا موقف اچھی طرح واضح ہو جاتا ہے کہ دونوں ترجمے اگرچہ صحیح ہیں لیکن مولانا آزاد کا ترجمہ سیاق کے عمومی تقاضے کے اعتبار سے زیادہ موزوں ہے۔ اس وقت ہمارے سامنے جس غلطی کی نشان دہی کی گئی تھی' وہ یہی تھی جس کا جواب ہم دے چکے۔

مدیر ''فاران'' اگر اس کے علاوہ دوسری غلطیاں بتائیں گے' تو ہم ان کے ممنون ہوں گے اور ابھی سے ان کو یقین دلائے دیتے ہیں کہ اس معاملے میں وہ ہمیں قطعی غیر منصف نہیں پائیں گے۔ اگر مولانا آزاد نے فی الواقع کہیں ٹھوکر کھائی ہے اور ایسا ترجمہ کیا ہے جو تقاضائے عربیت کے خلاف ہے تو ہم پہلے شخص ہوں گے جو اس کو بسر و چشم قبول کریں گے۔ کیونکہ ہم ان کی گوناگوں خوبیوں اور کمالات کے قائل ہونے کے باوجود یہ رائے رکھتے ہیں کہ ان سے غلطیاں سرزد ہو سکتی ہیں۔ بلکہ اس سے بھی آگے

بڑھ کر ہم یہ کہتے ہیں کہ ترجمہ قرآن کی تصحیح کا مسئلہ اتنا اہم ہے کہ مولانا مسعود عالم مرحوم اگر اس خشونت کا اظہار کیے بغیر ان کی غلطیوں کی طرف اہل علم کو اور خود مولانا کو متوجہ کرتے تو یہ ان کی بہت بڑی علمی خدمت شمار ہوتی اور ہر کوئی اس کو سراہتا۔

ہمارے گلے شکوے کی بنا اس غلطی کی نشان دہی پر نہیں کہ یہ تو بجائے خود نیکی اور عین خیر سگالی ہے، ہمارا احتجاج اس غلو کے خلاف ہے کہ اتنی سی بات پر ان کے علم کو سطحی قرار دے دیا جائے اور مسلمہ خدمات اور وقیع کارناموں کے باوجود ان کو دائرہ عربیت سے نکال باہر کیا جائے کہ انھوں نے ان کے نقطہ نظر سے اتفاق کیوں نہیں کیا اور وہی ترجمہ کیوں اختیار نہیں کیا جس میں تفہیم القرآن کے مصنف منفرد ہیں۔

ہم مولانا آزاد سے زیادہ قریبی تعلقات نہیں رکھتے، البتہ الہلال' ترجمان القرآن اور غبار خاطر میں ان کی معجزہ طرازیوں کا لطف اٹھایا ہے۔ کبھی کبھی ان محفلوں میں بھی شرکت کی ہے' جس میں کہ مولانا نے بہ یک وقت' مختلف اور متضاد قسم کے امور پر کامیابی سے گفتگو کی ہے۔ ہم نے دیکھا ہے کہ سیاسیات کے خارزار سے لے کر تصوف و فلسفہ اور ادب و شاعری کے مرغزاروں تک میں' مولانا کی رفتار یکساں' متوازن اور ہموار ہے۔ کہیں وسعت مطالعہ' دقت نظر اور جانی بوجھی راے ان کا ساتھ نہیں چھوڑتی۔ جس موضوع پر بھی بات چیت ہوئی ہے ایسا معلوم ہوا کہ گویا برسوں مولانا نے اسی موضوع پر غور کیا ہے اور اسی کے اطراف میں فکر و نظر کی کاوشوں کو محصور رکھا ہے۔ ہم نے جو کچھ لکھا ہے ذاتی راے کی مجبوریوں سے لکھا ہے۔ لیکن ملک میں ایسے بہت سے بزرگ اور دوست ہیں جنھوں نے مولانا کو نہایت ہی قریب سے دیکھا ہے۔ برسوں ان کی صحبت کے لطف اٹھائے ہیں' بیسیوں مسائل پر گفتگو کی ہے اور نتیجتاً اپنے افکار و خیالات کی سمتوں کو ان کے دلائل کی روشنی میں بدلا ہے۔ کیا یہ بزرگ بھی اس مسئلے پر روشنی ڈالیں گے؟

کیا وہ بھی یہی سمجھتے ہیں کہ مولانا کا علم ٹھوس نہیں؟ یا ان کے دلوں پر جو تاثر مولانا کی صلاحیتوں کے بارے میں نقش ہے، وہ اس سے مختلف ہے؟

پروفیسر عبدالقیوم

(وفات ۸ ستمبر ۱۹۸۹)

۲۴ جولائی ۱۹۴۸ء کو مرکزی جمعیت اہل حدیث قائم ہوئی۔ اس کے پہلے صدر مولانا سید محمد داؤد غزنوی اور ناظم اعلیٰ پروفیسر عبدالقیوم تھے۔ مجھے اس کا ناظم دفتر مقرر کیا گیا تھا اور اس کے لیے مجھے مولانا عطاء اللہ حنیف کو بھیج کر میرے گاؤں سے بلایا گیا تھا۔

یہ خدمت انجام دینے کی غرض سے میں لاہور آیا اور مولانا داؤد غزنوی سے ملا۔ انھوں نے چند باتیں ارشاد فرمانے اور سمجھانے کے بعد حضرت مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی سے کہا کہ وہ مجھے مرکزی جمعیت کے ناظم اعلیٰ پروفیسر عبدالقیوم کے پاس ان کے گھر لے جائیں اور ان سے میرا تعارف کرادیں۔

ہم پروفیسر صاحب کے مکان پر پہنچے تو مولانا عطاء اللہ صاحب نے دروازے پر لگے ہوئے ایک بٹن پر انگلی رکھی اور ٹن ٹن کی تیز اور تیکھی سی آواز گونجنے لگی۔ میں نے یہ چیز پہلی دفعہ دیکھی اور سنی تھی۔ حیران ہوا کہ بٹن یہاں سے دبایا اور آواز ادھر سے آئی' یہ کیا معاملہ ہے۔ پتا چلا کہ مکان کے اندر گھنٹی لگی ہوئی ہے' جس کا بجلی کی تار کے ذریعے اس بٹن سے رابطہ قائم کیا گیا ہے' بٹن دبائیں تو گھنٹی بولنے لگتی ہے۔ ہم نے کہا وارے جائیں زمانے کی ترقیوں اور عقل کی کرشمہ سازیوں کے' نہ زبان سے بولنا پڑے' نہ حلق پھاڑ پھاڑ کر کسی کو آواز دینی پڑے۔ ادھر بٹن دبایا اور ادھر اندر بیٹھا ہوا شخص باہر آگیا۔

گھنٹی کی آواز پر مشکل سے ایک منٹ گزرا ہوگا کہ پروفیسر صاحب تشریف لائے۔ وہ گھریلو لباس میں ملبوس تھے یعنی پاجامہ' قمیص اور سویٹر پہنے ہوئے ---مولانا عطاء اللہ صاحب نے ان سے میرا تعارف کرایا تو نہایت گرم جوشی سے ملے' لیکن ساتھ ہی معذرت

کی کہ اب جلدی میں ہوں اور کالج جا رہا ہوں' کالج سے فارغ ہو کر ٹھیک ایک بجے دفتر پہنچوں گا اور وہاں آپ سے باتیں ہوں گی ---تھوڑی دیر بعد ہم واپس آ گئے۔

یہ ۸ دسمبر ۱۹۴۸ء کی بات ہے۔ میری باقاعدہ دفتری حاضری کی یہ پہلی تاریخ تھی۔ وعدے کے مطابق وہ ٹھیک ایک بجے تشریف لائے اور دروازے میں داخل ہوتے ہی میری طرف مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے بلند آواز میں کہا' السلام علیکم۔

میں انھیں دیکھ کر ایک دم کھڑا ہو گیا اور وعلیکم السلام کہتے ہوئے ان سے مصافحہ کیا۔ ان کا اس وقت کا حلیہ اور لباس اب تک ذہن میں ہے اور اسے عالم تصور میں لاتا ہوں تو ساری تصویر سامنے آ جاتی ہے۔ اس واقعے پر ترپن برس کا طویل عرصہ گزر چکا ہے' لیکن ایسے معلوم ہوتا ہے' جیسے کل کی بات ہو۔ تصویر کا کوئی رخ بھی دھندلا نہیں ہوا۔

پروفیسر عبدالقیوم کی عمر اس وقت چالیس برس کے لگ بھگ ہو گی' میں نے ان کو غور سے دیکھا۔ نکلتا ہوا قد اور نکھرا ہوا رنگ' منہ پر ہلکے سے چیچک کے داغ جوان کے چہرے کی خوب صورتی اور رنگ روپ پر اثر انداز ہونے میں کامیاب نہیں ہو سکے تھے۔ تیکھے نقوش' آنکھوں پر نظر کی عینک' صاف ستھرے اور شان دار کوٹ پتلون میں ملبوس' بہترین ٹائی باندھے ہوئے' کالے چمکتے ہوئے بوٹ اور اس سے ملتے جلتے رنگ کی جرابیں' انگریزی کٹ کے بال اور درمیان سے مانگ نکالے ہوئے' کلین شیو اور چھوٹی چھوٹی مونچھیں جو صرف نتھنوں کے نیچے تھیں۔ انھیں انور پاشا ٹائپ مونچھیں کہا جاتا ہے۔

خیر و عافیت پوچھنے کے بعد انھوں نے الماری سے نکال کر چند رجسٹر میرے حوالے کیے۔ ان میں سے ایک رجسٹر کے پہلے صفحے پر مرکزی جمعیت اہل حدیث کی مجلس عاملہ کے اکیس ارکان کے نام درج تھے۔ پہلا نام صدر جمعیت مولانا محمد داؤد غزنوی کا' دوسرا ناظم اعلیٰ پروفیسر عبدالقیوم کا' تیسرا نام ناظم مالیات میاں عبدالمجید کا۔ اس کے بعد باقی ارکان عاملہ کے نام مرقوم تھے--- اس سے اگلے صفحوں پر مجلس عاملہ کے ان دو یا تین اجلاسوں کی کارروائی لکھی گئی تھی' جو قیام جمعیت (۲۴ جولائی) کے بعد ہوئے تھے۔ ہر کارروائی کے آخر میں' جو میٹنگ میں سنائی گئی' صدر جمعیت مولانا محمد داؤد غزنوی کے دستخط تھے اور ساتھ ہی

تاریخ مرقوم تھی۔

ایک رجسٹر جنرل کونسل کا تھا۔اس میں ان تمام حضرات کے نام درج تھے جو ۲۴ جولائی کے اجلاس میں شریک ہوئے تھے اور اس میں جو کارروائی ہوئی اس کی تفصیل لکھی گئی تھی۔ اس کے نیچے پروفیسر عبدالقیوم کے دستخط تھے۔ایک رجسٹر خط و کتابت کا تھا۔

ایک رجسٹر اور تھا' جس پر لکھا تھا سٹاک رجسٹر---اس میں وہ چیزیں لکھی گئی تھیں جو مرکزی جمعیت کے قیام کے بعد دفتر کے لیے خریدی گئی تھیں۔ مثلاً میز' کرسی وغیرہ۔ ہر چیز کی تاریخ خرید درج تھی۔

ایک روزنامچہ تھا جس میں آمدنی اور خرچ کی تفصیل الگ الگ تحریر کی گئی تھی۔ ایک فائل میں ان کی تاریخ وار رسیدیں گوند کے ساتھ چسپاں تھیں۔

دفتری اصول کے مطابق پروفیسر صاحب یہ سب چیزیں میرے حوالے کرنا یعنی مجھے ان کا چارج دینا چاہتے تھے۔اس کے لیے سب سے پہلے انھوں نے سٹاک رجسٹر پکڑا اور اسے میری طرف بڑھاتے ہوئے فرمایا' یہ سب چیزیں آپ ترتیب وار پڑھتے جایئے' میں ان میں سے ہر چیز گن کر آپ کے حوالے کرتا جاؤں گا۔

میں نے پڑھنا شروع کیا۔ میز دو' کرسیاں آٹھ' رجسٹر کارروائی مجلس عاملہ ایک' ڈاک رجسٹر ایک' رجسٹر کارروائی جنرل کونسل ایک' پنسلیں پانچ' قلم دان ایک' اسی طرح پڑھتے پڑھتے میں نے کہا' فائل کور (Kaur) دس۔ ابھی پورا لفظ نہیں بولا تھا کہ فوراً زبان نے پلٹا کھایا فائل کور (Cover) دس۔

یہ سن کر پروفیسر صاحب نے میری طرف دیکھا اور پوچھا' آپ کہاں کے رہنے والے ہیں؟

جواب دیا' ریاست فرید کوٹ کا۔

ہونٹوں پر تھوڑی سی مسکراہٹ طاری کرتے ہوئے کہا: یہ سکھ ریاست ہے؟

عرض کیا: جی ہاں!

بولے: ٹھیک ہے' آگے پڑھیے۔

اس سے زیادہ انھوں نے کچھ نہیں کہا اور کہنے کی ضرورت بھی نہ تھی--- اس لیے کہ اس مختصر متن کی تشریح دور تک یعنی لاہور سے لے کر فرید کوٹ تک پھیلی ہوئی تھی۔ اصل میں وہ کہنا یہ چاہتے تھے کہ میں سکھ ریاست کا رہنے والا ہوں، جس طرح بسنت کور، مہندر کور، امرت کور وغیرہ سکھ عورتوں کے نام ہوتے ہیں، اسی طرح شاید میں فائل کور کو بھی کسی سکھ عورت کا نام سمجھا ہوں--- لیکن اپنی طبعی شرافت کی بنا پر انھوں نے زبان سے یہ الفاظ نہیں کہے، البتہ میرے اصل وطن کو "سکھ ریاست ہے؟" کہہ کر اس طرف اشارہ کر دیا کہ تمھیں پرانی باتیں یاد آ رہی ہیں، اس میں تمھارا قصور نہیں، یہ تمھارے ماحول کا اثر ہے جو تمھاری زبان سے بول رہا ہے۔

ایک دن میں نے ان کو یہ واقعہ سنایا تو مسکرائے اور فرمایا، مجھے تو یہ بات بالکل یاد نہیں۔

انھیں واقعی یاد نہیں ہوگی، وہ بھول چکے ہوں گے اور اپنی فطری شرافت اور طبعی متانت کی بنا پر انھیں یہ بات بھول ہی جانا چاہیے تھی، لیکن میں جو طبع متانت ناآشنا رکھتا ہوں، اس بات کو نہیں بھولا۔ کم وبیش ترپن برس قبل کا یہ تمام واقعہ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔

پروفیسر صاحب تقریباً ایک گھنٹا مرکزی جمعیت کے دفتر میں رہے اور انھوں نے مجھے بہت سی باتیں سمجھائیں۔ مجلس عاملہ کے ارکان کے ناموں کے ساتھ ان کے مکمل پتے درج تھے۔ لاہور کے ارکان عاملہ کے علاقوں اور گھروں کا محل وقوع بھی بتایا۔

وہ گورنمنٹ کالج میں پڑھاتے تھے۔ ان کا معمول تھا کہ کالج سے فارغ ہو کر روزانہ دفتر آتے اور کام سے متعلق پوچھتے۔ میرے پاس ڈھائی تین سو آدمیوں کے پتے موجود تھے جو مختلف رجسٹروں میں پروفیسر صاحب کے ہاتھ کے لکھے ہوئے تھے، میں روزانہ پندرہ بیس آدمیوں کو خط لکھ دیتا تھا اور انھیں جماعت کی تنظیم کی طرف توجہ دلاتا رہتا تھا۔ پروفیسر صاحب میری یہ "کارگزاری" روزانہ دیکھتے اور خوش ہوتے۔

وہ تقریباً ایک سال مرکزی جمعیت اہل حدیث کے ناظم اعلیٰ رہے۔ غالباً ۱۹۴۹ء کے مئی کی آخری تاریخوں میں حکومت نے سرکاری ملازموں کے نام ایک گشتی مراسلہ جاری کر

دیا تھا کہ وہ کسی ایسی جماعت کے عہدے دار نہیں رہ سکتے جو کسی صورت میں سیاسیات سے تعلق رکھتی ہو۔ مرکزی جمعیت اہل حدیث معروف معنوں میں تو سیاسی جماعت نہیں تھی، لیکن اس کی بعض قراردادیں ضرور سیاسی نوعیت کی ہوتی تھیں، اور پھر اس کے صدر مولانا داؤد غزنوی تھے جو پنجاب اسمبلی کے رکن تھے اور سیاست سے تعلق رکھتے تھے، اس بنا پر پروفیسر عبدالقیوم نے جون ۱۹۴۹ء میں مرکزی جمعیت کی نظامت علیا سے استعفا دے دیا تھا۔

پروفیسر صاحب کے بعد تین مہینے کے قریب مولانا عطاء اللہ حنیف ناظم اعلیٰ رہے۔ اس کے بعد مولانا محمد اسماعیل صاحب کو ناظم اعلیٰ منتخب کر لیا گیا تھا۔ اب پروفیسر صاحب جمعیت کے ناظم اعلیٰ تو نہیں رہے تھے، البتہ اس کی مجلس عاملہ کے بہ دستور رکن تھے۔

۸ دسمبر ۱۹۴۸ء سے جون ۱۹۴۹ء تک چھے سات مہینے مجھے ان کے ساتھ کام کرنے کا اتفاق ہوا۔ اس تھوڑے عرصے میں میرے دل پر انھوں نے اپنی تکریم کا ایک ایسا نقش بٹھا دیا تھا جو تمام عمر نمایاں رہا۔ پھر یہ معاملہ یک طرفہ نہیں تھا کہ صرف میں ہی ان کی تکریم کرتا تھا، انھیں بھی اس کا پورا خیال اور احساس تھا اور مجھ پر وہ ہمیشہ شفقت فرماتے رہے۔ میرے ملنے والوں کے سامنے انھوں نے ازراہ کرم مشفقانہ انداز میں میرا نام لیا۔ جب بھی میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا یا کہیں ملاقات ہوئی، میری حقیر سی علمی کوششوں کو سراہا اور دعائیں دیں۔

۱۹ اگست ۱۹۴۹ء کو گوجرانوالہ سے ہفت روزہ ''الاعتصام'' جاری ہوا۔ مولانا محمد حنیف ندوی کو اس کا ایڈیٹر اور مجھے ان کا معاون مقرر کیا گیا تھا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی میں مرکزی جمعیت کا ناظم دفتر بھی تھا۔ میں نے ہفتے کے سات دنوں کا پروگرام کچھ اس طرح بنا رکھا تھا کہ چار یا پانچ دن اخباری کام کے سلسلے میں گوجرانوالا میں رہتا تھا اور دو یا تین دن لاہور رہتا اور مرکزی جمعیت کا کام کرتا تھا۔ اس اثنا میں میری کوشش ہوتی کہ پروفیسر صاحب سے ملنے اور ان سے باتیں کرنے کی کوئی راہ نکالی جائے۔

الاعتصام ان کی خدمت میں بذریعہ ڈاک پیش کیا جاتا تھا۔ میں نے مولانا محمد حنیف ندوی کے کہنے سے الاعتصام کے ابتدائی دور میں اہل حدیث علمائے کرام کے مختصر سے

حالات لکھنا شروع کیے تھے' ایک دن پروفیسر صاحب سے ملاقات ہوئی تو اس سلسلے میں انھوں نے میری خوصلہ افزائی کی اور فرمایا' یہ سلسلہ جاری رکھو---اس قسم کی بعض اور باتیں بھی کہیں' جو میرے لیے خوشی کا باعث تھیں۔ ظاہر ہے ہر لکھنے والا کسی بڑے شخص کی حوصلہ افزا باتوں سے خوش ہوتا ہے' میں بھی خوش ہوا۔ لیکن افسوس ہے' وہ سلسلہ جاری نہ رہ سکا۔ چھے سات اشاعتیں چلا' پھر بند ہو گیا۔

مولانا محمد حنیف ندوی الاعتصام کا اداریہ لکھتے تھے اور میں ان کے فرمان کے مطابق ادارتی شذرات لکھا کرتا تھا' پروفیسر صاحب کو اگر کسی سیاسی قسم کے شذرے یا مضمون سے اختلاف ہوتا تو مسکراتے ہوئے احسن طریقے سے اس کا اظہار کرتے' اس سے میری دل شکنی بھی نہ ہوتی اور وہ بھی اپنے دل کی بات کہہ دیتے اور یہی ان کا اصل مقصد ہوتا تھا۔

ایک مرتبہ ''الاعتصام'' کے ایک قاری نے خط کے ذریعے کوئی فقہی نوعیت کا مسئلہ پوچھا اور کہا کہ یہ سوال اور اس کا جواب الاعتصام میں شائع کر دیا جائے تا کہ دوسرے لوگ بھی اس سے مستفید ہوں۔ مولانا محمد حنیف ندوی نے مجھے حکم دیا کہ میں اس کا جواب لکھوں۔ میں نے لکھ کر مولانا کو دکھایا' انھوں نے اس سے اتفاق کیا اور میں نے اخبار میں چھاپ دیا۔ اس سے تقریباً ڈیڑھ مہینے بعد پروفیسر صاحب سے ملاقات ہوئی تو اس سوال و جواب کا ذکر کیا اور فرمایا' آپ تو مفتی ہو گئے ہیں۔

میں نے پوچھا' اس میں کچھ جان بھی تھی؟

فرمایا' بالکل صحیح جواب تھا۔

اس قسم کی باتوں سے وہ میرا حوصلہ بڑھاتے رہتے تھے اور ہر بڑا شخص چھوٹے سے اسی قسم کا برتاؤ کرتا ہے۔

الاعتصام کے اجرا سے ایک سال بعد ۱۴ جولائی ۱۹۵۰ء (۲۷ رمضان ۱۳۶۹ء) کو ہم نے اس کا عید نمبر شائع کرنے کا فیصلہ کیا۔ مضمون کے لیے پروفیسر عبدالقیوم صاحب کو بھی خط لکھا اور میں خود بھی ان کی خدمت میں حاضر ہوا' ازراہ کرم مضمون مرحمت فرمایا۔ ان کا یہ دوسرا مضمون تھا جو الاعتصام میں چھپا۔ اس سے چند روز قبل ۳۰ جون اور ۷ جولائی ۱۹۵۰ء

کے دو شماروں میں ان کا ایک مضمون شائع ہوا تھا' جس کا عنوان تھا ''مفتی محمد عبدہ''۔

۱۵ مئی ۱۹۵۱ء کو مولانا محمد حنیف ندوی ادارہ ثقافت اسلامیہ سے منسلک ہو گئے اور اس سے کچھ عرصہ بعد وہ گوجرانوالہ سے لاہور آ گئے۔ الاعتصام بھی گوجرانوالہ سے لاہور منتقل ہو گیا اور مجھے اس کا ایڈیٹر بنا دیا گیا۔ اب پروفیسر صاحب سے تقریباً ہر جمعے ملاقات ہوتی تھی' اس لیے کہ عام طور پر میں بھی مسجد مبارک میں جمعہ پڑھتا تھا اور مولانا حنیف ندوی بھی زیادہ تر وہیں تشریف لے آتے تھے۔ اب وہ مسجد مبارک کے خطیب تو نہ تھے' نہ روزانہ درس قرآن کی ذمے داری ان پر عائد تھی' البتہ وہ طویل عرصے تک اس مسجد میں درس و خطابت کے فرائض انجام دیتے رہے تھے' اس لیے اس مسجد اور اس حلقے کے لوگوں سے ان کا دیرینہ تعلق تھا اور یہ تعلق انھیں ادھر کا رخ کرنے پر مجبور کرتا تھا۔ وہاں پروفیسر صاحب سے بھی ملاقات ہو جاتی تھی اور پروفیسر صاحب ان کا انتہائی احترام کرتے تھے۔

ایک مرتبہ مسجد مبارک کے نمازیوں نے مولانا سے درخواست کی کہ وہ مسجد میں دوبارہ درس قرآن کا سلسلہ شروع کر دیں۔ مولانا نے روزانہ کے بجائے ہر اتوار کو نماز عصر کے بعد درس کا پروگرام بنایا۔ چنانچہ ایک مدت تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ پروفیسر صاحب اس میں باقاعدہ شرکت کرتے تھے۔ درس کے بعد وہ بعض اوقات مجھے اور مولانا کو اپنے مکان پر لے جاتے جو مسجد سے بالکل متصل تھا' وہاں چائے کا دور چلتا اور آدھ پون گھنٹے کی نشست رہتی۔

مسجد سے باہر سرکلر روڈ اور برانڈرتھ روڈ کے چوک میں ایک صاحب کا بندوق سازی کا چھوٹا سا کارخانہ تھا' ان کا نام غالباً احمد خاں تھا۔ وہ مسجد مبارک کے نمازی تھے اور مولانا کے درس میں بالالتزام شریک ہوتے تھے اور ان کے معتقد تھے۔ ہمیں تو وہ اکثر چائے پلاتے ہی تھے' کبھی کبھی پروفیسر صاحب کو بھی ساتھ لے جاتے اور ہم سب کو پرتکلف چائے پلاتے۔

پروفیسر صاحب نے اپنے آپ کو مسجد مبارک کے خادم کی حیثیت دے رکھی تھی۔ وہ عام طور پر کالج سے یا دفتر سے گھر جاتے ہی کپڑے بدل کر مسجد میں چلے جاتے' بارہا میں نے ان کو مسجد میں صفیں بچھاتے اور صفیں جھاڑتے دیکھا۔

وہ اللہ کی راہ میں چھپا کر خرچ کرتے تھے اور دینی اداروں اور مسجدوں کی تعمیر کے لیے

چندہ دیتے، لیکن اس انداز سے کہ کسی کو پتا نہ چلے۔ ایک مرتبہ مجھے علیحدگی میں ایک دارالعلوم کے بارے میں کہا کہ اس کا آدمی آیا تھا، مجھ سے اس کی ملاقات نہیں ہو سکی، اسے میرے پاس بھیج دینا۔ ساتھ ہی فرمایا میں بہت مصروف ہوں، میرا خود وہاں جانا مشکل ہے۔

لوگوں کی وہ علمی معاونت بھی کرتے تھے اور مالی بھی، لیکن دکھلاوے اور نمائش سے ہمیشہ گریزاں رہتے۔

معاصرت بہت بری بیماری ہے جو اکثر اہل علم کو لاحق ہو جاتی ہے۔ عام طور سے ہم دیکھتے ہیں کہ کوئی کسی پر تنقید کر رہا ہے، کوئی کسی کے علم کے طول و عرض کی پیمائش میں مشغول ہے، کوئی کسی کے حوالوں کی غلطیوں کی نشان دہی کر رہا ہے اور کوئی کسی کی زبان اور انداز بیان پر حملوں میں مصروف ہے، لیکن پروفیسر عبدالقیوم کا دامن اس نوع کے مشاغل سے پاک تھا۔ وہ کسی کو سمجھانے اور توجہ دلانے کے اسلوب میں تو بات کرتے تھے، لیکن اس کو طنز و تحقیر اور نقد و جرح کا نشانہ نہیں بناتے تھے۔ وہ اہل علم کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور ہر موضوع کے عالم کو اس کا صحیح مقام دیتے تھے۔ ان کا ذہن حسد و رقابت سے خالی تھا اور ان کی زبان غیبت و بدگوئی سے پاک تھی۔ وہ سب کے خیر خواہ اور سب کے ہم درد تھے۔ کسی سے انھیں کدورت اور عداوت نہ تھی، وہ لوگوں کی غلطیوں کو اچھالتے نہ تھے، نظر انداز کر دیتے تھے۔

مجھ سے ان کا سلوک ہمیشہ ہم دردانہ رہا۔ میں ادارہ ثقافت اسلامیہ سے وابستہ ہوا تو مسرت کا اظہار کیا اور فرمایا ادارے کی علمی فضا تمھارے لیے بہتر رہے گی اور تم اچھا کام کرو گے۔ میں نے ان کے ان الفاظ کو اپنے لیے دعاے خیر سے تعبیر کیا۔

وہ کھلے ہاتھ، کھلے دل اور کھلی پیشانی کے صاحب علم تھے۔ میں جب بھی ان کے دفتر گیا اور ان کی خدمت میں حاضر ہوا، انھیں لکھنے پڑھنے میں مصروف پایا اور مجھے دیکھتے ہی اپنا کام بند کر دیا اور میری استطاعت ذہنی کے مطابق کوئی علمی گفتگو شروع کر دی۔

ان کی میز پر بہت سی کتابیں رکھی ہوتی تھیں اور وہ کسی نہ کسی موضوع کے بارے میں ان سے حوالے تلاش کرتے رہتے تھے۔ اردو دائرۂ معارف اسلامیہ میں چھپنے کے لیے جو

مقالہ آتا' وہ اسے غور سے پڑھتے' اپنے انداز سے اس کی زبان درست کرتے' اس کے حوالے چیک کرتے اور اس کے تمام گوشوں کو اپنے اسلوب میں ڈھالتے۔ یہ بہت بڑا کام تھا جو وہ سرانجام دیتے تھے۔

میں نے ان کو کبھی گھبراہٹ یا غصے کی حالت میں نہیں دیکھا۔ جب بھی ملاقات ہوئی چہرے پر ''خیر مقدمی'' مسکراہٹ پھیلی ہوئی دیکھی اور ہمیشہ خندہ پیشانی سے ملے۔ اس مادی اور افراتفری کے دور میں اس قسم کے سراپا خلوص لوگ اب کہاں ملیں گے۔

ادارہ ثقافت اسلامیہ میں آنے کے بعد میں نے جو کام کیا' وہ سب ان کے علم میں آیا۔ سب سے پہلے محمد بن اسحاق ابن ندیم وراق کی مشہور کتاب ''الفہرست'' کا ترجمہ کیا اور اس پر حواشی لکھے۔ ترجمہ شدہ کتاب تقریباً ایک ہزار صفحات پر مشتمل ہے جو پہلی مرتبہ ۱۹۶۹ء میں شائع ہوئی تھی۔ میں نے کتاب ان کی خدمت میں پیش کی تو ازراہ کرم اس کی تحسین کی اور مجھے مستحق مبارک باد قرار دیا۔

اس سے کچھ عرصہ بعد ''برصغیر میں علم فقہ'' شائع ہوئی۔ وہ بھی ان کی خدمت میں پیش کی گئی۔ پھر جیسے جیسے میری کتابیں چھپتی گئیں' میں ان کی نذر کرتا گیا۔ انھوں نے میری ہر کتاب کی تعریف کی اور ایسے الفاظ میں اہل علم کے سامنے میری حقیری خدمات کا تذکرہ کیا' جن سے میرا حوصلہ بڑھا۔

میری تصانیف میں ایک ضخیم کتاب ''فقہائے ہند'' ہے جو پہلی صدی ہجری سے لے کر تیرھویں صدی ہجری تک دس جلدوں کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ اس کا وہ خاص طور سے ذکر کیا کرتے تھے۔

پنجاب یونیورسٹی کے اردو دائرہ معارف اسلامیہ کے وہ سینئر ایڈیٹر تھے اور ڈاکٹر سید عبداللہ اس کے چیئرمین تھے۔ اس میں انھوں نے مجھ سے بہت سے مقالے لکھوائے' ان مقالوں میں چند مقالے قرآن مجید سے متعلق ہیں جو جمع وتدوین قرآن' واقعات وقصص قرآن' مضامین قرآن اور فضائل قرآن وغیرہ عنوانات پر مشتمل ہیں۔ علاوہ ازیں مرتد' المنافقون' ملائکہ' مسجد' مرتبین فتاویٰ عالم گیری' حافظ محمد لکھوی اور محمد بن عبدالوہاب وغیرہ

متعدد عنوانات سے متعلق مقالے لکھوائے۔ شیخ محمد بن عبدالوہاب پر مقالہ لکھنے کے لیے مجھے ۱۹۶۶ء کے آخر میں کہا گیا تھا۔ اب ان پر مختلف زبانوں میں بہت کچھ شائع ہو چکا ہے اور شائع ہو رہا ہے۔ اس وقت اس موضوع پر مواد ملنا نہایت مشکل تھا۔ اردو میں ان سے متعلق پاکستان میں شاید یہ پہلا مقالہ تھا۔

۱۹۷۸ء میں پنجاب کے گورنر جنرل سوار خاں تھے۔ انھوں نے ''سیرت کمیٹی'' بنائی تھی، جس کے ذمے اس مسئلے پر غور کرنا تھا کہ پہلی جماعت سے لے کر تعلیم کے آخری مرحلے تک نبی ﷺ کی سیرت طیبہ طلبا کو کس طرح پڑھائی جائے۔ اس کمیٹی کے چیئرمین ڈاکٹر سید عبداللہ تھے اور ارکان تھے، پروفیسر عبدالقیوم، ڈاکٹر عبدالرؤف (اس وقت کے ڈائریکٹر پنجاب ایجوکیشن) مفتی محمد حسین نعیمی، بریگیڈیئر گلزار احمد اور ان سطور کا راقم۔

اس کمیٹی کی میٹنگ پنجاب یونیورسٹی کے اردو دائرہ معارف اسلامیہ کے دفتر میں ہوتی تھی۔ کمیٹی نے ایک رپورٹ تیار کر کے گورنر کو پیش کر دی تھی۔ اس پر عمل کرنا تو حکومت کا کام تھا۔ میں یہاں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اس نہایت اہم اور نازک علمی موضوع کے سلسلے میں مجھے کافی عرصہ پروفیسر عبدالقیوم مرحوم کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا۔ اس وقت میں ادارہ ثقافت اسلامیہ میں ریسرچ فیلو کی حیثیت سے خدمات انجام دیتا تھا۔

اوپر دائرہ معارف اسلامیہ کے لیے مقالوں کا ذکر ہوا ہے۔ اس سلسلے میں یہاں ایک لطیفہ بھی سنتے جایے۔ ایک دفعہ دائرۂ معارف اسلامیہ کے دفتر سے دو خط آئے، ایک مولانا محمد حنیف ندوی کے نام اور ایک میرے نام۔ مجھے ''مرتد'' کے عنوان پر مقالہ لکھنے کے لیے کہا گیا تھا اور مولانا کو عنوان دیا گیا تھا ''معتزلہ'' --- میں نے از راہ مزاح مولانا سے کہا آپ کو خوب موضوع دیا گیا ہے ''معتزلہ''۔ مولانا کی طرف سے جواب کا ادھار نہیں ہوتا تھا، فوراً بولے! ''مرتد سے اچھا ہے۔''

میں اور مولانا محمد حنیف ندوی کئی دفعہ ان سے ملاقات کے لیے پنجاب یونیورسٹی میں ان کے دفتر اردو دائرۂ معارف اسلامیہ گئے۔ وہ ہمیشہ گرم جوشی سے پیش آئے۔ ہر دفعہ ہمارا شکریہ ادا کیا اور دعائیں دیں۔ ایک دن ہمارے ساتھ ہی دفتر سے باہر نکلے اور انارکلی کے

ایک ہوٹل میں چائے پلائی اور مٹھائی کھلائی۔

ایک دن میں اپنے دفتر (ادارۂ ثقافت اسلامیہ) میں بیٹھا کام کر رہا تھا کہ ایک نوجوان میرے کمرے میں داخل ہوئے اور کہا' السلام علیکم۔ میں نے کھڑے ہو کر ان کے سلام کا جواب دیا۔ ان کے چہرے پر چھوٹی چھوٹی داڑھی تھی۔ بولے' میرا نام زبیر قیوم ہے اور میں پروفیسر عبدالقیوم کا بیٹا ہوں۔

وہ پہلی دفعہ مجھ سے ملے تھے اور میں نے پہلی دفعہ انھیں دیکھا تھا۔ مسکراتے ہوئے ان سے کہا' پروفیسر عبدالقیوم کے خاندان میں آپ دوسرے شخص ہیں' جن کے چہرے پر کچھ بال دیکھے گئے ہیں۔ پہلے شخص ان کے والد منشی فضل الدین تھے اور دوسرے ان کے صاحب زادے ہیں جو اس وقت یہاں بیٹھے ہیں۔ اس کے بعد وہ میجر زبیر قیوم ہوئے۔ اب ریٹائر ہو گئے ہیں اور کاروبار کرتے ہیں۔

پروفیسر عبدالقیوم کے والد گرامی منشی فضل الدین نیک اور صالح بزرگ تھے اور مختلف موضوعات کی کتابوں پر ان کی نظر تھی۔ حضرت سید میاں نذیر حسین دہلوی' مولانا محمد حسین بٹالوی' مولانا حافظ عبدالمنان وزیر آبادی' قاضی محمد سلیمان منصور پوری' مولانا ثناء اللہ امرتسری' مولانا عبدالواحد غزنوی' مولانا محمد ابراہیم میر سیالکوٹی اور دیگر بہت سے اکابر علما سے ان کے مراسم رہے تھے اور ان کے حلقہ ہائے درس وخطابت میں بیٹھنے کا شرف حاصل کیا تھا۔ دور ماضی کی بڑی بڑی علمی بحثوں اور مناظرانہ مجلسوں میں شریک ہونے کے انھیں مواقع ملے تھے اور اس سلسلے کی بہت سی باتیں انھیں یاد تھیں' جو وہ گھنٹوں سناتے اور مزے لے لے کر اس کا تذکرہ کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر عالم انھیں جچتا نہ تھا' تقریر و خطابت اور درس قرآن کے بارے میں ان کا معیار دوسروں سے مختلف تھا۔

منشی فضل الدین کے ساتھ حضرت مولانا عبدالواحد غزنوی مرحوم کے تعلقات بہت اچھے تھے اور بسا اوقات وہ محض ان سے ملاقات کی غرض سے مسجد مبارک تشریف لاتے تھے۔ ایک مرتبہ منشی صاحب نے بتایا کہ ایک دن مولانا عبدالواحد صاحب ان کے پاس آئے۔ کافی دیر بیٹھے اور پھر چلے گئے۔ تین چار منٹ کے بعد پھر آ گئے' فرمایا' منشی صاحب!

مجھے ایک روپیہ دیجیے۔

انھوں نے ایک روپیہ دے دیا اور وہ روپیہ لے کر چلے گئے۔ آدھ پون گھنٹے کے بعد آئے اور فرمایا' یہ لیجیے روپیہ---!

منشی صاحب نے کہا' اتنی جلدی کی کیا ضرورت تھی' روپیہ پھر دے دیتے۔ فرمایا' قرض جلد سے جلد ادا کرنا چاہیے۔

بات اصل میں یہ تھی کہ جب وہ منشی فضل الدین کے ہاں سے اٹھ کر باہر نکلے تو راستے میں ایک فقیر بیٹھا تھا جو آنے جانے والوں سے کہہ رہا تھا۔ اللہ کے نام پر ایک پیسہ دے دو بابا۔

وہ مسلسل یہ صدا لگائے جا رہا تھا۔ مولانا عبدالواحد صاحب نے یہ الفاظ سنے تو منشی فضل الدین کے پاس پہنچے' ان سے ایک روپیہ لیا اور اس فقیر کو دیتے ہوئے فرمایا' میاں! اللہ کے نام سے چھوٹی چیز نہیں مانگنی چاہیے' بڑی چیز مانگنی چاہیے۔

ایک روپیہ اس زمانے میں بڑی چیز تھی جو مولانا کے پاس نہ تھا اور منشی فضل الدین سے ادھار لے کر فقیر کو دیا تھا۔

پروفیسر صاحب کے نانا مولوی سلطان احمد تھے' مسجد مبارک کی تعمیر کے بعد کچھ عرصے تک اس کی امامت وخطابت کے فرائض مولوی سلطان احمد سرانجام دیتے رہے۔

منشی صاحب نوے برس کی عمر کو پہنچ گئے تھے' لیکن صحت حیرت انگیز طور پر بہت اچھی تھی۔ پانچوں وقت کی نمازیں مسجد مبارک میں باجماعت ادا کرتے تھے اور تہجد بالالتزام پڑھتے تھے۔ مولانا محمد حنیف ندوی کے علم ومطالعے سے بہت متاثر تھے' ان کے خطبہ جمعہ اور درس قرآن میں باقاعدہ شامل ہوتے تھے۔ منشی صاحب نے ۸ جنوری ۱۹۵۷ء کو رات کے دس بجے حرکت قلب بند ہو جانے سے وفات پائی۔

کار خیر کے سلسلے میں وہ اخفا سے کام لیتے تھے اور ظاہر کی بجائے باطن کو ترجیح دیتے تھے۔ ایک مرتبہ ڈیڑھ دو مہینے ان سے ملاقات نہ ہو سکی۔ جمعے کے بعد نظریں ادھر ادھر انھیں دیکھنے کی کوشش کرتیں' لیکن ناکام رہتیں۔ پروفیسر صاحب سے بھی نہ پوچھا کہ منشی صاحب کس حال میں ہیں' جمعے میں کیوں نہیں آتے۔ ایک دن میں جمعے کے لیے گھر سے نکلا تو دل

میں فیصلہ کیا کہ آج اگر منشی صاحب نہ ملے تو پروفیسر صاحب سے ان کے بارے میں پوچھوں گا کہ خدانخواستہ بیمار تو نہیں ہیں۔ جمعے کی نماز ہو چکی تو اپنے سے بالکل متصل پچھلی صف میں دیکھا کہ منشی صاحب بیٹھے ہیں اور ان کے پاس ایک چھوٹا سا بیگ پڑا ہے۔ عرض کیا:

خیریت تو تھی‘ اتنے دن کہاں رہے؟

فرمایا: فریضہ حج ادا کرنے گیا تھا۔ جمعے کا وقت تھا‘ سیدھا مسجد میں آیا ہوں‘ ابھی گھر نہیں گیا۔

پوچھا: آپ کا سامان کہاں ہے؟

بیگ کو ہاتھ لگا کر کہا: یہ ہے میرا سامان‘ جو ضروری استعمال کی چند چیزوں پر مشتمل ہے اور چیزیں بھی وہ جو یہاں سے لے گیا تھا۔

میں کھڑا ہوا‘ وہ بھی اپنی جگہ سے اٹھے اور بغل گیر ہوئے۔ اس کے بعد کئی لوگ ان سے ملے۔ پروفیسر صاحب سے بھی وہیں ملاقات ہوئی اور باپ بیٹے نے معانقہ کیا۔

چپکے سے حج کے لیے گئے اور خاموشی سے واپس آ گئے‘ اور واپسی پر سب سے پہلے مسجد میں آئے۔ ورنہ حاجی صاحبان جس شان سے جاتے اور جس شان سے آتے ہیں اور اپنے ساتھ جو قسم قسم کا سامان لاتے ہیں‘ وہ سب کو معلوم ہے‘ مگر منشی فضل الدین کے گھر کے افراد کے سوا نہ کسی کو ان کے حج پر جانے کا علم تھا‘ نہ حج سے واپس آنے کا۔

نیک عمل کے بارے میں یہی حال ان کے صاحب زادے پروفیسر عبدالقیوم کا تھا۔ ان کی بھی یہی کوشش ہوتی تھی کہ کسی کو پتا نہ چلے۔ اس کا تعلق فقط اللہ کی ذات سے ہے‘ لہٰذا اس کے سوا کسی پر اس کا اظہار نہیں ہونا چاہیے۔

ایک دن میں نے ٹیلی ویژن کھولا تو ڈاکٹر محمد جہاں گیر خاں کے بارے میں پروگرام ہو رہا تھا۔ آزادی سے قبل ڈاکٹر صاحب گجرات کے زمیندار کالج میں جب پرنسپل تھے‘ پروفیسر عبدالقیوم ان کے ساتھ بطور معلم خدمات انجام دے چکے تھے‘ اس لیے اثنائے پروگرام میں کمپیئر نے پروفیسر صاحب کو بھی ان کے بارے میں گفتگو کرنے کے لیے سٹیج پر بلایا۔ میں یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ پروفیسر صاحب کے چہرے پر داڑھی سجی ہوئی ہے۔

پروگرام ختم ہوا تو ان کو ٹیلی فون کیا اور کہا کہ ابھی ابھی ٹیلی ویژن پر آپ سے ملاقات ہوئی ہے اور آپ کی داڑھی کی زیارت کا شرف بھی حاصل ہوا ہے' اس کی کیا عمر ہے؟

وہ ہنسے اور فرمایا: یہ کام بھی ہم نے کر ہی لیا۔

عرض کیا: آپ نے بڑا اہم قدم اٹھایا ہے۔

بولے: کسی دن مولانا محمد حنیف ندوی کو لے کر آؤ اور میرے ساتھ سہ پہر کی چائے پیؤ' پھر داڑھی کے موضوع پر بھی بات ہوگی اور دوسرے موضوع بھی زیر بحث آئیں گے۔

میں دوسرے دن دفتر پہنچا تو مولانا سے رات کے پروگرام اور پروفیسر صاحب کی داڑھی کا ذکر کیا اور جو ان سے گفتگو ہوئی تھی' مولانا کو سنائی اور ان کی طرف سے چائے کی دعوت دی۔

چند روز کے بعد میں نے ان کو ٹیلی فون کیا کہ آج میں اور مولانا ندوی عصر کی نماز مسجد مبارک میں پڑھیں گے۔

انھوں نے فرمایا: ضرور آیئے' میں انتظار کروں گا۔

مسجد میں پہنچا تو عصر کی جماعت ہو رہی تھی اور آخری رکعت قریب الاختتام تھی۔ نماز مکمل کی تو پروفیسر صاحب کو دیکھنے لگا۔ ازراہ کرم وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر حسب معمول مسکراتے ہوئے آئے اور گرم جوشی سے ملے' بغل گیر ہوتے ہوئے فرمایا' مولانا تو ابھی نہیں آئے۔ اتنے میں مولانا بھی تشریف لے آئے۔ انھوں نے نماز پڑھی تو پروفیسر صاحب اپنے مکان پر لے گئے' چائے پلائی اور دیر تک مختلف موضوعات پر باتوں کا سلسلہ جاری رہا۔ میں نے تو ان کی داڑھی کے بارے میں کوئی بات نہیں کی' البتہ مولانا بے تکلفی سے اس موضوع پر اظہار خیال کرتے رہے۔

ہر شخص کے دل میں ان کا احترام تھا اور وہ واقعی قابل احترام شخصیت کے مالک تھے۔ اصحاب جبہ و دستار بھی ان کے قدردان تھے اور جدید تعلیم یافتہ حضرات بھی ان کو عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ مذہبی حلقوں میں اس داڑھی منڈے کو کچھ دوسری نگاہ سے دیکھا جاتا ہے' جس کا تعلق منبر و محراب سے ہو' لیکن پروفیسر صاحب کو ہمیشہ اعزاز کا مقام حاصل رہا۔ اس

سے بڑی بات اور کیا ہو سکتی ہے کہ انھیں مرکزی جمعیت اہل حدیث کا پہلا ناظم اعلیٰ منتخب کیا گیا تھا اور کسی نے اعتراض نہیں کیا تھا کہ یہ داڑھی نہیں رکھتے' اس لیے جماعت اہل حدیث کی نظامت علیا اور علما کی سربراہی کا منصب انھیں نہیں سونپا جا سکتا۔ لوگوں پر ان کی علمیت کا اثر اتنا زیادہ تھا کہ ان کے چہرے کے بالوں پر غالب آ گیا تھا۔

ایک دن میں نے ان سے کہا آپ کی داڑھی بڑھتی چلی جا رہی ہے۔

بولے: اب میں نے اس کی باگیں ڈھیلی چھوڑ دی ہیں' جہاں اور جس طرف جانا چاہے' آزادی سے جائے' کسی موقعے پر کوئی رکاوٹ اس کی راہ میں پیش نہیں آئے گی۔

جب تک انھوں نے داڑھی نہیں رکھی تھی' انگریزی سوٹ پہنتے تھے۔ داڑھی کے بعد بھی کچھ عرصہ سوٹ زیب تن کرتے رہے۔ پھر شلوار اور شیروانی پہننے لگے تھے۔

بے شمار حضرات نے ان کے سامنے زانوئے شاگردی تہ کیا۔ ان کے تمام شاگردان کا احترام کرتے تھے' وہ بھی نئے اور پرانے شاگردوں کا خیال رکھتے اور ان کی علمی ترقی کے خواہاں رہتے تھے۔ سب کی بات غور سے سنتے اور صائب مشورہ دیتے۔

اپریل ۱۹۵۵ء میں لائل پور (فیصل آباد) میں جماعت اہل حدیث کی مرکزی درس گاہ ''جامعہ سلفیہ'' کا قیام عمل میں آیا تھا۔ اس سے کچھ عرصے بعد اس کا نصاب تعلیم مرتب کرنے کے لیے نصاب کمیٹی بنائی گئی تھی۔ اس کمیٹی میں پروفیسر عبدالقیوم اور مولانا محمد حنیف ندوی بھی شامل تھے۔ مولانا محمد داؤد غزنوی اس کمیٹی کے صدر تھے۔

پروفیسر عبدالقیوم یوں تو عربی کے آدمی تھے' لیکن عربی' انگریزی اور اردو میں بھی بے تکلفی سے اظہار خیال کرتے تھے۔ علاوہ ازیں جرمن' فرنچ اور فارسی زبانیں بھی جانتے تھے اور تحریر و نگارش کے مواقع پر ان سے کام لیتے اور ان کے علمی مقالات کے ترجمے کرتے تھے۔ قرآن' حدیث' تفسیر' فقہ' لغت' اصول اور ادبیات پر اچھی نظر رکھتے تھے۔ رجال حدیث اور شروح حدیث سے ان کو خاص شغف تھا۔ ماہرین لغت و ادب کے بارے میں ان کی تحقیق و کاوش کا اہل علم میں بڑا شہرہ تھا۔ شعرائے دور جاہلیت اور شعرائے دور اسلام کے طبقات کا انھیں خوب علم تھا اور اس موضوع پر اعتماد سے بات کرتے تھے۔ ان کی تحریر میں

پختگی اور گفتگو میں ثقاہت تھی۔ مختلف موضوعات کی کتابوں کے بارے میں ان کی معلومات کا دائرہ وسیع تھا۔

کثرت مطالعہ و معلومات کے ساتھ ان میں بہت بڑی خوبی یہ تھی کہ مزاج میں انکسار تھا۔ فخر و تعلی اور غرور و پندار کے کسی پہلو سے بھی آشنا نہ تھے۔ ہر شخص سے مخلصانہ اسلوب اور ہم دردانہ انداز میں بات کرتے تھے۔ ان میں یہ خصوصیت تھی کہ چھوٹے کو سمجھانے کی سعی کرتے اور بڑے سے سمجھنے کے لیے کوشاں ہوتے۔ وہ بنیادی طور پر استاد اور معلم تھے' جس شخص سے مخاطب ہوتے' اس کے ذہن و فکر کے پیمانے کو ملحوظ خاطر رکھتے اور اسی ڈھنگ سے بات کرتے' جسے وہ سمجھنے کی صلاحیت رکھتا اور بات کو اپنے فہم کی گرفت میں لا سکتا ہو۔

وہ کسی پر احسان کر کے اسے جتلانے اور کسی پر نیکی کر کے اس کا بدلہ لینے کے عادی نہ تھے۔ ان کا نقطہ نظر یہ تھا کہ نیکی کرو اور بھول جاؤ۔ وہ بعض نادار طالب علموں کی مدد کرتے اور غریب لوگوں پر خرچ کرتے تھے' لیکن حتی الامکان کسی کو اس کا پتا نہیں چلنے دیتے تھے۔

طلبا کا وہ خاص طور سے خیال رکھتے تھے اور انھیں فائدہ پہنچا کر خوش ہوتے تھے۔ ایک مرتبہ یونیورسٹی کے ایک طالب علم کو جاحظ پر ایم۔ اے کا مقالہ لکھنے کے لیے کہا گیا تھا۔ نگران نے ان کو میرے پاس بھیج دیا۔ وہ تیاری کے لیے روزانہ شام کے بعد میرے پاس آ جاتے تھے۔ میں تقریباً دو مہینے ان کی مدد کرتا رہا۔ کچھ دنوں کے بعد انھوں نے بتایا کہ زبانی امتحان (Viva Voce) پروفیسر عبدالقیوم لیں گے۔ ان کی خواہش کے مطابق میں نے پروفیسر صاحب سے ''ہاتھ نرم رکھنے'' کو کہا تو فرمایا' طلبا کی مدد کرنا میں اپنا فرض سمجھتا ہوں۔

زندگی کے ابتدائی دور ہی میں وہ نماز روزے کی پابندی کرنے لگے تھے اور شروع ہی سے ان میں عمل خیر کا جذبہ پایا جاتا تھا۔ مسجد میں جانا' جماعت کے انتظار میں بیٹھنا اور قرآن مجید کی تلاوت کرنا' اچھی باتیں کرنا اور اچھی باتیں سننا بچپن ہی سے ان کا معمول تھا۔ یہی وجہ ہے کہ چھوٹی عمر ہی میں لوگ انھیں ''مولوی'' کہنے لگے تھے۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد جب وہ تدریسی میدان میں آ گئے تب بھی یونیورسٹی کے حلقوں میں بعض رفقا ان کو مولوی یا مولانا کہہ کر پکارتے تھے۔

خود وہ بھی کسی چھوٹے یا بڑے عالم کے بارے میں کوئی بات کرتے تو اسے "مولوی صاحب" کہتے تھے۔

مولانا غلام رسول مہران کو عبدالقیوم بٹ کہا کرتے تھے۔ مجھ سے ان کے متعلق وہ اکثر پوچھتے کہ عبدالقیوم بٹ کا کیا حال ہے اور وہ کس عالم میں ہیں۔

مولانا داؤد غزنوی الفاظ کے استعمال میں بڑے محتاط تھے۔ ایک مرتبہ پروفیسر عبدالقیوم کے بارے میں کوئی بات کرتے ہوئے' میں نے مولانا کے سامنے قیوم صاحب کہا۔ اس پر مولانا نے فرمایا: قیوم' حی' غفار' قہار' رحمان' تواب' جبار' اللہ کے نام ہیں' ان کا اطلاق بندوں پر نہیں ہوتا۔ بندوں کو پورے نام سے پکارنا چاہیے۔ عبدالقیوم' عبدالحی' عبدالغفار' عبدالقہار' عبدالرحمٰن' عبدالتواب' عبدالجبار کہنا چاہیے۔

پروفیسر عبدالقیوم کے پردادا کا نام قادر بخش تھا اور وہ اصلاً موضع شپیاں (جموں کشمیر) کے رہنے والے تھے۔ کسی زمانے میں شپیاں سے نقل مکانی کر کے ضلع گجرات میں کھاریاں کے قریب موضع کلیانہ میں آ بسے تھے۔ قادر بخش کے دو بیٹے تھے۔ ایک کا نام عبداللہ تھا اور ایک کا حاجی محمد---! عبداللہ کے تین بیٹے ہوئے' فضل الدین' نور الدین اور احمد الدین---عبداللہ نے لاہور میں آ کر سکونت اختیار کر لی تھی اور وہ ٹھیکے داری کرتے تھے۔ سڑکوں اور سرکاری عمارتوں کی تعمیر اور نہروں کی کھدائی وغیرہ کا ٹھیکا لیتے تھے۔ ان کے بیٹے فضل الدین نے بھی اس کام میں باپ کی مدد کی اور برصغیر کے متعدد شہروں اور علاقوں میں اس سلسلے میں گئے اور اپنے کام کو وسعت دی۔ ریاست حیدر آباد (دکن) میں بھی انھوں نے نہروں کے تعمیر و کھدوائی کے ٹھیکے لیے۔ اس کام میں انھوں نے کمایا بھی بہت اور نقصان بھی بہت اٹھایا۔

منشی فضل الدین نے اپنے ایک بھائی نور الدین کو طب کی تعلیم دلائی اور وہ اپنے دور میں لاہور کے نامور طبیب ہوئے اور حکیم نور الدین کے نام سے شہرت پائی۔

دوسرے بھائی احمد الدین کے لیے ڈاکٹری کی تعلیم دلانے کا اہتمام کیا' وہ ہندوستانی فوج میں کیپٹن مقرر ہوئے اور عالم جوانی میں ملازمت کے دوران میں ایک حادثے سے دو

چار ہو کر وفات پا گئے۔

منشی فضل الدین کے آٹھ بیٹے تھے۔ عبدالحی' عبدالقیوم' عبدالسلام' عبداللہ' محمد یحییٰ' محمد زکریا' محمد یونس اور محمد سلیمان---! منشی فضل الدین نے بیٹوں کو بھی زیور تعلیم سے آراستہ کرنے کا فیصلہ کیا اور اللہ تعالیٰ نے ایسے حالات پیدا کر دیے کہ ان کے تمام بیٹے تعلیم یافتہ ہو کر ممتاز عہدوں پر فائز ہوئے۔

پروفیسر عبدالقیوم ۱۵ جنوری ۱۹۰۹ء کو لاہور میں پیدا ہوئے۔ آٹھویں جماعت پاس کی تو تعلیم چھوڑ کر باپ کے ساتھ کاروبار میں مشغول ہو گئے' مگر تھوڑے عرصے کے بعد جب دیکھا کہ ان کے دوسرے دوست میٹرک کا امتحان دینے والے ہیں تو انھوں نے کاروبار کا سلسلہ ختم کیا اور میٹرک کی تیاری شروع کر دی۔ اس وقت امتحان دینے میں صرف تین مہینے باقی تھے۔ دن رات محنت کی اور امتیازی نمبروں سے میٹرک پاس کیا۔ اس کے بعد باقاعدگی سے تعلیم جاری رکھی۔ اسلامیہ کالج (لاہور) سے ایف۔ اے پاس کیا اور اسی کالج سے ۱۹۳۲ء میں بی۔ اے آنرز کیا۔ پھر یونیورسٹی اورینٹل کالج سے ۱۹۳۴ء میں ایم۔ اے عربی کیا۔ ایم۔ اے عربی کے بعد جنوری ۱۹۳۵ء میں انھیں پنجاب یونیورسٹی نے میکلوڈ پنجاب عربی سکالرشپ عطا کیا جو مسلسل چار سال تک ملتا رہا۔ یہ وظیفہ اس زمانے کے گورنر پنجاب میکلوڈ کے نام سے جاری کیا گیا تھا' جن کے نام سے لاہور میں ایک سڑک بھی ہے جسے میکلوڈ روڈ کہا جاتا ہے۔ اب یہ سڑک مولانا ظفر علی خاں روڈ کہلاتی ہے۔ یہ ایک اعزاز تھا جو پروفیسر عبدالقیوم کے حصے میں آیا۔ سب سے پہلے یہ وظیفہ علامہ اقبال کو اور پھر ڈاکٹر مولوی محمد شفیع کو ملا تھا۔ اس کے بعد پروفیسر عبدالقیوم کو ملنے لگا۔ پروفیسر صاحب عربی میں ڈاکٹر مولوی محمد شفیع کے شاگرد تھے۔ وظیفہ ڈیڑھ سو روپے ماہانہ ملتا تھا جو جنوری ۱۹۳۵ء سے ۱۹۳۹ء تک جاری رہا۔

اس سکالرشپ کے چار سالہ دور میں پروفیسر عبدالقیوم نے جو کام کیا' برطانیہ کی کیمبرج یونیورسٹی کے پروفیسر ڈاکٹر کرنکو نے اس کے متعلق "اسلامک کلچر" حیدرآباد (دکن) ۱۹۳۷ء میں بہترین رائے کا اظہار کیا تھا۔

۱۹۳۹ء میں انھوں نے معلمی کا سلسلہ شروع کیا۔ ان کی پہلی تقرری بطور عربی استاد کے ۱۹۳۹ء میں زمیندار کالج گجرات میں ہوئی تھی۔ ۱۹۴۴ء تک وہاں تدریسی خدمات سرانجام دیتے رہے۔

اس کے بعد ۱۹۴۵ء میں ان کا تبادلہ (موجودہ مشرقی پنجاب کے شہر) ہوشیار پور میں کر دیا گیا۔ گورنمنٹ کالج ہوشیار پور میں وہ ۱۹۴۶ء تک ایک سال رہے۔

۱۹۴۶ء میں ہوشیار پور سے انھیں گورنمنٹ کالج لدھیانہ (مشرقی پنجاب) میں بھیج دیا گیا۔ وہاں وہ اگست ۱۹۴۷ء تک اقامت گزیں رہے۔

اگست ۱۹۴۷ء میں ملک آزاد ہو گیا اور پاکستان معرض قیام میں آ گیا۔ اسی سال (یعنی اگست ۱۹۴۷ء میں) ان کی تدریسی خدمات گورنمنٹ کالج لاہور نے حاصل کر لیں۔ اس کالج میں ۱۹۴۷ء سے ۱۹۶۸ء تک اکیس سال خدمات انجام دیں۔ مجموعی طور سے ان کا زمانہ تدریس تقریباً تیس برس پر مشتمل ہے۔ ۱۹۶۸ء میں وہ ریٹائر ہوئے۔ تیس برس کے اس طویل عرصے میں ان سے بے شمار حضرات نے تعلیم حاصل کی اور حصول تعلیم کے بعد وہ اہم مناصب پر فائز ہوئے۔

گورنمنٹ کالج سے ریٹائر ہونے کے بعد سینئر ایڈیٹر کے طور پر ان کی خدمات پنجاب یونیورسٹی کے اردو دائرہ معارف اسلامیہ نے حاصل کر لیں۔ اس مرکز علم و تحقیق میں انھوں نے نہایت محنت اور خوش اسلوبی سے اپنے فرائض سرانجام دیے۔ بہت سے تحقیقی مقالات خود لکھے جو اردو دائرہ معارف اسلامیہ کی مختلف جلدوں میں حروف تہجی کی ترتیب سے اشاعت پذیر ہوئے اور بے شمار اہل علم کے مقالوں پر نظر ثانی کی۔

تدریسی خدمات کے ساتھ ساتھ انھوں نے تصنیفی خدمات بھی سرانجام دیں۔ ان کی تصانیف میں نصابی کتابیں بھی شامل ہیں اور عربی ادب و لغت سے متعلق خالص فنی اور تحقیقی کتابیں بھی۔

علاوہ ازیں عربی ادب دور جدید 'تاریخ ادبیات پاکستان و ہند' (دوسری جلد) پروفیسر عبدالقیوم اور سید فیاض محمود نے ترتیب دی۔

پاکستان اور ہندوستان کے مختلف رسائل و جرائد میں ان کے جو مضامین و مقالات شائع ہوئے' ان کی فہرست درج ذیل ہے:

۱۔ عباسی دور کے اثرات عربی ثقافت و ادب پر---معارف اعظم گڑھ۔۱۹۳۶ء
۲۔ الشہاب المجازی---اورینٹل کالج میگزین لاہور۔
۳۔ حافظ سخاوی۔نویں صدی ہجری کا نامور مصری مؤرخ و محدث---اورینٹل کالج میگزین لاہور۔مئی ۱۹۴۸ء
۴۔ عربی صحافت کی ابتدا و ارتقا اورینٹل کالج میگزین لاہور۔۱۹۴۹ء
۵۔ جواہر اللسان فی لغات القرآن---اورینٹل کالج میگزین لاہور۔۱۹۴۹ء
۶۔ تحریک خوارج---اورینٹل کالج میگزین ۱۹۵۰ء
۷۔ شاہ ولی اللہ دہلوی کے تعلیمی نظریے---آموزش ۱۹۵۱ء
۸۔ تاجدار اقلیم حدیث۔حافظ ابن حجر عسقلانی---اورینٹل کالج میگزین لاہور۔اگست ستمبر ۱۹۵۲ء
۹۔ ابن منظور افریقی کی لسان العرب پر ایک نظر---معارف اعظم گڑھ' ۱۹۵۲ء
۱۰۔ حجاج بن یوسف---اسلامی زندگی لاہور-۱۹۵۴ء
۱۱۔ شیخ الرئیس ابن سینا---حمایت اسلام لاہور۔۱۹۶۳ء
۱۲۔ امی نبی کا مفہوم---لیل و نہار لاہور۔۱۹۶۲ء
۱۳۔ شاہ ولی اللہ دہلوی۔مفکر و مصلح---لیل و نہار لاہور ۱۹۶۲ء
۱۴۔ ابوالفرج اصفہانی---لیل و نہار لاہور-۱۹۶۳ء
۱۵۔ اندلس کا صوفی مفکر۔ابن عربی---لیل و نہار لاہور۔۱۹۶۳ء

ان کے علاوہ فارابی' ابن سینا' مفتی محمد عبدہ' مصطفیٰ کمال' قاسم امین اور طہ حسین کے بارے میں مضامین سپرد قلم کیے۔پھر ریڈیو پاکستان لاہور میں مختلف موضوعات پر بہت سی تقریریں کیں۔متعدد کتابوں پر تبصرے لکھے۔انگریزی میں کئی مقالے تحریر کیے جو انگریزی کے بعض رسالوں میں شائع ہوئے۔اردو کے تمام مقالے ان کے صاحب زادے میجر زبیر

قیوم کی کوشش سے ''مقالات عبدالقیوم'' کے نام سے دو جلدوں میں شائع ہو گئے ہیں جو مکتبہ سلفیہ شیش محل روڈ لاہور سے مل سکتے ہیں۔ ان کا ناشر بھی مکتبہ سلفیہ ہے۔ ان مقالات کی دوسری جلد میں برصغیر کی جماعت اہل حدیث اور رجال اہل حدیث پر معلومات افزا مقالات سپرد قلم کیے گئے ہیں۔ یہ مقالات اردو دائرہ معارف اسلامیہ کے چیئرمین ڈاکٹر محمود الحسن عارف اور میجر زبیر قیوم نے مرتب کیے ہیں۔ انگریزی مقالات شائع کرنے کا بھی منصوبہ بنایا گیا ہے۔

پروفیسر عبدالقیوم کی فہرست تصنیفات پر نظر ڈالیے تو اس میں سب سے پہلی کتاب ''فہارس لسان العرب'' کا نام دکھائی دے گا۔ یہ ان کی ایک اہم تصنیف ہے۔ اس پر علامہ سید سلیمان ندوی نے ستمبر ۱۹۳۹ء کے ''معارف'' (اعظم گڑھ) میں تبصرہ کیا تھا۔

افسوس ہے اس دنیائے فانی سے ''فہارس لسان العرب'' کا مؤلف بھی کوچ کر گیا ہے اور اس پر تبصرہ کرنے والا بھی آج سے تقریباً پچاس برس پہلے ۲۲ نومبر ۱۹۵۳ء کو اس عالم ناپائیدار سے رخت سفر باندھ گیا تھا۔ قرآن نے بالکل صحیح فرمایا:

کل من علیھا فان ویبقی وجہ ربك ذوالجلال والاکرام۔

رہے نام اللہ کا۔

پروفیسر عبدالقیوم کے بڑے بھائی کا نام عبدالحی تھا۔ ان دونوں بھائیوں نے چھوٹے بھائیوں کی تعلیم و تربیت میں بڑا حصہ لیا اور ان سے ہر قسم کا تعاون کیا۔ عبدالحی صاحب جب پنجاب یونیورسٹی سے ایم۔ اے ہسٹری کرنے کے بعد علی گڑھ گئے اور ایم۔ اے جغرافیہ کرنے کی غرض سے مسلم یونیورسٹی میں داخلہ لیا تو چھوٹے بھائی عبدالقیوم نے ان کی مالی مدد کی اور ان کے یونیورسٹی کے اخراجات پورے کرتے رہے۔

پہلے بتایا گیا ہے کہ یہ آٹھ بھائی تھے۔ ان میں سے عبدالسلام نے ۱۶ ستمبر ۱۹۵۹ء کو وفات پائی' عبداللہ بٹ نے ۲۹ ستمبر ۱۹۶۸ء کو سفر آخرت اختیار کیا' پروفیسر عبدالحی نے جو اسلامیہ کالج (ریلوے روڈ) میں پرنسپل تھے' ۱۹ اپریل ۱۹۷۷ء کو انتقال کیا اور پروفیسر عبدالقیوم نے ۸ ستمبر ۱۹۸۹ء کو داعی اجل کو لبیک کہا۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ تین بھائی ستمبر

کے مہینے میں فوت ہوئے۔

ان آٹھ بھائیوں میں سے میرے زیادہ تعلقات پروفیسر عبدالقیوم اور عبداللہ بٹ سے رہے۔ عبداللہ بٹ دلچسپ آدمی تھے۔

۱۹۸۹ء کے مارچ کی بائیس یا تیئس تاریخ تھی کہ معلوم ہوا پروفیسر عبدالقیوم کو مثانے کی تکلیف ہے اور وہ علاج کے لیے ہاجرہ میموریل ہسپتال میں داخل ہیں۔ میں عیادت کے لیے گیا تو ان کے صاحب زادے میجر زبیر قیوم وہاں موجود تھے۔ پروفیسر صاحب کا آپریشن ہو چکا تھا، میں تھوڑی دیر ان کے پاس بیٹھا، خیر و عافیت پوچھی اور واپس آ گیا۔

وہ چند روز ہسپتال رہے، پھر گھر آ گئے۔ مگر میں ان کے گھر نہیں جا سکا۔ ٹیلی فون پر خیریت پوچھ لیتا تھا۔ بات چیت میں وہ بالکل ٹھیک تھے۔ تشویش کا اظہار کبھی نہیں کیا، ہمیشہ حوصلے سے بات کرتے اور دعا کے لیے ضرور فرماتے۔

ایک دن ٹیلی فون کیا تو معلوم ہوا، وہ ہسپتال میں ہیں۔ دریافت کرنے سے پتا چلا کہ انھیں کمبائنڈ ملٹری ہسپتال (سی۔ ایم۔ ایچ) میں داخل کرا دیا گیا ہے۔ یہ آخر جولائی ۱۹۸۹ء کی بات ہے۔ دوسرے دن زبیر قیوم ادارہ ثقافت اسلامیہ کے دفتر آئے۔ انھوں نے یہ تشویش ناک اطلاع دی کہ ڈاکٹروں کی تشخیص کے مطابق پروفیسر صاحب کو کینسر ہو گیا ہے اور اس کا زہر پورے جسم میں پھیلتا جا رہا ہے۔ میں اسی دن ہسپتال ان کی عیادت کے لیے گیا، وہ حسب معمول اچھی طرح ملے۔ ڈاکٹروں کی تشخیص کا علم انھیں آخر تک نہیں ہو سکا۔ کئی دن وہ سی ایم ایچ میں رہے اور اس اثنا میں تین چار دفعہ میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔

جب علاج سے بالکل مایوس ہو گئے اور صحت یابی کی کوئی صورت باقی نہ رہی تو معالجوں کے کہنے سے میجر زبیر انھیں اپنے سرکاری مکان واقع چھاؤنی میں لے گئے۔ میں عیادت کے لیے گیا، وہ اچھی طرح ملے اور حسب معمول دعا کے لیے کہا، مگر اب حالت بدل چکی تھی اور سفر کی تیاریاں شروع ہو گئی تھیں۔

۸ ستمبر ۱۹۸۹ء کو میجر زبیر قیوم نے اطلاع دی کہ ابا جی کی حالت بہت خراب ہے۔ وہ

جمعے کا دن تھا۔ جمعہ پڑھ کر میں اور پروفیسر ڈاکٹر محمد یحیٰی (صدر شعبہ اسلامیات انجینئرنگ یونیورسٹی) ان کے مکان پر پہنچے۔ افراد خانہ قرآن مجید کی تلاوت کر رہے تھے اور کلمہ شریف کا ورد جاری تھا۔ پروفیسر صاحب نزع کی حالت میں تھے۔ ہمارے ساتھ وہ کوئی بات نہیں کر سکے۔ البتہ زبیر نے بتایا کہ کچھ دیر پہلے مولانا فضل الرحمٰن تشریف لائے۔ تھے۔ انھوں نے السلام علیکم کہا اور اپنا نام بتایا تو ان کے سلام کا جواب دیا اور کہا فضل الرحمٰن اللہ آپ کو خوش رکھے۔ پھر خاموش ہو گئے۔ ان کی دنیوی زندگی کا یہ آخری دن اور آخری وقت تھا۔ پتلیاں پھر گئی تھیں اور آنکھ کا نور زائل ہو چکا تھا۔ میں نے السلام علیکم کہا اور اپنا نام بتایا تو میری طرف آنکھیں کھول کر دیکھا۔ لب ہلے لیکن بول نہیں سکے۔ آنکھیں سفید ہو گئی تھیں۔

کچھ دیر ہم وہاں بیٹھے اور پھر ذہن پر حزن و ملال کا بوجھ اٹھائے واپس آ گئے۔ ان کا اکتالیس سال پر پھیلا ہوا دور ماضی جو ۱۹۴۸ء سے ۱۹۸۹ء تک میں نے دیکھا تھا، تصور میں آیا اور آنکھوں کے سامنے گھومنے لگا۔

شام کو میجر زبیر نے اطلاع دی کہ پروفیسر صاحب وفات پا گئے ہیں۔

انا للہ وانا الیہ راجعون

ان کی وفات سے لاہور کے ایک پرانے خاندان کی علمی یادگار مٹ گئی۔ تعلیمی سلسلے کی ایک قابل ذکر ہستی ختم ہو گئی اور قیام پاکستان کے بعد مرکزی جمعیت اہل حدیث کے نام سے جماعت کی جو تنظیم قائم ہوئی تھی، اس کا پہلا ناظم اعلیٰ اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔

وہ اپنے بیٹے میجر زبیر کی سرکاری رہائش گاہ چھاونی میں فوت ہوئے تھے۔ ان کی وصیت کے مطابق میت کو مسجد مبارک میں لایا گیا اور وہیں ۹ ستمبر کو ۱۱ بجے مسجد مبارک کے خطیب مولانا فضل الرحمٰن نے نماز جنازہ پڑھائی۔ قبرستان میانی صاحب میں ان کے خاندانی احاطے میں ان کے والدین اور بھائیوں کے قریب انھیں دفن کر دیا گیا۔

مرحوم پروفیسر عبدالقیوم قدیم اور جدید کے درمیان حسین ترین نقطہ اتصال تھے۔ اللہ ان کی قبر پر اپنے انوار رحمت کی بارش برسائے اور ان کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے۔ آمین یارب العالمین۔

یہاں ایک اور واقعہ سنتے جایے۔

پروفیسر صاحب کی تدفین کے تیسرے دن میں دوبارہ اظہار افسوس کے لیے میجر زبیر کے گھر گیا تو انھوں نے کہا میری بڑی بہن غزالہ سے بھی ابا جی کا افسوس کر لیجیے۔ ہم ان کے گھر گئے' غزالہ کے شوہر کرنل حامد محمود بٹ بھی اتفاق سے گھر پر موجود تھے۔ اثنائے گفتگو میں غزالہ نے بتایا کہ ۱۹۶۶ء میں انھوں نے ایم۔ اے اسلامیات کا مقالہ اپنے والد کے کہنے پر ''شروح صحیح بخاری'' کے عنوان سے لکھا تھا۔ میرے طلب کرنے پر انھوں نے مقالہ مجھے دکھایا' میں نے ادھر ادھر سے مقالہ دیکھا۔ یہ مقالہ میں نے ان سے لے لیا۔ اسے ایڈٹ کیا اور اس پر مقدمہ لکھا۔ پھر ادارہ ثقافت اسلامیہ کی طرف سے شائع کر دیا۔ اس میں صحیح بخاری کی تقریباً تمام شروح کا ذکر آ گیا ہے جو دو سو سے زائد ہیں۔ اس موضوع کی یہ اولین کتاب ہے۔

حکیم عبدالمجید

(وفات ۳۱ جنوری ۱۹۹۰ء)

۱۹ اگست ۱۹۴۹ء کو گوجرانوالہ سے مولانا محمد حنیف ندوی کی ادارت میں ہفت روزہ "الاعتصام" جاری ہوا تھا- میں اس وقت مرکزی جمعیت اہل حدیث کا ناظم دفتر تھا اور یہ دفتر لاہور میں شیش محل روڈ پر تھا- میں نے "الاعتصام" کے اجرا کے ابتدائی دور ہی میں اس میں کسی نہ کسی موضوع پر لکھنا شروع کر دیا تھا- پھر فروری ۱۹۵۰ء میں مجھے مولانا محمد حنیف ندوی کی طلب پر گوجرانوالہ بھیج دیا گیا تھا-

جامع مسجد اہل حدیث سے متصل "الاعتصام" کا دفتر تھا اور مسجد کے بڑے دروازے کے سامنے ایک اچھا خاصا چوک ہے، جس کے ایک طرف مسجد ہے جسے اس زمانے میں "اونچی مسجد" کہا جاتا تھا- اس مسجد کے نیچے تین چار دکانیں تھیں- ان دکانوں میں سے ایک دکان میں ایک حکیم صاحب کا مطب تھا- مولانا محمد حنیف ندوی کا مکان بڑے قبرستان کی طرف ٹاہلی والی مسجد سے اگلی گلی میں تھا- مولانا جب مکان سے تشریف لاتے تو ان حکیم صاحب کے پاس ضرور جاتے تھے-

مجھے وہاں گئے ہوئے چند روز ہوئے تھے کہ ایک دن مجھے بھی وہ حکیم صاحب کی خدمت میں لے گئے اور ان سے میرا تعارف کرایا- نہایت باغ و بہار شخصیت، بے حد خندہ پیشانی سے ملے- میانہ قد، گورا سرخی مائل رنگ، گول چہرہ، باریک ہونٹ، مناسب جسم، خوب صورت زاویے میں معتدل داڑھی، سادہ مگر صاف ستھرا لباس............ یہ تھے حکیم عبدالمجید- بہت اچھے طبیب، عربی، فارسی اور اردو کے فاضل، صاحب مطالعہ عالم دین- اللہ تعالیٰ نے نبض شناسی میں بھی ان کو مہارت عطا فرمائی تھی اور ان کے علاج سے بھی خالق

کائنات مریض کو صحت یاب فرماتا تھا۔

میری ان سے اس وقت ملاقات ہوئی تھی، جب وہ جوانی کی منزل سے نکل کر دورِ کہولت میں داخل ہو گئے تھے بہ ظاہر صحت بہت اچھی تھی--- ان کا دور کہولت آثار ماضی کی نشان دہی کرتا تھا اور پتا چلتا تھا کہ جوانی بڑی چمک دمک کی ہوگی۔

میرے وہ نہایت مہربان اور انتہائی کرم فرما تھے۔ مولانا ان کے پاس جائیں یا یہ نہ جائیں، میں ضرور جاتا تھا۔ ان میں ایک کشش تھی جو انسان کو اپنی طرف کھینچتی تھی۔

اب آیے حکیم عبدالمجید کے خاندان کی طرف---!

جو روایات ہمیں پہنچی ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس خاندان میں دو چیزیں مدت سے چلی آرہی تھیں۔ ایک طبابت اور دوسری کتابت! ان کے متعدد بزرگوں کو ان دو چیزوں سے تعلق رہا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ عہد مغلیہ میں یہ خاندان سوہدرہ میں آباد تھا جو ضلع گوجرانوالہ کی تحصیل وزیر آباد کا ایک معروف قصبہ ہے اور جس کے ساتھ علم وعمل کی ایک تاریخ وابستہ ہے۔ سوہدرہ میں مغلوں کے زمانے میں اس خاندان کے بعض افراد بعض اہم عہدوں پر متعین رہے۔ پھر واقعات نے ایسا رخ اختیار کیا کہ سوہدرہ سے نقل مکانی کر کے یہ خاندان ایک جگہ ''کولوتارڑ'' چلا گیا۔ وہاں سے ''حضرت کیلیاں والا'' کا قصد کیا۔ یہاں زیادہ مدت ٹھہرنے کا موقع نہیں ملا تو ایک گاؤں ''رتہ تخی'' کی راہ لی۔ وہاں بھی حالات ایسے پیش آئے کہ رہنا مشکل ہو گیا تو وزیر آباد کے قریب ایک گاؤں ''دھونیکے'' میں آ ڈیرے ڈالے اور وہاں مستقل طور سے سکونت اختیار کر لی۔ اس گاؤں کے لوگوں نے ان کی بڑی آؤ بھگت کی اور انھیں وہاں زمین بھی حاصل ہو گئی۔

حکیم عبدالمجید کے آباواجداد کے ناموں سے واقفیت ہمیں ان کے پردادے سے ہوتی ہے جن کا نام محکم دین تھا۔ محکم دین کا ایک ہی بیٹا تھا جس کا نام عبداللہ تھا۔ عبداللہ حالت جوانی میں وفات پا گیا تھا۔

وفات کے وقت اس کے چار بیٹے تھے اور دو بیٹیاں---! بیٹوں کے نام علی

الترتیب یہ تھے۔عبدالعزیز، محمد ابراہیم، احمد دین اور محمد عالم! ان میں سے عبدالعزیز اور محمد عالم لاولد فوت ہوئے۔لیکن محمد ابراہیم اور احمد دین کو اللہ تعالیٰ نے اولاد کی نعمت عطا فرمائی۔حضرت مولانا محمد اسماعیل سلفی جو جماعت اہل حدیث کے جلیل القدر عالم، ممتاز مصنف اور بے مثال خطیب تھے، انہی مولوی محمد ابراہیم کے فرزند عالی قدر تھے۔ان کا مفصل تذکرہ ہم اپنی کتاب "نقوش عظمت رفتہ" میں کر چکے ہیں۔یہ کتاب مکتبہ قدوسیہ اردو بازار لاہور کی طرف سے پہلی دفعہ ۱۹۹۷ء میں چھپی تھی جو تھوڑے عرصے میں ختم ہوگئی تھی۔اس کے بعد پھر شائع ہوئی۔

میاں احمد دین کو اللہ تعالیٰ نے آٹھ بیٹے، بیٹیوں سے نوازا۔ان میں ایک ہمارے ممدوح حکیم عبدالمجید تھے اور ان سطور میں انہی کے متعلق چند باتیں بیان کرنا مقصود ہے۔

حکیم صاحب کم وبیش ۱۹۰۵ء میں بمقام دھونیکے (تحصیل وزیر آباد ضلع گوجرانوالہ) میں پیدا ہوئے۔یہ ایسا علمی خاندان تھا، پڑھنا پڑھانا جس کے افراد کا دن رات کا مشغلہ تھا۔حکیم صاحب چار پانچ سال کے ہوئے تو حصول علم کی ابتدا اپنے والد محترم میاں احمد دین سے کی۔پھر بچے کو وزیر آباد بھیج دیا گیا۔اس وقت وزیر آباد کو مرکز علم اور منبع اصلاح کی حیثیت حاصل تھی۔وہاں حضرت حافظ عبدالمنان اور مولانا عمر دین کا سلسلہ تدریس جاری تھا۔یہ ان کے حلقہ شاگردی میں داخل ہوئے۔حضرت مولانا محمد اسماعیل سلفی حکیم صاحب کے چچازاد بھائی تھے جو ان سے عمر میں دس بارہ سال بڑے تھے اور گوجرانوالہ میں تدریس وخطابت کا فریضہ انجام دیتے تھے۔حکیم صاحب نے ان سے بھی استفادہ کیا۔

پھر علم طب سے دلچسپی پیدا ہوئی تو پہلے شیخوپورہ گئے، وہاں ایک طبیب حکیم عبدالرحیم فروکش تھے، ان سے طب کی کچھ کتابیں پڑھیں۔بعد ازاں امرتسر کو روانہ ہوئے، وہاں بھی بعض اساتذہ طب سے اس فن کے متعلق معلومات حاصل کیں اور ان سے مستفید ہوئے۔اس زمانے میں طب کی زیادہ کتابیں فارسی زبان میں پڑھائی جاتی تھیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ طالب علم طب بھی پڑھ رہا ہے اور اس کے ساتھ فارسی کی تعلیم بھی حاصل کی جا رہی ہے۔

امرتسر سے دہلی کا عزم کیا اور وہاں جامعہ طبیہ میں داخلہ لیا اور اس کا نصاب مکمل کر کے سند حاصل کی۔ اس طرح انھوں نے طب میں بھی مہارت پیدا کی اور دینیات کی تعلیم بھی مکمل کر لی۔ جامعہ طبیہ غالباً بعض معروف اطبا نے حکیم محمد اجمل خان کے طبیہ کالج کے مقابلے میں قائم کیا تھا جو اس علم کے حصول کا بہت بڑا مرکز تھا۔

دہلی اس دور میں مختلف علوم کا گہوارہ تھا۔ دینی علوم کے بھی بہت سے ماہرین وہاں موجود تھے اور علم طب کے شناور بھی۔ بڑے بڑے علما اور اطبا کا یہ شہر مرکز تھا اور دور دور سے شائقین علم اس میں آتے اور تحصیل علم کرتے تھے۔ حکیم عبدالمجید نے بھی اس شہر کا رخ کیا اور علم طب سے بہرہ ور ہوئے۔

واپس وطن آ کر طب کو انھوں نے اپنا پیشہ بنا لیا اور اس میں اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے بڑی برکت پیدا کی۔ ان میں بڑی خوبی یہ تھی کہ انھوں نے طب کے سلسلے میں اسی پر اکتفا نہیں کیا جو کتابوں میں انھیں پڑھایا گیا تھا بلکہ اس میں اپنے طور پر بھی ریسرچ کی۔ طبی اعتبار سے جڑی بوٹیوں کا معاملہ بے حد اہمیت کا حامل ہے اور مریض کے لیے اس میں بہت سے فوائد مضمر ہیں، حکیم صاحب نے اس مسئلے کو بھی ہدف فکر بنایا۔

انھوں نے کسی موضوع پر کوئی کتاب تصنیف نہیں کی اور نہ منبر ومحراب سے وابستہ ہوئے، البتہ اپنے انداز سے تبلیغ دین اور ترویج مسلک کا سلسلہ باقاعدگی سے جاری رکھا۔ وہ مریض کے ساتھ نہایت ہمدردی سے پیش آتے اور اس کی بات انتہائی توجہ سے سنتے۔ آدھی بیماری تو ان کی میٹھی میٹھی باتوں ہی سے ختم ہو جاتی تھی اور مریض مطمئن ہو کر ان کے مطب سے جاتا تھا۔ وہ مریض کو ڈراتے نہیں تھے اور یہ نہیں کہتے تھے کہ موت کے قریب پہنچ گئے ہو تو میرے پاس آ گئے ہو، بلکہ ان کی عادت یہ تھی کہ مرض کتنا بھی الجھا ہوا ہوتا، وہ مریض کو اطمینان دلانے کی کوشش کرتے کہ اللہ کے فضل سے تم تندرست ہو جاؤ گے۔ یہ تھوڑے دنوں کی تکلیف ہے، اللہ رفع فرما دے گا۔

مریض کو تسلی دینا، اس کی پریشانی دور کرنے کی کوشش کرنا، اس سے بہتر طریقے سے گفتگو کرنا اور اس کے دل کو حوصلہ دینا، بہت بڑی نیکی اور بہت بڑا کار ثواب ہے اور حکیم

عبدالمجید صاحب کا یہی معمول تھا۔

بعض اطبا کو دیکھا گیا ہے کہ اپنی باتوں سے وہ تندرست کو بھی موت کے کنارے جا کھڑے کرتے ہیں اور اگر وہ واقعی زیادہ مرض میں مبتلا ہو تو اس کی رہی سہی جان بھی نکال دیتے ہیں۔ یہ طب نہیں، میرے خیال میں "طبی دہشت گردی" ہے اور لوگوں کو خوف و ہراس میں مبتلا کرنا ہے۔ سیدھی بات ہے، مرض سمجھ میں آتا ہے تو اس کا علاج کیجیے، نہیں سمجھ میں آتا تو کہیے کہ کسی اور کے پاس جاؤ۔ اسے ڈرانے دھمکانے اور دہشت زدہ کرنے کی کیا ضرورت ہے۔

حکیم عبدالمجید نے نہایت لگن اور شوق کے ساتھ طب کی خدمت کی۔ بلکہ صحیح معنوں میں کہنا چاہیے کہ مریضوں کی خدمت کی۔ دن رات کے کسی حصے میں امیر، غریب، چھوٹا بڑا جو مریض ان کے پاس آیا، انھوں نے فوراً اسے دیکھا، اس کے مرض کی کیفیت جس انداز میں مناسب سمجھا، پوچھی اور اسے دوا دی۔

ان کا مطب ضرور تھا، وہ اس میں بیٹھتے اور اس کا کرایہ دیتے تھے، لیکن مریض سے کوئی تقاضا نہیں کرتے تھے، کسی نے کچھ دے دیا تو لے لیا، ورنہ اسے پریشان نہیں کیا۔ بالفاظ دیگر مطب کو انھوں نے مطلب برآری کا ذریعہ نہیں بنایا۔

وزیر آباد کے محلہ الہ آباد میں ان کا مکان تھا اور وہ روزانہ وہاں سے صبح کے وقت گوجرانوالہ آتے اور مطب پر بیٹھتے تھے، شام کو واپس گھر جاتے تھے۔ آتے اور جاتے وقت سفید رنگ کے موٹے کپڑے کا تھیلا ان کے ہاتھ میں ہوتا تھا۔ اس تھیلے میں کیا چیزیں ہوتی تھیں؟ چند شیشیاں، کچھ دوائیں یا کوئی کتاب یا ٹافیاں......!

وزیر آباد میں انھوں نے اپنی کوشش سے ایک مسجد "جامع الحمدی" تعمیر کرائی۔ یہ مسجد میں نے دیکھی ہے۔ خوب صورت اور کشادہ مسجد --- یہ ان کا صدقہ جاریہ ہے اور اس علاقے میں تبلیغ دین کا بہترین مرکز!

وہ صاحب مطالعہ عالم دین اور ہمدرد خلائق طبیب تھے۔ بے حد منکسر، متواضع اور متحمل مزاج۔ تہجد گزار، نماز باجماعت کے پابند۔ قرآن و حدیث پر خود تو عامل تھے

ہی لوگوں کو بھی اپنے خاص لہجے میں قرآن پڑھنے اور حدیث پر عمل کرنے کی تلقین فرماتے تھے۔

اگر انھیں کسی کام کے لیے کہا جاتا تو اسے اپنا ذاتی کام قرار دے لیتے اور اس کی تکمیل پر خوش ہوتے۔ اس کی ایک مثال عرض کرتا ہوں، جس کا تعلق میری ذات سے ہے۔

تقسیم ملک سے قبل اپنے علاقے مشرقی پنجاب میں ہمارا تعلق ٹرانسپورٹ سے تھا اور اس کا نام فرید کوٹ ٹرانسپورٹ کمپنی تھا۔ قیام پاکستان کے بعد ہم جڑانوالہ (ضلع لائل پور) میں آئے تو یہاں بھی کسی نہ کسی پیمانے پر یہ سلسلہ جاری رہا۔ اب بھی ہمارے بعض عزیز (جن میں میرے بھائی بھی شامل ہیں) یہ کام کرتے ہیں۔

غالباً ۱۹۶۰ء (یا اس کے پس وپیش) کی بات ہے کہ مجھ سے تعلق رکھنے والے ایک ڈرائیور راولپنڈی سے سامان سے بھرا ہوا ٹرک لے کر لاہور آرہے تھے کہ ضلع گجرات کے کسی مقام پر حادثہ پیش آگیا اور ایک شخص سخت زخمی ہوگیا۔ ڈرائیور کی عارضی ضمانت ہوگئی، لیکن آگے معاملے کا تعلق پولیس کی شہادت وغیرہ سے تھا۔ ڈرائیور میرے پاس آیا اور بتایا کہ گجرات کا ایس پی وزیر آباد کا رہنے والا ہے' اگر اس سے بات ہوجائے تو مسئلہ حل ہوسکتا ہے اور وہ سزا سے بچ سکتا ہے۔

میں اسے وزیر آباد حکیم صاحب کے پاس لے گیا۔ دن کے دس بجے کا وقت ہوگا۔ حکیم صاحب کو بات بتائی گئی تو کہا:

اب یہ مسئلہ تمھارا نہیں رہا میرا ہوگیا ہے۔

اسی وقت اپنے صاحب زادے محمد حنیف سے کہا کہ ایس پی کے گھر جاؤ اور پتا کرو وہ کس دن وزیر آباد آئیں گے۔ اگر یہاں آنے کا پروگرام نہیں ہے تو ہم ان کے پاس گجرات جائیں گے .... حنیف صاحب کو معلوم نہیں یہ واقعہ یاد ہے یا نہیں۔ بہرحال ایس پی اس دن اتفاق سے وہیں تھا۔ حکیم صاحب اس سے ملے اور کام متعلقہ آدمی کی مرضی کے مطابق ہوگیا۔

دوپہر کا کھانا ہم نے حکیم صاحب کے ساتھ کھایا اور شام کو لاہور آگئے۔

ایک واقعہ اور سنیے!

ایک دفعہ میری بیوی بیمار ہوگئی- کافی علاج کرائے لیکن افاقہ نہ ہوا- بڑی پریشانی ہوئی- مولانا محمد حنیف ندوی نے مشورہ دیا کہ حکیم عبدالمجید سے ملو اور ان سے علاج کراؤ- چنانچہ میں مریضہ کو حکیم صاحب کے پاس گوجرانوالہ لے گیا- اس وقت صبح کے نو بجے ہوں گے- حکیم صاحب مجھے دیکھ کر حیران ہوئے- فرمایا تم نے اتنی تکلیف کی- گھر کی بات تھی مجھے اطلاع دیتے میں لاہور پہنچ جاتا- مسکراتے ہوئے کہا: اس بہانے لاہور بھی دیکھ لیتا- مریضہ کو دیکھا اور آٹھ دن کی دوا دی اور کہا اب یہاں آنے کی ضرورت نہیں پڑے گی- اللہ تعالیٰ صحت عطا فرمائے گا- چنانچہ اللہ تعالیٰ نے صحت عطا فرما دی-

مولانا محمد حنیف ندوی کی پیدائش ۱۹۰۸ء کی تھی اور حکیم صاحب کی تقریباً ۱۹۰۵ء کی- دونوں قریب قریب ہم عمر بھی تھے اور دوست بھی۔ اس لیے باہم بے تکلفی سے گفتگو کرتے تھے- لیکن میرا اور حکیم صاحب کا کم و بیش بیس سال کا فرق تھا- میری پیدائش ۱۹۲۵ء کی ہے، لیکن مجھے بھی بات چیت میں انھوں نے "رواں" کرلیا تھا اور میری "خردیت" ختم کر کے مجھے برابر کی سطح پر لے آئے تھے...... تکلف، تصنع اور ہٹو بچو سے انھیں کوئی واسطہ نہ تھا-

بے شک ان معنوں میں وہ واعظ اور مقرر اور مدرس نہ تھے جن معنوں میں یہ لفظ بولا جاتا ہے، لیکن کثیر المطالعہ شخص تھے اور معلومات کا دائرہ وسیع تھا- اردو ادب سے بھی لگاؤ تھا- گفتگو میں شعر پڑھنے کی ضرورت پڑتی تو برمحل پڑھتے تھے- وظائف و اوراد کا بھی ذوق رکھتے تھے، لیکن کسی چیز کی نمائش نہیں کرتے تھے- اپنے نیک اطوار اور صالحیت آشنا اسلاف کا صحیح نمونہ تھے-

مطبوعہ کتابوں کے علاوہ قلمی کتابوں کا بھی اچھا خاصا ذخیرہ ان کے پاس محفوظ تھا اور موسم برسات گزر جانے کے بعد ہر سال قلمی کتابوں کو دھوپ میں رکھتے تھے- یہ فریضہ ان کے صاحب زادے ڈاکٹر محمد یوسف فاروق انجام دیتے تھے-

بالعموم کتابوں کے شائقین کسی کو کتاب دینے میں بخیل یا نرم لفظوں میں یوں کہیے کہ انتہائی محتاط ہوتے ہیں، لیکن حکیم صاحب اس سلسلے میں بڑے فراخ حوصلہ بلکہ غیر محتاط تھے-

ان سے کسی نے جو کتاب مانگی دے دی- نایاب اور نہایت قیمتی کتابیں بھی وہ اصحاب مطالعہ کو دے دیتے تھے- چنانچہ ان سے بعض قلمی کتابیں کرنل خواجہ عبدالرشید مرحوم نے لیں اور پھر حکیم صاحب کو واپس نہیں ملیں-

ان میں سے ایک قلمی کتاب کے اندرونی صفحے پر تحریر تھا کہ "یہ خط گلفام ایک نیا خط تحریر فردوسی نے شاہ نامہ کی تحریر کے لیے بادشاہ کی فرمائش پر ایجاد کیا تھا، .... پھر ایک طویل نظم اسی رسم الخط میں اس خط کی تعریف میں لکھی گئی تھی- اس تعریفی نظم کا ترجمہ بھی لکھا گیا تھا- حکیم صاحب کے فرزند گرامی ڈاکٹر محمد یوسف فاروق نے یہ تحریر کرنل خواجہ عبدالرشید کو دکھائی تو وہ نہایت متعجب ہوئے اور ان سے کہا کہ یہ تحریر مجھے دو، میں اس پر تحقیق کر کے مقالہ لکھوں گا- ڈاکٹر محمد یوسف فاروق صاحب نے حکیم صاحب کی اجازت سے وہ کتاب کرنل صاحب کو دے دی تا کہ وہ تحقیق کر کے مقالہ لکھ سکیں-

طویل عرصہ گزر گیا' لیکن کتاب کرنل صاحب نے واپس نہیں کی- حکیم صاحب اور ڈاکٹر یوسف نے کرنل صاحب کے احترام میں خاموشی اختیار کیے رکھی اور کتاب کا مطالبہ نہیں کیا- خیال یہ تھا کہ وہ خود کتاب واپس کر دیں گے- پھر ایک مدت کے بعد کرنل صاحب کا مکتوب گرامی موصول ہوا، جو حسب ذیل الفاظ پر مشتمل تھا-

> "گلفام محمود غزنوی کے زمانے کا "کوڈ" رسم الخط ہے جو خفیہ ہدایات لکھنے کے لیے استعمال ہوتا تھا- میں نے اس پر ایک مقالہ لکھا ہے- دوسری مثال اس خط کی ایران کی کسی لائبریری میں ملی ہے، میرا مقالہ ادارہ ثقافت اسلامیہ کے مجلّے میں بزبان انگریزی چھپا ہے- چوں کہ آپ اپنی کتاب لینے کے لیے نہیں آئے' اس لیے میں نے یہ کتاب عجائب گھر لاہور کو دے دی ہے-"

کرنل صاحب نے اپنا مقالہ بھی حکیم صاحب یا ڈاکٹر محمد یوسف فاروق کو نہیں بھجوایا اور کتاب بھی واپس نہیں کی، اور ان سے پوچھے بغیر عجائب گھر کو عنایت فرما دی- اب کیا معلوم وہ کتاب کہاں ہے اور کس کے پاس ہے-

اس سے کچھ عرصہ بعد کرنل صاحب وفات پا گئے-

میں ادارہ ثقافت اسلامیہ سے منسلک تھا اور بتیس سال وہاں تصنیفی خدمات انجام دیتا رہا- ادارے کے مجلّے ''المعارف'' کی ادارت میرے سپرد تھی، کرنل صاحب کی ادارے میں آمدورفت تھی اور ان سے میری ملاقات رہتی تھی- کچھ عرصہ وہ ادارے کی مجلس منتظمہ کے رکن بھی رہے، لیکن یہ معلوم نہیں کہ ان کا مقالہ ادارے کے مجلّے میں کب چھپا-

میرا خیال ہے انھیں سہو ہو گیا ہوگا- ان کا مقالہ کسی اور مجلّے میں چھپا ہوگا.........

بہر حال مقالہ کہیں چھپا ہو یا نہ چھپا ہو، کتاب تو اسی شخص کو دینی چاہیے تھی جو اس کا اصل مالک تھا اور جس سے لی تھی-

حکیم صاحب کی قلمی کتابوں میں ایک مثنوی مولانا روم تھی جو چھے جلدوں میں تھی اور اس کا خط نہایت خوب صورت تھا- یہ چھٹے مغل بادشاہ اورنگ زیب عالم گیر کے زمانے کی لکھی ہوئی تھی- اس کے بعد کسی کاتب ہدایت اللہ نے اس کی آخری جلد کے آخری صفحے پر یہ الفاظ تحریر کیے ہیں-

''یہ مثنوی معنوی چودھری محمد خاں نے نونہالان چمن اپنے بیٹوں محی الدین اور معین الدین کی خاطر لکھوائی اور میں نے دریاے چناب کے کنارے واقع شہر سوہدرہ میں رمضان المبارک کی ...... تاریخ بعد از نماز عصر اس کی تکمیل کی-''

یہ مثنوی بھی ایک صاحب نے حکیم صاحب سے لی اور پھر واپس نہیں کی-

حکیم صاحب کی مختلف موضوعات پر بہت سی قلمی کتابیں تھیں جو انھیں اپنے اسلاف سے ورثے میں ملی تھیں، لیکن ان کے صاحب زادے ڈاکٹر محمد یوسف فاروق کے بقول حکیم صاحب نے عجائب گھر (لاہور) کے ایک بہت بڑے ذمے دار شخص کو گھر بلا کر ان کے حوالے کر دیں- ان صاحب نے کتابیں وصول کیں لیکن وصولی کی رسید وغیرہ نہیں دی- حکیم صاحب نے یہ کتابیں عجائب گھر کی لائبریری کے لیے دی تھیں، کچھ معلوم نہیں وہ کتابیں کہاں ہیں اور کس حال میں ہیں-

جن صاحب کو یہ کتابیں دی گئی تھیں، ڈاکٹر صاحب نے میرے نام ایک خط میں ان کا اسم گرامی تحریر کیا ہے اور ان کا عہدہ بھی لکھا ہے، لیکن میں اس موضوع کی تفصیل میں جانا

مناسب نہیں سمجھتا۔ ان صاحب سے میرے بہت سالوں سے تعلقات ہیں۔

حکیم صاحب ذاتی طور پر کوئی بہت بڑے سرمایہ دار نہیں تھے، لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کو توفیق عطا فرمائی تھی کہ وہ اپنے طور سے یتیموں، مسکینوں اور بیوہ عورتوں کی مدد کرتے رہتے تھے، جس کی مدد کرنا ان کے نزدیک ضروری ہوتا، اس کی عزت نفس کا وہ پورا احترام کرتے تھے۔ ان کی کوشش ہوتی تھی کہ کسی کو اس کا پتا نہ چلے۔

بعض مریضوں اور مستحق لوگوں کو وہ اپنے صاحب زادے ڈاکٹر محمد یوسف فاروق کے پاس بھیج دیتے تھے کہ ان کا علاج بھی کیا جائے اور ان کی مالی مدد بھی کی جائے۔

وہ اپنی اولاد اور ملنے والوں کو تاکید کرتے کہ کسی معاملے میں غلط بیانی سے کام نہ لیا جائے، جھوٹ نہ بولا جائے، کسی کو دھوکا نہ دیا جائے، کسی اچھے کام کی انجام دہی میں تساہل نہ برتا جائے، وعدہ خلافی نہ کی جائے، کسی کی غیبت نہ کی جائے، کسی کو پریشانی میں مبتلا نہ کیا جائے، کسی کو نقصان نہ پہنچایا جائے، کسی کی برائی نہ کی جائے۔ وہ خود بھی بلند اخلاق تھے اور دوسروں کو بھی اخلاق حسنہ کی تلقین کرتے تھے۔

حکیم صاحب کی قوت حافظہ بہت مضبوط تھی۔ جو کتاب ایک دفعہ پڑھ لی، اس کے مطالب ان کے خزانۂ ذہن میں محفوظ ہو گئے۔ اس کے مندرجات پر گفتگو کرنے کے لیے انھیں بار بار اس کتاب کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی، بس ایک دفعہ اس پر نظر ڈال لینا کافی ہوتا تھا۔

ان کے دوستوں کا بھی ایک حلقہ تھا جو اہل علم اور اصحاب مطالعہ حضرات پر مشتمل تھا، ان میں مولانا محمد حنیف ندوی اور مولانا عطاء اللہ حنیف کے اسمائے گرامی نمایاں ہیں۔

پھر بعض حضرات سے وہ بے حد عقیدت کا اظہار کیا کرتے تھے، ان میں ایک حضرت مولانا محمد اسماعیل سلفی تھے جو ان کے تایا زاد بھی تھے، ان کے بہنوئی بھی تھے اور ان کے استاذ بھی تھے۔

حضرت مولانا ابوالکلام آزاد سے وہ بے پناہ عقیدت رکھتے تھے۔ کسی زمانے میں ان کی تحریریں پڑھتے اور ان کی تقریریں سنتے رہے تھے۔ گوجرانوالہ شہر اور ضلعے کو جہاں ایک

مذہبی ضلع اور شہر کی حیثیت حاصل ہے، وہاں سیاسی اعتبار سے بھی یہاں کے لوگوں کو ایک اہم مقام حاصل تھا۔ خود مولانا محمد اسماعیل سلفی سیاسیات میں خاص شہرت رکھتے تھے اور ملک کے سیاسی دائرے میں ان کا تعلق مولانا ابوالکلام آزاد کے نقطۂ فکر سے تھا اور وہ عملاً بھی اس میں حصہ لیتے تھے۔ حکیم صاحب کا تعلق عملی سیاست سے تو نہیں تھا البتہ طویل عرصے تک ان کے رجحانات وہی رہے جو مولانا ابوالکلام آزاد کے معتقدین کے تھے۔ قیام پاکستان سے تھوڑا عرصہ قبل ذہنی سانچا کچھ بدل گیا تھا۔

حکیم صاحب میں ایک بہت بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ بزرگان دین کی علمی مساعی کو نہایت اہمیت دیتے تھے اور اس کے تسلسل کو آگے بڑھانے کے خواہاں رہتے تھے۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ ان کی خواہش تھی کہ حضرت نواب سید صدیق حسن خاں رحمۃ اللہ علیہ کی اردو تفسیر ترجمان القرآن کو جو پندرہ ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے، دوبارہ شائع کیا جائے، لیکن اشاعت سے پہلے اس کی زبان اور انداز نگارش وغیرہ پر اس طرح غور کیا جائے کہ قدیم اور متروک الفاظ کی جگہ نئے الفاظ لائے جائیں جو موجودہ دور میں رائج ہیں۔ مختلف مقامات پر بڑے عنوان قائم کیے جائیں اور پھر ان کے تحت ذیلی عنوانات لائے جائیں۔ الگ الگ پیراگراف بنائے جائیں۔ دو تین یا چار اہل علم کو اس خدمت پر مامور کیا جائے جو زبان کی نزاکتوں کو بھی سمجھتے ہوں، قرآن کے مطالب پر بھی نگاہ رکھتے ہوں اور تفسیری نکات سے بھی آگاہ ہوں۔ بہت عرصہ پیشتر انھوں نے اپنے صاحب زادوں سے کہا تھا کہ اس کام کے لیے انھوں نے چھتیس ہزار روپے کی رقم مخصوص کی ہے جو ان کے پاس محفوظ ہے۔ جو حضرات یہ خدمت انجام دیں گے یہ رقم ان کی نذر کی جائے گی۔ جس زمانے میں انھوں نے اس منصوبے کو عملی شکل میں لانے کے متعلق سوچا تھا، اس زمانے میں یہ بہت بڑی رقم تھی اور یہ منصوبہ اس رقم سے پایۂ تکمیل کو پہنچ سکتا تھا۔ لیکن افسوس ہے رجال کار میسر نہ آنے کی وجہ سے کام شروع نہ ہوسکا۔ ان کی وفات کے بعد ان کے صاحب زادے ڈاکٹر محمد یوسف فاروق نے اپنے بھائیوں کے مشورے سے اس رقم میں ایک لاکھ روپے کا اضافہ کر دیا تھا۔ یہ بات انھوں نے مجھ سے بھی کی تھی۔ کچھ عرصہ پیشتر ڈاکٹر صاحب کے بھائی اور ہمارے

دوست عتیق الرحمٰن صاحب اپنے چند دوستوں کے ساتھ اس فقیر کی کٹیا میں تشریف لائے تھے۔ انھوں نے یہ خوش خبری سنائی تھی کہ اللہ کا نام لے کر کام شروع کر دیا گیا ہے۔ جن صاحب علم کے سپرد یہ کام کیا گیا ہے، مجھے یقین ہے، ان شاء اللہ وہ اسے بہتر طریقے سے انجام دیں گے۔

حضرت نواب صدیق حسن خاں صاحب کی خدمت قرآن دس ہزار صفحات پر مشتمل ہے اور انتہائی قابل قدر محققانہ خدمت ہے۔ اردو تفسیر میں انھوں نے جو اسلوب اختیار کیا ہے، وہ قرآن مجید کی تفہیم کا منفرد اور اچھوتا اسلوب ہے۔ ہم عاجز بندوں کی قرآن کو نازل کرنے والے کی بارگاہ اعلیٰ و اقدس میں دعا ہے کہ یہ کام جلد تکمیل کو پہنچے اور پھر اشاعت کا مرحلہ طے کرے۔ آمین

حکیم صاحب نہایت مشفق و منکسر اور علم اور علما کے قدردان تھے۔ ان کے انکسار کا یہ عالم تھا کہ اہل علم سے اس انداز سے بات کرتے کہ ان سے کچھ حاصل کرنے کے متمنی اور ان کی گفتگو سے اپنی معلومات میں اضافے کے خواہاں ہیں، حالاں کہ وہ خود صاحب علم تھے اور زیر بحث معاملے سے آگاہ ہوتے تھے۔

حضرت مولانا عطاء اللہ حنیف سے انھیں بالخصوص لگاؤ تھا۔ وہ بیماری کی حالت میں بھی ان کے پاس وزیر آباد سے لاہور آتے تھے۔ ایک دفعہ اپنے صاحب زادے ڈاکٹر محمد یوسف فاروق سے کہا کہ مولانا عطاء اللہ سے ملنے کو جی چاہتا ہے، آیئے لاہور چلیں۔ مولانا کی رہائش مکان کی دوسری منزل میں تھی۔ حکیم صاحب گھٹنوں کے درد میں مبتلا تھے' ان کے لیے اوپر جانا مشکل تھا اور مولانا عطاء اللہ صاحب کو بھی بیماری نے گھیر رکھا تھا، ان کے لیے نیچے آنا مشکل تھا۔ نیچے سیڑھیوں میں حکیم صاحب کو ان کے بیٹے یوسف صاحب لیے کھڑے ہیں اور اوپر مولانا کے صاحب زادے حافظ احمد شاکر باپ کو سہارا دیے ہوئے ہیں۔ کسی نہ کسی طرح حکیم صاحب کو اوپر لے جایا گیا تو دونوں کو آپس میں مصافحہ کرنے اور بات چیت کرنے کا موقع ملا۔

مولانا کافی عرصہ بیمار رہے۔ حکیم صاحب ان سے ملاقات کے لیے تشریف لاتے

رہے، اس وقت ان کی ملاقات یا تو مکتبہ سلفیہ میں ہو جاتی تھی جہاں مولانا آہستہ آہستہ چل کر آجاتے تھے یا حکیم صاحب اوپر جا کر ان سے مل لیتے تھے۔ لیکن پھر ایسا وقت آیا کہ دونوں بیمار پڑ گئے اور میل ملاقات میں بیماری سخت رکاوٹ بن گئی۔

اب آیئے حکیم صاحب کی وفات اور تدفین کا ذکر کرتے ہیں کہ ہر انسان کو مرنا ہے اور موت کے وقت کا کسی کو علم نہیں، لیکن اللہ کے نزدیک مقرر ہے اور وہ جانتا ہے کہ کسی جان دار کا آخری وقت کب آئے گا۔

پہلے بتایا جا چکا ہے کہ ابتدائی عمر میں انھوں نے حضرت حافظ عبدالمنان وزیر آبادی رحمۃ اللہ علیہ سے استفادہ کیا تھا...... حضرت حافظ صاحب کو استاذ پنجاب کہا جاتا ہے۔ وہ تمام عمر وزیر آباد میں رہے اور بے شمار علما و طلبا نے ان سے کتب حدیث پڑھیں اور آگے لاتعداد لوگوں کو پڑھائیں۔ انھوں نے وفات بھی وزیر آباد میں پائی اور وہیں دفن کیے گئے۔

حکیم صاحب اپنے بیٹوں کو کہا کرتے تھے کہ انھیں حافظ صاحب کے قریب دفن کیا جائے۔ جب بیمار ہو جاتے تو بار بار کہتے کہ ان کی قبر حافظ کی قبر سے متصل ہونی چاہیے۔ وفات سے پندرہ دن پہلے جب وہ تندرست تھے اور کسی مریض کے لیے دوا تیار کر رہے تھے اپنے صاحب زادے جناب عتیق الرحمٰن سے کہا کہ میری موت کا وقت قریب ہے، مجھے حافظ صاحب کے قریب دفن کرنا۔ یہ میرا تم پر فرض ہے، جس پر عمل کرنا ضروری ہے۔ یہ بات انھوں نے ایک سے زیادہ دفعہ کہی۔

عتیق الرحمٰن صاحب نے جواب دیا: کیا آپ کو مرنے کا شوق ہے۔ بار بار آپ یہی الفاظ کہہ رہے ہیں۔ اگر موت آ بھی جائے تو حافظ صاحب کی وفات پر ۸۰ برس گزر چکے ہیں، اب ان کی قبر کے آس پاس کہاں جگہ بچی ہوگی۔

حکیم صاحب نے اس جواب پر بیٹے کو ڈانٹا اور کہا: میرے ساتھ بحث نہ کرو۔ تم کوشش کرو گے تو اللہ تعالیٰ کامیابی کی راہ پیدا کر دے گا اور وہاں جگہ نکل آئے گی۔

کرنا خدا کا کیا ہوا کہ اس سے پندرہ دن بعد حکیم صاحب وفات پا گئے۔ اب تدفین کے سلسلے میں ان کی وصیت کا مسئلہ درپیش تھا۔ اس وقت وہاں کی جامع مسجد اہل حدیث

کے خطیب مولانا عبدالرحمٰن عتیق تھے جن کا مشرقی پنجاب میں اصل وطن وہی تھا جو میرا وطن ہے، یعنی کوٹ کپورہ ریاست فرید کوٹ- افسوس ہے وہ بھی وفات پا چکے ہیں- ان کے علم میں یہ بات لائی گئی تو وہ اسی وقت قبرستان گئے اور تھوڑی دیر بعد واپس آ گئے- انھوں نے بتایا کہ حکیم صاحب کے دونوں اساتذہ حضرات حافظ عبدالمنان اور مولانا عمر دین رحمتہ اللہ علیہم کی پائنتی میں بالکل صاف لیکن ڈھلان جگہ ہے- چنانچہ حکیم صاحب کو وہاں دفن کر دیا گیا- ان کی وفات و تدفین کا واقعہ ۳۱ جنوری ۱۹۹۰ء کو پیش آیا-

انا للہ وانا الیہ راجعون

اللھم اغفر لہ وارحمہ وعافہ واعف عنہ

ان کی تدفین کے بعد ان کے صاحب زادے ڈاکٹر محمد یوسف فاروق نے اچھی خاصی مٹی ڈلوا کر قبرستان کے اس ڈھلان کو ہموار کرا دیا تھا- اس سے دو سال بعد حکیم صاحب کے پاس مولانا عبدالرحمٰن کو دفن کیا گیا-

اللھم اکرم نزلہ ووسع مدخلہ وادخلہ جنت الفردوس

حکیم صاحب نے اپنی اولاد کو جو وصیت کی، ان میں یہ وصیت بھی شامل تھی کہ ہفت روزہ "الاعتصام" سے تعاون جاری رکھا جائے، میری کتابوں کی اگر تم حفاظت کر سکو تو انھیں افادہ عوام کے لیے میری مسجد میں رکھ دیا جائے- اگر حفاظت نہ کر سکو تو مولانا عطاء اللہ حنیف کی قائم کردہ لائبریری (دارالدعوۃ السلفیہ لاہور) کو دے دیا جائے-

ڈاکٹر محمد یوسف صاحب کا بیان ہے کہ جس رات حکیم صاحب نے وفات پائی، اس رات گھر میں انھوں نے (ڈاکٹر یوسف صاحب نے) اپنے چند دوستوں کو مدعو کر رکھا تھا- حکیم صاحب کی صحت بالکل ٹھیک تھی- وہ اس مجلس میں موجود تھے اور ہنسی خوشی باتیں کر رہے تھے- اپنے معمول کے مطابق ان کا وعظ و تبلیغ کا سلسلہ بھی اس مجلس میں جاری تھا- ڈاکٹر صاحب کے ایک دوست نے ان کی ٹانگیں دابنا شروع کیں تو دیر تک دابتے رہے- پھر حکیم صاحب نے ہنستے ہوئے ان سے کہا- بس کر یار میں قبر میں تمھارا مقروض رہوں گا- پھر بطور وصیت کے کہا: میری موت کی تشہیر سوزوکی پر نہ کرنا- اپنے آپ کو اسلام کے پابند رکھنا، یہی

فلاح کی راہ ہے- اس کے بعد خود تمام دوستوں کو رخصت کیا-

رات کے بارہ بجے کے قریب ڈاکٹر یوسف کو آواز دی اور ان سے اپنی عینک مانگی- ڈاکٹر صاحب نے ادھر ادھر عینک تلاش کی تو انھیں نہ ملی- پھر خود ہی تکیے کے نیچے سے عینک نکال کر آنکھوں پر لگائی اور اس طرح دیکھنے لگے جیسے کسی کو پہچاننے کی کوشش کر رہے ہوں- اسی اثنا میں ڈاکٹر صاحب سے کہا: میرے سینے سے لگ جاؤ- سینے سے لگا کر انھیں زور سے بھینچا اور دو دفعہ کہا:

استغفر الله ، استغفر الله

یہ آخری کلمہ تھا جو ان کی زبان سے ادا ہوا اور پھر اللہ کو پیارے ہو گئے-

انھوں نے اپنی اولاد کی بہترین تربیت کی- اولاد چار بیٹوں اور دو بیٹیوں پر مشتمل ہے- تمام اولاد تعلیم یافتہ، نیک اطوار اور عمدہ خصال ہے-

بیٹوں کے نام یہ ہیں: محمد ادریس، محمد حنیف، عتیق الرحمٰن اور محمد یوسف......!

محمد ادریس ریلوے کے شعبہ اکاؤنٹ میں افسر تھے- ریٹائر ہو چکے ہیں- راولپنڈی میں سکونت پذیر ہیں- ان کے چار بیٹے ہیں، عمر، احمد، اجمل اور کامران- عمر ڈاکٹر ہیں، ماہر امراض چشم- سعودی عرب میں اقامت گزیں ہیں- احمد پاکستان میں ائیر فورس میں افسر ہیں- اجمل اور کامران کمپیوٹر کا کاروبار کرتے ہیں-

محمد حنیف بھی ملازمت سے ریٹائر ہو چکے ہیں- ان کی سات بیٹیاں ہیں اور ایک بیٹا جو اپنا کاروبار کرتا ہے-

عتیق الرحمٰن نیشنل بینک میں مینجر تھے- ریٹائر ہو گئے ہیں- سات بچے ہیں، پانچ لڑکیاں اور دو لڑکے-

ڈاکٹر محمد یوسف فاروق کا وزیر آباد میں ہسپتال ہے- ان کا ایک بیٹا ہے جس کا نام وقاص ہے اور دو بیٹیاں ہیں-

یہاں حکیم صاحب کی ایک بیٹی کی شادی اور ان کے بیٹے ڈاکٹر محمد یوسف فاروق کی شادی کے متعلق بھی سنیے!

ایک صاحب تھے چودھری عبدالقادر۔ وہ ضلع فیروز پور کی تحصیل زیرہ سے تعلق رکھتے تھے۔ تقسیم ملک کے بعد منٹگمری (ساہیوال) میں آباد ہو گئے تھے۔ مرکزی جمعیت اہل حدیث کی مجلس عاملہ کے رکن تھے۔ ہمارے نہایت مہربان تھے۔ ان کے ایک بیٹے چودھری محمد صادق ہیں جن کا شمار سپریم کورٹ کے ممتاز وکلا میں ہوتا ہے۔ لاہور میں قیام پذیر ہیں اور ہمارے مخلص ترین دوستوں میں سے ہیں۔ ان کے ایک بھائی چودھری سلطان محمود ہیں، ان سے حکیم صاحب کی بیٹی کی شادی ہوئی ہے۔ اسی طرح چودھری محمد صادق کے چچا چودھری محمد عبداللہ کی بیٹی حکیم صاحب کے بیٹے ڈاکٹر محمد یوسف فاروق کے عقد میں آئیں۔ چودھری محمد عبداللہ بھی ہمارے کرم فرماتے تھے۔ نکاح حضرت مولانا عطاء اللہ حنیف نے پڑھایا تھا۔

اب آخر میں ڈاکٹر محمد یوسف فاروق کے ایک خط کا کچھ حصہ پیش کیا جاتا ہے۔ اس خط کا پس منظر یہ ہے کہ ۱۹۹۷ء میں میری کتاب ''نقوش عظمت رفتہ'' شائع ہوئی تھی۔ اس کتاب میں دیگر شخصیات کے علاوہ حضرت استاذ مولانا محمد اسماعیل سلفی مرحوم ومغفور سے متعلق بھی مضمون شامل تھا۔ اس مضمون میں عرض کیا گیا تھا کہ حضرت مولانا کے صاحب زادوں کے بارے میں تو میں کچھ معلومات رکھتا ہوں، لیکن ان کے صاحب زادوں کی اولاد کے سلسلے میں مجھے کچھ پتا نہیں ہے۔ اس پر ڈاکٹر صاحب موصوف نے مجھے چند باتیں لکھ بھیجی تھیں۔ اس میں بھی انھوں نے ''غالباً'' ہی تحریر فرمایا ہے۔ تاہم یہ مکتوب مولانا کی اولاد کی اولادوں کے بارے میں کافی معلومات پر مشتمل ہے۔ اس لیے اس کا کچھ حصہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں۔

مکرمی ومحترمی بھٹی صاحب!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

امید کہ مزاج بخیر ہوں گے۔ شکر گزار ہوں، آپ نے میرے عریضے کو جواب کے قابل سمجھا۔ ''نقوش عظمت رفتہ'' میرے زیر مطالعہ ہے۔ میں نے محترم مولانا محمد اسماعیل سلفی رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں مضمون ختم ہی کیا تھا کہ آپ کا خط ملا جس کی رسید میں

بذریعہ ٹیلی فون دے چکا ہوں۔ اس مضمون میں ماشاء اللہ آپ نے حق شاگردی ادا فرما دیا ہے۔

اپنے استاد محترم پر بہت عمدہ مضمون لکھا ہے۔

آپ نے ان کی اولادوں کی اولاد کے بارے میں اپنی معلومات کے نامکمل ہونے کا ذکر کیا ہے۔ آپ کی یہ بات بالکل صحیح ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ہم قریب ترین خونی رشتے دار ہیں، لیکن ایک دوسرے کے بارے میں بہت کم جانتے ہیں، کیونکہ باہمی رشتے اور قرابت داریاں اب روز بروز دوریاں اختیار کرتی جا رہی ہیں۔

بہر حال میں کچھ عرض کرتا ہوں۔ ان کے بڑے صاحب زادے پروفیسر محمد صاحب کی دو بیٹیاں اور ایک بیٹا ہے۔ ماشاء اللہ بڑی لائق اولاد ہے۔ بیٹا حافظ قرآن اور آنکھوں کا ماہر سرجن ہے۔ آج کل کسی عرب ریاست میں اقامت گزیں ہے۔ نام ڈاکٹر شعیب ہے۔ بہت اچھے اوصاف کا آدمی ہے۔ بڑی بیٹی طیبہ بھی ڈاکٹر ہے۔ انگلینڈ میں شادی ہوئی تھی، وہیں آباد ہیں۔ تیسری بیٹی عفیفہ بھی ایم اے کرنے کے بعد غالباً نیویارک میں اپنے میاں کے ساتھ آباد ہے۔

مولانا کے دوسرے بیٹے حکیم محمود صاحب کثیر الاولاد تھے۔ غالباً ان کے پانچ بیٹے اور پانچ بیٹیاں ہیں۔ دو بیٹے حکیم۔ ایک بیٹا ڈاکٹر۔ ایک سکول چلاتا ہے۔ غالباً ایک بیٹا زیر تعلیم ہے جب کہ اسعد کا اپنا اسٹیشنری کا کاروبار اردو بازار گوجرانوالہ میں ہے۔ ساتھ ہی وہ جامع بیت المکرم ماڈل ٹاؤن گوجرانوالہ میں خطابت کے فرائض سرانجام دیتے ہیں۔ سب بیٹیاں اپنے گھروں میں آباد ہیں۔

تیسرے داؤد صاحب تھے، ان کی زندگی پریشانیوں میں گزری۔ ٹی بی اور شوگر نے ان کو ایسا گھیرا کہ قبر میں جا اتارا۔ ان کی ٹانگ بھی شوگر کی وجہ سے مردہ ہوگئی تھی، جسے کاٹنا پڑا۔ لیکن پھر بھی وہ جاں بر نہ ہو سکے۔ ان کی نیک اطوار اور صالحہ بیوی نے جو رشتے میں ہماری سگی پھوپھی زاد ہیں، ایک بیٹے اور غالباً چار بیٹیوں کو باپ کی کمی محسوس نہیں ہونے دی

اور سچی بات تو یہ ہے کہ مرحوم حکیم محمود صاحب اور بھائی محمد صاحب نے ان کا پورا ساتھ دیا، نہ صرف ان کے قرضے ادا ہوئے بلکہ دکانیں مستقل گزارے کے لیے دیں۔ بچوں کی تعلیم اور شادیاں سب اچھی طرح کیں۔ بیٹا ان کا ایک ہی ہے۔ سلمان داؤد۔ طبیہ کالج میں مرحوم حکیم صاحب کے اثر ورسوخ کی وجہ سے مصروف تعلیم ہے۔

داؤد صاحب تو آپ کے بہت قریب رہے، ہمارے بھی دوستوں کی طرح تھے۔ تنگ دست لیکن خوش مزاج، حاضر دماغ اور یار باش آدمی تھے۔ ان کے جس جس سے مراسم تھے، مرتے دم تک کم نہیں کیے۔ کاش وہ آپ کی اس تصنیف کے وقت زندہ ہوتے تو وہ مولانا سلفی کی ذاتی زندگی کے بارے میں معلومات کے خزانے آپ پر نچھاور کرتے۔

مولانا مرحوم کا ایک قول بہت خوب ہے جو داؤد صاحب مرحوم نے بیان کیا کہ جو مولوی تہجد نہیں پڑھتا، وہ دین سے مخلص نہیں، کیونکہ پانچ نمازیں تو اس کا روزگار ہے۔

سادہ لباس اور سادہ خوراک مولانا سلفی کا شعار رہا۔ شام کو بعد از نماز مغرب وہ اکثر اپنے ساتھیوں، غلام محمد ڈار صاحب، اے جی صاحب (عبدالغنی صاحب) اور عبداللہ صاحب اہل حدیث کے ساتھ حکیم محمود کے مطب میں بیٹھا کرتے تھے۔

۱۹۶۳ء کے رمضان کے روزے مجھے ان کے گھر ان کے ساتھ رکھنے کا اتفاق ہوا۔ میں نے دیکھا کہ ان کی خوراک محض ایک پھلکا اور ایک کپ چائے تھی۔ ان کو دیکھ کر میں نے بھی بسیار خوری ایسی چھوڑی کہ اس دن سے آج تک جتنے بھی رمضان گزرے ہیں، ان میں ہمیشہ ایک چپاتی، ایک گلاس پانی اور ایک کپ چائے بس۔ اللہ اللہ خیر سلا۔

مجھے یہ بھی شرف حاصل ہے کہ مولانا مرحوم نے میرا نام فاروق رکھا تھا، جب کہ دادا جی نے محمد یوسف تجویز فرمایا تھا۔ ابا جی کے لیے چونکہ دونوں بزرگوں کا کہنا حکم کا درجہ رکھتا تھا، انھوں نے دونوں نام یک جا کر کے میرا موجودہ نام رکھ دیا' جس کا فائدہ مجھے سکول کی آٹھویں جماعت میں اس طرح پہنچا کہ ہماری کلاس میں پانچ لڑکے یوسف نام کے تھے۔ لہٰذا ان کی علیحدہ علیحدہ شناخت کے لیے حکم ہوا کہ اپنے ناموں کے ساتھ تخلص لگا لو۔ جب کہ میرے ساتھ تخلص تو نہیں، نام ہی علیحدہ تشخص کے لیے موجود تھا۔

مولانا سلفی مرحوم کے جنازے کا حال بھی مختصر کچھ اس طرح ہے کہ ہم اہل خانہ نے غسل سے پہلے ہی چہرہ دیکھ لیا۔ بعد میں ہمارے ہاتھ کچھ نہ آیا۔ ایک دنیا اُمڈ آئی تھی۔ بڑے بڑے مشہور و معروف لوگ جمع تھے۔ میں نے شیخ محمد اشرف صاحب اور شورش کاشمیری کو دیکھا کہ بچوں کی طرح رو رہے تھے۔ بعدہ ایک جلسہ لاہور کے وائی ایم سی اے ہال میں بسلسلہ تعزیت منعقد ہوا تو شورش مرحوم نے پاس بیٹھے ہوئے بزرگ شیخ محمد اشرف صاحب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ اس بزرگ کو میں نے اپنے اکلوتے بیٹے سلیم کی حادثاتی موت پر صبر و رضا کا پیکر بنے دیکھا، لیکن مولانا اسماعیل کی وفات پر ان کے صبر کے بندھن ٹوٹ گئے تھے۔

جنازے کی کھاٹ کے ساتھ لمبے لمبے بانس باندھ دیے گئے تھے اور شہر کی سب سے وسیع جگہ میونسپل سٹیڈیم میں جنازہ حافظ محمد یوسف گکھڑوی صاحب نے اس درد و کرب کے ساتھ پڑھایا کہ کہ زمانہ چیخیں مارتا تھا۔ اتنے وسیع میدان میں مجھے سیڑھیوں پر اونچی جگہ کھڑے ہونے کو ملی۔ کوئی جگہ بھی خالی نہ تھی۔ ایسے بڑے بڑے جنازے کبھی کبھار ہی ہوتے ہیں۔ جنازے میں ایک عجیب واقع پیش آیا کہ کچھ لوگ ایک اور جنازہ اٹھائے ہوئے جنازگاہ میں پہنچے اور استدعا کی کہ اس میت کا جنازہ بھی ساتھ ہی پڑھا دیجیے۔ اتنی دعائیں اور دردِدل سے التجائیں کسی کے نصیب میں ہوں گی۔

محمد یوسف فاروق

ایم۔بی۔بی۔ایس (پنجاب)

ماڈل کالونی۔وزیرآباد

ڈاکٹر صاحب کا یہ مکتوب گرامی ۱۶ مارچ ۱۹۹۷ء یعنی آج سے چھے سال قبل کا تحریر فرمودہ ہے۔ اس وقت جو بچے تعلیم حاصل کر رہے تھے، اب وہ تعلیم مکمل کر کے ماشاء اللہ کاروباری زندگی میں داخل ہو چکے ہوں گے۔

پھر حضرت مولانا محمد اسماعیل رحمتہ اللہ علیہ کے صاحب زادوں کی اولادوں کے بارے میں جو کچھ انھوں نے تحریر فرمایا ہے اس میں چار مقامات پر لفظ ''غالباً'' کا سہارا لیا

ہے۔اس کی اصل وجہ یہ ہے جو انھوں نے خود ہی لکھی ہے کہ "باہمی رشتے اور قرابت داریاں روز بروز دوریاں اختیار کرتی جارہی ہیں۔"

یہ بات بالکل صحیح ہے۔ابتدا میں ہر شخص کے رشتے دار اور قرابت دار دودھیال اور ننھیال ہوتے ہیں۔ پھر جب وہ خود صاحب اولاد ہوجاتا ہے تو اس کی رشتے داری ان لوگوں کی طرف منتقل ہوجاتی ہے، جہاں وہ بچوں کی شادیاں کرتا ہے۔ پھر اگر یہ شادیاں پہلے رشتے داروں میں کی جائیں تو ان سے تھوڑی بہت قرابت قائم رہتی ہے اور اگر دوسرے لوگوں میں کی جائیں (جیسا کہ عام طور سے بعض وجوہ کی بنا پر کی جاتی ہیں) تو رشتے داریاں ادھر منتقل ہوجاتی ہیں۔ پھر اسی طرح آگے سلسلہ چلتا ہے، جسے پنجابی محاورے میں "اگا دوڑ پچھا چوڑ" کہا جاتا ہے۔یعنی آگے کو دوڑو، پچھلی بات ختم کرو۔

خود میرا یہی حال ہے، میں اپنے بعض بہت قریبی اور خونی رشتے داروں کے بارے میں بالکل نہیں جانتا کہ انھوں نے اپنے بچوں کی شادیاں کہاں کی ہیں اور کس قسم کے لوگوں میں کی ہیں۔اور کس کی اولاد کتنے بچے بچیوں پر مشتمل ہے اور ان کے کیا مشاغل ہیں۔

❀❀❀

حافظ محمد شاکر

(وفات یکم اگست ۱۹۹۰)

حضرت حافظ عبداللہ بڈھیمالوی کا بیسویں صدی کے برصغیر کی دینی علوم کی تدریسی تاریخ کا بہت بڑا نام ہے۔ وہ ۷ مئی ۱۹۸۷ء کو اس دنیائے فانی سے رخصت ہوئے' لیکن اپنے پیچھے بے شمار شاگردوں کی لمبی لمبی قطاریں چھوڑ گئے جو اپنی قابلیت کے مطابق مختلف مقامات میں خدمات سرانجام دے رہے ہیں اور اپنے استاذ گرامی کی تدریسی روایات کو قائم رکھے ہوئے ہیں۔ اس اعتبار سے کہنا چاہیے کہ حافظ صاحب مرنے کے باوجود نہ صرف زندہ ہیں' بلکہ زندہ وتابندہ ہیں۔ اس لیے کہ ان کا مشن جاری ہے اور آئندہ ادوار میں ان کے شاگردوں کے شاگردوں کی تگ وتاز مدرسانہ کی وجہ سے جاری رہے گا اور یہ سلسلہ ایک خاص رفتار کے ساتھ ہمیشہ آگے بڑھتا جائے گا۔ ان شاء اللہ۔

ان کے شاگردان کی معنوی اولاد کہلائیں گے' لیکن اگر واقعات وحقائق کی روشنی میں دیکھا جائے تو شاگرد کے نزدیک استاد کا درجہ ماں باپ سے بھی بڑھ کر ہونا چاہیے' اس لیے کہ ماں باپ بچے کو آسمان سے زمین تک لانے کا باعث بنتے ہیں' جب کہ استاد اسے زمین سے آسمان تک پہنچانے کا ذریعہ ثابت ہوتا ہے' یعنی وہ اسے پستی سے بلندی تک پہنچاتا ہے اور ہر پہلو سے اس کی تربیت کرتا ہے۔ علمی بھی' ذہنی بھی' فکری بھی اور نظری بھی۔!

شاگرد کی صلاحیت کو پیش نظر رکھتے ہوئے' کسی کو استاذ تدریس کی راہ پر لگاتا ہے' کسی کو تصنیف وتالیف کی وادی میں لے جاتا ہے' کسی کو تقریر وخطابت کے گر سکھاتا ہے' کسی کو سیاست کے میدان میں جانے کی تلقین کرتا ہے' کسی کو انجینئر اور کسی کو سائنس دان بناتا ہے۔ اس کے پاس ہر شاگرد کی استعداد کو جانچنے کا پیمانہ موجود ہے' جس کی مدد سے وہ شاگرد کی رہنمائی کرتا ہے۔

ہم کہنا یہ چاہتے ہیں کہ حضرت حافظ عبداللہ بڈھیمالوی اپنے عہد کے نامور مدرس تھے- ان کے بارے میں اس فقیر کی تحریر کردہ چند باتیں اس کتاب میں مستقل عنوان کے تحت درج ہیں جو قارئین ذی تکریم کے زیر مطالعہ ہے- اس میں یہ بھی بتایا جا چکا ہے کہ حافظ صاحب کی اولادِ نرینہ تین بیٹے تھے' سب سے بڑے حافظ محمد شاکر' ان سے چھوٹے پروفیسر احمد ساقی اور سب سے چھوٹے قاری محمود الحسن-! حافظ محمد' لائق اکرام والد کی وفات سے کچھ عرصہ بعد سفر آخرت پر روانہ ہو گئے تھے اور باقی دو کے لیے ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ انھیں عمر دراز سے نوازے' وہ اپنی اپنی جگہ سرگرم عمل رہیں- اس فقیر کو جہاں ان سے ملنے کا موقع ملتا ہے' نہایت خندہ پیشانی سے ملتے اور بے حد انکسار سے پیش آتے ہیں--- آئندہ سطور میں حافظ محمد سے متعلق چند باتیں قارئین باتمکین کے علم میں لانا مقصود ہے- تو آیئے پہلے ان کی شکل وشباہت اور حلیے کے ذریعے ان سے متعارف ہونے کی سعی کرتے ہیں-

چھ فٹ قد' کشادہ پیشانی' چوڑی چھاتی' موٹی گردن' لمبی ناک' روشن آنکھیں' تیکھے ابرو' باریک ہونٹ' سفید دانت' گورا رنگ' سنت کے مطابق کانوں کی لو تک سر کے بال' قدرتی طور پر ہلکی مگر پوری داڑھی' مسکراتا ہوا چہرہ- مردانہ حسن کا خوب صورت نمونہ' کڑیل جوان-! میٹھا اندازِ گفتگو اور دلکش لہجہ-!! سادہ مگر صاف ستھرا لباس اور چال ڈھال میں وقار-!!!

حافظ محمد شاکر کے حلیے اور جسمانی ساخت سے مطلع ہونے کے بعد اب آیئے ان کے حصول علم اور ابتدائی حالات کی طرف-!

وہ ۲۵ جولائی ۱۹۵۳ء کو پیدا ہوئے- اس وقت ان کے والد مکرم حضرت حافظ عبداللہ بڈھیمالوی جامعہ محمدیہ اوکاڑہ میں شیخ الحدیث کے منصب عالی پر فائز تھے اور جامعہ محمدیہ کی دوسری منزل میں ان کی رہائش تھی' حافظ محمد کی ولادت وہیں ہوئی-

کچھ بڑے ہوئے تو وہاں کے پرائمری سکول میں داخل کرا دیے گئے اور ساتھ ہی جامعہ محمدیہ کے قاری صاحب سے ناظرہ قرآن مجید پڑھنا شروع کیا- تیسری جماعت تک پہنچے تھے کہ حافظ عبداللہ شیخ الحدیث کی حیثیت سے جامعہ سلفیہ (فیصل آباد) تشریف لے

گئے۔ حافظ محمد اوکاڑہ میں ناظرہ قرآن مجید ختم کر چکے تھے' اب انھیں جامعہ سلفیہ کے قریب گورنمنٹ سکول نشاط آباد میں چوتھی جماعت میں داخل کرا دیا گیا اور ساتھ ہی جامعہ سلفیہ کے قاری سے قرآن مجید حفظ کرنے لگے۔ قرآن کا کچھ حصہ حفظ کرنے اور سکول میں پرائمری پاس کرنے کے بعد جامعہ سلفیہ میں درس نظامی کے مطابق حصول علم کا آغاز کیا۔

درس نظامی کی تعلیم میں ان کے برادر صغیر احمد ساقی بھی ان کے ہم جماعت تھے جو آج کل پروفیسر احمد ساقی کے طور پر معروف ہیں ان کے ایک اور ہم جماعت مولانا عبدالرشید اظہر تھے جو مدینہ یونیورسٹی کے فارغ التحصیل ہیں اور ایک مدت سے جامعہ سلفیہ (اسلام آباد) میں خدمت تدریس انجام دینے پر مامور ہیں۔ اللہ نے ان کو علم کی نعمت سے بھی نوازا ہے اور تحقیق و کاوش کا ذوق بھی عطا فرمایا ہے۔

جامعہ سلفیہ اور دیگر مدارس میں حافظ محمد شاکر نے جن اساتذہ سے استفادہ کیا' وہ مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱) حضرت حافظ محمد گوندلوی (۲) خود ان کے والد مکرم مولانا حافظ عبداللہ بڈھیمالوی (۳) مولانا شریف اللہ خان سواتی (۴) مولانا محمد صادق خلیل (۵) پیر محمد یعقوب قریشی (۶) مولانا عبداللہ امجد چھتوی (۷) مولانا عبدالکریم ملتانی (۸) مولانا عبدالسلام ملتانی (۹) حافظ بنیامین (۱۰) مولانا عبدالرحمٰن ملتانی (۱۱) مولانا ثناء اللہ ہوشیارپوری (۱۲) مولانا علی محمد۔

ان حضرات سے حافظ محمد نے قرآن مجید کا ترجمہ پڑھا' مشکوٰۃ شریف' ترمذی شریف اور درس نظامی کی بعض دوسری کتابیں پڑھیں' جن میں حدیث' عربی ادب' صرف و نحو اور منطق وغیرہ کی نصابی کتابیں شامل ہیں۔

جامعہ سلفیہ سے صوفی عبداللہ مرحوم کی دعوت پر حافظ عبداللہ صاحب جامعہ تعلیم الاسلام (ماموں کانجن) تشریف لے گئے تو ان کے یہ صاحب زادے حافظ محمد بھی وہیں چلے گئے۔ وہاں قریب کے ایک گاؤں جنڈاں والی کے حافظ ثناء اللہ صاحب بطور مدرس

خدمت انجام دیتے تھے‘ حافظ محمد نے ان سے شروع سے لے کر آخر تک پورا قرآن مجید حفظ کیا اور بعض دوسرے اساتذہ سے درس نظامی کی کتابیں پڑھیں- وہاں سے جامعہ سلفیہ آ کر کچھ کتابوں کی تکمیل کی- صحیح بخاری اپنے والد مکرم سے پڑھی-

۱۹۷۲ء میں جامعہ سلفیہ سے فارغ ہوئے اور اپنے والد گرامی کے فرمان کے مطابق ۱۹۷۳ء میں حضرت حافظ محمد گوندلوی کی خدمت میں گوجرانوالہ جا کر دوبارہ صحیح بخاری پڑھی- اس اثنا میں حافظ عبداللہ صاحب جامعہ سلفیہ (فیصل آباد) سے تاندلیانوالہ منتقل ہو گئے تھے‘ حافظ محمد شاکر بھی فارغ ہو کر گوجرانوالہ سے تاندلیانوالہ آئے-

تاندلیانوالہ میں اپنے والد محترم کے ساتھ انھوں نے بھی تدریس کا سلسلہ شروع کر دیا- درسیات کی انتہائی کتابیں حافظ عبداللہ صاحب پڑھاتے تھے اور چھوٹے درجے کے طلبا کو حافظ محمد تعلیم دیتے تھے- یہاں انھوں نے بڑا اعزاز پایا- وہ نئے نئے تدریس کے میدان میں آئے تھے‘ ان کے پڑھانے کے انداز سے جہاں طلبا متاثر ہوئے‘ وہاں ان کی مجلسی گفتگو‘ میل جول اور وعظ و تقریر سے عام لوگ یوں سمجھیے کہ ان کے گرویدہ ہو گئے-

۱۹۷۷ء تک چار سال وہ تاندلیانوالہ رہے- بعد ازاں اس کے قریبی گاؤں چک نمبر ۴۰۵ گ ب کمیانہ شریف والا کے ایک بزرگ حاجی عبدالحق نمبردار کے اصرار پر وہاں جا ڈیرے ڈالے- وہاں انھوں نے اپنے والد محترم کے مشورے سے درالحدیث و حفظ القرآن رحمانیہ کی بنیاد رکھی- حافظ عبداللہ صاحب اس دارالحدیث کے سرپرست‘ حافظ محمد شاکر اس کے صدر اور حاجی عبدالحق کمیانہ نمبردار اس کے ناظم مقرر ہوئے- فیصلہ کیا گیا کہ اب وہ تا زندگی اسی گاؤں میں رہیں گے اور یہیں درس و تدریس اور خطابت و امامت کی خدمت انجام دیں گے- مروجہ نصابی کتابوں کی تدریس کے علاوہ بچوں کو قرآن مجید ناظرہ بھی پڑھائیں گے اور حفظ کرنے کے شائقین کو حفظ بھی کرائیں گے-

یہاں حافظ عبداللہ صاحب طلبا کو حدیث کی انتہائی کتابیں صحیح مسلم اور صحیح بخاری پڑھاتے تھے اور حافظ محمد دوسری کتابوں کا درس دیتے تھے- اسی طرح دیگر علوم متداولہ کی انتہائی کتابیں حافظ عبداللہ نے خود پڑھانے کا فیصلہ کیا اور ابتدائی اور ثانوی درجے

کی تدریس حافظ محمد شاکر کے سپرد کی- یہاں بہت لوگوں نے ان دونوں حضرات سے استفادہ کیا- پاکستان کے علاوہ الجزائر اور افغانستان کے طلبا بھی اس گاؤں میں آئے اور مستفید ہوئے-

حافظ محمد بہت سی خوبیوں کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے تھے- وہ جہاں بہت اچھے مدرس تھے' وہاں بہت اچھے خطیب بھی تھے- انھوں نے خطابت کا آغاز گوجرانوالہ سے آ کر ایک گاؤں سے کیا تھا' جو تاندلیانوالہ کے قریب تھا- دو سال وہ وہاں خطبہ جمعہ ارشاد فرماتے رہے- نہایت مدلل تقریر کرتے تھے اور کثیر تعداد میں لوگ ان کے خطبات جمعہ میں شامل ہوتے تھے- ان کا انداز بیان بے حد موثر تھا' آواز بارگاہ خداوندی سے کچھ اس قسم کی لے کر آئے تھے کہ جو ایک دفعہ سنتا' بار بار سننے کی کوشش کرتا-

پھر وہ اوکاڑے کی جماعت اہل حدیث کے اصرار پر وہاں کی جامع مسجد قدس میں خطبہ جمعہ دینے لگے تھے- جمعے کے روز اپنے مسکن چک نمبر ۴۰۵ گ ب کمیانہ سے آتے اور جمعہ پڑھا کر واپس چلے جاتے تھے- مجھے بھی ایک دفعہ اوکاڑہ میں ان کی اقتدا میں جمعہ پڑھنے اور ان کا خطبہ سننے کا موقع ملا تھا' بہت اچھی تقریر کرتے تھے- بے حد سلجھاؤ کے ساتھ صاف اسلوب میں اظہار مدعا فرماتے تھے- اوکاڑہ میں میں نے دیکھا کہ مجمع دور تک پھیلا ہوا تھا- جمعے کے بعد ان سے ملا تو انتہائی خوش ہوئے اور دیر تک بات چیت کا سلسلہ جاری رہا- اوکاڑہ میں انھوں نے پورے بارہ سال خدمت خطابت انجام دی- وہاں کی مسجد کی مجلس انتظامیہ کے ارکان اور عام لوگ ان سے بہت خوش تھے-

مولانا محمد صدیق فیصل آباد کی جامع مسجد اہل حدیث (واقع امین پور بازار) کے منصب خطابت پر فائز تھے- ان کی خطابت و تقریر کا بڑا شہرہ تھا- انھوں نے ۱۲ ستمبر ۱۹۸۹ کو وفات پائی- ان کی وفات کے بعد مسجد کی انتظامیہ نے خطابت کے لیے حافظ محمد شاکر سے رابطہ پیدا کیا اور یہ ذمہ داری سنبھالنے کے لیے بڑا اصرار کیا- معقول مشاہرے کی پیش کش کی- لیکن انھوں نے معذرت کر دی اور فرمایا میں اسی صورت میں آپ کی بات پر غور کر سکتا ہوں' جب کہ اوکاڑہ کی مسجد قدس کی مجلس منتظمہ مجھے وہاں جانے کی اجازت دے دے' ان

کی اجازت کے بغیر میرا وہاں جانا ممکن نہیں --- (آج کل ہمارے دیرینہ دوست مولانا محمد یوسف انور فیصل آباد کی اس مسجد میں خطبہ جمعہ ارشاد فرماتے ہیں-)

اپنی زندگی کے آخری دور میں حافظ محمد نے اوکاڑہ میں مسجد قاضی محمد رمضان میں بھی غالباً چند جمعے پڑھائے تھے-

تقریر میں نہ وہ کسی کی مخالفت کرتے تھے اور نہ کسی کو نشانۂ طعن بناتے تھے' مثبت انداز میں کتاب وسنت کے حوالوں سے بات کرتے تھے جو لوگوں کے دلوں میں اترتی تھی اور وہ نہایت شوق اور دلجمعی سے سنتے اور اثر پذیر ہوتے تھے-

ضلع پاک پتن میں ایک شہر عارف والا ہے جو اس ضلعے کی ایک تحصیل ہے- ایک مرتبہ عارف والا کے لوگوں کی دعوت پر حافظ محمد وہاں تقریر کرنے گئے اور تقریر کی- وہاں احناف کے بریلوی مکتب فکر کے ایک عالم سکونت پذیر تھے جو اہل حدیث کے شدید مخالف تھے- انھوں نے کہیں بیٹھ کر حافظ صاحب کی تقریر سنی- تقریر ختم ہوئی تو حافظ صاحب کے پاس آئے اور آتے ہی ان کا ماتھا چوم کر کہا' آپ نے لاجواب تقریر کی ہے- میں نے بہت مقرروں کی بہت تقریریں سنی ہیں' آج تک اتنی مدلل اور اثر سے بھرپور تقریر نہیں سنی-

حافظ صاحب مختلف مقامات میں درس قرآن دیتے اور تقریریں کیا کرتے تھے' یہ ان کا معمول تھا اور تبلیغ دین کا حصہ-! ہر مہینے جمعرات کے دن نماز مغرب کے بعد ان کا درس قرآن جامع مسجد اہل حدیث امین پور بازار (فیصل آباد) میں ہوتا تھا جو ان کا ماہانہ سلسلہ درس تھا' جس میں بے شمار لوگ شامل ہوتے اور نہایت انہماک اور شوق سے ان کا درس قرآن سنتے تھے- درس قرآن کا یہ سلسلہ مسجد کی مجلس انتظامیہ کے کہنے پر جاری کیا گیا تھا-

وہ پرہیزگار اور صاحب تقوی عالم تھے- ایک مرتبہ تاندلیانوالہ کے قریب ایک گاؤں "جھوک خیالی" میں تقریر کے لیے گئے- تقریر سے فارغ ہوئے تو وہاں کے نمبردار نے درخواست کی کہ بارش کے لیے دعا کی جائے- حافظ صاحب نے فرمایا میں دعا کرتا ہوں' تم اللہ کی راہ میں صدقہ خیرات کرو- یہ نماز عشا کے بعد کا وقت تھا- حافظ صاحب نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے تو اللہ تعالیٰ نے اسی رات موسلا دھار بارش برسا دی- وہاں کے لوگوں کا

کہنا ہے کہ یہ بارش صرف اسی گاؤں میں ہوئی تھی۔

حافظ محمد کی شادی ۱۹۷۴ء کو اکیس برس کی عمر میں ان کی پھوپھی کی بیٹی سے ہوئی تھی جو حضرت مولانا محمد یعقوب ملہوی مرحوم و مغفور کی صاحب زادی اور حافظ محمد امین (شیخ الحدیث دار العلوم تقویۃ الاسلام اوڈاں والا) کی بڑی بہن ہیں۔

اب حافظ صاحب کی خرابیٔ صحت کے متعلق سنیے۔۔۔! وہ عمر کے بتیسویں سال میں تھے کہ انھیں بواسیر کا عارضہ لاحق ہوا۔ علاج کے لیے کافی عرصہ ہسپتال میں رہے۔ آخر آپریشن کرایا گیا تو کچھ افاقہ ہوا۔

اس سے چند برس بعد دل کا حملہ ہوا' کافی مدت اس تکلیف میں مبتلا رہے۔ تکلیف بہت زیادہ ہوگئی تو ڈاکٹر محمد راشد رندھاوا اور مولانا معین الدین لکھوی کے صاحب زادے ڈاکٹر زعیم الدین عابد کے مشورے سے دل کا آپریشن کرانا پڑا۔ یہ نہایت نازک اور بہت بڑا آپریشن تھا جو میو ہسپتال (لاہور) میں ہوا۔ ہسپتال میں ان کے فرماں بردار اور عقیدت مند شاگرد حافظ محمود ان کے پاس رہے' انھوں نے ان کی بڑی خدمت کی۔ ان کا بیان ہے کہ حافظ محمد شاکر کے لیے یہ انتہائی تکلیف کا زمانہ تھا' لیکن انھوں نے ہر موقعے پر اللہ کا شکر ادا کیا اور ہر تکلیف پر صبر و ضبط سے کام لیا۔

ان کی بے حد تکلیف کے وقت بہ درجہ غایت صبر کا ایک واقعہ تو انتہائی حیرت انگیز ہے۔ آپریشن سے پہلے ڈاکٹروں کی غفلت یا غلطی سے انھیں اچھی طرح بے ہوش نہیں کیا جا سکا تھا۔ اسی حالت میں آپریشن ہوا۔ لیکن انھوں نے آپریشن کے دوران' تکلیف کا اظہار نہیں کیا۔ جب آپریشن ہوگیا تو انھوں نے سرجن سے شکایت کی کہ انھیں مناسب طریقے سے بے ہوش نہیں کیا گیا' جس کی وجہ سے انھیں سخت پریشانی ہوئی۔ لیکن ڈاکٹروں نے ان کی بات ماننے سے انکار کر دیا۔ اب حافظ صاحب نے جب ڈاکٹروں کو ان کی وہ باتیں بتائیں جو وہ آپریشن کے دوران آپس میں کرتے رہے تھے تو وہ ان کے اس بے انتہا صبر و ضبط کے مظاہرے پر نہایت حیران ہوئے۔ اس پر سرجن نے اپنے عملے کو ڈانٹا اور حافظ صاحب سے معذرت کی۔ حافظ صاحب نے انھیں معاف کر دیا۔

وہ تقریباً دو مہینے میو ہسپتال میں رہے اور اس اثنا میں بے شمار لوگ ان کی عیادت کے لیے ہسپتال گئے۔ وہ سب سے خوش اخلاقی سے پیش آتے اور ان کا شکریہ ادا کرتے۔ بیماری کے دنوں میں اکثر لوگ چڑچڑے سے ہو جاتے ہیں، لیکن حافظ صاحب کی خوش مزاجی کا یہ حال تھا کہ ہر شخص کا خندہ پیشانی سے استقبال کرتے اور اس سے خیر خیریت پوچھتے---

وہ اپنے نام کے ساتھ لفظ "شاکر" لکھتے تھے اور ہر دم اللہ کا شکر ادا کرتے تھے، جب کچھ افاقہ ہوا اور طبیعت بہتر ہوئی تو واپس اپنے گھر چک نمبر ۴۰۵ گ ب کمیانہ شریف والا چلے گئے۔ یہاں چند روز کے بعد حالت اتنی بہتر ہوگئی کہ اوکاڑہ میں جمعہ پڑھانے اور خطبہ دینے کے لیے جانا شروع کر دیا۔ لیکن ڈاکٹروں نے کہا تھا کہ ان کے سینے کی Veins (جنھیں عربی میں ورید کہا جاتا ہے اور اردو میں ہم اسے رگ یا نس کہتے ہیں) بند ہوگئی ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ انھیں شدید کھانسی آنے لگی اور بواسیر کا حملہ دوبارہ ہو گیا۔

اب انھیں پھر میو ہسپتال (لاہور) میں داخل کرا دیا گیا۔ ڈیڑھ مہینے کے قریب وہ میو ہسپتال میں رہے۔ ایک دن اچانک پکار اٹھے کہ مجھے جلدی گھر لے چلو۔ ان کے پھوپھی زاد بھائی اور برادر نسبتی ڈاکٹر حافظ مسعود عالم بھی (جو اس وقت الائیڈ ہسپتال فیصل آباد میں متعین ہیں) وہاں موجود تھے، انھوں نے کہا کہ اس حالت میں گھر جانا مناسب نہیں، لیکن وہ نہیں مانے اور گھر جانے پر سخت اصرار کرنے لگے۔ چنانچہ وہاں سے چل پڑے۔ رات اوکاڑہ میں اپنی خالہ کے پاس محلہ دارالسلام میں بسر کی۔ دوسرے دن صبح کے وقت اپنے گھر کمیانہ پہنچے۔ سب سے پہلے مدرسے گئے۔ طلبا کو پڑھتے دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ پھر گھر آئے اور آتے ہی والدہ کی خدمت میں حاضری دی اور ان کی خیر و عافیت پوچھی۔ پھر بچوں سے ملے۔

یہ دوپہر کا وقت تھا اور کہا میں نہانا چاہتا ہوں۔ تہبند باندھا اور چھوٹے بھائی قاری محمود الحسن سے کہا کہ میرے بدن پر پانی ڈالو۔ وہ نہلانے لگے۔ نہانے کے بعد کھڑے ہوئے۔ ابھی ایک قدم ہی چلے ہوں گے کہ روح ان کے جسم سے پرواز کر گئی۔ اب وہاں ان کا مردہ جسم پڑا تھا اور روح اعلیٰ علیین میں پہنچ گئی تھی۔ یہ حادثہ یکم اگست ۱۹۹۰ کو پیش آیا۔

اس وقت ان کی عمر شمسی حساب سے ۴۷ برس پانچ دن کی تھی۔

اس ناگہانی موت سے کہرام بپا ہو گیا اور مختلف مقامات میں تیزی سے اس کی اطلاع پہنچ گئی۔ یکے بعد دیگرے تین جنازے ہوئے۔ پہلا جنازہ حافظ محمد امین نے پڑھایا' جس میں ایک اندازے کے مطابق دس ہزار کے لگ بھگ لوگ شریک جنازہ تھے۔

دوسرا جنازہ حافظ محمد یحیٰ عزیز میر محمدی نے پڑھایا۔ کہا جاتا ہے کہ اس جنازے میں بھی اتنے ہی لوگ شامل تھے' جتنے پہلے میں تھے۔

تیسرا جنازہ مولانا عتیق اللہ سلفی نے پڑھایا' اس میں بھی بہت لوگ تھے۔

اس جوانِ رعنا اور متقی عالم دین کو ان کے والد گرامی حافظ عبداللہ بڈھیمالوی کے پہلو میں دفن کر دیا گیا۔

اللھم اغفرلھم وارحمھم وعافھم واعف عنھم

ان کی کئی حیثیتیں تھیں۔

ماں کے نہایت پیارے اور مثالی بیٹے تھے' خدمت گزار اور تابعدار۔

بھائیوں کے بے حد مشفق' انتہائی خیر خواہ اور بہ درجہ غایت ہم درد بھائی۔

بہنوں سے پرخلوص تعلق رکھنے والے بھائی۔

بیوی کے نہایت متحمل مزاج شوہر' اس کے حقوق کے نگاہ دار اور ہر اعتبار سے اس کی کفالت کے ذمہ دار۔

بچوں سے بے پناہ پیار کرنے والے' ان کی ضروریات کی تکمیل کرنے والے اور ان سے میٹھی میٹھی باتیں کرنے والے' ان کی تعلیم کے لیے کوشاں اور ان کے کھیل کود میں دلچسپی لینے والے باپ۔

بہت اچھے دوست' لائق استاد اور قابل قدر خطیب۔

حافظ محمد شاکر کی اولاد چھے بیٹوں اور ایک بیٹی پر مشتمل تھی۔ دو بیٹے اور بیٹی بچپن میں فوت ہو گئے تھے۔ اب ماشاء اللہ بہ ترتیب ذیل چار بیٹے موجود ہیں۔

سب سے بڑے بیٹے کا نام حافظ عبدالسلام خالد ہے۔ انھوں نے پنجاب یونیورسٹی

سے ایم اے (عربی) کرنے کے بعد حال ہی میں گورنمنٹ کالج آف ایجوکیشن لاہور سے بی ایڈ کیا ہے۔

ان سے چھوٹے قاری عبدالرحمٰن عابد ہیں' جو جامعہ سلفیہ (فیصل آباد) کے فارغ التحصیل ہیں اور اعزازی طور پر جامعہ سلفیہ کی امامت بھی ان کے سپرد رہی۔

ان سے چھوٹے حافظ عبدالحنان ساجد ہیں' جو تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔

سب سے چھوٹے عبدالمنان زاہد ہیں۔ یہ بھی حصول علم میں معروف ہیں۔

ماشاءاللہ چاروں بھائی قرآن مجید کے حافظ اور قاری ہیں اور نیک والدین کے نیک بیٹے ہیں۔ دعا ہے اللہ تعالیٰ ان کا مستقبل بہتر کرے اور یہ ماں کی آنکھوں کے لیے ٹھنڈک ثابت ہوں۔

❀❀❀

مولانا محمد عبداللہ سلیم

(وفات ۲۱ ستمبر ۱۹۹۴ء)

راجووال (ضلع اوکاڑہ) کے مولانا محمد یوسف کا شمار ہمارے پرانے اخلاص پیشہ دوستوں میں ہوتا ہے۔ اپنے عہد شباب میں وہ امور خیر میں نہایت مستعد اور اعمال صالحہ میں انتہائی تیز رو تھے۔ جذبات اب بھی وہی ہیں لیکن افسوس ہے، ضعف و پیری نے عزم و ہمت کی رفتار کو روک لیا ہے، بیماری نے دواعی ذہن کو بے حد متاثر کیا ہے۔ شدید و پیہم صدمات نے عمل و حرکت کے تقاضوں کو اس درجے مجروح کر دیا ہے کہ ہم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ مولانا کے چار بیٹے ہیں جن کے نام علی الترتیب یہ ہیں۔

(۱) عبداللہ سلیمؒ

(۲) حافظ عبدالرحمٰن

(۳) حافظ عبیداللہ احسن

(۴) عبیدالرحمٰن محسن

ان میں عبداللہ سلیم وفات پا گئے ہیں اور آج کی صحبت میں انہی کے بارے میں چند باتیں ضبط تحریر میں لانا مقصود ہے، اور میں یہ باتیں اپنے عزیز دوست مولانا محمد ابراہیم خلیل فیروز پوری (خطیب جامع مسجد اہل حدیث حجرہ شاہ مقیم) سے مستعار لے رہا ہوں۔ انھوں نے ایک کتاب ترتیب دی ہے جس کا عنوان ہے "مرحوم دوست عبداللہ سلیمؒ کی یاد میں"۔ میں یہاں اپنے اس عزیز دوست کے شکریے کے ساتھ کتاب کے بعض مندرجات اپنے الفاظ میں منتقل کر کے خوانندگان محترم کی خدمت میں پیش کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔

میانہ قد، چوڑا چہرہ، خندہ رو، گندمی رنگ، گھنی داڑھی، متحمل مزاج، خوش پوش، نفاست پسند۔ یہ تھے مولانا محمد یوسف کے بڑے بیٹے عبداللہ سلیمؒ جن کے نام کے ساتھ علوم مروجہ کی

تحصیل کی وجہ سے "مولانا" کا لفظ لگا دیا گیا تھا اور انھیں مولانا عبداللہ سلیم کہا جانے لگا تھا۔ وہ مولانا محمد یوسف کی پہلوٹھی کی اولاد تھے جو ۲۱ ستمبر ۱۹۵۲ء (یکم محرم ۱۳۷۲ھ) کو دوشنبہ کے دن راجووال میں پیدا ہوئے۔ اس وقت مولانا کو یہاں آئے اور دارالحدیث کمالیہ قائم کیے تھوڑا عرصہ ہوا تھا۔

قدرتی بات ہے بچے کی ولادت مولانا کے لیے بہت بڑی مسرت کا باعث تھی۔ مسنون حکم کے مطابق سات دن کے بعد بچے کا عقیقہ کیا گیا' جس میں دارالحدیث کے مدرسین وطلبا کے علاوہ بہت سے اعزہ واقارب اور علما وزعما کو دعوت شرکت دی گئی۔ جیسے جیسے بچہ بڑا ہوتا گیا اور اس کی زبان الفاظ وحروف کی ادائی کے قابل ہوتی گئی' مولانا اسے علم کی راہ پر چلانے لگے۔ سب سے پہلے وہ دعائیں زبانی یاد کرانا شروع کیں جن کا مختلف اوقات ومواقع پر پڑھنے کا نبی ﷺ نے حکم دیا ہے اور جنھیں شرعی اصطلاح میں "ادعیہ ماثورہ" قرار دیا گیا ہے۔ چار سال کی عمر میں بچے کو بہت سی دعائیں یاد کرا دی گئی تھیں۔

۱۹۵۶ء میں جب چار سال کی عمر ہوئی تو قرآن مجید پڑھانے کے لیے حافظ محمد سلیمان کی خدمات حاصل کی گئیں۔ اس کے ساتھ ہی اردو لکھانے پڑھانے کے لیے دارالحدیث کے بعض اساتذہ سے کہا گیا۔ چنانچہ انھوں نے نہایت خوش اسلوبی سے یہ فریضہ انجام دیا۔ ۱۹۶۰ء تک قرآن مجید بھی پڑھ لیا اور اردو لکھنے پڑھنے سے بھی دلچسپی پیدا ہوگئی۔ ۱۹۶۰ء میں بچے کو راجووال کے پرائمری سکول میں داخل کرا دیا گیا۔

پرائمری کی منزل سے نکلنے کے بعد ۱۹۶۵ء میں ڈی سی ہائی سکول حجرہ شاہ مقیم میں داخلہ لیا اور ۱۹۷۰ء میں اسی سکول سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ اس وقت وہ روزانہ راجووال سے بذریعہ بس حجرہ شاہ مقیم صبح جاتے اور شام کو واپس آتے تھے۔ کبھی وہیں مولانا محمد ابراہیم خلیل کے پاس رات کو ٹھہر جاتے۔ ابراہیم خلیل صاحب کا آبائی گاؤں بھی وہی ہے جو ضلع فیروز پور میں مولانا یوسف کا تھا۔ اس گاؤں کا نام "سومیاں اعوان" تھا۔ اس کی مناسب تفصیل اس مضمون میں بیان کی گئی ہے جو مولانا محمد یوسف پر لکھا گیا ہے۔ یہاں یہ یاد رہے کہ مولانا محمد ابراہیم خلیل نے درس نظامی کی مروجہ تعلیم راجووال میں حاصل کی ہے

اوران کا شمار مولانا محمد یوسف صاحب کے شاگردوں میں ہوتا ہے۔

عبداللہ سلیم نے سکول کی تعلیم کے ساتھ ساتھ رات کو دارالحدیث کمالیہ میں عربی اور فارسی کی تعلیم کے حصول کا سلسلہ بھی جاری رکھا' چنانچہ میٹرک کے بعد انھوں نے ۱۹۷۲ء میں لاہور بورڈ سے فاضل عربی کا امتحان پاس کرلیا۔ تمام امتحانوں میں بہتر پوزیشن حاصل کی۔ ان کا خط (ہینڈ رائٹنگ) بہت اچھا تھا۔ امتحانات میں زیادہ نمبر حاصل کرنے میں ان کی خوش نویسی خاص طور سے معاون ثابت ہوئی۔

درس نظامی کی اکثر کتابیں انھوں نے دارالحدیث راجووال کے اساتذہ اوراپنے والد مکرم سے پڑھیں۔ ۱۹۷۴ء میں جب فاضل عربی کا امتحان دیا' اس وقت وہ جامعہ سلفیہ (فیصل آباد) کے آخری درجے کے طالب علم تھے۔

راجووال کے دارالحدیث سے کتب متداولہ پڑھنے کے بعد وہ جامعہ رحمانیہ ماڈل ٹاؤن لاہور میں داخل ہوئے۔ وہاں حضرت حافظ ثناء اللہ مدنی سے استفادہ کیا' جن کے علمی اور تحقیقی فتوے ہم ہر ہفتے ''الاعتصام'' میں پڑھتے اوران سے مستفید ہوتے ہیں۔

لاہور کی علما اکیڈمی میں بھی انھوں نے تعلیم حاصل کی اوراکیڈمی کے استاذ مولانا حافظ عبدالسلام کیلانی کے سامنے زانوئے شاگردی تہ کیا۔ اس کے بعد پھر جامعہ سلفیہ (فیصل آباد) میں داخل ہوئے اوروہاں صحیحین کی تکمیل کی۔ جامعہ سلفیہ میں انھوں نے مندرجہ ذیل اساتذہ سے مندرجہ ذیل کتابیں پڑھیں۔

(۱) حدیث کی سنن نسائی اورعلم صرف کی فصول اکبری مولانا عبدالوہاب تتقی سے پڑھیں۔

(۲) فتح المجید' النحو الواضح' قرأة الرشیدہ مکمل اور مشکوۃ شریف کی قرأت مولانا عبدالرحمٰن دھرم کوٹی سے کی۔

(۳) مقامات حریری اورالعبرات کی تکمیل مولانا حافظ عبدالستار حسن سے کی۔

(۴) کافیہ مولانا حافظ محمد بنیامین سے پڑھا۔

(۵) قدوری اورمحیط الدائرہ کتابیں مولانا علی محمد سلفی سے پڑھیں۔

(۶) شرح ابن عقیل کی تکمیل حافظ محمد اسحاق کے حلقہ درس میں کی۔

(۷) شرح عقیدہ طحاویہ اور بدایۃ المجتہد شیخ مصطفیٰ عرب سے پڑھیں۔

(۸) مطول اور حجۃ اللہ البالغہ کے لیے شیخ محمد امان عرب کی خدمت میں حاضری دی۔

(۹) تفسیر بیضاوی اور صحیح بخاری کے لیے حضرت مولانا سلطان محمود کے حضور زانوئے تلمذ تہہ کیا۔

اس طرح ۱۹۷۴ء میں جامعہ سلفیہ کا نصاب مکمل کیا اور مولانا سلطان محمود سے سند فراغت حاصل کی۔ ان کی سند یعنی ''الشہادۃ العالیہ'' میں بزبان عربی مرقوم ہے کہ یہ راجووال میں محرم ۱۳۷۳ھ (۱۹۵۲ء) کو پیدا ہوئے اور جامعہ سلفیہ کے امتحان ۱۹۷۴ء؛ ۱۹۷۵ء میں بہتر پوزیشن حاصل کی۔ اجرائے سند کی تاریخ ۱۰ ربیع الاول ۱۴۰۱ھ ہے۔

جامعہ سلفیہ کے نصاب کی تکمیل اور حصول سند کے بعد وہ گورنمنٹ ایلمنٹری ٹیچر ٹریننگ کالج میں داخل ہوئے۔ وہاں ایک سال کی مدت میں انھوں نے مشرقی زبانوں میں سے عربی زبان کی تدریس کی تربیت حاصل کی اور اس کی سند سے بہرہ مند ہوئے۔ بعد ازاں ۲۱ نومبر ۱۹۷۵ء کو اوڈی سرکاری سکول میں معلم مقرر کر دیے گئے۔ یہ ان کی ملازمتی زندگی کا آغاز تھا جسے نئی زندگی سے تعبیر کرنا چاہیے۔ اب وہ سکول کی ثانوی اور اعلیٰ جماعتوں کو اردو فارسی اور عربی زبانوں کی تعلیم دیتے تھے۔

۱۹۸۵ء کو میں وفاق المدارس السلفیہ کا امتحان دیا اور اسی سال پنجاب یونیورسٹی سے بی۔ اے کا امتحان پاس کیا اور بی۔ ایڈ بھی کر لیا۔

۱۹۸۲ء میں اسلام آباد اوپن یونیورسٹی سے عربی زبان کی تعلیم کا سلسلہ شروع ہوا تھا۔ عبداللہ سلیم اور محمد ابراہیم خلیل نے بھی اس میں حصہ لیا۔ لاہور میں اس کی ورکشاپ ہوئی۔ دونوں ساتھی بہت اچھے نمبروں میں پاس ہوئے۔

یہاں یہ یاد رہے کہ مولانا محمد یوسف نہیں چاہتے تھے کہ عبداللہ سلیم او۔ ٹی کریں اور پھر کسی سرکاری ہائی سکول میں معلم کی حیثیت سے خدمات سرانجام دیں۔ ان کی خواہش تھی کہ وہ ان کے قائم کردہ دارالحدیث میں طلبا کو دینی علوم پڑھائیں اور ساتھ ہی اس کے انتظام و انصرام کی ذمہ داری قبول کریں۔ اس سلسلے میں انھوں نے او۔ ٹی کی تربیت کے

زمانے میں بہاول پور سے لائق احترام والد کی خدمت میں ۲۴ مارچ ۱۹۷۵ء کو خط لکھا' جس میں اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کی۔

۱۹۸۲ء میں مولانا محمد یوسف نے مقامی جماعت کی میٹنگ بلائی اور کہا کہ میں اس دارالحدیث کے انتظامی معاملات سے علیحدگی اختیار کرنا چاہتا ہوں' لیکن لوگ مولانا کی علیحدگی پر رضا مند نہ ہوئے۔ کافی بحث وتمحیص کے بعد مولانا عبداللہ سلیم کو اس کا ناظم مقرر کیا گیا۔ وہ یہ اہم ذمہ داری قبول کرنے پر امادہ نہ تھے' لیکن لوگوں کے اصرار پر زمام نظامت ہاتھ میں لے لی اور اسے جدید خطوط پر چلانے کا فیصلہ کیا۔ اس میں فاضل عربی کلاس کا اجرا عمل میں لایا گیا' انگریزی اور ریاضی وغیرہ مضامین داخل نصاب کیے گئے اور وقت وحالات کے مطابق ان کی تعلیم کا آغاز کر دیا گیا۔ اس طرح اس درس گاہ کو انھوں نے قدیم وجدید علوم کی تعلیم کا مرکز بنانے کا عزم کیا اواس پر عمل ہونے لگا۔ بیٹے کی جاری کردہ بعض اصلاحات سے خالص سلفی العقیدہ باپ کو اختلاف بھی ہوا اور اس کا اظہار بھی کیا گیا' لیکن باہمی گفتگو سے معاملات حل ہوتے گئے اور رکاوٹیں دور ہوتی گئیں۔ ان کے ہر کام میں خلوص کا جذبہ کار فرما تھا اور ہر عمل میں طلبا کی بہتری مضمر تھی' اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان کا کام آسان فرما دیا اور آگے بڑھنے کے آثار نمایا ہونے لگے۔ ان کے دل پر خیر کی حکمرانی تھی اور ذہن صاف تھا۔ ابتداے عمر ہی میں ان کی صلاحیتیں اجاگر ہونے لگی تھیں۔ اور وہ ان صلاحیتوں کے مصرف سے خوب آگاہ تھے۔

اللہ تعالیٰ نے ان کو حج بیت اللہ کی توفیق بھی مرحمت فرمائی۔ پہلی دفعہ ۱۹۹۲ء میں عازم حرمین ہوئے اور عمرہ کیا۔ دوسری دفعہ ۱۹۹۳ء میں دیار پاک کا رخ کیا۔ رمضان المبارک کا مہینا مکہ معظمہ میں بسر کیا اور بیت اللہ شریف میں اعتکاف کا شرف حاصل کیا۔ چار مہینے وہاں رہے۔ حج کی سعادت سے بہرہ اندوز ہو کر واپس گھر آئے۔

عبادت گزار' اخلاق حسنہ کی دولت سے مالا مال' طلبا کے بہی خواہ اور علماے دین کے قدردان' بڑوں کے سامنے مؤدب اور چھوٹوں کے لیے سراپا شفقت۔

قلم وقرطاس سے بھی رابطہ تھا۔ جماعت کے مختلف رسائل وجرائد میں ان کے

مضامین و مقالات چھپتے رہتے تھے- ذہن رس پایا تھا- افکار کی دنیا وسیع تھی- شعر فہمی کا ملکہ بھی رکھتے تھے- تحریر و کلام میں برمحل شعر لکھنے اور پڑھنے کے ذوق سے آگاہ تھے-

علمی اور مسلکی خدمت کے لیے ہر آن بے تاب رہتے تھے اور چاہتے تھے کہ یہ روشنی گھر گھر پہنچے اور لوگوں کے ذہن و قلب اس سے مستنیر ہوں' چنانچہ مختلف دینی موضوعات کے متعلق بعض اہل علم کے رسائل "مجموعۃ الرسائل" کے نام سے دارالحدیث راجووال کی طرف سے شائع کیے' جو بہت مقبول ہوئے-

عبداللہ سلیم بارگاہ الٰہی سے زیادہ عمر لے کر نہیں آئے تھے- وہ کم عرصہ جیے اور بہت زیادہ یادیں چھوڑ گئے- ان کے والد گرامی مولانا محمد یوسف کی کولے کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی- وہ صاحب فراش تھے' نیک بخت بیٹا باپ کے علاج معالجے اور ان کی خدمت میں معروف رہتا تھا- اس کے علاوہ دارالحدیث کمالیہ کی نظامت و نگرانی کی ذمہ داری بھی ان کے سپرد تھی- سکول میں معلمی کا فریضہ بھی انجام دیتے تھے- اس طرح کئی قسم کے بوجھ ان کے سر پر تھے-

۱۹۹۳ء کے ۲۱ ستمبر کی تاریخ تھی اور منگل کا دن تھا- ٹھیک صبح کے ساڑھے آٹھ بجے تھے- ناگہاں عبداللہ سلیم پر دل کا حملہ ہوا اور وہ اسی لمحے اللہ کو پیارے ہو گئے- انا للہ وانا الیہ راجعون-

بے بس بوڑھا باپ چارپائی پر پڑا ہے اور سامنے جوان اور عالم و ذہین بیٹے کی لاش پڑی ہے- لحہ بھر میں روشنی تاریکی میں بدل گئی' دنیا اندھیر ہو گئی اور ذہنی و فکری معاملات یکسر منقلب ہو گئے- گھر میں کہرام بپا ہو گیا' ارد گرد اور دور دراز کے علاقوں میں جیسے جیسے اطلاع پہنچتی گئی' لوگ راجووال کا رخ کرتے گئے- دیکھتے ہی دیکھتے ہزاروں کی تعداد میں لوگ جمع ہو گئے- ایک بجے کے قریب میت کو غسل دے کر چارپائی پر رکھا گیا اور دارالعلوم میں لایا گیا- چہرہ دیکھنے والوں کا بہت بڑا ہجوم تھا- مولانا معین الدین لکھوی نے نماز جنازہ پڑھائی-

بہت لوگ اس کے بعد بھی آئے' جن میں مرنے والے کے استاد محترم مولانا حافظ

ثناء اللہ مدنی بھی تھے۔ تھوڑی دیر میں پھر کثیر تعداد میں لوگ جمع ہو گئے۔ اب حضرت حافظ ثناء اللہ مدنی صاحب نے اپنے لائق شاگرد کا جنازہ پڑھایا۔ رات کو سات بجے اس جوان رعنا اور باعمل عالم کو سپرد خاک کر دیا گیا۔

اللھم اغفرلہ و ارحمہ و عافہ و اعف عنہ

اب دو خواب ملاحظہ ہوں جو عبداللہ سلیم کی وفات سے قبل مولانا محمد یوسف نے دیکھے۔

پہلا خواب انھوں نے یہ دیکھا کہ ان کے استاذ مکرم مولانا عطاء اللہ لکھویؒ کے صاحب زادہ گرامی قدر حافظ عزیز الرحمان لکھوی (مرحوم) تشریف لائے ہیں۔ اس وقت وہ وضو کر رہے تھے۔ حافظ صاحب کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور فرمایا اب میں لکھویوں کو نہیں چھوڑوں گا۔ اتنے میں حافظ صاحب نے ان کے قریب ہو کر بائیں پہلو میں پاؤں سے اس قدر زور سے ٹھوکر لگائی کہ وہ شدت درد سے چلا اٹھے اور مضروب حصے کو پکڑ کر کافی دیر بیٹھے کراہتے رہے۔

اس شدید درد کی تعبیر ان کے نزدیک ان کے بیٹے عبداللہ سلیم کی وفات تھی، جو اس خواب سے کچھ عرصہ بعد ظہور میں آئی۔

دوسرا خواب مولانا محمد یوسف نے اس وقت دیکھا جب وہ لاہور میں زیر علاج تھے۔ انھوں نے رات کو خواب میں دیکھا کہ ان کا ایک دانت جو بالکل ٹھیک حالت میں تھا، ٹوٹ گیا ہے۔ اس کی تعبیر انھوں نے یہ کی کہ ان کا کوئی جوان بیٹا یا بیٹی اچانک وفات پا جائیں گے۔ چنانچہ خواب سے چند روز بعد عبداللہ سلیم وفات پا گئے۔

آخر میں ایک اور خواب سنیے جو مولوی احمد حسن لقمان (چک نمبر ۱۰/ ون ایل، تحصیل رینالہ خورد، ضلع اوکاڑہ) نے مولانا عبداللہ سلیم کی وفات کے بعد دیکھا۔ وہ خواب یہ ہے کہ مولانا عبداللہ سلیم اپنے دارالحدیث کے دفتر میں بیٹھے ہیں۔ ان کے والد گرامی مولانا یوسف اور بھائی بھی وہاں موجود ہیں۔ ایک اجنبی شخص آیا اور اس نے عبداللہ سلیمؒ کو پرندوں کا بھنا ہوا گوشت پیش کیا۔ مولانا عبداللہ سلیمؒ نے ایک کونے میں بیٹھ کر اسے کھانا شروع کر دیا۔

کسی کو کھانے میں شرکت کی دعوت نہ دی۔

مولانا محمد یوسف نے یہ خواب سنا تو بے ساختہ ان کی زبان سے قرآن مجید کے یہ الفاظ نکلے۔

وَلَحْمِ طَيْرٍ مِّمَّا يَشْتَهُونَ

(یہ سورہ واقعہ کی اکیسویں آیت ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جنتی لوگ پرندوں کا' جس قسم کا گوشت جی چاہے گا' کھائیں گے۔)

مولانا محمد یوسف نے اس خواب کو عبداللہ سلیم کے لیے جنت کی بشارت سے تعبیر کیا اور یہی تعبیر صحیح معلوم ہوتی ہے۔ رحمہ اللہ تعالیٰ

مرحوم عبداللہ سلیم کے پسماندگان میں سے پانچ لڑکیاں اور ایک لڑکا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ مرحوم کے بیٹے کو ان کا صحیح جانشین بنائے۔

جامعہ سلفیہ میں مرحوم نے ۱۹۷۴ء اور ۱۹۷۵ء میں تعلیم حاصل کی۔ اس وقت ان کے شرکائے درس مندرجہ ذیل حضرات تھے۔

۱۔ مولانا محمد منیر قمر' ترجمان ام القوین حال کویت۔

۲۔ مولانا محمد اشرف جاوید مدیر مکتبہ جامعہ سلفیہ فیصل آباد۔

۳۔ مولانا حافظ بنیامین' خطیب فیصل آباد۔

۴۔ مولانا عبداللہ سعید چھتوی۔

۵۔ مولانا عطاء اللہ حنیف' خطیب کوٹ رادھا کشن ضلع قصور۔

۶۔ ڈاکٹر عبدالقادر حمید اللہ پروفیسر پنجاب یونیورسٹی۔

حافظ محمد لکھوی

(وفات ۱۶ فروری ۱۹۹۵ء)

۱۴ فروری ۱۹۹۵ء کو منگل کے دن مولانا معین الدین لکھوی لاہور میں تھے۔ یہیں سے چار بجے کے قریب ان کا ٹیلی فون آیا کہ حافظ محمد سخت بیمار ہیں اور ہم ان کی بیماری کی وجہ سے بہت پریشان ہیں۔ حالت بڑی خراب ہے۔ کوئی چیز ہضم نہیں ہوتی اور کسی قسم کا علاج کارگر ثابت نہیں ہو رہا۔ فرمایا دعا کرو' بس دعا کی ضرورت ہے۔ علاج معالجے کا معاملہ بظاہر ختم ہو چکا ہے۔

یہ الفاظ انھوں نے نہایت تشویش ناک لہجے میں کہے اور بات بھی انتہائی تشویش کی تھی۔ میرے لیے یہ نئی اطلاع تھی۔ مجھے بالکل علم نہیں تھا کہ حافظ محمد بیمار ہیں یا انھیں کوئی تکلیف ہے۔ ہم عاجز بندے بارگاہِ خداوندی میں دعا ہی کر سکتے تھے اور وہ ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں کرتے رہے۔

اس سے تیسرے دن جمعرات کے روز ۱۶ فروری ۱۹۹۵ء (۱۵ رمضان المبارک ۱۴۱۵ھ) کو رات کے دس بجے ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ یہ بھی مولانا معین الدین کا ٹیلی فون تھا۔ انھوں نے حزن و ملال میں ڈوبی ہوئی آواز میں بتایا کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے حافظ محمد وفات پا گئے ہیں۔ یہ اندوہناک خبر سنتے ہی زبان سے بے ساختہ انا للہ وانا الیہ راجعون کے الفاظ نکلے اور ذہن معاً پیچھے کو زقند لگا کر نصف صدی سے بھی طویل مسافت طے کر گیا۔ یہ وہی مسافت تھی جو کیلنڈر کی رفتار میں لیل ونہار کی بے شمار گردشوں نے آہستہ آہستہ طے کی تھی' اب ذہن کی لامرئی تیز رفتاری نے ایک ہی لمحے میں طے کر ڈالی۔ چند الفاظ میں اس کا خلاصہ یہ ہے:

۱۹۳۳ء سے ۱۹۳۶ء کے آخر تک (چار سال) حضرت مولانا عطاء اللہ حنیف

بھوجیانی ہمارے سابق وطن (کوٹ کپورہ ریاست فرید کوٹ) میں قیام فرما رہے۔ لیکن ان کا ذہن اور عملی تعلق برصغیر کی اس سیاسی جماعت سے تھا' جس سے کسی نوع کی وابستگی ریاستی نظام حکمرانی کی رو سے ممنوع تھی۔ متحدہ ہندوستان میں چھوٹی بڑی پانچ سو اکیاون ریاستیں تھیں' جن میں والیانِ ریاست اس انداز کی سیاسی سرگرمیاں ہرگز برداشت نہ کرتے تھے' جن سے ریاستوں کی خودمختاری پر ذرہ بھی زد پڑھنے کا اندیشہ ہوتا۔ ریاست فرید کوٹ کے حکمران بھی اسی ذہن وفکر کے مالک تھے۔ چنانچہ مولانا عطاء اللہ حنیفؒ کا وہاں مزید اقامت اختیار کیے رکھنا ممکن نہ رہا۔

حضرت مولانا محمد علی لکھوی بڑے کھلے ڈُلے کے عالم دین تھے۔ انھیں اس صورت حال کا پتا چلا تو وہ مولانا عطاء اللہ حنیفؒ کو اپنے ہاں (مرکز الاسلام) لے گئے۔ جو طالب علم ان کے ساتھ مرکز الاسلام آئے' ان میں یہ فقیر بھی شامل تھا۔ مرکز الاسلام کیا تھا؟ اس وقت اس سوال کا جواب دینا ہمارے آج کے موضوع کا حصہ نہیں' تاہم اس ضمن میں یہاں اتنی بات بتا دینا ضروری ہے کہ یہ ضلع وتحصیل فیروز پور میں ''لکھوکے'' سے تقریباً دو میل کے فاصلے پر جھوک ٹہل سنگھ کے ریلوے اسٹیشن کے قریب واقع تھا' جس کی تفصیل اسی کتاب میں مولانا محی الدین لکھوی سے متعلق مضمون میں بیان کی گئی ہے۔ علاوہ ازیں میں اپنی کتاب ''بزم ارجمنداں'' کے ان مضامین میں بتا چکا ہوں جو مولانا محمد علی لکھوی اور معین الدین لکھوی کے بارے میں تحریر کیے گئے ہیں۔

یکم جنوری ۱۹۳۷ء کو مرحوم مولانا محمد عطاء اللہ حنیفؒ کے ساتھ ہم مرکز الاسلام پہنچے۔ شمسی حساب کے مطابق یہ آج سے ۶۵ برس قبل کی بات ہے۔ مولانا مرحوم ومغفور سمیت یہ قافلہ پانچ افراد پر مشتمل تھا اور وہ افراد تھے محمد رفیق' محمد جمیل' نور محمد اور ان سطور کا راقم۔!

محمد جمیل بٹھنڈے کا رہنے والا تھا اور اس کا تعلق وہاں کے مشہور مزار حاجی رتن کے متولیوں سے تھا' اس اعتبار سے وہ مسلکی لحاظ سے بریلوی تھا۔ مرکز الاسلام کے جنگل کو دیکھ کر یوں تو ہم سبھی گھبرا گئے تھے' مگر جمیل پر کچھ زیادہ ہی گھبراہٹ طاری ہوئی۔ چنانچہ عیدالاضحیٰ کی چھٹیوں میں وہ اپنے وطن گیا اور پھر واپس نہیں آیا۔ اس سے دس سال بعد

اگست ۱۹۴۷ء کے ہنگامے میں عین عالم جوانی میں اس کا انتقال ہو گیا۔

نور محمد سرسہ (ضلع حصار) کا باشندہ تھا۔ ذہین اور علم کا شائق لڑکا تھا' لیکن ٹی بی کے موذی مرض کی گرفت میں آ گیا تھا۔ مرض نے شدت پکڑی تو گھر چلا گیا۔ پھر چند روز بعد اس کی موت کی اطلاع آ گئی۔

میں نے اور رفیق نے سال پورا کیا۔ دینی مدارس کا سال پندرہ شوال سے شروع ہوتا اور پندرہ شعبان کو ختم ہو جاتا ہے۔

خوانندگان محترم کو تفصیل میں لے جانا مقصود نہیں۔ تمہیدی سفر جلدی سے طے کر کے اصل موضوع کی طرف آنا چاہتا ہوں۔

یہ مولانا محی الدین لکھوی کے بھرپور شباب کا زمانہ اور مولانا معین الدین کی اٹھتی جوانی کا دور تھا۔ دونوں بھائی خوب صورت اور خوش مزاج تھے۔ اس جنگل میں یہ نہایت سلیقے اور قرینے کی زندگی بسر کرتے تھے۔ کہتے ہیں "جنگل میں مور ناچا' کس نے دیکھا" مگر یہ مور سب کی نظر میں تھے اور انہیں سب دیکھتے تھے۔

اسی دور میں مرکز الاسلام کی زرخیز مٹی میں محی الدین اور معین الدین سے ہماری دوستی کا بیج بویا گیا جو وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتا اور پھیلتا گیا۔ بے شک بسا اوقات جلدی ملاقات کے مواقع میسر نہیں آتے اور بارہا ایسا بھی ہوا کہ عدم ملاقات کا وقفہ غیر معمولی طوالت اختیار کر گیا' مگر طرفین کے دل برابر دھڑکتے رہے۔ دوستی اور محبت کا پیمانہ ملاقات یا رابطے کا جلدی یا دیر سے ہونا نہیں ہے' بلکہ اس کا تعلق دل سے ہے' اگر دو دل قریب ہیں اور دونوں میں دھڑکن کا عمل جاری ہے تو دوستی قائم اور محبت کا سلسلہ استوار ہے' اور اگر کسی وجہ سے دلوں کی مسافت میں بعد پیدا ہو گیا ہے اور یادوں کا سفر سمٹ گیا ہے تو سمجھ لیجیے کہ دوستی کی ڈور ڈھیلی پڑ گئی ہے اور محبت کا رشتہ اختتام کو پہنچ گیا ہے۔

اس زمانے میں ان دونوں بھائیوں کے نام کے ساتھ حسن اور حسین کا لاحقہ بھی سننے میں آیا تھا' یعنی محی الدین حسن اور معین الدین حسین۔

۱۹۳۷ء ہی میں حافظ محمد کی ولادت ہوئی۔ یہ مولانا محی الدین کی اولین اولاد تھے۔

جون کا مہینا تھا اور ولادت کے ساتویں دن عقیقہ کیا گیا تھا اور وہ جمعے کا دن تھا۔ دو گائیں ذبح کی گئی تھیں (یا ممکن ہے ایک ہو) مرکز الاسلام میں جمعے کے روز قرب و جوار کے دیہات سے جمعہ پڑھنے کافی لوگ آتے تھے اور اچھا خاصا مجمع ہو جاتا تھا۔ عقیقے کے موقعے پر بھی جمعے کی وجہ سے بہت سے لوگ موجود تھے۔ خاص طور سے بھی متعدد افراد کو دعوت شرکت دی گئی تھی۔ حضرت مولانا محمد علی لکھوی نے جمعہ پڑھایا تھا اور تقریر کرتے ہوئے جو الفاظ ارشاد فرمائے تھے ان کا مفہوم یہ تھا کہ لڑکے کا نام انھوں نے اپنے لائق صد احترام دادا کے نام پر محمد رکھا ہے۔ وہ تو واقعتاً حافظ قرآن تھے، لیکن لفظ "حافظ" اس بچے کے نام کا جز ہے۔ ممکن ہے اسے بھی حفظ قرآن کی نعمت حاصل ہو جائے۔ مولانا نے تقریر میں اپنے آباو اجداد کے بعض واقعات بھی بیان فرمائے تھے۔ ایک واقعہ یہ بیان فرمایا تھا کہ مرزا غلام احمد قادیانی کے دعوائے نبوت کے بعد ان پر کفر کا پہلا فتویٰ اہل حدیث علما نے لگایا تھا۔ ان علمائے کرام میں میرے والد مولانا محی الدین عبدالرحمٰن بھی شامل تھے۔ انھوں نے مختلف اوقات میں مرزا صاحب کی شدید مخالفت کی تھی۔ اتفاق کی بات یہ کہ فتوائے کفر جاری کرنے کے بعد ان کے دو یا تین بیٹے فوت ہو گئے تھے۔ صرف بیٹیاں رہ گئی تھیں۔ مرزا صاحب نے اس صورت حال کے پیش نظر یہ پیش گوئی کی تھی کہ محی الدین عبدالرحمٰن لکھوی میری مخالفت کر رہا ہے، یہ اولادِ نرینہ سے محروم رہے گا اور پھر بددعا کی تھی کہ اس کے کوئی بیٹا نہ ہو۔ مولانا نے اس موقعے پر مسکراتے ہوئے فرمایا تھا کہ مرزا صاحب کی بددعا کے بعد میری ولادت ہوئی۔ اس طرح میں مرزا غلام احمد قادیانی کی بددعا کا نتیجہ ہوں۔

حافظ محمد کا سلسلہ نسب یہ ہے۔ حافظ محمد بن محی الدین بن محمد علی بن محی الدین عبدالرحمٰن بن حافظ محمد بن حافظ بارک اللہ بن حافظ احمد بن حافظ محمد امین۔!

حافظ محمد سے لے کر اکتیسویں پشت میں ان کا سلسلہ نسب امام محمد بن حنفیہ کی وساطت سے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ تک پہنچتا ہے۔ خاندانی اعتبار سے یہ علوی ہیں اور اپنے اپنے عہد میں اس سلسلے کے تمام بزرگ قبلہ گاہ تشنگانِ فیض رہے ہیں۔ مخلوق خدا کی اصلاح اور علمی و روحانی نفع رسانی ان کا بنیادی فریضہ تھا جسے یہ کامل اخلاص اور پوری تندہی سے

انجام دیتے رہے۔

حافظ محمد خاندان لکھویہ کے گل سر سبد مولانا محمد علی لکھوی کے پوتے' مولانا محی الدین لکھوی کے بیٹے اور جماعت اہل حدیث کے رہنما مولانا معین الدین لکھوی کے بھتیجے تھے۔ والدہ کی طرف سے استاذِ پنجاب حضرت مولانا عطاء اللہ لکھوی کے نواسے اور مولانا عبدالرحمٰن' مولانا حبیب الرحمٰن' حافظ شفیق الرحمٰن اور حافظ عزیز الرحمٰن لکھوی کے بھانجے تھے۔ ان چار بھائیوں میں سے حبیب الرحمٰن لکھوی نے ۲۰ مئی ۱۹۷۳ کو وفات پائی' حافظ عزیز الرحمٰن کا انتقال آٹھ نو برس پہلے ہوا اور مولانا عبدالرحمٰن لکھوی ۴ مارچ ۲۰۰۱ کو فوت ہوئے۔

حافظ محمدؒ نے اپنی آبائی درس گاہ جامعہ محمدیہ کے اساتذہ سے تعلیم حاصل کی۔ حصول علم کے بعد خود مسند تدریس پر متمکن ہوئے' لائق استاذ تھے۔ محنت اور لگن سے خدمت تدریس انجام دیتے تھے۔ اللہ نے ان کو بہت سی خوبیوں سے نوازا تھا۔ جسمانی اعتبار سے بھی اور ذہنی اعتبار سے بھی۔!

اکہرا بدن' کھلتا ہوا قد' سرخی مائل گندمی رنگ' نیک اطوار' خوش خصال' خوش لباس' خوش اخلاق' ملنسار' خوبرو' نرم طبع' ہنس مکھ اور مہمان نواز۔۔۔ عمل و کردار میں اپنے اسلاف اور خاندان کی درخشاں روایات سے آگاہ و باخبر۔۔۔!

ان سطور کے راقم کو جب بھی اوکاڑے جانے کا اتفاق ہوا اور حافظ محمدؒ سے ملاقات ہوئی' وہ نہایت خندہ پیشانی سے ملے۔ ان کے خانوادۂ عالی مرتبت کے جن بزرگانِ کرام سے میرے مراسم رہے ہیں' اس کا انھیں علم تھا۔ اپنے والد مکرم اور عم محترم سے میرے دوستانہ علائق سے بھی وہ خوب آگاہ تھے۔ راقم کے ساتھ بات چیت اور برتاؤ میں انھوں نے ہمیشہ اس نزاکت کو ملحوظ خاطر رکھا اور ہر موقعے پر احترام سے پیش آئے۔ نفسانفسی کے اس دور میں یہ بہت بڑی بات ہے۔ اسے ان کی خاندانی شرافت اور ذاتی نیکی سے تعبیر کرنا چاہیے۔

اپنے بڑوں کے ساتھ تعلق رکھنے والوں سے تکریم سے پیش آنا' اسلامی ثقافت اور

دینی تہذیب کا بنیادی عنصر ہے، جس سے حافظ محمد آگاہ بھی تھے اور اس پر عامل بھی---!

حافظ محمد صاف ستھری بات کرتے اور ادبی ذوق رکھتے تھے' اقبالیات سے انھیں بالخصوص دلچسپی تھی۔ اقبال کے بہت سے اشعار ان کے حافظے میں محفوظ تھے۔

انھوں نے ساڑھے ستاون سال عمر پائی۔ ان کی وفات ان کے والد مکرم مولانا محی الدین لکھوی اور اعزہ و اقارب کے لیے بہت بڑا الیہ تھا۔ باپ کی زندگی میں لائق اور پڑھے لکھے بیٹے کا موت کی آغوش میں چلے جانا اور پھر باپ کا اپنے ہاتھوں اس کو لحد میں اتارنا انتہائی حزن و ملال کا باعث تھا۔

حافظ محمدؒ کے بارے میں آئندہ لکھنے والے مرحوم کا لفظ لکھیں گے اور یہ لفظ بالکل صحیح ہوگا' لیکن سچی بات یہ ہے کہ نہ زبان یہ لفظ بولنے کے لیے تیار ہے' نہ قلم اسے لکھنے پر رضا مند ہے اور نہ ذہن قبول کرنے پر آمادہ ہے۔ مسلسل یہی بات ذہن میں گردش کر رہی ہے کہ حافظ محمد ہمارے سامنے پیدا ہوا اور ہمارے سامنے پلا بڑھا' ہمارے نزدیک وہ کل کا بچہ تھا۔ ابھی اس کے مرنے کی عمر کہاں تھی۔ مگر یہ محض واہمہ اور خام خیالی ہے' حقیقت یہ ہے کہ وقعت الواقعہ۔ یہ حادثہ رونما ہو چکا' فرشتہ اجل نے حکم خداوندی کی تعمیل کر دی اور موت اپنا کھیل ختم کر چکی اور لوگوں نے اس پر منوں مٹی ڈال دی۔ اب وہ کبھی واپس نہیں آئے گا۔ وہ ہمیشہ کے لیے ہم سے روپوش ہو چکا ہے اور ایسی جگہ چلا گیا ہے جہاں سے کبھی کوئی واپس نہیں آیا۔ ان محمدا قدمات۔ اب ہمیں دعا کرنی چاہیے اللھم اغفرلہ وارحمہ و عافہ واعف عنہ۔

حضرت مولانا محمد علی لکھوی کے دادا حضرت حافظ محمد لکھویؒ نے ۱۳۱۱ھ میں وفات پائی تھی---مولانا کے پوتے حافظ محمد لکھوی نے اس سے ایک سو چار سال بعد ۱۴۱۵ھ میں داعی اجل کو لبیک کہا۔ رحمھم اللہ تعالی۔

حافظ محمد کی نرینہ اولاد تین بیٹے ہیں۔

۱۔ طیب: سب سے بڑے ہیں۔ ان کی دیپال پور میں آٹو پارٹس کی دکان ہے۔

۲۔ طاہر: ان سے چھوٹے ہیں۔ جامعہ محمدیہ (اوکاڑہ) کے دفتر کی نگرانی ان کے

سپرد ہے۔

۳۔ اظہر: سب سے چھوٹے ہیں' اپنی زمین کا انتظام وانصرام ان کے ذمے ہے۔
ان تینوں بھائیوں کی تعلیمی حالت کا علم نہیں ہو سکا۔

دعا ہے اللہ تعالیٰ ان کو اور ان کی آل اولاد کو ہمیشہ اپنے سایۂ عاطفت میں رکھے۔
آمین یارب العالمین

***

مولانا محی الدین لکھوی

(وفات ۲۷ فروری ۱۹۹۸ء)

یکم جنوری ۱۹۳۷ء کو میں حضرت الاستاذ مولانا محمد عطاء اللہ حنیف بھوجیانی کے ساتھ طالب علم کی حیثیت سے مرکز الاسلام گیا تو وہاں پہلی دفعہ مولانا محی الدین لکھوی کو دیکھا۔ پورا قد' سرخی مائل گورا رنگ' تیکھے نقوش' صاف ستھرے سفید لباس میں ملبوس' اس زمانے کے دیہاتی کلچر کے مطابق تہبند باندھے ہوئے۔ بائیس تیئیس سال کے خوب صورت و صحت مند کسرتی جسم کے نوجوان۔ نہایت محبت سے پیش آئے اور اس اسلوب میں میٹھی زبان سے مخاطب ہوئے جیسے مدت سے آشنائی ہو۔ صاحب زادوں اور بڑے لوگوں کی اولادوں میں جس طرح کی اکڑفوں عام طور سے پائی جاتی ہے' اس سے انھیں کوئی واسطہ نہ تھا۔ مرض غرور سے بالکل محفوظ۔ اسی تواضع' انکسار اور نرمی سے متصف' جو ان کے اکابر کا طرۂ امتیاز بیان کیا جاتا ہے۔ بے شک ان کے اکابر لوگوں کو نور بصیرت سے آشنا کرتے اور خلق خدا کو حسنات کے تحائف عطا فرماتے تھے۔ دعا ہے یہ سلسلہ آئندہ بھی جاری رہے۔

اس زمانے میں وہ ان معنوں میں ''مولانا'' نہیں تھے' جن معنوں میں یہ لفظ بولا جاتا ہے۔ لیکن چوں کہ وہ دودمان علما کے فرد تھے اور سات پشتوں سے درس و تدریس کے گھرانے اور اصحاب رشد و ہدایت سے تعلق تھا اور پھر اپنے والد گرامی قدر حضرت مولانا محمد علی لکھوی کی غیر موجودگی میں مرکز الاسلام میں جمعہ و جماعت کے فرائض کی انجام دہی ان کے ذمے تھی' اس لیے سب لوگ انھیں ''مولوی محی الدین'' کہتے تھے۔

بھری جوانی (جسے پنجاب کی زبان میں ''جوانی مستانی'' کہا جاتا ہے) کے دور میں بھی تہجد گزار اور قائم اللیل تھے۔ حالاں کہ یہ وہ زمانہ ہوتا ہے' جس کے بارے میں شاعر کہتا ہے:

دل آیا ہے تری اٹھتی جوانی ابھرے جوبن پر

اس زمانے میں بھی وہ نماز خشوع وخضوع سے پڑھتے تھے۔ حلم، خداترسی، رحم دلی، بڑوں کا احترام، چھوٹوں پر شفقت، احکام شریعت کی پابندی، قوت برداشت ان کے وہ اوصاف تھے جو انھیں اپنے عالی مرتبت اسلاف سے ورثے میں ملے تھے۔

در جوانی توبہ کردن شیوۂ پیغمبری

والد محترم کی طرح طبیعت مجاہدانہ پائی تھی، ورزش کرتے، دوڑ لگاتے، گھر کے کام کاج کرتے، کھیتی باڑی میں مزارعوں کے شریک کار ہوتے اور "مگدر" اٹھاتے تھے جو مرکز الاسلام میں خاص طور سے رکھا گیا تھا۔ اس وقت ان کے پاس بائیسکل تھا، اسے الٹا سیدھا چلانے اور تیز دوڑانے میں بڑے ماہر تھے۔

محی الدین اپریل ۱۹۱۴ء کو اپنے آبائی گاؤں لکھوکے میں پیدا ہوئے...... سلسلہ نسب جو مجھے معلوم ہے یہ ہے: محی الدین بن مولانا محمد علی بن مولانا محی الدین عبدالرحمٰن بن حافظ محمد بن حافظ بارک اللہ بن حافظ احمد بن حافظ محمد امین بن ابوداود (ڈھنگ شاہ) اس سلسلہ نسب میں آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ آٹھ نام آتے ہیں، جن میں چار کے ساتھ لفظ "حافظ" کا سابقہ ہے، یعنی یہ بزرگ قرآن مجید کے حافظ تھے۔ اور وہ تھے، حافظ محمد، حافظ بارک اللہ، حافظ احمد اور حافظ محمد امین...... لیکن میں نے کسی زمانے میں بعض حضرات سے سنا تھا کہ مولانا محمد علی اور ان کے والد مولانا محی الدین عبدالرحمٰن بھی قرآن کے حافظ تھے۔ اگر میری یہ شنید صحیح ہے تو ان آٹھ بزرگوں میں سے چھے حافظ قرآن ہوئے۔

لکھوکے میں اردو مڈل سکول قائم تھا، محی الدین نے اس سکول سے مڈل پاس کیا۔ پھر دو سال اپنے آبائی دینی مدرسے میں اپنے حقیقی ماموں حضرت مولانا عطاء اللہ لکھوی سے صرف ونحو کی کتابیں پڑھیں۔ بعد ازاں انگریزی کا ایک سال کا نصاب تین مہینے میں مکمل کر کے فیروز پور کے گورنمنٹ ہائی سکول میں داخلہ لیا اور میٹرک کا امتحان پاس کیا...... ددھیال اور ننھیال کی طرف سے تمام ماحول علمی تھا اور حصول علم کے مواقع میسر تھے۔ ذہن اخاذ تھا اور پڑھنے میں تیز تھے۔ اللہ نے توفیق دی اور آگے بڑھتے گئے۔

میٹرک کے بعد حدیث کی تعلیم شروع کی۔ ۱۹۳۷ء میں چند کتابیں مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی سے پڑھیں۔ بعدازاں حضرت مولانا عطاء اللہ صاحب لکھوی کے حلقہ درس حدیث میں شامل ہوئے۔ اپنے والد مکرم مولانا محمد علی لکھوی سے بھی مرکز الاسلام میں حدیث کا درس لیتے رہے...... اس طرح بلوغ المرام' مشکوۃ شریف' سنن نسائی' سنن ابی داؤد' ابن ماجہ اور جامع ترمذی وغیرہ کتابیں مکمل کر لیں۔ مرکز الاسلام میں سنن نسائی میں یہ فقیر ان کا شریک درس تھا۔

۱۹۴۰ء میں گوجرانوالا کا عزم کیا اور حضرت حافظ محمد گوندلوی سے صحیح بخاری اور صحیح مسلم پڑھنے لگے۔ میں بھی اس سال وہیں تھا اور بعض دوسری کتابوں کے علاوہ حضرت حافظ صاحب سے یہ کتابیں بھی پڑھتا تھا۔ ان دنوں مولوی محمد افضل بھی جو (بورے والا ضلع وہاڑی میں مقیم ہیں) وہاں تعلیم حاصل کرتے تھے اور ہم تینوں جو پہلے سے آپس میں بہت اچھے تعلقات رکھتے تھے' اب صحیحین میں ہم درس وہم جماعت تھے۔

لیکن محی الدین اب ۱۹۳۷ء کے محی الدین نہیں رہے تھے۔ اب وہ بالکل بدل گئے تھے' ذہن وفکر کی دنیا میں عظیم انقلاب آچکا تھا...... نیکی' تدین اور احکام شریعت کی سختی کے ساتھ پابندی کا جذبہ تو ان میں ابتدائے عمر ہی سے تھا' لیکن ۱۹۳۸ء کے بعد جب کہ حضرت مولانا محمد علی لکھوی دوسری یا تیسری بار مدینہ منورہ گئے ہیں' ان کی عملی زندگی یکسر منقلب ہوگئی تھی۔ اب وہ داڑھی منڈوانے والوں' سگریٹ نوشوں' حقہ پینے والوں کو نفرت کی نگاہ سے دیکھنے لگے تھے۔ بے نماز سے تو بات کرنا ان کے لیے مشکل ہو گیا تھا۔ پھر جس شخص کی آمدنی ان کے نزدیک ذرہ بھی مشکوک ہوتی' اس کے گھر کا کھانا پینا اپنے لیے ممنوع قرار دے لیا تھا۔ عام بات چیت میں انتہائی محتاط ہو گئے تھے۔ وعظ و تبلیغ اور امور خیر کی نشرو اشاعت کو اپنا مقصد حیات ٹھہرا لیا تھا۔ شہری زندگی پر دیہاتی زندگی کو ترجیح دیتے تھے اور دیہاتی زندگی کی نسبت جنگل کی سکونت ان کے لیے باعث سکینت تھی...... جب انھوں نے دیکھا کہ گوجرانوالا میں سگریٹ نوشی اور حقہ نوشی بھی عام ہے' داڑھی منڈوانے والے بھی شمار سے باہر ہیں' لوگوں کے ذرائع آمدنی مشکوک ہیں اور جدھر جاؤ اسی قسم کے لوگوں پر نظر

پڑتی ہے' جو ان کے نزدیک پسندیدہ نہیں- پھر جو لوگ مدرسے کی مالی مدد کرتے ہیں خود ان کی طرز حیات کے متعدد گوشے بظاہر شریعت سے متصادم نظر آتے ہیں تو انھوں نے گوجرانوالا میں رہ کر تعلیم حاصل کرنا مناسب نہ سمجھا- وہ رمضان المبارک کے بعد وہاں گئے تھے اور دو مہینے وہاں بڑی مشکل سے گزارے- عیدالاضحیٰ کی چھٹیوں پر مرکز الاسلام آئے' پھر واپس گوجرانوالا نہیں گئے-

یہاں یہ لطیفہ بھی سنتے جایے کہ عیدالاضحیٰ کی رخصتوں کے بعد جب دوبارہ تعلیم کا آغاز ہوا تو ایک روز حضرت استاذ حافظ محمد صاحب نے پوچھا کہ مولوی محی الدین نہیں آئے؟ انھیں بتایا گیا کہ ان کے لیے اس ماحول میں رہنا مشکل ہو گیا تھا اور اس کی وجہ بھی ان کی خدمت میں عرض کی گئی تو فرمایا یہ شیطانی اثر ہے' شیطان نے ان کے دل میں اس قسم کے وسوسے پیدا کر دیے ہیں تاکہ وہ اچھی طرح علم نہ حاصل کر سکیں-

دونوں بزرگوں میں سے کس کا نقطہ نظر صحیح تھا؟ حضرت حافظ صاحب کا یا مولانا محی الدین کا؟ اس کے متعلق ہم گنہگار کچھ نہیں کہہ سکتے- اس میں البتہ کوئی شک نہیں کہ شیطان انسان کو ورغلانے کے لیے بہت سے طریقے اختیار کرتا ہے اور مختلف افراد کے ذہنوں کو مختلف انداز کے وسوسوں سے بھر دیتا ہے-

مرکز الاسلام میں بھی جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا' میں نسائی شریف میں مولانا محی الدین کا ہم درس تھا' اب صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں بھی ان کا ہم جماعت تھا- حافظ محمد زکریا (جھوک دادو' ضلع فیصل آباد) محمد افضل (بورے والا) مولانا خالد گھرجاکھی اور دیگر متعدد طلبا ہمارے ساتھ تھے' جن کا ذکر ''نقوش عظمت رفتہ'' میں حضرت حافظ محمد گوندلوی کے حالات میں کیا جا چکا ہے- مولانا محی الدین' حضرت حافظ محمد صاحب کے سلسلۂ درس میں تو زیادہ عرصہ نہیں رہے البتہ اللہ تعالیٰ نے ان پر کرم فرمایا کہ علوم متداولہ کی تکمیل کی اور مولانا محی الدین لکھوی کے طور پر اللہ نے ان کو شہرت عطا فرمائی اور وہ اس کے دین کے مبلغ و داعی ہوئے-

اپنے لائق تکریم باپ کی طرح انھوں نے زندگی کے ہر قدم پر جفاکشی کا مظاہرہ

کیا اور جس کام کو ہاتھ ڈالا اس میں محنت اور تگ و دو کی- ہل چلایا، بھینسیں چرائیں، ان کا دودھ دھوہا، بیلوں کے ذریعے کنوئیں سے پانی نکال کر فصل سیراب کرتے رہے- ایک مرتبہ یہ منصوبہ بھی بنایا کہ دیہات سے دودھ اکٹھا کر کے فیروز پور چھاونی میں فوج کو فروخت کیا جائے، لیکن اس پر عمل نہیں کیا کہ اس سے تبلیغ دین میں روکاوٹ پیدا ہو گی اور ان کے اسلاف قال اللہ وقال الرسول کی جو صدائیں بلند کرتے رہے ہیں، اس کا سلسلہ بند ہو جائے گا-

اس زمانے میں ایک بزرگ مولانا عبداللہ اوڈ تھے جو بنگلہ فاضلکا میں فروکش تھے-[1] مرکز الاسلام میں ان کا آنا جانا تھا- مولانا محی الدین نے ان سے اپنے اس کاروبار کے منصوبے کا ذکر کیا تو انھوں نے بھی اس سے اختلاف کیا اور فرمایا: اس سے تبلیغ دین اور درس وتدریس کے بنیادی مقاصد کو نقصان پہنچے گا...... مولانا عبداللہ اوڈ کا نقطہ نظر بالکل صحیح اور ان کا مشورہ صائب تھا، بعد ازاں مولانا محی الدین نے مرکز الاسلام میں بچوں کی تعلیم وتربیت کو مقصد حیات قرار دے لیا تھا- مرکز الاسلام آکر ارد گرد کے دیہات کے بچے ان سے استفادہ کرتے تھے- کچھ ایسے طالب علم بھی تھے جو دور کے علاقوں سے تعلق رکھتے تھے اور مرکز الاسلام میں رہتے اور مولانا سے تعلیم حاصل کرتے تھے-

مرکز الاسلام میں جمعہ مولانا محی الدین پڑھاتے تھے- جمعے کے دن صبح ہی سے دیہات کے لوگ وہاں آنا شروع ہو جاتے تھے- جمعے تک اچھا خاصا مجمع ہو جاتا تھا...... بہت سے لوگ دوپہر کا کھانا وہیں کھاتے تھے- کھانا مولانا کے گھر سے آتا تھا اور مولانا مہمانوں کے لیے خود کھانا لاتے تھے- بعض دفعہ انھیں کھانا لانے کے لیے کئی کئی دفعہ گھر جانا پڑتا تھا- پہلے ایک مہمان آیا، پھر دوسرا آیا اور پھر تیسرا...... اس طرح وہ بار بار گھر جاتے اور کھانا لاتے- اس اعتبار سے یہ بڑا فراخ حوصلہ اور کھلے دل کا گھرانا تھا-

جیسا کہ پہلے بتایا گیا، مولانا محی الدین نے شہری زندگی پر ہمیشہ دیہاتی زندگی کو ترجیح

---

[1] میں اپنی تصنیف "کاروان سلف" میں ان کے حالات تفصیل سے بیان کر چکا ہوں-

دی- مرکز الاسلام کے جنگل کو انھوں نے تمام دیہات وقصبات اور بڑے بڑے بلاد و امصاد پر فائق تر گردانا- فیروز پور شہر میں وہ تھوڑا عرصہ ہی رہے اور یہ وہ زمانہ تھا جب وہ میٹرک کا امتحان دینے کے لیے گورنمنٹ ہائی سکول میں داخل ہوئے تھے- اس وقت ان کا قیام سکول کے ہوسٹل میں تھا- ان دنوں دیہات میں ہائی سکول نہیں ہوتے تھے- پرائمری سکول بھی ہر گاؤں میں نہیں تھے...... بڑی آبادی کے کسی گاؤں میں پرائمری سکول ہوتا تھا اور اس میں قرب وجوار کے دیہات سے آکر بچے تعلیم حاصل کرتے تھے-

اب مولانا کی زندگی کا ایک اور دور شروع ہوتا ہے، جسے ہم سیاسی دور کہہ سکتے ہیں- دوسری عالم گیر جنگ عظیم ۳ ستمبر ۱۹۳۹ء کو شروع ہوئی تھی- اس وقت برطانیہ کی کنزرویٹو پارٹی برسر اقتدار تھی، جس کے وزیر اعظم مسٹر چرچل تھے- وہ ہندوستان کو آزاد کرنے کے حامی نہ تھے- انھوں نے صاف لفظوں میں اعلان کیا تھا کہ انھیں اس لیے وزیر اعظم نہیں بنایا گیا کہ ہندوستان اور دیگر برطانوی مقبوضات کو آزاد کر کے اپنے ملک کو دیوالیہ بنادیں...... جولائی ۱۹۴۵ء میں جنگ ختم ہوئی تو ہندوستان کی مختلف سیاسی جماعتوں کے ان سیاسی لیڈروں اور ورکروں کو رہا کر دیا گیا تھا، جنھیں حکومت کی مخالفت کے جرم میں ہندوستان کی انگریزی حکومت نے گرفتار کر رکھا تھا...... برطانیہ میں انتخابات ہوئے تو جنگ جیتنے والے چرچل کی کنزرویٹو پارٹی انتخابات ہار چکی تھی اور اس کی جگہ لیبر پارٹی نے زمام حکومت ہاتھ میں لے لی تھی، جس کا وزیر اعظم مسٹر اٹیلی کو منتخب کیا گیا تھا-

اب برطانیہ کی نئی حکمران لیبر پارٹی نے ہندوستان کی سیاسی جماعتوں کے رہنماؤں سے آزادیِ ہند کے مسئلے پر گفتگو شروع کی- اس نازک مسئلے میں بہت سی پیچیدگیاں پیدا ہوئیں اور منزل تک پہنچنے کی راہ میں کئی خطرناک موڑ آئے- اس موقعے پر ان سیاسی بکھیڑوں کی تفصیل میں جانا مقصود نہیں- مختصر الفاظ میں صرف یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ بات چیت کے متعدد مرحلوں کے بعد آخر کار اٹیلی نے مارچ ۱۹۴۶ء میں ہندوستان کی آزادی کے سلسلے میں ملک کے سیاسی رہنماؤں سے فیصلہ کن بات چیت کے لیے برطانوی کابینہ کا ایک سہ رکنی وفد ہندوستان بھیجا جو اے وی الیگزینڈر، سر سٹیفورڈ کرپس اور لارڈ

پیتھک لارنس پر مشتمل تھا' اسے کیبنٹ مشن کہا جاتا تھا۔

سیاسی لیڈروں سے طویل گفت وشنید کے بعد حکومت ہند نے ملک میں عام انتخابات کے انعقاد کا اعلان کر دیا تھا...... ملک کے مختلف علاقوں سے بہت سے لوگوں نے ان انتخابات میں حصہ لینے کا فیصلہ کیا۔ ضلع فیروز پور میں مسلم لیگ کی طرف سے نواب افتخار حسین خاں آف ممدوٹ امیدوار تھے۔ مجلس احرار نے مولانا محی الدین لکھوی سے رابطہ پیدا کیا اور انھیں انتخابات میں حصہ لینے کے لیے کہا۔ جیسا کہ میں اپنی کتاب ''بزم ارجمنداں'' میں حضرت مولانا محمد علی لکھوی کے تذکرے میں بیان کر چکا ہوں کہ لکھویوں کے اس گھرانے اور ممدوٹ کی نواب فیملی کے درمیان حضرت حافظ بارک اللہ کے زمانے سے ذہنی کش مکش چلی آ رہی تھی...... ملک میں انتخابات کے اعلان کے زمانے میں مولانا محمد علی لکھوی مدینہ منورہ میں اقامت گزیں تھے۔ انھوں نے محی الدین اور معین الدین کو خط لکھا کہ نواب ممدوٹ کا مقابلہ کیا جائے' چنانچہ مولانا محی الدین نے کاغذات نامزدگی داخل کرا دیے۔ ادھر نواب صاحب کا مقابلہ کرنے کے لیے محمد سرور بودلہ بھی یونینسٹ پارٹی کے ٹکٹ پر میدان میں اتر چکے تھے۔ وہ تحصیل فاضلکا میں بارہ دیہات کے مالک تھے اور اس علاقے کے بہت بڑے زمین دار تھے۔ انھوں نے مرکز الاسلام کا چکر لگایا اور مولانا محی الدین سے کہا کہ وہ الیکشن نہ لڑیں' صرف انہی کو نواب ممدوٹ کا مقابلہ کرنے دیں' لیکن مولانا اس پر رضامند نہ ہوئے۔

اس سے چند روز بعد مولانا محی الدین کو کسی شخص کے ذریعے خفیہ طریقے سے جماعت مجاہدین کے اہم رکن مولانا فضل الٰہی وزیر آبادی کا خط پہنچا کہ مسلم لیگ کے امیدوار نواب ممدوٹ کا مقابلہ نہ کیا جائے۔ چنانچہ مولانا محی الدین مقابلے سے دست کش ہو گئے۔ ہوا یہ تھا کہ جس تاریخ کو امیدواروں کے کاغذات کی جانچ پڑتال ہونا تھی' اس تاریخ کو مولانا یا ان کا کوئی نمائندہ متعلقہ اہل کار کے سامنے پیش نہیں ہوا۔ اس سے کئی دن بعد مولانا معین الدین کی نواب ممدوٹ کے ایک شخص سے اچانک ملاقات ہوئی تو اس نے مولانا سے پوچھا کہ آپ اس دن کیوں نہیں آئے؟ انھوں نے بتایا ہمیں ایک بزرگ کا خط پہنچا تھا کہ مسلم

لیگ کے نمائندے کا مقابلہ نہ کیا جائے' اس لیے ہم نہیں پہنچے- اس شخص نے بتایا کہ نواب صاحب اور ان کے رفقائے کار آپ کی وجہ سے سخت پریشان تھے- ان کا خیال تھا کہ آپ کے مقابلے میں ہمیں نقصان پہنچ سکتا ہے- آپ نہیں آئے تو نواب صاحب اور ان کے معاونین نے اطمینان کا سانس لیا-

یہاں یہ یاد رہے کہ مولانا فضل الٰہی جماعت مجاہدین کے سربراہ ہونے کی بنا پر انگریزی حکومت کے معتوب تھے اور مولانا ابوالکلام آزاد کے پاس کلکتے میں روپوش تھے- مولانا نے ان کے متعلق براہ راست وائسرائے سے بات کی تو ان پر سے پابندی ختم ہوئی اور وہ گھر پہنچنے میں کامیاب ہوئے- چمرکند کے مجاہدین کے لیے وہ شدید سختی کا دور تھا اور وہ چھپ چھپا کر رہتے تھے-

محمد سرور بودلہ کا ذکر آیا ہے تو یہ بھی سنتے جایے کہ وہ مرکز الاسلام آئے تو کئی چودھری قسم کے لوگ اور نوکر چاکر ان کے ساتھ تھے- ایک ملازم نے پانی کا مشکیزہ کندھے میں لٹکا رکھا تھا- دوسرے کی کمر پر چمڑے کی پیٹی بندھی ہوئی تھی' جس کے تین چار خانے تھے- ایک خانے میں شیشے کا گلاس تھا' ایک میں حقے کی چلم تھی اور ایک خانے میں تمباکو کی تھیلی لٹک رہی تھی اور حقہ اس کے ہاتھ میں تھا جس کی ربڑ کی لمبی سے نے تھی- جہاں سردار محمد سرور بودلہ بیٹھتے یا کھڑے ہوتے تھے' وہ حقے کی نے ان کی طرف کر دیتا تھا تاکہ وہ حقہ نوش فرمالیں- لیکن ازراہ احترام وہ مرکز الاسلام کی چار دیواری کے اندر حقہ لے کر نہیں آئے- ان کا حقہ بردار باہر ہی رہا-

یہ تو سردار محمد سرور بودلہ کے زمین دارانہ انداز کا ایک حصہ تھا یا یوں کہیے کہ فیوڈل کلچر تھا- لیکن اس علاقے میں ذاتی طور پر وہ ایک شریف آدمی کی حیثیت سے مشہور تھے اور لوگوں کے ہمدرد و خیر خواہ گردانے جاتے تھے- وہ دور مسلم لیگ کا تھا اور مسلم لیگ مسلمانوں کی اکثریت کے ذہنوں پر چھائی ہوئی تھی- اس لیے زیادہ تر اسی کے امیدوار کامیاب ہوئے- دوسری جماعتوں کے مسلمان امیدواروں نے بہت محدود تعداد میں کامیابی حاصل کی- پنجاب میں مولانا سید محمد داؤد غزنوی واحد مسلمان تھے جو کانگرس کے ٹکٹ پر

مزدور حلقے سے کامیاب ہوئے۔ ان کے مقابلے میں مسلم لیگی اور مزدور نمائندے نے بری طرح شکست کھائی۔

تقسیم ملک کے بعد سنا تھا کہ محمد سرور بودلہ اور ان کے خاندان کے زیادہ لوگ میاں چنوں اور اس کے گردونواح میں آباد ہو گئے تھے۔ کہتے ہیں یہاں آ کر سرور بودلہ صاحب کی حالت میں بہت تبدیلی آ گئی تھی۔ داڑھی بڑھا لی تھی اور اللہ کی عبادت اور ذکر الٰہی میں مشغول ہو گئے تھے۔۔۔ میرے ''الاعتصام'' کے زمانہ ادارت میں مجھے معلوم ہے کہ وہ ''الاعتصام'' کے مستقل خریدار تھے اور اس کا مطالعہ کرتے تھے۔ ان کے خاندان کے اور بھی متعدد حضرات ''الاعتصام'' کے خریدار تھے۔۔۔ اللہ ان کی مغفرت فرمائے۔ موجودہ زمانے کے لوگوں کی نسبت گزشتہ زمانے کے لوگ بہر حال اچھے تھے۔

بات مولانا محی الدین کی ہو رہی تھی، وہ جن دنوں انتخاب لڑنے کی تیاری کر رہے تھے ان دنوں حضرت مولانا سید محمد داؤد غزنوی کے چھوٹے بھائی مولانا عبدالغفار غزنوی مرکز الاسلام تشریف لائے۔ ان کے ساتھ مولانا عبیداللہ احرار اور مولانا عبدالرحیم بھی تھے۔ معاملہ یہ تھا کہ مولانا عبدالغفار غزنوی کانگرس کے ٹکٹ پر تحصیل چونیاں اور قصور سے مسلم لیگی امیدوار میاں افتخار الدین کے مقابلے میں انتخاب لڑ رہے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ مولانا محی الدین اس حلقے میں ان کی مدد کریں، چنانچہ میں اور مولانا محی الدین ان کے حلقے میں پہنچے اور ہم نے مختلف مقامات میں ان کے حق میں تقریریں کیں۔ چھ سات دن ہم ان کے حلقے میں رہے۔ اس علاقے میں مولانا محمد علی لکھوی اور مولانا محی الدین کا بہت اثر تھا اور وہاں کے لوگ ان کے ارادت مندوں اور فیض یافتوں میں شامل تھے۔ اب بھی اس علاقے میں لکھوی حضرات کا بہت اثر ہے اور یہ مولانا معین الدین لکھوی کا حلقہ انتخاب ہے۔

مولانا محی الدین کی بہت بڑی خصوصیت یہ تھی کہ وہ ہمیشہ اطمینان قلب کی دولت سے بہرہ ور رہے، اگر کوئی تکلیف پہنچی تو صبر و ضبط سے کام لیا اور ہر حال میں مساعید شاکر رہے اور اللہ نے جس حالت میں رکھا، اس پر اطمینان کا اظہار کیا: قناعت ان کا شیوہ اور اطمینان قلب ان کے لیے اللہ کا عطیہ تھا۔

بحث مباحثے اور جدل ونزاع سے ہمیشہ کنارہ کشی اختیار کیے رکھی۔ اگر کسی نے کبھی زیادتی بھی کی تو خاموشی سے کام لیا۔ سختی کا بدلہ سختی سے نہیں لیا۔

ان کے چھوٹے بھائی مولانا معین الدین لکھوی کے پاس بے شمار تعویذ لینے والے آتے ہیں اور وہ انھیں تعویذ دیتے ہیں۔ ہم نے ان کے سلسلہ تعویذات کا نام "تعویذ فارمیسی" رکھا تھا۔ ہفتے میں دو دن (اتوار اور پیر) انھوں نے تعویذات کے لیے وقف کر رکھے ہیں۔ ماشاء اللہ ان کی تعویذ فارمیسی خوب چلتی ہے۔ وہ صبح کو اپنے تعویذ خانے میں بیٹھ جاتے ہیں اور شام تک لوگوں کو تعویذ پر تعویذ دیتے چلے جاتے ہیں۔ جنرل ضیاء الحق بھی ان سے تعویذ لیتا تھا اور ان سے دعا کی درخواست کیا کرتا تھا۔

میرا تجربہ یہ ہے کہ بعض معاملات میں ان کا تعویذ اثر کرتا ہے، بشرطیکہ تعویذ لینے والا صدق دل سے تعویذ لے۔ مثلاً جنات کے سلسلے میں ان کا دم اور تعویذ موثر ہے، اسی طرح بچوں کی بیماریاں اٹھرا وغیرہ کے لیے بھی ان کے تعویذ میں اللہ نے تاثیر رکھی ہے۔ عورتوں کی بعض بیماریوں کے لیے بھی ان کا تعویذ اللہ کے فضل سے افاقے کا باعث بنتا ہے۔ لیکن مولانا محی الدین تعویذ نہیں دیتے تھے، نمک پر دم کر دیتے تھے اور اس کے استعمال سے اللہ تکلیف رفع فرما دیتا تھا۔ ایک دن میں ان کی خدمت میں حاضر تھا کہ بعض لوگوں نے ان سے نمک پر دم کرایا۔ ایسے مواقع پر ہم بے عملوں کی باتیں بے عملوں جیسی ہوتی ہیں۔ میں نے ان سے عرض کیا اس طرح نمک کی ایک ایک ڈلی پر دم کرنے سے بہتر ہے کہ آپ کوہستان نمک پر تشریف لے جایئے اور وہاں کھڑے ہو کر پھونک مار آیئے تا کہ نمک کھانے والا ہر شخص تندرست ہو جائے۔

مولانا محی الدین کی تقویٰ شعاری کا اندازہ اس واقعہ سے لگایئے کہ مرکز الاسلام سے کچھ فاصلے پر ایک گاؤں میں خلجیوں کا ایک زمین دار خاندان آباد تھا۔ ان کا مولانا محی الدین سے کسی معاملے میں کچھ اختلاف تھا، جس کی تفصیل کا مجھے علم نہیں۔ انھیں جنات پریشان کرتے تھے اور ان کے لیے مصیبت کا باعث بنے ہوئے تھے...... بعض لوگوں نے ان سے کہا کہ مولانا محی الدین کی خدمت میں جاؤ، انھیں ساری بات بتاؤ، وہ اللہ اللہ کریں گے اور

خدا بھلی کرے گا۔

خلجی ان کے پاس جانے سے گھبراتے تھے کہ ایسا نہ ہو' مولانا ہم پر خفگی کا اظہار فرمائیں اور ہمیں شرمندہ ہونا پڑے۔

لوگوں نے کہا: ایسی کوئی بات نہیں' تم جاؤ' وہ بہت اچھی طرح پیش آئیں گے' اللہ کا نام لیں گے اور تمھاری تکلیف رفع ہو جائے گی۔

چنانچہ وہ مولانا کی خدمت میں آئے اور اپنی بپتا بیان کی...... مجھے یاد پڑتا ہے' مولانا نے جنات کے نام ان کو اس قسم کے چند الفاظ لکھ کر دیے تھے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

از محی الدین

السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ یہ لوگ تمھارے ہاتھوں بہت پریشان ہیں۔ اب تم چلے جاؤ۔ والسلام

فرمایا: یہ رقعہ کسی صاف ستھرے کپڑے میں بند کر کے گھر کے بڑے دروازے پر باندھ دو' اللہ تعالیٰ تکلیف رفع فرمادے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا' اور ان لوگوں کی پریشانی ختم ہو گئی۔

لکھوی حضرات کے تعویذات سے متعلق جو بات مشہور تھی اور ہم نے سنی تھی' وہ بھی یہاں بیان کر دیں--- کہتے ہیں شدید سردیوں کے دن تھے' ان کے بزرگوں میں سے ایک بزرگ حسب معمول آدھی رات کو تہجد کی نماز پڑھنے مسجد میں گئے۔ اندر داخل ہوئے تو ایک شخص کو جو مسجد میں لیٹا ہوا تھا' ان کے پاؤں کی ٹھوکر لگی۔ اس نے کہا تمھیں دکھائی نہیں دیتا' میں لیٹا ہوا ہوں اور تم مجھے ٹھوکر لگا رہے ہو۔؟

انھوں نے کہا: مسجد میں اندھیرا ہے' اس لیے مجھے پتا نہیں چلا کہ تم یہاں لیٹے ہوئے ہو' تمھیں تکلیف ہوئی۔ میں معافی چاہتا ہوں' لیکن یہ بتاؤ تم کون ہو جو اتنی جلدی مسجد میں آ گئے ہو۔؟

وہ شخص اٹھا اور کہا میرے ساتھ باہر آیئے--- وہ اس کے ساتھ چل پڑے۔ ایک اونچی جگہ پر کھڑے ہو کر اس نے کہا وہ سامنے دیکھیے دور تک کیا نظر آ رہا ہے؟

جواب دیا: یہ جھگیاں سی ہیں جن میں بہت سے لوگ دکھائی دے رہے ہیں۔

اس نے کہا: یہ جنوں کی جھگیاں ہیں جو بہت بڑی تعداد میں یہاں آئے ہیں۔ میں اس گروہ کا سربراہ ہوں۔ اگر کسی کو جن کی شکایت ہوتو (ایک دعا بتائی کہ) یہ لکھ کر اسے پلا دیے (یا اس کے گلے میں ڈال دیے) شکایت رفع ہو جائے گی۔ اور آپ کی سات پشتوں تک اس سے فائدے کا سلسلہ جاری رہے گا۔ (یہ دعا مجھے معلوم نہیں کون سی تھی)

سنا ہے مولانا معین الدین لکھوی تک چھٹی (یا ساتویں) پشت ہے۔ یہ جو کچھ میں نے بیان کیا ہے روایت باللفظ نہیں' روایت بالمعنی ہے۔ اللہ ہی بہتر جانتا ہے اس میں کہاں تک صداقت ہے۔

مرکز الاسلام میں بہت سے لوگ آتے تھے اور ان میں سے بعض طویل عرصے تک وہاں رہتے تھے۔ انہی حضرات میں سے ایک ہمارے بزرگ دوست قاضی عبیداللہ تھے جو کئی مہینے وہاں رہے تھے۔ انھیں اخبار پڑھنے اور ان دواؤں کے اشتہارات دیکھنے کی عادت تھی' جو اخبار میں چھپتے تھے...... ایک دن وہ صبح کے وقت وہاں سے نکلے اور شام کو واپس آئے۔ پوچھا کہاں گئے تھے؟ کہا بس یوں ہی ایک گاؤں میں گیا تھا۔ دوسرے دن پھر یہی ہوا کہ صبح کو گئے اور شام کو آئے۔ پوچھنے پر اب بھی یہی بتایا کہ ایک گاؤں میں ایک دوست کے پاس چلا گیا تھا۔ تیسرے دن بات واضح کی کہ انھوں نے اخبار میں کسی مرض کے لیے ایک نسخہ پڑھا ہے' جس کے اجزا میں سے ایک جز "کشنیز" ہے۔

نسخے کے تمام اجزا مل گئے ہیں' لیکن "کشنیز" نہیں ملا' اور کشنیز نسخے کا ضروری جز ہے۔ کئی روز سے کشنیز کی تلاش میں ہوں اور کشنیز کسی گاؤں سے دست یاب نہیں ہو رہا ہے۔

مولانا محی الدین ان کی یہ بات سن کر اٹھے اور گھر سے دھنیا کا چھنا بھر کر ان کے سامنے لا رکھا اور فرمایا: لیجیے کشنیز——! قاضی صاحب تعجب سے بولے: اچھا یہ ہے کشنیز۔

مولانا محی الدین نہایت رحم دل اور نرم مزاج تھے۔ ہمیشہ اپنی ضرورت نظر انداز کر کے دوسرے کی ضرورت پورا کرنے کی کوشش کرتے...... ایک مرتبہ نیا کھیس اوڑھے ہوئے تھے۔ ایک شخص کو دیکھا کہ سردی سے ٹھٹھر رہا ہے۔ کھیس اتار کر اسے دے دیا۔

کچھ عرصہ پیشتر میں نے سنا تھا کہ نئی موٹر سائیکل پر کہیں جا رہے تھے- ایک شخص نے جس سے کوئی جان پہچان نہیں تھی' ان کو روکا اور بہ انداز لجاجت کہا کہ ذرا موٹر سائیکل دیجیے' مجھے فلاں شخص سے کچھ کام ہے' ابھی آتا ہوں...... اسے موٹر سائیکل دے دیا اور وہ لے کر چلتا بنا-

۱۹۳۷ کی گرمیوں کے دن تھے اور دوپہر کا وقت...... ہم چار پانچ طالب علم سرکنڈا کاٹنے کے لیے "ونڈی" میں گئے- "ونڈی" مرکز اسلام کے قریب ایک بالکل خشک مگر کافی گہری اور چوڑی نہر کا نام تھا- سرکنڈا اس کے اردگرد دور تک پھیلا ہوا تھا- ہم کلہاڑیوں اور درانتیوں سے سرکنڈا کاٹ رہے تھے کہ مٹی کا ایک بڑا سا ڈلا ہمارے قریب آ کر گرا- کام بند کر کے ہم ادھر ادھر دیکھنے لگے- اتنے میں ایک اور ڈلا آیا- ہم سہم گئے- ہم نے سن رکھا تھا کہ دوپہر کے وقت جنگل میں جن بھوت آ جاتے ہیں' ذہن میں آیا کہ کوئی جن بھوت ہے' جس نے ہماری طرف یکے بعد دیگرے دو ڈلے پھینکے ہیں...... اب ایک اور ڈلا آیا' اس کے بعد مسلسل چار پانچ ڈلے آئے اور ہمارے قریب آ کر گرے-

ہمارے ساتھ ہمارا ایک عزیز محمد زکریا تھا جو عمر میں ہم سب سے چھوٹا تھا' آج کل وہ جڑانوالا (ضلع فیصل آباد) میں میاں محمد زکریا کے نام سے معروف ہے- ماشاءاللہ اس کی دنیا بدلی ہوئی ہے- اچھی خاصی سفید داڑھی ہے اور تہجد گزار--- ! کچھ عرصہ پیشتر وہ میرے پاس لاہور آئے اور مجھے بتایا کہ امام کی غیر موجودگی میں اب وہ امامت کا فریضہ بھی انجام دیتے ہیں-

اس نے اعلان کیا کہ اگر ڈلے چلانے والا ہمارا واقف ہے اور اس کا مقصد محض مذاق بازی ہے تو بول پڑے' ورنہ ہم جو جی میں آیا اسے کہیں گے- اس وارننگ کے نتیجے میں دو ڈلے اور آئے جو ہمارے پاؤں کے قریب آ کر گرے...... پھر زکریا نے زبان کو حرکت دی تو تیزی کے ساتھ ڈلوں کی بارش ہونے لگی اور ساتھ ہی سرکنڈے ہلتے ہوئے دکھائی دینے لگے- ہم نے دیکھا کہ کبھی وہ سرکنڈا ہل رہا ہے' کبھی وہ حرکت کر رہا ہے اور ضرب و حرکت کا یہ سلسلہ ہمارے قریب آ رہا ہے...... اتنے میں سرکنڈوں میں بیٹھے ہوئے انسانی جسم کے

مونڈھوں پر نظر پڑی اور ساتھ ہی سفید بنیان دکھائی دی...... نعرہ بلند ہوا' مولوی محی الدین......!

محی الدین ہنستے ہوئے سرکنڈوں کی اوٹ سے نمودار ہوئے اور ہماری نگاہیں مارے شرم کے جھک گئیں۔

مولوی محی الدین سے ان دنوں ہماری گہری دوستی تھی۔ ہمارا وطن کوٹ کپورہ مرکز الاسلام سے بذریعہ سڑک پینتالیس میل کے فاصلے پر تھا۔ ایک دفعہ وہ سخت گرمیوں کے موسم میں مجھے ملنے کے لیے سائیکل پر وہاں پہنچے اور رات ہمارے ہاں رہے۔

مرکز الاسلام کی چار دیواری کے اندر چار گھر تھے' ایک مسجد تھی اور ایک مدرسہ تھا' مدرسے کے تین کچے کمرے تھے جنھیں بڑے بڑے کوٹھے کہنا چاہیے۔ اگر کوئی ایسا مہمان آ جاتا جس کا ارادہ وہاں رات بسر کرنے کا ہوتا تو انہی کمروں یا کوٹھوں میں سے ایک کمرے میں اسے سلا دیا جاتا تھا۔ چار مکانوں میں سے ایک مکان مولانا کا تھا جس کا صرف دروازہ پختہ اینٹوں کا تھا' باقی تمام مکان کچا تھا۔ چھوٹی سی مسجد البتہ پختہ اینٹوں کی تھی' ایک چھوٹا سا کنواں تھا' جسے ''کھوہی'' کہا جاتا تھا۔ اس کا ایک حصہ مسجد کی طرف تھا اور ایک مولانا کے مکان کی طرف --- دونوں طرف چمڑے کے بوکے سے پانی نکالا جاتا تھا --- ایک مکان فتح محمد عرف ''پھتا'' لوہار کا تھا۔ یہ کل تین افراد تھے' ایک خود فتح محمد' ایک اس کی بیوی اور ایک بیٹا۔ بیٹے کا نام یحییٰ تھا۔ ۱۹۴۷ء کے بعد نہ ان کو کہیں دیکھا اور نہ یہ پتا چل سکا کہ ان کے ساتھ کیا گزری۔

ایک گھر قمر دین ترکھان کا تھا۔ یہ دو افراد تھے۔ ایک قمر دین اور ایک اس کا بیٹا موسیٰ --- ! ان دونوں کے ساتھ ایک دفعہ ۱۹۵۳ء میں رات کے گیارہ بجے کے بعد اس وقت ملاقات ہوئی تھی جب میں ایک گاؤں غالباً کھرل کلاں میں حضرت مولانا محمد علی لکھوی کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ اس کا ذکر میں نے اپنی کتاب ''بزم ارجمنداں'' کے صفحہ ۲۳۸ ۲۳۹ میں مولانا ممدوح کے حالات کے ضمن میں کیا ہے۔

ایک مکان اور تھا' جو ۱۹۳۷ء میں مولانا عطاء اللہ حنیف کا مسکن تھا۔ یہ اس وقت کل دو

افراد تھے‘ ایک خود مولانا اور ایک ان کی اہلیہ محترمہ بہن حنیفہ---!

مولانا عطاء اللہ کی سکونت اس میں صرف ایک سال رہی- ۱۹۳۸ء میں وہ فیروز پور چلے گئے تھے- اس سے کافی عرصہ بعد اس مکان میں دو حقیقی بھائی مقیم ہوئے‘ بڑے کا نام محمد دین تھا اور چھوٹے کا محمد حنیف---! یہ نومسلم تھے- ۱۹۴۵ میں یہ فقیر مرکز الاسلام میں معلم کی حیثیت سے خدمت سرانجام دیتا تھا- جمعرات کو آدھی چھٹی ہوتی تھی اور جمعے کو پوری- مرکز الاسلام کا ریلوے اسٹیشن جھوک ٹہل سنگھ تھا- فیروز پور جانے کے لیے دن میں دو ٹرینیں وہاں سے گزرتی تھیں جو بہاول نگر اور فاضلکا بنگلہ سے آتی تھیں‘ ایک صبح نو بجے کے قریب اور دوسری دن کے تین بجے--- میں اپنے وطن کوٹ کپورے جانے کے لیے تین بجے کی ٹرین پکڑتا تھا اور فیروز پور اتر جاتا تھا- فیروز پور سے اس ٹرین پر بیٹھ جاتا تھا جو لاہور سے چلتی تھی اور فیروز پور سے ہوتی ہوئی دہلی اور پھر بمبئی جاتی تھی‘ اسے بمبے ایکسپریس کہا جاتا تھا- کوٹ کپورے یہ ٹرین شام کے چھے بجے پہنچتی تھی-

ایک دن گیارہ بجے کے قریب میں نے محمد دین سے کہا کہ آج تین بجے کی ٹرین سے میں اپنے گھر کوٹ کپورے روانہ ہوں گا اور پھر ہفتے کے روز واپس آؤں گا- وہ بالعموم مسکراتا رہتا تھا- اس نے مسکراتے ہوئے کہا آج آپ دوپہر کا کھانا میرے ساتھ کھائیے- میں آپ کے لیے کھیر اور گوشت پکاؤں گا‘ میری دعوت قبول کیجیے- کھانا کھا کر چلے جائیے گا-

میں نے کہا:- ٹھیک ہے تمھاری دعوت منظور- تمھارے ہاتھ کی پکی ہوئی کھیر اور گوشت ضرور کھائیں گے-

اس زمانے میں کھیر پکا کر اس کے اوپر عام طور سے شکر ڈالی جاتی تھی- اس نے کانسی کی بڑی سی تھالی میں کھیر ڈالی اور اس کے اوپر شکر بکھیری اور ہم نے کھائی- محمد دین صحت مند جوان تھا- کھانے کے دوران اس نے ہنستے ہوئے مجھے کہا:-

جناب! ہماری شادی اس دنیا میں کہیں ہوگی یا جنت میں حوروں کے ساتھ ہوگی-؟

میں نے کہا:- فکر نہ کرو‘ کہیں تو ہوگی-

یہ ہنسی مذاق کی بات تھی۔ میں چلا گیا۔ تیسرے دن واپس آیا تو پتا چلا کہ محمد دین وفات پا گیا ہے۔

سن کر نہایت افسوس ہوا اور اس کی حوروں کے ساتھ شادی والی بات میرے دل میں بیٹھ گئی جو اس کی وفات کی اطلاع دینے والوں کو میں نے سنائی۔ ہنسی مذاق کی بات حقیقت میں بدل گئی تھی۔ مجھے یقین ہے اس پاک باز شخص کی شادی ضرور جنت میں حوروں کے ساتھ ہو گئی ہو گی۔

دونوں بھائیوں کا سانولا سا رنگ تھا' محمد دین کا کم اور محمد حنیف کا قدرے زیادہ--- یوں تو دونوں بھائی قد آور تھے' لیکن محمد دین کا قد محمد حنیف سے کچھ لمبا تھا--- تقسیم ملک کے بعد مختلف اوقات میں محمد حنیف سے کئی دفعہ ملاقات ہوئی۔ اس نے ایک دفعہ بتایا تھا کہ وہ گونڈلاں والا (ضلع گوجرانوالا) میں مقیم ہے۔ پاکستان آ کر اس کی شادی ہو گئی تھی اور وہ صاحب اولاد تھا۔ بہت مدت سے اس سے ملاقات نہیں ہوئی۔ خدا جانے کہاں ہے اور کس حال میں ہے۔

مولانا محی الدین لکھوی ان دونوں بھائیوں کا بہت خیال رکھتے تھے اور ان کی مدد کیا کرتے تھے۔

مولانا کا ایک مزارع چھوٹے قد کا گول گپا سا تھا۔ اس کا نام غالباً چراغ تھا۔ مولانا اسے سراج کہا کرتے تھے۔ وہ ہل چلایا کرتا تھا۔ بعض دفعہ مولانا اس کے پاس چلے جاتے اور اس سے ہل پکڑ کر خود چلانے لگتے۔ وہ مولانا کو ہل چلاتے دیکھ کر بہت خوش ہوتا تھا۔

ان کی مرکز الاسلام والی زمین کا ایک مزارع خان محمد رکوال تھا' جسے لوگ ''خانوں'' کہہ کر پکارتے تھے۔ اس کا بھائی نور محمد تھا جو نکھرے ہوئے رنگ کا کلین شیو طویل قامت جوان تھا اور اس کی بڑی بڑی مونچھیں تھیں۔ حضرت مولانا محمد علی لکھوی مرحوم سے اس کے اچھے مراسم تھے اور وہ ان کے سامنے سگریٹ پیتا تو وہ انھیں کچھ نہیں کہتے تھے۔ حالانکہ سگریٹ نوشی کے وہ سخت خلاف تھے۔ ایک دن اس نے مولانا محی الدین کے سامنے سگریٹ پیا تو انھوں نے اسے روک دیا۔ اس نے اسے محسوس کیا اور کہا کہ میں ان کے باپ کے

سامنے سگریٹ پیتا تھا اور وہ مجھے کچھ نہیں کہتے تھے۔ یہ ان سے بھی زیادہ عالم ہیں---اس کے بعد اس نے مولانا محی الدین سے معافی مانگ لی تھی۔

قیام پاکستان کے بعد نور محمد جڑانوالا کے قریب چک نمبر ۵ گ ب میں آباد ہو گئے تھے۔ مرکز الاسلام میں مجھ سے وہ بہت اچھا تعلق رکھتے تھے۔ انھیں جب ہمارے متعلق معلوم ہوا کہ ہمارا خاندان اسی علاقے میں آبسا ہے تو وہ جڑانوالا کی منڈی میں گڈس ٹرانسپورٹ کمپنی کے اڈے پر پہنچے اور میرے عزیزوں سے میرے متعلق پوچھا اور اپنے متعلق انھیں بتایا اور پیغام دیا کہ میں اسے ضرور ملوں یا ان کے گاؤں پہنچوں یا لاہور سے جڑانوالا آؤں تو انھیں وہاں بلالوں۔ لیکن افسوس ہے میں ان سے مل نہ سکا۔ میں لاہور سے جب بھی جڑانوالے گیا' مجھے گڈس ٹرانسپورٹ کمپنی کے اڈے سے اپنے عزیزوں کی زبانی نور محمد کا پیغام ملا' لیکن ان سے ملاقات نہ ہو سکی۔ ایک دن میں بذریعہ بس جڑانوالا سے لاہور آ رہا تھا کہ چک نمبر ۵ سے خان محمد (خانوں) اسی بس میں سوار ہوئے۔ مجھے دیکھتے ہی انھوں نے پہچان لیا اور نہایت مسرت کا اظہار کیا۔ میں نے بھی پہچان لیا۔ کئی سال کے بعد ملاقات ہوئی تھی۔ نور محمد صاحب چک نمبر ۵ سے حجرہ شاہ مقیم (ضلع اوکاڑہ) چلے گئے تھے' وہیں فوت ہوئے۔ مولانا محمد علی لکھوی کے گھرانے سے وہ عقیدت مندانہ علاقہ رکھتے تھے۔ اس دور کے بہت سے لوگ وفات پا چکے ہیں' جن سے ہمارے مراسم تھے اور ہر روز کی ملاقات تھی۔ اللہ ان سب کی مغفرت فرمائے اور اس گنہگار کو عمل خیر کی توفیق سے نوازے۔ آمین۔

گزشتہ سطور میں ہم نے مولانا محی الدین لکھوی کے بارے میں ان واقعات کا مطالعہ کیا ہے' جن کا تعلق قیام پاکستان کے قبل سے تھا۔ ان کے آباواجداد کا تذکرہ اگرچہ ہم اپنی کتاب "بزم ارجمنداں" کے دو مضمونوں میں کر چکے ہیں (ایک اس مضمون میں جو ان کے والد مکرم مولانا محمد علی لکھوی سے متعلق لکھا گیا ہے اور ایک اس میں جو ان کے برادر صغیر مولانا معین الدین لکھوی کے بارے میں ضبط تحریر میں لایا گیا ہے) تاہم زیر مطالعہ گزارشات میں بھی ان کے اکابر کا تذکرہ کسی نہ کسی انداز میں آ گیا ہے۔ ان کے اکابر نہایت بلند مرتبے

کے حامل تھے اور بہت سے اوصاف سے موصوف---!

مثلاً:-

o-تصنیف وتالیف میں'

o-درس وتدریس میں'

o-وعظ وتبلیغ میں'

o-تقویٰ وصالحیت میں'

o-مہمان نوازی میں'

o-اخلاق حسنہ میں'

o-میل جول میں'

o-عالی ظرفی میں'

ان کا مقام بہت اونچا تھا- افسوس ہے' ان کے مکمل حالات اب تک معرض تصنیف میں نہیں آسکے- جو کچھ تھوڑا بہت ان کے بارے میں لکھا' دوسروں نے لکھا- ان کے اخلاف اور خاندان کے کسی فرد نے کچھ نہیں لکھا- حالانکہ یہ سب تعلیم یافتہ لوگ ہیں اور علم و عمل اور شہرت و ناموری کی جو نعمت انھیں حاصل ہوئی ہے' اس کا باعث وہی عالی مرتبت بزرگ ہیں' رحمہم اللہ تعالیٰ---مولانا معین الدین کو اللہ نے بڑی صلاحیتیں عطا فرمائی ہیں' اگر لکھنا چاہیں تو بہت اچھا لکھتے ہیں' لیکن ہمارے اس قابل احترام دوست نے اپنے آپ کو (ہماری رائے کے مطابق) بے مقصد سیاست کے لیے وقف کر رکھا ہے- کاش وہ اپنے اکابر کے حالات قلم بند کریں اور ان کی خدمات گوناگوں سے لوگوں کو متعارف کرائیں-

اب چند باتیں اور---!

۱- مولانا محی الدین اور معین الدین کے ایک دوست چودھری برکت علی تھے- جو فیروز پور کے بالکل قریب کے ایک گاؤں کے رہنے والے تھے- حصول تعلیم کے بعد اے جی آفس میں اکاؤنٹ آفیسر کی حیثیت سے ان کا تقرر ہوا تھا- نہایت دلچسپ آدمی تھے- مولانا محی الدین نے ایک دفعہ بتایا کہ جس زمانے میں وہ میٹرک کا امتحان دینے کے لیے

فیروز پور کے گورنمنٹ ہائی سکول میں داخل ہوئے اور ہوسٹل میں گئے تو برکت علی بھی وہیں تھے۔ ایک دن وہ گھر سے تین چار سیر "پنجیری" ڈبے میں بند کر کے لائے۔ ڈبہ الماری میں رکھ دیا۔ لڑکوں نے ان کی الماری کھولی جن میں خود مولانا بھی شامل تھے' اس سے ڈبہ نکالا اور چند لمحوں میں پنجیری ختم کر ڈالی۔ انھوں نے آ کر دیکھا تو معاملہ صاف تھا۔ اب وہ کیا کر سکتے تھے' جو ہونا تھا ہو چکا تھا۔

۲۔ میں ۱۹۳۷ میں ایک سال مرکز الاسلام میں بہ طور طالب علم اور ۱۹۴۳ سے ۱۹۴۷ تک چار سال معلم کی حیثیت رہا اور ان سے پرخلوص دوستانہ تعلقات قائم ہوئے۔ معلمی کے دور میں چودھری غلام حسین تھاڑیہ بھی وہیں خدمت تدریس انجام دیتے تھے۔ ایک دفعہ مولانا محی الدین نے مشورہ دیا کہ مرکز الاسلام کے جامعہ محمدیہ کے طلبا اردو میں گفتگو کیا کریں۔ چودھری صاحب بھی یہی چاہتے تھے' چنانچہ اس پر عمل شروع ہو گیا۔ اب تو پنجاب کے دیہات میں بھی بچے صاف اردو بولتے ہیں' اس وقت اردو کا چلن پنجاب میں بہت کم تھا۔ ہر اردو بولنے والے کو "ہندستوڑا" کہا جاتا تھا۔ مرکز الاسلام میں چھوٹے بچے اردو بولتے تو بعض اوقات عجیب قسم کی لطیفانہ صورت حال پیدا ہو جاتی۔ پنجابی میں چارپائی کو "منجی" کہا جاتا تھا۔ بعض بچے "منجی" کو اردو میں بدل کر "مانجی" کہتے اور پیچھے کو "پیٹھ" ---! اس طرح عجیب و غریب لطیفے پیدا ہو جاتے۔

۳۔ پھر جامعہ کی زبان عربی کر دی گئی۔ اس میں ابتدا میں تو لطائف ابھرے مگر آہستہ آہستہ معاملہ ٹھیک ہو گیا۔

۴۔ مولانا محی الدین نماز فجر سے قبل مسجد میں آ جاتے اور آ کر السلام علیکم کہتے۔ لڑکے مسجد کے صحن سے باہر چارپائیوں (یعنی "مانجیوں") پر لیٹے ہوتے تھے' مولانا کسی کو جگاتے نہیں تھے' قدرے بلند آواز سے نماز تہجد میں قرآن پڑھتے' نہایت موثر اور خوب صورت آواز تھی۔ وہ تلاوت کرتے تو سننے والے کے ذہن میں خاص قسم کے اثرات ابھرنے لگتے۔

۵۔ عشا کی نماز وہاں دیر سے پڑھی جاتی تھی۔ سردیوں میں تو دیر کا احساس نہیں ہوتا تھا' پڑھنے اور مطالعہ کرنے میں آسانی سے وقت گزر جاتا تھا' لیکن گرمیوں میں زیادہ

انتظار مشکل ہوتا تھا' اس لیے کہ وہاں بتی نہیں تھی اور دیے کی روشنی میں پڑھنا باعث تکلیف ہوتا تھا۔ پروانوں کی فوج دیے پر ٹوٹ پڑتی تھی اور پھر وہاں بیٹھنے والوں کو اپنا رقیب سمجھ کر اجتماعی حملے کی زد میں لے آتی تھی۔ اب سوائے چارپائی پر لیٹ جانے کے چارہ نہ تھا اور لیٹنے کا نتیجہ نیند کی شکل میں نکلتا تھا' جس کی وجہ سے عشا کی نماز کے وہ اثرات قلب وذہن پر طاری نہیں ہو سکتے تھے' جن کا نماز تقاضا کرتی ہے۔ بس ایک فرض تھا جو کسی طرح ادا کر لیا جاتا تھا۔

ایک دن اتفاق سے چودھری غلام حسین وہاں نہیں تھے۔ مجھے ایک بات سوجھی (اور میرے جیسے کوتاہ عملوں کو اسی قسم کی باتیں سوجھا کرتی ہیں) کہ مولانا کے تشریف لانے سے پہلے نماز پڑھ لو اور چارپائیاں پیچھے کو ہٹا کر سو جاؤ۔ نیند آئے یا نہ آئے بس لیٹے رہو۔ چنانچہ میں نے آہستہ آواز سے نماز پڑھائی اور فارغ ہو کر سب چارپائیوں پر لیٹ گئے۔ ایسے چوری چھپے کے مواقع پر نیند تو آتی نہیں' بس لیٹنا ہی ہوتا ہے۔

مولانا تشریف لائے' لم لیٹوں کو دیکھا اور بہ آواز بلند السلام علیکم کہہ کر حسب معمول اذان کہی' دو رکعتیں پڑھیں اور فرض پڑھنے کے لیے "سوئے ہوئے" لشکر کو السلام علیکم کی مسنون آواز سے جگانے کی کوشش کی۔ سوئے ہوئے کو تو آدمی جگا سکتا ہے' جاگنے والے کو کون جگائے۔ رات کے اندھیرے میں سب انھیں دیکھ رہے تھے۔ وہ قدرے جہری قرأت سے نماز پڑھ کر چلے گئے۔ کسی سے کچھ نہیں کہا۔ دوسرے دن بھی اس ضمن میں کوئی بات نہیں کی۔ البتہ عشا کی نماز کے لیے روزانہ کے معمول سے پہلے تشریف لائے اور پھر ہر روز پہلے آنے کو معمول بنا لیا۔

ان کی ظہر کی نماز خاصی طویل ہوتی تھی۔ ایک دو مرتبہ نماز کی طوالت کی بنا پر کچھ مہمان گاڑی سے بھی رہ گئے تھے۔ میں نے عرض کیا تو مسکرائے اور پھر اختصار سے کام لینے لگے۔

مولانا محی الدین لکھوی نہایت حلیم الطبع اور سلیم الفطرت عالم دین تھے۔ حلم ان کا خاصہ' سلامت روی ان کا شب وروز کا ضروری عمل اور صالحیت ان کا جزو حیات تھا۔ شائستگی کا پیکر اور اس کے ساتھ ہی شگفتگی کا اعلیٰ نمونہ۔ پاکیزہ کلام' عالی کردار' انتہائی خوش گفتار اور

بے حد عذوبت لسان کے حامل' خندہ رو' کھلے دل اور بلند حوصلے کے مالک' سادہ مگر صاف ستھرا لباس پہنتے تھے- وعظ وتقریر میں ان کا ایک خاص اسلوب تھا- اثنائے کلام اور دوران تقریر میں اللہ اکبر کہتے تو پتا چلتا تھا کہ یہ پاک نام ان کے قلب کی گہرائیوں سے نکلا ہے- اللہ تعالیٰ کے کسی فرمان کا حوالہ دیتے تو فرماتے اللہ پاک نے فرمایا...... ان میں ایک خوبی یہ تھی کہ ہر وقت باوضو رہنے کی کوشش کرتے تھے اور بسا اوقات وضو کے بعد ''تحیۃ الوضو'' کی دو رکعتیں پڑھتے تھے- کسی مسجد میں تشریف لے جاتے تو مسجد میں بیٹھنے سے پہلے دو رکعت نماز ''تحیۃ المسجد'' پڑھتے-

ان کا خط (ہینڈ رائٹنگ) بہت عمدہ تھا- ان کے والد محترم حضرت مولانا محمد علی لکھوی رحمۃ اللہ علیہ کا خط بھی بڑا خوب صورت تھا- ان کے برادر صغیر مولانا معین الدین لکھوی کا خط بھی بہت اچھا ہے- میں نے متعدد لکھوی حضرات کے خط دیکھے ہیں' صاف اور عمدہ انداز سے لکھتے ہیں- میں ان کے مقابلے میں بدخط ہوں-

کچھ عرصہ مولانا ممدوح اپنے نام کے ساتھ ''عبدالسلام'' بھی لکھتے رہے ہیں' یعنی محی الدین عبدالسلام---!

مولانا محی الدین کے تذکرے میں ہم مختلف موڑ کاٹتے ہوئے اگست ۱۹۴۷ء تک پہنچ گئے ہیں- آئندہ سطور میں یہ دیکھیں گے کہ آزادیٔ برصغیر اور قیام پاکستان کے اعلان کے بعد وہ اپنے اہل وعیال اور خاندان کے ساتھ اپنے قدیم مسکن لکھو کے (ضلع فیروز پور مشرقی پنجاب) اور اپنے والد مکرم کے قائم کردہ ''مرکز الاسلام'' سے جو لکھو کے سے تقریباً دو میل کے فاصلے پر تھا' کیسے نکلے اور کس طرح پاکستان پہنچے-

یہاں یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ ۱۹۹۷ء میں جب میں ''بزم ارجمنداں'' مرتب کر رہا تھا' میں نے مولانا محی الدین کو خط لکھا تھا جس میں گزارش کی گئی تھی کہ وہ یہ فرمائیں کہ اگست ۱۹۴۷ء میں اعلان آزادی کے بعد وہ کس طرح مرکز الاسلام سے نکل کر پاکستان پہنچے- یہ بات میں نے اس لیے ان سے پوچھی تھی کہ وہ لکھو کے سے کچھ فاصلے پر جنگل میں رہتے تھے اور ان کے قریب جھوک ٹہل سنگھ کے اکالی ان کے سخت مخالف تھے' لیکن مخالفت

کے باوجود دم جھاڑے کے لیے خود ان کی اور ان کی خواتین کی ان کے پاس آمد و رفت رہتی تھی اور اس سلسلے میں ان کو وہ بے حد احترام کا مستحق گردانتے تھے۔ مگر اس وقت حالات اس درجہ خطرناک منزل میں داخل ہو گئے تھے کہ لوگوں نے احترام کے رشتے داروں کو پامال کر ڈالا تھا۔ میرے خط کے جواب میں مولانا نے اپنے صاحب زادے محمد حماد (پروفیسر پنجاب یونیورسٹی لاہور) کے ذریعے ایک تفصیلی تحریر بھیجی تھی۔

میں چاہتا تھا کہ "بزم ارجمنداں" میں مولانا محمد علی لکھوی اور ان کے فرزند گرامی مولانا معین الدین لکھوی کے ساتھ مولانا محی الدین لکھوی کے حالات بھی شائع کر دیے جائیں تاکہ قارئین کرام تینوں کے حالات ایک ہی جگہ پڑھ سکیں۔ لیکن عزیزی عمر فاروق (مکتبہ قدوسیہ) نے رائے دی کہ مولانا محی الدین کے حالات اس مجموعے کے بجائے دوسرے مجموعے میں شائع کیے جائیں۔ چنانچہ ان کے حالات روک لیے گئے تھے۔ اس وقت وہ زندہ تھے لیکن بیمار تھے۔

ذیل میں ان کی وہ تحریر درج کی جاتی ہے جو انھوں نے میرے خط کے جواب میں اپنے صاحب زادے حماد کے ہاتھ ارسال فرمائی تھی۔ اس میں ان کی وطن سے روانگی اور پاکستان میں ورود کی تمام تفصیل آ گئی ہے۔ ہم نے بعض مقامات پر اس تحریر کے الفاظ و انداز میں معمولی سا ردوبدل کیا ہے۔ یہ ایک دلچسپ اور معلومات افزا تحریر ہے۔ اس میں ان کی پنجاب اسمبلی کی رکنیت، اس کے حلف اور ملکہ برطانیہ کے بارے میں ایک عجیب و غریب خواب اور اس کی تعبیر کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔ ملاحظہ فرمایئے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تقسیم ہند کے دنوں میں عام طور پر خطرے کا سماں رہتا تھا۔ راتوں کو اکثر و بیشتر کسی نہ کسی طرف شور اٹھتا جو خطرۂ بدامنی اور لوٹ مار کی علامت تھا۔ ہم ان دنوں مرکز الاسلام میں تھے۔ مرکز کے لیے بظاہر الحمدللہ کوئی خطرے کی بات نہیں تھی، جس کی ایک وجہ شاید یہ تھی کہ ایک بڑی چار دیواری کے اندر مدرسہ اور رہائشی مکانات تھے۔ اردگرد کے لوگوں کے دلوں میں مرکز کا رعب تھا کہ پتا نہیں

اس کے اندر کیا ہے؟- بہر حال انہی دنوں ایک رات بہت بڑی سرچ لائٹ مرکز پر پڑی جو فیروز پور کی جانب سے آ رہی تھی اور دور دور تک (کئی دیہات تک) پھیلی ہوئی تھی- کافی دیر تک یہ روشنی رہی (۱۵ منٹ سے آدھ گھنٹے تک)- یہ روشنی مرکز پر پڑتی دیکھ کر قریبی گاؤں "دلارام" کے لوگوں نے سمجھا کہ مرکز کے لیے شاید کوئی خطرہ ہے- ایسا نہ ہو کہ سکھوں نے حملہ کر دیا ہو--- اس تشویش کی وجہ سے دلارام کے کچھ دوست جن کی تعداد آٹھ دس ہوگی مسلح ہو کر رات ہی کو مرکز آئے تاکہ خیریت کا پتا کیا جا سکے- یہاں ہر طرح سے خیریت پا کر وہ اطمینان سے واپس لوٹ گئے-

ان دنوں مولانا معین الدین صاحب کسی کام سے لاہور گئے ہوئے تھے- میں مردوں میں وہاں اکیلا ہی تھا- مدرسے کے طلبا بھی عید اور رمضان کی چھٹیوں پر تھے-

سرچ لائٹ والی رات کے اگلے دن تقریباً دوپہر کے وقت حافظ شفیق الرحمٰن چند آدمیوں کے ساتھ "لکھوکے" گاؤں سے آئے' انھوں نے کہا کہ سارا گاؤں کوچ کی تیاری کر چکا ہے- آپ بھی آ جائیں تاکہ جلد از جلد یہاں سے نکلا جائے- ہم ان کے ساتھ چل پڑے- مویشی آگے لگا لیے- نوکر جو مویشیوں کے لیے رکھا تھا' فرار ہو گیا تھا- لہٰذا مویشی خود ہی ہانکنا پڑے-

جب ہم لکھوکے پہنچے تو گاؤں کے ہمارے خاندان کے تمام لوگ گاؤں سے باہر نکل کر چلنے کے لیے تیار تھے- گاؤں کے رہنے والے ڈوگر بھی نکلے لیکن ان کا ہمیں کچھ پتا نہیں کہ کس طرف گئے- ابھی ہم نے سفر شروع نہیں کیا تھا کہ جیپوں پر ہندو اور سکھ فوجی ادھر سے گزرے- انھوں نے ہوائی فائرنگ کر دی جس سے لوگ ڈر کر گھروں میں گھس گئے- ہمارے مویشی بھی بدک گئے- جیپیں فائرنگ کرتی ہوئی آگے نکل گئیں--- شاید ان کا مقصد صرف ڈرانا دھمکانا تھا-

فائرنگ سے جب تھوڑی سی افراتفری پھیلی تو اس دوران ایک اونٹ کے بدکنے سے اس پر بندھی ہوئی ہمارے قیمتی کپڑوں اور زیورات کی ایک گٹھڑی گر گئی' جس کا فوری طور پر ہمیں پتا نہ چل سکا۔ بریف کیسوں کی بجائے چھوٹا موٹا جتنا سامان ساتھ لے سکے تھے' گٹھڑیوں میں باندھا گیا تھا' گٹھڑیوں میں اس لیے باندھا کہ راستے میں لوٹ مار کا خطرہ کم سے کم ہو' اس طرح غریب سمجھ کر چھوڑ دیے جانے کے امکانات زیادہ تھے۔۔۔ مذکورہ گٹھڑی جو گر گئی تھی ایک آدھ دن کے سفر کے بعد جب اس کا خیال آیا تو بہت تلاش کے بعد بھی نہ ملی۔ مولانا معین الدین کی شادی کو ابھی تھوڑا عرصہ ہوا تھا' شادی والے قیمتی کپڑے اور تمام زیورات اسی ایک گٹھڑی میں تھے۔ فوری طور پر تو اس کا کوئی سراغ نہ ملا' لیکن پاکستان آ جانے کے بعد سراغ تو مل گیا مگر گٹھڑی اور اس کی قیمتی اشیا واپس نہ مل سکیں۔

تقریباً عصر کے وقت ہم نے گاؤں سے سفر کا آغاز کیا تھا۔ دریائے ستلج کی طرف جانے کی بجائے ہم کھائی پھیمکی کی طرف گئے۔ کیونکہ دریا کی طرف ماہتم (سکھ) رہتے تھے' ان سے خطرہ تھا۔

جب ہم مرکز الاسلام سے چلے تھے تو عین چلتے وقت جھوک ٹہل سنگھ کا رہنے والا ایک آدمی جو مسلمان تھا' مرکز کے آس پاس پھرتا دکھائی دیا۔ پتا چلا کہ اس کو سکھوں نے جاسوسی کے لیے بھیجا ہے۔ پہلے تو ہم نے اس کو مار دینے کا خیال کیا لیکن پھر یہ ارادہ ترک کر دیا اور اسی حال میں اسے چھوڑ کر روانہ ہو گئے۔

سفر کی پہلی رات ہم نے کھائی پھیمکی کے سکول میں بسر کی۔ اندھیری اور پرخطر رات' خالی گاؤں ایک عجیب منظر پیش کر رہا تھا۔ گاؤں میں صرف عیسائی موجود تھے۔ اس رات ہماری ایک خوب صورت نوعمر بھینس گم ہو گئی۔ کوئی پتا نہیں چل سکا کہ چوری ہوئی یا کیا ہوا۔ بہر حال صبح فجر کی نماز پڑھ کر پھر چل پڑے۔ ہیڈ گنڈا سنگھ آ پہنچے۔ ہیڈ پر بہت زیادہ رش تھا' اوپر سے گرمی کا موسم۔

بڑے انتظار اور تکلیف کے بعد ہم ہیڈ کے پل سے دریا کراس کرنے میں کامیاب ہوئے۔

ہیڈ گنڈا سنگھ سے چند میل آگے ایک گاؤں ''بجیاں والا'' تھا' وہاں رات بسر کی۔ اس گاؤں کے اکثر لوگ اہل حدیث تھے۔ ہم میں سے کچھ لوگ مسجد میں اور کچھ لوگوں کے گھروں میں رہے۔ گاؤں والوں نے دیگ پکا کر ہمیں چاول کھلائے۔ اگلے روز پھر چل پڑے اور گاؤں ''بازید پور'' پہنچ کر رات کو قیام کیا۔ اس گاؤں میں بھی اہل حدیث حضرات کی اکثریت تھی۔ گاؤں والوں نے ہمیں ایک حویلی خالی کرا کے دے دی۔ اس گاؤں میں ہم ایک ہفتہ رہے۔ کھانے کا اہتمام گاؤں والے ہی کرتے رہے۔ بازید پور سے ڈھنگ شاہ آ گئے۔ یہاں مولانا معین الدین صاحب سے ملاقات ہوئی۔ ان کا خیال تھا کہ ڈھنگ شاہ میں ہی مستقل رہا جائے۔ یہ لکھوی حضرات کا قدیم مسکن تھا۔ بہر حال کافی دن کوئی مہینا بھر وہاں رہے۔

پھر وہاں سے ''بھاگیوال'' اور بھاگیوال سے ہمارا یہ قافلہ ضلع اوکاڑہ کے ایک گاؤں چک نمبر ۱ بدھے والا پہنچ کر قیام پذیر ہوا --- میں ''کھرل کلاں'' میں رک گیا تھا۔ یہ گاؤں ضلع اوکاڑہ اور ضلع قصور کی حد پر واقع ہے۔ گاؤں سے تقریباً تین کلومیٹر دور ہماری زمین ہے جو والد محترم نے تقسیم ہند سے پہلے خرید رکھی تھی --- میں نے اپنی زمین پر رہائش اختیار کر لی اور مستقل طور سے وہیں رہنے کا ارادہ کیا۔ لیکن کچھ عرصے کے بعد لنک نہر ٹوٹ جانے کی وجہ سے علاقے میں سیلاب آ گیا اور مجھے وہاں سے بچوں کو لے کر راتوں رات نکلنا پڑا۔ اس کے بعد دوبارہ وہاں رہائش اختیار نہ کی جا سکی --- (ہندوستان) لکھوکی سے لے کر پاکستان ضلع اوکاڑہ تک راستے میں کسی سے کہیں کوئی تصادم نہیں ہوا۔

تقسیم ہند سے کچھ عرصہ پہلے میں نے یہ خواب دیکھا تھا کہ ملکہ وکٹوریا کا جنازہ رکھا ہوا ہے اور ملک کے نامور علمائے کرام اس کا جنازہ پڑھنے کی تیاری کر

رہے ہیں۔ جنازہ پڑھنے کے لیے جو صف بنائی گئی ہے' وہ بجائے سیدھی ہونے کے گولائی میں ہے۔ درمیان میں ملکہ وکٹوریا کی میت پڑی ہے۔ میں اس صف سے باہر نکل کر پر جوش انداز میں تمام علماے کرام کو مخاطب کر کے کہتا ہوں: تمھیں کیا ہو گیا ہے' ایک کافر عورت کا جنازہ پڑھنے لگے ہو' کوئی خدا کا خوف کرو'۔۔۔بس یہیں میری آنکھ کھل گئی۔

وقت گزرتا گیا لیکن یہ خواب مجھے یاد رہا۔۔۔ پاکستان بننے کے بعد جو پہلے الیکشن ہوئے' لوگوں نے کہہ کہلا کر مجھے اس الیکشن میں کھڑا کر دیا اور اللہ تعالیٰ نے کامیابی دی۔ یہ اس وقت لیجسلیٹو اسمبلیاں تھیں۔ پنجاب کی لیجسلیٹو اسمبلی کا میں رکن (ایم ایل اے) منتخب ہوا تھا۔

پنجاب اسمبلی کی عمارت میں اجلاس ہوا تو میں نے اس میں شرکت کی۔ حلف برداری کی تقریب میں ہر رکن حلف نامہ پڑھ کر دستخط کرتا اور سپیکر سے مصافحہ کر کے باہر نکل جاتا تھا۔ حلف نامے کی عبارت کے الفاظ کچھ اس قسم کے تھے کہ میں پاکستان کے آئین کا ہمیشہ پابند رہوں گا اور تمام آئینی حدود کا احترام اور پابندی کروں گا۔ میں بیٹھا سوچتا رہا کہ یہ شخص اس آئین کی پابندی کا حلف اٹھا رہا ہے جو ابھی بنا ہی نہیں۔ پتا نہیں کیسا آئین بنے گا۔ قرآن وسنت کا اس میں کتنا دخل ہوگا۔

ان خیالات کے ساتھ میرے اضطراب میں اضافہ ہوتا گیا اور جب میری باری حلف اٹھانے کی آئی تو میں نے بڑے پر جوش انداز میں سپیکر کو مخاطب کر کے کہا: ''جناب سپیکر۔! اگر یہ حدود (جن کا حلف نامے میں ذکر ہے) کسی مقام پر اللہ اور اس کے رسول کی حدود سے ٹکرائیں تو پھر کیا صورت ہوگی؟'' اس پر پورے ایوان میں سناٹا چھا گیا۔ سپیکر نے بھی اس بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ صرف مولانا عبدالستار نیازی نے اٹھ کر پر جوش آواز میں کہا کہ پھر ہم اس (حلف نامے کی حدود) کو چھوڑ دیں گے۔۔۔اس کے بعد جھنگ کے ایک معمر

رکن مولانا ذاکر صاحب نے بڑی نحیف آواز میں فرمایا "میں بھی مولانا کی تائید کرتا ہوں۔"

"میں نے اس پر جزاکم اللہ کہا اور دستخط کر کے سپیکر سے مصافحہ کیا اور باہر آ گیا۔

"دروازے سے نکلتے ہی میں نے دیکھا کہ اس کے بالکل سامنے ایک چبوترے پر (جہاں آج کل قرآن مجید کا ایک نسخہ رکھا ہے) ملکہ وکٹوریا کا بت (مجسمہ) نصب ہے۔ اس مجسمے پر نظر پڑتے ہی مجھے اپنا خواب یاد آ گیا اور میں نے سمجھا کہ یہ اس کی تعبیر ہے۔"

مولانا محی الدین کی تحریر یہاں ختم ہوئی۔

بات یہ ہے کہ اس وقت ۱۹۳۵ء کا انگریزی حکومت کا بنایا ہوا ایکٹ چلتا تھا' اسی کے تحت انتخابات ہوئے تھے' وہی اس وقت پاکستان کا آئین تھا اور اسمبلی کے ارکان نے اس کی پابندی کرنے اور اس کی حدود میں رہنے کا حلف اٹھایا تھا۔ حلف اٹھانے والوں میں علمائے کرام بھی تھے' جو کافر حکومت کے بنائے ہوئے آئین کی پابندی کرنے کا اعلان کر رہے تھے۔ اسمبلی کی نشستیں گولائی میں ہیں' جن پر بیٹھ کر پاکستان میں انگریز کے آئین کی وفاداری کا اقرار کیا جا رہا تھا۔

مولانا نے حلف اٹھانے سے قبل سپیکر سے مخاطب ہو کر جو کچھ کہا تھا' وہ اخبارات میں شائع ہوا تھا۔ یہ مئی ۱۹۵۱ء کا واقعہ ہے' جس پر پچاس برس گزر چکے ہیں۔ میں اس وقت اخبار "الاعتصام" سے وابستہ تھا اور ہم نے مولانا محی الدین کے اس اعلان پر "حسن آغاز" کے عنوان سے ۱۸ مئی ۱۹۵۱ء کے "الاعتصام" میں ادارتی شذرہ لکھا تھا۔ اس زمانے کی تاریخ کو تازہ کرنے اور مولانا محی الدین کی اس عہد کی آواز کو آپ کے کانوں تک پہنچانے کے لیے وہ ادارتی شذرہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔ قیام پاکستان کے بعد یہ پہلی آواز تھی جو اس مرد حق آگاہ نے پنجاب اسمبلی میں بلند کی تھی۔

"ہمیں دلی مسرت ہے کہ اب کی پنجاب اسمبلی میں مختلف دروازوں سے ایسے لوگ بھی آئے ہیں جو خالص اسلامی ذہن و فکر کے حامل ہیں اور جن پر یہ احساس

ہر آن طاری رہتا ہے کہ ہمارا ملک صحیح معنوں میں اسلامی روایات اور اسلامی ثقافت کا حامل ہو۔ ان میں ہمارے نوجوان دوست مولانا محی الدین لکھوی قابل ذکر ہیں۔ انھوں نے پنجاب کی مجلس دستور ساز کے پہلے ہی اجلاس میں جس اسلامیت کا ثبوت دیا ہے' اس پر ہر صحیح العقیدہ مسلمان کو خوش ہونا چاہیے۔

''۷ مئی کو پنجاب کی نئی مجلس دستور ساز کا پہلا اجلاس ارکان مجلس سے حلف وفاداری لینے اور سپیکر چننے کے لیے منعقد کیا گیا تھا۔ جب مولانا محی الدین لکھوی کو حلف وفاداری اٹھانے کے لیے بلایا گیا تو انھوں نے معزز سپیکر سے یہ تصریح طلب کی کہ اگر کسی وقت موجودہ آئین کے کتاب وسنت سے متصادم ہونے کی صورت پیدا ہو جائے تو کیا اس وقت کوئی مسلمان اس آئین کا پابند رہ سکتا ہے؟

''مولانا کی حلف وفاداری سے متعلق اس صراحت طلبی پر ایوان سے آوازیں بلند ہوئیں کہ ''ہم ایسی صورت میں اسمبلی سے احتجاجاً نکل جائیں گے''۔۔۔ ہم اس حسن آغاز سے بے حد مسرور ہیں اور سمجھتے ہیں کہ مولانا محی الدین اور دیگر اسلامی ذہن کے ارکان ہر موقعے پر اسلام کے تقاضوں کا پورا پورا خیال رکھیں گے اور غیر اسلامی قوانین کو اسمبلی میں گھسنے نہیں دیں گے۔ ہمیں اس سے بھی قلبی تسکین ہوئی ہے کہ اسمبلی کے ارکان نے ایسے موقعے پر مولانا کے ساتھ تعاون کا وعدہ کیا ہے۔''

مولانا محی الدین لکھوی کی عمر اس وقت ۳۶/۳۵ سال تھی۔ انھوں نے اسمبلی کا انتخاب تو لڑا' اس میں کامیاب بھی ہوئے اور اسمبلی میں یہ اعلان بھی کیا۔ لیکن یہ کام اور اسمبلی کا ماحول ان کے مزاج اور رجحان کے بالکل خلاف تھا' اس لیے جب تک وہ اس کے رکن رہے' ذہنی طور سے ان پر لا یموت فیھا ولا یحیی کی سی کیفیت طاری رہی۔۔۔ لیکن اس کے کئی سال بعد ایوب خاں کے جاری کردہ آئین کے تحت بھی انھوں نے اور مولانا معین الدین نے اس حلقے سے قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات میں حصہ لیا تھا' میں بھی دو تین روز ان کے ساتھ ان کے حلقے میں چکر لگاتا رہا تھا۔

قیام پاکستان سے کچھ عرصہ بعد (جب میں لاہور نہیں آیا تھا) اپنے گاؤں چک نمبر ۵۳ گ ب منصور پور (ضلع لائل پور) میں مقیم تھا) مولانا محی الدین سے ملاقات کے لیے اوکاڑے گیا۔ وہاں سے پتا چلا کہ وہ دیپال پور کے قریب موضع تارا سنگھ میں اقامت گزیں ہیں۔ اس گاؤں کا نام انھوں نے پہلے مرکز الاسلام رکھا تھا۔ پھر اسے الہ آباد سے موسوم کر دیا تھا۔

میں وہاں پہنچا تو مل کر نہایت خوش ہوئے اور فرمایا کہ ان کے نام یہاں کچھ رقبہ الاٹ ہوگیا ہے اور اب یہی ان کا مسکن ہے۔ وہاں ایک شاہ صاحب مقیم تھے' ان کا نام مجھے یاد نہیں رہا' وہ مولانا سے بے حد عقیدت کا اظہار کرتے تھے' ایک کوٹھی نما مکان میں رہتے تھے۔ اس گاؤں میں مولانا کے بعض اور رشتے دار بھی آباد ہو گئے تھے' جن میں مولوی احمد حسن بھی شامل تھے جو ہمارے دوست پروفیسر سعید احمد لکھوی کے والد تھے۔ پروفیسر سعید احمد کی شادی مولانا کی سب سے چھوٹی ہمشیرہ سے ہوئی تھی۔ ان کی ملازمت کا زیادہ عرصہ اسلام آباد میں گزرا' آج کل ریٹائرمنٹ کے بعد ساہیوال میں مقیم ہیں۔

مولانا چاہتے تھے کہ میں بھی ان کے پاس موضع تارا سنگھ (یعنی الہ آباد) میں سکونت اختیار کرلوں۔ انھوں نے میرے لیے زمین کی الاٹ منٹ کا انتظام بھی کر دیا تھا۔ مولوی احمد حسن صاحب مرحوم نے بھی میرے وہاں رہنے کے لیے بہت اصرار کیا' لیکن میرا وہاں جی نہیں لگا۔ سات آٹھ دن ان کے پاس رہا' پھر اپنے گاؤں چلا گیا۔ وہاں سے لاہور آ گیا اور اب تک لاہور میں ہوں۔

مولانا موصوف بلاشبہ مرد صالح تھے اور ان سے ملنے اور ان کی مجلس میں بیٹھنے سے اللہ یاد آتا اور دل نیکی کی طرف راغب ہوتا تھا...... ۱۹۵۴ء کی بات ہے' گرمیوں کے دن تھے' شام کے وقت مولانا محمد حنیف ندوی' جناب محمد فاروق قریشی اور ان سطور کا راقم انارکلی میں حاجی محمد اسحاق حنیف مرحوم کی دکان پر بیٹھے تھے کہ مولانا محی الدین کا ذکر چھڑ گیا اور ان کی صالحیت کی باتیں ہونے لگیں۔ حاجی صاحب مرحوم دلچسپ آدمی تھے۔ کہا آیئے آج ان سے ملنے ان کے گاؤں چلتے ہیں...... حاجی صاحب کے ڈرائیور کا نام عبدالکریم تھا۔ اسے

آواز دی، وہ گاڑی لے آیا اور نماز مغرب کے بعد ہم لاہور سے دیپال پور کو روانہ ہو گئے۔ دیپال پور سے ان کا گاؤں ایک میل کے فاصلے پر ہوگا۔ ہم وہاں پہنچے تو وہ مسجد میں بیٹھے تھے۔ ہماری اچانک آمد پر نہایت خوش ہوئے اور بڑی خاطر تواضع کی۔ گھنٹے سوا گھنٹے کے قریب ہم ان کے پاس رہے اور رات کو تین بجے لاہور واپس آ گئے۔

میرے ایک دوست محمد سعید قادری تھے جو نیشنل بینک کے بڑے افسروں میں سے تھے۔ فقہی مسلک کے اعتبار سے اہل حدیث نہ تھے۔ نیک لوگوں اور اہم شخصیتوں سے ملنے کا انھیں بڑا شوق تھا۔ ۱۹۸۹ء کے مئی کی کوئی تاریخ تھی کہ ان سے میں نے مولانا محی الدین لکھوی کا ذکر کیا۔ فوراً پکار اٹھے، چلیے ان کی خدمت میں حاضری دیں۔

چنانچہ ہم دیپال پور کو روانہ ہو گئے۔ بس سٹاپ پر اترے تو ایک تانگے والے سے پوچھا کہ ایک گاؤں میں مولانا محی الدین رہتے ہیں۔ بات ابھی پوری نہیں ہوئی تھی کہ اس نے کہا آپ مولوی صاحب سے ملیں گے، بیٹھیے میرے تانگے پر......!

پوچھا: وہاں کا کیا کرایہ لو گے؟

کہا: جو مرضی دے دینا۔ آپ کی وجہ سے مولوی صاحب کی زیارت ہو جائے گی۔ وہ راستے میں ان کی نیکی کی باتیں سناتا گیا اور ساتھ ہی مولانا کی اس زمین کی نشان دہی کرتا گیا جو راستے میں پڑتی تھی۔ ہم نے اسے دس روپے دیے۔ نہایت خوش ہوا۔

تانگے سے اتر کر ہم سیدھے مسجد میں گئے۔ یہ نماز ظہر سے کچھ دیر بعد کا وقت تھا۔ مسجد میں ایک صاحب قرآن مجید پڑھ رہے تھے۔ مجھے خیال گزرا کہ یہ مولانا کے صاحب زادے احمد ہوں گے۔ پوچھنے سے پتا چلا کہ میرا خیال صحیح تھا۔ میں نے ان کو بتایا کہ میرا نام اسحاق بھٹی ہے، ہم لاہور سے آئے ہیں اور مولانا کو سلام عرض کرنا چاہتے ہیں۔ احمد صاحب نے میری طرف دیکھا اور کہا آپ کا نام تو بہت دفعہ سنا ہے لیکن ملاقات کا موقع آج ملا ہے۔

انھوں نے گھر جا کر مولانا کو اطلاع دی --- مولانا چند منٹ بعد اس حالت میں تشریف لائے کہ دونوں ہاتھوں میں ٹرے پکڑا ہوا ہے اور ٹرے میں دو شیشے کے گلاس ہیں

اور شیشے ہی کا ایک جگ شربت سے بھرا ہوا ہے۔ السلام علیکم کہہ کر انھوں نے ٹرے فرش پر رکھا اور باری باری ہم دونوں سے معانقہ کیا۔ پھر اپنے ہاتھ سے شربت پلایا اور کھانے کا پوچھا' لیکن ہم کھانا کھا کر گئے تھے۔

کچھ دیر ہم ان کی خدمت میں رہے۔ واپسی کے لیے اجازت مانگی تو فرمایا آج یہیں رہو' کل چلے جانا...... ہم نے معذرت کی تو باہر تک رخصت کرنے آئے اور بچوں سے فرمایا' ان کو گاڑی پر دیپال پور لے جاؤ اور وہاں سے لاہور جانے والی بس پر بٹھا دو۔

سعید قادری ان کے اخلاق حسنہ اور گفتگو سے نہایت متاثر ہوئے...... قادری صاحب میرے حلقہ احباب کے مخلص ترین رکن تھے۔ نومبر ۱۹۹۰ء میں فوت ہوئے' انا للہ وانا الیہ راجعون۔ مولانا لاہور تشریف لاتے تو بعض اوقات مجھے یاد فرماتے اور اس فقیر کی کٹیا میں قدم رنجہ فرماتے' روکھا سوکھا جو پیش کیا جاتا نہایت شوق سے تناول کرتے۔

بہت عرصہ ہوا ایک مرتبہ مولانا محمد حنیف ندوی مرحوم نے مجھے فرمایا کہ مولانا محی الدین یہاں آئیں اور آپ سے ان کا رابطہ ہو تو میں ان سے ملنا چاہتا ہوں۔ چند روز کے بعد مولانا آئے تو میں نے مولانا ندوی کو اطلاع دی اور غریب خانے پر دونوں کو کھانے پر بلایا۔ کافی دیر بعض امور سے متعلق دونوں مصروف گفتگو رہے۔

۱۹۵۸ میں مسئلہ صدارت و امارت کی بحث چلی تھی۔ اس وقت میرا سہ روزہ اخبار ''منہاج'' جاری تھا۔ مولانا محی الدین نے مجھ سے بات کی اور مسئلہ امارت کے موضوع پر تعاون کے لیے فرمایا اور میں نے ''منہاج'' کی خدمات ان کے حوالے کر دیں۔

ایک مرتبہ وہ لاہور کے ایک علاقے مدینہ ٹاؤن میں تشریف لائے جو والٹن کے قریب ہے۔ سخت سردیوں کا موسم تھا۔ مجھے کسی ذریعے سے یاد فرمایا۔ یہ علاقہ میرے گھر سے دس گیارہ میل کے فاصلے پر ہوگا۔ میں نماز عشا کے بعد وہاں پہنچا اور ان کی قیام گاہ پر حاضر ہوا۔ نہایت خوش ہوئے۔ فوراً چائے منگوائی' کھانے کے لیے فرمایا' لیکن میں کھانا کھا کر گیا تھا۔ کچھ دیر وہاں بیٹھا' چند باتیں کیں' پھر اجازت لے کر واپس آ گیا۔

ایک مرتبہ صبح کے وقت حافظ احمد شاکر صاحب نے اطلاع دی کہ مولانا محی الدین

تشریف لائے ہیں اور تمھیں یاد فرما رہے ہیں- چنانچہ میں وہاں پہنچا اور حافظ صاحب کے مکان پر ہم نے اکٹھے ناشتہ کیا-

ان کی ہمیشہ یہ کوشش ہوتی کہ دنیا کے ہنگاموں سے دامن کشاں رہیں- جو لوگ ان سے ملتے اور جہاں وہ جاتے' ان کو اللہ اور اس کے رسول (ﷺ) کے ارشادات سناتے- ان کا زیادہ تر موضوعِ گفتگو موت اور قبر و قیامت کے مسائل ہوتے تھے جنھیں وہ قرآن و حدیث کی روشنی میں بیان فرمایا کرتے تھے-

ایک مرتبہ میں ان کے گاؤں الہ آباد ان سے ملنے گیا- ایک رات وہاں رہا- دوسرے دن مجھے وہ اپنے ساتھ کنگن پور لے گئے- ایک رات ان کے ساتھ وہاں بسر کی' پھر لاہور آ گیا عقیدت مندوں کا ہجوم ان کی رکاب میں رہتا تھا اور لوگ بے حد غور اور توجہ سے ان کے فرمودات سنتے تھے-

وہ پنجابی کے بہت اچھے شاعر تھے- پنجابی اشعار میں ان کی ایک کتاب بھی ہے-

کسی زمانے میں اقبال کے انھیں بہت سے اشعار یاد تھے اور وہ ان کی کتابیں بڑے شوق سے پڑھا کرتے تھے- ایک مرتبہ مرکز الاسلام میں کوئی ورزش کر رہے تھے اور ساتھ ساتھ یہ شعر بھی پڑھتے جا رہے تھے-

جھپٹنا پلٹنا پلٹ کر جھپٹنا لہو گرم رکھنے کا ہے اک بہانہ

ایک دفعہ انھوں نے عجیب لطیفہ پیدا کیا- لاہور آئے اور از راہ کرم میرے گھر تشریف لائے- جہاں وہ بیٹھے تھے' وہاں علامہ اقبال کی کتاب بال جبریل پڑی تھی- کتاب اٹھائی اور اسے پڑھنا شروع کیا- سری قرات تھی- میں نے دیکھا کہ کافی دیر سے ایک ہی صفحے کے ایک ہی مقام پر نظریں جمائے بیٹھے ہیں-

عرض کیا: آپ کو اس صفحے کا کوئی شعر بہت پسند آ گیا ہے کہ اسی کو دل میں بار بار پڑھ رہے ہیں-

فرمایا: اس شعر کو سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں' کچھ پتا نہیں چل رہا ہے اس کا کیا مطلب ہے؟ عرض کیا: کون سا شعر؟

بولے:

"ہواَ ہے" گو تند و تیز لیکن چراغ اپنا جلا رہا ہے
وہ مرد درویش جس کو دیے ہیں حق نے اندازِ خسروانہ

شعر کا پہلا لفظ "ہواَ ہے" سن کر بے ساختہ میری ہنسی نکل گئی۔ عرض کیا، جس طرح آپ شعر پڑھ رہے ہیں، اس طرح تو ساری زندگی آپ اس کا مطلب نہیں سمجھ سکیں گے، نہ اس طرح پڑھنے والا کوئی اور شخص سمجھ سکے گا۔

فرمایا: پھر اسے کس طرح پڑھا جائے؟

عرض کیا: "ہوا" --- ابھی میں نے اتنا ہی لفظ زبان سے نکالا تھا کہ اپنے اندازِ خاص سے مسکرانے لگے --- اور مطلب واضح ہو گیا۔

بعض اوقات اچھا بھلا پڑھا لکھا آدمی معمولی سی بات میں الجھ جاتا ہے۔

اب ہم اس رجل رشید کی حیات مستعار کے آخری دور میں پہنچ گئے ہیں۔ چند لمحوں میں یہ دور بھی ختم ہونے والا ہے اور پھر رہے نام اللہ کا ---!

۱۹۹۷ء کی سردیوں کا موسم تھا اور رات کے نو بجے ہوں گے کہ اوکاڑہ سے مولانا معین الدین لکھوی کا ٹیلی فون آیا، فرمایا بھائی صاحب کی طبیعت بہت ناساز ہے۔ معلوم نہیں تھوڑی دیر کے بعد کیا خبر سننا پڑے۔ آپ گھر میں رہیں اور ٹیلی فون اپنے قریب رکھیں۔ ممکن ہے اخبارات میں کوئی الم ناک خبر دینے کی ضرورت پیش آ جائے۔

مجھے یہ بات سن کر نہایت تشویش ہوئی اور ۱۹۳۷ء سے ۱۹۹۷ء تک کا ساٹھ برس میں پھیلا ہوا طویل عرصہ ایک دم سمٹ کر آنکھوں کے سامنے آ گیا۔ ان کا عالم شباب، ان کا دور کہولت، ان کا بڑھاپا، ان کا چلنا پھرنا، ان کے وعظ و تبلیغ کا سلسلہ، ان کی اصلاحی کوششیں، سب باتیں ایک دم نظروں میں سما گئیں۔

تھوڑی دیر بعد پھر مولانا معین الدین کی طرف سے اسی مضمون کا ٹیلی فون آیا جو تشویش میں مزید اضافے کا باعث بنا اور جس نے ذہن میں اور اضطراب پیدا کر دیا۔ تقریباً ڈیڑھ گھنٹا خاموشی رہی۔ پھر خود میں نے ان سے اوکاڑہ میں رابطہ پیدا کیا تو بتایا کہ

اللہ کا شکر ہے' طبیعت سنبھل گئی ہے- یہ سن کر فوراً زبان سے نکلا-الحمد للہ علی ذالک-

مولانا محی الدین کو کچھ مدت سے جگر کی تکلیف تھی اور یہ تکلیف بڑی باعث تشویش تھی- مجھے اس کا علم اس وقت ہوا' جب میں نے ایک معاملے میں ان کو خط لکھا اور اس خط کے جواب میں انھوں نے اس مرض کی اطلاع دی- یہ ۱۹۹۷ء کے اپریل کی بات ہے- انھوں نے لکھا تھا کہ بہت کم زور ہو گیا ہوں- لکھنے پڑھنے کی بالکل سکت نہیں رہی-

۱۹۹۸ء کے جنوری کا مہینا تھا اور اس کے پہلے ہفتے کی کوئی تاریخ تھی کہ حافظ احمد شاکر نے رات کے وقت مجھے ٹیلی فون کیا کہ مولانا محی الدین لکھوی بیمار ہیں-کل فجر کی نماز کے بعد یہاں سے چلیں اور ان کے گاؤں جا کر ان کی عیادت کریں- انھوں نے یہ بھی کہا کہ فجر کی نماز سے پہلے ہم آپ کو گھر سے لے لیں گے- چنانچہ دوسرے دن نماز فجر سے چند منٹ پہلے حافظ احمد شاکر اور مرحوم قاری نعیم الحق میرے غریب خانے پر آئے- میں ان کا انتظار کر رہا تھا- ہم اسی وقت چل پڑے' میرے گھر سے کچھ فاصلے پر مسجد اہل حدیث میں فجر کی نماز ہم نے حافظ احمد شاکر کی اقتدا میں پڑھی اور دیپال پور کو روانہ ہو گئے- ناشتہ رائے ونڈ کے ایک ہوٹل میں کیا- وہاں سے اپنے دیرینہ دوست عبدالعلیم خاں کے ہاں چونیاں پہنچے- انھوں نے ایک سکول جاری کر رکھا ہے اور وہ اس وقت سکول ہی میں تھے- اصرار کر کے چائے پلائی- اس کے بعد ہم راجووال کو روانہ ہوئے اور مولانا محمد یوسف سے ملے- ان کا ''دارالعلوم کمالیہ'' لب سڑک ہے- وہ ہمیں دیکھ کر بے حد خوش ہوئے- میں وہاں پہلی دفعہ گیا تھا- ایک طویل قامت نوجوان کو انھوں نے آواز دی اور مسرت آمیز لہجے میں کہا: ''عنایت اللہ یہ دیکھو'' نقوش عظمت رفتہ' والے اسحاق بھٹی ہمارے ہاں آئے ہیں''-

مولانا عنایت اللہ وہاں مدرس ہیں اور مولانا محمد یوسف صاحب کے عزیز ہیں-

مولانا محمد یوسف کا شمار ہمارے نہایت مخلص دوستوں میں ہوتا ہے- وہ لکھوی علمائے کرام کے عقیدت مند شاگرد ہیں- ان سے ہم نے مقصد سفر بیان کیا تو وہ بھی ہمارے ساتھ جانے کو تیار ہو گئے- راستے میں ایک جگہ انھوں نے گاڑی رکوا کر پتا کیا کہ مولانا محی

الدین اس وقت کہاں ہیں؟

بتایا گیا کہ اپنے گاؤں الہ آباد میں ہیں اور بیمار ہیں- ہم ان کی خدمت میں پہنچے- وہ تکلیف کے باوجود ملاقات کے لیے باہر آئے- ان کے دو صاحب زادے انھیں لے کر آئے تھے- مولانا نے موت اور قبر و قیامت کی باتیں شروع کر دیں- ان کی آنکھوں سے تیزی کے ساتھ آنسو بہہ رہے تھے- یہ باتیں ہمارے نزدیک "وصیت" سے تعلق رکھتی تھیں اور یہ ان کی زندگی کی ہم سے آخری باتیں تھیں جو ہم سن رہے تھے اور آخری ملاقات تھی- سخت سردی کا موسم تھا- تقریباً ایک گھنٹا ہم ان کی خدمت میں رہے- ان سے جانے کی اجازت طلب کی تو فرمایا چائے پی کر چلے جانا-

آخری ملاقات اور آخری مصافحہ کر کے ہم وہاں سے چل پڑے- واپس آ کر راجووال میں مولانا محمد یوسف کے ہاں کھانا کھایا اور لاہور کو روانہ ہو گئے- آتے ہوئے مولانا یوسف نے ہمیں ایک ایک بوتل شہد کی عنایت کی اور پانچ چھے کلو سیب ہماری گاڑی میں رکھ دیے کہ راستے میں کھاتے جائیں-

اس سے تقریباً ایک ماہ بعد ۲۷ فروری ۱۹۹۸ء کو رات کے آٹھ بجے کے لگ بھگ اوکاڑہ سے مولانا معین الدین نے بذریعہ ٹیلی فون اطلاع دی کہ بھائی صاحب کی حالت بہت تشویش ناک ہے- اگر اخبارات اور ٹیلی ویژن اور ریڈیو کو کوئی اندوہناک خبر دینا پڑی تو اس کا انتظام ہو جائے گا؟

میں نے جواب دیا: اللہ سے دعا ہے کہ ایسا موقع نہ آئے' لیکن اگر خدانخواستہ کوئی حزن انگیز معاملہ پیش آ بھی گیا تو اس کے اعلان کا انتظام ہو جائے گا- اس سے تھوڑی دیر بعد پھر ٹیلی فون کی گھنٹی بجی تو مولانا معین الدین کی آواز آئی کہ بھائی صاحب کی طبیعت زیادہ بگڑ گئی ہے- چند منٹ گزرے تھے کہ تیسری گھنٹی ہوئی- اب انھوں نے بھرائی ہوئی آواز میں جو کچھ بتایا اس کا مطلب یہ تھا کہ زندگی اور موت کے درمیان جو دو چار سانس کا فاصلہ تھا' وہ ختم ہو گیا ہے یعنی وقعت الواقعہ۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اس کے ساتھ ہی ٹیلی فون بند ہو گیا-

چند منٹ کے بعد میں نے ان سے اوکاڑہ میں رابطہ پیدا کیا اور پوچھا: جنازہ کہاں ہو گا اور کس وقت ہو گا؟

مولانا کی وفات اوکاڑہ میں ہوئی تھی۔ دوسرے دن ٹرانسپورٹ کی ہڑتال تھی۔ انھوں نے بتایا کہ ان کے بیٹے کہتے ہیں جنازہ کل نماز ظہر کے بعد ان کے گاؤں (الہ آباد) میں ہو گا۔

میں نے عرض کیا: کل دس بجے ایک جنازہ آپ اوکاڑہ میں پڑھ لیجیے تاکہ اوکاڑہ اور اس کے اردگرد کے لوگ آسانی سے شامل ہو سکیں اور دوسرا جنازہ ظہر کے بعد گاؤں میں پڑھ لیں۔ کل بسوں کی ہڑتال ہے' اوکاڑہ میں جنازہ پڑھ لیا جائے تو اوکاڑہ اور اس کے قرب وجوار کے لوگوں کو تو آنے جانے کی زیادہ تکلیف نہیں اٹھانی پڑے گی۔

انھوں نے فرمایا: میں نے ان کے بیٹوں کو یہ مشورہ دیا تھا' وہ نہیں مانتے۔ اب تم ان سے بات کر لو۔

میں نے بات کی تو مجھے بھی وہی جواب دیا جو مولانا معین الدین کو دے چکے تھے۔ یعنی ہم میت ابھی گاؤں میں لے جائیں گے اور جنازہ اوکاڑہ میں نہیں پڑھا جائے گا' گاؤں ہی میں پڑھا جائے گا۔

اس کے بعد میں نے تمام اخبارات کے دفاتر میں یکے بعد دیگرے ٹیلی فون کیا اور وفات کی خبر لکھوائی جو صبح کو چھپی۔ ٹیلی ویژن اور ریڈیو پر بھی اعلان ہو گیا۔ اخبارات پڑھ کر اور ٹیلی ویژن اور ریڈیو کے اعلان سن کر ٹرانسپورٹ کی ہڑتال کے باوجود بے شمار لوگ دوردراز علاقوں اور شہروں سے الہ آباد پہنچے اور جنازے میں شریک ہوئے۔ لاہور سے بھی بہت لوگوں نے شرکت کی۔ حافظ احمد شاکر' مولوی ابوبکر صدیق' حافظ محمد اشرف سعید' قاری نعیم الحق نعیم اور ان سطور کا راقم اکٹھے لاہور سے چلے اور شامل جنازہ ہوئے۔ ان کے برادر صغیر مولانا معین الدین لکھوی نے جنازہ پڑھایا اور انھیں ۲۸ فروری ۱۹۹۸ء کو ان کی زرعی زمین کے ایک کونے میں دفن کر دیا گیا۔ دنیا کی ۸۴ سالہ زندگی گزارنے کے بعد آخر میں یہی دو تین گز زمین ان کی حصے میں آئی۔

اللھم اغفرلہ وارحمہ وعافہ واعف عنہ

یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ جماعت اہل حدیث کے متعدد اکابر علمائے کرام کی خبر وفات ان کے ضروری حالات کے ساتھ اخبارات میں اس فقیر نے شائع کرائی' ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر بھی اعلان ہوئے اور حتی الامکان میں نے ہر عالم دین کے جنازے میں بھی شرکت کی ہے۔فخر ومباہات کے طور پر نہیں' تحدیث نعمت کے طور پر یہاں یہ بھی عرض کر دیں کہ بعض اکابر علمائے اہل حدیث پر ان کی زندگی میں (جن میں دو لکھوی بزرگ بھی شامل ہیں) اسی فقیر نے لکھا' اس سے پہلے کسی نے نہیں لکھا تھا' حالاں کہ ان کے بے شمار عقیدت مند اور شاگرد موجود تھے جو نہایت فاضل اور سعادت مند حضرات تھے۔مثلاً حضرت مولانا عطاء اللہ لکھوی سے متعلق سب سے پہلے گزارشات اس گنہگار کی (۳ فروری ۱۹۵۰ کے ''الاعتصام'' میں) شائع ہوئیں۔ پھر حضرت مولانا محمد علی لکھوی کے بارے میں ۲۴ مارچ ۱۹۵۰ کے ''الاعتصام'' میں میرا مضمون چھپا۔

اب آخر میں مولانا محی الدین لکھوی کی اولاد نرینہ کے بارے میں---! ان کی اولاد نرینہ علی الترتیب مندرجہ ذیل حضرات پر مشتمل ہے۔

۱۔ حافظ محمد لکھوی: ان کے متعلق مضمون اس کتاب میں درج ہے۔
۲۔ حافظ احمد: گورنمنٹ ہائی سکول دیپال پور میں ٹیچر۔
۳۔ ڈاکٹر محمد حماد لکھوی: استاد شعبہ اسلامیات پنجاب یونیورسٹی۔لاہور
۴۔ حمود لکھوی: استاد گورنمنٹ کالج۔اوکاڑہ
۵۔ حامد لکھوی: استاد عربی (یا اسلامیات) دیپال پور۔
۶۔ حمید لکھوی: استاد عربی (یا اسلامیات) دیپال پور۔
۷۔ زید لکھوی: اسلامیات یا عربی کے لیکچرار گورنمنٹ کالج اوکاڑہ

سب شعبہ تدریس سے منسلک ہیں۔

حافظ عبدالقادر روپڑی

(وفات ۶ دسمبر ۱۹۹۹)

۱۹۳۴ کے مارچ میں انجمن اصلاح المسلمین کوٹ کپورہ (ریاست فرید کوٹ' مشرقی پنجاب) کا سالانہ جلسہ منعقد ہوا- یہ جلسہ ہر سال عام طور سے مارچ کے مہینے میں کیا جاتا تھا اور اس میں خالص تبلیغی اور اصلاحی نوعیت کی تقریریں کی جاتی تھیں- وقتی سیاسیات کے جھمیلوں سے ان جلسوں کا کوئی تعلق نہ تھا- علمائے کرام تشریف لاتے تھے' وعظ فرماتے اور دینی مسائل بیان کرتے تھے' جس سے لوگ نہایت متاثر ہوتے تھے- یہی ان کی ذہنی غذا' یہی فکری امنگ اور یہی دینی ضرورت تھی جو انھیں مناسب اور صحیح مقدار میں حاصل ہو جاتی تھی- اِدھر اُدھر کی بے مقصد سیاسی باتیں جو وقت گزارنے کے لیے مذہبی جلسوں میں موجودہ دور میں کی جاتی ہیں' ان جلسوں میں بالکل نہیں کی جاتی تھیں-

اب صورت حال یہ ہے کہ مقرر جلسے میں کسی سیاسی شخصیت یا سیاسی جماعت پر تنقید کرتا ہے اور کسی کی تعریف کرتا ہے- سامعین کو نہ تنقید سے کچھ حاصل ہوتا ہے' نہ تعریف سے ان کے کچھ پلے پڑتا ہے- البتہ مقرر کو ضرور فائدہ ہو جاتا ہے' وہ ذہنی اور عملی طور سے جس سیاسی جماعت سے وابستہ ہوتا ہے' اس کے سرکردہ ارکان کو یہ باور کرانے کی کوشش کرتا ہے کہ یہ جماعت آپ کے ساتھ ہے اور سیاسی معاملات میں آپ کی ہم آواز ہے اور آپ کی پالیسیوں سے پوری طرح متفق---! میں اس جماعت کا نمائندہ ہوں' آپ الیکشن میں مجھے ٹکٹ دیجیے- یعنی وہ اپنے سیاسی مفاد کے لیے اپنی جماعت کو استعمال کرتا ہے-

یاد رہے یہ سب دھوکا بازی ہے- کوئی مذہبی اور دینی جماعت کبھی کلیۃً کسی ایک سیاسی پارٹی یا سیاسی شخصیت کے ساتھ نہیں ہوتی- ہر مذہبی اور دینی جماعت میں ہر سیاسی ذہن کے لوگ موجود ہیں- وہ صرف مذہب اور مسلک میں باہم متفق ہیں' سیاسیات میں ان کے

رجحانات و میلانات الگ الگ ہیں- کوئی کسی سیاسی جماعت کے اصول و ضوابط کی صحت کا قائل ہے‘ کوئی کسی جماعت کو صحیح سمجھتا ہے---! اور یہ کوئی کفر اور اسلام کا مسئلہ نہیں ہے‘ جس کا جو جی چاہے اپنے علم و مطالعہ کی روشنی میں سیاسی رجحان رکھے---!

میں عرض یہ کرنا چاہتا ہوں کہ روپڑی حضرات کو کوٹ کپورہ کی انجمن اصلاح المسلمین کے سالانہ جلسے میں باقاعدہ دعوت شرکت دی جاتی تھی اور وہ شرکت فرماتے تھے‘ یعنی حضرت حافظ عبداللہ روپڑی اور ان کے دونوجوان بھتیجے‘ حافظ اسماعیل روپڑی اور حافظ عبدالقادر روپڑی کو ان جلسوں کی جان سمجھا جاتا تھا- اگر ان میں سے کوئی نہ آتا تو جلسہ ادھورا قرار پاتا تھا- ۱۹۳۴ کے جلسے میں جس کا آغاز گزارشات میں ذکر کیا گیا ہے‘ یہ حضرات تشریف لائے تھے اور میری ہوش میں یہ پہلا جلسہ تھا‘ اس سے قبل کے جلسوں کا مجھے کچھ پتا نہیں-

۱۹۳۵ کے سالانہ جلسے میں حضرت حافظ عبداللہ روپڑی کے چھوٹے بھائی مولانا حافظ محمد حسین روپڑی بھی تشریف لائے تھے‘ اس سے پہلے یا بعد وہ کبھی تشریف لائے یا نہیں‘ اس کا مجھے علم نہیں- مجھے ان کی صرف ایک ہی دفعہ تشریف آوری کا علم ہے-

۱۹۳۴ کے جلسے میں ایک مناظرہ بھی ہوا تھا- کوٹ کپورہ میں ایک گھر مرزائیوں کا تھا‘ جلسے کے موقعے پر انھوں نے قادیان سے اپنے ایک مبلغ کو بلایا اور مناظرے کی دعوت دی- یہ بالکل اچانک معاملہ تھا- اس وقت جلسہ گاہ میں جو حضرات علما موجود تھے‘ ان میں حضرت حافظ عبداللہ روپڑی‘ حافظ اسماعیل روپڑی‘ حافظ عبدالقادر روپڑی اور مولانا عبدالمجید خادم سوہدروی کے اسمائے گرامی مجھے یاد ہیں- جلسے کے اصحاب انتظام اور ان علمائے کرام کی مختصر سی میٹنگ میں فیصلہ کیا گیا کہ مرزائیوں سے ضرور مناظرہ کیا جائے گا اور مناظرہ حافظ عبدالقادر کریں گے اور مسلمانوں کی طرف سے اس کی صدارت کے فرائض مولانا عبدالمجید سوہدروی انجام دیں گے-

وہ امن کا زمانہ تھا‘ تمام مذاہب کے لوگ نہایت اطمینان اور آپس میں صلح صفائی کے ساتھ زندگی بسر کرتے تھے- کسی طرف سے نہ کوئی شور شرابہ ہوتا تھا‘ نہ ہلڑ بازی کا کوئی تصور

تھا- مذہب کے اختلاف کو لڑائی جھگڑے تک نہیں پہنچایا جاتا تھا- سب لوگ اپنے اپنے مذہب پر عمل کرتے ہوئے ایک حد میں رہتے تھے' اس حد سے آگے قدم نہیں بڑھاتے تھے- وہ حد تھی امن کی' ایک دوسرے کے احترام کی' اپنے سے اختلاف رکھنے والے کے جان و مال کو تحفظ فراہم کرنے کی- چنانچہ اس موقعے پر بھی یہی ہوا-

مرزائی مناظر کو میز کرسی کی سہولت فراہم کر دی گئی- اس کے ساتھیوں کو بھی کھلے دل سے کھلی جگہ دی گئی- وہ نہایت مطمئن اور پرسکون تھے اور انتہائی خوش گوار ماحول---!

بہت بڑا پنڈال اور بہت بڑا مجمع تھا- دن کے دس گیارہ بجے کا وقت ہوگا- جلسے میں مسلمان' سکھ اور ہندو وغیرہ تمام مذاہب کے لوگ موجود تھے اور نہایت دلچسپ صورت حال تھی- مرزائی مبلغ کا نام تو یاد نہیں رہا' البتہ یہ معلوم ہے کہ وہ اچھی خاصی عمر کا تھا- انجمن اصلاح المسلمین کے سٹیج پر حضرت حافظ عبداللہ صاحب (جنھیں اس خاندان میں بڑے حافظ صاحب کہا جاتا ہے) کے علاوہ حافظ اسماعیل صاحب روپڑی اور مولانا عبدالمجید خادم سوہدروی تشریف فرما تھے- مولانا سوہدروی بہت اچھے مقرر اور بہت اچھے منتظم تھے-

ابتدائی تقریر مولانا عبدالمجید صاحب نے کی- انھوں نے فرمایا ہماری طرف سے مناظرے کی کارروائی نہایت امن و سکون سے جاری رہے گی- کوئی شخص کسی قسم کی گڑبڑ نہیں کرے گا- انھوں نے فریق مخالف سے کہا کہ ہمیں امید ہے' وہ بھی امن کی فضا قائم رکھیں گے اور حالات کو بگڑتے نہیں دیں گے- ہمارا کام صرف یہ ہے کہ علمی انداز میں یہ واضح کیا جائے کہ صحیح کیا ہے اور غلط کیا ہے' لڑائی جھگڑا یا دنگا فساد ہرگز ہمارا مقصد نہیں-

اب مناظرے کا آغاز ہوتا ہے- پہلی تقریر کس مناظر نے کی اس کے متعلق کچھ معلوم نہیں- جو بات ذہن میں محفوظ ہے' وہ یہ ہے کہ حافظ عبدالقادر صاحب تقریر کے لیے اٹھے--- کشیدہ قامت' نہایت مناسب کسرتی سا جسم' تیکھی اور قدرے اونچی ناک' تھوڑا سا لمبا چہرہ' نکھرا ہوا گندمی رنگ' تہبند اور قمیص میں ملبوس' سر پر کلے والی مشہدی پگڑی' مقررانہ لہجہ اور کھنک دار آواز' بیس اکیس سال کے خوب رو درشتی جوان---!

خطبہ مسنونہ کے بعد انھوں نے تقریر شروع کی اور اس اسلوب سے اپنے نقطہ نظر کی

وضاحت کا آغاز کیا کہ ہر بات آسانی سے لوگوں کے ذہن میں اترتی اور اپنی جگہ بناتی جاتی تھی۔ بے حد اعتماد اور انتہائی متانت کے ساتھ بولتے اور مضبوط دلائل سے اپنے زاویہ فکر کی وضاحت کرتے تھے۔ مرزائی مناظر کافی عمر رسیدہ اور تجربہ کار تھا' لیکن ادھر اس کے مقابلے میں ایک نو عمر میدان میں کھڑا تھا۔ حضرت حافظ عبداللہ صاحب سٹیج پر تشریف فرما تھے اور حسب ضرورت نوجوان مناظر کو مختلف کتابوں سے حوالے نکال نکال کو دے رہے تھے۔ مجمع دور تک پھیلا ہوا تھا اور بے حد پرسکون---! ہر شخص خاموشی کے ساتھ بدرجہ غایت انہماک وتوجہ کے ساتھ دونوں طرف کے مقررین کی باتیں سن رہا تھا۔ کسی طرف سے کوئی نعرہ بازی نہیں ہوئی اور نہ کسی مقرر کو پریشان کرنے والی کوئی آواز اٹھی---!

حافظ صاحب کی جوانی' کلام کی روانی اور دلائل کی فراوانی سبحان اللہ۔ ان عناصر ثلاثہ کے مجموعے نے خوب سماں باندھا۔ لوگ حیران تھے کہ ایک طرف اچھی خاصی عمر کا تجربہ کار مناظر ہے اور دوسری طرف ایک نو عمر مقرر ہے جو اسے اپنے زور بیان سے بری طرح دبائے جا رہا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ مرزائی مناظر کی گردن حافظ صاحب کے دلائل کی گرفت میں تھی اور اس کی زبان ان کے طرز استدلال کے شکنجے میں لڑکھڑا رہی تھی۔ اب اس کے لیے ہتھیار پھینکنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا' چنانچہ اس نے یہی کیا۔

یہ پہلا مناظرہ تھا جو ہم نے سنا۔ اس سے کئی سال بعد لاہور میں اس مناظرے کے متعلق میں نے حافظ صاحب سے بات کی تو جواب دیا کہ یہ ان کا پہلا مناظرہ تھا۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ ان کے مناظروں کا آغاز ہمارے شہر کوٹ کپورہ سے ہوا اور یہ مناظرہ ان کے آئندہ مناظروں کی رسم افتتاح تھی۔

اب ماہ وسال کا طویل سفر طے کر کے ۱۹۴۵ میں آیے۔ میں اس زمانے میں مرکز الاسلام میں خدمت تدریس انجام دینے پر مامور تھا۔ مرکز الاسلام ۱۹۲۸ کے لگ بھگ موضع لکھوکے سے دو میل کے فاصلے پر حضرت مولانا محمد علی لکھوی مرحوم ومغفور نے قائم کیا تھا۔ یہ کل رقبہ دو مربعے زمین پر مشتمل تھا' اس کی آبادی صرف چار گھروں کو محیط تھی۔ ایک گھر مولانا کا اپنا تھا' ایک مزارع کا' ایک فتح محمد لوہار کا اور ایک قمر دین ترکھان کا---! یہ آبادی

دو یا تین ایکڑ زمین میں تھی۔ باقی ۱۴۷/۴۶ ایکڑ زمین زرعی تھی، جس میں غلہ وغیرہ بویا جاتا تھا۔ ۱۹۴۵ میں مولانا محمد علی لکھوی تو مدینہ منورہ میں اقامت گزیں تھے، البتہ ان کے دو صاحب زادے مولانا محی الدین اور مولانا معین الدین مرکز الاسلام میں سکونت پذیر تھے۔ وہاں جو دارالعلوم قائم تھا، اس کا نام جامعہ محمدیہ تھا، اس میں ایک خاص پیمانے پر طلبا کو قدیم اور جدید تعلیم دی جاتی تھی۔ جو مدرس وہاں فرائض تدریس انجام دیتے تھے، ان میں چودھری غلام حسین تھاڑیہ اور یہ فقیر شامل تھے۔ چودھری غلام حسین تھاڑیہ نے فیروز پور کے آر، ایس، ڈی (رام سکھ داس) کالج سے بی، اے پاس کیا تھا۔ مرکز الاسلام کے قریب ہی ان کا گاؤں تھا اور وہ اس نواح کی ارائیں برادری کے ایک معزز فرد تھے۔ آج کل ضلع قصور کے ایک قصبے تلونڈی میں مقیم ہیں اور میرے نہایت مخلص و محترم دوست ہیں۔ ہمارے ملک کے ممتاز ادیب و صحافی اسد اللہ غالب ان کے داماد ہیں۔

مرکز الاسلام سے تقریباً تین میل کے فاصلے پر ریاست فرید کوٹ میں ایک گاؤں دیپ سنگھ والا تھا۔ اس گاؤں کا انتساب اگرچہ ایک ''سکھ'' کے نام پر تھا، لیکن اس میں مسلمان اچھی خاصی تعداد میں آباد تھے اور زمین جائداد کے مالک تھے۔ مسلمانوں میں احناف کے بریلوی افکار کے حامل بھی تھے اور اہل حدیث حضرات بھی۔۔۔! ۱۹۴۵ میں یا اس کے پس وپیش وہاں مشہور اہل حدیث عالم مولانا عبدالقادر حصاری قیام فرما تھے اور انھوں نے ایک مدرسہ بھی وہاں جاری کیا تھا۔ وہ نہایت مستعد، باہمت، اپنے مسلک پر پوری طرح عامل اور اچھے مقرر و واعظ تھے۔ وہاں کے بریلوی حضرات نے ان کو ''علم غیب'' کے موضوع پر مناظرے کا چیلنج دیا اور کہا کہ نبی ﷺ کو غیب کا علم تھا اور حضورؐ جانتے تھے کہ آئندہ کیا ہونے والا ہے اور ہماری نظروں سے دور کیا ہو رہا ہے۔

مولانا عبدالقادر حصاری نے بریلویوں کا چیلنج قبول کیا اور مناظرے کی شرائط طے کر کے اور وقت و تاریخ وغیرہ مقرر کر کے حافظ عبدالقادر روپڑی کو تشریف لانے کی دعوت دی۔ بریلوی حضرات کی طرف سے مناظر مولانا محمد عمر اچھروی تھے، جیسا کہ ان کی نسبت سکونت سے واضح ہے، وہ لاہور کے علاقہ ''اچھرہ'' کے رہنے والے تھے۔ مئی کا مہینا تھا اور سورج

آگ اگل رہا تھا۔ اس کے ساتھ لو یعنی گرم ہوا نے زور باندھ رکھا تھا۔ اس کے باوجود اردگرد کے بے شمار لوگ دیپ سنگھ والا میں پہنچ گئے تھے۔ مسلمانوں کے علاوہ غیر مسلم بھی کثیر تعداد میں موجود تھے۔ نقشہ کچھ اس قسم کا آنکھوں کے سامنے گھوم رہا ہے کہ جہاں مجلس مناظرہ کے انعقاد کا اہتمام کیا گیا تھا' وہاں پانی کا کچا تالاب تھا جیسا کہ عام طور پر دیہات میں ہوتا ہے اور اس کے اردگرد گھنے سایہ دار درخت تھے۔ ان درختوں کی ٹھنڈی چھاؤں میں دونوں مناظروں کی میز کرسیاں آمنے سامنے رکھ دی گئی تھیں۔ ستاون اٹھاون سال قبل کے مناظرے کی تمام تفصیلات تو ذہن میں محفوظ نہیں رہیں' البتہ یہ دلچسپ منظر اب بھی آنکھوں کے سامنے ہے کہ جب حافظ صاحب کے حریف مولانا محمد عمر اچھروی کے علم کی کشتی مناظرے کے دریا میں ڈگمگانے لگی اور ان کی گفتگو بے چارگی کی سرحدوں پر جا پہنچی تو حافظ صاحب نے اپنے مناظرانہ فن کا ثبوت دیتے ہوئے' سو سو کے پانچ نوٹ' جو اس زمانے میں سبز رنگ کے ہوتے تھے' جیب سے نکالے۔ ان میں سے ایک نوٹ پگڑی کے نیچے ماتھے پر لٹکایا' دو اسی طرح پگڑی کے نیچے سے ایک ایک کر کے دونوں کانوں پر لٹکائے اور دو نوٹ دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر بہ آواز بلند حریف کو مخاطب کر کے للکارا:۔

''مولوی صاحب! اگر آپ میرے سوالوں کا صحیح جواب دے دیں تو چھتروں جیسے یہ پانچ سبز نوٹ آپ کی خدمت میں پیش کر دیے جائیں گے۔''

یہ اس میدان مناظرہ میں حافظ صاحب کے آخری الفاظ تھے' جنھیں سننے کے بعد مولانا محمد عمر اچھروی کو اپنی جگہ سے اٹھنے کی ہمت نہیں ہوئی' اور اس طرح یہ مناظرہ اختتام کو پہنچ گیا۔

حافظ صاحب کی تقریریں بھی بہت سنیں' ان کی اقتدا میں متعدد مرتبہ نماز جمعہ بھی پڑھی اور ان کے خطبات سننے کی سعادت بھی حاصل ہوئی۔ لیکن ان کے مناظرے دو ہی سننے کا اتفاق ہوا۔ بلاشبہ وہ بہت کامیاب مقرر اور حاضر جواب مناظر تھے۔ حریف کو گرفت میں لانے اور اس کے سوالات کا ترکی بہ ترکی جواب دینے کے فن میں کامل مہارت رکھتے تھے۔

بعض حضرات کہا کرتے ہیں کہ مناظرے سے کوئی مسئلہ حل نہیں ہوتا۔ یہ محض فریقین

کے علم کی نمائش کا ذریعہ ہے۔ دو شخص اکھاڑے میں اترتے ہیں اور ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کے لیے علم کی کشتی شروع کر دیتے ہیں۔ اس سے تلخیاں بڑھتی ہیں اور دلوں میں کدورتوں کے جراثیم جنم لیتے ہیں۔ لیکن مجھے اس نقطہ نظر سے اتفاق نہیں۔ میرے خیال میں مناظرے سے صحیح اور غلط میں امتیاز کی راہیں کھلتی ہیں۔ سچ اور جھوٹ میں فرق کا پتا چلتا ہے۔ مسائل نکھرتے اور حقائق کھل کر سامنے آتے ہیں۔

میں تو کہتا ہوں کہ کسی صاحب قلم کو ہمت کر کے ان اہل علم کے حالات لکھنے چاہئیں جو برصغیر میں عیسائیوں' آریہ سماجیوں' سناتن دھرمیوں' مرزائیوں اور دیگر مذاہب و مسالک کے حاملین سے مناظرے کرتے رہے ہیں۔ مناظروں کی تفصیلات معلوم کرنے کی کوشش بھی کرنی چاہیے۔

بہت سے لوگ مناظروں سے متاثر ہو کر راہ راست پر آئے اور کسی اہم مسئلے میں فریقین کے دلائل سننے کے بعد ان پر حقیقت واضح ہوئی اور وہ صراط مستقیم پر گام زن ہوئے۔

مسلک اہل حدیث سے وابستہ مناظر حضرات میں سے حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی' مولانا ثناء اللہ امرتسری' مولانا محمد بشیر سہسوانی' مولانا محمد ابراہیم سیالکوٹی' مولانا ابوالقاسم بنارسی' مولانا احمد الدین گکھڑوی' حافظ عبدالقادر روپڑی' مولانا عبداللہ معمار' مولانا نور حسین گھرجاکھی اور دیگر متعدد بزرگان دین شامل ہیں۔ ان کے حالات کے ساتھ اگر کوئی صاحب ان کے مناظروں کی تفصیل (جو میسر آئے) لکھ دیں تو میرے خیال میں یہ بڑی خدمت دین ہوگی اور تبلیغ اسلام کی تگ و دو کے سلسلے کا ایک دلچسپ گوشہ لوگوں کے علم و مطالعہ میں آئے گا۔

کسی کے حالات میں صرف یہ لکھ دینا کافی نہیں کہ وہ بہت بڑے مناظر تھے اور اپنے حریف کو چند لمحوں میں خاموشی اختیار کرنے پر مجبور کر دیتے تھے۔۔۔ اس کی مثالیں دینی چاہئیں اور بتانا چاہیے کہ انھوں نے کس عالم سے کس مقام پر' کس موضوع سے متعلق مناظرہ کیا اور پھر اس کا کیا نتیجہ نکلا۔ فریقین کی باہمی گفتگو کا کوئی حصہ یاد ہو یا کسی سے سنا ہو

یا کہیں پڑھا ہو تو اس کا تذکرہ ضرور کرنا چاہیے۔ یہ کام محنت طلب تو بے شک ہے لیکن میرے خیال میں ہے بڑا مفید اور دلچسپ ---افسوس ہے ہم اپنے علمائے کرام کے حالات اور بزرگانِ دین کے واقعات جمع کرنے' ایک خاص ترتیب کے ساتھ انھیں محفوظ کرنے اور ضبط تحریر میں لانے کے عادی نہیں ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمیں ان کے متعلق بعض بنیادی باتوں کا بھی علم نہیں ہوتا اور جب لکھنے کی ضرورت پیش آتی ہے تو بے حد پریشانی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

آج سے کم و بیش دو سو سال قبل پنجاب میں اہل حدیث کے دو خاندان ایسے تھے' جو درس و تدریس کے میدان میں بھی سرگرم عمل تھے' تصنیف و تالیف کے مختلف شعبوں میں بھی ان کی تگ و تاز جاری تھی اور روحانی اعتبار سے بھی لوگ ان سے فیض حاصل کرتے تھے۔ وہ تھے لکھوی حضرات اور غزنوی علمائے کرام---! لیکن نہایت الم انگیز تعجب کی بات ہے کہ ان دونوں خاندانوں کی کوئی مستند تاریخ ہمارے سامنے نہیں ہے۔ اس وقت ہمارے ہاں درس و تدریس کے جو سلسلے جاری ہیں اور جو مدرسین عظام یہ خدمت سرانجام دے رہے ہیں' بالواسطہ یا بلاواسطہ انہی خاندانوں کے فیض یافتہ ہیں۔ روپڑی خاندان کے اکابر نے بھی انہی سے استفادہ کیا تھا۔ اب بھی ان لائق احترام خاندانوں میں علم و عمل کے چرچے ہیں' اور ان کے مدارس جاری ہیں' لیکن ان خاندانوں میں سے کسی صاحب علم نے نہ خود اپنے بزرگوں کے حالات قلم بند کیے' نہ کسی سے کرائے۔ غزنویوں کے سوا اس وقت باقی زیادہ تر حضرات وقتی سیاسیات کے بے مقصد جھمیلوں میں پھنسے ہوئے ہیں۔ اگر ان کے بزرگوں کے بارے میں (جو یقیناً ہمارے بھی بزرگ ہیں) کوئی کچھ لکھے بھی تو ان کو اس کے پڑھنے کی توفیق نہیں ہوتی۔ فضول قسم کی سیاست بازی سے وقت ملے تو اسے پڑھیں۔ سیاست میں دیوبندی حضرات بھی حصہ لیتے ہیں اور ان سے کہیں زیادہ حصہ لیتے ہیں' لیکن وہ اپنے بزرگوں کے علمی اور عملی کارناموں کو بھی تحریری اور تقریری طور سے اجاگر کرتے رہتے ہیں' بلکہ بعض اہل قلم کو انھوں نے تحریری خدمت پر مقرر کر رکھا ہے اور ان کی تحریریں وہ دلچسپی سے پڑھتے ہیں' ان کے پاس جاتے ہیں انھیں مشورے دیتے ہیں اور ان کے لیے معلومات

فراہم کرتے ہیں- جماعت اہل حدیث کے "سیاست دانوں" کی طرح اپنے بزرگوں کو انھوں نے بھلایا نہیں-

ہمارے لیے ذہنی اعتبار سے یہ نہایت اذیت ناک قصہ ہے کہ ہم اپنے اکابر کی علمی اور عملی سرگرمیوں سے بہت حد تک نا آشنا ہیں- اب ہم حافظ عبدالقادر روپڑی کے اکابر کی طرف آتے ہیں اور چند لمحے ان کی روحانی اور علمی مجالس میں گزارنے کی سعی کرتے ہیں- یہ پاک باز اور تقویٰ شعار لوگ ہیں' ان کے باب عالی پر دستک دینا' ان کی مجلسوں میں حاضر ہونا اور ان کے تذکار میں وقت گزارنا' کارثواب اور عمل خیر ہے- آیئے کچھ پیچھے چل کر ان بزرگوں کو تلاش کرنے کی کوشش کریں-

اس خاندان کے بزرگوں کے نہایت مختصر حالات مولانا محمد صدیق مرحوم (سرگودھا) نے "فتاویٰ اہل حدیث" کے شروع میں تحریر فرمائے ہیں جو صرف چودہ صفحات پر مشتمل ہیں- کیا ان کے حالات صرف اتنے ہی ہیں اور یہی ان کی تاریخ ہے؟ کسی روپڑی عالم دین نے اپنے اکابر کے بارے میں نہیں لکھا- اگر کسی نے کچھ لکھا بھی ہے تو چھپا نہیں- اس لکھنے کا کیا فائدہ' جسے شائع کرنے کی ضرورت نہیں محسوس کی جاتی- میرا یہ پیرایۂ بیان بے شک بعض لوگوں کے نزدیک سخت ہو گا' لیکن ہے مبنی برحقیقت-! بہرحال ہم مولانا محمد صدیق مرحوم صاحب کے شکرگزار ہیں جنھوں نے اختصار کے ساتھ ہی سہی' ہمیں کچھ نہ کچھ دیا تو ہے-

اس خاندان کا اصل تعلق موضع ایمن آباد (ضلع گوجرانوالہ) سے تھا- بیان کیا جاتا ہے کہ رنجیت سنگھ کے دور حکمرانی میں کسی خدمت کے صلے میں ان کے کسی بڑے شخص کو ضلع امرتسر کے علاقہ کمیر پور کی جاگیر عطا ہوئی تھی جو پانچ سو ایکڑ پر مشتمل تھی- یہ خاندان اس جاگیر کی وجہ سے ایمن آباد کی سکونت ترک کر کے یہیں آ گیا تھا-

اس خاندان کے ایک بزرگ میاں روشن دین تھے جو علم وعلماء سے بے حد تعلق رکھتے تھے- وہ ۱۳۰۱ھ (۱۸۸۴ء) کو حصول علم کے لیے حضرت حافظ محمد لکھوی رحمتہ اللہ علیہ کی خدمت میں "لکھو" کے گئے اور وہاں کے نصاب کے مطابق علم حاصل کیا- وہ اپنی آل اولاد

کو بھی حصول علم کی راہ پر لگانے کے خواہاں تھے۔ اس میں اللہ تعالیٰ نے ان کی مدد فرمائی اور ان کی آئندہ نسل تحصیل علم کی راہ پر قدم زن ہوئی۔ روشن دین نے ۲۲ جولائی ۱۹۲۴ (۲۷ ذی الحجہ ۱۳۴۲ھ) کو روپڑ میں وفات پائی اور وہیں دفن کیے گئے۔

میاں روشن دین کے سات بیٹے تھے اور ایک بیٹی---! بیٹوں کے نام علی الترتیب یہ ہیں: رکن الدین' رحیم بخش' حافظ عبداللہ' عبدالواحد' عبدالقادر' حافظ محمد حسین اور حافظ عبدالرحمٰن---! بیٹی کا نام فاطمہ تھا جو عبدالقادر سے چھوٹی اور حافظ محمد حسین سے بڑی تھیں۔ وہ چھ برس کی عمر میں کمیر پور کے قریب پانی کے ایک نالے میں ڈوب کر مر گئی تھیں۔

میاں رحیم بخش جو حضرت حافظ عبداللہ صاحب سے عمر میں بڑے تھے' ۱۳۰۱ھ (۱۸۸۴ء) کو کمیر پور میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے موضع ڈوبہ کے ایک بزرگ مولوی عبداللہ سے قرآن مجید پڑھا۔ کچھ اور تعلیم بھی حاصل کی۔ کاشت کار بھی تھے اور تجارت بھی کرتے تھے---! بے حد جفاکش اور باہمت شخص تھے۔ انھوں نے ۵ صفر ۱۳۵۳ھ (۲۰ مئی ۱۹۳۴ء) کو کمیر پور میں وفات پائی۔

اس خاندان کو جب کمیر پور کے علاقے میں پانچ سو ایکڑ کی جاگیر ملی تھی' اس وقت اس کے تمام افراد ایمن آباد سے کمیر پور چلے گئے تھے اور ''کمیر پوری'' کی نسبت سے پکارے گئے۔ پھر جب خاندان کے افراد بڑھنے لگے اور جاگیر تقسیم در تقسیم کے مراحل طے کرتی ہوئی سکڑنے لگی تو ان میں سے بعض لوگ مختلف مقامات میں جا بسے اور بعض وہیں رہ گئے اور پھر اسی نسبت سے شہرت پائی' جہاں سکونت پذیر ہوئے تھے' مثلاً حضرت حافظ عبداللہ صاحب جو تکمیل تعلیم کے بعد ۱۹۱۴ میں روپڑ کی جماعت اہل حدیث کے اصرار پر روپڑ چلے گئے تھے' ''روپڑی'' کی نسبت سے مشہور ہوئے اور جو کمیر پور رہ گئے تھے' وہ ''کمیر پوری'' کہلائے۔ لیکن یہ حضرات جہاں بھی رہے' درس و تدریس' اشاعت مسلک اور تبلیغ دین کی خصوصیات ان کے ساتھ رہیں۔ تحریر و نگارش اور مخالفین اسلام سے مباحث و مناظرات کے اوصاف سے بھی یہ لوگ متصف تھے۔ ان کی اولاد کی کثیر تعداد حفظ قرآن کی نعمت سے متمتع

ہوئی- اب بھی ان میں بہت سے افراد قرآن مجید کے حافظ ہیں- یہ اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا احسان ہے' جس سے یہ بہرہ ور ہوئے-

میاں رحیم بخش مرحوم کے (جو حافظ عبداللہ صاحب سے عمر میں بڑے) تھے' چار بیٹے تھے اور چاروں حافظ قرآن تھے- سب سے بڑے حافظ محمد' ان سے چھوٹے حافظ محمد اسماعیل' ان سے چھوٹے حافظ عبدالقادر اور سب سے چھوٹے حافظ محمود احمد---! میری یہ خوش بختی سمجھے کہ میری ان چاروں سے آشنائی تھی-

حافظ محمد' تقسیم ملک سے کافی پہلے سے لاہور میں اقامت گزیں تھے اور ماڈل ٹاون کے جے بلاک کی کوٹھی نمبر ۱۸ میں رہائش پذیر تھے- انھیں ''مولوی محمد احمد خان'' کہاں جاتا تھا اور اپنے حلقہ احباب میں ''مولوی صاحب'' کے عرف سے معروف تھے- طویل قامت اور نکھرے ہوئے گندمی رنگ کے خوب صورت آدمی' خوش پوش اور وجیہ---! کھلے پائچے کا کھدر کا پاجامہ پہنتے تھے' سردیوں میں گرم شیروانی زیب تن ہوتی تھی- چھوٹی داڑھی اور سر ننگا- ان کی چھوٹے سائز کی سیاہ رنگ کی کار تھی جسے وہ خود ہی چلاتے تھے- سیاسی اعتبار سے کانگرسی تھے اور مولانا ابوالکلام آزاد کے انتہائی مداح---! مولانا نے اپنے بعض خطوط میں (جو انھوں نے مولانا غلام رسول مہر کے نام تحریر فرمائے تھے) ان کا ذکر کیا ہے- اپنی مشہور کتاب ''غبار خاطر'' کی اشاعت کے سلسلے میں لاہور کے جن حضرات سے مولانا نے رابطہ قائم کیا تھا' ان میں ہمارے ممدوح مولوی محمد احمد خاں بھی شامل تھے-

تقسیم ملک سے قبل ان کی شادی مولانا ظفر علی خاں کی بھانجی سے ہوئی تھی- یہ خاتون شاعرہ تھیں اور ان کے نام کا ایک جز ''اختر'' تھا- مولوی صاحب کانگرسی تھے اور یہ مسلم لیگ سے تعلق رکھتی تھیں- ۱۹۴۵ کا الیکشن بھی انھوں نے پنجاب کے کسی حلقے سے کانگرس کے ٹکٹ پر لڑا تھا- اردو بازار کا پہلا نام موہن لال روڈ تھا' کچہری کی طرف سے اس بازار میں داخل ہوں تو بائیں جانب ایک بہت بڑی بلڈنگ ہے' اس میں مولوی محمد احمد خاں کا پریس تھا' جس کا نام انھوں نے مولانا ابوالکلام آزاد کے ہفت روزہ ''البلال'' کے نام پر ''البلال پریس'' رکھا تھا- ہمارا اخبار ''الاعتصام'' ابتدا میں حجازی پریس میں چھپتا تھا جو اردو بازار کے

باہر سرکلر روڈ پر موری دروازے کے سامنے تھا- اس زمانے میں ''الاعتصام'' گوجرانوالا سے شائع ہوتا تھا- میں منگل کے روز گوجرانوالا سے اخبار چھپوانے کے لیے لاہور آتا تھا اور بوریوں میں بند کر کے بذریعہ بس گوجرانوالا لے جاتا تھا- وہاں کے بڑے ڈاک خانے میں اخبار حوالہ ڈاک کیا جاتا تھا-

میں کبھی اردو بازار میں جاؤں اور ''البلال پریس'' والی بلڈنگ کے سامنے سے گزروں تو فوراً مولوی محمد احمد خان یاد آ جاتے ہیں- اس بلڈنگ کا وہی بڑا سا گیٹ ہے اور گیٹ کے اندر اچھا خاصا کھلا صحن ہے' لیکن اب اس کے آگے اور جنوبی جانب کتابوں اور کاغذ وغیرہ کی دکانوں کا ایک جال بچھا ہوا ہے- بلڈنگ کے بڑے گیٹ کے اندر ڈیوڑھی میں مولوی صاحب کی کارکھڑی ہوتی تھی- ایک میز اور تین چار کرسیاں تھیں اور ایک کونے میں ان کے لیٹنے کے لیے ایک چارپائی تھی- صحن میں ایک بڑے سے ہال کمرے میں چھپائی کی مشینیں نصب تھیں-

میں مرکزی جمعیت اہل حدیث کے آفس سیکرٹری کی حیثیت سے ۱۹۴۸ میں لاہور آیا تو جلد ہی مولوی محمد احمد خاں سے تعلقات پیدا ہو گئے تھے- پھر اگست ۱۹۴۹ء میں ''الاعتصام'' جاری ہوا تو میں اس سے وابستہ ہو گیا- ایک دن انھوں نے مجھ سے کہا کہ میں اہل حدیث بھی ہوں اور ہمارے باہمی تعلقات بھی ہیں' لیکن تم اخبار میرے پریس میں نہیں چھپواتے' اس کی کیا وجہ ہے؟ میں نے جواب دیا' آپ نے ٹھیک کہا--- ان شاء اللہ جلد ہی آپ کے پریس سے اخبار چھپوانا شروع کر دیا جائے گا-

گوجرانوالا جا کر میں نے حضرت مولانا محمد اسماعیل سلفی رحمتہ اللہ علیہ سے عرض کیا تو انھوں نے مجھ سے حیران ہو کر پوچھا! مولوی محمد احمد نے پریس کا کام شروع کیا ہے؟ اگر ان کا اپنا پریس ہے تو پھر اخبار وہیں سے چھپنا چاہیے- اب مولانا نے میرے ہاتھ انھیں خط بھیجا' جس میں مومن خاں مومن کا یہ شعر لکھا-

کبھی ہم میں تم میں بھی چاہ تھی' کبھی ہم سے تم سے بھی راہ تھی
کبھی ہم بھی تم بھی تھے آشنا' تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

پہلی بیوی اختر کی وفات کے بعد مولوی محمد احمد خاں نے دوسری شادی گوجرانوالا کے قریبی گاؤں کھوکھر کے میں کی تھی- سنا ہے ان کا ایک ہی لڑکا ہے- اس لڑکے سے میری کبھی ملاقات نہیں ہوئی- اس وقت کا یہ لڑکا اب جوانی کی منزل بھی طے کر چکا ہوگا اور ماشاء اللہ اچھا خاصا "بھائی" ہوگا جو خود لڑکوں اور لڑکیوں والا ہوگا- ممکن ہے اس سے بھی آگے بڑھ کر نوبت پوتے پوتیوں تک پہنچ گئی ہو-

پہلے بتا چکا ہوں کہ مولوی صاحب سیاسی افکار کے اعتبار سے کانگرسی تھے اور کانگرسی ہونا کوئی بری بات نہ تھی- گزشتہ دور کی سیاسیات سے بعض ناآشنا لوگ شاید ان کے کانگرسی ہونے پر حیرت کا اظہار کریں- انھیں یاد رکھنا چاہیے کہ حصول آزادی کا ایک طویل پس منظر ہوتا ہے- آزادی کی رانی کسی ایک ہی دروازے سے صحن چمن میں داخل نہیں ہوتی- مختلف دروازوں پر دستک دیتی ہوئی' ایک دروازے پر آ رکتی اور اس کے ذریعے اندر قدم رکھتی ہے- برصغیر کی آزادی کا بھی طویل پس منظر ہے- اس میں کانگرس کا بھی حصہ ہے' مسلم لیگ کی کوششیں بھی اس میں کارفرما ہیں' مجلس خلافت' جمعیت علمائے ہند' آل انڈیا مومن کانفرنس' مجلس احرار' نوجوان بھارت سبھا' بنگال کی فرائضی تحریک' کمیونسٹ پارٹی اور سوشلسٹ پارٹی وغیرہ تمام سیاسی جماعتوں کی تگ و تاز کے نتیجے میں برصغیر آزاد ہوا اور پاکستان نقشہ عالم پر ابھرا--- یہاں میں واضح لفظوں میں عرض کروں گا کہ برصغیر کی آزادی میں سب سے زیادہ جدوجہد کرنے اور جانی اور مالی قربانیاں دینے والی جماعت مجاہدین کی ہے جو خالص اہل حدیث مسلک سے تعلق رکھنے والوں کی جماعت تھی اور جس کی قیادت کی باگ دوڑ حضرت مولانا اسماعیل شہید دہلوی اور سید احمد شہید رائے بریلوی کے ہاتھوں میں تھی- ان پاک باز حضرات نے ۱۸۲۶ء میں انگریزی حکومت کے خلاف سلسلۂ جہاد شروع کیا تھا جو آزادئ برصغیر ۱۹۴۷ء تک جاری رہا- اس جماعت نے ایک سو اکیس برس عمر پائی- برصغیر کی سب سے طویل عمر کی یہی جماعت مجاہدین ہے' جس کے آثار اب بھی باقی ہیں- اس کے بارے میں انگریزی اور اردو میں بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں' انگریزوں نے بھی اس تحریک کی تفصیلات بیان کی ہیں اور

مسلمانوں نے بھی اس کے متعلق بہت کچھ لکھا ہے۔ اہل حدیث حضرات کا فرض ہے کہ وہ برصغیر کی آزادی کا کریڈٹ اسی جماعت مجاہدین کو دیں۔ دوسری کسی سیاسی اور اسلامی جماعت کو اس پر ترجیح نہیں دینی چاہیے۔

لیکن تعجب کی بات ہے آج کل کے بعض اہل حدیث مضمون نگار جماعت مجاہدین کو نظر انداز کر کے مسلم لیگ کی تعریف میں جتے ہوئے ہیں۔ اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے' اس فقیر کا کبھی مسلم لیگ سے تعلق نہیں رہا۔ اب اگر خدانخواستہ تعلق قائم بھی کریں تو کس مسلم لیگ سے کریں۔ مسلم لیگ کی بہت سی قسمیں سامنے آئی ہیں' مثلاً مسلم لیگ (نواز) مسلم لیگ (پگاڑا) مسلم لیگ (جونیجو) مسلم لیگ (چٹھا) مسلم لیگ (منظور وٹو) مسلم لیگ قاسم' مسلم لیگ قائد اعظم' مسلم لیگ زہری' مسلم لیگ چودھری' یقیناً اس کی اور قسمیں بھی ہوں گی' لیکن میں قسمیں بیان کرتا کرتا تھک گیا ہوں۔ آپ بھی پڑھتے پڑھتے تھک گئے ہوں گے۔ میں نے کسی اخبار میں پڑھا تھا' ایک ''جٹکی مسلم لیگ'' بھی بنی ہے ''جٹکی مسلم لیگ'' بنانے والوں کا کہنا ہے کہ پہلی تمام مسلم لیگیں زمینداروں' سرمایہ داروں اور صنعت کاروں کی ہیں' کوئی سیدھے سادے جاٹ قسم کے لوگوں کی مسلم لیگ بھی ہونی چاہیے' چنانچہ انھوں نے اپنی مسلم لیگ کا نام ''جٹکی مسلم لیگ'' رکھ لیا۔ دعا ہے اللہ اس میں مزید برکت پیدا کرے' آمین۔

مسلم لیگوں میں اضافوں کی یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ طویل عرصے سے یہی سلسلہ چلا آرہا ہے' جناح مسلم لیگ' جناح عوامی مسلم لیگ' داؤدی مسلم لیگ' شفیع مسلم لیگ وغیرہ اس معصومہ کے کئی نام تھے۔

آدمی گھر کی بات کیا بتائے' حقیقت یہ ہے کہ اپنی جماعت اہل حدیث کا بھی یہی حال ہے۔ میرے جیسے آدمی کے لیے جو حساب کتاب نہیں جانتا' اس کے ناموں کا بھی شمار قطار میں لانا مشکل ہے۔

جماعت اسلامی کو بہت منظم جماعت کہا جاتا ہے' اس کا بھی تقریباً یہی حال ہے۔ اس کے بانی مولانا ابوالاعلیٰ مودودی تو اپنی زندگی ہی میں اس سے علیحدہ ہو گئے تھے۔ اس کے

کچھ حصے پر نظام خلافت کے نام سے ڈاکٹر اسرار احمد نے قبضہ کر لیا' کچھ حصے پر تحریک اسلامی کے نام سے جناب نعیم صدیقی صاحب قابض ہو گئے' کچھ حصے پر جماعت اسلامی مودودی گروپ کے عنوان سے مولانا مرحوم کے صاحب زادہ گرامی سید حیدر فاروق مودودی نے تسلط جما لیا اور مولانا امین احسن اصلاحی' مولانا عبدالرحیم اشرف' عبدالجبار غازی' مولانا محمد منظور نعمانی' مولانا ابوالحسن علی ندوی' مولانا نذیر الحق میرٹھی اور مولانا عبدالغفار حسن کی طرح کے بہت سے بزرگانِ عالی قدر مولانا مودودی کی موجودگی ہی میں جماعت کے اسلام سے خارج ہو گئے تھے۔ لیکن اس کے باوجود سننے میں آیا ہے کہ یہ جماعت منظم ہے اور اس میں کبھی کہیں دراڑ نہیں آئی۔

بات مولوی محمد احمد خاں کے بارے میں ہو رہی تھی۔ جی چاہتا ہے' اپنے اس مرحوم بزرگ دوست پر مستقل مضمون لکھا جائے۔ ان کی بہت سی باتیں یادداشتوں کی تہہ سے اچھل کر حافظے کی سطح پر آ کھڑی ہوئی ہیں۔ ایک دن میں نے ان سے کہا آپ اپنے نام کے ساتھ ''خان'' کا اضافہ کیوں کرتے ہیں' جب کہ آپ پٹھان نہیں ہیں۔

بولے: کیا ''خان'' کا لفظ اللہ تعالیٰ نے پٹھانوں کو لکھ کر دے دیا ہے کہ تم ہی اس کے حق دار ہو اور کوئی اس کا حق دار نہیں ہے۔ تمھارے سوا کوئی شخص اپنے نام کے ساتھ یہ لفظ لکھنے کا مجاز نہیں --- مجھے یہ لفظ پسند ہے' میں اسے اپنے نام کے ساتھ لکھتا ہوں' اور بھی جس کا جی چاہے لکھے' کوئی اسے روک نہیں سکتا۔ آپ بھی اپنے نام کے ساتھ ''خان'' لکھا کریں۔

دہلی سے ایک کتاب چھپی ہے' جس کا نام ہے ''باتیں لاہور کی''۔ اس کے مصنف کا نام ہے' آنند سوئم۔ مصنف ماڈل ٹاؤن میں مولوی صاحب کا ہمسایہ تھا۔ میں نے کتاب کی فہرست مضامین دیکھی تو ایک عنوان تھا ''مولوی صاحب''۔ فوراً میرے ذہن میں آیا کہ اس سے مولوی محمد احمد مراد ہوں گے۔ چنانچہ میں نے کتاب کے متن کا صفحہ نکال کر دیکھا تو مضمون انھی سے متعلق تھا۔ اس مضمون کے علاوہ بھی کتاب میں دو تین مقامات پر مولوی صاحب کا ذکر آیا ہے۔ مصنف ہندو ہے جو آزادی کے بعد اپنے

خاندان کے ساتھ لاہور سے دہلی چلا گیا تھا- اس نے کتاب میں لاہور کے اپنے مسلمان ساتھیوں اور یہاں کی مختلف شخصیتوں کا دلچسپ انداز میں تذکرہ کیا ہے' جن میں مولوی محمد احمد بھی شامل ہیں-

مولوی صاحب کے خاندان کے بارے میں تو مجھے معلوم نہیں کہ یہ حضرات انھیں کیا کہتے تھے' لیکن ان کے حلقہ تعارف کے متعلق میں جانتا ہوں کہ ہر شخص انھیں ''مولوی صاحب'' کہہ کر پکارتا تھا' یہاں تک کہ خود وہ بھی کسی کو ٹیلی فون کرتے تو فرماتے ''میں مولوی محمد احمد خاں بول رہا ہوں''- یا کسی کو کسی کے پاس کسی کام سے بھیجتے تو فرماتے: ''اس سے کہو مولوی صاحب نے مجھے اس کام سے بھیجا ہے''-

اسی طرح ہمارے فیصل آباد کے دوست مولانا عبیداللہ احرار مرحوم کو ان سے تعلق رکھنے والا ہر شخص ''مولانا عبیداللہ احرار'' کہا کرتا تھا- خود وہ بھی اپنا نام اسی طرح بتایا کرتے تھے' ''میں ہوں مولانا عبیداللہ احرار''- کسی کو ٹیلی فون کرتے تو کہتے ''مولانا عبیداللہ احرار بول رہا ہوں''- یعنی ''مولانا'' کا لفظ ان کے نام کا جز ہو گیا تھا-

مولوی محمد احمد شوگر کے مریض تھے- ایک پاؤں کا انگوٹھا بھی زخمی ہو گیا تھا اور غالباً دو یہ تین انگلیاں بھی متاثر ہو گئی تھیں- انھوں نے ۲۴ جنوری ۱۹۶۷ (۱۲ شوال ۱۳۸۶ء) کو وفات پائی اور گارڈن ٹاؤن کے قبرستان میں دفن کیے گئے- ان سے چھوٹے حافظ محمد اسماعیل تھے- انھوں نے روپڑ میں قرآن مجید حفظ کیا اور وہیں حضرت حافظ عبداللہ روپڑی سے مروجہ نصاب کی کتابیں پڑھیں اور فارغ التحصیل ہوئے- شیریں بیان خطیب اور بہت اچھے مقرر تھے- توحید و سنت ان کا خاص موضوع تھا' اس موضوع پر نہایت موثر وعظ کہتے تھے- معاملہ فہم' نرم گفتار اور مسلک اہل حدیث کے سرگرم داعی--- کتابی چہرہ' خوب صورت ناک نقشہ' خوش لباس' دوستوں کے دوست' سب کے ہم درد' باہمت اور خوش نوا عالم دین تھے--- قرآن مجید نہایت عمدہ لہجے سے پڑھتے تھے- کافی عرصہ بیمار رہے- ٹانگ میں ہڈی کا کینسر ہو گیا تھا اور سارے جسم میں اس کا زہر پھیل گیا تھا- ۱۲ جنوری ۱۹۶۲ء (۴ شعبان ۱۳۸۱ھ) کو وفات پائی- وفات کے وقت مسجد قدس (چوک دال گراں) میں تھے- گارڈن ٹاؤن

میں دفن کیے گئے۔

تقسیم ملک سے کچھ عرصہ پہلے کی بات ہے' وہ ایک جلسے میں تقریر کر رہے تھے۔ تقریر کا موضوع تو مجھے یاد نہیں کیا تھا' البتہ اتنی بات یاد ہے کہ انھوں نے اپنے خاص دلکش انداز میں یہ دو شعر پڑھے تھے۔

کمر باندھے ہوئے چلنے کو یاں سب یار بیٹھے ہیں
بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں

نہ چھیڑ اے نکہت باد بہاری راہ لگ اپنی
تجھے اٹکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بے زار بیٹھے ہیں

یہ انشاء اللہ خاں انشا کی ایک غزل کے دو شعر ہیں جو اس نے اپنی زندگی کے آخری دور کے ایک مشاعرے میں پڑھی تھی۔ اس وقت وہ سخت ذہنی اور مالی پریشانیوں میں مبتلا تھا۔ اس حالت میں مجلس مشاعرہ میں آیا تھا کہ لوگ اسے دیکھ کر اس کا مذاق اڑاتے تھے۔ اس نے غزل پڑھنا شروع کی تو سناٹا چھا گیا۔ نہایت دردناک غزل تھی۔ غزل ختم کرنے کے بعد وہ وہاں رکا نہیں۔۔ جس کاغذ پر غزل لکھی تھی' اس نے وہ کاغذ وہیں پھینکا اور تیزی سے باہر نکل گیا۔ لیکن اس غزل نے بڑی شہرت پائی۔۔۔ اس غزل کے دو شعر جو اوپر درج کیے گئے ہیں' قبل از تقسیم ملک میں نے حافظ اسماعیل روپڑی مرحوم سے سنے تھے۔ یہ یاد نہیں رہا کہ یہ شعر انھوں نے کس سیاق میں پڑھے تھے۔

حافظ اسماعیل سے چھوٹے حافظ عبدالقادر تھے' جن کے بارے میں یہ مختصر مضمون لکھا گیا ہے اور ان سے چھوٹے حافظ محمود احمد تھے' جنھیں عام طور سے حافظ احمد کہا جاتا تھا۔ مسجد قدس کی نظامت' اخبار "تنظیم اہل حدیث" کی نگرانی اور مدرسے کی دیکھ بھال ان کے سپرد تھی۔ یہ تمام فرائض وہ نہایت حسن وخوبی سے سرانجام دیتے تھے۔ ۱۱ ذی الحجہ ۱۴۰۹ھ (۱۵ جولائی ۱۹۸۹ء) کو ان کا انتقال ہوا۔

یہ چاروں بھائی حافظ قرآن تھے۔ حافظ اسماعیل اور حافظ عبدالقادر کی زندگی کا بہت

بڑا حصہ حضرت حافظ عبداللہ روپڑی کی خدمت میں روپڑ میں بسر ہوا تھا اور انہی سے انھوں نے تعلیم حاصل کی تھی' اس لیے انھوں نے ''روپڑی'' کی نسبت سے شہرت پائی اور تقریری و تبلیغی میدان میں بڑی خدمات انجام دیں۔

حافظ عبدالقادر روپڑی اس فقیر کے مہربان تھے۔ جہاں ملاقات ہوتی نہایت شفقت کا اظہار کرتے۔ ایک دفعہ میرے اس وقت کے دفتر ادارہ ثقافت اسلامیہ تشریف لے گئے۔ ان کے ساتھ کوئی اور صاحب بھی تھے۔ میں انھیں دیکھ کر بے حد متعجب بھی ہوا اور خوش بھی۔! عرض کیا آپ کی تشریف آوری تو اس عاجز کے لیے نہایت مسرت کا باعث ہے' لیکن اگر کچھ ارشاد فرمانا مقصود تھا تو مجھے پیغام بھجوا دیتے' میں بلا تامل حاضر ہو جاتا۔

بولے: ایک کام سے آیا ہوں اور چاہتا ہوں کہ تم اس کی انجام دہی پر آمادہ ہو جاؤ۔

عرض کیا: حکم کیجیے' اگر میرے بس میں ہوا تو ضرور تعمیل ہو گی۔

فرمایا: تمھارے بس میں ہے اور تم کر سکتے ہو۔ وہ کام یہ ہے کہ ''تنظیم اہل حدیث'' کا اداریہ لکھ دیا کرو۔

انھوں نے بہت کہا اور بار بار کہا' لیکن افسوس ہے میں اس حکم کی تعمیل نہ کر سکا۔ عرض کیا میں انتہائی معذرت چاہتا ہوں' آپ کی پالیسی پر عمل نہیں کر سکوں گا۔

ایک دفعہ میں دفتر سے اٹھا اور نمازِ جمعہ پڑھنے کے لیے مسجد قدس گیا۔ حافظ صاحب خطبہ ارشاد فرما رہے تھے۔ سردیوں کا موسم تھا' میں مسجد کے صحن میں دھوپ میں بیٹھ گیا۔ انھوں نے مجھے دیکھ لیا۔ دوسرا خطبہ ختم ہونے کو آیا تو میرا نام لے کر فرمایا کہ وہ سامنے بیٹھے ہیں۔ نماز کے بعد مجھے ملے بغیر نہ جائیں۔ چنانچہ میں ملا۔ بعض ملاقاتیوں سے باتیں کرنے کے بعد مجھے اپنے کمرے میں لے گئے۔ کافی دیر جماعتی سلسلے میں گفتگو ہوتی رہی۔ اس اثنا میں مجھے چائے بھی پلائی اور کچھ کھلایا بھی۔! یہ ان کا اس فقیر پر کرم تھا۔

ایک دفعہ میں نے اور مولانا محمد حنیف ندوی نے مغرب کی نماز مسجد قدس میں پڑھی۔ حافظ صاحب نے نماز پڑھائی اور ہمیں دیکھ کر اور مل کر نہایت مسرت کا اظہار کیا اور فرمایا میں آپ کو آج وہ چائے پلاؤں گا جس کا ذکر مولانا ابوالکلام آزاد نے ''غبار

خاطر“ میں مزے لے لے کر کیا ہے۔ چنانچہ انھوں نے وہ چائے پلائی اور بتایا کہ اس چائے کا ڈبہ انھیں ایک دوست نے بطور تحفہ دیا ہے۔ اسے خاص خاص دوستوں کو پلاتا ہوں‘ خود بہت کم پیتا ہوں۔

۱۹۷۰ء کے الیکشن میں وہ پیپلز پارٹی کے سخت خلاف تھے۔ حضرت مولانا عبدالقادر قصوری کے فرزند گرامی میاں محمود علی قصوری مرحوم پیپلز پارٹی کے ٹکٹ پر لاہور سے الیکشن لڑ رہے تھے۔ میں ان کا حامی تھا اور ان کے حلقہ انتخاب میں ان کی حمایت کے لیے جاتا تھا۔ ایک دن نماز عشا کے بعد میاں صاحب کے کہنے سے میں اور میاں صاحب کے صاحب زادے عمر محمود قصوری مسجد قدس میں حافظ صاحب کی خدمت میں گئے اور عرض کیا کہ میاں صاحب اہل حدیث ہیں اور اہل حدیث کی حیثیت سے ان کی مدد کرنی چاہیے۔ حافظ صاحب نے بڑے تحمل سے ہماری باتیں سنیں اور فرمایا میرا تو آپ کے ساتھ ان کے حلقہ انتخاب میں ان کی مدد کے لیے جانا مناسب نہیں‘ آپ ان کے حلقے کے فلاں فلاں افراد سے ملیے اور انھیں میرا پیغام پہنچایے۔ میں خود بھی کسی وقت اکیلا ان سے ملوں گا۔ چنانچہ ہم ان حضرات کے پاس گئے اور حافظ صاحب کا پیغام پہنچایا اور اس کا وہی نتیجہ نکلا جو ہم چاہتے تھے۔

اسی طرح حضرت الاستاذ مولانا عطاء اللہ حنیف مرحوم و مغفور کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انھوں نے بھی اسی انداز سے میاں محمود علی قصوری کی حمایت کی۔ البتہ مولانا سید محمد داؤد غزنوی کے بڑے صاحب زادے مولوی عمر فاروق غزنوی ہمارے ساتھ گئے اور جماعت کے لوگوں سے واضح الفاظ میں میاں محمود علی قصوری کو ووٹ دینے اور ان کی حمایت کے لیے کوشاں ہونے کے لیے کہا۔ اس وقت دارالعلوم تقویۃ الاسلام میں حافظ عبدالرشید گوہڑوی فریضہ تدریس انجام دیتے تھے‘ وہ بھی ہمارے ساتھ گئے اور لوگوں پر میاں محمود علی قصوری کی مدد کے لیے زور دیا۔

حافظ عبدالقادر کے ایک بے تکلف دوست بشیر احمد بھٹی تھے۔ مجھ سے بھی وہ اچھے مراسم رکھتے تھے۔ میرے ساتھ حافظ صاحب ان کے پاس گئے اور آمد کا مقصد بیان کیا۔

رات کا کھانا ہم نے انھی کے ہاں کھایا اور جو مقصد ہم لے کر گئے تھے' اس میں انھوں نے ہمارے ساتھ تعاون کیا۔

ایک دن مولانا عبدالقادر ندوی میرے پاس تشریف لائے۔ وہ میری رفاقت میں حافظ صاحب سے ملنا چاہتے تھے۔ حافظ صاحب بیمار تھے اور مسجد قدس میں ان کا قیام تھا۔ ظہر سے تھوڑی دیر پہلے ہم ان کی خدمت میں گئے۔ حافظ صاحب اپنے کمرے میں کرسی پر بیٹھ کر نماز پڑھتے تھے' مسجد میں چل کر جانا مشکل تھا۔ کافی دیر ہم ان کی خدمت میں رہے۔ ہم نے آنے کے لیے اجازت چاہی تو فرمایا کھانا کھائے بغیر آپ نہیں جا سکتے۔ چنانچہ انھوں نے ہمارے لیے کھانا منگوایا۔ پھر چائے پلائی۔ اس کے بعد فرمایا جانے کے لیے اجازت دینے کو جی تو نہیں چاہتا' لیکن آپ ضرور جانا ہی چاہتے ہیں تو آپ کی مرضی۔!

حافظ صاحب کا سیاسیات سے کوئی زیادہ تعلق نہیں تھا' نہ ان کا یہ موضوع تھا اور نہ وہ کسی سیاسی جماعت سے منسلک تھے۔ غالباً ۱۹۷۷ میں نواب زادہ نصراللہ خاں کی جماعت پی ڈی پی (پاکستان جمہوری پارٹی) میں معلوم نہیں کیوں داخل ہو گئے تھے' لیکن سیاسی دھندا ان کے مزاج کے خلاف تھا' اس لیے جلد ہی اس سے الگ ہو گئے تھے۔ خالص تبلیغی اور دینی ذہن کا آدمی یہ کام نہیں کر سکتا۔ انگریزی دور کی سیاست کا انداز کچھ اور تھا' اس کا بنیادی مقصد ملک وقوم کو انگریز کی غلامی سے نجات دلانا تھا' جس میں نیکی کا عنصر پایا جاتا تھا۔ اب وہ سیاست نہیں رہی۔ یہ حصول اقتدار کی سیاست ہے' جس میں علماے دین کام کرتے ہیں اور سیاست دان فائدہ اٹھاتے ہیں۔

حافظ صاحب کی خدمات کا دائرہ بہت وسیع تھا۔ وہ صرف مناظر و مقرر یا واعظ و مبلغ ہی نہ تھے' یعنی صرف گفتار کے غازی نہ تھے۔ بلکہ حرکت و عمل میں بھی وہ اپنا ایک مقام رکھتے تھے۔ ۱۹۵۳ء میں مرزائیت کے خلاف جو تحریک چلی تھی' حافظ صاحب نے اس میں بے حد سرگرمی کا مظاہرہ کیا تھا اور واقعہ یہ ہے کہ اس میں اہل حدیث علما و عوام نے بڑے جوش و جذبے کے ساتھ حصہ لیا تھا۔ ان کے بے شمار لوگ گرفتار کیے گئے تھے اور کئی کئی مہینے

ملک کی مختلف جیلوں میں قید رہے تھے۔ اس تحریک کے نتیجے میں ۱۹۵۳ء کے فروری میں حکومت نے مارشل لا لگا دیا تھا۔ اس کی خلاف ورزی میں لاتعداد اہل حدیث حضرات کو پکڑ کر جیلوں میں بند کر دیا گیا تھا۔ حافظ صاحب نے اس تحریک کو کامیابی سے ہم کنار کرنے کے لیے بے پناہ تگ و دو کی تھی۔ مرزائیت کی مخالفت ان کا خاص موضوع تھا' اس لیے اس میں وہ ہر آن اور ہر موقعے پر پیش پیش رہے اور کئی مہینے جیل میں گزرے۔

۱۹۷۴ء میں مرزائیوں کی مخالفت میں تحریک چلی تو اس میں بھی انھوں نے خوب کام کیا اور مرزائیوں کو اقلیت قرار دینے کے مطالبے پر بڑی سرگرمی دکھائی۔

یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ

۱۔ مرزا غلام احمد قادیانی پر کفر کا فتویٰ سب سے پہلے اہل حدیث عالم حضرت مولانا محمد حسین بٹالوی نے تیار کیا تھا اور اس پر اولین دستخط حضرت میاں سید نذیر حسین دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے ثبت فرمائے تھے۔

۲۔ مرزا غلام احمد سے مناظرہ و مباحثہ کرنے کے لیے سب سے پہلے جو عالم قادیان گئے' وہ اہل حدیث تھے اور ان کا اسم گرامی تھا' حضرت مولانا ثناء اللہ امرتسری۔! وہ ۱۱ جنوری ۱۹۰۳ء کو قادیان گئے تھے اور مرزا صاحب ان کے مقابلے میں نہیں آئے تھے۔

۳۔ فاتح قادیان کا خطاب ہندوستان کے مسلمانوں کی طرف سے مولانا ثناء اللہ امرتسری کو دیا گیا تھا۔

۴۔ مرزا صاحب کی موت کا باعث بھی مولانا ثناء اللہ صاحب ہوئے۔ مرزا صاحب نے کہا تھا کہ مولوی ثناء اللہ نے مجھے بہت پریشان کیا ہے۔ میری دعا ہے کہ جھوٹا سچے کی زندگی میں مر جائے۔ اس مضمون کا اشتہار انھوں نے ۱۵ اپریل ۱۹۰۷ء کو شائع کیا تھا۔ چنانچہ اس دعا سے چودہ مہینے دس دن بعد ۲۶ جون ۱۹۰۸ء کو مرزا صاحب لاہور میں مر گئے' جب کہ حضرت مولانا ثناء اللہ امرتسری نے اس سے چالیس برس بعد ۱۵ مارچ ۱۹۴۸ء کو داعی اجل کو لبیک کہا۔ یعنی جھوٹا (مرزا) سچے (مولانا ثناء اللہ) کی زندگی میں مر گیا۔ مرزا صاحب کی زندگی بھر کی یہی ایک دعا یا بددعا تھی جو قبول ہوئی۔

۵- مرزائیوں کو اقلیت قرار دینے کا مطالبہ سب سے پہلے اہل حدیث نے کیا- ۱۹۵۰ء میں اس موضوع پر مولانا محمد حنیف ندوی نے ہفت روزہ ''الاعتصام'' میں مضامین لکھے اور اس پر زور دیا کہ پاکستان کی اسلامی مملکت میں خود مرزائیوں کو چاہیے کہ وہ حکومت سے مطالبہ کریں کہ انھیں اقلیت کا درجہ دیا جائے- اس ملک کے آئین میں یہی صورت ان کے لیے فائدہ مند رہے گی-

۱۹۵۳ء میں ان کی ایک کتاب ''مرزائیت نئے زاویوں سے'' کے نام سے شائع ہوئی تھی جو ان کے ان بہت سے مضامین پر مشتمل تھی جو اس موضوع سے متعلق ''الاعتصام'' میں شائع ہوئے تھے- اپنی نوعیت کی یہ اولین کتاب تھی جو چند روز میں ختم ہو گئی تھی-

مرزائیت کے سلسلے میں اہل حدیث کی بہت سی اولیات ہیں- یہ مختصر مضمون ان کی تفصیلات کا متحمل نہیں ہو سکتا- افسوس ہے موجودہ اہل حدیث اکابر کو ان امور سے دلچسپی نہیں رہی اور وہ بھول گئے کہ ان کے اکابر نے اس میدان میں کیا خدمات سرانجام دی ہیں- ان کی تمام دلچسپیاں اور سرگرمیاں اس سیاست میں محصور ہو کر رہ گئی ہیں، جس کا سوائے اس کے کوئی سر پیر نہیں ہے کہ ان کی تصویریں اخباروں میں شائع ہو جاتی ہیں- چند مہینے پہلے یکے بعد دیگرے دو مشہور اہل حدیث عالموں کی تصویریں ایک بے پردہ مسلم لیگی خاتون کے ساتھ شائع ہوئی تھیں- ان تصویروں میں جماعت اہل حدیث کے دونوں علمائے کرام بڑے خوش دکھائی دیتے تھے- ہماری دعا ہے اللہ تعالیٰ اسی طرح ان کو اپنے دین کی خدمت کے لیے وقف ہو جانے کی توفیق عطا فرمائے، جس طرح ان کے بزرگوں کو عطا فرمائی تھی، آمین-

حافظ صاحب سے متعلق ہم اپنی گزارشات کے آخری موڑ پر پہنچ گئے ہیں اور یہ وہ مقام ہے، جہاں سے ان کے کاروان حیات کا بھی آخری موڑ شروع ہو جاتا ہے--- اس موڑ میں وہ اس طرح داخل ہوتے ہیں کہ پہلے انھیں شوگر ہوئی، لیکن انھوں نے اس کی پروا نہیں کی- تبلیغی سرگرمیاں بہ دستور جاری رہیں، دور و نزدیک کے سفر کا سلسلہ چلتا رہا، وعظ و تقریر میں کوئی فرق نہیں آیا- وہ خوش مزاج، بلند حوصلہ، محنت کش اور نفس مکھ عالم دین تھے-

بیماری یا تکلیف سے گھبرانے اور آزردہ خاطر ہونے کے عادی نہ تھے- مرض اور تکلیف کے باوجود تقریر کے لیے جس نے جہاں بلایا' چل پڑے' اپنی صحت اور جسمانی حالت کی کبھی پروا نہ کی- پیدل جانا پڑا تو پیدل جا رہے ہیں' کسی نے سائیکل پر بٹھا لیا ہے تو سائیکل پر بیٹھ گئے ہیں- تانگے' موٹر یا بس کی سواری مل گئی ہے تو اس میں سوار ہو گئے ہیں- تکلف اور آرام و سہولت سے انھیں کبھی سروکار نہیں رہا- ابتدا میں شوگر کے مرض کا انھوں نے زیادہ خیال نہیں کیا' جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ تیزی سے بڑھنے لگا' یہاں تک کہ اس نے اندر سے بہت حد تک انھیں کھوکھلا کر دیا اور اپنے ساتھ اور بھی کئی تکلیفیں لے آیا- علاج معالجے کی تمام سہولتیں حاصل تھیں لیکن انھوں نے ان سہولتوں سے زیادہ فائدہ نہیں اٹھایا-

پھر ایک وقت آیا کہ انھیں اتفاق ہسپتال میں داخل کرا دیا گیا' ہسپتال کے معالجوں نے توجہ اور محنت سے ان کے علاج کا سلسلہ شروع کیا- کچھ عرصہ ہسپتال میں رہنے کے بعد گھر آ گئے- گھر میں تکلیف بڑھی تو دوبارہ ہسپتال کا رخ کیا گیا- میں ان کی عیادت کے لیے ایک دفعہ مولانا محمود احمد غضنفر کے ساتھ ماڈل ٹاؤن ان کی کوٹھی نمبر ۱۱۹ سی بلاک گیا- دوسری مرتبہ ایک اور دوست کی معیت میں گیا- اسی طرح تین چار دفعہ ہسپتال جا کر ان کی مزاج پرسی کی- وہ بیماری کے باوجود باتیں کرتے اور گزشتہ دور کے واقعات سنتے اور سناتے تھے- آخری مرتبہ دسمبر ۱۹۹۹ء کی پہلی یا دوسری تاریخ کو میں' حافظ احمد شاکر' حافظ عبدالرشید گوہڑوی اور پروفیسر ڈاکٹر محمد یحییٰ (انجینئرنگ یونیورسٹی) ہسپتال میں ان کی عیادت کے لیے حاضر ہوئے- اب وہ انتہائی نگہداشت کے وارڈ میں تھے- بے حد کمزوری نے چاروں طرف سے انھیں گھیر رکھا تھا- آنکھیں بند تھیں- زبان سے کوئی لفظ بولنا ان کے لیے مشکل ہو گیا تھا- بہت اونچی آواز سے اپنا نام بتایا جاتا تو کچھ سمجھ لیتے تھے- اس کا اندازہ اس وقت ہوتا تھا' جب وہ سر کو ذرہ جنبش دیتے یا نہایت ہلکی آواز میں "ہوں" کہتے تھے-

ہم دیکھ رہے تھے کہ وہ تیزی کے ساتھ عالم جاودانی کی طرف جا رہے ہیں- ۱۹۲۰ء کو کمیر پور (ضلع امرتسر) میں ان کی ولادت ہوئی تھی اور اس جہان فانی کا ۸۰ سالہ دور گزار کر اب ان کا قافلہ حیات جنت الفردوس کے دروازے کی طرف بڑھ رہا تھا- آخر ۶ دسمبر ۱۹۹۹ء

(۲۷ شعبان ۱۴۲۰ھ) کی تاریخ تھی اور دوشنبہ کا دن تھا کہ جوں ہی گھڑی کی سوئیاں چلتے چلتے شام کے چار بج کر ۴۵ منٹ پر پہنچیں فرشتہ اجل نے صدا دی۔

یاایتھا النفس المطمئنة۔ ارجعی الی ربك راضية مرضية۔ فادخلی فی عبدی و ادخلی جنتی۔

(اے اطمینان پانے والی روح۔ اپنے پروردگار کی طرف لوٹ چل۔ تو اس سے راضی' وہ تجھ سے راضی۔ تو میرے ممتاز بندوں میں داخل ہو جا اور میری بہشت میں اپنا مسکن بنالے)

حافظ صاحب کے سانحہ ارتحال کے بعد روپڑی خاندان کو یکے بعد دیگرے کئی صدمات سے دوچار ہونا پڑا۔

- ان کی وفات پر ابھی پورے دو مہینے بھی نہیں گزرے تھے کہ یکم فروری ۲۰۰۰ء کو ان کے بڑے صاحب زادے جناب عارف سلمان روپڑی کا گیارہ سالہ بیٹا حافظ محمد عثمان اچانک وفات پا گیا۔
- حافظ صاحب مرحوم کے عم محترم اور حضرت حافظ عبداللہ روپڑی کے برادرِ صغیر حافظ عبدالرحمٰن مختصر علالت کے بعد ۹ مارچ ۲۰۰۰ء کو وفات پا گئے۔
- اس سے چند روز بعد عارف سلمان صاحب روپڑی کے دوسرے بیٹے حافظ محمد عمر پر دل کا حملہ ہوا اور انھیں ہسپتال میں داخل کرایا گیا۔ کچھ افاقہ ہوا تو امراضِ قلب کے ماہرین نے اس بچے کو مزید علاج کے لیے امریکہ یا برطانیہ لے جانے کا مشورہ دیا' چنانچہ اسے امریکہ لے جایا گیا اور وہاں اس کے دل کا آپریشن کرایا گیا۔
- ۱۵ اگست ۲۰۰۰ کو حضرت حافظ عبداللہ روپڑی کے صاحب زادہ گرامی پروفیسر حافظ مسعود احمد روپڑی دل کا دورہ پڑنے سے انتقال کر گئے۔
- ۲۱ اگست ۲۰۰۰ کو حضرت حافظ عبداللہ روپڑی کے پوتے خالد روپڑی ایک حادثے میں وفات پا گئے۔

اس طرح حافظ عبدالقادر صاحب کے سفرِ آخرت پر روانہ ہونے کے ساتھ ہی اس

خاندان کو متعدد الم ناک حوادث پیش آئے- دعا ہے اللہ تعالیٰ ان کے متعلقین کی تمام تکلیفیں رفع فرمائے- آمین-

حضرت حافظ عبدالقادر روپڑی رحمۃ اللہ علیہ کے دو صاحب زادے ہیں- بڑے جناب عارف سلمان روپڑی ہیں اور چھوٹے حامد سلمان روپڑی-! اللہ ان کا حامی و ناصر ہو اور انھیں اپنے بزرگوں کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے- آمین

حافظ عبدالرحمٰن کمیرپوری

(وفات ۹ مارچ ۲۰۰۰ء)

حاجی محمد اسحاق حنیف کا شمار ہمارے مخلص دوستوں میں ہوتا تھا۔ وہ ایک دن یہ کہہ کر مجھے ماڈل ٹاؤن لے گئے کہ آؤ تمھیں ایک بزرگ عالم دین سے ملاتے ہیں۔ ایک مدرسے میں پہنچے' جس کی تعلیم کا وقت ختم ہو چکا تھا اور بچے اپنے گھروں کو جا چکے تھے' لیکن وہ بزرگ موجود تھے' جن سے حاجی صاحب مجھے ملانا چاہتے تھے۔ درمیانہ قد' لاغر اندام' سفید قمیص اور سفید شلوار میں ملبوس' گندم گوں' لمبی داڑھی' تیکھے نقوش۔ ان کا اسم گرامی تھا حافظ عبدالرحمٰن کمیرپوری --- حضرت حافظ عبداللہ روپڑی کے سب سے چھوٹے بھائی۔

نہایت تپاک سے ملے اور بے تکلفی سے باتیں کیں۔ تقویٰ اور صالحیت کے آثار ان کے چہرے پر نمایاں تھے' جن کا اثر مجھ گنہگار پر بھی پڑ رہا تھا۔ انھوں نے اپنے مدرسے کے نئے تعمیر شدہ کمرے بھی دکھائے اور وہ بھی جو تعمیر کے ابتدائی مراحل میں تھی۔

میں نے اپنی کتاب "بزم ارجمنداں" میں حضرت حافظ عبداللہ روپڑی سے متعلق ایک طویل مضمون لکھا ہے' جس میں اس خاندان کے ابتدائی حالات تفصیل سے بیان کیے ہیں۔ علاوہ ازیں اسی کتاب میں جو قارئین کرام کے زیر مطالعہ ہے' حافظ محمد حسین روپڑی اور حافظ عبدالقادر روپڑی پر مضامین شامل ہیں' ان میں بھی اس خاندان کے اکابر کا ذکر کیا گیا ہے۔ اب اگرچہ حافظ عبدالرحمٰن کمیرپوری سے متعلق گزارشات میں ان کے خاندانی پس منظر کا تذکرہ ضروری نہیں' تاہم چند الفاظ اس سلسلے میں یہاں بھی سنتے جایئے۔

کسی زمانے میں اس خاندان کا سکونتی تعلق ایمن آباد (ضلع گوجرانوالہ) سے تھا۔ ان کے بعض بزرگ مہاراجا رنجیت سنگھ کے زمانے میں ایمن آباد سے کمیرپور (ضلع امرتسر) میں آ بسے تھے۔ ان بزرگوں کی اولاد میں سے ایک بزرگ کا نام میاں روشن دین تھا۔ میاں

روشن کی اولاد چھے بیٹوں اور ایک بیٹی پر مشتمل تھی- بیٹی کا نام فاطمہ تھا اور وہ چھے سال کی عمر میں کمیرپور کے قریب ایک نالے میں ڈوب کر فوت ہوگئی تھی-

بیٹوں میں سب سے بڑے حافظ رکن الدین تھے' جنھوں نے ججہ کلاں (متصل چھانگا مانگا ضلع قصور) لکھوکی' سہارن پور' میرٹھ' دہلی وغیرہ میں درس نظامی کی تکمیل کی اور علم طب پڑھا- فارغ ہوکر اپنے وطن واپس آئے' طبابت کا سلسلہ شروع کرنا چاہتے تھے کہ مرض سل میں مبتلا ہوگئے- ایک سال بیمار رہے اور پھر وفات پا گئے- کمیرپور میں دفن کیے گئے- آزادیٔ برصغیر کے بعد وہ علاقہ مشرقی پنجاب میں آیا اور مسلمانوں سے خالی ہوگیا- اب نہ وہاں مسجدیں رہی ہیں' نہ اسلامی مدرسے رہے ہیں اور نہ قبرستانوں کا کہیں نشان باقی ہے- سب چیزیں ان سکھوں نے ختم کردیں' جن سے پاکستان کے بعض لوگ تعلقات قائم کرنا چاہتے ہیں-

ان سے چھوٹے میاں رحیم بخش تھے جو حافظ اسماعیل روپڑی اور حافظ عبدالقادر روپڑی کے والد محترم تھے- وہ ۱۸۸۴ (۱۳۰۱ھ) کو کمیرپوری میں پیدا ہوئے- تجارت اور کاشت کاری کرتے تھے- حافظ قرآن تھے- ۲۰ مئی ۱۹۳۴ (۵ صفر ۱۳۵۳ھ) کو کمیرپور میں فوت ہوئے اور وہیں دفن کیے گئے-

حضرت حافظ عبداللہ روپڑی ۱۸۸۷ء (۱۳۰۴ھ) کو کمیرپور میں پیدا ہوئے اور مدرسہ غزنویہ (امرتسر) لکھوکے' دہلی' میرٹھ' رام پور وغیرہ مقامات میں تعلیم پائی- (۲۰ اگست ۱۹۶۴ (۱۱ ربیع الثانی ۱۳۸۴ھ) کو لاہور میں انتقال ہوا- (تفصیل کے لیے دیکھیے اس عاجز کی کتاب ''بزم ارجمنداں'' مکتبہ قدوسیہ' اردو بازار لاہور)-

حضرت حافظ صاحب سے چھوٹے میاں عبدالواحد تھے- ان کی ولادت بھی کمیرپور میں ہوئی- کھیتی باڑی کرتے تھے' نہایت متدین اور صالح بزرگ تھے- تقسیم ملک کے وقت بھوئے آصل (نزد چھانگا مانگا) میں آباد ہوئے- وہیں متروکہ زمین کے بدلے میں زمین ملی- زہد و تقویٰ میں اپنی مثال آپ تھے- ان کے دو بیٹے تھے- حافظ عبداللہ اور عبدالجبار- مرحوم عبدالجبار ایک حادثے میں قتل ہوگئے تھے- ان کی اولاد سے دو بیٹے ہیں- حافظ

عبدالغفار اور حافظ عبدالوہاب---! جامعہ اہل حدیث اور جامع مسجد قدس (چوک دال گراں' لاہور) کا نظام آج کل یہی چلا رہے ہیں- حافظ عبدالوہاب جامعہ ام القریٰ (مکہ مکرمہ) کے فارغ التحصیل ہیں- دونوں بھائی مولانا حافظ ثناء اللہ خاں مدنی کے شاگرد ہیں اور نہایت قابلیت اور محنت سے خدمات سرانجام دے رہے ہیں-

میاں عبدالواحد سے چھوٹے مولانا حافظ محمد حسین روپڑی تھے- عالم و فاضل اور متقی و عابد بزرگ---! تقسیم ملک کے وقت ۱۹۴۷ میں نواں کوٹ امرتسر میں مقیم تھے- وہاں سے موضع بھوئے آصل (ضلع قصور) آئے اور وہاں زمین الاٹ کرائی- پھر لاہور آ گئے' ماڈل ٹاؤن کے جے بلاک میں کوٹھی نمبر ۱۰۰ ان کے نام الاٹ ہوئی- یہیں ۱۲ اکتوبر ۱۹۵۹ (۲۸ ربیع الاول ۱۳۷۹ھ) کو سفر آخرت پر روانہ ہوئے- (ان کے تفصیلی حالات اسی کتاب میں ملاحظہ فرمایے) سب سے چھوٹے حافظ عبدالرحمٰن کیرپوری تھے جو ۱۸۹۸ (۱۳۱۶ھ) کو کیرپور میں پیدا ہوئے- تمام مروجہ علوم و فنون کی کتابیں حضرت حافظ عبداللہ روپڑی سے پڑھیں اور انہی سے سند فراغ حاصل کی- ان سے متعلق "الاعتصام" کے دو شماروں (۱۵ جون اور ۲۳ جون ۲۰۰۰) میں ہمارے نہایت قابل احترام اور فاضل دوست شیخ الحدیث مولانا ثناء اللہ خاں مدنی کا مضمون شائع ہوا ہے- مندرجہ ذیل سطور میں ہم اسی مضمون سے استفادہ کر رہے ہیں- گزشتہ کئی سال سے "الاعتصام" کا بہرہ استفتا حافظ ثناء اللہ خاں صاحب کے سپرد ہے' بہ الفاظ واضح وہ "الاعتصام" کے لائق ترین مفتی ہیں اور ہر ہفتے ہم ان کے تحریر فرمودہ فتوؤں سے مستفید ہوتے ہیں- دعا ہے اللہ تعالیٰ انھیں اپنے دین کی خدمت کے زیادہ سے زیادہ مواقع عطا فرمائے' آمین-

حافظ عبدالرحمٰن نے تکمیل تعلیم کے بعد دین کی نشر و اشاعت کا سلسلہ اپنے آبائی قصبے کیرپور میں شروع کیا اور لڑکے اور لڑکیوں کے لیے چھوٹے بڑے مدارس قائم کیے' جن میں سیکڑوں طلبا اور طالبات نے علم حاصل کیا اور پھر آگے چل کر بہت سے لوگوں میں اس علم کو پھیلایا- ان کے اس دور کے شاگردوں میں مولانا محمد حسین شیخوپوری' حافظ محمد ابراہیم کیرپوری' حافظ محمد یوسف مرحوم (جھنگ) حافظ علم الدین' مولانا حسن دین فیصل آبادی اور

پروفیسر حافظ عبداللہ بہاول پوری شامل ہیں- اس فہرست میں بہت سی خواتین کے نام بھی آتے ہیں جنھوں نے اپنی اپنی جگہ بے شمار خواتین کو قرآن مجید حفظ کرایا اور دینی تعلیم دی-

حافظ صاحب نماز تراویح ہمیشہ امرتسر کے محلّہ ''لوہ گڑھ'' کی مسجد اہل حدیث میں پڑھایا کرتے تھے- ہمارے مرحوم دوست حاجی محمد اسحاق حنیف کا مسکن یہی محلّہ تھا اور حاجی صاحب سے ان کے مخلصانہ مراسم تھے-

تقسیم ملک کے بعد حافظ صاحب لاہور کے علاقہ ماڈل ٹاؤن کے جے بلاک میں آ گئے تھے اور وہاں کوٹھی نمبر ۴۷ میں اقامت اختیار کر لی تھی- یہاں بھی انھوں نے مسجد بنائی اور مدرسہ قائم کیا- مسجد کی تعمیر میں بڑی رکاوٹیں پیش آئیں، لیکن اللہ نے انھیں کامیابی عطا فرمائی اور تمام رکاوٹیں دور ہو گئیں- اس مسجد کے وہ خود ہی امام، خود ہی خطیب اور خود ہی خادم تھے- اگر کبھی حضرت حافظ عبداللہ تشریف لے آتے تو وہ فریضہ امامت انجام دیتے تھے- اس مسجد کے خاص معاون ایک بزرگ میاں ظہور الحق ہیں-

حافظ صاحب کے دل میں خدمت دین کا بے پناہ جذبہ پایا جاتا تھا اور ہر وقت کسی نہ کسی صورت میں اس کی تبلیغ و اشاعت میں مشغول رہتے تھے- نماز خشوع و خضوع سے پڑھتے تھے- ان کا زیادہ وقت مسجد میں گزرتا تھا- نفلی روزے بہ کثرت رکھتے تھے- اللہ کا ڈر ان پر ہر آن طاری رہتا تھا- کھانا دن رات میں صرف ایک وقت کھاتے تھے- شہر میں کہیں جانا ہوتا تو سائیکل پر جاتے تھے اور یہی ان کی پسندیدہ سواری تھی- دنیوی تکلفات سے ہمیشہ دور رہے-

بعض لوگوں نے ان پر مقدمے بھی قائم کیے اور انھیں کئی دفعہ عدالت میں بھی جانا پڑا، لیکن کبھی کسی کو اپنا وکیل نہیں بنایا، خود ہی اپنی وکالت کرتے تھے-

ان کی زندگی کا ایک نہایت عجیب و غریب واقعہ یہ ہے کہ علاقہ روپڑ کے قصبہ ''ملک پور'' میں سکھوں اور ہندوؤں نے فیصلہ کیا کہ مسلمانوں کو گائے کی قربانی نہیں کرنے دیں گے، چنانچہ ۱۹۲۸ کی عیدالاضحیٰ کے موقعے پر انھوں نے مسلمانوں پر حملہ کر دیا، ان کی تعداد پانچ ہزار تھی- ان کے مقابلے میں مسلمان صرف ایک ہزار تھے، جن میں ہمارے ممدوح

حافظ عبدالرحمٰن بھی شامل تھے۔ مسلمانوں اور غیر مسلموں میں دست بہ دست لڑائی ہوئی اور لاٹھیوں اور کلہاڑیوں کا بے دریغ استعمال ہوا۔ مسلمانوں کو اللہ نے کامیابی سے نوازا اور غیر مسلم میدان چھوڑ کر بھاگ گئے۔

لڑائی ختم ہوئی تو حکومت کی طرف سے گرفتاریوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ جن مسلمانوں کو گرفتار کیا گیا تھا' ان میں حافظ عبدالرحمٰن بھی شامل تھے۔ مقدمہ عدالت میں گیا اور سکھوں اور ہندوؤں کے عدالت میں بیانات ہوئے تو انھوں نے صاف لفظوں میں کہا کہ ہمیں مارنے والے یہ لوگ نہیں تھے' جن کو پولیس نے گرفتار کر کے عدالت میں پیش کیا ہے۔ ہمیں مارنے والوں نے سفید کپڑے پہن رکھے تھے اور ان کے چہروں پر نور برس رہا تھا۔

علاقے کے لوگوں پر اس واقعہ کا اتنا اثر ہوا کہ اس کے بعد سکھوں اور ہندوؤں نے مسلمانوں کے مقابلے میں بالکل خاموشی اختیار کر لی اور مسلمان برملا گائے کی قربانی کرنے لگے۔ کوئی انھیں روکنے اور ٹوکنے والا نہ تھا۔

حافظ عبدالرحمٰن کمیرپوری نے ۹ مارچ ۲۰۰۰ (۳ ذوالحجہ ۱۴۲۰ھ) کو ۹۶ سال کی عمر پا کر انتقال کیا۔

انا للہ وانا الیہ راجعون

حافظ صاحب کے بیٹے حافظ صالح محمد ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کا حامی وناصر ہو۔

مولانا عبدالعظیم انصاری

(ولادت ۱۹۱۶)

عبدالعظیم انصاری نام ہے ایک مستعد، محنتی، خوش کردار، باہمت اور میرے نزدیک نہایت ایمان دار وجود کا............! ان سے اصل تعارف بلکہ دلی تعلق ۱۹۵۶ء میں ہوا جب وہ مرکزی جمعیت کے ناظم دفتر کی حیثیت سے لاہور آئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مرکزی جمعیت اہل حدیث کا دفتر شیش محل روڈ پر تھا۔ حضرت مولانا سید محمد داؤد غزنوی اس کے صدر، مولانا محمد اسماعیل سلفی ناظم اعلیٰ، میاں عبدالمجید ناظم مالیات اور حاجی محمد اسحاق حنیف ناظم نشر واشاعت تھے۔

ان کے علاوہ مولانا محمد حنیف ندوی، مولانا عطاء اللہ حنیف، مولانا معین الدین لکھوی، چودھری عبدالقادر (ساہیوال) میاں عبدالستار (سرگودھا) حافظ محمد اسماعیل ذبیح، پروفیسر عبدالقیوم اور مولانا محی الدین احمد قصوری۔ ایسے حضرات ارکان عاملہ میں شامل تھے۔

مجھے یاد پڑتا ہے عبدالعظیم انصاری کو مولانا محمد اسحاق رحمانی کے مشورے سے مرکزی جمعیت اہل حدیث کا ناظم دفتر مقرر کیا گیا تھا ان کے کام، ان کی محنت، ان کے اسلوب کار اور میل جول سے مرکزی جمعیت کے تمام حضرات مطمئن تھے۔

اس وقت مرکزی جمعیت کی عمر آٹھ برس کی ہو چکی تھی اور پورے ملک میں اس کی شاخیں قائم ہوگئی تھیں۔ عبدالعظیم انصاری بھی اس کی نظامت دفتر کی ذمہ داری قبول کرنے سے قبل اس سے وابستہ تھے اور کام کی نوعیت اور پھیلاؤ سے آگاہ تھے۔

ان کے لاہور آنے سے قبل ہمارا آپس میں کوئی تعلق تھا یا نہیں، اس سے متعلق مجھے کچھ یاد تو نہیں لیکن میرا خیال ہے تھوڑی بہت جان پہچان ضرور ہوگی۔ اس کی ایک وجہ میری

سمجھ میں یہ آتی ہے کہ میں مرکزی جمعیت کی پیدائش کے وقت سے اس کے ساتھ وابستہ تھا اور کئی سال اس کا ناظم دفتر رہا تھا۔ اس اثنا میں دو مرتبہ مرکزی جمعیت کی رکن سازی بھی ہو چکی تھی، اس لیے میرا حسن ظن ہے کہ عظیم صاحب مجھے جانتے ہوں گے۔

دوسری وجہ جان پہچان کی یہ ہو سکتی ہے کہ ''الاعتصام'' کی ادارت میرے سپرد تھی اور عظیم صاحب یقیناً اس اخبار کے قاری بلکہ خریدار ہوں گے۔ میرا وہ جوانی کا زمانہ تھا اور میں اخباری لڑائی کے لیے اپنے آپ کو ہر وقت تیار رکھتا تھا اور بعض غیر جماعتی حلقوں میں میرا تعارف بھی کچھ اسی قسم کا تھا کہ یہ مونچھوں والا بہت پریشان کرتا ہے۔ میں اس زمانے میں مونچھوں کو تاؤ دے کر رکھتا تھا۔ اب میں بھی بوڑھا ہو گیا ہوں، میری مونچھیں بھی بوڑھی ہو کر جھک گئی ہیں اور تمام کس بل نکل گئے ہیں۔

بہر حال میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ ۱۹۵۶ء میں مرکزی جمعیت کے ناظم کے طور پر آنے سے پہلے مولانا عبدالعظیم انصاری مجھے کچھ نہ کچھ جانتے ہوں گے۔ میں بھی یقیناً انھیں جانتا ہوں گا، اب اگر اس سلسلے کی کوئی بات ذہن میں نہیں رہی تو اس کا مطلب مطلقاً نفی نہیں ہے۔

عبدالعظیم انصاری جب مرکزی جمعیت کے دفتر میں آئے تھے اس وقت ان کی عمر چالیس برس کے پس و پیش ہو گی۔ پورا قد، متوسط جسم، گندم گوں، گول چہرہ اور چہرے کے مطابق مناسب نقش و نگار، صاف ستھرا لباس، مہذبانہ گفتگو اور بہت اچھا انداز کلام۔ دفتر کا وہ کام جس کی انجام دہی کے لیے انھیں لایا گیا تھا، انھوں نے آتے ہی سمجھ لیا تھا اور سچی بات یہ ہے کہ نہایت ذمے داری سے انھوں نے جماعت کی خدمت کی۔

عبدالعظیم کے آبا و اجداد دراصل موضع ''بلہر'' کے رہنے والے تھے جو تقسیم ملک سے قبل ضلع لاہور کے ایک مشہور قصبے ''پٹی'' کے قریب تھا۔

ان کے والد مرحوم ایک صالح بزرگ تھے جو اپنے دور اور علاقے کے اہل علم اور اصحاب صلاح سے عقیدت مندانہ مراسم رکھتے تھے۔ حضرت سید محمد شریف گھڑیالوی اس نواح کے نہایت صاحب تقویٰ بزرگ تھے، عظیم صاحب کے والد شاہ صاحب کے حلقہ

بیعت میں شامل تھے اور ان کی خدمت میں حاضری دینا اور ان سے استفاضہ کرنا ان کے معمولات کا ضروری حصہ تھا۔

عبدالعظیم انصاری ۱۹۱۶ کو اس نیک سیرت اور پرہیزگار شخص کے گھر موضع ''بلہر'' میں پیدا ہوئے۔

ناظرہ قرآن مجید اپنے والد محترم سے پڑھا اور پھر اسی گاؤں کے سرکاری سکول میں پرائمری تک تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد تقویٰ شعار والد نے ہونہار بیٹے کو دینی علوم کے حصول کی راہ پر لگا دیا۔

یہ کام عبدالعظیم کی خاندانی روایت، ان کے ذاتی رجحان اور مزاج کے عین مطابق تھا۔ اس میں انھوں نے خوب محنت کی اور حسب ذیل علمائے کرام سے استفادہ کیا:

سب سے پہلے مولانا عطاء اللہ شہید کی خدمت میں حاضری دی جو ضلع امرتسر کے ایک معروف گاؤں موضع ''بھینی سندھواں'' کے رہنے والے تھے، جاٹوں کی ''رندھاوا'' برادری سے تعلق رکھتے تھے۔ نہایت پرجوش مبلغ اور مستقل مزاج عالم دین تھے۔ مدرسہ غزنویہ (امرتسر) اور جامعہ محمدیہ (لکھوکے، ضلع فیروز پور) کے عالی قدر اساتذہ کے ارشد تلامذہ میں سے تھے۔ علوم دینیہ میں مہارت اور فارسی میں دست رس رکھتے تھے۔ عظیم صاحب ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے قرآن مجید کا ترجمہ پڑھا، حدیث کی کتاب بلوغ المرام اور مشکوٰۃ شریف کا کچھ حصہ پڑھا، صرف ونحو کی چند ابتدائی کتابیں پڑھیں، فارسی کی جو کتابیں اس وقت دینی مدارس میں پڑھائی جاتی تھیں ان میں سے پند نامہ، کریما، گلستان اور بوستان وغیرہ کی تکمیل کی۔ تقریباً ڈیڑھ سال وہاں رہے۔ مولانا عطاء اللہ شہید کے حالات میں نے اپنی کتاب ''کاروان سلف'' میں بیان کیے ہیں۔ یہ کتاب مکتبہ اسلامیہ فیصل آباد نے شائع کی ہے۔

بھوجیاں (تحصیل ترنتارن، ضلع امرتسر) میں بھی ان دنوں ایک دینی مدرسہ قائم تھا جو علمائے غزنویہ کے مرید وشاگرد حضرت مولانا فیض محمد خاں نے ''مدرسہ فیض الاسلام'' کے نام سے جاری کیا تھا، جس میں خود مولانا فیض محمد خاں اور ان کے صاحب زادے

مولانا عبدالرحمٰن بھوجیانی اور دیگر مدرسین طلبا کو مستفید فرماتے رہے ہیں- عبدالعظیم انصاری نے بھی سندھواں سے بھوجیاں کا عزم کیا اور وہاں کے جلیل القدر علما سے استفادہ کیا- ان کے تفصیلی حالات جو نہایت معلومات افزا اور بے حد دردناک ہیں عبدالعظیم انصاری نے اپنی کتاب ''تذکرہ علماے بھوجیاں'' میں شائع کیے ہیں- یہ کتاب انھوں نے خود ہی شائع کی ہے اور ان کے گھر کے پتے کوٹ اعظم خاں، قصور سے حاصل کی جا سکتی ہے- اس کتاب سے پتا چلتا ہے کہ سکھ کس قدر ظالم لوگ ہیں اور انھوں نے مسلمانوں پر کتنے ستم ڈھائے ہیں-

عبدالعظیم انصاری دو سال بھوجیاں رہے اور مدرسہ فیض الاسلام کے اساتذہ سے فیض حاصل کرتے رہے-

بھوجیاں سے امرتسر کو روانہ ہوئے اور مدرسہ غزنویہ (دارالعلوم تقویۃ الاسلام) میں داخلہ لیا- اس زمانے میں پنجاب کا یہ بہت بڑا دارالعلوم تھا جو تقسیم ملک کے بعد لاہور منتقل ہو گیا تھا- یہاں بھی حضرت مولانا سید محمد داؤد غزنوی نے اس کی تدریسی روایت کو نہ صرف قائم رکھا بلکہ اسے مزید دلکش بنایا اور اس میں نکھار اور حسن پیدا کیا- ان کے بعد سید ابوبکر غزنوی مرحوم نے بھی اس کے ماضی کا خوب تحفظ کیا- سید ابوبکر غزنوی کی وفات کے بعد ان کے بڑے بھائی مولوی عمر فاروق غزنوی نے اس میں مزید اصلاحات کیں- انھوں نے سفر آخرت اختیار کیا تو اس کا اہتمام سید عثمان غزنوی کے سپرد ہوا، انھوں نے بھی اپنے پیش رو حضرات کی طرح اس کی خدمت کی- لیکن زمانہ ہمیشہ ایک سا نہیں رہتا- اس میں تغیر کا عمل جاری رہتا ہے- اور یہ دارالعلوم بھی تغیر کے عمل سے گزر رہا ہے- بعض چیزوں کا حسن قدامت پسندی ہی کا مرہون منت ہوتا ہے- ہم قدامت پسندوں کے نزدیک اس دارالعلوم کا حسن قدامت پسندی ہی سے وابستہ ہے، جدیدیت سے اس کی قدامت ختم ہو جائے گی اور جدت آئے گی نہیں- پھر اس کوے کا سا معاملہ ہو جائے گا جو ہنس کی چال سیکھنے گیا تھا لیکن اپنی چال بھی بھول گیا تھا- بہرحال یہ ہمارا موضوع نہیں- ان کا موضوع ہے جن کے ہاتھوں میں اس کی زمام اختیار ہے- ہم یہاں صرف یہ کہنا چاہتے ہیں کہ امرتسر کے

مدرسہ غزنویہ میں مولانا عبدالعظیم انصاری نے مندرجہ ذیل علمائے کرام سے استفادہ کیا۔

۱۔حضرت مولانا نیک محمد سے جامع ترمذی، صحیح بخاری اور صحیح مسلم پڑھیں

۲۔مولانا محمد حسین ہزاروی سے سنن نسائی اور صرف ونحو کی بعض کتابیں پڑھیں

۳۔مولانا شریف اللہ خاں سواتی سے فقہ واصول کی کتابوں کا درس کیا۔

۴۔مولانا اصحاب الدین سے کنز الدقائق، ہدایہ اولین، اصول فقہ اور عقائد کی بعض کتابیں پڑھیں

بعض دیگر اساتذہ سے بھی استفادہ کیا۔

۱۹۳۳ میں حضرت مولانا محمد علی لکھوی مسجد چینیاں والی (لاہور) میں فریضہ تدریس انجام دیتے تھے۔ امرتسر سے عبدالعظیم انصاری ان کی خدمت میں آ گئے۔ ان سے حدیث کی بعض کتابیں دوبارہ پڑھیں اور انہی سے سند فراغ حاصل کی۔ مولانا سید محمد داؤد غزنوی ان دنوں سیاسی سلسلے میں جیل میں تھے اور ان کی جگہ مولانا محمد علی لکھوی مسجد چینیاں والی میں خطبہ جمعہ بھی ارشاد فرماتے تھے اور طلبا کو پڑھاتے بھی تھے۔ دس طالب علم اس وقت اس مسجد میں مولانا لکھوی سے کتب حدیث پڑھتے تھے اور وہ تھے۔

۱۔حافظ محمد سلیمان بھوجیانی

۲۔مولانا عبدالودود (موضع ہڈاں والی، ضلع فیروز پور)

۳۔حافظ محمد یوسف گکھڑوی۔

۴۔سید زین العابدین

۵۔مولانا عبدالصمد بنگالی

۶۔عبدالعزیز کاتب

۷۔مولانا عبدالحلیم بٹربن (کشمیر)

۸۔مولانا عبدالواحد لائل پوری

۹۔خود مولانا عبدالعظیم انصاری

۱۰۔ایک اور صاحب تھے، جن کا نام یاد نہیں رہا۔

ان میں سے نمبر ۱، ۲، ۳، ۶، ۸ تو یقیناً فوت ہو چکے ہیں۔ ۴، ۵، ۷ کے متعلق کچھ نہیں کہا جاسکتا، ممکن ہے یہ بھی اللہ کو پیارے ہو گئے ہوں۔ نمبر ۱۰ کا نام یاد نہیں۔ نمبر ۹ البتہ اس دنیا میں موجود ہیں، جنھیں عبدالعظیم انصاری کہا جاتا ہے۔ دعا ہے اللہ تعالیٰ ان کی عمر میں برکت پیدا کرے اور یہ اس کے دین کی زیادہ سے زیادہ خدمت کریں۔

چینیاں والی مسجد کے دور طالب علمی کا عبدالعظیم انصاری صاحب نے یہ واقعہ بیان کیا کہ ایک دن حضرت مولانا محمد علی لکھوی حدیث شریف کی کوئی کتاب پڑھا رہے تھے کہ حکیم ابوتراب عبدالحق امرتسری مرحوم تشریف لائے۔ انھوں نے گفتگو کرتے ہوئے کوئی ایسی بات کہی جس سے انگریزی حکومت کی حمایت کا پہلو نکلتا تھا۔ مولانا لکھوی انگریزی حکومت کے شدید مخالف اور مجاہدین کے حامی تھے۔ حکیم صاحب کی بات سن کر انھیں سخت کوفت ہوئی اور چہرے کا رنگ بدل گیا۔ مولانا عبدالعزیز کاتب نے یہ صورت حال دیکھی تو فوراً اٹھے اور حکیم صاحب کو دھکیل کر مسجد سے باہر نکال دیا۔ مولانا لکھوی صاحب کو یہ حرکت ناگوار گزری اور انھوں نے اپنے شاگرد عبدالعزیز کو سخت ڈانٹ پلائی اور اختلاف کے باوجود حکیم صاحب کا احترام بجالائے۔

دینی علوم کی تحصیل سے فارغ ہو کر عبدالعظیم انصاری اپنے وطن پٹی چلے گئے۔ وہاں حافظ احمد پٹوی سے ترمذی شریف اور ابن ماجہ کا دوبارہ درس لیا اور علم طب بھی ان سے پڑھا۔

حافظ صاحب مرحوم کثیر المطالعہ عالم دین تھے۔ نہایت پرہیز گار اور سلف کا صحیح ترین نمونہ۔ بہت اچھے طبیب بھی تھے۔ تقسیم ملک کے بعد اپنے وطن پٹی سے جڑانوالہ (ضلع فیصل آباد) چلے گئے تھے۔ وہیں ۱۵ مارچ ۱۹۷۰ کو بروز ہفتہ صبح چار بجے وفات پائی۔

انا للہ وانا الیہ راجعون

مروجہ تعلیم سے فراغت کے بعد عبدالعظیم انصاری اپنے آبائی گاؤں موضع بلہر آ گئے۔ اس گاؤں میں سکھوں کی اکثریت تھی، مسلمانوں کی آبادی چند گھروں پر مشتمل تھی۔ یہاں نہ کوئی مسجد تھی اور نہ اذان کی آواز کسی کونے سے سنائی دیتی تھی۔ عظیم صاحب کی کوشش سے

وہاں ایک مسجد تعمیر کی گئی۔ اس علاقے میں اتفاق سے ایک مسلمان تھانے دار آیا تو اس نے مسلمانوں کے ساتھ تعاون کیا اور سکھوں کی مخالفت کے باوجود گاؤں میں اذان ہونے لگی اور مسجد میں باجماعت نماز کا اہتمام ہوا۔

۱۹۳۴ میں وہ صوبہ سندھ کے ضلع خیر پور میں جیمس آباد کے قریب ایک گاؤں چک نمبر ۳۳۳ میں چلے گئے۔ وہاں تقریباً چار سال بہ طور خطیب مقیم رہے اور ایک دینی مدرسے کی بنیاد بھی رکھی، جس میں تدریس کا سلسلہ جاری کیا۔

پھر وہاں سے واپس اپنے گاؤں آ گئے اور ۱۹۳۸ میں گاؤں کی سکونت ترک کر کے اپنے خاندان سمیت پٹی چلے گئے اور وہیں رہائش اختیار کر لی۔ پٹی میں ایک دینی مدرسہ ”مدرسہ محمدیہ“ کے نام سے جاری تھا جس کے نگران مولانا محمد علی قصوری ایم اے کینٹب تھے، عظیم صاحب کو اس کا ناظم مقرر کیا گیا۔ مدرسین میں مولانا عبدالرحمٰن لکھوی مرحوم اور مولانا ہدایت اللہ ندوی شامل تھے۔ مولانا ہدایت اللہ ندوی کا اصل تعلق ریاست فرید کوٹ کے ایک گاؤں اراثیاں والا سے ہے اور آج کل میاں چنوں میں مقیم ہیں۔ نہایت لائق اور فاضل شخص ہیں، کئی کتابوں کے مصنف و مترجم ہیں۔

قیام پاکستان کے بعد عظیم صاحب قصور آ گئے۔ جب منقولہ اور غیر منقولہ جائدادوں کے کلیم داخل کیے گئے تو اس مدرسے کا کلیم بھی داخل کر دیا گیا جو پٹی میں جاری تھا۔ سولہ ہزار روپے کا کلیم منظور ہوا، اس زمانے میں یہ ایک خطیر رقم تھی۔ اس سے کچھ عرصہ بعد راجہ جنگ (ضلع قصور) میں ”دارالعلوم ضیاء السنہ“ کے نام سے دینی درس گاہ جاری ہوئی تو موضع پٹی کے احباب جماعت کے مشورے کے بعد اس رقم سے دارالعلوم ضیاء السنہ میں ”حدیث ہال“ تعمیر کیا گیا۔

عبدالعظیم انصاری مستعد آدمی ہیں۔ قصبہ پٹی کے محلہ کھوڑی والا میں اپنے دوستوں کے تعاون سے اہل حدیث کی ایک مسجد بھی تعمیر کرائی تھی، جس میں قیام پاکستان تک یہ خود فریضۂ خطابت انجام دیتے رہے۔

تقسیم ملک کے بعد ان پناہ گزینوں کی آباد کاری کا مسئلہ بہت بڑی اہمیت اختیار کر گیا

تھا جو مشرقی پنجاب کے مختلف علاقوں سے وارد پاکستان ہوئے تھے۔ عظیم صاحب نے کچھ دوستوں کے ساتھ مل کر انجمن مہاجرین قائم کی اور حکومت کے تعاون سے ان لوگوں کی آباد کاری کا منصوبہ بنایا جو بے پناہ مصیبتوں کے سیلاب سے گزرتے ہوئے قصور شہر میں آئے تھے۔ ان کے لیے روٹی کپڑے مکان کا انتظام بھی ضروری تھا اور ہر اسلامی اور غیر اسلامی حکومت کا فرض ہے کہ اپنی رعایا کے لیے اس کا اہتمام کرے۔

۱۹۵۲ میں میونسپل کمیٹی قصور کے کونسلر منتخب ہوئے اور اس زمانے میں رفاہ عامہ کے بڑے کام کیے۔

کئی سال انجمن اہل حدیث قصور کے صدر رہے۔ قصور کی جامع مسجد فریدیہ اہل حدیث پہلے چھوٹی مسجد تھی۔ احباب کے تعاون سے اس مسجد کو کافی وسیع کیا۔ عمارت بھی شان دار بنائی گئی۔

شیخ حاجی عبدالکریم مرحوم ان کے مخلص دوست تھے۔ ان کی معیت اور بھاگ دوڑ سے ''تائید الاسلام پرائمری سکول'' جاری کیا، جسے بعد میں ہائی سکول تک ترقی دی گئی۔

۱۹۵۳ کی تحریک تحفظ ختم نبوت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور ایک جلوس کی قیادت کرتے ہوئے گرفتار ہوئے اور کچھ عرصہ قصور جیل میں رہے۔

دسمبر ۱۹۷۷ میں حاجی محمد سردار مرحوم قاری محمد عثمان کے تعاون سے مدرسہ حفظ القرآن فریدیہ کا اجرا کیا۔ یہ مدرسہ کامیابی سے چل رہا ہے۔ اس کی ایک شاخ ''شعبۃ البنات'' ہے جس میں معلمات بچیوں کو تعلیم دیتی ہیں۔ انصاری صاحب اس مدرسے کے مہتمم ہیں۔

۱۹۷۴ کی تحریک تحفظ نبوت میں بھی حصہ لیا۔

۱۹۵۸ میں مرکزی جمعیت اہل حدیث کے ناظم دفتر مقرر کیے گئے تھے، کئی سال یہ خدمت انجام دیتے رہے۔ ۱۶ دسمبر ۱۹۶۳ کو حضرت مولانا سید محمد داؤد غزنوی نے وفات پائی۔ ان کی وفات کے بعد بھی کچھ عرصہ اس خدمت پر مامور رہے۔ پھر حالات نے ایسی کروٹ لی کہ اس منصب سے الگ ہو گئے۔

مرکزی جمعیت اور "الاعتصام" کے دفاتر ایک ہی بلڈنگ میں تھے۔ میری اور عظیم صاحب کی ذمے داریاں اگرچہ الگ الگ تھیں، لیکن ہم اکٹھے رہتے تھے۔ سات آٹھ سال ہمارا نہایت قریبی ساتھ رہا۔ اس طویل عرصے میں مجھے یاد نہیں کہ کسی معاملے میں کبھی مجھے ان سے یا انھیں مجھ سے کوئی شکایت پیدا ہوئی ہو۔ نہایت پیار سے وقت گزرا۔ میں لطیفہ پسند بلکہ لطیفہ باز قسم کا آدمی ہوں۔ عظیم صاحب کو "فنون لطیفہ" سے زیادہ دلچسپی نہیں ہے، لیکن میں انھیں بھی اپنے ڈھب پر لے آتا تھا۔

۱۹۷۹ میں قصور کے محلہ کوٹ اعظم خاں کے باہر "الفیصل مسجد اہل حدیث" کی بنیاد رکھی۔ اب اس مسجد کو وہاں کی جماعت اہل حدیث کے مرکز کی حیثیت حاصل ہے۔

ہمارے دوست مولانا عبدالعظیم انصاری دلچسپ آدمی ہیں۔ ایک دفعہ میں نے ان سے تاریخ ولادت اور مقام ولادت وغیرہ سوالات کرتے ہوئے کہا اگر ہو سکے تو وجہ ولادت بھی بتا دیجیے۔

بولے: وجہ ولادت ہے، خدا کی مخلوق میں ایک گنہگار کا اضافہ......!"

عبدالعظیم انصاری کا حافظہ ماشاءاللہ بڑا تیز ہے۔ جماعت اہل حدیث کے بہت سے علماوزعما سے ان کے تعلقات رہے ہیں۔ ان سے متعلق "الاعتصام" اور جماعت کے دوسرے اخباروں ("ہفت روزہ اہل حدیث" اور تنظیم "اہل حدیث" وغیرہ) میں ان کے مضامین کی اشاعت کا سلسلہ جاری رہتا ہے جو ہمارے لیے استفادے کا باعث ہے۔

"تذکرہ علماے بھوجیاں" ان کی وہ کتاب ہے جو بہت سی معلومات پر مشتمل ہے اور علماے کرام کی ایک بڑی جماعت کے حالات اس میں خاص ترتیب کے ساتھ آگئے ہیں۔ یہ کتاب ایک نوحہ بھی ہے، ایک مرثیہ بھی ہے، ایک داستان بھی ہے، ایک تاریخ بھی ہے اور سکھوں کے مظالم کی ایک درد انگیز کہانی بھی ہے۔

عبدالعظیم انصاری کے بیٹے ماشاءاللہ لائق اور تعلیم یافتہ ہیں۔ یوں تو وہ سب کا احترام کرتے ہیں، لیکن اپنے والد سے میل جول رکھنے والوں سے بالخصوص تکریم سے پیش آتے ہیں۔

دعا ہے اللہ تعالیٰ مولانا عبدالعظیم انصاری کو صحت و عافیت سے رکھے تاکہ یہ زیادہ سے زیادہ اس کے دین کی خدمت کرسکیں اور ان کی آل اولاد کو اپنے باپ کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین یارب العالمین

❀❀❀

مولانا محمد یوسف

(ولادت ۱۹۱۹)

۱۹۴۸ء یعنی مرکزی جمعیت اہل حدیث کے قیام کے بعد جن حضرات سے ملنے اور تعلقات قائم کرنے اور قائم رکھنے کے مواقع میسر آئے ان میں مولانا محمد یوسف کا اسم گرامی قابل ذکر ہے۔ مجھے یاد پڑتا ہے ان سے پہلی ملاقات ۱۹۴۹ء کے ماہ مئی کے آخری ہفتے میں لاہور میں ہوئی تھی۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب مرکزی جمعیت اہل حدیث کی پہلی کانفرنس دارالعلوم تقویۃ الاسلام میں بصدارت مولانا محمد ابراہیم میر سیالکوٹی منعقد ہوئی تھی۔ میں اس زمانے میں مرکزی جمعیت کا آفس سیکرٹری تھا۔ کانفرنس کے اشتہارات چھپوانے' اخبارات میں اس کے متعلق اعلانات شائع کرانے' لوگوں کو اس میں شرکت کے لیے خطوط لکھنے' مہمانوں سے ان کے حسب مراتب پیش آنے اور ان کے قیام وغیرہ کے انتظام کا سلسلہ جن چار پانچ آدمیوں کے سپرد تھا' ان میں آفس سیکرٹری کی حیثیت سے میں بھی شامل تھا' بلکہ میری ذمہ داری بوجوہ سب حضرات سے زیادہ تھی۔

اس زمانے میں ہمارے مرحوم دوست مولوی محی الدین سلفیؒ دارالعلوم تقویۃ الاسلام میں درس نظامی کی انتہائی کتابیں پڑھتے تھے۔ ان کا تعلق جماعت اسلامی سے تھا۔ تقسیم ملک سے قبل وہ امرتسر میں حضرت مولانا نیک محمد مرحوم و مغفور کے حلقہ درس میں شامل رہے تھے۔ میرا خیال ہے لاہور کی اس کانفرنس کے موقعے پر مولانا محمد یوسف سے میرا تعارف انہی نے کرایا تھا۔

محی الدین نہایت میل جول کے آدمی تھے۔ وہ ۱۹۵۷ میں جماعت اسلامی کے نظام سے الگ ہو گئے تھے۔ ان کا تعلق حضرت مولانا عبدالغفار حسن صاحب سے تھا۔ مالیر کوٹلہ (مشرقی پنجاب) میں جب مولانا عبدالغفار حسن کا سلسلہ درس جاری تھا وہ ان کے دائرہ

شاگردی میں شامل رہے تھے۔ ۱۹۷۵ء میں جب پاکستان میں پیپلز پارٹی کی حکومت قائم تھی، وہ ہمارے دوست جناب مصطفیٰ صادق (مالک و مدیر روزنامہ "وفاق") کی کوشش سے پاکستان کے سفارت خانہ جدہ میں ملازم ہو گئے تھے۔ اپنے اہل و عیال کو بھی وہیں لے گئے تھے۔ انھوں نے ۷ جنوری ۱۹۷۶ کو اچانک جدہ میں وفات پائی۔ اس وقت ان کی عمر زیادہ سے زیادہ ۴۷، ۴۸ سال کی ہوگی۔ ان کی نماز جنازہ ان کے استاذ محترم حضرت مولانا عبدالغفار حسن نے پڑھائی تھی۔

جو بات میرے ذہن میں آ رہی ہے وہ یہ ہے کہ وہ مرکزی جمعیت کی لاہور کانفرنس کے موقعے پر ایک دن ایک صاحب کو دفتر لے کر آئے اور بتایا کہ ان کا نام مولانا محمد یوسف ہے۔ درمیانہ قد، کسرتی سا جسم، نہ بہت زیادہ دبلے نہ زیادہ موٹے، گندمی رنگ، ستواں چہرہ، تیکھے نقوش، سیاہ داڑھی، سفید تہبند اور سفید قمیص میں ملبوس، لبوں پر مسکراہٹ!

یہ پہلا موقع تھا کہ میں نے مولانا محمد یوسف کو دیکھا اور ان سے باتیں ہوئیں۔ نہایت منکسر، بے حد متواضع اور نرم کلام۔ ان سے مل کر انتہائی مسرت ہوئی۔ اس کے بعد وہ ہمارے مخلص ترین دوست تھے۔ "الاعتصام" جاری ہوا تو نہ صرف وہ خود اس کے خریدار بنے بلکہ بہت سے لوگوں کو اس کے خریدار بنایا۔ جب بھی جماعتی سلسلے میں یا اپنے کسی کام سے لاہور آئے، مجھ سے ملنے کی کوشش کی اور گفتگو میں نہایت اخلاص اور بے حد دھیمے پن کا مظاہرہ کیا۔ اس وقت سے لے کر اب تک یہی حال ہے۔ وہی اخلاص، وہی نرمی، وہی انکسار، وہی تواضع، وہی دھیما پن جو اب سے پچاس برس پہلے تھا، آج بھی ہے۔

اس نصف صدی میں ان کی عمر تو ضرور نصف صدی بڑھ گئی ہے، داڑھی سیاہ سے سفید ہو گئی ہے، جوانی کہولت کے دور سے آگے نکل کر بڑھاپے کی منزل میں داخل ہو گئی ہے۔ طاقت، کمزوری کا روپ دھار گئی ہے۔ تندرستی کی جگہ کئی قسم کی بیماریوں نے جسم میں ڈیرے ڈال لیے ہیں، بے فکری تفکرات میں بدل گئی ہے۔ لیکن ان کی خندہ روئی، خوش مزاجی اور حسن تکلم میں بحمداللہ کوئی فرق نہیں پڑا۔ دعا ہے اللہ تعالیٰ اپنے اس بندۂ خوش خصال پر اپنا سایۂ عاطفت ہمیشہ قائم رکھے۔ آمین۔

ان کے تذکرے میں یہ بات بھی بیان کرتا چلوں کہ جب سے ان کے ساتھ تعلقات استوار ہوئے ہیں' یہ مجھے "چودھری صاحب" کہہ کر پکارتے ہیں۔ جہاں ملاقات ہوئی اور جب ملے انھوں نے میرے لیے ہمیشہ صیغۂ تخاطب "چودھری صاحب" استعمال کیا۔ حالاں کہ نہ میں بہت زیادہ زمین جائداد کا مالک ہوں' نہ کسی کو ڈانٹ ڈپٹ کرتا اور برا بھلا کہتا ہوں' نہ موٹا تازہ اور بڑے پیٹ والا ہوں' نہ کھلا ڈلا کرتہ پہن کر یا بڑا سا تہبند باندھ کر جو ٹخنوں سے گھستا جائے' گاؤں کی چوپال میں بڑی سی چارپائی یا مونڈھے پر بیٹھ کر اس طرح حقہ پیتا ہوں کہ اس کا "نیچہ" ایک ملازم یا چوکیدار یا مزارع قسم کے آدمی کے ہاتھ میں ہو اور وہ باقاعدگی سے حقے کی نے میرے منہ میں ڈالتا جائے اور میں گڑ گڑ کرتا ہوا اسے پیتا جاؤں' نہ میں نے کوئی مالشیہ رکھا ہے جو میرے جسم کی مالش کرے اور میرے سر کے بالوں میں تیل "جھسے"۔ اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے' میں نے "موری ممبری" سے لے کر قومی اسمبلی کی رکنیت تک کبھی انتخاب لڑنے کی خواہش بھی نہیں کی' بلکہ ہمیشہ اس دھندے سے نفرت کا اظہار کیا' یعنی چودھریوں والی کوئی خصلت یا کوئی نشانی مجھ میں نہیں پائی جاتی' تو پھر خدا جانے مولانا یوسف مجھ حقیر فقیر کو چودھری کیوں کہتے ہیں۔ چلیے ان کی موج ہے' میں اس میں کیا دخل دے سکتا ہوں۔ اگر اس سے ان کا رانجھا راضی رہتا ہے تو اپنا کیا بگڑتا ہے۔ ان کی خوشی' اپنی خوشی۔ ان کا آرام اپنا آرام۔!

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ مولانا محمد یوسف جن کا تذکرہ ہو رہا ہے' ہیں کون؟ ان کا پس منظر اور پیش منظر کیا ہے؟ یہ کیا کرتے ہیں؟ پہلے کیا تھے' اب کیا ہیں؟ کس علاقے اور کس خاندان سے تعلق رکھتے ہیں؟ کہاں تعلیم حاصل کی؟ کن اساتذہ کے حضور زانوئے شاگردی تہہ کیا؟ اور آج کل کیا مشاغل ہیں؟ آیئے ذیل کی سطور میں ان سوالات کا جواب تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

مولانا محمد یوسف مشرقی پنجاب کے ضلع فیروز پور کے ایک گاؤں چک سومیاں میں جو "اعوان" کے نام سے معروف تھا' ۱۹۱۹ء کو پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا اسم گرامی کمال الدین تھا اور دادا کا حق نواز---! اس نواح کا یہ غیر معروف مگر نیک سیرت گھرانا تھا۔ اس

کا اندازہ اس سے کیجیے کہ حق نواز کا انتقال نماز پڑھتے ہوئے حالت سجدہ میں ہوا تھا۔

فیروز پور سے فاضل کا بنگلہ اور بہاول نگر کو جانے والی ریلوے لائن پر تیسرا اسٹیشن گورو ہر سائے تھا جو فیروز پور سے اکیس میل کے فاصلے پر تھا۔ اب معلوم نہیں کیا صورت حال ہے' تقسیم ملک سے قبل ہر ریلوے اسٹیشن کا باہمی فاصلہ تقریباً سات میل ہوتا تھا اور سات میل کا کرایہ دو آنے تھا۔ فیروز پور شہر سے بذریعہ ریل فاضلکا بنگلہ کو جائیں تو پہلا اسٹیشن کھائی پھیمکی اور دوسرا جھوک ٹہل سنگھ تھا۔ لکھو کے اور حضرت مولانا محمد علی لکھوی کے مسکن مرکز الاسلام جانے والے لوگ اسی اسٹیشن (جھوک ٹہل سنگھ) پر اترتے تھے۔ جھوک ٹہل سنگھ سے سات میل آگے گورو ہر سائے تھا۔ گورو ہر سائے سے چک سومیاں اعوان پانچ میل دور تھا۔ گورو ہر سائے اس علاقے کا اچھا خاصا قصبہ تھا اور مشہور منڈی تھی۔ یہ سکھوں کے قدیم دور کے گوروؤں کا قصبہ تھا جو مال دار اور زمیندار لوگ تھے۔

تقسیم ملک سے ڈھائی مہینے پہلے جون ۱۹۴۷ء کے ابتدائی دنوں میں گوروؤں کا یہ خاندان گورو ہر سائے سے مکتسر چلا گیا تھا۔ فیروز پور کی پانچ تحصیلیں تھیں۔

(۱) فیروز پور (۲) زیرہ (۳) فاضلکا (۴) موگا اور (۵) مکتسر۔

فیروز پور' فاضلکا اور زیرہ کی تین تحصیلوں میں مسلمانوں کی اکثریت تھی اور غیر مسلموں کو شبہ تھا کہ یہ تحصیلیں پاکستان میں شامل ہوں گی۔ مکتسر اور موگا میں سکھوں کی اکثریت تھی اور مکتسر سکھوں کا دھارمک (مذہبی) مقام تھا' جہاں بہت بڑا تالاب اور گوردوارہ تھا اور ہر سال پوہ کے مہینے میں وہاں سکھوں کا میلہ لگتا تھا اور تالاب میں اشنان کیا جاتا تھا۔ مرد بھی اس میلے اور اشنان میں دور دور سے آتے تھے اور عورتیں بھی۔ وہ اپنے بچوں اور بوڑھوں اور بیماروں کو بھی ساتھ لانے کی کوشش کرتے تھے۔

گورو ہر سائے کے گورو جو بڑے اثر و رسوخ کے مالک تھے' مسلمانوں کے ڈر سے قیام پاکستان سے کئی ہفتے پہلے مکتسر چلے گئے تھے۔ وہ بذریعہ ریل گورو ہر سائے سے ہمارے شہر کوٹ کپورے آئے۔ ہمارے خاندان کے زیادہ لوگ ٹرانسپورٹ کا کام کرتے تھے اور

موگا' فیروز پور اور مکتسر کو بسیں چلتی تھیں- کوٹ کپورہ سے مکتسر اکیس میل تھا اور چار آنے کرایہ تھا- گوروؤں کے خاندان کی بہت سی عورتیں اور مرد کوٹ کپورہ سے بس کے ذریعے مکتسر گئے تھے- یہ سب لوگ سہمے ہوئے تھے اور انھیں دیکھ کر ترس آتا تھا- بس میں بیٹھے ہوئے بڑے چھوٹے سب گورو بڑی لجاجت سے پوچھتے تھے' گاڑی کس وقت چلے گی؟ ہمیں جلد مکتسر پہنچاؤ- بسوں کے مالک اور ڈرائیور وغیرہ سب مسلمان تھے اور ہمارے عزیز تھے-

بات اصل میں یہ ہے کہ ضلع فیروز پور میں مجموعی اعتبار سے مسلمانوں کی اکثریت تھی اور لوگوں کا خیال تھا کہ اس ضلعے کے بعض مقامات پاکستان میں شامل ہو جائیں گے' اس لیے وہاں کے غیر مسلم سہمے ہوئے تھے اور وہ ان علاقوں میں چلے گئے تھے' جن میں غیر مسلموں کی اکثریت تھی' گورو ہرسہاے کے گورو بھی اس زمانے میں خوف زدہ تھے' حالاں کہ وہ اس نواح میں بہت بڑی حیثیت کے مالک تھے-

گورو ہرسائے کے بارے میں ایک بات اور سنیے---! کسی زمانے میں اس کے قریب ایک کٹیا میں ایک سادھو رہتا تھا' جس کا نام "دیا سنگھ" تھا- اس نے گورمکھی رسم الخط میں ایک کتاب لکھی تھی' جس کا نام تھا "زندگی بلاس-" پھر وہ کتاب فارسی رسم الخط میں منتقل ہوئی اور بہت دفعہ چھپی- دیا سنگھ نے نہایت خوب صورت پنجابی اشعار میں لکھا تھا کہ انسان پہلے سال سے لے کر سو سال تک کن کن منزلوں سے گزرتا ہے اور کن کن افکار میں اس کی زندگی ڈھلتی ہے- بچپن میں اس کی کیا کیفیت ہوتی ہے' جوانی میں کیا ہوتی ہے' کہولت میں کیا ہوتی ہے اور بڑھاپے کا دور کن حالات میں گزرتا ہے- انسانی زندگی کی یہ سو سالہ داستان تھی جو دلآویز پنجابی اشعار میں بیان کی گئی تھی- اسے پنجابی ادب اور نصائح کا بہترین مرقع کہنا چاہیے- کتاب بہت مقبول ہوئی تھی اور بہت پڑھی جاتی تھی- اب وہ کتاب نایاب ہے- مجھے اس کی تلاش ہے' کہیں سے ملی نہیں- بعض پرانے لوگوں نے اس کے متعلق مجھ سے پوچھا بھی ہے اور طلب بھی کی ہے' لیکن میں اس کے حصول میں کامیاب نہیں ہو سکا-

۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو جب برصغیر آزاد ہو گیا اور پاکستان معرض وجود میں آ گیا اور گورو ہرسائے جو ضلع اور تحصیل فیروز پور میں واقع تھا' ہندوستان کے حصے میں آیا تو یہاں کے گورو مکتسر سے اپنے وطن گورو ہرسائے گئے۔

آزادی سے کچھ عرصہ بعد ہندوستان کی حکومت نے ریاستیں ختم کر دی تھیں اور ہماری ریاست فرید کوٹ کو ضلع بنا دیا گیا تھا---مکتسر اور موگا دونوں تحصیلیں ضلع فرید کوٹ میں شامل کر دی گئی تھیں۔

بات مولانا محمد یوسف کے آبائی وطن اور ان کے مولد و مسکن کی ہو رہی تھی جو گورو ہرسائے کی وجہ سے اس علاقے کی جغرافیائی حدود میں پہنچ گئی۔ تاہم تھوڑی بہت معلومات میرے خیال میں اس میں بھی پائی جاتی ہیں۔

محمد یوسف' شہری آبادی سے دور خالص دیہاتی ماحول میں رہنے کے باوجود بچپن ہی میں حصول علم کی راہ پر گامزن ہو گئے تھے۔ ناظرہ قرآن مجید اپنے گاؤں کے ایک بزرگ میاں دل محمد سے پڑھا۔ صرف و نحو کی ابتدائی کتابیں ضلع فیروز پور کے ایک عالم مولانا محمد قلعوی سے پڑھیں' جو مدرسہ رحمانیہ دہلی کے فارغ التحصیل تھے۔

۱۹۳۸ء میں فیروز پور شہر کی مسجد اہل حدیث گنبداں والی میں حضرت مولانا عطاء اللہ حنیف نے ''دارالحدیث نذیریہ'' کے نام سے ایک دارالعلوم قائم کیا تھا۔ اس دارالعلوم میں بہت سے طلبا و علما نے استفادہ کیا' محمد یوسف نے بھی اس میں داخلہ لیا اور مولانا عطاء اللہ صاحب سے مستفید ہوئے۔ مولانا مرحوم کا ۲ اور ۳ اکتوبر ۱۹۸۷ء کی درمیانی شب کو لاہور میں انتقال ہوا۔ ان کا سال ولادت ۱۹۰۹ء ہے۔ انھوں نے کم و بیش ۷۸ برس عمر پائی۔

مولانا عطاء اللہ حنیف سے تھوڑے بہت استفادے کے بعد یوسف نے ضلع قصور کے ایک قصبے عثمان والا کا قصد کیا۔ وہاں مولانا محمد داؤد ارشد کا سلسلۂ تدریس جاری تھا۔ ان کے مدرسے کا نام ''مدرسہ قمر الہدیٰ'' تھا۔ انھوں نے ان سے متعدد درسی کتابیں پڑھیں۔

مولانا محمد داؤد ارشد بلند اخلاق' عالی کردار اور نہایت مہمان نواز عالم دین تھے- تقسیم ملک کے بعد میاں چنوں چلے گئے تھے- وہاں ان کے مدرسے کا نام "مدرسہ حفظ القرآن والحدیث" تھا-

وہ ۱۹۱۱ء میں پیدا اور ۹ مئی ۱۹۶۶ء کو فوت ہوئے-

عثمان والا سے یوسف صاحب استاذ پنجاب حضرت مولانا عطاء اللہ لکھوی مرحوم کی خدمت میں گئے اور "جامعہ محمدیہ" میں داخل ہوئے- اس جامعہ کا اجرا حضرت حافظ محمد لکھوی (متوفی ۱۳۱۱ھ-۱۸۹۴ء) نے کیا تھا- ان کے صاحب زادہ گرامی قدر مولانا محی الدین عبدالرحمٰن لکھوی (متوفی ۱۳۱۳ھ- ۱۸۹۶ء) طویل عرصے تک جامعہ محمدیہ میں فرائض تدریس انجام دیتے رہے-

پھر مولانا عبدالقادر لکھوی مرحوم (متوفی ۱۹۲۴ء) بھی جامعہ محمدیہ میں کئی سال مصروف درس و تدریس رہے- ان کی وفات کے بعد ان کے نیک اطوار صاحب زادے حضرت مولانا عطاء اللہ لکھوی نے جامعہ محمدیہ میں مسند تدریس آراستہ کی- ان کا سال ولادت ۱۸۸۲ء (۱۲۹۹ھ) ہے- ۱۹۰۵ء میں انھوں نے حضرت امام مولانا عبدالجبار غزنوی سے سند حدیث حاصل کی اور اسی سال اپنی خدمات جامعہ محمدیہ کے سپرد کر دیں- تمام عمر اس جامعہ سے وابستہ رہے- تقسیم ملک کے بعد مشرقی پنجاب کی یہ درس گاہ اوکاڑہ (پاکستان) میں منتقل ہو گئی تو حضرت مولانا عطاء اللہ لکھوی وہاں تشریف لے گئے--- یہیں خدمت انجام دیتے ہوئے ۲۶ نومبر ۱۹۵۲ء (۷ ربیع الاول ۱۳۷۲ھ) کو یہ مرد جلیل سفر آخرت پر روانہ ہو گئے- اللھم اغفرلہ و رحمہ-

ہمارے ممدوح مولانا محمد یوسف نے مولانا عطاء اللہ لکھوی رحمۃ اللہ علیہ سے بھی استفادہ کیا- جامعہ محمدیہ لکھوکے سے انھوں نے امرتسر کا عزم کیا اور دارالعلوم تقویۃ الاسلام (مدرسہ غزنویہ) میں داخل ہوئے- وہاں مندرجہ ذیل اساتذہ سے حصول علم کیا-

۱- مولانا نیک محمد صاحب سے مسلم' ابوداؤد' ترمذی اور حدیث کی بعض دوسری

کتابیں پڑھیں۔

۲۔ مولانا محمد حسین ہزاروی سے شرح جامی اور تفسیر قرآن کی وہ کتابیں پڑھیں جو اس دارالعلوم کے نصاب میں شامل تھیں۔

۳۔ مولانا عبداللہ شہید بھوجیانی سے منطق کی شرح تہذیب اور تفسیر جامع البیان پڑھیں۔ یہاں یہ یاد رہے کہ مولانا عبداللہ بھوجیانی کو حضرت مولانا ثناءاللہ امرتسری ''منطقی'' کے لقب سے یاد فرمایا کرتے تھے اور منطق کے بعض مسائل کے متعلق ان سے گفتگو کیا کرتے تھے۔ اگست ۱۹۴۷ء میں مولانا عبداللہ کو سکھوں نے ان کے گاؤں بھوجیاں میں حملہ کر کے شہید کر دیا تھا۔

۴۔ مولانا عبداللہ شہید کے چھوٹے بھائی مولانا عبدالرحیم تھے۔ ان سے مولانا یوسف صاحب نے عربی ادب کی مقامات حریری اور بعض دوسری کتابوں کی تکمیل کی۔ یہ بھی اگست ۱۹۴۷ء میں سکھوں کے حملے سے اپنے گاؤں بھوجیاں میں شہید ہو گئے تھے۔

یہ دونوں بھائی اپنے دور کے ممتاز عالم، بہت اچھے مدرس اور عالی قدر بزرگ تھے۔

قیام امرتسر کے زمانے میں نماز جمعہ مولانا محمد یوسف مدرسہ غزنویہ میں پڑھا کرتے تھے۔ مدرسے کے ہر طالب علم کے لیے مدرسے کی مسجد میں جمعہ پڑھنا ضروری تھا۔ جمعے کے بعد وہ عام طور پر مولانا ثناءاللہ امرتسری کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔ ایک روز اپنے معمول کے مطابق مولانا کی خدمت میں گئے تو انھوں نے ان سے چند باتیں بطور امتحان پوچھیں اور پھر ان کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے جامع ترمذی کی شرح تحفۃ الاحوذی انھیں انعام کے طور پر عنایت فرمائی۔

امرتسر سے وہ دہلی پہنچے اور وہاں مدرسہ دارالکتاب والسنہ میں داخل ہوئے۔ اس وقت مولانا حافظ عبدالستار دہلوی، مولانا عبدالجلیل پنجابی اور مولانا عبدالرحمٰن نومسلم اس مدرسے میں فرائض تدریس انجام دینے پر مامور تھے۔ حافظ عبدالستار صاحب سے انھوں نے صحیح بخاری پڑھی۔ دوسرے اساتذہ کرام سے بعض دوسری کتابیں پڑھیں۔

حصول علم اور تحقیق مسائل سے انھیں ہمیشہ شغف رہا۔ اس کا اندازہ اس سے کیجیے کہ

امرتسر کے دارالعلوم تقویۃ الاسلام یعنی مدرسہ سلفیہ غزنویہ کے دوران طالب علمی میں بھی، پھر ۱۹۴۴ء میں فارغ التحصیل ہونے کے بعد بھی اور تقسیم ملک کے بعد راجووال میں اپنا مدرسہ قائم کرنے کے بعد بھی ان کا ہمیشہ یہ معمول رہا کہ مطالعہ وتدریس کے دوران کوئی الجھن پیدا ہوتی تو صحیح بخاری اور بعض دوسری کتابوں کے ان مقامات پر نشان لگا لیتے اور پھر ان مقامات کو سمجھنے کے لیے مہینے ڈیڑھ مہینے کے بعد حضرت حافظ عبداللہ روپڑی یا حضرت حافظ محمد گوندلوی کی خدمت میں جاتے اور اس وقت تک وہاں رہتے جب تک نشان زدہ مقامات اچھی طرح ذہن کی گرفت میں نہ آ جاتے۔

وہ ۱۹۴۴ء میں فارغ التحصیل ہوئے تھے۔

تقسیم ملک کے وقت ان کی عمر اٹھائیس برس کی تھی اور یہ ان کی بھرپور جوانی کا زمانہ تھا۔ وہ اپنے گاؤں چک سومیاں اعوان سے چلے اور پاکستان کی حد میں داخل ہوئے تو سب سے پہلے موضع ''اہل'' میں سکونت اختیار کی جو اس وقت ضلع لاہور میں تھا، بعد میں ضلع قصور میں شامل کر لیا گیا تھا۔ یہاں تقریباً چار سال اقامت گزیں رہے۔ وہاں بچوں کی تعلیم وتعلم کا سلسلہ شروع کیا اور جس انداز میں اس وقت کام کر سکتے تھے، کرنے کا آغاز فرمایا۔

بعد ازاں ۱۹۵۲ء میں ''راجووال'' کا عزم کیا، جو اس وقت چھوٹا سا گاؤں تھا اور ضلع منٹگمری (موجودہ ساہیوال) میں شامل تھا۔ وہاں اہل حدیث حضرات کی ایک مسجد تھی، جو ۱۹۴۳ء میں بنائی گئی تھی۔ اب یہ ایک شہر نما قصبہ ہے جو قصور دیپال پور روڈ پر واقع ہے۔ سرسبز وشاداب اور ضلع اوکاڑہ کا حصہ۔

یہاں آ کر مولانا نے بڑی محنت کی اور اس بنجر وخشک علاقے میں تعلیم پھیلائی۔ ان دنوں وہاں کے لوگ مسجد میں عیدین کی نماز پڑھتے تھے، باہر کھلی جگہ جا کر نماز عید پڑھنے کا ان کے نزدیک کوئی تصور نہ تھا۔ مولانا نے اس کا آغاز کیا اور پہلی دفعہ سنت کے مطابق عید کی نماز پڑھنے کے لیے گاؤں سے باہر نکلے تو صرف چار افراد تھے۔ ایک خود مولانا اور ایک اس علاقے کا پٹواری۔ ایک مولانا کی اہلیہ محترمہ اور ایک پٹواری صاحب کی زوجہ مکرمہ۔ یعنی دو مرد اور دو عورتیں۔

اپنے والد محترم کمال الدین کے نام سے "دارالحدیث کمالیہ" کے عنوان سے ایک دارالعلوم قائم کیا- یہ ادارہ تین کنال ایک مرلہ زمین میں واقع ہے' جس کی بنیادی اینٹ حضرت حافظ محمد گوندلوی اور حضرت حافظ عبداللہ روپڑی نے رکھی- کچھ کام آگے بڑھا تو لڑکیوں کی تعلیم کے لیے ایک مدرسہ قائم کیا گیا' جس کے لیے چار کنال کا پلاٹ الگ حاصل کیا گیا جو زیر تعمیر ہے- اب ماشاء اللہ اس نواح میں یہ اہل حدیث کا بھی ایک مرکز ہے اور تعلیم و تعلم کا بھی معروف مقام ہے-

اس کے قیام سے پہلے مولانا نے جو خواب دیکھے تھے' یہاں ان کا ذکر کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے-

۱- فارغ التحصیل ہونے کے بعد انھوں نے خواب میں دیکھا کہ کسی سفر پر جا رہے ہیں- راستے میں دریا بہہ رہا ہے- وہ اس میں داخل ہو گئے- ان کے پاس تعلیم سے فراغت کی سند بھی ہے- پانی بہت زیادہ ہے- وہ اپنی سند بھیگنے سے بچانا چاہتے ہیں- لیکن بے حد کوشش کے باوجود نہیں بچا سکے- سند بھیگ گئی اور الفاظ کی سیاہی کاغذ پر ادھر ادھر پھیل گئی- اس سے وہ بہت پریشان ہوئے-

خواب اساتذہ سے بیان کیا تو انھوں نے کہا اس میں پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں' یہ بہت اچھا خواب ہے- اس کی تعبیر یہ ہے کہ اللہ تم سے اپنے دین کا کام لے گا اور لوگ تم سے علم حاصل کریں گے اور اپنی قابلیت کے مطابق مشرق و مغرب اور جنوب و شمال میں جا کر اللہ کے دین کی تبلیغ کریں گے' اس طرح وہ تم سے حاصل کردہ علم کو مختلف علاقوں میں پھیلانے کا باعث بنیں گے-

چنانچہ اس خواب کی تعبیر راجووال میں دارالحدیث کمالیہ قائم کرنے کی صورت میں سامنے آئی-

۲- راجووال کو جب انھوں نے تبلیغ دین اور اشاعت علم کا مرکز بنایا تو حالت خواب میں ایک خوب صورت اور موٹی تازی گائے دیکھی' جس کی تعبیر پوچھی گئی تو بتایا گیا کہ خواب میں گائے دیکھنا بہت اچھا ہے' جیسا کہ صحیح بخاری کی "کتاب التعبیر" میں باب قائم کیا گیا ہے'

"باب اذا رای بقراً تنحر" اس میں گائے کا ذکر کیا گیا ہے۔

اچھا خواب چوں کہ مومن کے لیے اچھی نوید کا باعث بنتا ہے اور کسی کار خیر سے متعلق اس کے لیے خوش خبری کا موجب ثابت ہوتا ہے' اس لیے اس قسم کے خوابوں سے مولانا محمد یوسف کا حوصلہ بڑھا اور انھوں نے اللہ پر توکل کر کے اس علاقے میں تدریس و تعلیم کا آغاز کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی مدد فرمائی اور ان کے خلوص نیت اور جذبہ صادقہ کی وجہ سے اس دار العلوم سے بے شمار علمائے دین پیدا ہوئے' جنھوں نے مختلف علاقوں میں پھیل کر اللہ کے دین کی بے حد خدمت کی اور کتاب و سنت کی نشر و اشاعت کا باعث بنے۔ یہ سلسلہ مسلسل آگے بڑھ رہا ہے اور اللہ تعالیٰ مدد فرما رہا ہے۔

مولانا محمد یوسف نہایت سادہ زندگی بسر کرتے اور عوام میں گھل مل کر رہتے ہیں۔ کسی سے کسی قسم کی کدورت نہیں رکھتے۔ ان کا آئینہ قلب بغض و عداوت کے داغ دھبوں سے صاف اور سطح ذہن رنج و دشمنی سے قطعی طور سے پاک ہے۔ وہ اپنی عملی زندگی میں رسول اللہ ﷺ کی اس حدیث کا صحیح ترین نمونہ ہیں جو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مشکوۃ شریف کے "باب البکاء والخوف" میں وارد ہے۔ نبی ﷺ فرماتے ہیں۔

أَمَرَنِی رَبِّی بِتِسْعٍ۔

میرے رب نے مجھے نو (۹) چیزوں کا حکم دیا ہے۔

۱۔ خشیة الله فی السر و العلانیة۔

(ظاہر اور پوشیدہ حالت میں اللہ سے ڈرنا۔)

۲۔ کلمة العدل فی الغضب و الرضا۔

(خوشی اور غصے کی حالت میں انصاف کی بات کرنا۔)

۳۔ و القصد فی الفقر و الغنی۔

(فقر اور غنا میں میانہ روی اختیار کرنا۔)

٤۔ و ان اصل من قطعنی۔

(جو شخص مجھ سے قطع رحمی کرے' میں اس سے صلہ رحمی کروں۔)

۵۔ و اعطی من حرمنی۔

(جو شخص مجھے محروم رکھے' میں اسے دیتا رہوں۔)

۶۔ و اعفو من ظلمنی۔

(جو شخص مجھ پر ظلم کرے' میں اسے معاف کردوں۔)

۷۔ و ان یکون صمتی فکراً۔

(میری خاموشی میرے غور و فکر کا باعث ہو۔)

۸۔ و نطقی ذکراً۔

(میرا بولنا ذکر الٰہی ہو۔)

۹۔ و نظری عبرۃ۔

(میرا دیکھنا میرے لیے موجب عبرت ہو۔)

جہاں تک مجھے معلوم ہے اس حدیث پاک کا ہر لفظ مولانا محمد یوسف کی زندگی کا عکاس اور ان کے شب و روز کے عمل کا غماز ہے۔ ان سے متعدد لوگوں نے اس قسم کی باتیں کیں جن سے کسی شخص کا مشتعل ہو جانا کوئی بہت بڑی بات نہیں ہے۔ لیکن وہ کبھی اشتعال میں نہیں آئے۔ اپنے مخالفوں کے لیے ان کا رویہ ہمیشہ درگز اور عفو و کرم کا رہا۔ اس کے ثبوت کے لیے متعدد واقعات میں سے چند واقعات یہاں بیان کیے جاتے ہیں۔

۱۔ ضلع قصور کے قصبہ کھڈیاں سے جماعت کے بعض احباب ایک دفعہ مولانا کے پاس آئے۔ مولانا نے خیر و عافیت کے بعد اپنے معمول اور عادت کے مطابق ان سے کچھ کھانے پینے کے لیے اصرار کیا تو انھوں نے کہا کہ ہمارے پاس یہاں کچھ دیر ٹھہرنے اور کھانے پینے کے لیے وقت نہیں ہے۔ ہم بہت جلد واپس جانا چاہتے ہیں۔ مولانا نے اتنی جلدی واپس جانے کی وجہ پوچھی تو انھوں نے کہا کل ہمارے ہاں ایک شخص گیا' جسے ہم جانتے نہیں ہیں۔ مجلس میں گفتگو کرتے ہوئے آپ کا ذکر چھڑا تو اس نے کہا:

چھوڑیے جی مولوی یوسف کو' وہ بہت غلط اور غاصب آدمی ہے۔

ہم نے پوچھا: وہ کس طرح غاصب اور غلط آدمی ہیں؟

اس نے جواب دیا: گزشتہ رات میں راجووال میں تھا- مولوی یوسف کے پاس ایک مسافر آیا' جس کے پاس اچھا خاصا سونا یا نقد روپے تھے- اس نے اپنا یہ سرمایہ مولوی صاحب کے پاس بطور امانت رکھا- مولوی صاحب نے اس امانت کو ہضم کرنے کے لیے اس شخص کو زہر کھلا کر مار دیا ہے-

ہمارے لیے یہ بہت بڑی بات تھی- ہم اسے چند آدمیوں کے سپرد کر کے کہ بھاگ نہ جائے' حقیقت معلوم کرنے کے لیے آپ کے پاس آئے ہیں- اگر یہ بات غلط ہے تو ہم اسے اس کی سخت سزا دیں گے-

مولانا نے فرمایا: بات تو بالکل غلط ہے' لیکن تم اسے پکڑ کر سزا نہ دو- یہاں سے جاتے ہی اسے چھوڑ دو- معلوم نہیں اس نے اتنا بڑا جھوٹ کیوں بولا ہے؟ میری ذات کے لیے اسے کچھ نہ کہو- تم اسے تکلیف دو گے تو وہ بے چارہ پریشان ہوگا- کسی مسلمان کا کسی مسلمان کو تکلیف دینا جائز نہیں- جس طرح مسلمان سے نرمی کا برتاؤ کرنا شرعی اعتبار سے موجب ثواب ہے' اسی طرح اس پر سختی سے پیش آنا قابل گرفت ہے- تم اس پر نرمی کر کے ثواب حاصل کرو- سختی کر کے گناہ کا ارتکاب نہ کرو-

۲- مولانا نے جب راجووال میں کلمہ توحید بلند کیا اور لوگوں کو بدعات و منکرات سے روکنے کا سلسلہ شروع کیا تو اردگرد کے بعض حضرات نے ان کی شدید مخالفت کی اور ان بنیادی شرعی احکام کی تبلیغ سے انھیں باز رکھنے کے لیے ہر حربہ استعمال کیا- لیکن انھوں نے اپنے پیارے اور میٹھے انداز میں نشر و اشاعت دین کی مہم ہر حال میں جاری رکھی' جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہاں مسجد بھی تعمیر ہوئی' دارالعلوم بھی قائم ہوا' لڑکیوں کے لیے دینی تعلیم کا منصوبہ بھی عمل میں آیا اور اس کے لیے دو کنال زمین راجووال کے ایک مخیّر بزرگ جناب نور صمد ولد محمد مہر دین نے عطا کی اور دو کنال ایک نیک طینت شخص جناب حاجی محمد اسحاق ولد محمد اسماعیل نے وقف کی- اللہ انھیں جزائے خیر سے نوازے- آمین-

مولانا کی کوشش سے راجووال کی مسجد اور مدرسے میں سلسلہ اصلاح و تدریس جاری تھا' تبلیغ حق ہو رہی تھی اور اچھی خاصی تعداد میں طلبا تعلیم حاصل کر رہے تھے- لیکن ایک دفعہ

حالات نے کچھ ایسی کروٹ لی کہ وہ راجووال سے ضلع قصور کے ایک قصبے "راجا جنگ" چلے گئے۔ ایک سال وہاں رہے۔ پھر راجووال کے ایک بزرگ میاں محمد عمر ولد نور محمد مرحوم اور میاں محمد حسن ولد محمود مرحوم نے مولانا معین الدین لکھوی سے رابطہ پیدا کیا اور ان کی رفاقت میں راجا جنگ مولانا کی خدمت میں گئے اور انھیں واپس راجووال لے کر آئے۔ میاں محمد حسن نے اپنی کچھ زمین مولانا کے نام رجسٹری کرادی تھی، لیکن مولانا نے یہ زمین اپنے پاس نہیں رکھی بلکہ مدرسے کے نام منتقل کرادی۔

مولانا محمد یوسف کو اللہ تعالیٰ نے بہت سی خوبیوں سے نوازا ہے۔ ان کی ابتدائی تربیت بھی اچھے ماحول میں ہوئی، اور تعلیم بھی پاک باز اور بلند خو اساتذہ سے حاصل کی۔ یہاں ان کے تقویٰ شعار اساتذہ میں سے ایک صالح فطرت استاذ مولانا محمد داؤد ارشد سے متعلق (جن کا ذکر پہلے گزر چکا ہے) ایک واقعہ بیان کرنے کو جی چاہتا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ مختلف واقعات کے ہجوم میں یہ واقعہ ذہن سے نکل جائے، اس لیے اسے یہاں لکھنا ضروری ہے۔

مولانا محمد داؤد ارشد کے ایک شاگرد حافظ عبدالمنان ملتانی روایت کرتے ہیں کہ ایک دن وہ مولانا سے مسلم شریف پڑھ رہے تھے۔ اچانک مولانا نے کتاب بند کردی اور آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ شاگرد (حافظ عبدالمنان) نے استاذ محترم سے عرض کیا:

آپ کو اچانک کوئی تکلیف ہو گئی ہے؟

فرمایا: نہیں۔ کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔ بات یہ ہے کہ رات میں نے خواب میں دیکھا کہ پانی کا ایک کنواں ہے، جو پہلے جاری تھا اور لوگ اس سے خوب پانی بھر رہے تھے اور اپنی پیاس بجھا رہے تھے۔ پھر وہ کنواں اچانک بند ہو گیا۔

اس کی تعبیر مجھے یہ معلوم ہوتی ہے کہ میری زندگی اب بہت کم رہ گئی ہے اور تدریس کا یہ سلسلہ جو میں چلا رہا ہوں ختم ہونے والا ہے --- چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اس سے چند روز بعد ۹ مئی ۱۹۶۶ء کو وہ اس دنیاے فانی سے عالم آخرت کی طرف روانہ ہو گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مولانا محمد داؤد ارشد سے ان سطور کے راقم کا بھی تعلق رہا ہے۔ وہ نہایت عمدہ خصال اور مہمان نواز عالم دین تھے۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔ آمین۔

مولانا محمد یوسف نے عالم طفولیت سے لے کر اب تک کہ عالم پیری میں داخل ہو گئے ہیں' صاف ستھری زندگی بسر کی ہے۔ انتہائی دیانت دار' بے حد محتاط۔ اس کی بہت سی مثالوں میں سے صرف دو مثالیں ملاحظہ ہوں۔

۱۔ انھوں نے اب تک تین حج کیے ہیں۔ پہلا حج ۱۹۵۴ء میں کیا۔ اس وقت آج کل کی نسبت حج پر بہت کم پیسے خرچ ہوتے تھے۔ اس حج میں راجووال کے چند حضرات ان کے رفقائے سفر تھے۔

دوسرا حج ۱۹۶۲ء میں کیا۔ کراچی پہنچے تو حضرت حافظ عبداللہ روپڑیؒ اور حافظ عبدالقادر روپڑیؒ کی رفاقت میسر آ گئی۔ کراچی سے لے کر جدہ تک کا یہ بحری جہاز کا سفر تھا جو آٹھ دن میں ختم ہوا تھا۔ اس اثنا میں انھوں نے حضرت حافظ عبداللہ روپڑیؒ سے خوب استفادہ کیا۔ مشکوٰۃ شریف ساتھ لے کر گئے تھے۔ اسے پڑھتے اور حافظ صاحب سے مستفید ہوتے رہے۔

تیسرا حج ۱۹۷۹ء میں کیا۔ اس سال انھوں نے رمضان کے روزے بیت اللہ شریف میں رکھے اور اعتکاف کیا۔

یہاں عرض یہ کرنا مقصود ہے کہ پہلا اور تیسرا یعنی دو حج انھوں نے اپنے خرچ پر کیے تھے۔ دوسرا حج جو ۱۹۶۲ء میں کیا' حج بدل تھا جو موضع ''ببر کھائی'' کے ایک بزرگ ماسٹر محمد سعید نے کرایا تھا۔ مولانا نے جمعے کی نماز کے بعد راجووال کی مسجد میں ماسٹر محمد سعید صاحب سے یہ اعلان کرایا کہ

''یہ میری طرف سے حج بدل پر جا رہے ہیں' اور اس حج کا تمام خرچ میں اپنی جیب سے ادا کر رہا ہوں۔۔۔''

مقصد اس سے یہ تھا کہ کوئی شخص یہ بدگمانی نہ کرے کہ مولوی صاحب شاید مدرسے کی رقم سے حج کے لیے جا رہے ہیں۔ یہ ان کی دیانت و احتیاط اور کسی قسم کے الزام سے اپنے آپ کو

محفوظ رکھنے کی کوشش تھی---!

۲- ان کے پاس مہمان کثرت سے آتے ہیں' ان کے کھانے پینے کا انتظام وہ اپنے گھر میں کرتے ہیں- یہ تمام مہمان صرف ان کے ذاتی نہیں ہوتے- مدرسے کے سلسلے میں بھی مہمانوں کی آمد ورفت رہتی ہے- لیکن وہ ان کا خرچ بالعموم مدرسے پر نہیں ڈالتے-

ایک ان کی خصوصیت یہ ہے کہ روزنامہ اخبار گھر میں نہیں جانے دیتے- مدرسے ہی میں بیٹھ کر پڑھتے ہیں- اس کی وجہ یہ ہے کہ اخبار میں مردوں اور عورتوں کی عجیب وغریب قسم کی تصویریں چھاپی جاتی ہیں- فلمی اشتہارات اور فلمی ایکٹروں اور ایکٹرسوں کی تصویریں بھی شائع کی جاتی ہیں' جنھیں بچے دیکھتے ہیں تو برا اثر لیتے ہیں-

یہ انتہائی بے احتیاطی کا دور ہے اور اخبارات میں تصویروں کے علاوہ جرائم کی خبریں بھی چھپتی ہیں جنھیں پڑھ کر نہایت شرم محسوس ہوتی ہے- لیکن اس کے باوجود ہمارے گھروں میں اخبار آتے ہیں اور گھر کے چھوٹے بڑے تمام افراد انھیں پڑھتے ہیں- اللہ تعالیٰ مولانا کو خوش رکھے کہ وہ اس قدر احتیاط کا ثبوت دیتے ہیں کہ اخبار کے لیے انھوں نے اپنے گھر کے دروازے بند کر رکھے ہیں-

مولانا یوسف نے جب سے ہوش سنبھالا ہے' اپنے آپ کو خدمت دین کے لیے وقف کر رکھا ہے- درس و تدریس اور وعظ و تبلیغ کے ساتھ ساتھ دین کی جس بنیادی خدمت کو انھوں نے لازمہ حیات قرار دے رکھا ہے' وہ مرزائیت کی مخالفت اور قادیانی نبوت کے خلاف اعلان جنگ ہے- ۱۹۵۳ء میں مرزائیت کے خلاف جو زبردست تحریک شروع ہوئی تھی' اس میں اہل حدیث علما و عوام نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا- مولانا یوسف بھی اپنے رفقا کے ساتھ اس تحریک میں شامل تھے اور انھیں گرفتار کر کے حکومت نے ساہیوال سنٹرل جیل میں قید کر دیا تھا- چار مہینے وہ اس جیل میں قید رہے- قید کے اس زمانے میں اسیران جیل کو وہ درس قرآن بھی دیتے رہے اور جمعہ و جماعت کا سلسلہ بھی جاری رکھا- ان دنوں اس جیل میں حافظ عبدالغفور جہلمی بھی قید تھے- ان کا جرم بھی یہی تھا کہ وہ مرزا قادیانی کو کافر قرار دیتے تھے اور اس کی نبوت کو کفر سے تعبیر کرتے تھے- حافظ

صاحب نے ۱۶- اکتوبر ۱۹۸۶ء کو جہلم میں وفات پائی- بڑے جی دار اور مضبوط اعصاب کے عالم دین تھے- رحمہ اللہ تعالیٰ-

حافظ عبدالغفور جہلمی مرحوم کے علاوہ صوفی محمد علی (کھڈیاں) صوفی محمد سلیمان' مہر صدیق اشرف (راجووال) وغیرہ متعدد حضرات ساہیوال سنٹر جیل میں مولانا کے ساتھ قید تھے- ان حضرات نے گرفتاری جامعہ محمدیہ اوکاڑہ سے دی تھی-

اہل حدیث کو مرزائیت کے متعلق اپنی تاریخ یاد رکھنی چاہیے اور یہ بات کبھی نہیں بھولنی چاہیے کہ:

۱- مرزا قادیانی پر کفر کا پہلا فتویٰ مولانا محمد حسین بٹالوی نے تیار کیا تھا اور اس پر سب سے پہلے حضرت میاں سید نذیر حسین دہلوی نے دستخط کیے تھے- اس کے بعد مولانا بٹالوی نے برصغیر کے دوسرے علمائے کرام سے دستخط کرائے تھے- اس کے لیے بہت سے حضرات علما کی خدمت میں مولانا بٹالوی خود تشریف لے گئے تھے اور بہت سوں کی خدمت میں اپنے آدمی بھیجے تھے-

۲- مرزا غلام احمد کے ساتھ مناظروں اور مباحثوں کا سلسلہ سب سے پہلے اہل حدیث علمائے کرام نے شروع کیا تھا- اس کے لیے ۱۱ جنوری ۱۹۰۳ء کو حضرت مولانا ثناء اللہ امرتسری قادیان گئے' لیکن مرزا صاحب میدان میں نہیں آئے-

۳- مرزا صاحب کی موت کا باعث بھی مرزا صاحب کا تحریر کردہ "مولوی ثناء اللہ سے آخری فیصلہ" والا اشتہار ہوا تھا- مرزا صاحب نے ۱۵ اپریل ۱۹۰۷ء کو ایک لمبا چوڑا اشتہار شائع کیا تھا' جس میں لکھا تھا کہ مولوی ثناء اللہ نے اپنے اخبار "اہل حدیث" میں میری تکذیب اور تفسیق کا سلسلہ شروع کر رکھا ہے- "میں خدا سے دعا کرتا ہوں کہ اے میرے مالک بصیر وقدیر' جو علیم وخبیر ہے' جو میرے دل کے حالات سے واقف ہے' اگر یہ دعویٰ مسیح موعود ہونے کا محض میرے نفس کا افترا ہے اور میں تیری نظر میں مفسد' کذاب ہوں اور دن رات افترا کرنا میرا کام ہے تو اے میرے پیارے مالک' میں عاجزی سے تیری جناب میں دعا کرتا ہوں کہ مولوی ثناء اللہ کی زندگی میں مجھے ہلاک کر اور میری موت سے ان کو اور ان کی

جماعت کو خوش کر دے' آمین۔"

یہ اشتہار کافی بڑا ہے۔ اس کی یہاں چند سطریں نقل کی گئی ہیں --- اس اشتہار کی اشاعت سے تیرہ مہینے دس دن بعد ۲۶ مئی ۱۹۰۸ء کو لاہور میں مرزا صاحب کی موت واقع ہو گئی تھی اور مولانا ثناء اللہ صاحب نے اس سے چالیس سال بعد ۱۵ مارچ ۱۹۴۸ء کو سرگودھا میں وفات پائی۔

۴۔ قیام پاکستان کے بعد مرزائیوں کو اقلیت قرار دینے کا مطالبہ سب سے پہلے ۱۹۵۰ء میں جماعت اہل حدیث کے اخبار "الاعتصام" نے کیا تھا اور اس موضوع پر مولانا محمد حنیف ندوی نے مسلسل مضامین لکھے تھے۔ میں اس زمانے میں "الاعتصام" میں خدمات انجام دیتا تھا۔ مولانا ندوی کے وہ مضامین ۱۹۵۳ء کو کتابی صورت میں شائع ہوئے تھے اور کتاب کا نام "مرزائیت نئے زاویوں سے" رکھا گیا تھا۔ یہ کتاب چند روز میں ختم ہو گئی تھی۔ پچاس سال کے بعد اب یہ کتاب طارق اکیڈمی فیصل آباد نے شائع کی ہے۔

میں اس موقعے پر مرزائیت سے متعلق اہل حدیث کی اولیات کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتا۔ تفصیل ان شاء اللہ کسی دوسرے موقعے پر بیان ہو گی۔ مولانا محمد یوسف صاحب کے سلسلے میں چلتے چلتے اس موضوع سے متعلق یہ چند ضروری باتیں نوک قلم پر آ گئی ہیں۔

کاش اہل حدیث علمائے کرام بے مقصد اور فضول قسم کی سیاسیات کے جھمیلوں سے نکل کر اپنے اسلاف کی تاریخ اور ان کی بوقلموں خدمات کو اپنا موضوع بنائیں اور لوگوں کو بتائیں کہ مختلف میدان ہائے کار میں انھوں نے کیا تگ و دو کی ہے --- لیکن یہ پتا مارنے والا کام ہے' جو ان کے لیے بہت مشکل ہے۔ انھیں آرام طلبی کی عادت پڑ گئی ہے۔ اخبار میں بیان دیا یا کہیں ادھر ادھر کی چند باتوں پر مشتمل تقریر کی' کسی غلط جماعت کو صحیح کہا' کسی صحیح کو غلط قرار دیا' اخباروں میں تصویر چھپی --- انھوں نے سمجھ لیا کہ خدمت دین و ملت کا حق ادا ہو گیا اور ملک و قوم کی کامیابی کی راہ ہموار ہو گئی۔ ان کے نزدیک یہی مسلک اہل حدیث ہے' یہی حکم حق ہے اور یہی عند اللہ باعث نجات ہے ---

مولانا محمد یوسف کو اللہ تعالیٰ نے ہمت بھی دی ہے اور خدمتِ دین کا جذبہ بھی دیا

ہے۔ وہ طویل عرصے سے طلبا کو دینی علوم کی تعلیم بھی دے رہے ہیں' لوگوں سے میل جول بھی رکھتے ہیں اور اپنے دار العلوم کے تمام شعبوں کی نگرانی بھی کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ اپنے علاقے کی جماعت اہل حدیث کے نظم ونسق کی ذمہ داریاں بھی پوری کر رہے ہیں۔ وہ کافی عرصہ ضلع ساہیوال کی جمعیت اہل حدیث کے امیر رہے اور اس کے انتظامی امور کی گاڑی کو چلانے کے لیے انھوں نے بڑی تگ و دو کی۔ ضلع اوکاڑہ کی جمعیت کی امارت بھی ان کے سپرد رہی۔

ان کی زندگی کے بہت سے واقعات میں سے ایک واقعہ بے حد حیرت انگیز ہے۔ موجودہ دور کے لوگ شاید اسے ماننے کو بھی تیار نہ ہوں--- وہ واقعہ یہ ہے کہ ان کی شادی ان کی سگی خالہ کی بیٹی سے ہوئی تھی اور نکاح خواں تھے' شاہ عبدالرحمٰن صاحب جو موضع پٹی (ضلع امرتسر) کے رہنے والے تھے' بہت بڑے عالم اور نبی ﷺ کی ہزاروں احادیث کے حافظ' خدا تعالیٰ غریق رحمت کرے' نہایت متقی بزرگ تھے۔ ۱۹۶۱ء میں فوت ہوئے۔

مولانا یوسف صاحب کے نکاح کے موقعے پر شاہ عبدالرحمٰن مرحوم نے لڑکی کا حق مہر کیا مقرر کیا تھا؟ سنیے! حق مہر یہ تھا کہ یہ اپنی بیوی کو سورہ نور کا ترجمہ پڑھائیں گے۔ اس طرح حق مہر کے تقرر میں صحابہ کرامؓ کی سنت زندہ کر دی گئی تھی--- اس کے بعد انھوں نے نکاح کے موضوع پر نہایت موثر تقریر کی تھی۔

مولانا محمد یوسف کو مختلف مقامات کے بہت سے لوگ نکاح پڑھانے کے لیے بلاتے ہیں۔ طبیعت ٹھیک ہو تو ایسے مواقع پر مولانا ضرور تشریف لے جاتے ہیں۔ وہاں تقریر بھی کرتے ہیں' جس میں نکاح وغیرہ کے مسائل بیان فرماتے ہیں اور لڑکی کو مولانا حافظ عبدالستار دہلوی کے ترجمے والا قرآن مجید اور مولانا محمد شفیع کی تصنیف کردہ نماز محمدی بہ صورت تحفہ عطا فرماتے ہیں۔

اب آیئے مولانا کے معمولات کی طرف۔!

زندگی میں ہر شخص کے شب و روز کے کچھ معمولات ہوتے ہیں جو اس کی عادات و اطوار اور عمل و کردار کی نقاب کشائی کرتے ہیں۔ ہمارے مولانا محمد یوسف کے معمولات

یہ ہیں-

۱- روزانہ قرآن مجید کے تین پاروں کی تلاوت-

۲- ہر جمعہ کو سورہ کہف کی تلاوت- سنا ہے کہ صرف ایک دفعہ دورانِ سفر میں تلاوت نہیں ہو سکی تھی-

۳- سورہ نوح کی آخری آیت رب اغفرلي ولوالدی .... صبح صادق کے بعد طلوع آفتاب سے قبل تک (کسی بھی وقت) پڑھنا-

۴- مدرسے میں صبح درس قرآن اور رات کو درس حدیث-

۵- بدعات و منکرات کی تردید-

ہمیشہ سے ان کے اسی قسم کے معمولات ہیں، جن پر وہ اللہ کے فضل سے قائم ہیں-

جب وہ راجووال گئے ہیں، اس وقت اس نواح کے اکثر مسلمانوں نے خلاف اسلام رسوم ورواج کے ارتکاب کو اپنے لیے ضروری قرار دے رکھا تھا- مولانا نے وہاں اس انداز سے سلسلۂ تبلیغ شروع کیا کہ آہستہ آہستہ بدعات و رسوم کے ارتکاب کا معاملہ ختم ہو گیا اور لوگ راہ راست پر آ گئے-

اس زمانے میں جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا اس نواح کے دیہات کے بہت سے لوگ گھروں میں عیدین کی نماز پڑھتے تھے، مولانا نے گاؤں سے باہر کھلے میدان میں نمازِ عیدین پڑھنے کا اعلان کیا- پہلی عید میں راجووال کا ایک پٹواری اور اس کی بیوی اور خود مولانا اور ان کی بیوی- کل چار نمازی (دو عورتیں اور دو مرد) باہر کھلے میدان میں نماز عید پڑھنے گئے--- اس کے بعد جلد ہی حالات بدل گئے اور نہ صرف راجووال بلکہ قرب و جوار کے بعض دیہات کے لوگ راجووال آ کر نماز عیدین اور نماز جمعہ مولانا کی اقتدا میں ادا کرنے لگے--- اب ہر گاؤں میں کھلے مقام پر یہ سنت ادا کی جاتی ہے-

مولانا اب تو بہت کم زور ہو گئے ہیں اور چلنا پھرنا مشکل ہو گیا ہے، جب صحت اچھی تھی، اس وقت گھر کے کام کاج وہ خود کرتے اور خود دکان سے سودا سلف لاتے تھے-

قرآن و حدیث سے ان کے قلبی لگاؤ کا یہ عالم ہے اور اس کی تبلیغ و اشاعت کے لیے

وہ اس درجہ حریص ہیں کہ کتب حدیث طلبا کو نہایت شوق سے خود پڑھاتے رہے اور تفسیر قرآن کا ایک مستقل شعبہ قائم کیا' جس میں حضرت مولانا حافظ عبداللہ بڈھیمالویؒ (وفات ۷ مئی ۱۹۸۷ء) مولانا محمد عبدہؒ (وفات ۳۰ مئی ۱۹۹۹ء) مولانا سلطان محمود جلال پوری (وفات ۴ نومبر ۱۹۹۵ء) مولانا محمد اسحٰق (جامع مسجد قدس لاہور) مولانا عبداللہ امجد (شیخ الحدیث مرکز الدعوۃ السلفیہ ستیانہ بنگلہ ضلع فیصل آباد) مولانا حافظ محمد ابراہیم کمیر پوری (وفات ۱۹ جون ۱۹۸۹ء) اور مولانا قدرت اللہ فوق خدمات انجام دیتے رہے۔ تفسیر قرآن کا یہ سلسلہ دارالعلوم راجووال میں ۱۹۷۵ء سے ۱۹۸۱ء تک سات سال جاری رہا۔ پھر مولانا کی بیماری اور ضعف جسمانی کی وجہ سے وسائل بہت محدود ہو گئے تو اس عظیم الشان منصوبے پر عمل درآمد کا سلسلہ جاری نہ رہ سکا' جس کا مولانا کو سخت افسوس ہے۔

وہ غربا و مساکین کے انتہائی ہم درد ہیں اور ان کی مدد کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ یہاں اس کی ایک مثال بیان کی جاتی ہے۔

بہت عرصہ ہوا موضع فتیانہ (ضلع اوکاڑہ) کے ایک شخص غلام اللہ کے والدین وفات پا گئے۔ غلام اللہ کی ایک بہن تھی۔ یہ دونوں بہن بھائی نہایت عسرت اور پریشانی کی زندگی بسر کرتے تھے۔ گاؤں میں ان کی کوئی زمین جائداد نہ تھی۔ گھر سے نکلے تو چلتے چلتے راجووال آ گئے اور مولانا محمد یوسف سے ملاقات ہو گئی۔ انھوں نے ان کی بپتا سنی تو اپنے گھر لے گئے۔ ان کے قیام وطعام کا انتظام کیا اور دونوں کو حصول علم کی راہ پر لگا دیا۔ غلام اللہ نے راجووال کے مدرسے میں تھوڑی مدت میں مروجہ درس نظامی کی تکمیل کر لی۔ مشہور عالم حضرت مولانا عبدالجبار کھنڈیلوی (وفات ۱۴ اگست ۱۹۶۲ء) سے بھی استفادہ کیا اور اسے مولوی غلام اللہ کہا جانے لگا۔ اس کی بہن بھی جس کا نام نواب بی بی تھا علم سے آشنا ہو گئی اور اس کی شادی موضع ڈھنگ شاہ (ضلع قصور) کے مولوی محمد اسماعیل سے کر دی گئی اور مولوی غلام اللہ کا عقد دارالحدیث اوکاڑہ کے بانی مولوی عبدالعزیز (وفات ۱۹۸۳ء) کے گھر ہوا۔ دونوں بہن بھائیوں کی شادی کے اخراجات خود مولانا محمد یوسف نے برداشت کیے۔

تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد مولوی غلام اللہ چک نمبر ۷-۱/۱۸ (ضلع اوکاڑہ)

میں منصب خطابت پر متعین ہوئے۔ نہایت صاحب تقوی بزرگ تھے۔ طویل عرصے تک فریضۂ خطابت انجام دیتے رہے۔ پچپن سال عمر پا کر چک نمبر ۷-۱/ ۱۸ میں فوت ہوئے۔ وفات کے وقت پسماندگان میں ایک بیوہ دو بیٹے اور چار بیٹیاں تھیں۔

مولانا محمد یوسف کے بارے میں جو معلومات ہمیں حاصل ہیں، ان میں ایک یہ ہے کہ وہ تعویذات کے قائل نہیں ہیں، جب کہ بہت سے علمائے کرام (علاج بالتعویذ) کو جائز قرار دیتے ہیں، بلکہ بے شمار جدید تعلیم یافتہ حضرات جن میں مرد بھی شامل ہیں اور عورتیں بھی، تعویذات کے حصول کو اکثر اوقات اپنے آپ پر ضروری قرار دے لیتے ہیں۔ وہ طبی (یونانی)، ایلوپیتھی، ہومیو پیتھی، علاج بھی کراتے ہیں اور تعویذ دینے والوں کے پیچھے بھی بھاگے بھاگے پھرتے ہیں۔ عورتیں (اگرچہ امریکہ اور یورپ کی یونیورسٹیوں کی تعلیم یافتہ ہوں) مردوں کو تعویذ نویسوں کی خدمت میں جانے پر خاص طور سے مجبور کرتی ہیں۔ مگر نہ ہمارے مولانا محمد یوسف اس کے قائل ہیں اور نہ ان کی بیوی اسے صحیح سمجھتی ہیں۔ اس کی دو مثالیں ملاحظہ ہوں۔

۱۔ ایک مرتبہ مولانا کی بیٹی کسی بیماری میں مبتلا ہوگئی۔ مسلسل دس سال بیمار رہی۔ بہت علاج کرائے مگر افاقہ نہ ہوا۔ بعض مخلص احباب نے نیا خون دینے اور تعویذ استعمال کرنے کا مشورہ دیا۔ مولانا نے اس سے انکار کر دیا اور فرمایا جو کچھ ہوگا اللہ کے حکم سے ہوگا، اسی پر میرا بھروسا ہے، وہی بیمار کرنے والا ہے اور وہی شفا دینے والا ہے۔ تعویذ سے یا کسی کے خون سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔

۲۔ ان کا بیٹا عبداللہ سلیم بچپن میں بیمار ہوگیا، جیسے جیسے علاج کراتے گئے مرض بڑھتا گیا۔ حسین خانوالہ (نزد چونکی) میں ایک صاحب حافظ بشیر احمد رہتے تھے، وہ مولانا کے ہم مسلک تو نہ تھے البتہ ان کے دوست تھے اور باعمل عالم تھے۔ طبیب بھی تھے۔ مولانا نے عبداللہ سلیم کو اپنی اہلیہ محترمہ کے ساتھ دوا لینے کے لیے حکیم صاحب کے پاس حسین خانوالہ بھیجا۔ حکیم صاحب نے بچے کو دیکھا اور مرض کی جو تشخیص کی تھی اس کے مطابق دوا بھی دی اور تعویذ بھی دیے کہ یہ بچے کو پلائے بھی جائیں، گلے میں بھی ڈالے جائیں اور بازو پر بھی باندھے

جائیں- نیک بخت ماں نے دوا تو لے لی' لیکن تعویذ لینے سے انکار کر دیا- کچھ عرصے بعد حکیم صاحب کی ملاقات مولانا سے ہوئی تو انھوں نے اس کا ذکر ان سے کیا اور فرمایا اکثر عورتیں دوا کی بجائے تعویذ پر یقین رکھتی ہیں' لیکن آپ کی بیوی بڑے مضبوط عقیدے کی ہیں' انھوں نے دوا تو لے لی مگر تعویذ لینے سے انکار کر دیا-

عبداللہ سلیم کو حکیم بشیر احمد کی دوا سے شفا نہ ہوئی اور طبیعت زیادہ خراب ہونے لگی تو متوکل علی اللہ باپ نے بیٹے کو گود میں اٹھایا اور مسجد میں لا کر محراب میں بٹھا دیا- خود بھی وہیں بیٹھ گئے اور بارگاہِ الٰہی میں بچے کی صحت کے لیے گڑگڑا کر دعا مانگنا شروع کی- دعا مانگتے مانگتے اللہ کے حضور سجدہ ریز ہو گئے- قادر مطلق نے اپنے عاجز بندے کی عاجزانہ دعا کو شرف قبولیت بخشا اور بچے کو تندرستی عطا فرمائی-

صحت یاب ہو کر عبداللہ سلیم نے علم حاصل کیا اور باعمل عالم کی حیثیت سے ابھرا- اپنے باپ کے قائم کردہ مدرسے کو ترقی دی' کتاب و سنت کی تبلیغ و اشاعت کو اپنا مطمح نظر ٹھہرایا اور مسند تدریس بچھائی- پھر عین عالم جوانی میں ۲۱ ستمبر ۱۹۹۳ء کو اچانک عالم آخرت کی راہ لی- انا للہ وانا الیہ راجعون (ان سے متعلق الگ مضمون لکھا گیا ہے جو اسی کتاب میں شامل ہے)

تدریس و خطابت کے علاوہ مولانا محمد یوسف کو تحریر و نگارش سے بھی دلچسپی ہے- انھوں نے متعدد مواقع پر ہفت روزہ الاعتصام' ہفت روزہ اہل حدیث اور ہفت روزہ تنظیم اہل حدیث وغیرہ رسائل و جرائد میں مختلف عنوانات پر مضامین لکھے- ان کے دارالعلوم میں ایک مستقل شعبہ تصنیف و تالیف کا قائم ہے-

مضامین کے علاوہ بہت سے مسائل سے متعلق کتابیں تصنیف کیں' جو مدرسے کے شعبہ تصنیف و تالیف کی طرف سے شائع ہوئیں- ان کی تصانیف میں فضائل رمضان' حیات عیسیٰ ابن مریم' خود ساختہ جشن عید میلاد النبی' مقتدی کے لیے نماز میں امام کی طرح سورتوں کے جواب دینے کا مسئلہ' قربانی کے جانور کے مسنہ ہونے کی بحث' نیا جال لائے پرانے شکاری' وغیرہ شامل ہیں- پھر حضرت حافظ عبداللہ روپڑیؒ کی تصنیف اہل حدیث کے

امتیازی مسائل، ابراء اہل الحدیث والقرآن۔ مولانا عبدالقادر حصاریؒ کی کتاب قبروں پر اذان، شرعی داڑھی اور کتاب الاذان۔ مولانا محمد عبدہؒ کی تصنیف فہم قرآن کے بنیادی اصول، الصحیحین اور تاریخ قرآن۔ مولوی شہاب الدین ثاقب زیروی مرحوم کی پنجابی نظمیں وغیرہ متعدد کتابیں اس شعبے کی طرف سے اشاعت پذیر ہوئیں۔

مولانا ممدوح کی مساعی کسی ایک ہی گوشے میں محدود نہیں ہیں، مختلف سمتوں میں پھیلی ہوئی ہیں۔ انھوں نے متعدد پہلوؤں سے دین کی خدمت کو اپنا مقصد حیات قرار دیا اور اللہ تعالیٰ نے اس میں انھیں کامیابی سے نوازا۔ مساجد کی تعمیر میں بھی انھوں نے بھرپور حصہ لیا۔ بعض مقامات پر خود مسجدیں تعمیر کرائیں۔ بعض مساجد کے سنگ بنیاد اپنے دست مبارک سے رکھے۔ ان میں سے چند مسجدیں مندرجہ ذیل ہیں۔ بیان مساجد کے سلسلے میں افسوس ہے، سنین کی ترتیب قائم نہیں رہ سکی۔

۱۔ ۱۹۴۹ء میں راجووال گاؤں میں مسجد کا سنگ بنیاد رکھا۔ یہ بہت بڑی مسجد ہے جو ان کی سعی وہمت سے تعمیر ہوئی۔

۲۔ ۱۹۷۰ء میں لب سڑک راجووال میں مسجد کا سنگ بنیاد رکھا۔ یہ ایک وسیع وعریض مسجد ہے جسے انھوں نے اپنی کوشش سے تعمیر کرایا۔

یہاں یہ یاد رہے کہ مسجد رحمانیہ اہل حدیث کی تعمیر راجووال گاؤں میں ۱۹۴۳ء میں ہوئی تھی اور اس کے پہلے امام وخطیب مولوی نور محمد تھے۔ بعد میں مولوی احمد دین ولد عبدالرشید نے اس ذمہ داری کو نباہا۔ پھر مولانا محمد یوسف تشریف لے آئے۔ مولوی نور محمد ۱۹۵۱ء میں فوت ہوئے۔ ایک بزرگ بابا محمد عمر تھے، وہ طویل مدت تک اس مسجد کے امام و خطیب رہے۔

۳۔ ۱۴ جولائی ۱۹۶۶ء کو حجرہ شاہ مقیم میں مسجد اہل حدیث ربانی کی بنیاد رکھی۔ مولانا معین الدین لکھوی اور جماعت کے مشہور بزرگ میاں محمد باقر (متوفی ۱۹۷۷ء) نے مقامی حضرات کے مشورے سے اس کی نگرانی پر مولانا محمد یوسف کو مامور فرمایا۔ اس کی خطابت کی ذمہ داری مولانا محمد ابراہیم خلیل کے سپرد ہوئی۔ اس مسجد کی تعمیر کے لیے ڈاکٹر عبدالرحمٰن ولد

میاں محمد ابراہیم مرحوم' حافظ محمد صادق اور ان کے رفقا نے بڑی تگ و دو کی۔

۴۔ ضلع اوکاڑہ کا ایک مشہور گاؤں جیٹھ پور ہے جو راجووال سے بجانب جنوب سات میل کے فاصلے پر ہے۔ یہاں کی مسجد میں احناف اور اہل حدیث اکٹھے نماز ادا کرتے تھے۔ مہینے میں تین جمعے بصیر پور کے ایک عالم یہاں آ کر پڑھاتے تھے اور ایک جمعہ مولانا محمد یوسف صاحب راجووال سے پیدل جا کر پڑھاتے تھے۔ یہ مولانا کی جوانی کا زمانہ تھا۔ لیکن احناف کے بعض حضرات یہ برداشت نہ کر سکے۔ اہل حدیث تعداد میں کم تھے۔ احناف نے ان کو اپنی الگ مسجد تعمیر کرنے کے لیے کہا' چنانچہ اس کے لیے جگہ خریدی گئی۔ ۱۹۶۲ء میں مولانا محمد یوسف نے وہاں مسجد اہل حدیث کی بنیاد رکھی اور مالی امداد بھی دی۔ وہاں ہاشمی خاندان کے ایک سید آباد ہیں۔ اس خاندان کے دو شخص اور ہیں' مولوی خوشی محمد اور مولوی محمد اسماعیل۔ ان کا شمار مولانا محمد یوسف کے ارشد تلامذہ میں ہوتا ہے۔ یہ ایک عالی کردار خاندان ہے۔ مولوی خوشی محمد اور مولوی محمد اسماعیل نے اس مسجد کی تعمیر کے سلسلے میں بے حد کوشش کی اور مسجد تعمیر ہو گئی۔

۵۔ ضلع اوکاڑہ میں ایک گاؤں کا نام ''پیر حیات'' ہے۔ اس گاؤں میں ایک صاحب مولوی احمد یار فروکش ہیں جو مسلک اہل حدیث سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کی کوشش سے وہاں مسجد اہل حدیث کے لیے جگہ کا انتخاب کیا گیا اور مولانا محمد یوسف نے عبداللہ (سکنہ حسوکے) کی معیت میں وہاں جا کر ۲۵ نومبر ۱۹۹۶ء کو مسجد اہل حدیث کی بنیاد رکھی۔

۶۔ ضلع قصور میں ایک قصبے کا نام الہ آباد ہے' جسے پہلے ''ٹھینگ موڑ'' کہا جاتا تھا۔ وہاں ماسٹر رحمت اللہ کشمیری کی کوشش سے چار مسجدیں تعمیر ہوئیں۔ ان میں سے ایک مسجد دیپال پور قصور روڈ پر ہے۔ یہ مسجد محلہ عثمان غنیؓ میں ہے اور جامع مسجد عثمان اہل حدیث کے نام سے موسوم ہے۔ اس کا سنگ بنیاد مولانا محمد یوسف نے ۲۶ فروری ۱۹۹۶ء کو رکھا۔

۷۔ اس سے قبل الہ آباد (ٹھینگ موڑ) ہی میں چونیاں روڈ پر ۱۱ فروری ۱۹۹۶ء کو مولانا نے مسجد بلال اہل حدیث کی بنیاد رکھی تھی اور اس موقع پر مسجد کی اہمیت و فضیلت کے موضوع پر نہایت مؤثر تقریر کی تھی۔

۸- کنگن پور روڈ پر الہ آباد کے وارڈ نمبر ۳ میں مولانا نے ۱۹ اکتوبر ۱۹۹۹ء کو جامع مسجد رحمان کی بنیادی اینٹ نصب کی۔

۹- ضلع اوکاڑہ میں ''حویلی لکھا'' ایک معروف قصبہ ہے۔ اس قصبے میں ریلوے لائن کے قریب اہل حدیث مسلک کے حاملین کی ایک مسجد ہے' جسے مسجد قدس کہا جاتا ہے۔ اس کے منتظم محمد سلطان صاحب ہیں۔ اس کا سنگ بنیاد اپریل ۱۹۸۷ء میں مولانا محمد یوسف صاحب نے رکھا تھا۔ اس مسجد میں جمعہ جماعت کا بہت اچھا انتظام ہے' جس کی وجہ سے اس کے گرد ونواح میں مسلک اہل حدیث کو کافی فروغ حاصل ہوا۔

۱۰- الہ آباد کے علی محلّہ میں قصور روڈ پر ایک مسجد کی بنیاد مولانا نے رکھی۔

۱۱- الہ آباد ہی میں دیپال پور روڈ پر جامع مسجد ابوبکر کی بنیاد رکھی گئی۔

۱۲- ضلع قصور میں ایک اچھا خاصا قصبہ ''تلونڈی'' ہے جو قصور دیپال پور روڈ پر واقع ہے۔ وہاں ایک عالم دین حافظ منظور احمد رہائش پذیر ہیں' جن کا شمار مولانا محمد یوسف صاحب کے شاگردانِ گرامی میں ہوتا ہے۔ انھوں نے راجووال کے دارالعلوم کمالیہ کے شعبہ تحفیظ القرآن میں قرآن مجید حفظ کیا ہے۔ ان کی اور ان کے احباب کی خواہش پر ۱۰ فروری ۱۹۹۶ء کو مولانا نے مسجد اہل حدیث ابوبکر کی بنیاد رکھی۔ یہ مسجد قصور دیپال پور روڈ پر ہے' حافظ منظور احمد کی زیرنگرانی اس مسجد میں بچوں کی تعلیم کا سلسلہ جاری ہے۔

یہاں یہ یاد رہے کہ اس مسجد کے تعمیری اخراجات حافظ عبدالکریم ڈیرہ غازی خاں نے ادا کیے اور اب تعلیمی اخراجات بھی وہی پورے کر رہے ہیں۔

۱۳- ضلع اوکاڑہ کے موضع ''حسوکے'' میں ایک صاحب مولوی محمد یحییٰ اقامت گزیں ہیں۔ نہایت نیک' مخلص اور مسلک اہل حدیث کی تبلیغ واشاعت میں کوشاں۔ ان کی درخواست پر مولانا وہاں تشریف لے گئے۔ ایک بزرگ شاہ اسماعیل عمری ان کے ساتھ تھے۔ وہاں مولانا نے ۱۹۷۵ء کے رمضان المبارک کی یکم تاریخ کو مسجد اہل حدیث کی بنیاد رکھی۔ اس مسجد کا انتظام مولوی محمد یحییٰ کے سپرد کیا گیا۔ اب وہاں متعدد حضرات مسلک اہل حدیث سے وابستہ ہو گئے ہیں اور آہستہ آہستہ اللہ کے فضل سے ان کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے۔

۱۴- ضلع اوکاڑہ میں دیپال پور روڈ پر ''بیٹیاں'' کے قریب ایک آبادی ہے' وہاں مولانا نے جنوری ۱۹۷۰ء میں مسجد اہل حدیث کی بنیاد رکھی- اس مسجد کی تعمیر کے لیے مولانا نے بڑی کوشش کی- مسجد کا نگران صوفی عبدالحمید کو بنایا گیا- اس مسجد کی وجہ سے وہاں اہل حدیث کی تعداد میں کافی اضافہ ہوا ہے-

۱۵- ضلع اوکاڑہ ہی میں ایک مشہور گاؤں ''ڈاہر'' ہے- اس گاؤں پر اللہ کا خاص کرم ہے- ہماری شنید کے مطابق اس میں حفاظ کرام خاصی تعداد میں موجود ہیں اور علمائے دین بھی--- اور یہ سب حضرات قدیم دور سے مسلک اہل حدیث سے تعلق رکھتے ہیں اور اس کے مبلغ ہیں- اس گاؤں میں مسجد کی بنیاد اگرچہ مولانا نے نہیں رکھی' لیکن مالی تعاون ضرور کیا- مثلاً وہاں لاؤڈ سپیکر نہیں تھا' مولانا نے ۱۹۷۷ء میں وہاں کی مسجد کے لیے لاؤڈ سپیکر کا انتظام کیا اور اس کے لیے معقول رقم فراہم کی-

۱۶- ایک گاؤں بونگی کلیا میں وہ مولوی محمد صدیق اور میاں عبدالخالق کی دعوت پر گئے اور وہاں مسجد کی بنیاد رکھی- اس سے قبل وہاں ایک مسجد تھی- مولانا نے جس مسجد کی بنیاد رکھی' یہ اس گاؤں کی دوسری مسجد تھی-

اس عالم دین پر اللہ کی خوش نودی کا شامیانہ قائم رہے' انھوں نے نامساعد و ناموافق حالات اور ناآشنا ماحول میں دینی علوم کی ترویج و اشاعت کا اہتمام کیا اور لوگوں کی خیر و صلاح کے لیے کوشاں ہوئے- مختلف مقامات پر بہت سی مسجدیں تعمیر کرائیں جن میں بے شمار لوگ پانچ وقت نماز ادا کرتے ہیں-

بعض حضرات اس انداز سے اسلام کی تبلیغ کرتے ہیں جیسے لوگوں کو مارنا پیٹنا اور بھگا دینا چاہتے ہوں- زبان تیزی سے چل رہی ہے اور الٹی سیدھی باتیں اگل رہی ہے- ہاتھ مکے کی شکل میں گھوم رہے ہیں- مبلغ دین کے ساتھ دائیں بائیں کلاشن کوفیے اور موزریے کھڑے ہیں' جنھیں محافظ کہا جاتا ہے' لیکن مولانا محمد یوسف صاحب جہاں جاتے ہیں بغیر محافظ کے جاتے ہیں اور خالی ہاتھ جاتے ہیں- ان کے ساتھ صرف اللہ کی مدد ہوتی ہے- اسی کی حفاظت میں وہ اپنے مافی الضمیر کا اظہار کرتے ہیں اور نرم اور میٹھے لہجے میں لوگوں سے

مخاطب ہوتے ہیں۔

مولانا محمد یوسف کو مسائل کی تحقیق سے خاص طور پر دلچسپی ہے۔ بعض اوقات خواب بھی وہ اسی قسم کے دیکھتے ہیں۔ ذیل میں اس سلسلے کے دو خواب درج کیے جاتے ہیں۔

خواب نمبر ۱:۔ ایک دفعہ نہایت خوب صورت شکل اور لباس میں حضرت حافظ عبداللہ روپڑیؒ خواب میں مولانا محمد یوسف کو ملے۔ حافظ صاحب کے ساتھ چھے آدمی اور ہیں جن میں حافظ ثناء اللہ صاحب مدنی بھی شامل ہیں۔ یہ خواب جمعرات کو دیکھا تھا۔ جمعے کا خطبہ حضرت محدث روپڑی صاحب نے دینا تھا۔ فرمایا محمد یوسف ہم چھے آدمی ہیں' ہمارے کھانے کا اہتمام کرو۔ مولانا نے یہ حکم بخوشی قبول کیا اور ساتھ ہی یہ مسئلہ دریافت کیا کہ حدیث میں آتا ہے کہ جو فرشتے قبل از خطبہ دفتر لے کر مسجد میں حاضر ہوتے اور درجہ بدرجہ آنے والوں کی حاضری درج کرتے ہیں' جب امام خطبے کے لیے کھڑا ہوتا ہے تو فرشتے اپنے دفتر لپیٹ کر خطبہ سنتے ہیں۔ امام بخاریؒ نے اپنی صحیح میں یہ تبویب قائم کی ہے باب الاستماع الی الخطبة (بخاری جلد اول ص ۱۲۷) وہاں حدیث کے لفظ ہیں ثم طووا صحفهم جس سے معلوم ہوتا ہے کہ تاخیر سے آنے والوں کی حاضری فرشتے درج نہیں کرتے۔ اس عدم اندراج سے نام مراد ہیں یا ثواب طووا صحفهم کا مطلب کیا ہے---؟

حافظ صاحب نے فرمایا: اس کا مطلب یہ ہے کہ روزمرہ کے فرشتے کراماً کاتبین اور ہیں اور جمعے کے اور--- جمعے کے فرشتوں کی ایک خاص جماعت ہے۔ یہ فرشتے صرف جمعے کے دن حاضر ہوتے ہیں۔ لہٰذا بعد از شروع خطبہ آنے والوں کی حاضری کا اندراج وہ نہیں کرتے بلکہ عام کراماً کاتبین کرتے ہیں۔

خواب نمبر ۲:۔ امام بخاریؒ نے اپنی صحیح میں یہ باب قائم کیا ہے۔

باب ما یذکر فی الفخذ (بخاری ج ۱ ص ۵۳) "فخذ" عربی میں ران کو کہتے ہیں۔ یہ ایک سوال ہے کہ ران انسانی ستر میں شامل ہے یا نہیں؟ یہ اشکال اکثر ذہن میں گردش کرتا رہتا تھا۔ ایک دفعہ خواب میں حضرت حافظ عبداللہ روپڑی سے ملاقات ہوئی۔

مولانا نے یہ مسئلہ ان سے دریافت کیا۔ یہ مسئلہ نبی پاک ﷺ سے روایت کرنے والے حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور جرہد بن جحش ہیں۔ ان سے مروی حدیث کا خلاصہ یہ ہے کہ ران ستر میں شامل ہے۔ کیونکہ اس روایت میں "ھذا احوط عندی" کے لفظ ہیں۔ یہ حضرت امام بخاریؒ کے لفظ ہیں' جب کہ ایک دوسری حدیث حضرت انسؓ سے مروی ہے' جس سے ثابت ہوتا ہے کہ ران انسانی ستر میں شامل نہیں۔ عام حالات میں بعض دفعہ آنحضور ﷺ کی ران اتفاقاً برہنہ ہو جاتی تھی اور حضرت انسؓ کی روایت سنداً بھی جرہد کی روایت سے قوی ہے' تو حافظ صاحب نے جواب میں فرمایا کہ حضرت انسؓ کی روایت سے جو ثابت ہے وہی معتبر ہے کہ ران ستر میں شامل نہیں' لیکن میرا وجدان حضرت جرہدؓ کی روایت کی طرف مائل ہے' اگرچہ حضرت انسؓ کی حدیث سے قوی سند کے ساتھ ران کا ستر میں شامل نہ ہونا ثابت ہے تاہم اس کے چھپانے میں احتیاط ہے تاکہ ہم اختلاف سے بچ سکیں حتی نخرج من اختلافھم امام بخاریؒ کا یہی فتویٰ ہے۔

یہ دونوں خواب مسائل شرعیہ سے ان کے قلبی تعلق اور ذوق تحقیق کا نتیجہ ہیں۔

مولانا کے بارے میں گزارشات کافی طویل ہو گئی ہیں' لیکن یہ ضروری تھا' اس لیے کہ ان کی خدمات کا دائرہ بڑا وسیع ہے اور ان کا طول و عرض دور تک پھیلا ہوا ہے۔

اب ذیل میں ان چند حضرات کے اسمائے گرامی درج کیے جاتے ہیں جو امرتسر کے مدرسہ غزنویہ میں ان کے استاد بھائی یا ہم جماعت اور ہم درس تھے۔

۱۔ مولانا عبداللہ صاحب۔ گوجرانوالہ
۲۔ مولانا محمد اسحاق حصاری۔ چک نمبر ایس۔بی/۳۷ نزد پاکپتن
۳۔ مولانا عبدالعظیم انصاری۔ کوٹ اعظم خاں' قصور
۴۔ مولانا عبدالرشید بھوجیانی۔ کوٹ رادھا کشن' ضلع قصور
۵۔ ماسٹر محمد احمد۔ کوٹ رادھا کشن' ضلع قصور
۶۔ حافظ محمد ابراہیم کمیرپوری۔ وفات ۱۹ جون ۱۹۸۹ء
۷۔ مولانا محمد اسحاق چیمہ۔ وفات ۲۳ مارچ ۱۹۹۳ء

۸- حافظ عبدالحق صدیقی- وفات ۳۱ مارچ ۱۹۷۶ء
۹- حافظ محمد یحییٰ عزیز میر محمدی- رئیس مرکز التبلیغ بونگہ بلوچاں-
۱۰- مولانا حبیب اللہ لکھوی مرحوم- وفات ۲۰ مئی ۱۹۷۳
۱۱- مولانا سیف الرحمٰن الفلاح- وفات ۱۹۹۹ء
۱۲- مولانا محمد عیسیٰ فیروز پوری-
۱۳- مولانا جمال الدین فیروز پوری- وفات ۲۳ مارچ ۱۹۹۶ء
۱۴- حافظ فضل کریم بھوئے آصل- وفات نومبر ۱۹۵۲ء
۱۵- مولوی نور اللہ ارشد ڈھولن ہٹھاڑ ضلع قصور- وفات ۱۵ فروری ۱۹۸۳ء

ان لوگوں کو ہماری نئی نسل کہاں جانتی ہے- چند حضرات کے سوا ان کے لیے یہ سب لوگ اجنبی ہیں- ہم زندہ لوگوں کو تو تھوڑا بہت یاد رکھتے ہیں' مردوں سے تعلقات توڑ لیتے ہیں- اگرچہ وہ اپنے دور کے کتنے بڑے لوگ ہوں- یہی مطلب ہے اپنی تاریخ کو بھول جانے اور اپنے ماضی کو نظر انداز کر دینے کا-!

مولانا محمد یوسف گزشتہ پچاس برس سے خدمت تدریس میں مشغول ہیں- بیس' اکیس مرتبہ صحیح بخاری شریف پڑھا چکے ہیں- نصف صدی میں ان سے جن طلبا نے تحصیل علم کی انھیں حیطۂ شمار میں لانا ممکن نہیں- البتہ جو حضرات ہمارے ذہن میں آ رہے ہیں' ان کے اسمائے گرامی یہاں درج کیے جاتے ہیں- یہ حضرات مختلف مقامات پر علمی خدمات میں مشغول ہیں-

۱- ڈاکٹر عبدالغفار حلیم: چونیاں
۲- مولانا محمد ابراہیم خلیل: مصنف تاریخ لکھوی' خطیب جامع اہل حدیث حجرہ شاہ مقیم
۳- مولانا اسد اللہ بھابڑی: ناظم مدرسہ شمس الحدیث بورے والا-
۴- سید حبیب الرحمٰن شاہ: (سابق ناظم جامعہ سلفیہ اسلام آباد- وفات ۱۸ اپریل ۲۰۰۰)
۵- مولانا عبدالرشید سلیم: سابق مدرس ریاض القرآن والحدیث رام گڑھ لاہور-
۶- مولانا علم الدین علیم: خطیب محلہ اسلام آباد- گوجرانوالہ

۷- مولانا محمد اسمٰعیل مرحوم: سابق خطیب مسجد اہل حدیث ڈھنگ شاہ، ضلع قصور
۸- قاری عبدالمجید: سابق مدرس تعلیمات اسلامیہ فیصل آباد
۹- مولانا نذیر احمد شاہ: مدرس جھوک دادو چک نمبر ۲۴۷ گ ب ضلع فیصل آباد
۱۰- مولانا حفیظ اللہ: او-ٹی ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول باغبان پورہ لاہور
۱۱- حاجی احمد دین محمود: او-ٹی ٹیچر گورنمنٹ ہائیر سیکنڈری سکول کھڈیاں خاص ضلع قصور
۱۲- مولانا عنایت اللہ امین: مدرس دارالحدیث کمالیہ راجووال، ضلع اوکاڑہ
۱۳- مولانا سردار علی: خطیب جامع مسجد اہل حدیث، پاکپتن
۱۴- مولانا عبدالحمید: خطیب جامع اہل حدیث فیروزکھلا، ضلع شیخوپورہ
۱۵- مولانا ثناء اللہ: چونیاں، ضلع قصور
۱۶- مولانا رحمت اللہ: سابق خطیب جامع اہل حدیث واہ کینٹ وفات ۱۹۹۵ء
۱۷- مولانا عطاء اللہ حنیف: خطیب کوٹ رادھا کشن، ضلع قصور
۱۸- مولانا عبدالرحمٰن عزیز: حسین خانوالہ ضلع قصور

مولانا محمد یوسف صاحب نے متعدد مرتبہ تبلیغی جلسوں کے انعقاد کا اہتمام کیا، راجووال میں بھی اور اس علاقے کے دیگر مختلف مقامات میں بھی- ان جلسوں میں شریک ہونے اور وعظ و تقریر کرنے والے بعض علمائے کرام وفات پا چکے ہیں اور بعض اللہ کے فضل سے زندہ ہیں- وفات پانے والوں میں حضرت مولانا محمد علی لکھوی ؒ، حضرت حافظ عبداللہ روپڑی ؒ، حافظ اسماعیل روپڑی، مولانا محی الدین لکھوی ؒ، مولانا عبدالقادر حصاری ؒ، حافظ عبدالقادر روپڑی ؒ، مولانا عطاء اللہ حنیف ؒ اور قاضی محمد اسلم سیف ؒ شامل ہیں- اور زندہ بزرگان دین میں سے مولانا معین الدین لکھوی، حافظ محمد یحییٰ عزیز میر محمدی، مولانا عبداللہ گورداس پوری اور مولانا محمد حسین شیخوپوری کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں- بارگاہ الٰہی سے عاجزانہ دعا ہے کہ وہ وفات پا جانے والوں کو جنت الفردوس میں داخل فرمائے اور زندہ حضرات کی عمروں میں برکت پیدا فرمائے اور انھیں اپنے دین کی زیادہ سے زیادہ خدمت

کے مواقع فراہم کرے۔ آمین یارب العلمین۔

مولانا محمد یوسف بے شک عالم دین ہیں، معلم ہیں، مقرر ہیں، واعظ ہیں۔ لوگ ان سے شرعی مسائل پوچھتے ہیں اور وہ انھیں جواب دیتے ہیں۔ لیکن بعض دفعہ وہ خود بھی علماے دین کی طرف رجوع کرتے ہیں اور ان سے مسائل دریافت فرماتے ہیں۔ چنانچہ ایک دفعہ انھوں نے حضرت مولانا محمد علی لکھوی مرحوم و مغفور (متوفی ۱۹ دسمبر ۱۹۷۳ء) سے ایک مسئلہ دریافت فرمایا۔ ذیل میں ان کا سوال اور حضرت مولانا لکھوی کا جواب درج کیا جاتا ہے۔

سوال: کیا فرماتے ہیں علماے دین اس مسئلے میں کہ دینی مدارس کو زکوٰۃ دینی چاہیے یا نہیں؟ کتاب وسنت کی رو سے اس کا جواب مطلوب ہے۔ اس لیے کہ بعض علماے کرام کا کہنا ہے کہ قرآن مجید میں مدارس دینیہ کو زکوٰۃ دینے کا ذکر نہیں آیا۔

سائل: محمد یوسف راجووال۔ ضلع اوکاڑہ۔

جواب:۔ کتاب وسنت کی رو سے مدارس دینیہ کو زکوٰۃ دینی جائز ہے بلکہ افضل ہے۔ جن کی آنکھوں پر غفلت یا تقلید کا پردہ پڑا ہے، وہ کتاب وسنت میں زکوٰۃ کا ذکر نہیں دیکھ سکتے۔ ان کو سمجھانا چاہیے کہ قرآن کریم ایک اصول کی کتاب ہے، اس میں فروعی مسائل کی تفصیل کتب فقہ کی طرح نہیں ہے۔ جیسے گدھا حرام ہے، اس کا قرآن میں ذکر نہیں تو کیا یہ حلال ہوگا؟ بے شمار مثالیں ہیں۔ اسی طرح لفظ زکوٰۃ کا ذکر بابت مدارس دینیہ قرآن میں نہیں، مگر وہ کلمہ عامہ مطلقہ منصوصہ کتاب اللہ میں بلفظ فی سبیل اللہ موجود ہے، جس طرح تمام حرام چیزیں حرم الخبائث میں موجود ہیں۔

اب رہا یہ امر کہ فی سبیل اللہ کی تخصیص غازیوں میں ہے تو یہ صحیح نہیں۔ بلکہ اس میں تمام اعمال خیر داخل ہیں۔ غازیوں میں تخصیص قول بلا دلیل ہے۔ قرآن وحدیث کے مقتضی کے بالکل خلاف ہے۔ قرآن کریم میں بیس مقامات سے زیادہ میں "فی سبیل اللہ" کا اطلاق غیر غازیوں پر ہوا ہے، جہاں غازیوں کو مراد لینا علم کتاب اللہ اور دین پر ظلم عظیم ہے۔ ملاحظہ ہو صدعن سبیل اللہ (سورہ بقرہ آیت ۲۱۷) "لم تصدون عن سبیل اللہ" (سورہ آل عمران آیت ۹۹) علیٰ ھذا القیاس سورہ نساء، انعام، اعراف، ہود، انفال، توبہ، ابراہیم

نحل، حج، ص، حجر، منافقون میں غیر غازیوں پر اس لفظ کا اطلاق ہوا ہے۔

حسن بصری اور امام احمد فرماتے ہیں۔الحج فی سبیل اللہ (تفسیر ابن کثیر) یہ مسئلہ حدیث سے بھی ثابت ہے۔مثلاً عن انسؓ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من خرج فی طلب العلم فھو فی سبیل اللہ حتی یرجع (رواہ الترمذی والدارمی، مشکوٰۃ) جب یہ اصول قرآن وحدیث سے ثابت ہوا تو بعض کا قول مردود ہوا۔

والسلام

حررہ: محمد علی محی الدین عبدالرحمٰن لکھوی عفا اللہ عنہ

از مدینہ منورہ۔مورخہ ۵ ربیع الثانی ۱۳۸۷ھ

یہ مکتوب گرامی تو ایک خالص شرعی مسئلے کے متعلق تھا۔ایک خط حضرت مولانا محمد علی لکھوی کے صاحب زادہ گرامی قدر مولانا معین الدین لکھوی کا ملاحظہ فرمایئے۔اس خط کا تعلق دو فریقوں کے باہمی جھگڑے سے ہے۔مولانا معین الدین تحریر فرماتے ہیں۔

مکرمی برادرم مولانا محمد یوسف صاحب! السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔

قصبہ شام کوٹ کے فریقین اپنے اپنے بیانات لے کر میرے پاس پہنچے ہیں۔بندہ نے ان کو بمقام راجووال بروز اتوار مورخہ ۱۵ مئی (۱۹۶۰ء) کی تاریخ دی ہے کہ ان کے گواہ اور زبانی بیانات لیے جائیں۔براہ کرم آپ اس تاریخ کو گھر پر تشریف رکھیں۔اگر خدانخواستہ راجووال میں آپ کی موجودگی مقررہ تاریخ کو ممکن نہ ہو، تو براہ کرم بر سیدن ایں عریضہ مجھے اس تاریخ اور مقام سے جو آپ کو منظور ہو، آگاہ فرمائیں اور فریقین سے مشورہ کر کے تاریخ اور مقام مقرر فرمادیں---اس کی بندہ کو اطلاع اوکاڑہ میں آنی چاہیے۔

والسلام

دعا گو۔معین الدین لکھوی

۱۱-۵-۶۰

مولانا معین الدین لکھوی کے اس خط سے پتا چلتا ہے کہ وہ مولانا محمد یوسف پر بے حد اعتماد کرتے اور ان سے پرخلوص مراسم رکھتے ہیں۔

اب مولانا محمد یوسف صاحب کے نام ایک خط مولانا معین الدین کے برادر کبیر مولانا محی الدین لکھوی (وفات ۲۸ فروری ۱۹۹۸ء) کا پڑھیے۔ اس خط میں بھی لکھوی برادران اور مولانا محمد یوسف کے باہمی تعلقات کی وضاحت ہوتی ہے اور آپس کے مخلصانہ علائق کی گہرائی کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہ خط ۱۹۶۱ء کے رمضان المبارک کی ۲۰ تاریخ کا رقم فرمودہ ہے۔ اس خط سے پتا چلتا ہے کہ منڈی عثمان والا کے لوگ چاہتے ہیں کہ مولانا معین الدین رمضان کا آخری جمعہ ان کے ہاں پڑھائیں اور مولانا محی الدین کا مولانا محمد یوسف کے نام فرمان ہے کہ وہ یہ جمعہ اوکاڑہ میں مولانا معین الدین کی جگہ پڑھائیں۔ ان دنوں حضرت مولانا محمد علی لکھوی مرحوم ومغفور پاکستان میں تشریف فرما تھے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

من خادم المسلمین محی الدین لکھوی' الی الاخ العزیز مولانا محمد یوسف صاحب

دارالحدیث راجووال ---- السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ امابعد۔

موضع عثمان والا کی فضا اللہ تعالیٰ نے کچھ تکدر کے بعد پھر درست فرمادی ہے۔ گزشتہ جمعہ کو والد محترم اور راقم وہاں پہنچے تھے۔ بیش از پیش فائدہ نظر آیا۔ آج وہاں سے حاملین رقعہ دو نوجوان پھر مطالبہ لے کر آئے ہیں کہ آئندہ آخری جمعہ کے لیے مولانا معین الدین صاحب کو لے جائیں۔ لیکن یہ اسی وقت ہو سکے گا جب کہ اوکاڑہ کے لیے کوئی موزوں آدمی مل جائے' کیونکہ اس آخری جمعہ میں وہاں بھی مردوزن کی معتد بہ حاضری ہوگی۔ اس غرض کے لیے آپ کو دوبارہ تکلیف دے رہا ہوں۔ امید ہے کہ آپ پہلے کی طرح اپنی ضرورت و وقت کی قربانی کر کے اس درخواست کو منظور فرمائیں گے۔ گویا مولانا معین الدین منڈی عثمان والا جائیں گے اور آپ ان کی جگہ اوکاڑہ میں خطبہ دیں گے۔ راقم مسجد رحمانیہ پونچھ روڈ لاہور میں وعدہ دے چکا ہے' ورنہ آپ کو تکلیف نہ دی جاتی۔

اگر دوسری جگہ وعدہ ہو تو وہاں کوئی دوسرا آدمی بھیج دیں اور اعتکاف ہو تو قضا کر دیں۔

والسلام

محی الدین لکھوی (۱۴-۳-۶۱)

اب ایک خط صوفی عبداللہ مرحوم کا ملاحظہ ہو- صوفی صاحب نے ۲۸ اپریل ۱۹۷۵ء کو وفات پائی- یہ خط وفات سے پونے سات مہینے قبل یکم ستمبر ۱۹۷۴ء کا مرقومہ ہے- تحریر فرماتے ہیں-

محترم المقام جناب مولانا محمد یوسف صاحب مہتمم دارالحدیث راجووال

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ مزاج گرامی بخیر-

اس گرانی کے دور میں آپ نے اپنے دارالحدیث کے سفرا سے کیا تعاون کر رکھا ہے؟ چندے کی رقم سے ان کو کیا حصہ دیتے ہیں اور سفر خرچ کا کیا حساب ہوتا ہے؟ آپ کے جواب پر ہم بھی اپنے ادارے کے سفرا سے بات طے کریں گے- جواب میں تاخیر نہ کرنا تا کہ بات وقت سے پہلے طے ہو جائے- امید ہے کہ آپ خیریت سے ہوں گے- نیز فرمائیں کہ اساتذہ کرام اور ملازمین کو گرانی کی بنا پر کیا سہولتیں دے رکھی ہیں؟

ابوالمساکین فقیر الی اللہ صوفی محمد عبداللہ

مہتمم دارالعلوم تعلیم الاسلام' ماموں کانجن- ضلع لائل پور

اس وقت اس شہر کو "مسلمان" بنا کر اس کا نام فیصل آباد نہیں رکھا گیا تھا- اس دور میں اس کا "کافرانہ" نام لائل پور ہی تھا' اس لیے یہاں یہی نام لکھا گیا ہے- یعنی جس طرح خط میں لکھا ہے' اسی طرح ہم نے لکھ دیا ہے-

ہمارے ہاں بہت سے شہروں' قصبوں اور شہراہوں کے نام بدلے گئے ہیں' نام کیا بدلے گئے ہیں' ان کی تاریخ بدل دی گئی ہے بلکہ کہنا چاہیے کہ ان کی تاریخ مسخ کر دی گئی ہے- لائل پور کی تاریخ بھی مسخ کر دی گئی ہے- یہ بہت بڑا صنعتی شہر تھا' اسی بنا پر متحدہ ہند میں اسے ہندوستان کا "مانچسٹر" کہا جاتا تھا-

بات مولانا یوسف صاحب کے بارے میں ہو رہی تھی' اثنائے کلام میں صوفی عبداللہ مرحوم کے مکتوب گرامی کی وجہ سے "لائل پور" کا نام آیا تو قلم نے بلا دو مقامات کے ناموں میں کفر و اسلام کی طرف رخ کر لیا' حالانکہ کسی کے نام کا تعلق نہ کفر سے ہے نہ اسلام سے- اس کا تعلق تاریخ سے ہے جیسا کہ لائل پور کی بنیاد ۱۸۹۲ء میں پنجاب کے لیفٹیننٹ گورنر

لائل نے رکھی تھی' یہ ایک تاریخی بات ہے- مسئلہ یہ ہے کہ کسی مسلمان مرد اور عورت کے نام میں لفظ کفر اور شرک کی آمیزش نہیں ہونی چاہیے- مثلاً عبدالعزیٰ اور عبدالشمس کسی مسلمان کا نام نہیں رکھنا چاہیے- اسی طرح کسی مسلمان عورت کا نام مہنت کور' سنت کور' شکنتلا دیوی وغیرہ نہ رکھا جائے-

ان ضمنی سی چند سطروں کے بعد اب پھر مولانا یوسف کی طرف آیئے- پہلے بتایا جا چکا ہے کہ جن صفات سے وہ متصف ہیں ان میں ایک یہ ہے کہ وہ بے حد مہمان نواز ہیں- ۲۸ فروری ۱۹۹۸ء کو مولانا محی الدین لکھویؒ نے وفات پائی- اس سے چند روز پیشتر حافظ احمد شاکر' حافظ محمد اشرف' قاری نعیم الحق نعیم (مرحوم) اور ان سطور کا راقم مولانا لکھوی کی عیادت کے لیے لاہور سے براستہ راجووال روانہ ہوئے- مولانا مرحوم دیپال پور کے قریب ایک گاؤں الہ آباد میں سکونت پذیر تھے- راستے میں ہم راجووال مولانا یوسف صاحب کے ہاں پہنچے- وہ ہمیں دیکھ کر نہایت خوش ہوئے اور اپنے دارالحدیث کے ایک مدرس مولانا عنایت اللہ کو پر سرور لہجے میں آواز دی:

عنایت اللہ! یہ دیکھو نقوش عظمت رفتہ والے اسحاق بھٹی صاحب ہمارے پاس آئے ہیں-

یہ الفاظ اس فقیر کے ساتھ ان کی محبت پر دلالت کرتے ہیں-

ہم نے ان کو اپنا پروگرام اور مقصد سفر بتایا تو وہ بھی ہمارے ساتھ مولانا محی الدین لکھویؒ کے ہاں جانے کو تیار ہو گئے- مولانا لکھوی سے ملاقات کر کے واپس راجووال آئے تو پتا چلا کہ کھانا تیار ہے- پرتکلف کھانا- عصر کی نماز پڑھ کر ہم راجووال سے لاہور کو روانہ ہونے لگے تو سب کو ایک ایک بوتل شہد کی عنایت فرمائی گئی- راستے میں کھانے کے لیے چار پانچ کلو سیب عطا کیے گئے-

میں پہلی دفعہ دارالحدیث راجووال گیا تھا- دارالحدیث کی ماشاء اللہ بہت بڑی لائبریری ہے' جس میں درسی کتابوں کے بھی کئی کئی نسخے ہیں اور علما و طلبا کے مطالعہ کے لیے تفسیر' حدیث' فقہ' تاریخ اور رجال وغیرہ سے متعلق عربی' اردو اور فارسی وغیرہ زبانوں کی

ہزاروں کتابیں موجود ہیں- جو ماہنامے' ہفت روزے اور روز نامے دارالحدیث میں آتے ہیں' وہ بہت بڑی تعداد میں لائبریری کی زینت ہیں- ہم نے دیکھا کہ جلد ساز وہیں موجود تھا جو کتابوں اور رسالوں کی جلدیں بنا رہا تھا-

مولانا محمد یوسف صاحب بڑے باقاعدہ شخص ہیں- ہر شے احتیاط اور قرینے سے رکھتے ہیں- کتابوں کے سلسلے میں خاص طور سے بہت محتاط ہیں اور ان کی صفائی ستھرائی کا بے حد خیال رکھتے ہیں-

اپریل ۲۰۰۰ء کے آخری دنوں میں دارالحدیث راجووال کے مدرس مولانا عنایت اللہ میرے پاس تشریف لائے اور مولانا کا سلام پہنچایا اور فرمایا کہ وہ بہت کمزور ہو گئے ہیں اور آپ سے ملنا چاہتے ہیں- یہاں تشریف لائیں گے اور اپنے پرانے ساتھیوں اور دوستوں کو ملیں گے--- اس سے کچھ دن پہلے میں نے ان کو خط بھی لکھا تھا- چند روز بعد اچانک تشریف لے آئے- آج ۱۳ جون ۲۰۰۰ء کو یہ سطور لکھی جا رہی ہیں- وہ غالباً ۱۲ مئی کو تشریف لائے تھے- واقعی بہت کمزور ہو گئے ہیں- کچھ دیر بیٹھے- چند باتیں کیں اور چلے گئے- کئی سال پہلے ان کی ٹانگ ٹوٹ گئی تھی- بہت تکلیف سے چلتے ہیں- ۱۹۹۳ء میں ان کے بڑے بیٹے مولانا عبداللہ سلیم جو نہایت لائق اور ذہین عالم دین تھے اچانک وفات پا گئے تھے- اس کا انھیں بہت صدمہ ہے- اب مولانا کے ماشاءاللہ تین صاحب زادے ہیں- تینوں نہایت ملنسار اور بلند اخلاق ہیں-

سب بیٹوں کے نام عبداللہ سلیم سمیت علی الترتیب یہ ہیں-

۱- مولانا عبداللہ سلیم (مرحوم) جسے اللہ تعالٰی نے بڑی صلاحیتیں دی تھیں خصوصاً دالدین کی خدمت- یہ ۲۱ ستمبر ۱۹۹۳ء کو اچانک اس دارِ فانی سے کوچ کر گئے- انا للہ وانا الیہ راجعون- اللہ انھیں اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے- آمین-

۲- حافظ عبدالرحمٰن یوسف:- انھوں نے پاکستان کے دینی مدارس کے علاوہ جامعہ اسلامیہ مدینہ یونیورسٹی میں چار سال تعلیم حاصل کی ہے- ذہین نوجوان ہیں- پنجاب یونیورسٹی سے عربی میں پی ایچ ڈی کر چکے ہیں- لکھنے کا شوق بھی رکھتے ہیں-

دارالحدیث راجووال کے سلسلے میں اپنے والد محترم کے مددگار ہیں- جامعہ سلفیہ میں اول پوزیشن حاصل کی تھی-

۳- حافظ عبیداللہ احسن:- چند سال سے قرآن مجید نمازِ تراویح میں صادق گنج میں مسلسل سنا رہے ہیں- صحاح ستہ مکمل کر چکے ہیں اور پرائیویٹ اقرأ ماڈل سکول نئی آبادی راجووال میں معلم ہیں- بی-اے پاس کر چکے ہیں-

۴- حافظ عبیدالرحمٰن محسن:- پنجاب بھر میں بی-اے میں اول پوزیشن حاصل کی- بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد میں زیر تعلیم ہیں اور اس سال سند فراغت بابت مفتی وراثت حاصل کر چکے ہیں- جامعہ سلفیہ میں ہر سال اول آتے رہے ہیں اور وفاق المدارس کے سالانہ امتحان میں تمام پاکستان میں دوسرے نمبر پر رہے- تعلیم و تعلم میں اللہ تعالیٰ نے ان کو بڑی ذہانت سے نوازا ہے-

تقریر کے فن سے خوب آگاہ ہیں- عربی' اردو اور پنجابی زبانوں میں بہت اچھی تقریر کرتے ہیں- عربی کے ایک امتحانی تقریری مقابلے میں عرب طلبا نے بھی تقریریں کیں اور پاکستانی طلبا نے بھی- حافظ عبیدالرحمٰن محسن نے بھی اس تقریری مقابلے میں حصہ لیا' جس میں انھوں نے تمام مقررین سے اول پوزیشن حاصل کی اور اول انعام کے حق دار قرار پائے-

یہ ان کا ابتدائی دور ہے- ان شاء اللہ آگے چل کر ان کی صلاحیتیں مزید بیدار ہوں گی اور پروان چڑھیں گی- وقت کے ساتھ ساتھ ہی قابلیت کے جوہر کھلتے ہیں-

یہ تو تھا' عبداللہ سلیم کے سوا مولانا محمد یوسف کے تینوں بیٹوں کا نہایت مختصر تعارف-! (عبداللہ سلیم پر الگ مضمون لکھا گیا ہے) اب آئندہ چند سطور مولانا کی بیٹیوں کے بارے میں-!

مولانا محمد یوسف کی چھے بیٹیاں ہیں-

۱- امۃ الرحمٰن اسما:- یہ سب سے بڑی بیٹی ہیں- قاری عبداللہ یونس بن مولانا عبدالعزیز (مرحوم) بانی دارالحدیث اوکاڑہ کے عقد میں ہیں- عبداللہ یونس بفضلہ تعالیٰ ۲۴-۲۵

سال سے اوکاڑہ ہی میں (رمضان المبارک میں) بلاناغہ قرآن سنا رہے ہیں۔

۲۔ امۃ الرحمٰن امۃ اللہ:۔ ان کی شادی مولانا حافظ عبدالستار حماد سے ہوئی۔ حافظ صاحب عالم دین ہیں‘ دو درجن سے زائد عربی رسائل و کتب کا ترجمہ اردو میں کیا ہے۔ ملتان میں خطبہ جمعہ دیتے ہیں اور حکومت سعودیہ کی طرف سے مبعوث ہیں۔

حافظ عبدالستار حماد سے یہ رشتہ مولانا یوسف نے مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی اور شیخ الحدیث مولانا سلطان محمود جلال پوری کے مشورے سے کیا تھا۔ استخارہ بھی کیا تھا۔ استخارے میں دیکھا کہ بیٹی نے ہنڈیا چولھے پر چڑھائی ہوئی ہے اور حافظ عبدالستار حماد ہنڈیا کے اردگرد جھاڑو سے صفائی کر رہے ہیں۔ مولانا نے اس کی یہ تعبیر کی کہ عبدالستار سے ان کی بیٹی کو سکون ملے گا۔ الحمدللہ ایسا ہی ہوا۔ رمضان المبارک میں امۃ الرحمٰن امۃ اللہ اور مولانا کی نواسی فوزیہ تراویح میں قرآن مجید سناتی ہیں اور تین نواسے بھی قرآن سناتے ہیں۔

۳۔ امۃ الرحمٰن عابدہ:۔ یہ بیٹی دس سال بیمار رہی۔ نہایت صابرہ تھیں۔ چونکہ نبی کریم ﷺ کا حکم ہے کہ اپنے مریضوں کا علاج کراؤ‘ لہٰذا علاج معالجے کی بڑی کوشش کی گئی مگر صحت یاب نہ ہوئیں۔ بالآخر اللہ کو پیاری ہو گئیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

قابل ذکر بات یہ ہے کہ مولانا نے بقول خود بیٹی کا "علاج بالحرام نہیں کرایا۔" ان کے نزدیک علاج بالحرام کی چند قسموں میں سے ایک یہ بھی ہے جو ہسپتالوں میں کیا جاتا ہے یعنی خون کی بوتلیں مریضوں کو دی جاتی ہیں۔ اس باب میں مولانا کا نقطہ نظر ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔ اس سے اختلاف بھی کیا جا سکتا ہے اور اتفاق بھی---!

مولانا فرماتے ہیں:

سلفی علمائے کرام کی تحقیق کی رو سے خون سے علاج کرانا ممنوع ہے‘ کیونکہ آدمی کا خون ناپاک اور حرام ہے اور اس ناپاک خون سے بیمار کو غذا دی جاتی ہے۔ گو موجودہ دور کے علما جواز کے قائل ہیں۔ خون کی بوتلیں ویسے بھی مشکوک ہیں اور غیر محرم مردوں کی ہیں۔ موت جن کا مقدر بن چکی ہے‘ وہ خون کی بوتلوں سے نہیں بچ سکتے۔

خون دینے والا خود بھی کمزور ہو جاتا ہے- گویا کہ جو بیماری میں مبتلا ہے' اس کی خاطر تندرست کو بھی بیمار کرنا ہے-

جو لوگ جواز کے قائل ہیں' وہ اس کا نام ایثار رکھتے ہیں- جیسے رشوت کو تحفے کا نام دیا جاتا ہے- مجوزین کی بہت بڑی دلیل یہ ہے ﴿فمن اضطر﴾ الآیۃ حالانکہ ﴿فمن اضطر﴾ کی تعریف میں سخت ترین اختلاف ہے' اور یہ استدلال محل نظر ہے-

خون سے علاج کے بارے میں یہ مولانا محمد یوسف کا نقطہ نظر ہے جو قارئین کے ملاحظہ گرامی میں آیا-

۴- امۃ الرحمٰن ساجدہ:- ان کا نکاح حافظ عبدالمجید ولد ابوعبداللہ مولانا محمد (مرحوم) سے ہوا-

۵- امۃ الرحمٰن فاطمہ:- یہ قاری عبیداللہ احسن ولد مولانا عبدالخالق سلفی کی اہلیہ ہیں- قاری صاحب چونیاں میں خطیب ہیں-

۶- امۃ الرحمٰن امۃ العظیم:- یہ سب سے چھوٹی بچی ہے-

مولانا کی عمر ۸۰ سال سے تین برس اوپر چلی گئی ہے اور امور خیر کی انجام دہی میں اللہ کے فضل سے بڑے تیز ہیں- دعا ہے اللہ تعالیٰ انھیں صحت و عافیت سے نوازے رکھے تاکہ وہ اس کے دین کی زیادہ سے زیادہ خدمت کر سکیں اور ان کے نیک اطوار بچوں کو عالی قدر باپ کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے اور ان کے دل میں یہ جذبہ ہمیشہ موجزن رہے کہ دارالحدیث کمالیہ کے نام سے ان کے والد گرامی نے جو درس گاہ قائم کی ہے' وہ اس کے سچے خادم ثابت ہوں گے اور باپ کی طرح کامل خلوص کے ساتھ اسے ترقی دینے کی سعی کرتے رہیں گے- بہتر اولاد وہی ہے جو اپنے آبا و اجداد کے قائم کردہ دینی اداروں کی نہ صرف حفاظت کرے بلکہ اسے ارتقا کی منزلوں تک پہنچانے کے لیے برابر تگ و تاز کرتی رہے--- یہ صدقہ جاریہ ہے' جس کا اجر تا قیامت ملتا رہے گا' اس قسم کے ادارے قائم کرنے والوں کو بھی اور قائم رکھنے والوں کو بھی-!

اللہ تعالیٰ ہم سب کا حامی و ناصر ہو- آمین

یہاں یہ عرض کر دیں کہ مولانا محمد یوسف کے ذہن میں ہمیشہ یہ بات رہی ہے (اور یہ بالکل صحیح بات ہے) کہ ہر دینی ادارے میں مسجد نہایت ضروری ہے تاکہ مسجد کی وجہ سے طلبا میں عبادت کا جذبہ پیدا ہو اور یاد الٰہی کا شوق ابھرے‘ اسی لیے یہ مسجد تعمیر کی گئی ہے جس کی چار دیواری مع مدرسہ کے تین کنال ایک مرلے پر مشتمل ہے۔ یہ جگہ محمود ولد چراغ دین مرحوم نے دارالحدیث راجووال کے نام ۱۹۵۷ء میں ہبہ کی تھی‘ جزاہ اللہ تعالیٰ---اس کی پہلی بنیادی اینٹ ۱۹۷۰ء میں رکھی گئی تھی۔ اس سے قبل یہاں ایک جھونپڑی تھی اور درختوں کے سائے میں تعلیم دی جاتی تھی۔ اس مسجد کے کئی نام ہیں‘ اسے مسجد الحسن بھی کہا جاتا ہے‘ مسجد الحسین بھی اور مسجد کمال بھی۔ لیکن سرکاری کاغذات میں یہ مسجد دارالحدیث کے نام سے درج ہے۔

مسجد کے سلسلے میں خاص طور سے دلچسپی لینے والے چند حضرات کے اسمائے گرامی درج ذیل ہیں۔

۱۔	مولانا محمد عبداللہ مرحوم کھرل کلاں۔	متوفی ۱۹۹۹ھ
۲۔	حاجی نور احمد مرحوم۔	متوفی ۱۹۹۸ء
۳۔	مولوی قدرت اللہ بن حاجی نور احمد مرحوم	
۴۔	حاجی خدا بخش مرحوم۔	لاہور
۵۔	چودھری نواب دین مرحوم۔	لاہور
۶۔	حاجی نذیر احمد میڈیکل سٹور۔	منڈی احمد آباد
۷۔	محمد اکرام تیل ایجنسی۔	منڈی احمد آباد
۸۔	مولانا عبدالرشید سلیم	
۹۔	حاجی محمد اسحاق بن محمد اسماعیل مرحوم۔	راجووال وفات ۱۹۷۶ء
۱۰۔	حاجی محمد علی جوہر۔	راجووال
۱۱۔	محمد صدیق بن محمد عمر۔	راجووال
۱۲۔	عبداللہ سلیم مرحوم۔	راجووال متوفی ۱۹۹۳ء

مقامی احباب نے حالات کے مطابق اس کار خیر میں بے حد دلچسپی لی۔ یہ دو منزلہ مسجد ہے جو اس وقت علاقے کی ایک بے مثال مسجد ہے۔

اب ملاحظہ فرمایئے دارالحدیث کمالیہ کی چند خصوصیات

یہ دارالحدیث کئی شعبوں پر مشتمل ہے۔ (۱) درس نظامی۔ (۲) تحفیظ القرآن۔ (۳) دعوت وارشاد۔ (۴) طبع وتالیف۔ (۵) ناظرہ قرآن۔ (۶) پرائمری سکول۔

دارالحدیث کا وفاق المدارس السّلفیہ سے باقاعدہ الحاق ہے۔ تدریس کے لیے دارالحدیث اپنے فارغ شدگان کو زیادہ ترجیح دیتا ہے۔

سال رواں کے اساتذہ کرام بمطابق ۱۴۲۱ھ/ ۲۰۰۰ء جو تدریسی خدمات سرانجام دے رہے ہیں' مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ شیخ الحدیث مولانا محمد یوسف صاحب

۲۔ مولانا محمد اسحاق حقانی مبعوث دارالافتا سعودیہ۔

۳۔ مولانا محمد ابراہیم خلیل فاضل دارالحدیث کمالیہ و جامعہ محمدیہ اوکاڑہ' حجرہ شاہ مقیم میں مسلک کی اشاعت نہایت دھیمے اور سلجھے ہوئے انداز میں کر رہے ہیں۔ اہل قلم بھی ہیں۔ چنانچہ مولانا یوسف صاحب کے رغبت دلانے پر مولانا عبدالقادر حصاریؒ کے مقالات و فتاوی پانچ ہزار صفحات میں مرتب کر چکے ہیں۔ اس کی کتابت پر چالیس ہزار روپے خرچ ہو چکے ہیں۔

۴۔ مولانا احمد دین محمود فاضل دارالحدیث کمالیہ ماشاء اللہ باعمل عالم ہیں۔ تدریس و خطابت کا پچیس سالہ تجربہ رکھتے ہیں۔ کھڈیاں خاص کے رہنے والے ہیں۔ نیز جامعہ سلفیہ سے فارغ التحصیل ہیں۔

۵۔ مولانا عنایت اللہ امین ڈاہروی فاضل دارالحدیث کمالیہ و جامعہ محمدیہ گوجرانوالہ' خطابت و تدریس کا چودہ سالہ تجربہ رکھتے ہیں۔ نہایت محنتی مدرس ہیں۔ ان کے والد اور بھائی بھی مدرسے کی بے حد خدمت کرتے ہیں۔ جماعتی اخبارات میں ان کے مضامین چھپتے رہتے ہیں۔ مولانا محمد یوسف اور دارالحدیث کمالیہ کے متعلق بہت سا مواد مجھے انہی کی

معرفت ملا ہے۔ منجھے ہوئے مدرس ہیں ---- اطاعت شعار' منکسر' خوش گفتار اور ملنسار۔

۶۔ حافظ عبدالرحمٰن یوسف فاضل مدینہ یونیورسٹی۔

۷۔ حافظ عبیدالرحمٰن محسن فاضل نیشنل اسلامک یونیورسٹی اسلام آباد۔

۸۔ مولانا عقیل عاصر فاضل دارالحدیث کمالیہ (شیر نگر اوکاڑہ)

۹۔ مولانا منظور احمد فاضل دارالحدیث کمالیہ (تانگڑیاں قصور)

شعبہ حفظ القرآن میں مندرجہ ذیل حضرات خدمت انجام دے رہے ہیں۔

۱۔ قاری محمد ابراہیم حبیب آبادی (قصور)

۲۔ قاری محمود قاسم کنگن پور (قصور)

شعبہ ناظرہ مقامی میں۔

۳۔ حافظ محمد عرفان کھڈیاں خاص

جامعہ میں کل طلبا کی تعداد (بمطابق ۱۴۲۱ھ/۲۰۰۰ء) ۲۱۵ ہے' جس کی تفصیل یہ ہے۔

شعبہ درس نظامی:۔	۴۰
شعبہ حفظ القرآن بیرونی:۔	۸۶
شعبہ ناظرہ قرآن مقامی:۔	۹۰

تمام طلبا و اساتذہ کے اخراجات دارالحدیث کے ذمے ہیں۔

اب دارالحدیث کی دوسری شاخ کی طرف آیئے یہ ہے مدرسہ بنات المسلمین: مسلم خواتین میں اسلامی تعلیمات کو فروغ دینے اور ان کو اسلامی اخلاق و معاشرت سے آراستہ کرنے کے لیے ریاض الحدیث للطالبات کے نام سے ادارہ قائم کیا گیا ہے۔ اس کے لیے ۸۰ مرلے کا پلاٹ حاصل کر لیا گیا ہے جو زیر تعمیر ہے۔ پانچ کمرے تعمیر ہو چکے ہیں۔ چار کنال رقبے کی چاردیواری مکمل ہو چکی ہے۔ گیٹ حسب ضرورت لگ چکا ہے۔ اصحاب خیر آگے بڑھیں تاکہ تعمیرات مکمل ہونے پر تعلیم کا آغاز ہو سکے۔ تعلیم و تدریس کے یہ تمام سلسلے خالصتاً لوجہ اللہ جاری کیے گئے ہیں۔ ہمیں یقین ہے اللہ تعالیٰ ان سلاسل کو جاری کرنے اور جاری رکھنے والوں کی مدد فرمائے گا۔

مولانا محمد صادق خلیل

(ولادت مارچ ۱۹۲۵)

۱۹۴۶ کے موسم گرما کی یہ بات مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک دن میں اپنے وطن کوٹ کپورہ کے محلہ میںتلیاں والا کی ایک گلی سے گزر رہا تھا کہ ایک شخص کے ساتھ جس کا نام مجھے یاد نہیں رہا، بیس اکیس سال کے میرے ہم عمر نوجوان سے ملاقات ہوئی- میانہ قد، سرخی مائل گندمی رنگ، گداز جسم، بھرا ہوا چہرہ، موٹی موٹی آنکھیں، ابھری ہوئی ناک، سفید قمیص اور اس دور کے مطابق سفید تہبند باندھے ہوئے- ان کے ساتھی نے بتایا کہ ان کا نام محمد صادق ہے اور یہ اوڈاں والا کے رہنے والے ہیں-

محمد صادق کا نام تو میں نے پہلی دفعہ سنا تھا لیکن اوڈاں والا اور اس کی تدریسی روایات سے تو ہر وہ شخص باخبر تھا اور باخبر ہے جو دینی اور مذہبی مدارس کی سرگرمیوں اور ان کی تاریخ سے تھوڑی بہت دلچسپی رکھتا ہے- یہ وہ جگہ ہے جہاں جماعت مجاہدین کے عہد آخر کے مرد جلیل صوفی عبداللہ مرحوم و مغفور نے ۱۹۳۲ میں دارالعلوم تعلیم الاسلام کے نام سے دینی مدرسہ جاری کیا تھا-

یہ عجیب بات ہے کہ نہ صوفی صاحب کا اس علاقے سے کوئی تعلق، نہ وہاں ان کی دور یا نزدیک کی کوئی رشتے داری، نہ وہاں ان کی برادری کا کوئی فرد، نہ کسی سے لین دین، نہ کسی سے کاروباری سانجھ.......... صوفی صاحب اصلاً وزیر آباد (ضلع گوجرانوالہ) کے رہنے والے- دونوں علاقوں کی پنجابی ہونے کے باوجود زبان اتنی مختلف کہ بعض الفاظ کا سمجھنا مشکل اور لہجہ ایک دوسرے سے متضاد........... !سوائے مسلکی ہم آہنگی کے صوفی صاحب اور وہاں کے باشندوں کے درمیان کوئی شے مشترک نہ تھی- لیکن صوفی نے اپنا مسکن اسی جگہ کو بنایا- بقول غالب

رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو
ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زبان کوئی نہ ہو

بہت جلد بے شمار لوگ ان کے ہم سخن بھی ہو گئے اور ہم زبان بھی- اس جگہ نے صوفی صاحب کے افکار اور کارہائے خیر کو اپنے اندر جذب کیا اور صوفی صاحب کو ان کے اخلاص نے اپنی طرف کھینچا- یہی وجہ ہے کہ اس غیر معروف مقام نے اس قدر شہرت پائی کہ یہ نام عرب وعجم کے دینی اور تدریسی حلقوں میں اکرام واحترام کا نشان قرار پا گیا-

محمد صادق کا مسکن یہی گاؤں تھا اور یہ کوئی بہت بڑا گاؤں نہیں ہے- اس کا حجم مختصر ہے، مگر نہایت صاف ستھرا- اس کی ظاہری صفائی کے اندر سے اس کے باطن کی صفائی صاف جھلکتی دکھائی دیتی ہے-

محمد صادق جب کوٹ کپورے گئے تو انھوں نے فیروز پور میں حضرت مولانا عطاء اللہ حنیف کی خدمت میں بھی حاضری دی جو اس سے کچھ عرصہ قبل شیخ الحدیث کی حیثیت سے اوڈاں والا میں رہ چکے تھے-

اس واقعہ سے تقریباً تین سال بعد ۱۹۴۸ میں صادق صاحب سے اوڈاں والا میں دوسری ملاقات اس وقت ہوئی تھی جب حافظ محمد یحییٰ عزیز میر محمدی، مولوی ابوبکر صدیق، خلیل اثری اور ان سطور کا راقم جمعیت طلبائے اہل حدیث مغربی پنجاب کے قیام کے سلسلے میں مختلف مقامات کے مدارس اہل حدیث کا چکر لگاتے ہوئے اوڈاں والا پہنچے تھے- یہ سردیوں کا موسم تھا-

جمعیت طلبائے اہل حدیث مغربی پنجاب کی باقاعدہ تشکیل مئی ۱۹۴۹ میں دارالعلوم تقویۃ الاسلام (لاہور) میں طلبا کے ایک اجلاس میں ہوئی تھی، جس میں پنجاب کے طلبا کے نمائندے اچھی خاصی تعداد میں شامل ہوئے تھے- اس اجلاس میں بہ اتفاق رائے حافظ محمد یحییٰ عزیز میر محمدی کو صدر اور ابوبکر صدیق کو ناظم اعلیٰ منتخب کیا گیا تھا- یہ دونوں اس وقت دارالعلوم تقویۃ الاسلام کے طالب علم تھے- خلیل اثری نے اس اجلاس کے انعقاد میں اہم کردار ادا کیا تھا- وہ بھی دارالعلوم تقویۃ الاسلام کے طالب علم تھے- نصابی تعلیم سے فارغ

ہونے کے بعد وہ اپنے گاؤں چک نمبر ۹۷ گ ب (تحصیل سمندری، ضلع فیصل آباد) چلے گئے تھے۔ اب بھی وہیں ہیں اور اچھے خاصے زمیندار گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان سے ملاقات کا سلسلہ بحمد اللہ جاری رہتا ہے۔

ہمارے صاحب ترجمہ محمد صادق کے خاندان کا تعلق دراصل ضلع جھنگ سے تھا اور یہ لوگ دریائے چناب کے قریب سے نقل مکانی کر کے ۱۹۰۱ کے لگ بھگ اوڈاں والا میں آبسے تھے۔ صادق صاحب کے والد مرحوم درزی تھے اور ان کا نام احمد دین تھا۔ ان کی سکونت تو اوڈاں والا میں تھی لیکن کام وہ منڈی ماموں کانجن میں کرتے تھے۔

۱۹۲۵ کے پس و پیش صوفی عبداللہ بھی اوڈاں والا تشریف لے گئے تھے اور پھر انھوں نے وہیں ڈیرے ڈال لیے تھے۔ صادق صاحب کے والد مولوی احمد دین نے صوفی صاحب کے ہاتھ پر بیعت جہاد کی تھی اور وہ جماعت مجاہدین میں شامل تھے۔ بے شمار لوگ اس جماعت سے تعلق رکھتے تھے اور مسلکاً سبھی اہل حدیث تھے۔

اس وقت (یعنی ۱۹۲۴، ۱۹۲۵ میں جماعت مجاہدین کے) موجودہ امیر غازی عبدالکریم (جو ایک عرصے سے مجاہد آباد ضلع لودھراں میں فروکش ہیں) اس دور کے امیر مولانا فضل الٰہی وزیر آبادی اور صوفی عبداللہ کے درمیان رابطے کے فرائض انجام دینے پر مامور تھے۔ غازی صاحب موصوف جماعت مجاہدین کے لیے فراہمی زر کے لیے خفیہ طریقے سے صادق صاحب کے والد کے ہاں ماموں کانجن آتے اور مرکز مجاہدین سے مولانا فضل الٰہی کا پیغام ان کی معرفت صوفی صاحب کو پہنچاتے اور پھر ان کے والد صوفی صاحب کا پیغام جماعت مجاہدین کے امیر مولانا فضل الٰہی کو پہنچاتے تھے۔ فراہم شدہ رقم بھی اسی ذریعے سے مرکز میں پہنچائی جاتی تھی۔

جماعت مجاہدین کی ہندوستان میں تمام سرگرمیاں انتہائی خفیہ طریقے سے ہوتی تھیں۔ انگریزی حکومت کی سی آئی ڈی بے حد تیز نگاہ رکھتی تھی اور اس کا جال دور تک پھیلا ہوا تھا۔ اگر کسی کے متعلق ذرہ بھی شبہ پڑ جاتا کہ اس کا تعلق جماعت مجاہدین سے ہے تو اسے شدید سزا کا مستوجب قرار دیا جاتا تھا۔ مجاہدین نے خفیہ مراکز قائم کر رکھے تھے جن میں

ایک مرکز صوفی عبداللہ کی وجہ سے اوڈاں والا تھا۔ اس لیے کہ صوفی صاحب مرکز مجاہدین سے یہاں آئے تھے...... اس کی تفصیل میں نے اپنی اس کتاب میں بیان کی ہے جو صوفی عبداللہ کے حالات میں لکھی ہے۔ یہ کتاب ان شاء اللہ جلد شائع ہو گی۔

بہرحال صادق صاحب کے والد جو نہایت متقی اور پرہیز گار بزرگ تھے، صوفی صاحب کے نزدیک بے حد قابل اعتماد تھے۔ میں نے ان کو دیکھا ہے، انتہائی منکسر اور نیک خصال بزرگ تھے۔

صوفی صاحب کے وہ مرید بھی تھے اور ان کے شاگرد بھی تھے۔ انھوں نے قرآن مجید کا ترجمہ صوفی صاحب سے پڑھا تھا اور اپنے اس استاد اور مرشد کے وہ مخلص ترین خدمت گزار تھے۔

یہاں ایک حیرت انگیز بات سنتے جایئے، وہ یہ کہ محمد صادق چار سال شکم مادر میں رہے۔ سلسلہ ولادت کی اصطلاح میں اسے "پت لگ جانا" کہا جاتا ہے۔ صوفی صاحب کو ان کے الد نے یہ بات بتائی اور دعا کی درخواست کی تو انھوں نے بارگاہِ الٰہی میں دعا کی اور بچہ پیدا ہوا جس کا نام محمد صادق رکھا گیا۔ یہ اپنے والدین کی آخری عمر کی اولاد ہیں اور ان کے اکلوتے بیٹے۔۔۔ صوفی صاحب نے ان کے والد سے کہا تھا کہ تمھارا یہ بچہ عالم فاضل ہو گا اور اسی حیثیت سے شہرت پائے گا۔ چنانچہ یہی ہوا۔

محمد صادق مارچ ۱۹۲۵ میں پیدا ہوئے۔ ماں باپ نے ان کی اپنے طور پر بہتر طریقے سے تربیت کی۔ کچھ بڑے ہوئے تو والد مکرم نے ادعیہ ماثورہ وغیرہ زبانی یاد کرانا شروع کیں اور سرکاری سکول میں داخل کرا دیا۔ اس زمانے میں پرائمری کا لفظ چار جماعتوں پر بولا جاتا تھا۔ انھوں نے سکول میں پرائمری پاس کی۔

صادق صاحب بتاتے ہیں کہ جب وہ سکول میں پڑھتے تھے تو تقریباً ہر رات یہ خواب دیکھتے تھے کہ فضا میں اڑ رہے ہیں اور اڑتے ہوئے اپنے ساتھی طالب علموں سے کہتے ہیں آؤ تم بھی میرے ساتھ اڑو۔ وہ تو ان کا ساتھ نہیں دیتے تھے۔ لیکن یہ خود اڑتے ہوئے دور تک پہنچ جاتے، پھر نہایت آسانی سے جب جی چاہتا فضا سے زمین پر آ جاتے...... اس

خواب کی جو وہ مسلسل دیکھتے تھے، یہی تعبیر معلوم ہوتی ہے کہ انھوں نے طویل عرصے تک تدریسی خدمت انجام دی اور ان سے بے شمار شاگردوں نے تعلیم حاصل کی، جن کے ذریعے دور دراز علاقوں تک علم پہنچا- پھر تصنیف وتالیف اور بہت سی عربی کتابوں کے اردو ترجمے کر کے علم دین کو آگے بڑھایا اور لاتعداد لوگوں نے اس سے استفادہ کیا- اس طرح ان کے آثار علم مختلف علاقوں اور ملکوں میں پہنچے-

صادق صاحب نے سرکاری سکول سے پرائمری پاس کی تو والد نے ۱۹۳۸ میں ان کو اپنے گاؤں اوڈاں والا کے اس دینی مدرسے میں داخل کرا دیا جو صوفی صاحب نے جاری کیا تھا- یہ چھے سال کا نصاب تھا جو انھوں نے اسی دارالعلوم کے اساتذہ سے مکمل کیا- ان کے ابتدائی دور کے اساتذہ تھے خود ان کے والد میاں احمد دین، صوفی عبداللہ (بانی دارالعلوم تعلیم الاسلام اوڈاں والا و ماموں کانجن) اور صوفی محمد ابراہیم (اوڈاں والا) پھر متوسط اور انتہائی درجوں کی کتابیں جن اساتذہ سے پڑھیں وہ تھے حضرت حافظ محمد گوندلوی، مولانا نواب الدین، مولانا ثناء اللہ ہوشیار پوری، مولانا عبدالرحمٰن نومسلم، مولانا حافظ محمد اسحاق اور مولانا محمد داؤد انصاری بھوجیانی...... یہ تمام حضرات عالی قدر کسی زمانے میں اوڈاں والا میں فرائض تدریس انجام دیتے رہے تھے- اور محمد صادق نے انھی سے تکمیل تعلیم کی اور اسی دارالعلوم سے سند فراغ حاصل کی-

اس کے علاوہ میٹرک کا امتحان وہیں رہ کر دیا اور پنجاب یونیورسٹی سے فاضل عربی اور فاضل فارسی کے امتحانات بھی اسی دارالعلوم کی طرف سے دیے اور نمایاں پوزیشن حاصل کی-

دارالعلوم تعلیم الاسلام میں کئی سال یہ سلسلہ چلا کہ جو طالب علم وہاں سے فارغ ہوا، وہیں استاذ کی حیثیت سے اس کی تقرری کر دی گئی اور اسے باقاعدہ ماہانہ تنخواہ ملنے لگی- مولانا محمد صادق خلیل کو بھی یہ رعایت دی گئی اور فراغت کے بعد ۱۹۴۵ میں بہ طور استاذ کے ان کی خدمات حاصل کر لی گئیں-

۱۹۴۵ سے ۱۹۶۰ تک پندرہ سال وہ اوڈاں والا کی مسند تدریس پر فائز رہے- اس اثنا

میں بہت سے طلبا نے ان سے استفادہ کیا۔

۱۹۶۱ میں مولانا سید محمد داؤد غزنوی کے حکم سے وہ اپنے گاؤں کے دارالعلوم سے نکلے اور جامعہ سلفیہ میں (فیصل آباد) چلے گئے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ انھوں نے تدریس کے لیے اپنے آبائی مسکن سے باہر قدم رکھا۔ وہاں متعدد لائق اور منجھے ہوئے اساتذہ موجود تھے، مدرسین کی اس جماعت میں انھوں نے بے حد محنت کی اور نہایت جاں فشانی سے فریضۂ تدریس انجام دیا۔ ہدایہ اور مسلم الثبوت وغیرہ مشکل علوم وفنون کی کتابیں طلبا کو پڑھائیں۔ وہاں تقریباً دس سال ان کا سلسلہ تدریس جاری رہا۔ اس طویل مدت میں بہت سے طلبا ان سے مستفید ہوئے۔ ان کے پرانے ساتھی پیر محمد یعقوب قریشی بھی اس وقت وہیں تھے جو گزشتہ کئی سال سے جامعہ علوم اثریہ جہلم میں شیخ الحدیث کے منصب عالی پر متمکن ہیں۔

اس اثنا میں اوڈاں والا سے دارالعلوم تعلیم الاسلام کا بہت بڑا حصہ ماموں کانجن منتقل ہو چکا تھا۔ مولانا محمد صادق خلیل بھی جامعہ سلفیہ سے مستعفی ہو کر ماموں کانجن آ گئے تھے۔ پیر محمد یعقوب قریشی بھی ان کے ساتھ وہیں تشریف لے آئے تھے۔

چار سال مولانا محمد صادق ماموں کانجن رہے۔ پھر دارالحدیث کراچی کے ارباب انتظام کے اصرار پر کراچی کا عزم کیا۔ وہاں ان کی مدت تدریس صرف ایک سال رہی۔

پھر راولپنڈی کے مدرسہ تدریس القرآن والحدیث کی مجلس انتظامیہ کے زور دینے پر راولپنڈی کا قصد کیا۔ وہاں دس سال رہے۔

اس کے بعد حافظ عبدالرحمٰن مدنی سے رابطہ ہوا تو انھوں نے ان کی خدمات اپنی جامعہ رحمانیہ کے لیے حاصل کر لیں جو ماڈل ٹاؤن (لاہور) میں قائم ہے۔ وہاں ان کا قیام تین سال رہا۔

بعد ازاں پروفیسر عبدالحکیم سیف انھیں دارالحدیث کوٹ رادھا کشن (ضلع قصور) لے آئے۔ یہ مدرسہ مولانا عبدالقدوس میواتی نے جاری فرمایا تھا۔ حضرت مولانا مرحوم پاکیزہ سیرت عالم دین تھے۔ ان کی وفات کے بعد دارالحدیث ان کے لائق صاحب زادے پروفیسر عبدالحکیم سیف کے زیر اہتمام آیا۔ باپ کی زندگی میں وہ ایک کالج میں

اسلامیات کے پروفیسر تھے۔ان کا انتقال ہوا تو پروفیسری سے استعفیٰ دے دیا اور عالی قدر باپ کے جاری کردہ دارالعلوم کے لیے اپنی خدمات وقف کر دیں، جس کا نام انھوں نے جامعہ قدوسیہ رکھا۔طالب علمی کے زمانے میں یہ اوڈاں والا میں مولانا محمد صادق خلیل سے تعلیم حاصل کرتے رہے تھے اور ان کی تدریسی صلاحیتوں سے آگاہ تھے، وہ انھیں کوٹ رادھا کشن لے گئے۔مولانا تین سال وہاں رہے۔کسی دینی مدرسے میں ان کا یہ آخری سلسلہ تدریس تھا۔

انھوں نے مختلف اوقات میں اوڈاں والا سے لے کر کراچی تک سات مدارس دینیہ میں خدمت تدریس انجام دی جو کم وبیش چالیس برس کی طویل مدت میں پھیلی ہوئی ہے۔اس عرصے میں ان سے جن طلبا نے استفادہ کیا، نہ ان کو ان کے ناموں کا علم ہوگا اور نہ ان کی صحیح تعداد کا پتا ہوگا۔ابتدائی، ثانوی اور انتہائی درجوں کے بے شمار شائقین علم ان کے حلقہ درس میں شامل ہوئے اور ان سب نے ان سے اپنی علمی تشنگی بجھانے کی کوشش کی۔اب ان میں سے بفضل الٰہی کچھ حضرات درس وتدریس میں مصروف ہوں گے، بعض نے خطابت و مواعظ کا محاذ سنبھالا ہوگا، بعض نے قلم وقرطاس سے رابطہ قائم کر رکھا ہوگا، کچھ وہ ہوں گے جنھوں نے کاروبار کو مرکز توجہ ٹھہرایا ہوگا، کچھ تعداد ان کی ہوگی جو سرکاری سکولوں اور کالجوں میں جا کر طلبا کو مستفید کر رہے ہوں گے اور کچھ اس دنیائے فانی سے کوچ کر کے عالم جاودانی میں چلے گئے ہوں گے۔

مولانا کے شاگرد جو خدمت خیر انجام دے رہے ہیں، اس کی حیثیت ان کے لیے صدقہ جاریہ کی ہے، جس کا اجر انھیں دربار خداوندی سے ہمیشہ ملتا رہے گا۔

ان کی تدریس کا سلسلہ کوٹ رادھا کشن کے بعد ختم ہوگیا۔وہاں سے فارغ ہو کر انھوں نے حج بیت اللہ کیا۔

تقریباً ڈیڑھ سال ایک ایسے کام میں الجھے رہے جو نہ ان کے ذوق کے مطابق تھا، نہ ان کے مزاج سے لگا کھاتا تھا اور نہ ان کی ذہنی افتاد سے کوئی تعلق رکھتا تھا۔خدا جانے اتنے بڑے عالم دین اور منجھے ہوئے مدرس کے ذہن میں کس سیانے نے پھونک ماری اور انھوں

نے وہ دھندا شروع کر دیا جس سے انھیں کوئی علاقہ نہ تھا۔ وہ تھا ٹرانسپورٹ کا کام۔ نہ ان کو اس کا تجربہ، نہ اس سے کوئی تعلق۔ ایک سوزوکی وین خریدی اور اسے فیصل آباد کی سڑکوں پر چلانے کے لیے کسی ڈرائیور کو اس کے اسٹیرنگ پر بٹھا دیا اور اپنے ایک بیٹے کو ڈرائیور کے ساتھ نتھی کر دیا۔

سال ڈیڑھ سال یہ سلسلہ کسی نہ کسی طرح گھسیٹتے رہے۔ پھر کانوں کو ہاتھ لگائے اور اسے ترک کر دیا۔ ایک سوزوکی ویگن سے آہستہ آہستہ وہ اس شیخ چلی کی طرح ٹرانسپوٹر بننے کا ارمان دل میں رکھتے ہوں گے جس نے کسی کی گھڑی سر پر اٹھا کر سوچا تھا کہ اس سے جو ایک آنہ مزدوری کا ملے گا، اس سے مرغی کا انڈہ خریدوں گا، اسے ''کڑک'' والی کسی مرغی کے نیچے رکھوں گا، اس سے مرغی کے بچے نکلیں گے، پھر آہستہ آہستہ بہت سی مرغیاں ہو جائیں گی اور میں بہت بڑا مال دار بن جاؤں گا۔

وہ چھوٹی سی ننھی منی سی وین تھی۔ ایک دن مجھے بھی فیصل آباد میں اس پر سوار ہونے کی سعادت حاصل ہوئی تھی۔ مولانا کچھ بھاری کم ہیں۔ میں نے ان سے کہا تھا کہ اس کا وزن تو آپ کے وزن سے بھی کم ہوگا۔ اب تو ''ماس'' کچھ ڈھل گیا ہے، پہلے تو نوبت یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ علم کے ساتھ بسطۃً فی الجسم بھی ہو گئے تھے اور میں نے درخواست کی تھی کہ دور تک پیدل چلا کریں ورنہ بسطہ کے بجائے گوشت کا بھرا ہوا ''بستہ'' ہو جاؤ گے۔

وہ میرے مخلص ترین دیرینہ دوست ہیں، میں جو کچھ ان سے کہوں اس کا نہ صرف یہ کہ برا نہیں مانتے، بلکہ اتنا خوش ہوتے ہیں کہ اس سے میری حوصلہ افزائی ہوتی ہے اور مجھے مزید کچھ کہنے کا موقع مل جاتا ہے۔ یہ ان کی فراخ حوصلگی اور دوست نوازی ہے۔

ٹرانسپوٹری کا دور عارضی تھا اور یہ نشہ بہت جلد اتر گیا تھا.................. اس کے بعد انھوں نے جو کچھ کیا اس پر رشک آتا ہے۔ ''ضیاء السنہ'' کے نام سے ترجمہ و تالیف کا ادارہ قائم کیا اور اس کی طرف سے ابتدا میں جو نہایت اہم کتاب شائع کی وہ ترمذی شریف کی شرح تحفۃ الاحوذی ہے۔ حضرت مولانا عبدالرحمٰن مبارک پوری محدث رحمۃ اللہ کی تصنیف جو نہایت تحقیقی مقدمے سمیت پانچ جلدوں پر مشتمل ہے۔ یہ ان کا عظیم

کارنامہ ہے۔

قسمت نے یاوری کی کہ انھوں نے نجد وحجاز کے اہم مقامات کا دورہ کیا۔ مکہ مکرمہ، مدینہ منورہ، ریاض، جدہ، درعیہ وغیرہ متعدد شہروں میں گئے۔ دیوبند کانفرنس میں شرکت کے لیے ہندوستان کا عزم بھی کیا اور بہت سے اہل علم سے ملاقاتیں کیں۔

اب آیئے ان کی ترجمہ وتالیف کی مساعی کی طرف، جس کی تفصیل اس طرح ہے۔

بہت سال پیشتر انھوں نے اوڈاں والا کی سکونت ترک کردی تھی اور فیصل آباد میں جامعہ سلفیہ کے قریب محلہ حاجی آباد میں مکان تعمیر کر کے وہیں اقامت گزیں ہو گئے تھے۔ اچھی خاصی لائبریری بنائی اور ترجمہ وتالیف میں جت گئے۔ مندرجہ ذیل کتابوں کا ترجمہ کیا اور ان کا زیادہ کام ترجمے کا ہے۔

۱۔ ترجمہ مشکوۃ شریف — مع حواشی پانچ جلدوں پر مشتمل ہے۔

۲۔ روضہ اقدس کی زیارت ترجمہ الرد علی الاخنا — تصنیف امام ابن تیمیہ

۳۔ افکار صوفیہ ترجمہ فکر الصوفی — تالیف عبدالخالق عبدالرحمٰن

۴۔ اردو ترجمہ ریاض الصالحین — تالیف ابوزکریا یحییٰ بن شرف نووی دمشقی

۵۔ قبروں پر مسجدیں اور اسلام — اردو ترجمہ تحذیر المساجد عن اتخاذ القبور مساجد۔ تصنیف شیخ محمد ناصر الدین البانی

۶۔ حج نبویہ — ترجمہ حجۃ النبیؐ: تصنیف شیخ محمد ناصر الدین البانی

۷۔ نماز تراویح — ترجمہ صلوٰۃ التراویح تصنیف شیخ محمد ناصر الدین البانی

۸۔ امام احمد بن محمد کا دور ابتلا — ترجمہ محنۃ الامام احمد بن حنبل تحقیق ڈاکٹر نقش مصری

۹۔ اردو ترجمہ محمد بن عبدالوہاب — تالیف احمد بن عبدالغفور العطار۔ یہ کتاب کم وبیش چالیس ہزار کی تعداد میں چھپی اور بکی۔

۱۰۔ احادیث ضعیفہ — ترجمہ الاحادیث الضعیفہ تصنیف علامہ البانی

۱۱-نماز نبوی — ترجمہ صلوۃ النبی کما تراھا تالیف علامہ البانی

۱۲-اسلامی عقائد — ترجمہ شرح العقیدہ الطحاویہ-تالیف ابن اعز الحنفی

۱۳-اردو ترجمہ الرد علی البکری — تالیف امام ابن تیمیہ

ترجمہ شرح عقیدہ واسطیہ

مذکورہ کتابوں میں سے بعض کتابیں بڑی ضخیم ہیں اوران میں اکثر کئی بار چھپ چکی ہیں- کچھ کتابیں ایسی بھی ہیں جن کے پندرہ ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں-

اب ان کی پوری توجہ قرآن مجید کی تفسیر کی طرف ہے-اس کی چند جلدیں چھپ چکی ہیں اور اگلی جلدوں کی کمپوزنگ ہو رہی ہے-تفسیر کا نام ''اصدق البیان'' رکھا ہے- خدا کرے یہ مہتم بالشان کام جلد پایہ تکمیل کو پہنچے- چھبیسویں پارے پر کام ہو رہا ہے-

حضرت مولانا سید محمد داؤد غزنوی کے دور صدارت میں کچھ عرصہ وہ مرکزی جمعیت اہل حدیث کی مجلس عاملہ کے رکن بھی رہے اور جمعیت اہل حدیث ضلع لائل پور کے ناظم بھی............!

برصغیر کی عملی سیاست میں انھوں نے کبھی حصہ نہیں لیا، لیکن اس باب میں وہ حضرت مولانا ابوالکلام آزاد سے متاثر ہیں اور برصغیر کی سیاست کے تحریکی دور میں انھی کے سیاسی نقطہ فکر کو صحیح قرار دیتے تھے-

اب آیئے اخبار ''منہاج'' کی طرف!

۱۹۵۸ میں ہم چند دوستوں نے مل کر سہ روزہ اخبار ''منہاج'' جاری کیا تھا- میں اس وقت اخبار ''الاعتصام'' کی ادارت پر مامور تھا- ''منہاج'' بھی مسلک اہل حدیث کا ترجمان تھا اور میں نے عارضی طور سے الاعتصام سے الگ ہو کر ''منہاج'' کی زمام ادارت سنبھال لی- مولانا محمد صادق خلیل کا مالی تعاون ''منہاج'' کو حاصل تھا- ایک دفعہ میں اسی سلسلے میں اوڈاں والے گیا اور مولانا صادق کے گھر ٹھہرا- ان کے والد اور والدہ نے میرے ساتھ نہایت پیار کا برتاؤ کیا اور کھلانے پلانے میں اس قدر میرا خیال رکھا کہ مجھے احساس شرمندگی ہونے لگا- پرانے زمانے کے لوگ بلاشبہ بہت مخلص اور صاف دل تھے اور اپنے بچوں کے

دوستوں سے بچوں کا سا سلوک روا رکھتے تھے۔ ایک رات میں وہاں رہا۔ صادق صاحب کے والد نے گھر میں کپڑے کی دکان کھول رکھی تھی۔ دوسرے دن واپس آنے لگا تو انھوں نے ازراہ کرم مجھے رضائی کے لیے سات آٹھ گز کپڑا دیا۔ بہت اچھا پھول دار کپڑا۔ کہا: اس کی ایک رضائی تمھارے بھائی صادق کو بنا کر دی ہے، ایک تم بنا لو۔ وہ رضائی ہم نے بنائی اور کئی سال میرے استعمال میں رہی۔ جب میں وہ رضائی دیکھتا یا اوڑھتا تھا تو صادق صاحب کے ماں باپ کی محبت کا یہ پہلو یاد آ جاتا تھا۔

۱۹۵۸ء ہی میں اپریل کا مہینا تھا اور رمضان کے روزے۔ صادق صاحب دو مہینے کی سالانہ چھٹیوں پر تھے۔ ہم نے ''منہاج'' کی توسیع اشاعت کے لیے راولپنڈی جانے کا پروگرام بنایا۔ خیال یہ تھا کہ کسی کو تکلیف نہیں دیں گے، ہوٹل میں رہیں گے۔

ہم راجہ بازار میں گھوم رہے تھے کہ اتفاقاً ایک دوست مل گئے، جن کا نام معراج دین تھا اور ہم نے انھیں معراج صاحب کہا کرتے تھے۔ وہ ارائیں برادری سے تعلق رکھتے تھے اور تقسیم ملک کے زمانے میں امرتسر سے نقل مکانی کر کے اپنے خاندان کے ساتھ راولپنڈی آ بسے تھے۔ بڑے خوب صورت نوجوان تھے۔ ایک تنگ سے بازار میں جس کا نام میں بھول گیا ہوں، ان کا پرفیومری کا کاروبار تھا اور یہ لفظ ان کی دکان کے نام کا جز بھی تھا۔ ان کے بعض رشتے دار فیصل آباد میں رہتے تھے اور وہیں ان کی شادی ہوئی تھی۔ فیصل آباد میں بھی اتفاقاً دو تین دفعہ ان سے ملاقات ہوئی تھی۔ مسلکاً پکے اہل حدیث تھے۔ نہایت خوش مزاج، خندہ رو اور لطیفہ سننے اور سنانے کے شائق۔ جماعت اسلامی سے متاثر تھے۔ لیکن جماعت اسلامی کا کوئی اثر نہ ان کی زبان سے ہمیں معلوم ہوا، نہ عام میل جول سے۔ خشکی اور تنگ نظری سے وہ آشنا ہی نہ تھے۔

ہمیں دیکھ کر اور مل کر بہت خوش ہوئے اور پوچھا:

کب آئے اور کہاں ٹھہرے ہو؟

ہم نے کہا: آج ہی لاہور سے آئے ہیں اور کل آپ کو بتائیں گے کہ کہاں ٹھہرے ہیں۔

بولے: نہیں اب تم میرے مہمان ہو، جتنے دن یہاں رہو گے میرے گھر میں رہو گے۔ ہم نے ہر چند ان سے اجازت لینے کی کوشش کی، لیکن وہ نہیں مانے۔ شام سے پہلے ہی وہ ہمیں اپنے گھر لے گئے اور کھانا کھلایا۔ دوسرے دن ہمارا پروگرام مری جانے کا تھا۔ ہم نے ان کو بتایا تو انھوں نے کہا میں بھی تمھارے ساتھ مری چلوں گا۔ باتیں ہوں گی اور لطیفے چلیں گے۔

مجھے رات کو صادق صاحب نے کہا کہ آج روزے کی وجہ سے بہت تنگ ہوئے ہیں، سفر میں روزہ نہ رکھنے کی شریعت نے صاف الفاظ میں اجازت دی ہے۔ کل پھر سفر درپیش ہے، اس لیے روزہ نہیں رکھیں گے۔ ان کے ساتھ سحری کے وقت کھانا کھالیں گے لیکن روزے کی نیت سے نہیں۔

میں نے کہا: روزہ رکھنا چاہیے۔ انھوں نے کہا نہیں رکھنا چاہیے۔ اگر تم نے روزہ رکھا تو میں مری جا کر کسی ہوٹل میں جہاں ہم رہیں گے، تمھارا روزہ تڑوادوں گا۔ ہم مسافر ہیں اور لمبے سفر پر ہیں۔ تم خواہ مخواہ نیک بننے کی کوشش کر رہے ہو۔ سفر میں تنگ ہو کر روزہ رکھنا کوئی نیکی نہیں۔

دوسرے دن معراج صاحب کو تو کوئی ضروری کام پڑ گیا' وہ ہمارے ساتھ مری نہ جا سکے، لیکن ہم چلے گئے۔ ایک بجے کے قریب ہم وہاں پہنچے اور میجسٹک ہوٹل میں ہم نے ایک کمرہ لیا۔ سخت بھوک لگی تھی مجھے بھی اور صادق صاحب کو بھی......! اب انھوں نے کھانے کے لیے کہا اور میں نے کھانے سے انکار کر دیا۔ انھوں نے مسافر کے لیے روزہ نہ رکھنے کے بارے میں پہلے قرآن کی آیت پڑھی، پھر حدیثیں سنانا شروع کر دیں۔ وہ اس طرح مجھے سفر میں روزہ نہ رکھنے کے مسائل بتا رہے تھے جیسے میں ان سے بالکل ناواقف ہوں۔

بہر حال ہم نے اپنے کمرے کے بیرے کو کھانے کا آرڈر دیا۔ اس نے کھانا ہمارے سامنے رکھا۔ ابھی ہم نے ایک ایک لقمہ منہ میں ڈالا تھا کہ باہر سڑک پر شور کی آوازیں آنے لگیں اور ساتھ ہی ہوٹل کے کمروں کے دروازوں پر زور زور سے ڈنڈے برسنے لگے کہ

اندر بے روز گھسے ہوئے ہیں اور کھانا کھا رہے ہیں۔ ہم سخت پریشان کہ اب کیا ہوگا۔ میں نے صادق صاحب سے کہا: کھاؤ کھانا، خود بھی پھنسے اور مجھ غریب کو بھی پھنسایا۔ اتنے میں بیرا دوڑتا ہوا آیا اور کہا: یہ پٹھان لوگ خود ہر وقت نسوار کھاتے رہتے ہیں، لوگوں کو پریشان کرتے ہیں، آپ مسافر ہیں، ہم بھی جانتے ہیں، مسافر کو روزہ نہ رکھنے کی شریعت نے اجازت دی ہے۔ میں باہر سے آپ کے کمرے کو تالا لگا دیتا ہوں۔ آپ ان نسوار بازوں سے نہ گھبرائیں، آرام سے کھانا کھائیں۔ یہ لوگ اس ہوٹل سے آگے چلے جائیں گے تو میں آپ کے پاس آؤں گا اور آپ مری کی سیر کو چلے جایئے گا۔

تین دن ہم وہاں رہے اور مری کی سیر کی۔ واپس آ کر معراج صاحب سے ملاقات ہوئی۔ دو تین روز ''منہاج'' کی توسیع اشاعت کے لیے دوستوں سے ملے اور اپنے مقصد میں کامیاب رہے۔ واپس سیالکوٹ آئے۔ ایک دن وہاں رہ کر پچیس تیس خریدار بنائے اور بذریعہ بس براستہ سوہدرہ، وزیرآباد لاہور آ گئے۔ سوہدرہ ہم نے اسی دن (اپریل ۱۹۵۸ میں) بس پر آتے ہوئے دیکھا۔

گزشتہ سطور میں معراج صاحب کا ذکر آپ نے پڑھا۔ نہایت افسوس ہے اس خوب رو اور خوش گفتار نوجوان نے عالم جوانی میں وفات پائی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

معلوم نہیں معراج مرحوم کے عزیزوں اور جاننے والوں میں سے یہ سطور کسی کے مطالعے میں آئیں گی یا نہیں۔ کچھ عرصہ پیشتر بھی میں نے ایک مضمون میں ان کا ذکر کیا تھا۔

ہر شخص کے بارے میں ہر شخص کا ذاتی تجربہ اور اپنا نقطۂ نظر ہوتا ہے۔ وہ اسی کے مطابق اس شخص کا تذکرہ کرتا ہے، کسی کو اس سے اتفاق ہوتا ہے اور کسی کو اختلاف۔ میرا بھی اپنے دوست مولانا محمد صادق خلیل کے متعلق ذاتی تجربہ اور اس کی روشنی میں اپنا نقطۂ نظر ہے، میں نے اسی کے پیش نظر ان کے بارے میں لکھا ہے۔ میرے نزدیک ان کی تدریسی اور ترجمے کی خدمات نہایت قابل قدر ہیں۔ انھوں نے مسلک سلف اور اہل حدیث کے زاویۂ فکر کو اپنا رہنما اصول ٹھہرایا ہے اور اس کی وضاحت بہت اچھے پیرائے میں کی ہے۔ اس کے ساتھ ہی انھوں نے اردو زبان کی خدمت بھی کی ہے۔ ان کا قلم محتاط اور لہجہ متوازن ہے۔ وہ صاف

انداز اور مثبت اسلوب میں اپنے مافی الضمیر کا اظہار کرتے ہیں۔ جزاہ اللہ تعالیٰ۔

میں نے ان کو خوش مزاج رفیق سفر پایا ہے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے بہتر آدمی کے لیے ایک مجلس میں جن معیارات کا ذکر کیا تھا، ان میں ایک یہ ہے کہ سفر میں وہ اپنے ساتھی کا معاون اور خیر خواہ ہو، اور اپنی ضرورت پر اس کی ضرورت کو ترجیح دیتا اور مقدم گردانتا ہو۔ سو میرے ساتھ صادق خلیل کا سفر اور غیر سفر میں جو معاملہ رہا ہے، اس پر میں خوش ہوں اور ان کا شکر گزار ہوں۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ انھیں دینی خدمات کے زیادہ سے زیادہ مواقع حاصل ہوں جو اس کی بارگاہ میں ان کے لیے صدقہ جاریہ ثابت ہوں۔ آمین یا رب العالمین

اب چند الفاظ مولانا محمد صادق خلیل کی اولاد کے بارے میں......!

ان کے پانچ بیٹے اور تین بیٹیاں ہیں۔ بیٹیاں اپنے گھروں میں آباد ہیں اور ماشاء اللہ سب بال بچوں والی ہیں............ بیٹوں کی تفصیل یہ ہے۔

۱۔ حبیب اللہ جاوید: گھی کارپوریشن کے ایک ادارے میں چیف انجینئر اب ریٹائر ہو چکے ہیں۔

۲۔ عبدالرشید: ایک ٹیکسٹائل ملز میں میں انجینئر ہیں۔

۳۔ محمد اقبال تبسم: کریسنٹ ٹیکسٹائل ملز فیصل آباد میں انجینئر ہیں۔

۴۔ عبدالحفیظ مدنی: تحقیقی کاموں میں باپ کی مدد کرتے ہیں۔ بالخصوص تفسیر کے سلسلے میں ان کے معاون ہیں۔ مدینہ یونیورسٹی میں حصول علم کرتے رہے ہیں۔

۵۔ شفقت وقار: جلد ساز ہیں۔

پانچوں بیٹے اور تینوں بیٹیاں ماشاء اللہ والدین کے فرماں بردار ہیں اور اصحاب اولاد ہیں۔

پروردگار عالم اس گھرانے کو خوش و خرم رکھے۔ آمین

❀❀❀

مولانا محمد یونس اثری

(ولادت مئی ۱۹۲۷)

۱۹۴۹ میں مرکزی جمعیت اہل حدیث کے آفس سیکرٹری کی حیثیت سے میں لاہور میں تھا اور جمعیت کا دفتر اس وقت شیش محل روڈ پر دارالعلوم تقویۃ الاسلام کی بلڈنگ میں تھا۔ اس زمانے میں بہت لوگوں سے تعلقات پیدا ہوئے اور بے شمار حضرات سے ملاقات کے مواقع میسر آئے۔ دارالعلوم تقویۃ الاسلام اس وقت پاکستان میں تدریس کا بہت بڑا مرکز تھا اور متعدد مشہور اساتذہ اس میں طلبا کو تعلیم دینے پر متعین تھے۔ اس دور کے طلبا نہایت محنت اور انہماک سے تعلیم حاصل کرتے تھے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ نے ان پر کرم فرمایا اور ان کا شمار ان علمائے دین کی صف میں ہونے لگا جنھوں نے آگے چل کر اس کے دین کی اپنے انداز میں بے حد خدمت کی اور یہ خدمت بڑی ثمر آور ثابت ہوئی۔ انھی علمائے دین میں ہمارے لائق احترام دوست مولانا محمد یونس اثری کا اسم گرامی شامل ہے۔

دارالعلوم تقویۃ الاسلام میں جس زمانے میں ان سے ملاقات ہوئی وہ ان کی طالب علمی کا زمانہ تھا اور اس وقت ان کی اکیس بائیس سال کی عمر ہوگی۔ درمیانہ قد، سرخی مائل گندمی رنگ، تیکھے نقوش، ہنس مکھ، خوش مزاج اور عمدہ خصائل نوجوان............!

اب آیئے ان کے اب تک کے شب و روز کا جائزہ لیتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ انھیں زندگی کی کن کن منازل سے گزرنے کا اتفاق ہوا۔

محمد یونس اثری مئی ۱۹۲۷ کو موضع گھینال (ضلع مظفر آباد، آزاد کشمیر) میں پیدا ہوئے۔ جس عہد میں ان کی پیدائش ہوئی اس عہد میں آزاد کشمیر کا کوئی تصور نہ تھا۔ اس وقت ایک ہی کشمیر تھا اور وہ ڈوگرہ حکمران کی گرفت میں تھا۔ اس پر آزاد کشمیر اور مقبوضہ کشمیر کی اصطلاح کا اطلاق اس وقت ہونے لگا جب برصغیر دو حصوں میں منقسم ہوا، ایک حصے کا

نام وہی ہندوستان رہا جو اس کا پرانا نام تھا اور دوسرا حصہ پاکستان کہلایا۔ اس وقت حالات نے ایسی کروٹ لی کہ کشمیر دو حصوں میں بٹ گیا۔ اس کا جو حصہ ہندوستان میں آیا اسے ہماری زبان میں ''مقبوضہ کشمیر'' کہا جانے لگا اور جو پاکستان میں آیا وہ آزاد کشمیر کے نام سے موسوم ہوا۔ ہمارے دوست محمد یونس اثری کا تعلق سکونت اسی آزاد کشمیر سے ہے۔

ان کا گھرانا نیک لوگوں کا گھرانا تھا اور ان کے سب ارکان پر دین داری کا غلبہ تھا اور تعلیم و تعلم کا سلسلہ بھی کسی حد تک ان میں جاری تھا۔ چنانچہ محمد یونس نے ابتدائی تعلیم گھر میں اپنے والدین سے حاصل کی۔ ۱۹۴۲ میں جب کہ وہ پندرہ سال کو پہنچ گئے تھے، مزید تعلیم کے لیے گھر سے نکلے اور ہزارہ کے علاقے میں آئے۔ ہزارہ کے مختلف مقامات میں ان دنوں بڑی بڑی مسجدوں میں دینی تعلیم دی جاتی تھی۔ چنانچہ یہ ہزارہ کے داتا حفیظ، بانڈی، مانسہرہ، گامرہ اور ہری پور وغیرہ مقامات میں حصول علم کرتے رہے۔ اس نواح میں انھوں نے دو سال یہ سلسلہ جاری رکھا۔

احناف کے دیوبندی مکتب فکر کے مولانا غلام اللہ خاں کا اس وقت بڑا شہرہ تھا، وہ راولپنڈی میں قیام فرماتے تھے اور وہ پورا علاقہ ان کے درس و تدریس اور تقریر و خطابت سے متاثر تھا۔ ۱۹۴۴ میں محمد یونس نے ان کی خدمت میں حاضری دی۔ ایک سال وہ ان کے حلقہ درس میں رہے اور ان سے تفسیر قرآن کے بعض مقامات پڑھنے اور سمجھنے کی سعادت حاصل کی۔

۱۹۴۵ میں انھوں نے امرتسر کا عزم کیا اور وہاں دارالعلوم تقویۃ الاسلام (یعنی مدرسہ غزنویہ) میں داخلہ لیا۔ ۱۹۴۷ تک وہ وہاں کے عالی مرتبت اساتذہ سے استفادہ کرتے رہے۔ اگست ۱۹۴۷ میں ملک تقسیم ہو گیا اور پاکستان معرض قیام میں آ گیا تو وہ وہاں سے نکلے اور نیا کوٹ کے مدرسہ اشرف العلوم میں آ گئے۔ وہاں ایک عالم دین مولانا عبدالرحمٰن کا سلسلہ تدریس جاری تھا۔ وہ دیوبندی مسلک سے تعلق رکھتے تھے۔ بعد میں اہل حدیث ہو گئے تھے۔ ان سے انھوں نے علم نحو کی انتہائی کتاب شرح جامی پڑھی، منطق کی قطبی اور میر قطبی دو کتابیں پڑھیں اور معانی و بیان کی مختصر المعانی کی تکمیل کی۔

۱۹۴۷ میں کچھ عرصہ وہ گھر رہے۔ کیونکہ وہ نہایت افراتفری کا زمانہ تھا اور کشمیر کی آزادی کے لیے جدوجہد کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا تھا، اس میں کچھ تیزی بھی آ گئی تھی۔ نوجوان محمد یونس بھی اس جدوجہد میں شامل ہو گئے تھے۔ اس طرح کئی مہینے وہ حصول علم سے الگ رہے۔ پھر ان کے والد محترم نے بیٹے کو مولانا فضل الٰہی وزیر آبادی کی خدمت میں وزیر آباد بھیج دیا۔ مولانا وزیر آبادی نے سفارشی خط دے کر ان کو مولانا محمد اسماعیل سلفی کی خدمت میں گوجرانوالہ جانے کا حکم دیا۔

مولانا فضل الٰہی وزیر آبادی کی فراست کی داد دیجیے کہ انھوں نے اس نوجوان کو تحصیل علم کی راہ پر گامزن ہونے کی تلقین فرمائی اور مولانا محمد اسماعیل سلفی کی خدمت میں بھیج دیا۔ حالاں کہ محمد یونس کا تعلق اس وقت کشمیر کی عملی جدوجہد سے تھا اور وہاں کسی پیمانے پر لڑائی کا سلسلہ جاری تھا اور وہ اس میں شامل بھی رہ چکے تھے، لیکن مولانا نے ان کو اس جدوجہد میں شامل رہنے کا مشورہ نہیں دیا۔ وہ چاہتے تھے کہ یہ نوجوان علم حاصل کرے اور یہی صحیح مشورہ تھا اور اسی پر محمد یونس نے عمل کیا۔

چنانچہ مولانا فضل الٰہی کے مشورے سے ۱۹۴۸ میں محمد یونس گوجرانوالہ میں حضرت مولانا محمد اسماعیل سلفی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان کے حلقۂ شاگردی میں شمولیت اختیار کی اور ان سے بعض درسی کتابیں پڑھیں۔

گوجرانوالہ میں وہ ایک سال رہے۔ اس کے بعد دارالعلوم تقویۃ الاسلام میں لاہور آ گئے۔ تقسیم ملک سے قبل یہ دارالعلوم امرتسر میں قائم تھا اور جیسا کہ پہلے بتایا گیا، محمد یونس وہاں اس میں تعلیم حاصل کرتے رہے تھے۔ امرتسر میں ان کے قیام کا زمانہ تقریباً دو سال پر محیط تھا، لیکن لاہور میں انھوں نے اسی دارالعلوم میں مروجہ نصاب کی تکمیل کی اور ۱۹۵۳ میں سند فراغ لی۔

مولانا محمد یونس اثری نے مندرجہ ذیل حضرات سے تعلیم حاصل کی۔

۱۔ مولانا عبدالرحمٰن مدرسہ اشرف العلوم نیا کوٹ

۲۔ مولانا غلام اللہ خاں راولپنڈی

۳-حضرت مولانا نیک محمد دارالعلوم تقویۃ الاسلام (مدرسہ غزنویہ) امرتسر

۴-مولانا محمد حسین ہزاروی مدرسہ غزنویہ امرتسر

۵-مولانا عبداللہ بھوجیانی مدرسہ غزنویہ امرتسر

۶-مولانا عبدالجبار کھنڈیلوی

۷-مولانا عطاء اللہ حنیف دارالعلوم تقویۃ الاسلام لاہور

۸-مولانا عبدالرحیم صاحب

۹-مولانا محمد یوسف حفیظ بانڈی

۱۰-مولانا عبدالشکور لداخی

۱۱-مولانا محمد اسماعیل سلفی گوجرانوالہ

۱۲-مولانا شریف اللہ خاں، دارالعلوم تقویۃ الاسلام، لاہور

۱۳-مولانا موسیٰ خاں، دارالعلوم تقویۃ الاسلام، لاہور

ان کے علاوہ بھی بعض حضرات سے استفادہ کیا۔

۱۹۵۳ میں جب انھوں نے تقویۃ الاسلام سے سند فراغ حاصل کی، اس وقت جہلم میں دارالحدیث کے نام سے دینی تعلیم کا ایک مدرسہ قائم تھا جو مولانا عبدالمجید دینانگری نے قائم کیا تھا۔ مولانا عبدالمجید دینانگری نہایت صالح عالم دین تھے۔ خلوص ومحبت کا پیکر۔ ایک مرتبہ میں اور مولانا محمد حنیف ندوی اخبار الاعتصام کی توسیع اشاعت کے سلسلے میں ان کی خدمت میں گئے تھے۔ انھوں نے ہماری بہت مدد کی تھی۔ دو یا تین مرتبہ میں اکیلا بھی اس سلسلے میں ان کی خدمت گیا تھا۔

مولانا دینانگری کو اس مدرسے کے لیے ایک مدرس کی ضرورت تھی۔ اس کا ذکر انھوں نے حضرت مولانا سید محمد داؤد غزنوی سے کیا تو انھوں نے مولانا محمد یونس اثری کو وہاں بھیج دیا۔ وہ صرف ڈیڑھ سال وہاں رہے۔

۱۹۵۵ء میں وہ جہلم سے مظفر آباد چلے گئے۔ یہ ان کا آبائی علاقہ ہے اور ان کے خاندان کے لوگ اسی علاقے میں آباد ہیں۔

مسلک اہل حدیث سے تعلق رکھنے والے افراد تو اس علاقے کے اکثر مقامات میں موجود تھے لیکن تنظیمی اعتبار سے پورا علاقہ بنجر تھا۔ نظم ونسق کا کہیں نام ونشان نہ تھا۔ خود مظفرآباد شہر میں نہ کوئی اہل حدیث کی مسجد تھی اور نہ مؤثر آواز۔ مولانا محمد یونس نے وہاں جا کر جماعت کے بکھرے ہوئے افراد کو اکٹھا کیا، ان میں اجتماعیت کا شعور پیدا کیا اور اہل حدیث کی مسجد تعمیر کی۔ مدرسہ محمدیہ کے نام سے مدرسہ جاری کیا اور پورے علاقے میں دوروں کا پروگرام بنایا اور توحید وسنت کے موضوع پر وعظ وتقریر کا سلسلہ شروع کیا۔ لوگ ان کی تقریروں سے بے حد متاثر ہوئے، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان لوگوں کے کان صحیح آواز سننے کے لیے بے تاب اور دل اسے قبول کرنے کے لیے بے قرار تھے۔ جوں ہی آوازۂ حق ان کے پردہ سماعت سے ٹکرایا ان کے دلوں میں پیوست ہو گیا اور انھوں نے اسے اپنے اندر جذب کر لیا۔

جگہ جگہ جلسے ہونے لگے، جن میں پاکستان کے مختلف علاقوں سے علمائے کرام کو وعظ وتقریر کے لیے بلایا جانے لگا۔ اس وقت مرکزی جمعیت اہل حدیث کے صدر مولانا سید محمد داؤد غزنوی اور ناظم اعلیٰ مولانا محمد اسماعیل سلفی تھے۔ علم وفضل اور عمل وسیرت کے اعتبار سے یہ دونوں بزرگ نہایت اونچے مرتبے پر فائز تھے اور ان کے اثر ورسوخ کے دائرے بہت وسیع تھے۔ مولانا محمد یونس اثری نے ان دونوں حضرات کو وہاں تشریف لے جانے کی دعوت دی اور وہ تشریف لے گئے، جس کی وجہ سے اس نواح کی جماعت اہل حدیث کی آواز دور دور تک پہنچی اور لوگ اس سے بدرجہ غایت متاثر ہوئے۔ مولانا محمد اسماعیل سلفی نے مختلف اوقات میں مظفرآباد اور اس علاقے کے گیارہ چکر لگائے، مولانا محمد یونس اثری جماعت کی تنظیم اور مسلک کی ترویج کے لیے ہر وقت مستعد رہتے تھے اور مولانا داؤد غزنوی اور مولانا اسماعیل سلفی سے پورا رابطہ رکھتے تھے اور ان سے باقاعدہ ہدایات لیتے اور پھر ان ہدایات پر عمل کرتے تھے۔ اگر چند روز مولانا یونس بذریعہ خط حضرت مولانا محمد اسماعیل سلفی کو کسی مجبوری کی بنا پر اپنی جماعتی سرگرمیوں کی اطلاع نہ دے سکتے تو مولانا اسماعیل صاحب انھیں خط لکھتے اور تاکید فرماتے کہ وہ انھیں وہاں کے حالات سے مطلع کرتے رہیں۔

مولانا محمد یونس نہایت دھیمی طبیعت کے مالک ہیں۔ متحمل مزاج اور خوش کلام۔ سب سے بنا کر رکھتے ہیں۔ اپنی بات مثبت انداز میں کہنے کے عادی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس علاقے کے احناف بھی ان سے متاثر ہیں اور ان کے علمائے کرام ان سے قریبی علاقہ رکھتے ہیں۔

سیاسی اعتبار سے بھی آزاد کشمیر میں مولانا محمد یونس اثری کا ایک مقام ہے اور انھیں خاص اہمیت حاصل ہے۔ چنانچہ وہاں کے سیاسی قائدین جن میں سے بعض وفات پا چکے ہیں انھیں اپنے علاقے کی قابل احترام شخصیت گردانتے تھے۔ مثلاً چودھری غلام عباس مرحوم اور میر واعظ محمد یوسف مرحوم، کے ایچ خورشید مرحوم وغیرہ ان سے نہایت تکریم کا برتاؤ کرتے تھے۔ موجودہ رہنماؤں میں سے سردار محمد ابراہیم، سردار عبدالقیوم، سردار سکندر حیات، سردار عتیق اللہ اور دیگر حضرات کے نزدیک انھیں بڑی قدر و منزلت حاصل ہے۔

۱۹۷۰ میں آزاد کشمیر میں سردار عبدالقیوم کی حکومت قائم ہوئی تو مولانا یونس نے اس علاقے میں اسلامی نظام کے نفاذ کے لیے کوشش کی، جس کے نتیجے میں محکمہ قضا قائم ہوا۔ اسلامی نظریاتی کونسل کا قیام عمل میں آیا، زکوۃ کونسل بنی، شلوار قمیص کو قومی لباس قرار دیا گیا، اردو کو سرکاری زبان کا درجہ دیا گیا اور اسی زبان میں سرکاری خط و کتابت ہونے لگی۔

ضیاء الحق سے بھی مولانا محمد یونس اثری کے مراسم تھے اور وہ ان کا بڑا احترام کرتے تھے۔ چنانچہ آزاد کشمیر میں اسلامی نوعیت کے کئی کام ان کی وساطت سے ہوئے۔

مولانا محمد یونس اثری مندرجہ ذیل مناصب پر فائز ہیں۔

☆ بانی و مہتمم جامعہ محمدیہ (مدینہ مارکیٹ) مظفر آباد

☆ خطیب جامع مسجد اہل حدیث مظفر آباد

☆ امیر جمعیت اہل حدیث آزاد کشمیر

☆ رکن اسلامی نظریاتی کونسل آزاد کشمیر

پہلے وہ آزاد کشمیر کی مرکزی زکوۃ کونسل کے رکن بھی تھے۔ آزاد کشمیر ریڈیو سے ان کی تقریروں کا سلسلہ بھی جاری ہے۔

بلاشبہ وہ آزاد کشمیر کی ایک مؤثر اور مستعد شخصیت ہیں اور اس نواح کی جماعت اہل حدیث کے سرگرم رہنما۔

ذاتی حیثیت کے علاوہ خاندانی اعتبار سے بھی انھیں اہمیت حاصل ہے۔ ان کے ایک بزرگ کا نام امیر اللہ خاں تھا۔ وہ حضرت سید احمد شہید اور مولانا شاہ اسماعیل شہید دہلوی کی جماعت مجاہدین کے رکن تھے اور بالاکوٹ کے میدان میں ان کے ساتھ شریک جہاد تھے۔ لیکن کچھ پتا نہیں چلتا تھا کہ زندہ ہیں یا جام شہادت نوش کر گئے ہیں۔ چھے مہینے غائب رہے۔ واپس آئے تو کہا کہ امیر المجاہدین سید احمد بریلوی زندہ ہیں اور دوبارہ واپس آئیں گے۔ بعض لوگوں کا عقیدہ تھا کہ سید احمد غائب ہو گئے ہیں، امیر اللہ خاں بھی یہی عقیدہ رکھتے تھے۔

مولانا محمد یونس کے نانا مولانا محمد حسین ہزاروی تھے، جو حضرت میاں سید نذیر حسین دہلوی کے شاگرد تھے۔ انھوں نے اس عقیدے کی سخت تردید کی اور فرمایا کہ سید احمد بریلوی اور ان کے بہت سے رفقائے کرام شہید ہو گئے ہیں۔ ان کے غائب ہونے یا دوبارہ آنے کا عقیدہ بالکل غلط ہے۔ اس کے بعد امیر اللہ خاں نے یہ عقیدہ ترک کر دیا تھا۔

مولانا محمد یونس کے والد کا تعلق بھی جماعت مجاہدین سے تھا اور وہ دس سال چمرکنڈ اور اسمس میں بہ سلسلہ جہاد مجاہدین کے ساتھ رہے تھے۔ وہ کشمیر کی مدد کا سلسلہ جاری رکھتے تھے۔ اس طرح ان کے خاندان میں طویل عرصے تک مجاہدین سے وابستگی کا عمل جاری رہا۔

قیام پاکستان کے بعد اس کے پہلے وزیر اعظم لیاقت علی خاں نے مجاہدین کو ختم کرنے کا منصوبہ بنایا تھا، کیونکہ انگریزی حکومت کے خاتمے کے بعد مجاہدین نے اپنی سرگرمیوں کا مرکز محاذ کشمیر کو قرار دے لیا تھا۔ مولانا محمد یونس کے والد نے لیاقت علی خاں کے اس اقدام کو سخت تنقید کا نشانہ بنایا تھا۔

مولانا محمد یونس نے بھی جہاد کشمیر میں شرکت کی تھی اور ۱۹۷۱ میں اس موضوع پر ایک کتاب بھی لکھی تھی جو کثیر تعداد میں چھپی اور مجاہدین کشمیر میں تقسیم کی گئی تھی۔

مولانا محمد یونس اثری سے ہمارے دوستانہ مراسم نصف صدی سے زائد عرصے پر محیط

ہیں-وہ لاہور تشریف لائیں تو مجھے ضرور ملتے ہیں-کئی دفعہ انھوں نے زبانی بھی اور بذریعہ خطوط بھی مجھے مظفر آباد آنے کی دعوت دی ہے اور اصرار کیا ہے کہ میں گرمیوں کے دنوں میں ان کے ہاں جاؤں اور پورا موسم ان کے ہاں گزاروں، لیکن افسوس ہے، میں اب تک اس مخلص ترین دیرینہ دوست کی دعوت پر عمل نہیں کر سکا-

دعا ہے اللہ تعالیٰ انھیں صحت و عافیت سے نوازے رکھے اور ان کے لیے اپنے دین کی زیادہ سے زیادہ خدمت کے مواقع فراہم کرے-ان سے درخواست ہے کہ وہ بھی اس گوشہ گیر فقیر کو اپنی دعاؤں میں یاد رکھیں-میں ان کی طالب علمی کے زمانے میں بھی جب کہ وہ عالم شباب میں تھے ان کی صالحیت سے متاثر تھا-اب بھی جب کہ وہ عالم پیری کو پہنچ گئے ہیں ان سے متاثر ہوں-جوانی میں بھی اسی طرح شیریں کلام تھے اور اسی طرح چہرے سے معصومیت ٹپکتی تھی، جیسا کہ اب ہے-

❁❁❁

ڈاکٹر محمد لقمان سلفی

(ولادت ۱۹۴۱)

۲۴ مارچ ۲۰۰۰ء کو نو بجے کے قریب مجھے قاری عنایت اللہ بھٹی نے کہا کہ تھوڑی دیر کے بعد ڈاکٹر محمد لقمان سلفی سے ملاقات کا پروگرام طے پا چکا ہے۔ یہ حج بیت اللہ سے چند روز بعد کی بات ہے چنانچہ ہم تین آدمی قاری عنایت اللہ ان کے صاحب زادے عزیزی ابوبکر اور ان سطور کا راقم اپنی قیام گاہ سے نکلے اور ڈاکٹر صاحب کے دفتر دارالافتا پہنچے۔ ان کا مرکزی دفتر تو ریاض میں ہے' لیکن مکہ مکرمہ میں بھی ان کا دفتر اس نام سے قائم ہے۔ بہت بڑا دفتر ہے جو طول وعرض میں دور تک پھیلا ہوا ہے۔ پھر افتا کا سلسلہ بھی شرعی اعتبار سے نہایت اہم ہے اور دینی معاملات کی اصل بنیاد یہی ہے۔ ہمارے ہاں تو مدت مدید سے یہ سلسلہ چلا آرہا ہے کہ مولوی صاحب مسجد میں بیٹھے ہیں' کسی کو کوئی مسئلہ پوچھنے کی ضرورت پیش آئی تو انھیں گھر میں بلایا یا بہت عزت کی تو ان کے پاس گئے اور زبانی یا تحریری صورت میں مسئلہ پوچھا اور بات ختم ہوگئی۔ لیکن مملکت سعودی عرب خالص اسلامی مملکت ہے اور دنیا بھر کے مسلمانوں کی عقیدت ومحبت کا مرکزی مقام ہے' اس لیے مسلمان اس کی طرف رجوع کرتے ہیں اور دینی وشرعی امور کے سلسلے میں وہاں سے جاری شدہ فتوے کو بے حد اہمیت دی جاتی ہے۔

دفتر کی حدود میں بہت سی کاریں کھڑی تھیں اور مختلف کمروں میں متعدد حضرات اپنے دفتری فرائض سرانجام دینے میں مصروف تھے۔ ہم ایک کمرے کے سامنے جا کر کھڑے ہو گئے۔ میں چوں کہ اجنبی تھا اور پہلی دفعہ وہاں گیا تھا' اس لیے میری نظریں بے ساختہ ادھر ادھر گھومنے لگیں۔ ایسا محسوس ہوا کہ یہ خالص اسلامی ماحول ہے کیوں کہ دنیا کے پاکیزہ شہر مکہ مکرمہ میں واقع ہے۔ یہ وہی جگہ ہے جو آج سے تین ہزار سال پیشتر بے آب وگیاہ' ریتلا

میدان تھا' جہاں پہلی دفعہ حضرت ابراہیم علیہ السلام تشریف لائے اور اپنی بیوی اور کم عمر بچے کو اللہ کے حکم سے یہاں چھوڑ گئے اور پھر اس مقام کو اس قدر اعزاز حاصل ہوا اور اسے اتنا احترام ملا کہ ساری دنیا کے مسلمانوں کا یہ مرجع قرار پا گیا اور پھر اسی شہر میں اللہ تعالیٰ کے آخری نبی حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی بعثت کا عظیم الشان واقعہ پیش آیا۔

یہ قدرتی بات ہے کہ جو مسلمان پہلی دفعہ وہاں جائے یقیناً اس کے دل میں اس قسم کی بہت سی باتیں آئیں گی اور وہ حیرت و تعجب سے وہاں کے مختلف مقامات کو دیکھے گا' وہاں کی عمارتوں' وہاں کے دفتروں اور وہاں کے باشندوں اور ان کی نقل و حرکت پر نگاہ ڈالے گا۔ چنانچہ میں نے بھی چاروں طرف دیکھنا شروع کیا اور کئی قسم کی باتیں سطح ذہن پر گردش کرنے لگیں۔

اس کیفیت پر تین یا چار منٹ گزرے تھے اور میں اپنے خیال میں مگن تھا کہ قاری عنایت اللہ نے کہا: "شیخ تشریف لے آئے۔"

میں نے اچانک گھوم کر دیکھا تو ایک صاحب میرے سامنے کھڑے تھے' جنھوں نے نہایت محبت سے السلام علیکم کہتے ہوئے ہاتھ میری طرف بڑھائے اور پھر بغل گیر ہو گئے۔

دو تین منٹ ہم وہاں کھڑے ایک دوسرے سے خیر و عافیت پوچھتے رہے۔ میں نے ان کو سر سے پاؤں تک دیکھا۔ میانہ قد' سرخی مائل گندمی رنگ' گول بھرا ہوا چہرہ' چمک دار آنکھیں' بڑا سر' کشادہ پیشانی اعتدال کے خوب صورت زاویے میں سیاہ داڑھی' عربوں جیسی سفید لمبی عبا زیب تن' سر پر کپڑے کی ٹوپی اور اس کے اوپر سفید رومال۔ پاؤں میں چپل۔ یہ تھے ڈاکٹر محمد لقمان سلفی---! ان کے ماتھے سے اوپر ٹوپی کی اوٹ سے سر کے بال منڈے ہوئے دکھائی دے رہے تھے' جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کر چکے ہیں--- جو لباس انھوں نے اس وقت زیب تن کر رکھا تھا' وہاں کے بڑے چھوٹوں کا یہی لباس ہے۔

وہیں کھڑے کھڑے انھوں نے قاری عنایت اللہ سے کہا کہ اگر آج آپ بھٹی صاحب سے میری ملاقات نہ کراتے تو میں آپ سے سخت خفگی کا اظہار کرتا۔

ان کی گفتگو سے مجھے محسوس ہوا کہ انھیں میری آمد کا پتا چل گیا تھا اور انھیں یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ میں قاری عنایت اللہ کے ہاں مقیم ہوں۔ انھوں نے قاری صاحب سے ملاقات کے لیے کہا بھی، لیکن ہوا یہ کہ میں چند روز مکہ مکرمہ میں قیام کے بعد مدینہ طیبہ چلا گیا تھا، سات آٹھ روز کے بعد واپس آیا تو حج کے دن آگئے۔ اس طرح ملاقات کا موقع نہ مل سکا۔

وہاں "حالت قیام" میں چند باتیں کرنے کے بعد انھوں نے میرا دایاں ہاتھ پکڑا اور کمرے کے اندر لے گئے۔ کمرے میں تھوڑی سی اونچی جگہ پر دو کرسیاں پڑی تھیں اور ایک میز۔۔۔! ان میں سے ایک کرسی پر مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور ایک پر خود تشریف فرما ہوئے۔ سامنے چار پانچ کرسیاں رکھی تھیں، ان پر قاری عنایت اللہ اور ان کے صاحب زادے ابوبکر کو بیٹھنے کے لیے کہا۔

ابوبکر ماشاء اللہ نہایت سعادت مند اور ذہین بچہ ہے اور وہاں کی اکثر معروف شخصیتوں سے متعارف ہے اور وہ جن سرکاری یا غیر سرکاری مناصب پر فائز ہیں اس سے بھی وہ آگاہ ہے۔ پاکستانی اور ہندوستانی اہل علم سے بالخصوص واقفیت رکھتا ہے، وہ بھی اسے اچھی طرح جانتے ہیں۔ اس سے بڑی عمر کے لوگ اگر مجلس میں گفتگو کر رہے ہوں تو خاموشی سے ان کی باتیں سنتا ہے، درمیان میں بالکل نہیں بولتا۔ البتہ مجھ سے بے تکلف ہو گیا تھا اور بڑی باتیں پوچھتا تھا۔ اس کے سوالات کا جواب دیتے ہوئے بعض دفعہ میں اکتا بھی جاتا تھا اور اسے کہہ دیتا تھا کہ بس اتنی باتیں بہت ہیں، باقی باتیں پھر کسی وقت کریں گے۔

ڈاکٹر صاحب سے سوا گھنٹا سلسلہ کلام جاری رہا۔ انھوں نے میرے تصنیفی کام کی تفصیلات پوچھیں اور میں نے بتائیں۔ میری کتاب "فقہائے ہند" پہلی صدی ہجری سے لے کر تیرھویں صدی ہجری تک دس جلدوں پر مشتمل ہے، جس میں برصغیر کے ہزاروں اہل علم کے حالات اور ان کی تدریسی و تصنیفی خدمات کا تذکرہ ضبط کتابت میں آگیا ہے۔ معلومات کی فراہمی کے مطابق کسی بزرگ کے بارے میں تفصیل سے لکھا گیا ہے اور کسی کے متعلق اختصار سے۔! ڈاکٹر صاحب نے اس کتاب کا خاص طور سے ذکر کیا۔ پھر آج کل میں جو خدمات انجام دے رہا ہوں، اس کا تذکرہ ہوا۔

ایک بات جو مجھ سے تھوڑا بہت تعلق رکھنے والے تقریباً تمام حضرات کو معلوم ہو چکی تھی' اس کے بارے میں بھی پوچھا- وہ بات یہ تھی کہ میں لاہور سے اپنی تین کتابوں (نقوش عظمت رفتہ' بزم ارجمنداں اور کاروان سلف) کے چار چار نسخے (کل بارہ نسخے) لے کر گیا تھا- خیال یہ تھا کہ یہ کتابیں بعض دوستوں کی خدمت میں پیش کی جائیں گی- لیکن جدہ ایئر پورٹ پر سامان کی چیکنگ ہوئی تو ان تینوں کتابوں کے تین تین نسخے چیک کرنے والے عملے نے ضبط کر لیے اور ایک ایک نسخہ میرے حوالے کر دیا گیا- یہ بھی ان کی مہربانی تھی- اگر یہ بھی نہ دیتے تو میں کیا کر لیتا- جن دوستوں کو اس کا علم ہوا' ان سب نے مجھ سے پوچھا کہ جو کتابیں عملے نے روک لیں' کیا ان کی رسید آپ کو دی گئی یا آپ نے ان سے مانگی؟

میں نے سب کو اس سوال کا نفی میں جواب دیا' اس لیے کہ مجھے پتا ہی نہ تھا کہ متعلقہ عملے کی طرف سے ضبط شدہ اشیا کی رسید دی جاتی ہے یا اس سے مانگی جاتی ہے- پوچھنے والے دوستوں کا مطلب یہ تھا کہ اگر رسید موجود ہو تو یہ کتابیں وہاں سے واپس لی جا سکتی ہیں- لیکن اس کے باوجود بعض دوستوں نے کتابیں نکلوانے کی کوشش کی مگر کامیابی نہ ہوئی- اس لیے کہ معلوم نہیں ان لوگوں نے بے دردی کے ساتھ انھیں کہاں پھینک دیا تھا اور وہ کتنے سامان کے نیچے دب گئی تھیں-

ڈاکٹر محمد لقمان سلفی صاحب کو بھی اس واقعہ کا علم ہو چکا تھا' چنانچہ انھوں نے بھی مجھ سے پوچھا--- یہ کتابیں شخصیات سے متعلق ہیں' جن شخصیات کا ان میں تذکرہ کیا گیا ہے' ڈاکٹر صاحب نے ان کے اسمائے گرامی دریافت کیے-

باتیں کرتے اور لکھتے لکھتے ہم اتنی دور نکل آئے اور گفتگو اور تحریر کا اتنا سفر طے کر چکے' لیکن یہ آپ کو بتایا ہی نہ جا سکا کہ ڈاکٹر محمد لقمان سلفی کون صاحب ہیں اور سعودی عرب کے کس مقام پر قیام پذیر ہیں اور کیا خدمات سر انجام دیتے ہیں؟

دو لفظوں میں اس کا جواب یہ ہے کہ وہ ایک معروف اور بہت بڑے ہندوستانی عالم دین ہیں' مملکت سعودیہ کے محکمہ افتا میں ان کا اصل فریضہ اردو' فارسی اور انگریزی مواد کو عربی میں منتقل کرنا ہے جو نہایت اہم فریضہ ہے- لیکن اس کے ساتھ ہی وہ اس محکمے کے ڈائریکٹر

جنرل کے سیکرٹری کے فرائض بھی انجام دیتے ہیں جو ان کی قابلیت اور محکمے کے نظم و نسق پر پوری طرح حاوی ہونے کی دلیل ہے۔ دوسرے الفاظ میں ہم یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ وہ سعودی عرب کے وزیر امور شرعیہ اور مفتی اعظم کے معتمد علیہ ہیں ---- یہ بہت بڑا اعزاز ہے جو دنیا کی عظیم اسلامی مملکت میں انھیں عطا ہوا ہے۔

لیکن اگر آپ یہ کہیں کہ ان کا یہ بہت بڑا تعارف ہونے کے باوجود بہت مختصر ہے' تو آیے ان کا اس انداز سے تعارف کرانے کی کوشش کرتے ہیں' جس میں مناسب الفاظ میں ان کے آبا و اجداد کا تذکرہ بھی آ جائے' ان کے اصل وطن کا پتا بھی چل جائے اور تعلیم و تعلم کے جن مراحل سے وہ گزرے ہیں اور جس طرح وہ موجودہ منصب تک پہنچے ہیں' اس کی کچھ تفصیل بھی حیطہ فہم میں آ جائے۔

ڈاکٹر صاحب نسب کے اعتبار سے صدیقی ہیں اور ان کا سلسلہ نسب خلیفہ اول حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ تک پہنچتا ہے۔ اس سلسلے کے چند نام یہ ہیں: محمد لقمان بن بارک اللہ بن محمد یٰسین بن سلامت اللہ بن عبدالعظیم صدیقی ---!

ڈاکٹر محمد لقمان کا مقام ولادت ہندوستان کے صوبہ بہار کا موضع ''چندن بارہ'' ہے۔ ان کے اکابر میں سے ایک شخص کا نام ''چندن'' تھا اور اس قصبے کی بنیاد انہی بزرگ نے رکھی تھی اور پھر انہی کے نام سے یہ قصبہ مشہور ہو گیا' جو اب ایک شہر ہے اور اس کے اردگرد کا علاقہ نہایت سرسبز و شاداب ہے۔ صوبہ بہار کے دارالحکومت پٹنہ سے دو سو کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ اس نواح میں ڈاکٹر صاحب کا خاندان علم و عمل اور شرافت و نجابت کے اعتبار سے بڑی شہرت رکھتا ہے اور بے حد اثر و رسوخ کا مالک ہے۔

محمد لقمان کے جد امجد محمد یٰسین نہایت نیک خو اور صالح بزرگ تھے اور اس کے ساتھ ہی انتہائی جرأت مند اور جفا پیشہ۔! ان کا تعلق سید احمد شہید اور حضرت مولانا اسماعیل شہید کی جماعت مجاہدین سے تھا۔ برصغیر میں وہ انگریزی حکومت کا زمانہ تھا اور اس زمانے میں جماعت مجاہدین سے تعلق قائم کرنا اور قائم رکھنا اپنے آپ کو کئی قسم کے خطرات کے حوالے کر دینے کے مترادف تھا' لیکن محمد یٰسین اس جماعت سے منسلک تھے۔ وہ اس جماعت کے لیے

اپنی جیب سے بھی روپیہ پیسہ دیتے تھے اور لوگوں سے بھی سرمایہ مہیا کر کے مرکز مجاہدین میں بھیجتے تھے۔ خود بھی وہاں گئے‘ مجاہدین سے ہم رکاب ہو کر انگریزوں کے خلاف لڑائی میں حصہ لیا اور کئی سال وہاں رہے۔ پھر واپس اپنے وطن آئے۔ کچھ عرصہ یہاں قیام کیا۔ پھر بار دیگر مرکز مجاہدین کو روانہ ہو گئے۔ اب اہلیہ محترمہ کو بھی ساتھ لے گئے تھے۔ اس مرتبہ وہ کم وبیش آٹھ سال وہاں اقامت گزیں رہے۔ وہیں ان کے صاحب زادے بارک اللہ صدیقی پیدا ہوئے جو ہمارے ممدوح ڈاکٹر محمد لقمان کے والد مکرم تھے۔ بیٹے کی ولادت سے کچھ مدت بعد امیر المجاہدین کی اجازت سے عازم وطن ہوئے۔ بعد ازاں انھوں نے مجاہدین سے رابطہ تو قائم رکھا اور باقاعدہ ان کی مالی امداد بھی کرتے رہے‘ لیکن مرکز میں جانے کا موقع نہیں ملا۔

دراصل پٹنہ (یعنی عظیم آباد) کو جماعت مجاہدین کے قیام کے بالکل ابتدائی دور ہی سے اس تنظیم سے بے پناہ تعلق رہا ہے۔ وہاں کے علمائے کرام کو اس تعلق کی پاداش میں کالا پانی بھیجا گیا اور انھیں شدید سزاؤں میں مبتلا کیا گیا۔ مرکز سے بھی ان حضرات کا نہایت قریبی رابطہ رہا‘ بلکہ وہاں کی امارت وسربراہی کی ذمہ داریاں ان کے سپرد رہیں اور وہ تمام حضرات مسلک کے اعتبار سے اہل حدیث تھے۔ یہ بزرگان عالی مرتبت عظیم آباد کے محلہ صادق پور کے رہنے والے تھے‘ اس لیے انھیں تحریک جہاد میں علمائے صادق پوری کی نسبت سے پکارا جاتا ہے۔ عظیم آباد سے دور و نزدیک سے تعلق رکھنے والے لوگ ان بزرگوں سے بے حد متاثر تھے‘ اہل حدیث ہونے کی وجہ سے بھی اور سلسلہ جہاد جاری رکھنے اور انگریزی حکومت کی مخالفت کی بنا پر بھی۔۔۔! خوش قسمتی سے ڈاکٹر محمد لقمان کے خاندان کا مسکن بھی وہی علاقہ تھا اور یہ خاندان شجاعت و دلیری میں ممتاز اور مالی لحاظ سے آسودہ حال تھا‘ پھر مسلکی ہم آہنگی بھی تھی‘ اس لیے اس خاندان کے اکابر کا تعلق بھی مجاہدین سے رہا‘ بلکہ لقمان صاحب کے والد بارک اللہ صدیقی مرحوم تو پیدا ہی مجاہدین کے مرکز میں ہوئے تھے۔

اس موقعے پر ہمارا مقصد مجاہدین کی تاریخ بیان کرنا نہیں ہے‘ نہ اس کے سلسلہ جہاد کی تفصیل میں جانا مقصود ہے۔ یہ چند سطریں ڈاکٹر لقمان کے جد امجد محمد یٰسین مرحوم کے

تذکرے کے ضمن میں نوک قلم پر آ گئیں کہ ان کا تعلق اس جماعت سے تھا۔

محمد لقمان کی ولادت ۱۹۴۱ میں چندن بارہ میں ہوئی جو ان کے اکابر کا قصبہ تھا۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم گھر ہی میں اپنے قابل احترام دادا محمد یٰسین مرحوم سے حاصل کی۔ وہ اپنے اس پوتے پر نہایت شفقت فرماتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ اس کا سر بڑا ہے اور بڑے سر والا شخص زرخیز دماغ اور تیز ذہن کا مالک ہوتا ہے۔ یہ لڑکا بھی ان شاء اللہ عالم و فاضل ہوگا' ذہانت و فطانت میں شہرت پائے گا اور اس کا دائرہ کار وسیع ہوگا۔

دادا کے علاوہ ان کے والد بارک اللہ صدیقی مرحوم بھی بیٹے کا بے حد خیال رکھتے تھے۔ وہ نہایت متدین اور پیکر صالحیت بزرگ تھے اور عمدہ کردار کے مالک---! ان کی والدہ کا اسم گرامی رقیہ بی بی تھا' وہ بھی بہترین اوصاف سے مالا مال تھیں اور بچے کی تعلیم و تربیت کے لیے ہر آن کوشاں رہتی تھیں۔

لقمان کی عمر چھے سات سال کی ہوئی تو والد مکرم نے بچے کو حافظ محمد عثمان کے حلقہ درس میں داخل کرا دیا۔ حافظ صاحب موصوف انھی کے گاؤں چندن بارہ میں بچوں کو تعلیم دیتے تھے۔ لقمان نے ان سے قرآن مجید پڑھا' بعض ادعیہ ماثورہ یاد کیں اور کچھ لکھنے کی مشق کی۔ یہ ابتدائی تعلیم ان کے لیے نہایت سودمند ثابت ہوئی اور تھوڑے عرصے میں انھوں نے بہت کچھ سیکھ لیا۔ یہ ان کی ذہانت کی وجہ سے بھی تھا اور اللہ تعالیٰ کا فضل خاص بھی تھا۔ مدرسے کے علاوہ گھر میں بھی تعلیم کا سلسلہ جاری رہتا تھا اور جو کچھ پڑھتے تھے' اسے یاد رکھتے تھے۔

ڈاکٹر محمد لقمان چار بہن بھائی ہیں۔ سب سے بڑے محمد ابوذر صدیقی' ان سے چھوٹے خود لقمان صاحب' ان سے چھوٹے محمد عبداللہ صدیقی اور چوتھی بہن سیدہ صادقہ۔ یہ سب نہایت نیک اور عمدہ خصال لوگ ہیں' لیکن ہم ان سطور میں صرف ڈاکٹر محمد لقمان کے بارے میں چند گزارشات پیش کرنا چاہتے ہیں۔

گھر اور گاؤں میں تھوڑی بہت تعلیم حاصل کرنے کے بعد لقمان کو ایک جگہ فورنیا یا "پھورنیا" بھیج دیا گیا' وہاں ایک عالم دین مولانا محمد الیاس سے اکتساب علم کرنے لگے۔

دو سال ان کی خدمت میں رہے- فارسی اور اردو کی کچھ کتابیں ان سے پڑھیں- وہاں ایک بزرگ مولانا عبدالقادر فروکش تھے- ان کے بیٹے کا نام فضل الرحمٰن تھا' ہم عمر ہونے کی بنا پر لقمان صاحب سے ان کا دوستانہ ہو گیا تھا- مولانا عبدالقادر نہایت رحم دل اور نرم طینت عالم دین تھے' وہ لقمان کو اپنے گھر لے گئے اور ان کے گھر ہی میں ان کا قیام رہا- مولانا عبدالقادر اور ان کی اہلیہ محترمہ لقمان سے اپنے بیٹے فضل الرحمٰن کی طرح پیار کرتے تھے--- پھور نیا میں انھیں ٹائی فائیڈ ہو گیا تھا اور وہ سخت کمزور ہو گئے تھے- چنانچہ ان کے دادا انھیں اپنے گاؤں چندن بارہ لے آئے-

بیماری سے افاقہ ہوا اور طبیعت سنبھلی تو دادا نے اپنے اس ہونہار پوتے کو ایک ایسے مدرسے میں داخل کرا دیا جو ان کے مسکن کے قریب تھا- اس مدرسے میں دیوبند کا طریق تعلیم رائج تھا اور اسی نصاب کے مطابق طرز تدریس کا سلسلہ چلتا تھا-

لقمان صاحب نے اس مدرسے میں اس کے نصاب کے مطابق علم تجوید' علم فقہ' صرف ونحو اور ریاضی کی کتابیں پڑھیں- وہاں کے اساتذہ میں ایک استاذ مولانا محمد زبیر تھے جو نہایت تجربہ کار' قابل ترین اور منجھے ہوئے مدرس تھے- طلبا پر ان کا بڑا رعب تھا- اپنے شاگرد لقمان کا وہ بہت خیال رکھتے تھے اور بڑے اہتمام اور توجہ سے پڑھاتے تھے-

وہاں کے ایک استاذ کا اسم گرامی مولانا عبدالحنان تھا جو ''لہنیا'' گاؤں کے رہنے والے تھے- لقمان صاحب کے ننھیال کا تعلق بھی حسن اتفاق سے اسی گاؤں سے تھا- مولانا عبدالحنان کو اس تعلق کا پتا چلا تو وہ بے حد خوش ہوئے اور اپنے اس شاگرد پر شفقت کا اظہار فرمانے لگے- وہ انھیں اپنے گھر لے جاتے اور انھیں خوش رکھنے کی کوشش کرتے- لیکن اس مدرسے میں حنفیت کو اس انداز سے طلبا کے ذہنوں میں راسخ کرنے کی سعی کی جاتی تھی کہ جس سے اہل حدیثیت کے خلاف نفرت کا جذبہ پیدا ہو- اساتذہ اور طلبا اثنائے درس میں بھی اور عام مجلسوں میں بھی اہل حدیث کی تحقیر کرتے اور گفتگو میں ادھر ادھر کا چکر کاٹتے ہوئے' بالآخر ان مسائل پر آ جاتے جو اہل حدیث اور احناف کے درمیان طویل مدت سے باعث اختلاف چلے آ رہے ہیں- لقمان صاحب چوں کہ اہل حدیث تھے' اس لیے ان کو چڑانے

کے لیے بھی بسا اوقات اس مسلک اور اس پر عمل کرنے والوں کو نشانہ تنقید بنایا جاتا- ایسا بھی ہوا کہ بعض طلبا نے ان کے سامنے اہل حدیث کے تصنیف کردہ بعض رسائل نذر آتش کر دیے اور جھگڑے کی فضا پیدا کرنے کی سعی کی- یہ صورت حال ان کے لیے نہایت تکلیف دہ تھی- اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انھیں یہ مدرسہ چھوڑ دینا پڑا-

اس کے بعد کیا ہوا----!

یہ ۱۹۵۶ کی بات ہے- اب انھوں نے والد مکرم کے حکم سے ''دربھنگا'' کا رخ کیا جو انھی کے صوبہ بہار کا ایک شہر ہے- وہاں بہت مدت سے اہل حدیث کا ایک دارالعلوم قائم ہے، جس کا نام ''دارالعلوم احمدیہ سلفیہ'' ہے- اس دارالعلوم کے بانی مشہور اہل حدیث عالم مولانا محمد ابراہیم آروی تھے، جو اپنے مسلک کی تبلیغ و اشاعت کے سلسلے میں نہایت سرگرم تھے- علمائے اہل حدیث کی طرح انگریزی حکومت کے شدید مخالف تھے- ملک کے اہل علم اور اصحاب تدریس سے گہرے مراسم رکھتے تھے- سرسید احمد خاں مرحوم سے بھی ان کے تعلقات تھے- ان سے ان کی خط و کتابت بھی رہی- سرسید نے ایک طویل خط انھیں ۱۴ دسمبر ۱۸۹۴ کو لکھا، دوسرا ۱۵ فروری ۱۸۹۵ کو تحریر کیا- دراصل مولانا نے یہ مدرسہ اپنے شہر آرہ میں قائم کیا تھا- ہر سال اس کا سالانہ جلسہ شعبان کے مہینے میں منعقد کیا جاتا تھا، جس میں برصغیر کے بہت سے علمائے کرام شرکت فرماتے تھے- آل انڈیا اہل حدیث کانفرنس کا قیام بھی آرہ کے اسی جلسے کے موقع پر ۱۹۰۶ء میں عمل میں آیا تھا- ۱۸۹۵ میں وہاں کے مدرسے کے سالانہ جلسے کی تاریخ انعقاد ۱۷ فروری ۱۸۹۵ء (۲۱ شعبان ۱۳۱۲ھ) قرار پائی تھی اور سرسید کو اس میں شمولیت کی دعوت دی گئی تھی، لیکن سرسید نے ان کو جواب دیا کہ وہ انجمن حمایت اسلام کے جلسے میں شرکت کے لیے لاہور جا رہے ہیں جو ۲۳، ۲۴ فروری ۱۸۹۵ء کو منعقد ہو رہا ہے، اس لیے آپ کے جلسے میں شرکت کرنا مشکل ہے- سرسید کا تیسرا خط جو مولانا کے نام آیا ۱۰ فروری ۱۸۹۵ کا مکتوبہ ہے-

مولانا آروی اپنے دور کے جلیل القدر عالم تھے اور حضرت سید میاں نذیر حسین دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے تلمیذ تھے- مولانا نے ۶ ذی الحجہ ۱۳۲۰ھ (۶ مارچ ۱۹۰۳ء) کو اپنے وطن آرہ

(صوبہ بہار) میں وفات پائی۔

ان کی وفات کے بعد یہ دارالعلوم ۱۳۳۶ھ (۱۹۱۸) میں دربھنگا میں منتقل کر دیا گیا تھا اور اس کی بنیاد حضرت مولانا عبدالعزیز رحیم آبادی نے اپنے دست مبارک سے رکھی تھی۔ وہ برصغیر کے ممتاز اہل حدیث عالم دین تھے۔ انھوں نے اس دارالعلوم کو خوب ترقی دی۔ اپریل ۱۹۱۹ (۱۳۳۸) میں ان کا انتقال ہوا۔ ان کے بعد اس کی زمام انتظام ڈاکٹر محمد فرید کے ہاتھ میں آئی۔ انھوں نے بھی اس کی ترقی کے لیے بے حد محنت کی۔ ڈاکٹر محمد فرید کی وفات کے بعد دارالعلوم کے اہتمام کی باگ ڈور اس کے ایک فارغ التحصیل بزرگ ڈاکٹر عبدالحفیظ سلفی کے سپرد کی گئی۔ انھوں نے بھی اپنے پیش رو حضرات کی طرح یہ اہم فریضہ نہایت مستعدی اور خوش اسلوبی سے انجام دیا۔

وہ سفر آخرت پر روانہ ہوئے تو یہ ذمہ داری دارالعلوم کے ایک اور فارغ التحصیل عالم ڈاکٹر سید عبدالعزیز کے کندھوں پر آپڑی۔

کم و بیش ۹۰ سال سے یہ دارالعلوم قائم ہے اور نہایت کامیابی سے اپنا تدریسی سفر طے کر رہا ہے۔ اس اثنا میں بے شمار علما و طلبا اس سے اسنادِ فراغت لے کر نکلے جو تصنیف و تالیف' درس و تدریس' تقریر و خطابت اور دین کی نشر و اشاعت میں مصروف ہیں۔ ان میں بہت سے حضرات اپنے ملک میں یہ فریضہ انجام دے رہے ہیں اور بعض ملک سے باہر تشریف لے گئے ہیں۔

دارالعلوم احمدیہ سلفیہ میں حالات کے مطابق تدریس و تعلیم کے کئی شعبے قائم ہیں۔ درس نظامی کی کتابیں بھی اس میں پڑھائی جاتی ہیں۔ جدید علوم یعنی انگریزی' جغرافیہ اور سائنس وغیرہ کی تعلیم بھی دی جاتی ہے' تحریر و نگارش سے بھی طلبا کو بہرہ مند کیا جاتا ہے' دورِ حاضر کی روشنی میں تبلیغ و تقریر کی مشق بھی کرائی جاتی ہے اور حفظ قرآن کا سلسلہ بھی جاری ہے۔ ہندوستان کے حالات پاکستان کے حالات سے متعدد امور میں بالکل مختلف ہیں' یہی وجہ ہے کہ وہاں کے مسلمانوں کا انداز تبلیغ ہم سے جداگانہ نوعیت رکھتا ہے' اور وہ اپنے معاملات کی نزاکتوں کو خوب سمجھتے ہیں اور اسی کی روشنی میں عمل کے میدان میں اترتے اور

قلم وزبان کو حرکت دیتے ہیں۔

دارالعلوم کی بہت بڑی لائبریری ہے جو دس ہزار سے زائد کتابوں پر مشتمل ہے۔ایک ماہانہ رسالہ بھی وہاں سے شائع ہوتا ہے‘جس کا نام ”الہدیٰ“ ہے۔

ڈاکٹر محمد لقمان کا شمار دارالعلوم احمدیہ سلفیہ (دربھنگا) کے ذہین اور لائق طلبا میں ہوتا تھا اور وہ بہ درجہ غایت محنت اور شوق سے تعلیم حاصل کرتے تھے اور اساتذہ ان کے شوق اور محنت کی وجہ سے ان سے بہت خوش تھے۔

وہ دارالعلوم کے تیسرے سال میں تھے کہ مدینہ منورہ میں جامعہ اسلامیہ کے قیام کا اعلان ہوا۔تمام ملکوں کے طلبا حصول علم کے لیے جامعہ اسلامیہ میں داخلہ لینے اور اپنی علمی تشنگی بجھانے کے لیے کوشاں ہوئے۔۔۔یہ ایک فطری بات ہے‘ایک مدینہ منورہ کی کشش اور دوسرے حصول علم کا جذبہ ہر صاحب صلاحیت اور شائق علم کو اس پاک سرزمین کا عزم کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ظاہر ہے محمد لقمان کے قلب صافی میں بھی یہ جذبہ موجزن ہوا۔۔۔۔

یہ جذبہ کس طرح عملی شکل اختیار کرتا ہے اور کس طرح طالب علم لقمان کی زندگی کے آثار بدلتے اور نئی کروٹ لیتے ہیں؟

اس کی مختصر روداد یہ ہے۔

علمائے اہل حدیث کا ایک وفد دہلی آیا‘جس کا مقصد یہ تھا کہ ملک کے مختلف اہل حدیث مدارس کے ارباب انتظام اور مدرسین سے رابطہ پیدا کیا جائے اور پھر ان مدارس سے تیز ذہن اور تیز فکر طلبا کی ایک فہرست تیار کی جائے اور ان کے انٹرویو لے کر انھیں اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ میں بھیجا جائے۔دارالعلوم احمدیہ سلفیہ کے ناظم اعلیٰ نے اس وفد کے ارکان سے ملاقات کی تو جامعہ اسلامیہ میں داخلے کے لیے طالب علم محمد لقمان کا نام پیش کیا۔چنانچہ وفد نے دارالعلوم میں محمد لقمان کے دور طالب علمی کا گزشتہ تین سال کا ریکارڈ ملاحظہ کیا تو معلوم ہوا کہ ان کے امتحانی نتائج جامعہ اسلامیہ کے معیار کے بالکل مطابق ہیں چنانچہ انھیں جامعہ میں داخلے کے لیے منتخب کرلیا گیا۔

وہ ۱۹۶۲ء (۱۳۸۲ھ) کو مدینہ منورہ پہنچے- اس وقت وہ انیس بیس برس کے نوجوان تھے- انھیں جامعہ کے کلیۃ الشریعہ میں داخلہ ملا- شیخ عبدالعزیز بن باز (رحمۃ اللہ علیہ) ان دنوں جامعہ کے وائس چانسلر تھے اور طلبا کے بارے میں مکمل معلومات رکھتے تھے- محمد لقمان کی محنت اور حصول علم کے لیے ان کے شوق سے وہ بہت متاثر ہوئے- ابتدائی بات چیت کا یہ تاثر عمر بھر قائم رہا اور محمد لقمان کو انھوں نے ہمیشہ اپنے قریب رکھا-

اب آیئے ڈاکٹر محمد لقمان کے اساتذہ کرام سے متعارف ہونے کی کوشش کرتے ہیں- انھوں نے وہاں جن اساتذہ کے حضور زانوئے شاگردی تہہ کیا' وہ تمام حضرات اپنے اپنے فن میں یگانہ روزگار تھے- ڈاکٹر صاحب نے ان سے خوب استفادہ کیا- ان سب حضرات کے اسمائے گرامی تو ہمیں معلوم نہیں ہو سکے' البتہ جن کا پتا چل سکا ہے' وہ مندرجہ ذیل بزرگان عالی قدر ہیں-

۱- شیخ عبدالعزیز بن باز: محمد لقمان نے ۱۹۶۲ء سے لے کر ان کی وفات تک اس رفیع المرتبت عالم سے اکتساب علم کا سلسلہ جاری رکھا- ان سے باقاعدہ طور سے انھوں نے عقیدہ طحاویہ پڑھا- پھر فتح الباری کا درس لیا- اس کی صورت یہ تھی ڈاکٹر صاحب استاذ عالی قدر کو فتح الباری سنایا کرتے تھے اور پھر صرفی ونحوی اور دیگر مسائل پر بحث ہوتی تھی-

۲- شیخ ناصر الدین البانی: جامعہ اسلامیہ کے یہ نہایت مشہور استاذ تھے' عالم اسلامی کے معروف محقق اور متعدد تحقیقی کتابوں کے مصنف---! بہت سے مسائل میں ان کی تحقیقی کاوشوں کے حوالے اہل علم کے حلقوں میں دیے جاتے ہیں اور ان کی تحقیق کو مستند سمجھا جاتا ہے- انھوں نے ۲- اکتوبر ۱۹۹۹ء کو وفات پائی-

۳- شیخ امین بن محمد المختار الحکنی شنقیطی: تفسیر وحدیث اور لغت میں ان کو امامت کا درجہ حاصل ہے- ''اضواء البیان فی ایضاح القرآن بالقرآن'' ان کی وہ تفسیر ہے' جسے اس دور میں اس موضوع سے متعلق شاہ کار کی حیثیت حاصل ہے-

۴- شیخ عبدالرزاق العفیفی: بہ حیثیت معلم بھی انھیں خاص شہرت حاصل ہے اور بہ طور مصنف بھی---! شرح عقیدہ واسطیہ ان کی معروف تصنیف ہے-

۵- شیخ مناح القطان: قرآن مجید سے انھیں بے حد شغف تھا اور حدیث اور علوم حدیث میں ان کا پایہ بڑا بلند تھا- الجامع الفرید اور مباحث فی علوم القرآن ان کی مقبول و معروف تصانیف ہیں-

۶- شیخ عبدالقادر شیبۃ الحمد: موجودہ دور کے اہل علم میں ان کو بڑا اعزاز حاصل ہے اور وہ اپنے بوقلموں علمی اوصاف کی بنا پر اعزاز کے مستحق بھی ہیں- دعوت و ارشاد اور اصلاح المسلمین سے انھیں خاص طور سے دلچسپی رہی-

۷- حضرت حافظ محمد گوندلوی: ضلع گوجرانوالہ کے قصبہ گوندلانوالہ میں پیدا ہوئے- برصغیر کے مختلف مقامات میں ان کا سلسلہ تدریس جاری رہا- بے شمار اہل علم ان سے مستفید ہوئے- فضل و کمال کا بے مثال پیکر تھے- حفظ و اتقان میں عدیم النظر---! کچھ عرصہ جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ میں مسند تدریس پر فائز رہے- ڈاکٹر لقمان صاحب نے وہیں ان سے استفادہ کیا-

۸- شیخ عبدالمحسن: مسجد نبوی میں معلم کا فریضہ انجام دیتے رہے- علوم حدیث و فقہ میں ماہر کامل- پہلے جامعہ اسلامیہ (منورہ) میں نائب رئیس تھے- پھر جامعہ کے کلیۃ الشریعہ کے استاذ مقرر کیے گئے-

۹- شیخ عبداللہ بن حمید: اسلامی قانون کے تمام گوشوں سے آگاہ اور سعودی عرب کے محکمۃ الشرعیہ کے سربراہ-

۱۰- شیخ ظہور بن محمد اصغر رحمانی: ہندوستان کے نامور عالم و معلم تھے- ۱۹۲۹ء میں پیدا ہوئے اور ۱۹۹۳ء میں وفات پائی- دارالحدیث رحمانیہ (دہلی) سے فارغ التحصیل تھے- مولانا نذیر احمد رحمانی املوی اور مولانا عبیداللہ رحمانی مبارک پوری (صاحب مرعاۃ المفاتیح) کے شاگرد رشید تھے-

۱۱- مولانا محمد ادریس آزاد رحمانی: ہندوستان کے ممتاز علما میں سے تھے- دارالعلوم احمدیہ سلفیہ (دربھنگا) کے رسالہ "الہدیٰ" میں ان کے مضامین شائع ہوتے رہتے تھے-

۱۲- عبدالرحمٰن سلفی: ان کا شمار بھی دیار ہند کے علمائے کرام میں ہوتا ہے- دینی و شرعی

مسائل سے لوگوں کو باخبر کرنا اور ان پر عامل رہنے کی تلقین کرنا ان کا خاص مشغلہ تھا۔

۱۳۔ مولانا حبیب المرسلین سلفی: ان کا تعلق بھی ہندوستان سے تھا۔ علوم دینی اور علوم عصری میں یکساں عبور رکھتے تھے۔ پٹنہ یونیورسٹی میں شعبہ فارسی کے صدر رہے۔

یہ تھے ڈاکٹر محمد لقمان کے چند اساتذہ گرامی جو اپنے موضوع میں فوقیت رکھتے تھے۔ ان حضرات سے ڈاکٹر صاحب نے حصول علم کیا اور ان کی صحبت سے سعادت اندوز ہوئے۔ وہ خوش قسمت ہیں کہ انھیں ان عالی قدر بزرگوں کی بے پناہ معلومات سے بہرہ مند ہونے کے مواقع میسر آئے۔

ڈاکٹر لقمان ۱۹۶۷ (۱۳۸۷ھ) میں جامعہ اسلامیہ (منورہ) سے فارغ ہوئے۔ اس وقت ان کی علمی شہرت ہندوستان کے مختلف مقامات میں پہنچ چکی تھی۔

اب ذیل میں ڈاکٹر محمد لقمان کے ان احباب و معاصرین کے اسمائے گرامی ملاحظہ ہوں جو ان کے ہم جماعت رہے۔ ان میں سے بعض حضرات نے بے حد شہرت پائی اور بڑی خدمات انجام دیں۔ اس جماعت کے چند حضرات وفات پا چکے ہیں۔ ہماری معلومات کے مطابق ڈاکٹر صاحب نے خط و کتابت یا میل جول کے ذریعے اپنے ان دوستوں سے رابطہ رکھنے کی ہمیشہ کوشش کی۔

۱۔ علامہ احسان الٰہی ظہیر: ڈاکٹر صاحب کے یہ دوست اور ہم جماعت ۲۳ مارچ ۱۹۸۷ کو لاہور کے علاقے قلعہ پچھمن سنگھ میں ایک جلسہ عام میں تقریر کرتے ہوئے، بم دھماکے میں شہید ہوگئے تھے۔ ان کے ساتھ ان کے دس ساتھی بھی جام شہادت نوش کر گئے تھے، جن میں مولانا عبدالخالق قدوسی بھی شامل تھے جو بہت اچھے عالم اور ممتاز محقق تھے۔ علامہ احسان الٰہی ظہیر نہ صرف جماعت اہل حدیث بلکہ عالم اسلامی کی گراں قدر متاع تھے۔

۲۔ ڈاکٹر محمد بن محمود الوائلی: فقہ اسلامی اور تاریخ ادیان میں ان کو خاص طور سے درک حاصل ہے۔ دراسات العلیا جامعہ اسلامیہ کا انھیں وکیل مقرر کیا گیا تھا۔ اس کے ساتھ انھیں یہ اعزاز بھی حاصل تھا کہ مسجد نبوی میں مستقل طور سے خدمت تدریس انجام دیتے رہے۔

۳- حافظ حفیظ الرحمٰن عمری: جامعہ اسلامیہ سے فارغ ہو کر جامعہ دارالسلام عمر آباد (مدراس) میں خدمت تدریس پر مامور ہوئے۔

۴- مولانا محمد یوسف کاظم: یہ جامعہ اسلامیہ میں ڈاکٹر لقمان صاحب کے ہم جماعت تھے۔ وطنی تعلق لاہور سے ہے۔ کچھ عرصہ جامعہ اسلامیہ کولمبو میں معلم رہے۔ پھر پاکستان آ گئے اور جامعہ اسلامیہ (اسلام آباد) کی الدعوہ اکیڈمی میں منصب تدریس پر متمکن ہوئے۔ وہیں سے ریٹائر ہوئے۔ دارالعلوم تقویۃ الاسلام (لاہور) میں بھی تعلیم حاصل کی اور سند لی۔

۵- مولانا عبدالستار سلفی: جامعہ اسلامیہ میں ڈاکٹر صاحب کے رفیق درس رہے۔ نہایت راسخ العقیدہ سلفی ہیں' ان کی سلفیت سے ڈاکٹر لقمان بہت متاثر تھے۔ آج کل جامعہ ستاریہ کراچی میں مدرس ہیں۔

۶- ڈاکٹر صہیب حسن: پاکستان کے جلیل القدر عالم اور جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کے سابق استاذ حضرت مولانا عبدالغفار حسن کے صاحب زادہ گرامی قدر ہیں۔ عمل و عقیدے کے اعتبار سے سلفیت کا پیکر محسوس۔ جامعہ اسلامیہ میں ڈاکٹر محمد لقمان کے ہم درس تھے۔ عربی' اردو اور انگریزی میں نہایت روانی سے اظہار مدعا کرتے ہیں۔

مجھے ان کی ایک کتاب ''لندن سے غرناطہ تک'' پڑھنے کا اتفاق ہوا ہے۔ زبان اور بیان واقعہ کے اعتبار سے بہترین کتاب ہے اور ایسا سفر نامہ کہ قاری اپنے آپ کو مسافر اور مصنف کے ساتھ چلتا پھرتا محسوس کرتا ہے۔ میں اس انداز تحریر سے نہایت متاثر ہوا۔ وہ کئی سال سے دعوت وارشاد کے سلسلے میں انگلستان میں مقیم ہیں' اس سے پہلے طویل عرصہ مدینہ منورہ میں گزرا اور وہیں حصول علم کی منزلیں طے کیں۔ خدا جانے عرب اور انگلستان میں رہنے والے اس شخص نے اس درجہ صاف اور ادیبانہ اردو لکھنے کا طریقہ کہاں سے سیکھا ہے۔

۷- حافظ عبدالرحمٰن مدنی: پاکستان کی جماعت اہل حدیث کے معروف علمائے کرام میں مولانا حافظ محمد حسین روپڑی مرحوم و مغفور کی ذات گرامی خاص اہمیت کی حامل ہے' جن کا تذکرہ اپنی معلومات کے مطابق اس کتاب میں کیا گیا ہے' حافظ عبدالرحمٰن مدنی انہی کے

فرزند ارجمند ہیں- لاہور میں جامعہ رحمانیہ اسلامیہ کا قیام ان کا بہت بڑا کارنامہ ہے- یہ جامعہ بہت سالوں سے قائم ہے اور تعلیم کا مشہور مرکز ہے، جس میں متعدد اساتذہ خدمت تدریس دینے پر مامور ہیں اور طلبا کی اچھی خاصی تعداد ان سے مستفید ہو رہی ہے- اس کے علاوہ ماہنامہ ''محدث'' ایک علمی اور تحقیقی مجلہ ہے، جو ان کی ادارت میں باقاعدہ شائع ہوتا ہے- حافظ عبدالرحمٰن مدنی مضمون نویس اور مقالہ نگار ہونے کے علاوہ تقریر و خطابت میں بھی اپنا ایک مقام رکھتے ہیں- مدینہ یونیورسٹی میں یہ ڈاکٹر محمد لقمان سلفی کے ہم جماعت و ہم درس تھے-

ڈاکٹر صاحب کے دور طالب علمی کے یہ چند دوستوں اور رفقاے درس کے نام ہیں جو پاکستان اور ہندوستان سے تعلق رکھتے ہیں، ان کے علاوہ بھی بے شمار حضرات ہیں، جنھوں نے ان کے ساتھ پڑھا اور نصابی تعلیم کی تکمیل کی- یہاں ان سب کے نام لکھنا بہت مشکل ہے- پھر ہم ان سب حضرات سے واقف بھی نہیں ہیں-

اب ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ ڈاکٹر محمد لقمان موجودہ منصب تک کیسے پہنچے اور کن کن مراحل سے گزرتے ہوئے انھوں نے اس مقام تک رسائی حاصل کی-

وہ ۱۹۶۷ (۱۳۸۷ھ) میں جامعہ اسلامیہ (مدینہ منورہ) سے فارغ ہوئے تھے--- فراغت کے بعد وہ ریاض پہنچے- ان کا مقصد کسی ملازمت کا حصول تھا- چنانچہ اسی سال (یعنی ۱۹۶۷) میں انھیں دارالافتا میں عربی سے انگریزی اور انگریزی سے عربی مترجم کی ملازمت مل گئی- ڈاکٹر صاحب نے اسے غنیمت جانا اور معہد العالی للقضاۃ میں ایم اے کے لیے داخلہ لے لیا اور پھر تین سال میں ایم- اے کی ڈگری حاصل کر لی- ایم- اے میں ان کے مقالے کا عنوان تھا: ''السنة حجيتها و مكانتها في الاسلام والرد على منكريها''-

ریاض میں قیام کے دوران جسمانی طور پر تو وہ بے شک ریاض میں تھے، مگر ان کا دل ہمیشہ شیخ ابن باز کی خدمت میں حاضری اور ان سے استفادے کے لیے بے چین رہتا تھا- چنانچہ شیخ جب گرمیوں کی چھٹیوں میں اپنے وطن ریاض جاتے تو ڈاکٹر صاحب فوراً ان سے

رابطہ قائم کرتے اور تمام فرضی نمازیں ان کی امامت میں پڑھتے۔ فتح الباری ان کو پڑھ کر سناتے۔ اگر دوران قرات کہیں غلطی ہو جاتی تو شیخ نہایت نرم الفاظ میں تصحیح کراتے اور علمی نکات کی وضاحت فرماتے۔ نیز صرفی ونحوی اور ادبی مقامات کی دلنشین انداز سے عقدہ کشائی کرتے۔

شیخ ابن باز سعودی عرب کے مختلف مقامات مثلاً مکہ مکرمہ مدینہ طیبہ ریاض اور طائف وغیرہ میں تبلیغی لیکچروں کے لیے تشریف لے جاتے تو ڈاکٹر صاحب ان کے ہم سفر ہوتے' مختف ممالک سے جو وفود شیخ سے ملاقات کے لیے آتے' ڈاکٹر صاحب ان کے درمیان ترجمان کا فریضہ ادا کرتے۔ شیخ کے فرمودات کا انگریزی میں یا اردو اور فارسی زبانوں میں ترجمہ کرتے اور وفود کے کلام کو عربی میں منتقل کر کے شیخ کے گوش گزار کرتے۔

شیخ ابن باز مسلمانوں کے معاملات میں گہری دلچسپی رکھتے تھے۔ جب بھی کوئی شخص ان کی خدمت میں کسی مشکل معاملے کی عقدہ کشائی کے لیے ان کے دروازے پر دستک دیتا' وہ جہاں تک ممکن ہوتا اسے حل کرنے کی سعی فرماتے۔ ڈاکٹر صاحب کے وطن کے بعض اہل حدیث حضرات نے شیخ کی خدمت میں درخواست پیش کی کہ ہمارے علاقے میں جامعہ ابن تیمیہ کے قیام کی اشد ضرورت ہے' ساتھ ہی تحریر کیا کہ آپ کے تلمیذ رشید ڈاکٹر محمد لقمان اس قابلیت کے مالک ہیں کہ وہ یہاں جامعہ ابن تیمیہ قائم کر کے اسے خوش اسلوبی سے جاری رکھ سکیں۔ چنانچہ شیخ نے ڈاکٹر صاحب کو طلب کیا اور حکم دیا کہ فوراً وہاں جامعہ ابن تیمیہ کا قیام عمل میں لایا جائے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۴۰۹ھ میں وہاں جامعہ ابن تیمیہ قائم ہو گئی' جس کا شمار برصغیر کے بڑے بڑے تعلیمی مراکز میں ہوتا ہے۔ جامعہ ابن تیمیہ میں شیخ کے نام سے مرکز شیخ عبدالعزیز بن باز للدراسات الاسلامیہ قائم کیا گیا ہے۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب کے دل میں شیخ کے ساتھ کس درجہ احترام کا جذبہ پایا جاتا ہے۔

شیخ رحمۃ اللہ علیہ کا مقام بہت بلند ہے اور وہ ڈاکٹر صاحب کے استاذ بھی تھے' ان کا احترام تو ان کے دل میں ہونا ہی چاہیے تھا' ان کے علاوہ بھی وہ ہر اہل علم کی تکریم بجا لانا اپنے لیے ضروری سمجھتے ہیں۔ وہ عمر میں ان سے چھوٹا ہو یا بڑا' منصب میں ان کے برابر ہو یا

کم درجہ رکھتا ہو'ان کے ماتحت ہو یا نہ ہو'ہر عالم کا اکرام ان کے نزدیک ضروری ہے۔

جامعہ ابن تیمیہ جو ان کے وطن کا بہت بڑا تدریسی اور تعلیمی ادارہ ہے' وہ اس کے اساتذہ اور طلبا سے قریبی رابطہ رکھتے ہیں اور اپنے طرز عمل سے انھیں بالکل احساس نہیں ہونے دیتے کہ ان کی مجلس میں کوئی چھوٹا یا بڑا بھی ہے' سب سے مساوی سطح پر پیش آتے ہیں۔

یہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ محمد لقمان جب جامعہ اسلامیہ سے فارغ التحصیل ہوئے اور شہادۃ اللیانس (degree in Language) حاصل کی' اس وقت انھیں علم تفسیر' علوم حدیث اور فقہ سے بے حد دلچسپی تھی۔ وہ تدریس کے شعبے میں خدمات انجام دینا چاہتے تھے' اسی مقصد کے حصول کے لیے وہ سعودی عرب کے دار الحکومت ریاض گئے تھے' لیکن وہاں انھیں ادارۃ الدعوۃ والافتا میں انگریزی مترجم کی حیثیت سے ملازم رکھ لیا گیا۔ یہ ۱۹۶۷ کی بات ہے۔

پھر جب ۱۹۷۵ء میں شیخ ابن باز ادارۃ البحوث العلمیہ والافتاء والدعوۃ والارشاد کے ڈائریکٹر مقرر ہوئے تو انھوں نے اپنے دفتر میں مترجم کی حیثیت سے ان کی خدمات حاصل کر لیں۔ اس کے ساتھ ہی وہ ان کے سیکرٹری بھی تھے اور یہ اس دفتر کا ایک بڑا منصب تھا جو ڈاکٹر لقمان کے حصے میں آیا۔

ان مناصب کے علاوہ ڈاکٹر محمد لقمان کی خدمات و مناصب کا خاکہ مندرجہ ذیل ہے۔

- موسس رئیس جامعہ ابن تیمیہ۔
- دار العلوم احمدیہ سلفیہ دربھنگا (بہار) سے متخرجین کی جمعیت کے صدر۔
- مرکزی عبدالعزیز بن باز للدراسات الاسلامیہ کے نگران اعلیٰ۔
- جمعیت امام ابن تیمیہ الخمریہ (بہار) کے نگران اعلیٰ۔
- جامعہ ابن تیمیہ کے رسالہ ''طوبیٰ'' کے اردو سیکشن کے نگران۔
- جامعہ ابن تیمیہ کے رسالہ ''الفرقان'' کے عربی سیکشن کے انچارج یا نگران۔
- سعودی عرب کے مفتی عام کے جاری کردہ فتاویٰ کے ذمے دار۔

- مئوناتھ بھنجن (یوپی) کے رسالہ ''آثار الصادرہ'' کی مجلس ادارت کے رکن۔
- دارالدعوہ سعودی عرب کے انچارج۔
- الدعوۃ الاسلامیہ ریاض کے رسالے ''الدعوہ'' کی مجلس انتظامیہ کے رکن اور عالم اسلامی سے متعلق اس میں شائع ہونے والے مقالات کے نگران۔

علاوہ ازیں وہ کئی سال مجلہ توعیۃ الاسلامیہ فی الحج کی مجلس کے رکن رہے، نیز کافی عرصہ جامعہ محمد بن سعود کے شعبہ تدریس سے ان کا تعلق رہا۔

بہرحال ان کی گوناگوں علمی خدمات کا دائرہ بہت وسیع ہے اور وہ ہر کام محنت اور ذمے داری سے انجام دیتے ہیں۔

اب ڈاکٹر محمد لقمان کی تصانیف وتالیفات کی طرف آیئے۔

۱۔ السنة حجيتها و مكانتها فی الاسلام والرد علی منكريها: یہ ان کا ایم-اے کا مقالہ تھا جو اس وقت لکھا تھا جب وہ معہد العالی للقضاۃ جامعہ محمد بن سعود (ریاض) میں ایم-اے کے طالب علم تھے۔۳۲۰ صفحات کا یہ مقالہ ۱۴۰۹ھ (۱۹۸۹) میں شائع ہوا۔

۲۔ اهتمام المحدثين بنقد الحديث سنداً و متنا ورخص مزاعم المستشرقين: یہ ان کا پی ایچ ڈی کا مقالہ تھا، جس پر انھیں ڈاکٹریٹ کی ڈگری ملی۔ ان کے نگران ڈاکٹر محمد ادیب صالح تھے جو اس وقت جامعہ محمد بن سعود میں شعبہ السنۃ وعلومھا کے چیرمین تھے۔ انھوں نے اپنی رپورٹ میں ڈاکٹر محمد لقمان کے مقالے کو نہایت اہم مقالہ قرار دیا اور انھیں ڈاکٹریٹ کی ڈگری دینے کی پرزور سفارش کی۔ یہ مقالہ پہلی دفعہ ۱۴۰۸ھ (۱۹۸۸) میں شائع ہوا تھا۔ اس کا اردو ترجمہ مرکز عبدالعزیز بن باز للدراسات الاسلامیہ کے استاذ مولانا فضل اللہ انصاری نے کیا اور حک واضافے کے ساتھ اس پر نظر ثانی مولانا فضل الرحمٰن ندوی نے کی۔ یہ بھی اسی مرکز میں فریضہ تدریس انجام دینے پر مامور ہیں۔

۳۔ بہت سال ہوئے مولانا ابوالاعلیٰ مودودی اور ایک خاتون کے درمیان خط وکتابت کا سلسلہ جاری ہوا تھا، جس کا تعلق اسلامی احکام ومعاملات کے بارے میں سوالات وجوابات سے تھا۔ بعدازاں یہ خاتون اسلام قبول کر کے مریم جمیلہ کے نام سے موسوم ہوئیں۔ ڈاکٹر

محمد لقمان نے اس خط وکتابت کا عربی میں ترجمہ کیا۔

۴- ایک کتاب انھوں نے اصول جرح وتعدیل سے متعلق لکھی تھی جس میں اس موضوع کی تفصیلات بیان کی گئی تھیں، لیکن افسوس ہے۔یہ مسودہ گم ہوگیا تھا۔

۵- تیسیر القرآن الکریم: یہ ان کی بہت بڑی خدمت قرآن ہے۔اس کی خصوصیات یہ ہیں۔

- قرآن کی تفسیر قرآن کی رو سے
- احادیث نبویہ کی رو سے
- اقوال صحابہ کی رو سے
- ترجمے میں الفاظ قرآن کے معانی ومطالب کا پورا خیال رکھا گیا ہے۔
- صرف ونحو کے قواعد کو پیش نگاہ رکھا گیا ہے۔
- ہر سورت کے آغاز میں اس کی شان نزول کی وضاحت کی گئی ہے۔
- سورتوں کی وجہ تسمیہ بیان کی گئی ہے۔
- احادیث اور اقوال صحابہ کی روشنی میں ہر سورت کی فضیلت بیان کی گئی ہے۔
- صفات الٰہی کے بیان میں مسلک سلف کو پیش نگاہ رکھا گیا ہے
- استخراج مسائل کیا گیا ہے۔
- مخالفین کے اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے۔

ان تصانیف کے علاوہ انھوں نے مختلف علمی، ادبی اور تحقیقی رسائل ومجلات میں بہت سے محققانہ اور عالمانہ مقالات سپرد قلم کیے۔

ڈاکٹر صاحب ابتدا ہی سے بے حد انہماک اور لگن سے حصول علم میں مصروف رہے۔ کہا جاتا ہے کہ انھوں نے دور طالب علمی کے ہر امتحان میں نمایاں طور سے کامیابی حاصل کی تھی اور اساتذہ ان سے بہت خوش رہتے تھے۔

اس زمانے میں بعض طلبا ایجوکیشن بورڈ میں مولوی، مولوی عالم اور مولوی فاضل کا امتحان دیا کرتے تھے، اور وہ سرکاری امتحان ہوتے تھے۔ڈاکٹر صاحب نے طالب علمی کے

ابتدائی دور میں ''مولوی'' کا امتحان دیا تھا اور اس میں اول پوزیشن حاصل کی تھی اور یہ پوزیشن گزشتہ دس سال میں کسی کو حاصل نہیں ہوئی تھی۔

اب ملاحظہ ہوں ڈاکٹر محمد لقمان سلفی کے بارے میں اصحاب علم کی آرائے گرامی۔

سب سے پہلے ان کے استاذ عالی قدر مرحوم ومغفور شیخ عبدالعزیز بن باز کی رائے۔وہ فرماتے ہیں:

۱۔ ڈاکٹر لقمان سلفی کو سعودی عرب کی قومیت حاصل ہے۔میرے لائق شاگردوں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ان میں جو اخلاص اور علمی پختگی کے جوہر پائے جاتے ہیں ان کی وجہ سے میں انھیں نہایت قابل اعتماد گردانتا ہوں اور ان کی علمی کاوشوں کی دل کی گہرائیوں سے قدر کرتا ہوں۔

۲۔ ڈاکٹر ادیب صالح سابق رئیس قسم ''السنۃ وعلومہا'' جامعہ امام محمد بن سعود (ریاض) کا ارشاد ہے کہ میں نے محمد لقمان سلفی کو طلب علم کا اصل متمنی، صحیح العقیدہ، قابل اعتماد ساتھی اور محنتی رفیق پایا ہے۔بلاشبہ یہ مخلص دوست اور لوگوں کے ہم درد ہیں۔

۳۔ حافظ عبدالرحمٰن مدنی اپنی رائے کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں: ڈاکٹر لقمان سلفی سے میں اس زمانے سے متعارف ہوں، جب وہ جامعہ اسلامیہ (مدینہ منورہ) میں زیر تعلیم تھے۔علم کے متلاشی، فہیم اور بہت اچھے دوست ہیں۔

۴۔ ڈاکٹر عبدالرحمٰن عبدالجبار فریوائی کا کہنا ہے: ڈاکٹر لقمان سے گزشتہ پچیس چھبیس برس سے میری آشنائی ہے۔میں نے انھیں ہر اعتبار سے لائق ستائش پایا ہے۔ان کا شمار میرے نزدیک برصغیر کے مستند اور ثقہ اصحاب علم میں ہوتا ہے۔سعودی عرب کے شیوخ کے نزدیک علمی اعتبار سے وہ معتمد علیہ شخصیت ہیں۔

۵۔ مولانا عبدالرؤف رحمانی رابطہ عالم اسلامی (مکہ مکرمہ) کے رکن اور جامعہ سراج العلوم (جھنڈا نگر) کے ناظم اعلیٰ ہیں، ان کا فرمان ہے: ڈاکٹر لقمان میرے نزدیک دیار ہند کے کبار علمائے اہل حدیث میں سے ہیں۔علم کے لیے ان کی حرص، دعوت اسلامی کے لیے تڑپ اور مسلمانوں کے لیے ہم دردی کے جذبات ان کا وہ طرۂ امتیاز ہے، جس کی بنا پر ہر

شخص ان کا قدر دان ہے۔

بہرکیف ڈاکٹر محمد لقمان سلفی اجلے فکر اور نکھرے ہوئے ذہن کے عالم دین ہیں اور اہل علم کو مستحق تکریم گردانتے ہیں۔

ان کے اساتذہ کرام میں شیخ عبدالعزیز بن باز کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ علمی اعتبار سے بھی، تصنیفی نقطہ نظر سے بھی اور مناصب کے لحاظ سے بھی۔! ڈاکٹر محمد لقمان جن مقامات پر پہنچے وہ اللہ تعالیٰ کی خاص کرم فرمائیوں کا نتیجہ تو ہے ہی، لیکن اس میں شیخ بن باز رحمۃ اللہ علیہ کی نظر شفقت کا بھی بہت بڑا حصہ ہے۔ وہ ان کی محنت و ہمت اور شوق علم کی بنا پر ان کا بے حد خیال رکھتے تھے، جس کا ذکر گزشتہ صفحات میں ہمارے مطالعے میں آ چکا ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں اختصار کے ساتھ حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ کی حیات مبارکہ کے مختلف گوشوں کا تذکرہ کر دیا جائے۔

☆ شیخ عبدالعزیز بن باز ۱۲ ذی الحجہ ۱۳۳۰ھ کو سعودی عرب کے دارالحکومت ریاض کے ایک سلفی العقیدہ علمی گھرانے میں پیدا ہوئے۔

☆ ان کا مختصر سلسلہ نسب یہ ہے: شیخ عبدالعزیز بن عبداللہ بن عبدالرحمٰن بن محمد آل باز۔

☆ ۱۳۴۶ھ میں ان کو آشوب چشم کا عارضہ لاحق ہوا۔

☆ ۱۳۵۰ھ میں بینائی جاتی رہی اور بصارت سے محروم ہو گئے، لیکن بصارت کی جگہ بصیرت نے لے لی، جس میں بارگاہ الٰہی کی طرف سے روز بروز اضافہ ہوتا گیا اور مملکت سعودی عرب کے بڑے بڑے مناصب کے دروازے انؒ کے سامنے تیزی سے کھلتے گئے۔

☆ ۱۳۵۷ھ میں علاقہ خرج کے قاضی مقرر ہوئے۔ ۱۳۷۱ تک اس عہدے پر متعین رہے۔

☆ ۱۳۷۲ھ میں معہد العلمی ریاض میں مسند تدریس پر فائز ہوئے۔

☆ ۱۳۷۳ھ میں شریعت کالج قائم ہوا تو اس میں حدیث وفقہ کے استاذ کی حیثیت سے ان کا تقرر ہوا۔ اس کے علاوہ الجامع الکبیر ریاض میں سلسلہ درس کا آغاز کیا۔

☆ ۱۳۸۱ میں جامعہ اسلامیہ (مدینہ منورہ) کا قیام عمل میں آیا تو اس کے وائس چانسلر بنا

دیے گئے۔

☆ ۱۳۹۰ میں اسی جامعہ اسلامیہ کے چانسلر مقرر کیے گئے۔ ۱۳۹۵ تک اس مسند پر متمکن رہے۔

☆ ۱۳۹۵ھ میں سعودی عرب کے ادارۃ البحوث العلمیہ والافتاء والدعوۃ والارشاد کی صدارت انھیں تفویض کی گئی۔

☆ ۱۴۰۲ھ میں شاہ فیصل ایوارڈ دیا گیا۔

☆ ۱۴۱۴ھ میں سعودی عرب کے مفتی اعظم کا اضافی چارج بھی انھیں دیا گیا۔ یہ عہدہ وزیر کے برابر تھا۔

☆ مساجد کی عالمی مجلس اعلیٰ کی صدارت پر متمکن ہوئے۔

☆ رابطہ عالم اسلامی کی مجلس تاسیسی کے صدر بنائے گئے۔

☆ رابطہ عالم اسلامی کے تحت مجمع فقہ اسلامی کے چیرمین۔

☆ جامعہ اسلامیہ (مدینہ منورہ) کی مجلس منتظمہ کے رکن۔

☆ مجلس کبار علمائے سعودی عرب کے رکن۔

☆ مدینہ منورہ میں قیام کے دوران مسجد نبوی میں روزانہ درس قرآن دیتے رہے۔

☆ ۲۷ محرم ۱۴۲۰ھ (۱۳ جون ۱۹۹۹ء) کو جمعرات کے روز وفات پائی۔ رحمہ اللہ تعالیٰ

شیخ عبدالعزیز بن باز نے اپنی ان گوناگوں مصروفیات کے باوجود عقائد، فقہ اسلامی، احکام و آداب دینی، معاشرتی معاملات وغیرہ موضوعات سے متعلق بائیس کتابیں تصنیف فرمائیں۔ ان میں سے بعض کتابیں کئی کئی جلدوں پر مشتمل ہیں۔ ان کے علاوہ متعدد رسائل و جرائد میں ان کے مقالات و مضامین شائع ہوتے رہے جو بہت سے عنوانات پر مشتمل تھے۔

یہ سطور آج ۲۰ جون ۲۰۰۱ کو لکھی جارہی ہیں اور ڈاکٹر محمد لقمان سے میری ملاقات آج سے پندرہ مہینے پہلے ۲۴ مارچ ۲۰۰۰ء کو ہوئی تھی، جو تقریباً سوا گھنٹے جاری رہی تھی۔ یہ پہلی ملاقات بھی تھی اور اب تک کی آخری بھی۔ آئندہ بہ ظاہر ان سے ملاقات کا امکان نہیں ہے،

اگر ہے بھی تو بہت کم--- وہ ہندوستان کے باشندے اور سعودی عرب میں مقیم اور میرا مسکن پاکستان---! سعودی عرب جانے کی تو صورت اللہ تعالیٰ نے بنا ہی دی تھی، لیکن ہندوستان جانے کی کوئی صورت میرا خیال ہے، اللہ تعالیٰ کو منظور نہیں ہے۔ گزشتہ پچاس ترپن سال کے عرصے میں بہت سے ہندوستانی دوستوں نے مجھے دعوت دی، ایک دعوت علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر کی طرف سے وہاں ایک سیمینار میں شریک ہونے اور مقالہ پڑھنے کی آئی، لیکن میں نہیں جا سکا، ندوۃ العلماء لکھنؤ سے بھی دعوت نامہ آیا۔ ہندوستان کی جماعت اہل حدیث کی طرف سے بھوپال کے ایک اجلاس میں شرکت کے لیے بلایا گیا، دہلی سے جمعیت اہل حدیث کے معزز ارکان کے دعوتی خطوط آئے، لیکن میں نہیں جا سکا۔

جناب مالک رام کا دعوت نامہ آیا جو عربی، اردو اور فارسی کے مشہور ہندوستانی محقق اور مصنف تھے، لیکن میں نہیں جا سکا۔ مالیر کوٹلہ (مشرقی پنجاب) کے جناب کفایت اللہ صاحب کے کئی دعوتی خطوط آئے، لیکن میں ان کی دعوت پر عمل نہیں کر سکا۔

عجیب تر بات یہ ہے کہ گیانی ذیل سنگھ پانچ سال ہندوستان کے منصب صدارت پر فائز رہے، جن سے قبل از تقسیم ملک میرے وطنی تعلقات بھی تھے اور دوستانہ بھی تھا۔ وہ ریاست فرید کوٹ کی پرجا منڈل کے صدر تھے اور میں جنرل سیکرٹری۔ انھوں نے اپنے دور صدارت میں مجھے ہندوستان آنے کی دعوت دی، لیکن میں نہیں جا سکا۔ ان کے بارے میں میرا تفصیلی مضمون میری کتاب ”نقوش عظمت رفتہ“ میں شائع ہوا ہے۔ عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ جب ان حالات میں ہندوستان نہیں جا سکا تو اب کیسے جاؤں گا؟ میں ”ظاہری“ ہوں، ”باطنی“ نہیں ہوں اور ظاہری اسباب کی روشنی ہی میں کسی مسئلے پر غور کرتا ہوں، اس لیے کہہ سکتا ہوں کہ ظاہری اسباب سے اندازہ ہوتا ہے کہ آئندہ ڈاکٹر محمد لقمان سلفی سے ملاقات کا امکان نہیں ہے اور اگر ہے تو اتنا کم کہ عدم کی سرحد تک پہنچا ہوا ہے۔

اب ایک حادثہ سنیے جو اس مضمون کو پیش آیا یا مجھے پیش آیا۔ کچھ عرصہ پیشتر اس کتاب کے ناشر اور مکتبہ قدوسیہ کے مالک عزیزی عمر فاروق صاحب نے مجھے کہا کہ تمام

کام مؤخر کر کے سب سے پہلے ہمیں ''قافلہ حدیث'' کے مضامین دیجیے۔ میں نے چند روز میں تقریباً تمام مضامین ان کے حوالے کر دیے' جن میں ڈاکٹر محمد لقمان سلفی سے متعلق مضمون بھی شامل تھا۔

باقی مضامین کے پروف تو ازراہ کرم مع مسودوں کے مجھے دے دیے گئے لیکن ڈاکٹر لقمان صاحب والا مضمون مجھے نہیں پہنچا۔ میں برابر پوچھتا اور مانگتا رہا' لیکن نہیں ملا۔ آخر انتہائی افسوس کے ساتھ مجھے بتایا گیا کہ بے حد تلاش کے باوجود مسودہ نہیں ملا اور کمپوز نہیں ہو سکا۔ یہ سن کر مجھے نہایت افسوس بھی ہوا اور غصہ بھی آیا' لیکن کیا کر سکتا تھا۔ اسی افسوس میں کئی مہینے گزر گئے اور میں اپنے دوسرے تصنیفی کام کرتا رہا۔ ایک دن میں نے گھر میں اپنے بکھرے ہوئے کاغذات دیکھنا شروع کیے تو اس مضمون کے دو تین بے حد ناقص اور ادھورے نوٹس ملے' جن میں بعض اشاروں کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔ جو حضرات تصنیف وتالیف سے تھوڑا بہت تعلق رکھتے ہیں' انھیں خوب معلوم ہے کہ لکھنے والے کے لیے اس قسم کا حادثہ کتنی ذہنی اذیت کا باعث ہوتا ہے۔ ایک خط گم ہو جائے تو دوبارہ لکھنا مشکل ہو جاتا ہے' چہ جائیکہ تیس بتیس صفحات کا پورا مضمون گم ہو جائے اور مضمون بھی اس شخص کے متعلق جو یہاں سے تین ہزار میل سے زائد مسافت پر بیٹھا ہے اور اس سے رابطہ کرنا اور معلومات لینا میرے جیسے محدود وسائل کے آدمی کے لیے انتہائی مشکل بلکہ ناممکن ہے۔

واقعات مستحضر کرنے کے لیے اب میں نے ذہن پر زور ڈالا اور اس کی منت سماجت کر کے اسے چند ماہ پیشتر کے اس دور اور ماحول میں لے جانے کی کوشش کی جس دور اور ماحول میں یہ مضمون لکھا گیا تھا۔ ذہن پر بھی اگرچہ بار بار اتنا زور ڈالا گیا ہے کہ وہ اسے برداشت کرتے کرتے تھک گیا ہے' لیکن مجھ سے اس کا بچپن ہی سے نہایت پر خلوص دوستانہ ہے اور ہر موقعے پر اس نے میرا بھرم قائم رکھا ہے' چنانچہ اس پریشانی کے موقعے پر بھی سچی بات ہے اس نے بے حد شرافت کا ثبوت دیا اور میں اس کا بہ درجہ غایت شکر گزار ہوں کہ پرانی روایات کو نبھاتے ہوئے میری بات مان گیا اور بغیر کسی ہچکچاہٹ کا اظہار کیے میرے قلم کے ساتھ چل پڑا' بلکہ بعض مقامات پر قلم سے بھی آگے نکل گیا' جس کا ثبوت ان

سطور کی شکل میں خوانندگان محترم کے سامنے ہے- گزشتہ سطور میں ہم پڑھ آئے ہیں کہ ڈاکٹر محمد لقمان سلفی کا بھی مسودہ گم ہو گیا تھا- بلاشبہ انھیں اس کا بہت قلق ہوا ہوگا- وہ بڑے آدمی ہیں' شاید انھوں نے ذرائع ابلاغ کے ذریعے اس کی گم شدگی کا اشتہار بھی دیا ہو- سنا ہے ان کا ذہن بڑا فرماں بردار اور اطاعت شعار ہے- معلوم نہیں اس گم شدہ مسودے کو تلاش کرنے کے لیے انھوں نے اس کی فرماں برداری اور اطاعت شعاری کا امتحان لیا یا نہیں- اصل دوست وہی ہے جو پریشانی کے وقت کام آئے- پریشانی تھوڑی ہو یا زیادہ' بہرحال پریشانی ہے- الحمدللہ میرا ذہن ہر آن میرا ساتھ دیتا ہے اور بچپن کی دوستی نباہ رہا ہے- وہ مجھ سے خوش' میں اس سے خوش!

دعا ہے اللہ تعالیٰ ہر لکھنے پڑھنے والے کو فرماں بردار اور مخلص ترین ذہن سے نوازے اور ہمارے محترم ڈاکٹر محمد لقمان سلفی کو کتاب وسنت کی زیادہ سے زیادہ خدمت کے مواقع عطا فرمائے' آمین یارب العالمین۔

❋❋❋

ڈاکٹر وصی اللہ

(ولادت ۱۹۴۸)

۲۵ مارچ ۲۰۰۰ء کو مکہ مکرمہ سے میری جدہ کے لیے روانگی کی تاریخ تھی۔ میرے پاسپورٹ پر لکھا تھا کہ ۲۷ مارچ کو صبح چھے بجے جہاز جدہ سے لاہور کے لیے پرواز کرے گا' میری سیٹ اسی جہاز کی ہے۔ مکتب کی طرف سے بتایا گیا تھا کہ جہاز پر سوار ہونے سے چوبیس گھنٹے پہلے جدہ ائیر پورٹ پر پہنچنا ضروری ہے اور یہ اسی صورت میں ہوسکتا ہے کہ ۲۵ مارچ کی شام کو مکہ مکرمہ سے روانہ ہوا جائے' اس لیے میں اپنی قیام گاہ (قاری عنایت اللہ بھٹی کے مکان) سے روانہ ہونے کی تیاری کررہا تھا۔ ان کا مکان مکہ مکرمہ کے محلہ عتیبیہ میں ہے۔ اس وقت دن کے گیارہ بجے تھے اور مجھے اپنے عزیز دوست رانا نصر اللہ کی قیام گاہ پر پہنچنا تھا جو بیت اللہ شریف کے قریب مدینہ ہوٹل کے سامنے کی گلی میں تھی۔ طے یہ پایا تھا کہ میں بارہ بجے کے پس و پیش وہاں پہنچ جاؤں گا' وہیں ہمارے مکتب نمبر ۹ کی بس آئے گی اور ہم چار بجے یا اس سے کچھ آگے پیچھے وہاں سے جدہ کو روانہ ہوجائیں گے۔

ساڑھے گیارہ بجنے والے ہوں گے کہ قاری عنایت اللہ بھٹی کے صاحب زادے عزیزی ابوبکر نے اطلاع دی کہ ڈاکٹر وصی اللہ تشریف لائے ہیں--- پورا قد' گداز جسم' کتابی چہرہ' سرخی مائل گندمی رنگ' بھری ہوئی داڑھی' عربوں کی سی سفید عبا پہنے ہوئے' سر پر کپڑے کی ٹوپی' اس پر تکونا رومال' پاؤں میں عربوں جیسی چپل' مسکراتے ہوئے نہایت گرم جوشی سے السلام علیکم کہہ کر مصافحہ کیا اور بے حد پیار کے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے بغل گیر ہوگئے۔ اسلامی ثقافت اور دینی تہذیب کا خوش نما پیکر ڈاکٹر وصی اللہ کی شکل میں میرے سامنے کھڑا تھا۔

ان چند کلمات کے بعد ہمارے لیے ضروری ہوگیا ہے کہ ہم ڈاکٹر وصی اللہ کے بارے

میں تفصیلی معلومات حاصل کرنے کا عزم کریں اور یہ کھوج لگانے کے لیے ساعی ہوں کہ ان کے آباواجداد کون ہیں اور وہ کہاں کے رہنے والے ہیں؟ ان کا ماضی کیا ہے اور اب تک ان کا کن حالات سے واسطہ پڑا ہے اور وہ علوم وفنون کی کن کن منازل سے آشنا ہوئے ہیں؟ اب کہاں ہیں اور کیا کرتے ہیں؟

ہندوستان کے صوبہ یوپی کے ضلع بستی کا قصبہ بستی لکھنؤ سے شمال کی جانب کم وبیش دو سو کلومیٹر کی مسافت پر واقع ہے۔ اس قصبے کے قریب کسی گاؤں میں ان کا پرانا خاندان آباد تھا' جس کے بعض افراد اب بھی وہاں موجود ہیں۔ معلوم نہیں کس بنا پر تقریباً ۱۶۰۰ء میں اس خاندان کے پانچ افراد جو آپس میں حقیقی بھائی تھے' اپنے اس قدیم وطن کی سکونت ترک کر کے اس علاقے کے ایک گاؤں پیرا بھوج میں آ بسے تھے۔ جس جگہ یہ گاؤں اب آباد ہے' اس وقت ایک جنگل تھا جو میلوں میں پھیلا ہوا تھا۔ چاروں طرف بے شمار درخت اور جھاڑیاں تھیں اور بڑا بڑا سرکنڈا دکھائی دیتا تھا۔ ان بھائیوں نے دن رات محنت کر کے درختوں' جھاڑیوں اور سرکنڈے کو کاٹا اور وہاں مکان وغیرہ بنا کر آباد ہو گئے اور اچھی خاصی زمین پر کاشت کاری شروع کر دی۔

ان پانچ بھائیوں کے نام بالترتیب یہ تھے۔

۱۔ بھوج بابا۔

۲۔ سنگرلے بالا۔

۳۔ سعد اللہ بالا۔

۴۔ زور آور۔

۵۔ جھر بیو بابا۔

ان میں سے بھوج بالا سب سے بڑے تھے۔ جس جگہ انھوں نے آ کر قیام کیا تھا' وہ گاؤں انھی کے نام سے موسوم کیا گیا تھا' اب بھی انھی کے نام سے موسوم اور مشہور ہے۔ ان پانچوں بھائیوں کو اب تک انھی ناموں سے یاد کیا جاتا ہے۔ معلوم نہیں یہ ان کے اصلی نام تھے یا عرفی نام ---! خاندان میں مشہور بہرحال یہی نام ہیں۔

ان کے خاندان کے ایک بزرگ نے جن کا انتقال ۱۸۰۰ء کے پس و پیش ہوا' فارسی زبان میں ایک کتاب لکھی تھی' جس میں انھوں نے اس خاندان کے قدیم بزرگوں کے حالات بیان کیے تھے۔ کتاب کے مصنف کے ایک پوتے کا نام حاجی بشیر احمد تھا۔ حاجی بشیر احمد مرحوم اس کتاب کے حوالے سے ان بزرگوں کے بعض واقعات لوگوں کو بتایا کرتے تھے۔

کہا جاتا ہے کہ اس علاقے میں آنے اور سکونت و زراعت کے لیے کچھ زمین صاف کرنے کے بعد بھوج بابا نے' جو تمام بھائیوں سے بڑے تھے' سب سے پہلے وہاں ایک مسجد کی بنیاد رکھی' لیکن کرنا خدا کا یہ ہوا کہ مسجد کی بنیاد رکھتے ہی ان پانچ بھائیوں میں سے ایک بھائی کا انتقال ہو گیا--- باقی بھائیوں اور خاندان کے لوگوں نے مسجد کی بنیاد کو بدشگونی قرار دیا اور اس کی تعمیر کا سلسلہ روک دیا گیا۔ منقول ہے کہ بارہ سال یہ سلسلہ رکا رہا۔ اس طویل مدت کے بعد ان کے ذہن کا جذبہ خیر بیدار ہوا اور حریم قلب میں داعیہ حسنات نے انگڑائی لی تو انھوں نے اعلان کر دیا کہ بے شک خاندان کے تمام افراد موت کی آغوش میں چلے جائیں' لیکن مسجد ضرور تعمیر ہو گی اور اس میں اللہ کی عبادت اور ادائے نماز کا سلسلہ جاری ہو گا۔ چنانچہ مسجد تعمیر ہوئی' اور اس زمانے کے حالات کے مطابق بہت وسیع اور شان دار مسجد تعمیر ہوئی' جس کے تین بڑے بڑے ستون تھے اور کافی چوڑی دیواریں تھیں' بیان کیا جاتا ہے کہ بالکل بابری مسجد کی شکل میں تھی۔ پرانے زمانے کی اینٹیں' اچھی لکڑی اور دوسری بہترین اشیا استعمال کی گئی تھیں۔ یہ مسجد اب بھی موجود ہے اور اسی آن بان کے ساتھ قائم ہے اور قدیم تاریخ کا یہ ایک خوب صورت باب ہے' جو ڈاکٹر وصی اللہ کے آبا و اجداد کی دینی و مذہبی کوششوں کا ثبوت اور ان کے لیے صدقہ جاریہ ہے۔

کسی زمانے میں اس علاقے کے مسلمان بہت سی ہندوانہ رسوم کا ارتکاب کرتے تھے۔ محرم کے دنوں میں تعزیہ بنانے اور نکالنے کا بھی رواج تھا۔ پھر ایک دور آیا کہ حضرت شاہ اسماعیل شہید دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے قافلے کے کچھ لوگوں کا ادھر سے گزر ہوا' وہ چند روز اس نواح میں رہے اور دین کی تبلیغ کی۔ اس سے لوگ بہت متاثر ہوئے اور غیر اسلامی

رسوم ورواج سے کنارہ کشی اختیار کرلی- آہستہ آہستہ ضلع بستی کے اس پورے علاقے میں ان کی تبلیغ کے اثرات پھیلے' سلفیت واہل حدیثیت کی اشاعت ہوئی اور حصولِ علم کا جذبہ پیدا ہوا-

اس دور کی مشہور شخصیتوں میں' جنھوں نے اس علاقے کو تبلیغ دین کے لیے مرکزِ التفات قرار دیا' مولانا عباداللہ یوسف پوری اور مولانا نوراللہ کے اسمائے گرامی خاص طور سے قابل ذکر ہیں- مولانا عباداللہ یوسف پوری نے ۱۸۹۰ء کے پس وپیش وفات پائی اور مولانا نوراللہ ۱۹۳۳ء کے لگ بھگ راہِ عالم بقا ہوئے- مولانا عباداللہ یوسف پوری کے بارے میں معلوم نہیں ہوسکا کہ انھوں نے کن علمائے عالی قدر سے تحصیل علم کی' البتہ مولانا نوراللہ کے متعلق پتا چلا ہے کہ وہ حضرت میاں سید نذیر حسین دہلوی کے شاگرد تھے- انھوں نے دہلی جاکر باقاعدہ ان سے کتب حدیث پڑھیں اور فقہ کی مشہور کتابوں میں سے ہدایہ کی تکمیل ان سے کی-

مولانا عباداللہ یوسف پوری نے ڈاکٹر وصی اللہ کے آبائی گاؤں پیرا بھوج (ضلع بستی) سے تین میل کے فاصلے پر "مدرسہ دارالہدیٰ" کی بنیاد رکھی' جس میں مولانا نوراللہ کو مدرس مقرر کیا گیا- مولانا نوراللہ نے اپنی سکونت کے لیے "پیرا بھوج" کا انتخاب کیا- وہ نہایت باوقار شخصیت کے مالک تھے اور متعدد خوبیوں کے حامل- بہت بڑے عالم' قابل ترین مدرس' پرتاثیر واعظ' مستجاب الدعوات' عالی کردار اور بے حد ملنسار- سب کے خیر خواہ' سب کے ہم درد---!

مدرسہ دارالہدیٰ کے قیام کے بعد اس علاقے میں مختلف مقامات کے علما وطلبا کی آمد ورفت اور ان کی تبلیغی وتعلیمی سرگرمیوں کا آغاز ہوا' جس کے نتیجے میں تمام علاقہ غیر اسلامی رسوم اور شرک وبدعات سے پاک ہوگیا- بلکہ یہ مدرسہ ہر معاملے میں علاقے کے مسلمانوں کا مرکز ورہنما قرار پاگیا- ۱۹۱۹ء میں انگریزی حکومت کے خلاف عدم تعاون اور ترک موالات کی ملک گیر تحریک شروع ہوئی تو اس علاقے کے اہل حدیث علما وزعما اور عوام نے اس میں نہایت شدومد کے ساتھ حصہ لیا- مدرسہ دارالہدیٰ اس تحریک کا مرکز تھا-

لوگ آپس کے تنازعات اس مدرسے کے ارباب علم اور اصحاب اہتمام کے ذریعے حل کراتے تھے۔ برصغیر کے مشاہیر واکابر علماے اہل حدیث اس نواح میں تشریف لاتے تھے تو ان کا قیام اسی مدرسے میں ہوتا تھا۔ سال میں ایک مرتبہ علما کے اجتماع کا اہتمام لازماً مدرسے میں کیا جاتا تھا۔ لوگ اس اجتماع کا بے چینی سے انتظار کرتے تھے۔ وہ اجتماع کے موقعے پر اپنے اہم مسائل اور تنازعات علماے کرام کی خدمت میں پیش کرتے اور ان سے فیصلے کے خواہاں ہوتے۔ جو فیصلہ وہ کرتے' بلا تامل سب فریق اسے مان لیتے۔ ڈاکٹر وصی اللہ کے بقول تقسیم ملک سے قبل کے جو لوگ اس علاقے میں فروکش ہیں' علما کے ان اجتماعات کا وہ تفصیل سے تذکرہ کرتے ہیں۔ حضرت مولانا ثناء اللہ امرتسری اور مولانا محمد جوناگڑھی بھی ان اجتماعات میں شرکت فرماتے تھے' وہ تقریریں کرتے' لوگوں کے مسائل سنتے اور ان کے جھگڑے ختم کراتے تھے۔ پرانے لوگ اب تک نہایت دلچسپی سے اس عہد کی باتیں ایک دوسرے کو سناتے اور اپنی یادیں تازہ کرتے ہیں۔ اس وقت یہ لوگ جوان تھے۔

ڈاکٹر صاحب کے دادا احمد خاں چالیس سال اپنے گاؤں (پیرا بھوج) کے مکھیا رہے۔ وہ اس نواح میں نہایت اثر ورسوخ کے مالک تھے۔ گاؤں کا داخلی نظام انہی کے ہاتھ میں تھا۔ یوں سمجھیے کہ وہ اس گاؤں کے ''وزیر داخلہ'' تھے۔ وہاں بیت المال قائم کیا گیا تھا' جس سے مستحقین کی امداد کی جاتی تھی۔ ضرورت کے مطابق کسی کو کپڑا دیا جاتا تھا' کسی کو غلہ اور کسی کو نقد روپیہ۔ رات کے بارہ بجے کے بعد کوئی شخص بغیر کسی اہم وجہ کے گاؤں میں گھوم نہیں سکتا تھا۔ گاؤں کے باشندے تھانے کچہری جانے کے بجاے اپنے چھوٹے موٹے معاملات خود ہی طے کر لیتے تھے۔ کوئی جھگڑا ہوا' چند سرکردہ افراد گاؤں کے مکھیا کے ڈیرے پر گئے۔ انھوں نے متعلقہ فریقوں کی باتیں سنیں اور جھگڑا ختم کرا دیا۔

اسی گاؤں ''پیرا بھوج'' میں ہمارے لائق احترام دوست ڈاکٹر وصی اللہ ۱۹۴۸ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام محمد عباس خاں' دادا کا احمد خاں عرف توسل خاں اور پردادا کا خوش حال خاں تھا۔ ابتدائی تعلیم اسی گاؤں میں مولانا محمد سلیم سے حاصل کی' جو اس گاؤں کے مرشد خاندان کی قابل تکریم شخصیت ہیں۔

مولانا محمد سلیم کا نام آیا ہے تو ان کے بارے میں یہ واقعہ بھی سنتے جایئے کہ وہ اگست ۱۹۴۷ میں دہلی کے مدرسہ رحمانیہ میں زیر تعلیم تھے اور رمضان المبارک کی رخصتوں میں گھر چلے گئے تھے- وہ نہایت خطرناک دور تھا' ستم رانیوں سے بھرپور' ہر طرف خون کی ہولی کھیلی جا رہی تھی- مولانا محمد سلیم بڑی مشکل سے جان بچا کر گھر پہنچے تھے- حالات میں کچھ ٹھہراؤ آیا اور سکون کی ہوا چلی تو وہ رمضان المبارک سے کچھ دن بعد حصول علم کے لیے دہلی پہنچے اور اپنی تعلیم گاہ مدرسہ رحمانیہ گئے- لیکن اب یہ مدرسہ اجڑ چکا تھا اور قال اللہ و قال الرسول کی جو صدائیں طویل عرصے تک وہاں بلند ہوتی رہی تھیں' اب خاموش ہو گئی تھیں- اس کے بعد انھوں نے مدرسہ ریاض العلوم کا قصد کیا' جس میں حضرت مولانا عبدالسلام بستوی فریضہ تدریس انجام دیتے تھے اور انہی نے اس کی تاسیس کی تھی- تمام عمر وہ اس مدرسے کے شیخ الحدیث اور منتظم رہے- مولانا محمد سلیم نے انہی سے تکمیل تعلیم کی-

گاؤں سے کچھ تعلیم حاصل کر کے وصی اللہ صاحب یوسف پور گئے جو ان کے گاؤں سے تین میل کے فاصلے پر ہے- وہاں مدرسہ دارالہدیٰ کے نام سے اچھی خاصی درس گاہ قائم ہے' جس میں اس وقت مرحوم مدرسہ رحمانیہ (دہلی) کے فارغ التحصیل تین بزرگ خدمت تدریس انجام دینے پر مامور تھے' وہ تھے مولانا عبدالرحیم رحمانی' مولانا محمد ابراہیم رحمانی اور مولانا جلال الدین رحمانی --- ان کے علاوہ مولانا عبدالاحد کان پوری اور مولانا محمد ادریس قاسمی کی مسند تدریس آراستہ تھی اور یہ پانچوں علمائے کرام درس و تدریس اور وعظ و تقریر میں بڑی شہرت رکھتے تھے- وصی اللہ صاحب نے اپنی عمر اور قابلیت کے مطابق ان ''پنج تن پاک'' سے خوب فیض حاصل کیا-

جس سال وصی اللہ تیسری جماعت سے فارغ ہوئے تھے' اس سال یوسف پور کے اس مدرسے میں علمائے اہل حدیث کا بہت بڑا اجتماع ہوا تھا- اس اجتماع میں حضرت مولانا نذیر احمد املوی رحمانی بھی تشریف لائے تھے جو اس وقت جامعہ رحمانیہ بنارس میں شیخ الحدیث کے منصب عالی پر فائز تھے- یہ عربی مدارس کے تعلیمی سال کا آخری مہینا تھا یعنی شعبان ---! وصی اللہ اس مدرسے کے ذہین اور لائق طالب علم تھے اور امتحان میں ہر سال

بہت اچھی پوزیشن میں کامیاب ہوتے تھے۔ تیسری جماعت میں مدرسے کے تمام طلبا میں اوّل درجے میں کامیاب ہوئے تھے۔ عمر صرف چودہ سال تھی اور اپنے رفقائے جماعت سے کم سن تھے۔ ان کے لائق احترام استاد مولانا جلال الدین رحمانی نے ان کو مولانا نذیر احمد رحمانی کی خدمت میں پیش کیا اور فرمایا یہ لڑکا ذہانت وقابلیت میں تمام لڑکوں سے آگے ہے اور تحصیل علم کا بے حد شائق ہے۔ آپ اسے جامعہ رحمانیہ (بنارس) میں داخل فرمالیں گے تو آپ کی نگرانی میں اس کے جوہر کھلیں گے اور یہ تیزی کے ساتھ حصول علم کی منزلیں طے کرے گا۔

مولانا نذیر احمد رحمانی نے فرمایا اس کی عمر بہت کم ہے جامعہ رحمانیہ کے بجائے کچھ عرصہ اسے یہیں رہنا چاہیے۔ لیکن مولانا جلال الدین نے اصرار کیا کہ اسے ضرور جامعہ رحمانیہ میں داخل کیا جائے۔ آپ اس کا امتحان لیں گے تو اس کی عمر سے اسے کہیں زیادہ لائق پائیں گے۔ چنانچہ مولانا نے ان سے چند باتیں پوچھیں تو پتا چلا کہ یہ کم سن لڑکا واقعی تیز ہے اور جامعہ کے معیار کے عین مطابق---! حکم ہوا فلاں تاریخ تک بنارس پہنچ جاؤ۔ یہ ان پر مولانا نذیر احمد رحمانی کی انتہائی شفقت تھی۔

جامعہ رحمانیہ (بنارس) میں وہ ۱۹۶۳ میں داخل ہوئے اور ۱۹۶۶ تک وہاں تعلیم حاصل کرتے رہے۔ متعدد اساتذہ جامعہ میں فرائض تدریس انجام دیتے تھے۔ مولانا نذیر احمد رحمانی انتہائی جماعتوں کے طلبا کو پڑھاتے تھے، لیکن اب انھوں نے وصی اللہ کو بھی اپنے حلقۂ شاگردی میں شامل فرمالیا اور انھیں کتاب نزہۃ النظر پڑھانا شروع کی۔ لیکن اس بات کا وصی اللہ کو افسوس ہے کہ یہ پوری کتاب مولانا رحمانی سے پڑھی نہ جاسکی۔ مولانا بیمار ہوگئے اور انھیں ہسپتال داخل کرانا پڑا۔ پھر ۳۰ مئی ۱۹۶۵ کو ان کا انتقال ہوگیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

جامعہ رحمانیہ (بنارس) میں انھوں نے مولانا محمد ادریس آزاد رحمانی، مولانا عبدالواحد رحمانی، مولانا محمد یوسف بہرائچی اور مولانا محمد عابد رحمانی سے اکتساب علم کیا۔

بنارس میں حصول تعلیم کے زمانے میں وہاں جامعہ سلفیہ (یعنی مرکزی دارالعلوم) کی

تاسیس اور اس کے افتتاح کی تقریب منعقد ہوئی- اس موقعے پر ایک اچھی خاصی کانفرنس کا انعقاد عمل میں آیا' جس میں ہندوستان کے علما وزعما کے علاوہ کئی اسلامی ملکوں کے نمائندے شریک ہوئے- مدینہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر حضرت شیخ علامہ عبدالعزیز بن باز رحمۃ اللہ علیہ کو بھی دعوت شرکت دی گئی تھی- انھوں نے اپنے نمائندے کی حیثیت سے شیخ عبدالقادر شیبۃ الحمد کو بنارس بھیجا- سعودی عرب کی طرف سے اس وقت ہندوستان میں جناب احمد الشبیلی عہدۂ سفارت پر فائز تھے' وہ بھی ان کے ساتھ بنارس گئے تھے-

حضرت علامہ عبدالعزیز بن باز نے اپنے نمائندے شیخ عبدالقادر کو خاص طور سے ہدایت کی تھی کہ جامعہ سلفیہ بنارس کے ارباب انتظام سے یہ بات ضرور کریں کہ وہاں سے مدینہ یونیورسٹی میں تعلیم کے لیے چند طلبا بھیجے جائیں- چنانچہ شیخ عبدالقادر نے یہ بات جامعہ سلفیہ کے منتظمین سے بھی کی اور جامعہ رحمانیہ کے ارباب اہتمام سے بھی---! جامعہ رحمانیہ کے ذمہ دار حضرات نے مدینہ یونیورسٹی کے لیے چار طلبا کا انتخاب کیا' وہ تھے' وصی اللہ' عبدالحمید رحمانی' عبدالسلام مدنی اور عبدالرحمن بستوی- ان چاروں کو شیخ عبدالقادر کی قیام گاہ پر لے جایا گیا- انھوں نے ان کا انٹرویو لیا اور داخلے کا وعدہ کر کے چلے گئے- اس طرح اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے مدینہ منورہ جانے کی راہ ہموار فرما دی-

مدینہ یونیورسٹی (یعنی جامعہ اسلامیہ مدینہ) میں تعلیم وقیام کا زمانہ یقیناً وصی اللہ صاحب کے لیے نہایت مسرت وانبساط کا زمانہ ہوگا- نبی ﷺ کا بلدۂ طیبہ' مہبط وحی' دنیا کے اوّلین مسلمانوں کا مہجر' بے شمار صحابہ وتابعین کا مستقر' لاتعداد ائمہ ہدیٰ اور صلحا واتقیا کا مدفن' علمائے دین اور مشائخ کرام کا مرکز---!

مدینہ یونیورسٹی میں اس وقت جو اساتذہ کرام خدمت تدریس سرانجام دیتے تھے' ان میں مولانا عبدالغفار حسن' شیخ عبدالمحسن العباد' شیخ صالح العراقی' شیخ ابوبکر الجزائری' شیخ حماد انصاری اور شیخ عبداللطیف کے اسمائے گرامی شامل ہیں- ۱۹۶۷ میں علامہ ڈاکٹر تقی الدین ہلالی مراکشی کی خدمات بھی یونیورسٹی کے لیے حاصل کر لی گئی تھیں-

ان دنوں جامعہ اسلامیہ کے پاکستانی طلبا میں علامہ احسان الٰہی ظہیر' حافظ ثناء اللہ

مدنی' مولانا صلاح الدین لکھوی' ڈاکٹر حسن راشد اور ڈاکٹر صہیب حسن بن مولانا عبدالغفار حسن شامل تھے- ہندوستانی طلبا میں سے مولانا عبدالحمید رحمانی' مولانا عبدالسلام مدنی' مولانا عبدالرحمٰن بستوی' مولانا عطاء الرحمٰن مدنی اور مولانا نذیر احمد رحمانی کے فرزند گرامی مولانا بلال احمد کے نام لائق تذکرہ ہیں- ان طلبا میں سے بعض وصی اللہ صاحب کے ہم جماعت تھے اور بعض ایک جماعت آگے یا پیچھے تھے- فارغ التحصیل ہونے کے بعد ان حضرات نے تعلیم و تدریس اور تقریر و تبلیغ کے مختلف شعبوں میں اپنے اپنے انداز میں بہت تگ و دو کی- ان میں سے بعض حضرات وفات پا چکے ہیں اور بعض اپنے ملک یا بیرون ملک میں خدمت دین میں مصروف ہیں- دعا ہے اللہ تعالیٰ وفات پانے والوں کو جنت الفردوس عطا فرمائے اور زندوں کو صحت و عافیت سے رکھے اور ان کے لیے اپنے دین کی خدمت کے زیادہ سے زیادہ مواقع فراہم کرے-

اوپر مدینہ یونیورسٹی کے جن عالی مرتبت اساتذہ کا ذکر کیا گیا ہے' وصی اللہ صاحب نے ان سے خوب استفادہ کیا- انھوں نے بھی لائق شاگرد کو اپنی شفقتوں کا مستحق ٹھہرایا-

علامہ حماد انصاری سے ان کو خاص طور سے قرب رہا- وہ اکثر اپنے ہم جماعت طلبا کے ساتھ نماز عصر کے بعد ان کے مکان پر چلے جاتے- جامعہ کے بعض جلیل القدر اساتذہ بھی اس وقت وہاں تشریف لے جاتے تھے- پھر خوب علمی گفتگو ہوتی' جس سے حاضرین مجلس مستفید ہوتے- علامہ حماد انصاری نہایت وسیع المطالعہ عالم تھے' ان کی یہ خصوصیت تھی کہ وہ اگرچہ کسی اہم کام میں مصروف ہوتے' ان کی خدمت میں آ کر ان سے کوئی مسئلہ پوچھا جاتا تو ہر قسم کی مصروفیت چھوڑ کر اس کی طرف متوجہ ہو جاتے اور اس کے سوال کا تسلی بخش جواب دیتے- علمی مجالس میں وہ خوب چہکتے تھے- اللہ نے ان کے ذہن و فکر کو بڑی جلا بخشی تھی-

جامعہ اسلامیہ کی طرف سے ان کو اور شیخ عبداللطیف کو بدایۃ المجتہد کی احادیث کی تخریج کا کام سپرد کیا گیا تھا- وصی اللہ صاحب اور ان کے بعض رفقا کی خوش بختی کہنا چاہیے کہ عالی قدر استاد نے ان کو بھی اس علمی راہ پر لگا دیا- ہونہار طلبا کو اس سے نہایت فائدہ

پہنچا اور ایک ایک حدیث کو تلاش کرنے کے لیے انھیں بہت سی کتابوں کا مطالعہ کرنے کا موقع ملا اور ان میں تحقیق و کاوش کا ذوق پیدا ہوا۔ وصی اللہ صاحب کا بیان ہے کہ انھوں نے استاد مکرم کی رہنمائی سے بے حد فائدہ اٹھایا۔ اسے وہ اللہ تعالیٰ کا خاص کرم قرار دیتے ہیں۔

تخریج سے حدیث و اصول کے مراجع کا پتا چلتا ہے۔ یہ نہایت اہم اور بنیادی کام ہے' لیکن ہمارے اکثر علما و طلبا کو اس کا علم نہیں اور وہ اس ذوق سے محروم ہیں۔ ہمارے ممدوح ڈاکٹر وصی اللہ خوش قسمت ہیں کہ انھیں جامعہ اسلامیہ مدینہ میں اپنے بلند پایہ اساتذہ کی رہنمائی میں اس ذوق سے بہرہ ور ہونے کی سعادت حاصل ہوئی۔

جامعہ اسلامیہ کے نامور استاذ علامہ صالح العلی عراقی سے بھی وصی اللہ صاحب بہت مستفید ہوئے۔ وہ جامعہ کے وائس چانسلر علامہ عبدالعزیز بن باز رحمۃ اللہ علیہ کے ان رفقا میں سے تھے' جنھیں بارگاہ خداوندی سے علوم دینی سے حصہ وافر عطا فرمایا گیا تھا۔ وہ کچھ عرصہ جامعہ سلفیہ بنارس میں بھی استاد کی حیثیت سے قیام فرما رہے تھے اور اہل حدیث طلبا پر بالخصوص شفقت فرماتے تھے۔ ان کی خواہش ہوتی کہ عصر کے بعد یعنی جامعہ کی معمول کی تدریس سے فراغت کے وقت وصی اللہ ان کی قیام گاہ پر آ جایا کریں۔ چنانچہ وہ اس وقت ان کی خدمت میں حاضر ہوتے اور ان سے علمی فوائد حاصل کرتے۔

یہاں یہ بھی سنتے جایئے کہ ہندوستان میں ان کے نام "وصی اللہ" پر کسی عالم دین نے کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔ لیکن جب وہ مدینہ شریف پہنچے اور حضرت علامہ عبدالعزیز بن باز کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنا نام بتایا تو انھوں نے پہلی ملاقات ہی میں نہایت مشفقانہ لہجے میں فرمایا:۔

"نام بدل لو۔"

انھوں نے بے حد احترام کے الفاظ میں عرض کیا:۔

"پاسپورٹ اور مختلف سرٹیفکیٹوں پر یہی نام لکھا ہے' نام بدلنے سے الجھن پیدا ہوگی۔

فرمایا:۔ لا باس

۱۹۶۷ میں دنیائے اسلام کے مشہور عالم ڈاکٹر تقی الدین ہلالی مراکشی حج کے لیے

تشریف لے گئے تھے- ان کی ملاقات مدینہ منورہ میں شیخ عبدالعزیز بن باز سے ہوئی تو وہ ان کی علمی گفتگو اور فراوانیٔ معلومات سے بہت متاثر ہوئے- انھوں نے ان کو جامعہ میں تدریس کی پیش کش کی جو انھوں نے منظور فرمالی- اب وہ جامعہ کے اساتذہ کی جماعت میں شامل تھے' ہندوستان کے طلبا ان کی جامعہ میں تشریف آوری پر خاص طور سے خوش تھے- اس لیے کہ تقسیم ملک سے قبل وہ ندوۃ العلما (لکھنؤ) اور لکھنؤ یونیورسٹی میں کئی سال خدمت تدریس سرانجام دیتے رہے تھے- حضرت مولانا عبدالرحمٰن مبارک پوری رحمۃ اللہ علیہ کے حلقۂ تلامذہ میں بھی رہے تھے اور ان سے بہت متاثر تھے- چونکہ وہ اہل حدیث مسلک کے حامل تھے' اس لیے اہل حدیث علما و طلبا سے انھیں خاص تعلق تھا- وصی اللہ صاحب نے ان سے بہت استفادہ کیا- جامعہ سے تدریس کے بعد وہ گھر تشریف لے جاتے تو طلبا کو اجازت تھی کہ وہ ان سے استفادے کے لیے گھر پر حاضر ہو سکتے ہیں- چنانچہ وصی اللہ صاحب اور ان کے بعض ساتھی عصر کے بعد ان کے گھر چلے جاتے' کسی طالب علم کو وہ کوئی کتاب پڑھاتے' کسی سے کسی بڑے عالم کے نام خط لکھواتے' کسی سے کسی اہم عنوان پر مضمون تحریر کراتے- اس سے طلبا کو بہت علمی فائدہ پہنچتا-

وصی اللہ صاحب کو یہ شرف حاصل ہے کہ وہ پورا ایک سال ڈاکٹر تقی الدین ہلالی کے گھر میں رہے- ان کے ساتھ ہی وہ جامعہ سے جاتے اور ساتھ ہی آتے- گھر کے لیے ضرورت کی چیزیں بھی وہی بازار سے خرید کر لاتے- اس طرح یہ عظیم المرتبت استاد اپنے اس شاگرد پر بہت خوش تھے-

ہلالی صاحب بے حد نفاست پسند تھے- عام استعمال کی جو چیز خریدتے' بہت نفیس خریدتے- وہ صاف ذہن و فکر کے مالک تھے- بقول ڈاکٹر وصی اللہ کے اہل مغرب کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ اتنے نازک مزاج ہوتے ہیں کہ اپنی رائے کے خلاف کوئی بات سننا گوارا نہیں کرتے' کسی نے ان کی ذرہ بھی مخالفت کی' فوراً غصے میں آگئے- لیکن وصی اللہ پر انھوں نے کبھی کسی معاملے میں خفگی کا اظہار نہیں کیا- ہمیشہ انھیں مستحق شفقت سمجھا- بلکہ اگر انھوں نے ان سے کسی کی سفارش کی تو اسے شرف قبول بخشا-

اس کی ایک مثال انھوں نے یہ بیان کی کہ ایک شخص محمد اسلم پاکستانی فوج میں میجر تھے- وہ ملازمت چھوڑ کر صرف حصول علم کے لیے مدینہ منورہ پہنچے اور جامعہ اسلامیہ میں داخلے کے لیے درخواست دی- لیکن داخلہ نہ مل سکا' اس لیے کہ عمر زیادہ تھی' اس سے وہ نہایت پریشان ہوئے- وصی اللہ صاحب سے ان کی ملاقات ہوئی تو اپنی اس مایوسی اور پریشانی کا اظہار کیا-

وصی اللہ صاحب نے اس کا تذکرہ ہلالی صاحب سے کیا اور کہا کہ یہ پاکستانی ہیں اور سلفی المسلک ہیں اور محض مدینہ یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے فوج کا اچھا خاصا منصب چھوڑ کر آئے ہیں- ہلالی صاحب اس سے متاثر ہوئے اور فرمایا آج رات کو وہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر شیخ عبدالعزیز بن باز کے پاس جائیں گے اور ان سے بات کریں گے- چنانچہ انھوں نے اپنی گاڑی میں میجر محمد اسلم اور وصی اللہ صاحب کو بٹھایا اور شیخ بن باز کے گھر پہنچ گئے- شیخ بن باز علمی معاملات میں ہلالی صاحب کی رائے کو ترجیح دیتے اور ان کا انتہائی احترام کرتے تھے- اس موضوع پر انھوں نے شیخ ممدوح سے بات کی تو شیخ نے اسی وقت یونیورسٹی کے اس محکمے کے سربراہ کے نام جو یونیورسٹی میں طلبا کے داخل اور اس سے خارج کرنے کا ذمے دار تھا' خط لکھا کہ میری ذمے داری پر میجر محمد اسلم کو یونیورسٹی میں داخل کرلیا جائے- چنانچہ انھیں شعبۃ اللغہ میں داخل کرلیا گیا- پھر انھوں نے کلیۃ الشریعہ کا نصاب مکمل کیا- اس کے بعد دارالافتا ریاض کی طرف سے مبعوث کی حیثیت سے ضلا دلفا گئے- وہاں انھوں نے اسلام کی تبلیغ کا آغاز کیا اور ان کی تبلیغی مساعی بڑی کامیاب رہیں- چند سال میں پورے ضلا دلفا میں ان کی تبلیغ اور وعظ وارشاد کے اثرات پھیل گئے اور بہت سے لوگ دائرہ اسلام میں داخل ہوگئے- لیکن دشمنان اسلام اس سے نہایت تیغ پا ہوئے اور ان کے درپے آزار ہوگئے- ایک دفعہ وہ تبلیغ کے لیے کسی دوسرے شہر میں جا رہے تھے کہ اچانک تین آدمی آئے اور انھیں گولیوں کا نشانہ بنالیا- وہ اسی وقت اللہ کو پیارے ہوگئے- اناللہ وانا الیہ راجعون:-

بات ڈاکٹر تقی الدین ہلالی مراکشی کی ہورہی تھی- وہ اپنے عہد کی عظیم شخصیت تھے اور

علما وطلبا کے نہایت ہم درد و بہی خواہ ---! ہمارے دوست جناب وصی اللہ صاحب کے
بالخصوص کرم فرماتے تھے۔ مصری علما سے بھی ان کے گہرے مراسم تھے اور بہت سال قبل وہ کافی
عرصہ مصر میں سلفیت واہل حدیثیت کی تبلیغ کرتے رہے تھے، جس سے متاثر ہو کر مصر کے
متعدد دیہات وقصبات میں یہ مسلک پھیلا اور اس علاقے کے لوگ اس پر عمل کرنے لگے۔
ملایا اور بعض دوسرے علاقوں کے لوگ بھی ان سے بہت متاثر ہوئے اور ان کی تبلیغ
اشاعت دین سے اثر پذیر ہو کر انھوں نے مسلک اہل حدیث سے وابستگی اختیار کی۔

جامعہ اسلامیہ کی تدریس کے زمانے میں بھی وہ مصر گئے اور اس سفر میں ازراہ کر
اپنے ہونہار شاگرد وصی اللہ کو بھی ساتھ لے گئے۔ مصر کے علاوہ ملاوی اور بعض
دیگر علاقوں کے اہل علم کے اصرار پر وہ وہاں بھی گئے۔ یہ ان کا خالص مطالعاتی دورہ تھ
جس میں وصی اللہ ان کے ہم سفر تھے۔

ڈاکٹر تقی الدین ہلالی کا ذکر آیا ہے تو اس موقعے پر یہ بھی عرض کر دیں کہ وہ ستمبر ۵۱
میں پاکستان تشریف لائے تھے۔ ان کے صاحب زادے شکیب ان کے ساتھ تھے، جن
عمر اس وقت پندرہ سال تھی۔ ان کا مقصد یہاں کے اہل حدیث علما وزعما سے ملاقات کر
تھا۔ چنانچہ وہ راولپنڈی، گوجرانوالہ، لاہور، ملتان اور کراچی وغیرہ شہروں میں گئے اور وہا
کے اہل حدیث اصحاب علم سے ملاقات کی۔ ان دنوں ان کے چھوٹے بھائی جناب
المراکشی لاہور کے اورینٹل کالج میں عربی کے پروفیسر تھے اور ہلالی صاحب کا قیام انہی
ہاں تھا۔ مرکزی جمعیت اہل حدیث کے دفتر میں ان کے اعزاز میں عصرانے کا اہتمام کیا
تھا، جس میں بہت سے حضرات کو دعوت شرکت دی گئی تھی اور اس دور کی جمعیت کے ص
مولانا سید محمد داؤد غزنوی نے نہایت شان دار الفاظ میں ان کا تعارف کرایا تھا۔ میں
وقت اخبار ''الاعتصام'' سے منسلک تھا۔ میں نے ان سے ایک طویل انٹرویو کیا تھ
ستمبر ۱۹۵۱ کے ''الاعتصام'' کے دو شماروں میں چھپا تھا۔

یہ ڈاکٹر وصی اللہ صاحب کے تذکرے میں ضمناً ہلالی صاحب کا ذکر آیا ہے۔ میر
پر ان شاء اللہ مستقل مضمون لکھوں گا، جو میری یادداشتوں کے کسی مجموعے میں شائع ہوگا

یہاں دراصل یہ عرض کرنا مقصود ہے کہ ڈاکٹر وصی اللہ مدینہ یونیورسٹی میں داخلے کے بعد جب پہلی دفعہ (جیسا کہ گزشتہ سطور میں بتایا گیا) علامہ شیخ عبدالعزیز بن باز کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے تو انھوں نے ان کے نام سے مطلع ہو کر فرمایا تھا: ”نام بدل لو“۔

ڈاکٹر صاحب ممدوح نے جواب میں کہا تھا کہ پاسپورٹ اور دیگر کاغذات میں یہی نام درج ہے‘ نام بدلا گیا تو مشکلات پیش آنے کا اندیشہ ہے۔

اس سے کچھ عرصہ بعد وہ ڈاکٹر تقی الدین ہلالی کی معیت میں حضرت علامہ کی خدمت میں گئے تو انھوں نے پھر فرمایا:۔

”بہتر یہ ہے کہ نام بدل لو۔“

اس پر ڈاکٹر ہلالی نے ان سے فرمایا: جناب محترم! اس نام میں کوئی قابل اعتراض بات نہیں ہے۔ جس طرح ہم سب عباد اللہ ہیں اور ایک شخص اپنا نام عبداللہ رکھ لیتا ہے‘ اسی طرح ہم سب بحیثیت مجموعی اوصیاء اللہ ہیں‘ تو ایک فرد ”وصی اللہ“ ہوگا اور یہ بالکل ٹھیک ہو گا‘ جیسا کہ قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے۔

﴿وَلَقَدْ وَصَّيْنَا الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتَابَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَ اِيَّاكُمْ اَنِ اتَّقُوا اللّٰهَ﴾

(النساء: ۱۳۱)

(اور ہم نے تم سے پہلے لوگوں کو جنھیں کتاب دی گئی اور خود تمھیں حکم دیا ہے کہ اللہ سے ڈرتے رہو)

حضرت شیخ بن باز نے یہ آیت سنی تو مسکرا کر خاموش ہو گئے۔ اس کے بعد وہ تقریباً پچیس سال زندہ رہے اور اس طویل مدت میں ڈاکٹر وصی اللہ صاحب کی ان سے بہت سی ملاقاتیں رہیں‘ لیکن انھوں نے کبھی اس نام پر اعتراض نہیں فرمایا‘ بلکہ ہمیشہ اظہار کرم کیا اور مشفقانہ انداز میں ان سے حال احوال پوچھے اور دعائیں دیں۔

عربی زبان میں و ص ی (وصی) کے معنے حکم دینے اور عہد و پیمان کے ہیں۔ قرآن مجید میں یہ لفظ مختلف صیغ و سیاق میں ۳۴/۳۵ مرتبہ آیا ہے۔ مجھے ان سے مکہ مکرمہ میں یہ نام

سن کر تعجب انگیز مسرت ہوئی تھی' اس لیے کہ پہلی دفعہ یہ خوب صورت نام سنا تھا- یہ نام متداول نہیں ہے اور ہمارے کان اس سے آشنا نہیں ہیں' اس لیے اس میں کچھ اجنبیت اور غرابت سی پائی جاتی ہے' لیکن نام بہت اچھا ہے- اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر وصی اللہ کے اکابر علم و ادب سے شناسا تھے-

ڈاکٹر وصی اللہ کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ انھوں نے عراق کے ایک بہت بڑے عالم دین اور ممتاز ادیب و شاعر علامہ بہجۃ اللہ کو اپنا تعارف کرایا اور نام بتایا اور ساتھ ہی سوال کیا کہ اس نام کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے---؟

جواب دیا: بالکل ٹھیک نام ہے- اس میں کوئی قابل اعتراض بات نہیں ہے-

مدینہ منورہ کے دوران قیام میں جن اساتذہ کرام اور ارباب علم سے وصی اللہ صاحب کا قرب رہا' ان میں علامہ ڈاکٹر ربیع ہادی بھی شامل ہیں- اب بھی ان سے بہ دستور سلسلہ مراسم قائم ہے اور ان کی خدمت میں انھیں حاضری کے مواقع ملتے رہتے ہیں-

یونیورسٹی میں جن اساتذہ سے انھوں نے استفادہ کیا' ان میں مصری اساتذہ بھی شامل ہیں-

مدینہ یونیورسٹی سے فراغت کے بعد وصی اللہ صاحب دراسات علیا کے لیے مکہ مکرمہ پہنچے- اسی سال وہاں غیر سعودی طلبا کے داخلے کا اعلان ہوا تھا- انٹرویو میں شریک ہوئے اور کامیاب رہے- داخلہ مل گیا- ایم اے اور پی ایچ ڈی حدیث شریف میں یہیں سے کیا- پی- ایچ- ڈی سے وہ ۱۴۰۱ھ (۱۹۸۱) میں فارغ ہوئے تھے- اسی سال مکہ مکرمہ میں جامعہ ام القریٰ قائم ہوئی- اس سے قبل مکہ مکرمہ کی درس گاہیں (دراسات علیا' کلیۃ الشرعیہ اور کلیۃ التربیہ) جدہ کی جامعہ ملک عبدالعزیز کے تابع تھیں-

پی' ایچ' ڈی کی تیاری کے زمانے میں ان کو حرم مکی میں تدریس کا موقع ملا- پی' ایچ' ڈی کرنے کے بعد کئی سال وہیں خدمت تدریس میں معروف رہے- پھر استاد کی حیثیت سے جامعہ ام القریٰ میں تقرر عمل میں آیا اور اس وقت وہیں ''قسم الکتاب والسنہ'' میں حدیث کے موضوعات کی تدریس پر مامور ہیں-

تصنیف وتالیف اور ترجمے کا عمدہ ذوق رکھتے ہیں۔ انھوں نے بعض کتابیں تصنیف کی ہیں، بعض کی تحقیق وتخریج کی ہے اور بعض اردو کتابوں کے عربی ترجمے کیے اور ان پر حواشی لکھے ہیں۔ تفصیل اس طرح ہے۔

۱۔ الضعفاء والمتروکون والمجهولون ورواياتهم فی سنن النسائی:۔ یہ ان کا ایم اے کا مقالہ ہے۔

۲۔ تحقیق کتاب فضائل الصحابة لامام احمد:۔ یہ پی۔ ایچ۔ ڈی کا مقالہ ہے۔

۳۔ المسجد الحرام تاریخه واحکامه:۔ یہ کتاب بیت اللہ شریف اور مکہ مکرمہ کی تاریخ واحکام سے متعلق ہے۔

۴۔ تحقیق الکلام فی وجوب القرأة خلف الامام:۔ یہ حضرت مولانا عبدالرحمٰن مبارک پوری رحمۃ اللہ علیہ کی اردو کتاب کا عربی ترجمہ ہے۔ اس پر تحشیہ بھی لکھا۔

۵۔ المصافحة باليد اليمنٰى:۔ اس کا ترجمہ بھی کیا اور حاشیہ بھی لکھا۔

۶۔ العلل ومعرفة الرجال:۔ یہ کتاب چار جلدوں پر مشتمل ہے اور امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کی تصنیف ہے۔ ڈاکٹر وصی اللہ نے اس کی تحقیق وتخریج کی ہے۔

۷۔ محجرالدم فیمن لدم فیمن تکلم فیه الامام احمد بمدح اوذم:۔ یہ دسویں صدی ہجری کے ایک عالم یوسف بن عبدالہادی کی تصنیف ہے، جس کی ڈاکٹر صاحب ممدوح نے تحقیق کی ہے۔

یہ سب کتابیں چھپ چکی ہیں اور حلقہ اہل علم میں متداول ہیں۔

۸۔ اتحاف المبرة:۔ یہ حافظ ابن حجر عسقلانی کی تصنیف ہے۔ مرکز السنه والسيرة (مدینہ منورہ) کی درخواست پر ڈاکٹر صاحب نے اس کی بارھویں جلد کی تحقیق کی ہے۔ اسی مرکز کی طرف سے اسے شائع کیا گیا ہے۔

۹۔ لسان المیزان:۔ یہ بھی حافظ ابن حجر عسقلانی کی تصنیف ہے۔ اس کی پانچویں جلد کی تحقیق مرکز السنه والسيرة (مدینہ منورہ) کی طرف سے کی گئی۔ طبع ہو گئی ہے۔

ان تراجم وحواشی اور تحقیق وتدقیق کے علاوہ بعض اور علمی کام بھی انھوں نے شرو
کررکھے ہیں- دعا ہے اللہ تعالیٰ انھیں ان تحقیقی وتصنیفی کاموں کی تکمیل کی تو
عطا فرمائے-

وہ جامعہ ام القریٰ کے شعبۃ الکتاب والسنہ میں ہمہ وقتی استاد ہیں- دوسال جامعہ
مجلس علمی کے رکن بھی رہے اور دوسال امام کعبۃ اللہ شیخ محمد بن عبداللہ السبیل کے مش
رہے- یہ سب نہایت اہم منصب ہیں، جن پر وہ فائز رہے ہیں-

علاوہ ازیں بیت اللہ شریف میں نماز مغرب کے بعد ان کے درس کا سلسلہ جار
ہے- اس کی صورت یہ ہے کہ دو دن صحیح بخاری کا درس ہوتا ہے، ایک دن نیل الاوطار کا ا
ایک دن مصطلح حدیث کا---!

ڈاکٹر وصی اللہ صاحب کی ولادت ۱۹۴۸ میں ہوئی- یہ سطور جولائی ۲۰۰۰ء کو لک
جارہی ہیں- اس حساب سے وہ تقریباً ۵۲ سال کی عمر کو پہنچ گئے ہیں- اس اثنا میں انھوں
تصنیفی وتدریسی میدان میں بڑی محنت وکاوش سے کام لیا ہے- وہ خوش قسمت ہی
جنھوں نے مدینہ منورہ اور مکہ مکرمہ کی مبارک سرزمین میں تحصیل علم کی اور دنیائے اسلام ک
جلیل لقدر اساتذہ سے اخذ فیض کیا- وہ اب بھی اسی ارض مقدس میں اقامت فرما ہیں ا
کتاب وسنت کی ترویج واشاعت میں سرگرم عمل ہیں-

دعا ہے اللہ تعالیٰ انھیں زیادہ سے زیادہ خدمت دین کے مواقع میسر فرمائے اور ان ک
حسنات وخیرات کی حدود وسیع سے وسیع تر ہوں- آمین-

محمد عزیر شمس

(ولادت ۱۹۵۷ء)

۱۹۸۰ یا اس سے کچھ پس و پیش کی بات ہے' گرمیوں کے دن تھے کہ ادارہ ثقافت اسلامیہ میں ایک نوجوان آئے' میانہ قد' چھریرا بدن' سفید پاجامہ اور قمیص پہنے ہوئے- لبوں پر مسکراہٹ' دیکھنے میں متحرک' سر ننگا اور بڑے بڑے بال' عمل مقراض سے محفوظ ہلکی سی کالی داڑھی جو اس عمر میں ہونی چاہیے- مجھے اور مولانا محمد حنیف ندوی سے نہایت احترام سے ملے اور وہ ہم دنوں سے ملاقات کے لیے ادارے آئے تھے- انھوں نے بتایا کہ ان کا نام محمد عزیر شمس ہے' ہندوستان کے صوبہ بہار کے ایک گاؤں کے رہنے والے ہیں- اپنے ملک کے بعض مدارس سے نصابی تعلیم مکمل کر کے مدینہ یونیورسٹی میں داخلہ لیا ہے' آج کل وہیں تعلیم حاصل کر رہے ہیں- اب پاکستان کے اہل علم سے ملاقات کی غرض سے یہاں آئے ہیں اور بعض حضرات سے مل چکے ہیں-

بڑی روانی سے صاف لہجے میں بولتے اور مختلف فنون کی کتابوں اور رجال سے متعلق وثوق سے اظہارِ مدعا کرتے تھے- ہندوستان کے بعض اکابر اہل حدیث کا انھوں نے نہایت احترام سے ذکر کیا اور اپنے متعلق کہا کہ میں برصغیر کے علما کے بارے میں لکھنا چاہتا ہوں اور کچھ لکھ بھی لیا ہے-

ادارہ ثقافت اسلامیہ کی لائبریری دیکھی اور مطبوعات ادارہ کی فہرست منگوا کر کئی کتابیں خریدیں اور پھر مجھے ہمارے ساتھ کے تصنیفی ادارے ''مجلس ترقی اردو'' میں لے گئے' اس کی بھی انھوں نے بہت سی کتابیں خریدیں- بتایا کہ وہ لاہور کے متعدد اشاعتی اداروں کے چکر لگا چکے اور ان کی بعض مطبوعات خرید چکے ہیں' مزید خریدنا چاہتے ہیں- انھوں نے کہا کہ یہ کتابیں وہ اپنے وطن ہندوستان لے جائیں گے اور اپنے آبائی کتب خانے میں

محفوظ کر دیں گے۔ ان کے والد گرامی مولانا شمس الحق سلفی' دیار ہند کے وہ اہل حدیث عالم ہیں جو خدمت تدریس بھی انجام دیتے ہیں اور وعظ و تقریر میں بھی شہرت رکھتے ہیں اور فتویٰ نویسی میں بھی ان کا ایک مقام ہے۔

محمد عزیر شمس کافی دیر ہمارے پاس رہے۔ پھر مولانا عطاء اللہ حنیف مرحوم و مغفور کی خدمت میں تشریف لے گئے۔ مجھے یاد پڑتا ہے' لاہور میں ان کا قیام انہی کے ہاں رہا تھا۔ وہ ان کی علمیت' ان کے کثرتِ مطالعہ' اصحاب الحدیث کے بارے میں ان کی فراوانی معلومات' ان کے کتب خانے اور کتابوں سے متعلق ان کی دلچسپی سے وہ بہت متاثر تھے' اور بلاشبہ اس سلسلے میں حضرت مولانا عطاء اللہ حنیف اپنے عہد کے علمائے کرام میں ممتاز حیثیت رکھتے تھے۔

عزیر صاحب کے جانے سے کچھ عرصے بعد ہندوستان کے ایک اور اہل علم تشریف لائے۔ انھوں نے بتایا کہ عزیر صاحب نے آپ کا تذکرہ کیا تھا (انھوں نے تو یہ بھی کہا تھا کہ "بہت اچھے الفاظ میں تذکرہ کیا تھا" لیکن مجھے اپنے متعلق یہ الفاظ لکھنے سے حجاب سا ہوا' اس لیے نہیں لکھے) بقول ان کے عزیز شمس صاحب نے انھیں تاکید کی تھی کہ ادارہ ثقافت اسلامیہ میں ہم سے ضرور ملاقات کی جائے۔

دو یا تین مرتبہ عزیر صاحب لاہور آئے اور ہم سے ملے۔ یہ ان کی محبت تھی' ورنہ کس کے پاس وقت پڑا ہے کہ محض کسی سے ملاقات کے لیے ادھر ادھر بھاگتا پھرے۔

۲۰۰۰ء کی ۲۲ فروری کو بہ سلسلہ حج یہ فقیر مکہ مکرمہ پہنچا تو عزیز القدر قاری عنایت اللہ نے محمد عزیر شمس صاحب کو میرے آنے کی اطلاع دی اور وہ ۲۴ فروری کو دن کے دس بجے کے قریب بیت اللہ شریف میں مجھے ملے۔ میں اس وقت باب بلال میں مولانا محمد حنیف ملتانی کے پاس بیٹھا تھا۔ بہت سے دوست وہاں موجود تھے' جن میں سے بعض کا تعلق پاکستان سے اور بعض کا ہندوستان سے تھا۔

یہاں یہ یاد رہے کہ مولانا محمد حنیف ملتانی کم و بیش تیس سال سے مکہ مکرمہ میں قیام پذیر ہیں اور روزانہ بیت اللہ میں تشریف لاتے اور باب بلال میں بیٹھتے ہیں۔ پاکستان اور

ہندوستان کے بہت سے اہل حدیث حجاج کرام (بالخصوص علمائے کرام) وہاں آجاتے ہیں اور باہم ملاقات ہوجاتی ہے۔کسی زمانے میں حافظ فتح محمد (حافظ فتحی) کی نشست وہاں ہوتی تھی۔

عزیر صاحب دو دفعہ وہاں آئے اور اپنی علمی سرگرمیوں کے متعلق بتایا۔ وہ خالص ہندوستانی لباس (پاجامہ اور کرتا) پہنے ہوئے تھے' وہاں وہ یہی لباس پہنتے ہیں۔

اب آیئے' یہ معلوم کرنے کی کوشش کریں کہ عزیر صاحب کون ہیں' ان کا علمی مرتبہ کیا ہے اور مکہ مکرمہ میں کیا کرتے ہیں؟

وہ ۱۹۵۷ء کے آغاز میں موضع بنکوا' ضلع مدھونبی (صوبہ بہار' ہندوستان) میں پیدا ہوئے۔والد کا اسم گرامی مولانا شمس الحق اور دادا کا مولانا رضاء اللہ تھا جو اپنے علاقے کے ممتاز علمائے دین میں سے تھے۔(مولانا شمس الحق کے متعلق اسی کتاب میں مضمون مندرج ہے) والدین نے بچے کا نام ''عزیر'' رکھا تھا' لیکن انھوں نے بڑے ہو کر عزیز کے ساتھ ''محمد'' کا سابقہ اور ''شمس'' کا لاحقہ لگایا اور اسے ''محمد عزیر شمس'' بنا لیا۔مگر لوگ انھیں عزیر ہی لکھتے اور کہتے ہیں۔بقول ان کے نام کے سلسلے میں ان کا معاملہ مشہور محدث علامہ خطابی کا سا ہے۔ابن خلکان نے ان کے حالات میں لکھا ہے کہ ان کا نام ''حمد'' تھا۔لیکن لوگ انھیں ''احمد'' کہتے تھے۔بہت تصحیح کی اور بتایا کہ ان کا نام احمد نہیں ''حمد'' ہے۔لیکن احمد اس قدر عوام و خواص کی زبان پر چڑھ گیا تھا کہ حمد کی طرف کسی کا دھیان نہیں جاتا تھا۔آخر تھک ہار کر خاموش ہوگئے اور لوگ انھیں احمد' احمد کہتے رہے۔

محمد عزیر شمس کی ابتدائی تعلیم درجہ پنجم' پھر درجہ فارسی تک مدرسہ فیض عام (مئو) میں ہوئی۔عربی تعلیم ۱۹۶۶ میں دارالعلوم احمدیہ سلفیہ (دربھنگہ' بہار) میں شروع ہوئی۔عربی کی دوسری جماعت کی تعلیم ''دارالحدیث'' (بیل ڈانگہ' ضلع مرشد آباذ بنگال) میں حاصل کی۔تیسری اور چوتھی جماعت میں وہ مدرسہ رحمانیہ (بنارس) میں تھے۔۱۹۷۰ میں کو جامعہ سلفیہ (بنارس) میں داخلہ لیا۔وہاں کے نصاب کے مطابق عالمیت کے چار سال اور فضیلت کے دو سال' یعنی چھ سال تعلیم حاصل کر کے ۱۹۷۶ میں رسمی طور پر فارغ ہوگئے۔اس طرح

تقریباً تمام متداولہ علوم ان مدارس میں پڑھ لیے- قدیم کے ساتھ کچھ جدید کی آمیزش سے انگریزی بھی لازمی مضمون کے طور پر پڑھی-

جامعہ سلفیہ (بنارس) سے سند فراغ حاصل کرنے کے بعد ڈیڑھ سال سیر و سیاحت کرتے رہے- یعنی دہلی، پٹنہ، لکھنؤ، علی گڑھ، کلکتہ وغیرہ شہروں کی مختلف لائبریریاں اور یونیورسٹیاں دیکھیں، بہت سے علما و ادبا اور محققین و مصنفین سے ملاقاتیں کیں، متعدد تنظیموں، جماعتوں اور تحریکوں کا قریب سے مشاہدہ کیا- کچھ دن پٹنہ کی مشہور لائبریری میں جو "خدا بخش لائبریری" کے نام سے موسوم ہے، عربی مخطوطات کی فہرست سازی کا کام بھی کیا جس کی وجہ سے ایک نئے اور وسیع میدان سے شناسائی ہوئی- پتا چلا کہ ہمارے اسلاف کی جو کتابیں مطبوعہ شکل میں دست یاب ہیں، ان سے کئی گنا زیادہ تعداد میں ذخیرہ قلمی شکل میں موجود ہے، جو دنیا کی مختلف لائبریریوں میں بکھرا پڑا ہے- مخطوطات کے ماہرین ان میں سے اہم اور نادر و نایاب کتابیں مختلف نسخوں کی مدد سے ایڈٹ کر کے شائع کرتے رہتے ہیں، جن سے ہمیں اپنے ماضی کی تاریخ اور دور گزشتہ کی تہذیب سے مزید واقفیت حاصل ہوتی ہے اور علمی اعتبار سے مستقبل کو سنوارنے میں مدد مل سکتی ہے، بشرطیکہ ہم ان سے مستفید ہونے کی صلاحیت رکھتے ہوں اور غیروں کے پیش کیے ہوئے خلاصوں اور ترجموں پر قانع نہ رہتے ہوں-

سیر و سیاحت ہی کے دوران انھیں جامعہ اسلامیہ (مدینہ منورہ) میں اعلیٰ تعلیم کے لیے داخلے کی منظوری کی اطلاع آ گئی اور وہ فروری ۱۹۷۸ء میں وہاں پہنچ گئے- وہاں چار سال عربی زبان و ادب میں تخصیص کی تعلیم حاصل کی اور بی- اے کیا--- ایم- اے (عربی) کے لیے جامعہ اسلامیہ (مدینہ منورہ) اور جامعہ ام القری (مکہ مکرمہ) دونوں یونیورسٹیوں میں داخلہ منظور ہو گیا، لیکن انھوں نے مکہ مکرمہ کو ترجیح دی اور جامعہ ام القریٰ سے چار سال کا نصاب مکمل کر کے ایم- اے کی سند حاصل کی- تحقیقی مقالے کا موضوع تھا "حالی کی تنقید اور شعری پر عربی کے اثرات-"

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ مدینہ یونیورسٹی میں بھی اور مکہ مکرمہ کی ام القری

یونیورسٹی میں بھی ہر سال انھوں نے جماعت میں اوّل پوزیشن حاصل کی اور درجۂ امتیاز کے حق دار قرار پائے۔

ایم۔اے کے بعد ام القریٰ یونیورسٹی ہی میں پی ایچ ڈی میں رجسٹریشن کرائی' مقالے کا عنوان تھا" ہندوستان میں عربی شاعری---تنقیدی مطالعہ۔" مقالہ مکمل کر کے اسے جمع کرانا چاہتے تھے کہ نگران (سپروائزر یا مشرف) سے کچھ اختلافات کی بنا پر اسے جمع نہ کرا سکے۔ اس سلسلے میں جو رکاوٹ پیدا ہو گئی تھی' وہ دور نہ ہو سکی۔ بقول ان کے خود انھوں نے بھی رکاوٹ دور کرنے کے لیے زیادہ کوشش نہیں کی۔

آخر ہوا یہ کہ جامعہ ام القریٰ سے واپس وطن آ گئے۔ کچھ دنوں کے بعد اللہ تعالیٰ نے پھر مکہ مکرمہ جانے کی صورت پیدا فرما دی۔ چنانچہ اس وقت وہیں ہیں اور تصنیف و تالیف میں مشغول ہیں۔

پڑھنے لکھنے کے سوا انھوں نے زندگی میں اب تک کوئی کام نہیں کیا۔

مدارس و جامعات میں حصول علم کے تذکرے کے بعد اب چند الفاظ میں ان موضوعات پر لکھنے اور تحقیق کرنے کی داستان سنیے' جن سے وہ دلچسپی رکھتے ہیں۔

گھر کا ماحول بھی علمی تھا اور خود ان کا اپنا شوق بھی تھا کہ چھوٹی عمر ہی میں مطالعے کی عادت پڑ گئی تھی۔ چنانچہ مختلف علوم وفنون سے متعلق عربی' اردو' فارسی اور انگریزی کی بہت سی کتابیں پڑھیں اور ان سے بہت کچھ حاصل کیا۔ جامعہ سلفیہ (بنارس) کی طالب علمی کے زمانے میں مولانا مسعود عالم ندوی کی کتابوں کا مطالعہ کیا تو اس کا اثر یہ ہوا کہ ذہن عربی اور اردو میں سوانح نگاری کی طرف مائل ہوا۔ چنانچہ علامہ شمس الحق عظیم آبادی کی حیات اور خدمت پر ایک مضمون لکھا جو ۱۹۷۵ میں "معارف" (اعظم گڑھ) کے دو شماروں میں چھپا۔ یہ ان کا پہلا مضمون تھا جو کسی رسالے میں شائع ہوا۔

علامہ ناصر الدین البانی دنیائے اسلام کے ممتاز عالم و محقق تھے۔ ان کی جو تصنیفات اس وقت ہندوستان پہنچ چکی تھیں' ان کا مطالعہ کیا' جس کے نتیجے میں علم حدیث سے مزید تعلق پیدا ہوا اور طبیعت میں فقہی مسائل کی تحقیق کا جذبہ ابھرا۔ بلکہ کہنا چاہیے کہ احادیث کی

تلاش، چھان بین اور تخریج کے سلسلے میں علامہ ممدوح کی کتابیں مشعل راہ ثابت ہوئیں اور ان سے زیادہ سے زیادہ استفادے کی کوشش کی۔ ان کتابوں کے مطالعے سے صحاح ستہ کے علاوہ دیگر کتب حدیث کی اہمیت کا پتا چلا، علم رجال کے موضوع کی تصنیفات سے آشنائی ہوئی۔ ان بہت سی ضعیف اور موضوع احادیث کا علم ہوا جو ہمارے ہاں معروف ہیں۔ نیز علامہ ناصر الدین البانیؒ کے طریق تحقیق سے آگاہی ہوئی۔ چنانچہ انھوں نے اپنی پہلی مطبوعہ کتاب کی (جو درحقیقت ان کا ایڈٹ ورک ہے) "رفع الالتباس من بعض الناس" (تالیف علامہ شمس الحق عظیم آبادی) کی تصحیح و تخریج میں علامہ البانی کے طریق تحقیق سے بہت فائدہ اٹھایا۔ اب بھی وہ انہی کے منہج تحقیق کا تتبع کر رہے ہیں۔

جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ میں محمد عزیز شمس کی علمی دلچسپی کے مندرجہ ذیل تین پہلو تھے۔

اول "عربی مخطوطات:" جامعہ کی لائبریری میں وہ مسلسل تین سال ان مخطوطات کی فہرست سازی میں مصروف رہے۔ اس اثنا میں ان کو بے شمار نادر و نایاب کتابیں دیکھنے، پڑھنے، پرکھنے کا موقع ملا۔

دوم "عربی شعروادب:" اس کا انھوں نے نہایت انہماک اور توجہ سے مطالعہ کیا، اس کی اصل وجہ اس موضوع میں ان کا درجہ تخصص تھا۔ بی۔ اے کے آخری سال میں انھوں نے زمانہ جاہلیت کے ایک شاعر "تأبط شرا" کا خاص طور سے مطالعہ کیا۔ اس کے اشعار اس وقت انھیں کسی عربی دیوان میں یک جا نہیں ملے تھے، اس لیے اس کا دیوان تیار کرنے کا بھی عزم کیا اور اس کے لیے انھوں نے عربی ادب اور لغت کی سیکڑوں کتابیں پڑھیں اور ان سے مستفید ہوئے۔ اس سے بہت بڑا فائدہ انھیں یہ ہوا کہ ان کتابوں کی درجہ بندی، اہمیت اور قدر و قیمت کا پتا چلا اور ان سے ذہن و فکر کو بہرہ مند کرنے کی تکنیک سے واقفیت ہوئی۔

سوم "علم حدیث:" اس بنیادی علم کی بہت سی مطبوعہ اور قلمی کتابوں کے مطالعہ کا موقع ملا۔ پھر ایک غیر مطبوعہ قلمی کتاب "اللآلئ المنثورہ فی الاحادیث المشہورہ"

(تالیف زرکشی) کے متعدد نسخے سامنے رکھ کر ایڈٹ کی۔ اس کی ایڈیٹنگ کے زمانے میں موضوع اور ضعیف احادیث کے تمام مجموعوں اور وضاع، کذاب، ضعیف اور متکلم فیہ رجال سے متعلق مصادر و مراجع کا علم ہوا۔

جامعہ ام القریٰ (مکہ مکرمہ) میں بھی انھیں مخطوطات سے دلچسپی رہی جو اب بھی ہے۔

یہاں انھوں نے علامہ عبدالعزیز میمنی کی تمام تصانیف و تحقیقات کا پوری دلجمعی سے مطالعہ کیا۔ اس کے نتیجے میں عربی لغت و ادب کے میدان میں علامہ میمنی کی وسعت نظر سے بہت متاثر ہوئے اور ان کی عظمت کا نقش ان کے قلب و ذہن پر بیٹھ گیا۔ فیصلہ کیا کہ ان کی مستقل کتابوں کے علاوہ ان کے جو مضامین و مقالات مختلف رسائل میں منتشر پڑے ہیں، انھیں یک جا کیا جائے۔ چنانچہ "بحوث و تحقیقات للعلامہ عبدالعزیز المیمنی" کے نام سے ان کے مضامین و مقالات جمع کر کے دو جلدوں میں شائع کیے۔

جس طرح برصغیر میں عربی زبان و ادب کے میدان میں علامہ عبدالعزیز میمنی نے شہرت پائی اسی طرح علم حدیث کے سلسلے میں علامہ شمس الحق عظیم آبادی کی عظمت و جلالت کا لوہا مانا گیا۔ ان کی غایۃ المقصود، عون المعبود اور التعلیق المغنی علی سنن الدارقطنی سے اہل علم کے تمام حلقے مستفید ہو رہے ہیں۔ علم حدیث سے لگن اور برصغیر کی علمی تاریخ سے رغبت کی بنا پر عزیر شمس نے علامہ عظیم آبادی کی تمام عربی، اردو تحریرات ڈھونڈ ڈھونڈ کر جمع کیں اور عربی اور اردو میں ان کے حالات اور خدمات سے متعلق دو کتابیں سپرد قلم کیں۔ علاوہ ازیں ان کے فارسی اور اردو فتاوے کا مجموعہ تیار کیا۔ یہ تینوں چیزیں چھپ چکی ہیں۔ ان کے تمام عربی رسائل بھی اکٹھا کر لیے ہیں۔ اب ان کی اشاعت کا مرحلہ درپیش ہے۔

علامہ شمس الحق عظیم آبادی اور علامہ عبدالعزیز میمنی کے علاوہ محمد عزیر شمس کے نزدیک برصغیر کی تیسری شخصیت حضرت مولانا شاہ اسماعیل شہید دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی ہے، جن کے مجاہدانہ کارناموں پر تو بہت کچھ لکھا گیا ہے اور لکھنا بھی چاہیے تھا، لیکن ان کی تصنیفی خدمات اور ان کے علمی کارناموں کا ان کے خیال میں زیادہ تعارف نہیں ہو سکا، نہ ان کے سیاسی اور مسلکی نظریات کا کماحقہ جائزہ لیا گیا ہے۔ انھوں نے ان پر بھی ایک مفصل کتاب لکھنے کا

منصوبہ بنایا تھا' جو ابھی تک تکمیل کی منزل میں داخل نہیں ہو سکا- وہ مولانا شہید کی تمام تصانیف جدید انداز میں ایڈٹ کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں- اب تک وہ صرف "رد الاشراک" شائع کر سکے ہیں جو "تقویۃ الایمان" کی اصل ہے اور جسے عام طور سے مفقود یا نایاب سمجھا جاتا تھا- ان کی دوسری تصانیف بھی یکے بعد دیگرے شائع کرنے کا انھوں نے عزم کر رکھا ہے اور یہ سلسلہ کچھ آگے بھی بڑھا ہے-

مولانا شہید کی فارسی کتابوں کے عربی ترجمے کی بھی ابتدا ہو چکی ہے' لیکن بعض وجوہ سے رفتار میں تیزی نہیں آ سکی- پھر ضروری مراجع و مآخذ بھی دست یاب نہیں ہیں-

محمد عزیر شمس صاحب نے گزشتہ دو ڈھائی سال سے ایک اور کام شروع کر رکھا ہے' جس کا تعلق شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ سے ہے- ان سے متعلق وہ حسب ذیل امور کے لیے مواد کی فراہمی اور اس کی ترتیب و تدوین میں مصروف ہیں-

۱- حضرت امام سے متعلق تمام قدیم مآخذ میں جو مواد موجود ہے' اسے تنقیدی حواشی کے ساتھ جمع کیا جائے--- یہ کام بحمد اللہ مکمل کر لیا گیا ہے اور "الجامع لسیرۃ شیخ الاسلام ابن تیمیہ" کے نام سے شائع بھی ہو چکا ہے-

۲- چودھویں اور پندرھویں صدی ہجری میں امام ابن تیمیہ پر جو کچھ کسی بھی زبان میں شائع ہوا ہے' وہ کتاب کی شکل میں ہے یا کسی رسالے اور اخبار میں مضمون کی صورت میں ہے یا کسی یونیورسٹی میں تحقیقی مقالے کے انداز میں ہے' اس کی مکمل توضیحی و تنقیدی فہرست بنائی جائے تاکہ اس موضوع پر کام کرنے والے محققین اس سے فائدہ اٹھا سکیں- یہ کام زیر ترتیب ہے-

۳- امام ابن تیمیہ کی تمام تصانیف کی اس طرح مکمل فہرست تیار کی جائے کہ اس میں ان کے تمام قلمی نسخے' تمام ایڈیشنوں اور مختلف زبانوں میں ترجموں کے ذکر کے ساتھ درج ہو جائیں- یہ کام بھی زیر ترتیب ہے-

۴- ابن تیمیہ کی جو کتابیں اب تک شائع نہیں ہوئی ہیں' خاص طور سے ان کے ہاتھ کی لکھی ہوئی وہ تحریریں' جنھیں زیادہ تر لوگ پڑھ نہیں سکتے' ان کی یکے بعد دیگرے

اشاعت کا منصوبہ-اب تک ''قاعدۃ فی الاستحسان'' -فتویٰ فی القطب والابدال والاوتاد'' اور ''قاعدۃ فی شمول النصوص للاحکام'' شائع ہوچکی ہیں-

ایک مجموعہ ''جامع المسائل'' کے نام سے بیس رسالوں پر مشتمل ہے' امید ہے چند ماہ میں اس کی اشاعت بھی ہوجائے گی-

مذکورہ بالا کتابوں کے علاوہ عزیر شمس صاحب نے اب تک جو عربی مخطوطات ایڈٹ کرکے شائع کیے ہیں' وہ حسب ذیل ہیں-

☆ روائع التراث : یہ دس نادرونایات عربی رسائل کا مجموعہ ہے-

☆ تاریخ وفاۃ الشیوخ الذین ادرکھم البغوی: تصنیف ابوالقاسم بغوی-

☆ جزء فیہ استدراک عائشۃ علی الصحابۃ: تصنیف ابومنصور البغدادی-

☆ تقیید المھمل و تمییز المشکل: تین جلدیں-تصنیف ابوعلی حیانی-تھوڑا عرصہ قبل شائع ہوئی ہے-

☆ غایۃ المقصود شرح سنن ابی داود: تصنیف علامہ شمس الحق عظیم آبادی-
یہ نہایت اہم کتاب اس کے منفرد قلمی نسخے کی بنیاد پر شائع کی گئی ہے-

انھوں نے چند کتابوں اور مضامین و مقالات کے عربی یا اردو ترجمے بھی کیے ہیں-

جن کے عربی ترجمے کیے ہیں' وہ یہ ہیں:

(۱) مسدس حالی کا نثری ترجمہ-

(۲) حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی اتحاف النبیہ-

(۳) علامہ شمس الحق عظیم آبادی کی ''ہدایۃ النجدین'' (مصافحہ ومعانقہ بعد العید بن کے موضوع پر)

(۴) علامہ عبدالعزیز میمنی کے بعض مقالات

(۵) حضرت میاں سید نذیر حسین دہلوی کی ''معیار الحق'' اور

(۶) شاہ اسماعیل شہید دہلوی کی ''ایضاح الحق الصریح'' ---لیکن ''معیار الحق'' اور ''ایضاح الحق الصریح'' کے ترجمے ان سطور کی تحریر تک مکمل نہیں ہوسکے-

جن کے اردو ترجمے کیے گئے ہیں' وہ یہ ہیں: شیخ عبدالقادر سندھی کی کتاب ''پردہ کے احکام۔'' علامہ شمس الحق عظیم آبادی کی ''عقیقہ کے احکام و مسائل۔'' دارالوسیلہ (جدہ) کی شائع کردہ قواعد ترتیل مع علامات تجوید' اور اسلامی فقہ اکیڈمی (جدہ) کی قراردادیں اور سفارشات۔

جامعہ سلفیہ (بنارس) کے زمانۂ طالب علمی میں عزیر شمس صاحب نے برصغیر کے علمائے اہل حدیث کا ایک تذکرہ سپرد قلم کیا تھا' جو تقریباً چھ سو علمائے کرام کے حالات پر مشتمل ہے لیکن ابھی تک وہ تذکرہ چھپ نہیں سکا' اس لیے کہ مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ میں قیام کی وجہ سے نہ وہ اس پر نظر ثانی کر سکے ہیں اور نہ حوالوں میں اضافے کا موقع ملا ہے۔

آج کل عزیر شمس مکہ مکرمہ میں مقیم ہیں اور چند علمی اداروں سے وابستہ ہو کر کام کر رہے ہیں۔ ان اداروں میں جامعہ ام القریٰ (مکہ مکرمہ) مجمع الملک فہد (مدینہ منورہ) اور اسلامی فقہ اکیڈمی (جدہ) شامل ہیں۔

عزیر شمس کے اساتذہ کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ ان کا وہ نہایت احترام سے ذکر کرتے ہیں اور انھیں اپنے مشفق اور کرم فرما قرار دیتے ہیں۔

ہندوستان میں انھوں نے جن حضرات سے استفادہ کیا' ان کی تعداد اکیس تک پہنچتی ہے اور وہ مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱) مولانا شمس الحق سلفی۔ ان کے والد محترم۔ (۲) مولانا عین الحق سلفی۔ ان کے عم محترم (۳) مولانا نور عظیم ندوی۔ (۴) مولانا محمد رئیس ندوی۔ (۵) مولانا محمد ادریس آزاد رحمانی۔ (۶) مولانا عابد حسن رحمانی۔ (۷) مولانا عبدالمعید بناری۔ (۸) مولانا عبدالوحید رحمانی۔ (۹) مولانا عبدالسلام رحمانی۔ (۱۰) مولانا عزیز احمد ندوی۔ (۱۱) مولانا قرۃ العین اعظمی۔ (۱۲) مولانا عبدالسلام طیبی۔ (۱۳) مولانا عبدالسلام مدنی۔ (۱۴) مولانا عبدالرحمٰن ٹونکی۔ (۱۵) مولانا صفی الرحمٰن مبارک پوری۔ (۱۶) مولانا رئیس الرحمٰن اعظمی۔ (۱۷) مولانا عبدالحنان بستوی۔ (۱۸) شیخ ہادی الطالبی۔ یہ ایک عرب استاد تھے جو جامعہ سلفیہ (بنارس) میں مدرس تھے۔ (۱۹) ماسٹر منظور احمد۔ (۲۰) ماسٹر آفتاب۔

(۲۱) ماسٹر شمس الدین۔

جامعہ اسلامیہ (مدینہ منورہ) میں جن عرب اساتذہ سے استفادہ کیا‘ ان میں سے چند نام مندرجہ ذیل ہیں۔ ان میں اکثریت ازہری اساتذہ کی ہے۔

(۱) ڈاکٹر عبدالعظیم علی الشناوی۔ (۲) عزالدین علی السید۔ (۳) احمد السید غالی۔ (۴) محمد قنادی عبداللہ۔ (۵) محفوظ ابراہیم فرج۔ (۶) عبدالعزیز محمد فاخر۔ (۷) ابراہیم محمد عبدالحمید ابو سکین۔ (۸) محمد احمد الغرب۔ (۹) احمد جمال العمری۔ (۱۰) صالح احمد بیلو۔ (۱۱) طہٰ ابو ریشہ۔ (۱۲) محمد بیلو احمد ابوبکر۔ (۱۳) عباس مجوب۔ (۱۴) عبدالباسط بدر۔ (۱۵) علی ناصر فقیہی۔ (۱۶) شیخ جبران۔

جامعہ ام القریٰ (مکہ مکرمہ) کے اساتذہ یہ ہیں۔

(۱) ڈاکٹر حسن محمد باجودہ۔ (۲) محمود حسن زینی۔ (۳) عبدالحکیم حسان۔ (۴) ڈاکٹر احمد مکی الانصاری۔ (۵) علی محمد العماری۔ (۶) عبدالعزیز الکفراوی۔ (۷) بطفی عبدالبدیع۔ (۸) عبدالسلام فہمی۔ (۹) نعمان امین طہٰ۔ (۱۰) عبدالعزیز کشک۔

یہ کل سنتالیس اساتذہ ہیں‘ ممکن ہے یہ فہرست مکمل نہ ہو۔ مدینہ اور مکہ کی یونیورسٹیوں میں ان کے اساتذہ شاید ان حضرات کے علاوہ بھی ہوں گے --- اساتذہ کی اس طویل فہرست سے ہوسکتا ہے کتاب کے خوانندگانِ محترم میں سے بعض حضرات کو زیادہ دلچسپی نہ ہو‘ لیکن ہم نے یہ فہرست یہاں اس لیے درج کردی ہے کہ ان کے علاوہ دیگر حضرات کے اساتذہ کے اسمائے گرامی سے بھی ہم اپنے قارئین کرام کو مطلع کرتے رہے ہیں۔ (اگر کسی محترم استاذ کے نام کی کمپوزنگ میں کوئی غلطی ہوگئی ہو تو ہم معذرت خواہ ہیں)

مکہ اور مدینہ کے دوران قیام میں عزیز شمس نے کئی مرتبہ مختلف ملکوں کا سفر بھی کیا اور ان ملکوں کی لائبریریوں‘ یونیورسٹیوں اور تحقیقی اداروں کو دیکھا اور وہاں کے اہل علم اور محققین و مصنفین سے ملاقاتیں کیں۔ ان ملکوں میں پاکستان‘ مصر‘ اردن‘ شام‘ ترکی‘ فرانس اور برطانیہ شامل ہیں۔ ان ملکوں کے سفر کے دوران پیش آنے والے مشاہدات و تاثرات اور اہم واقعات بھی انھوں نے نوٹ کر رکھے ہیں‘ جن کی ترتیب اور تفصیل ابھی تک معرضِ تحریر

میں نہیں آئی۔

گزشتہ سطور میں ان کی دلچسپی کے جن علوم وفنون کا ذکر کیا گیا ہے' ان کے علاوہ اور بھی متعدد علوم وفنون سے انھیں دلی لگاؤ ہے۔ مثلاً علم عروض اور منطق اور حساب سے بے حد دلچسپی رکھتے ہیں۔ علم عروض کے ماہرین کو ہم دیکھتے ہیں کہ وہ شعر کے بحر اور وزن کا پتا اس کی تقطیع سے لگاتے ہیں۔ لیکن ہمارے ممدوح محمد عزیز شمس کو اس کی ضرورت نہیں ہوتی۔ وہ شعر پڑھتے اور سنتے ہی فوراً اس کا وزن اور بحر بتا سکتے ہیں۔

ان کے حافظے اور کثرتِ مطالعہ کا یہ عالم ہے کہ ہزاروں نام ونسب' تواریخ اور وفیات ان کے ذہن میں محفوظ ہیں۔ اس سلسلے میں کتابوں کی طرف مراجعت کی انھیں بحمد اللہ ضرورت نہیں پڑتی۔

یہ سطور ۲۲ ستمبر ۲۰۰۰ کو لکھی گئی ہیں۔ اس وقت تینتالیس' چوالیس برس ان کی عمر ہے اور ماشاء اللہ صحت بہت اچھی ہے۔ بڑے چست اور متحرک ہیں۔ دعا ہے اللہ تعالیٰ ان کی عمر دراز کرے اور وہ زیادہ سے زیادہ علمی خدمات سرانجام دیں۔

اردو زبان کے دینی ادب میں گزشتہ تین صدیوں میں جن اسالیب کو اختیار کیا گیا ہے، ان میں اکثر اوقات معرب زبان، ادق اصطلاحات، مطالب کا ابہام اور معنویت میں الجھاؤ دکھائی دیتا ہے۔ مصنفین کے اس طبقے میں بیسویں صدی کے نصف آخر کا ایک قلمکار اور مصنف ایسا دکھائی دیتا ہے جس میں ابوالکلام آزاد کی نثری بلاغت، شبلی کی مؤرخانہ بصیرت، سید سلیمان ندوی کی علمیت، مولانا مودودی کی دعوت، رشید احمد صدیقی کی شگفتگی، مولانا ثناء اللہ امرتسری کی جامعیت اور علامہ احسان الٰہی ظہیر کی خطابت کا امتزاج دکھائی دیتا ہے۔ میری مراد محترم محمد اسحاق بھٹی کے اشہب قلم سے نکلنے والی نگارشات سے ہے۔ ان کے قلم کی تربیت ''الاعتصام'' کی ادارت سے شروع ہوئی تو ادارہ ثقافت اسلامیہ کے ''المعارف'' کی مضمون نویسی پر ختم ہوئی۔ یوں ان کے ہاں سلفیت اور تاریخیت کے دھارے ساتھ ساتھ چلتے دکھائی دیتے ہیں۔ ان کے پختہ تاریخی شعور نے اسماء الرجال کے حوالے سے انہیں برصغیر کا ممتاز تذکرہ نویس بنا دیا ہے۔ ان کی اس تذکرہ نگاری کے اولیں جوہر ''فقہائے پاک و ہند'' کی مجلدات میں کھلے تو شخصیت نگاری کا فن ''بزم ارجمنداں، نقوش عظمت رفتہ، کاروان سلف اور محفل دانشمنداں'' میں اپنے معراج و کمال پر دکھائی دیتا ہے۔ اردو ادبیات میں ان کے اس اسلوب کی انفرادیت ایک مسلمہ حقیقت ہے۔

محترم محمد اسحاق بھٹی صاحب نے اسی سلسلۃ الذہب کی ایک نئی کڑی ''قافلۂ حدیث'' کی صورت میں پیش کی ہے۔ اس میں برصغیر کے اکیس مرحومین اور پانچ موجودین کا تذکار علمی پیش کیا گیا ہے یہ ان حضرات کی سیرت و صورت کا مرقع ہے، جنہوں نے اپنی مہلت عمر اور حیات مستعار کو دعوت و تبلیغ، درس و تدریس اور تصنیف و تالیف میں صرف کیا ہے۔ یہ تذکرہ ایسے شستہ قلم اور شگفتہ پیرائے میں کیا گیا ہے کہ قاری از اوّل تا آخر اس کے مطالعے کے دوران محویت و جاذبیت محسوس کرتا ہے۔ حق تعالیٰ بھٹی صاحب کو اس پیرانہ سالی میں وہ صحت کاملہ عطا فرمائے کہ وہ اپنی علمی آرزوؤں اور تحقیقی عزائم کی تکمیل کر سکیں۔

مجھے یقین ہے کہ مکتبہ قدوسیہ کی جانب سے شائع ہونے والی اس کتاب کا ان شاء اللہ والہانہ استقبال کیا جائے گا اور یہ قارئین کے مطالعہ کے لیے علمی ثروت اور ایمانی حلاوت کا باعث بنے گی۔

پروفیسر عبدالجبار شاکر

بیت الحکمت، لاہور